بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾

فتاویٰ دار العلوم زکریا

جلدِ نہم (۹)

باب الطهارة ، باب الصلاة ، باب الزكاة ، باب الحج

باب النكاح و الطلاق ، باب الوقف ، باب البيوع

افادات

حضرت مفتی رضاء الحق صاحب مدظلہ

شیخ الحدیث وصدر مفتی دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

زیر اہتمام

حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی صاحب مدظلہ

مہتمم دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

تہذیب و تحقیق

محمد الیاس بن افضل شیخ، گھلا، سورت

معین دار الافتاء دار العلوم زکریا، جنوبی افریقہ

نام کتاب:...... **فتاویٰ دارالعلوم زکریا** جلدِ نہم (۹)۔

کتابت وکمپوزنگ:......دارالافتاء، دارالعلوم زکریا۔

تاریخ اشاعت:......نومبر ۲۰۲۰ء ، بہ مطابق ربیع الاول ۱۴۴۲ھ

صفحات: ۸۷۲۔

Darul Iftaa Darul Uloom Zakariyya

Lenasia South Africa

Email:duziftaa@gmail.com

shaikhim99@gmail.com

0027839510492

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجمالی فہرستِ فتاوی دارالعلوم زکریا جلدِ نہم (۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرستِ عنوانات

باب......﴿۸﴾

نکاح طلاق سے متعلق متفرق مسائل

پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحِیمْ

نَحْمَدُهُ وَ نُصَلِّى عَلى رَسُولِهِ الْكَرِيْم وَعَلى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ . أمَا بَعْدُ :

اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی جلدِنہم (۹) آپ کی دست بوسی کی منتظر ہے، یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ ہم ناچیزوں کی ناچیز تحریر کو قبولیت کی بادِنسیم سے اور مقبولیت کے مشک وعنبر سے معطر کیا، ہماری تحریری خامیوں کے باوجود اس کے متعدد ایڈیشن پاکستان اور ہندوستان سے شائع ہوئے اور بعض مدارس کے دارالافتاؤں نے اس کو باقاعدہ اپنے نصاب میں شامل کیا، اوراس کا مطالعہ لازمی قرار دیا، فارسی شاعر نے بہت بہتر انداز میں اللہ تعالیٰ کی رحمت خاصہ کو شعر میں بیان فرمایا ہم اس کو الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

رحمت محض است گر لطف جہاں آفرین ☆ خاص کند مدرسہ مصلحت عام را

اگر خالق کائنات کسی مدرسہ کو عام لوگوں کے فائدے کیلئے مخصوص فرمادے تو یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ومہربانی ہوگی۔ مولانائے روم فرماتے ہیں:

چارۂ آں دل عطائے مبدیست ☆ داد او را قابلیت شرط نیست

بلکہ شرط قابلیت داد اوست ☆ داد لب وقابلیت ہست پوست

(دفتر پنجم بحواشی حاجی امداد اللہ مکی رحمہ اللہ، ص۱۳۳)۔

یعنی دل کی اصلاح اللہ تعالیٰ کی تبدیل کرنے والی ذات کے رحم وکرم پر موقوف ہے اس کی عطا کیلئے قابلیت شرط اور ضروری نہیں، بلکہ اس کا فضل ورحم ضروری ہے، اس کی عطا مغز کی طرح اور قابلیت چھلکے کی مانند ہے۔

نویں جلد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ اس کو بھی اللہ تعالیٰ قبولیت اور مقبولیت سے نوازیں گے، اگر قارئین اس جلد میں یا سابقہ جلدوں میں غلطیاں محسوس فرمائیں تو بتلانے میں بخل نہ فرمائیں، ہم قابل اصلاح بات کی ضرور اصلاح کریں گے، اور اگر کوئی مسئلہ قابل رجوع ہو تو ضرور رجوع کریں گے، غلط بات پر جمنا اور ڈٹنا جہالت کی علامت ہے، ہم دارالعلوم زکریا کے اربابِ اہتمام خصوصاً مولانا شبیر احمد سالوجی حفظہ اللہ تعالیٰ کے شکریہ ادا کرنے میں بھی رطب اللسان ہیں، کہ انہوں نے ہمیں لکھنے پڑھنے کے لیے پرسکون ماحول مہیا فرمایا، اس جلد کی تیاری میں تخصص فی الافتاء کے طلبہ کرام کی محنت اور حوالوں کی تلاش قابل داد ہے، اور مفتی محمد الیاس صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ تو اس کے ماتھے کا جھومر "حلية الناصية" ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو علمی عملی ظاہری باطنی ترقی اور دنیوی اخروی برکات سے نوازدیں، اور ہم سب کو ہر بلا سے محفوظ رکھیں، اس جلد میں بھی سابقہ جلدوں کی طرح حتی الوسع تکرار سے گریز کیا گیا اگر مکرر سوالات کے جوابات کو فتاویٰ میں شامل کیا جاتا تو ایک جلد کی کئی جلدیں بن جاتیں۔

وصلى الله تعالىٰ على أشرف المرسلين محمد وآله وصحبه أجمعين .

(حضرت مفتی) رضاء الحق (مدظلہ العالی)

خادم الافتاء والتدریس دارالعلوم زکریا لینیشیا جنوبی افریقہ

مؤرخہ: ۱۴/ ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ

بہ مطابق: ۵/ اگست ۲۰۲۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

از حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ

جو شخص کسی چیز کو بناتا ہے وہی اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی چیز کس طرح استعمال کی جائے، اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے کون سا طریقہ مفید ہے اور کون سا طریقہ نقصان دہ؟ جیسے انسان جب کسی مشین کا استعمال کرتا ہے تو اس کو بنانے والی کمپنی کی ہدایات پر عمل کرنے کا اہتمام کرتا ہے، ڈاکٹر جب دوا تجویز کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ دواساز کمپنی نے اس کے بارے میں کیا رہنمائی کی ہے؟ اگر غور کی نظر سے دیکھیے اور چشمِ عبرت کو وا کیجیے تو اس کائنات میں جتنی مخلوقات ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ ایک عظیم الشان مشین ہیں اور ایسے حیرت انگیز نظام پر مبنی ہیں کہ انسان اپنی چشمِ بصیرت کھول کر دیکھے تو ایمان لائے بغیر نہ رہے، خود انسان کا وجود بھی اپنی ظاہری اور باطنی کیفیات کے اعتبار سے قدرت کے دستِ اعجاز کی نیرنگیوں اور عقل کو دنگ کر دینے والے عجائب کا مظہر ہے، تو کیا انسان کو کائنات سے فائدہ اٹھانے اور زندگی گزارنے کے لیے اس کو پیدا کرنے والے کی رہنمائی مطلوب نہیں ہوگی؟ ہوگی اور ضرور ہوگی؛ کیونکہ وہی ہم سب کا خالق و مالک ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالی ہی خالق بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی اس لائق بھی ہیں کہ ان کے احکام جاری ہوں اور وہ انسانیت کے بارے میں فیصلہ کریں کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟ **ألا لـه الـخـلـق والأمـر** (اعراف:۵۴) ایک اور موقع پر ارشاد ہوا: **إن الحكم إلا لله** (یوسف:۴۰)۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی گزارنے کے لیے اپنا ہدایت نامہ دو شکلوں میں انسان کے پاس بھیجا ہے، ایک کتاب اللہ جس کی تکمیل قرآن مجید پر ہو چکی، اور اب اس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہیں ہو سکتی، دوسرے رجال اللہ، جن میں پہلا درجہ انبیا کا ہے، حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور پہلے نبی بھی، نبوت کا یہ زریں سلسلہ

جاری رہا، یہاں تک کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سرمبارک پرختمِ نبوت کا تاج گہربار کھ دیا گیا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا: **ما كان محمد أبا أحد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين** (احزاب:۴۰)۔

البتہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ہدایت ربانی میں تسلسل قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو خصوصی انتظام فرمائے گئے ، ایک یہ کہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف محفوظ ہوگیا ، جس سے قیامت تک ایک نقطہ کی بھی تبدیلی نہیں ہوسکتی ، دوسرے رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مبارکہ کی حفاظت کی بھی منجانب اللہ ایسی صورت ہوئی کہ آپ ﷺ کی زندگی کے ایک ایک لمحہ کا ریکارڈ محفوظ ہوگیا ، خلوت ہو یا جلوت ، عبادت ہو یا معاشرت ، معاملات ہوں یا اخلاق ، مسلمانوں کے باہمی روابط ہوں یا مسلم وغیر مسلم تعلقات ، عدالت کی کرسی ہو یا تختِ اقتدار ، اور فاتح ہو یا مفتوح ، ہر حال کے لیے آپ کا اسوہ اور نمونہ موجود ہے۔

ہدایتِ ربانی کے ان بنیادی سرچشموں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے رجال اللہ کا تسلسل بھی برقرار رکھا کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی تو نہیں آسکتا ؛ لیکن وارثین انبیا ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے ؛ چناچہ ارشاد ہے: **العلماء ورثة الأنبياء** (ترمذی:۲۶۸۲) مختلف علما نے انبیا کے حق میراث کو الگ الگ جہتوں میں ادا کیا ، کسی نے دعوت وارشاد کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ، کسی نے علومِ اسلامی کی تدریس کی محفل سجائی ، کسی نے تزکیہ واحسان کی چٹائی بچھائی ، کسی نے میدانِ جہاد میں سپہ سالاری کی اور کسی نے مناظرات ومباحثات کے ذریعہ فرق باطلہ کا رد کیا ، غرض کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں مختلف اہلِ علم سے مختلف میدانوں میں کام لیا ؛ لیکن دین کی تشریح وتوضیح اور اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کا کام سب سے زیادہ دو گروہوں سے لیا گیا : محدثین اور فقہاء ، محدثین نے رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ومعمولات کو جمع کرنے اور رواۃ کے حالات کے اعتبار سے معتبر اور نامعتبر کو علاحدہ کرنے پر توجہ دی ، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ تحریف لفظی سے دین کی حفاظت ہوگئی ، قرآن تو منجاب اللہ محفوظ تھا ہی ، اور حدیث کی حفاظت محدثین کے ذریعہ انجام پائی ؛ لیکن الفاظ کی حفاظت کے بعد بھی اہل ہوی اور ہوس کی طرف سے تحریف معنوی کی گنجائش باقی رہتی ہے اور پچھلی امتوں نے تحریف وتصحیف کی ان دونوں شکلوں سے دین حق کی تعلیمات اور الٰہی ہدایات کو نقصان پہنچایا ہے۔

فقہا نے تحریفِ معنوی کے راستے کو بھی بند کردیا اور وہ اس طور پر کہ ایک تو انہوں نے اجتہاد واستنباط کے

اصول وضع کیے اور اس طرح قرآن وحدیث کی من چاہی تعبیر پر روک لگادی، دوسرے: قرآن وحدیث سے جو احکام مستنبط ہوتے تھے ان تمام احکامات کو ایک جامع نظام حیات کی شکل میں مرتب کردیا؛ تاکہ اسلامی تعلیمات اس طرح واضح ہوجائیں کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری تشریح قابلِ توجہ باقی نہ رہے؛ اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فقہا ومحدثین کا امت پر ایسا عظیم احسان ہے کہ امت کبھی اس سے سبک بار نہیں ہوسکتی۔

فقہا کا امت پر ایک اور احسان یہ ہے کہ انہوں نے امت کے عام مسلمانوں کے لیے دین پر چلنا آسان کردیا، مثلاً نماز ہی کو لے لیجیے، نماز سے متعلق دو چار ہی احکام قرآن مجید میں صراحتاً مذکور ہیں، بقیہ تفصیلات حدیثوں میں آئی ہیں، جو بکھری ہوئی ہیں، اب اگر کوئی شخص براہ راست قرآن وحدیث سے طریقہ نماز کو سمجھنا چاہے تو اگر وہ عربی زبان سے واقف ہو تب بھی اسے سینکڑوں حدیثیں تلاش کرنی ہوں گی، پھر ان کے راویوں کے حالات معلوم کرنے ہوں گے، پھر جو احادیث متعارض ہوں، ان میں تطبیق پیدا کرنی ہوں گی، تطبیق ممکن نہ ہو تو ناسخ منسوخ تلاش کرنا ہوگا؛ ورنہ ترجیح دینی ہوگی، عجب نہیں کہ ان مراحل کو طے کرنے میں اس کو دس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ لگ جائے، تب جاکر وہ چار رکعات نماز ادا کرسکے گا، فقہا نے آیات سے احکام کا استنباط کیا، احادیث کے ذخیرہ کو کھنگالا، ترجیحات قائم کیں، اور نماز کے احکام کو اس طرح مرتب کردیا کہ اگر کوئی شخص کتاب الصلاۃ میں سے صرف باب صفۃ الصلاۃ کو دیکھ جائے جو دو ڈھائی صفحات میں ہوتا ہے تو اس کو تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک تمام ضروری مسائل معلوم ہوجائیں گے۔

پھر مسلمانوں کی سہولت اور ان کی رہنمائی کے لیے افتاء کا نظام قائم ہوا کہ اگر کسی مسلمان کو کوئی خاص مسئلہ دریافت کرنا ہو تو وہ کتب فقہ کی ورق گردانی کرنے کے بجائے خاص اس واقعہ کے بارے میں مفتی سے دریافت کرلے، مفتی شرعی نقطۂ نظر سے اس کا جواب دے دیتا ہے، شرعی رہنمائی کا یہ سلسلہ خود رسول کریم ﷺ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے، آپ ﷺ امت کے سب سے پہلے مفتی تھے؛ چنانچہ آپ ﷺ کے فتاوی کو بعض اہل علم نے فتاوی النبی ﷺ کے نام سے جمع بھی کیا ہے، پھر عہد صحابہ میں کار افتاء کا تسلسل رہا، ان میں چند حضرات تو وہ ہیں جنھوں نے بڑی تعداد میں فتاویٰ دیے ہیں، جن کو مکثرین کہا جاتا ہے، ان کی تعداد سات ہے، دوسرے وہ ہیں جن سے نہ بہت زیادہ فتاویٰ منقول ہیں نہ بہت کم، ان کی تعداد بیس ذکر کی گئی ہے، تیسرے مقلین ہیں جن سے بہت کم

فتاویٰ منقول ہیں، بہر حال جن صحابہ سے فتویٰ دینا منقول ہے علامہ ابن القیمؒ کے بہ قول بحیثیت مجموعی ان کی تعداد ۱۳۰ سے زیادہ ہے، صحابہ کے بعد فقہائے تابعین وتبع تابعین اور ائمہ مجتہدین نے وسیع سطح پر یہ خدمت انجام دی ہے، امام ابوحنیفہؒ کو اس باب میں ایسی امتیازی شان حاصل تھی کہ امام شافعیؒ جیسے فقیہ ومحدث نے آپ کے بارے میں کہا تھا کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے محتاج ہیں۔

پھر ائمہ اربعہ کے متبعین میں بھی بڑے بڑے فقہا پیدا ہوئے اور ہمیشہ ایسے لوگوں نے اس فریضہ کو انجام دیا جو بیک وقت علم وتفقہ اور ورع وتقوی کے اوج کمال پر تھے؛ کیونکہ فتوی دینا بڑی ذمہ داری کا کام ہے، امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے:

لو لا الخوف من اللّٰه تعالى أن يضيع العلم ما أفتيت فيكون لهم الهناء وعلي الوزر (مقدمہ شرح عقود رسم المفتی ۶)۔

اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے علم کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں کبھی بھی فتویٰ نہ دیتا، کہ پوچھنے والے تو مزے ماریں اور ہم پر وبال ہو۔

امام مالکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک مجلس میں ان سے پچاس سوالات کیے گئے، انہوں نے ہر ایک کے جواب میں کہا مجھے نہیں معلوم، ایک اور موقع پر ان سے اڑتالیس مسائل پوچھے گئے، انہوں نے بتیس کے جواب میں کہا **لا أدری** مجھے نہیں معلوم۔ (مقدمہ شرح عقود رسم المفتی عن شرح المہذب للنووی ۵)۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ وہ ہے جسے علامہ خطیب بغدادیؒ نے عمر بن سعید سے نقل کیا ہے:

انہوں نے علقمہ سے ایک مسئلہ دریافت کیا، علقمہ نے ان سے کہا کہ **ائت عبيدة فسئله**، عبیدہ سے جا کر پوچھو، میں عبیدہ کے پاس گیا، انہوں نے کہا **ائت علقمة** علقمہ سے جا کر پوچھ لو، میں نے کہا کہ **علقمة أرسلني إليك**، علقمہ ہی نے آپ کے پاس بھیجا ہے، تب عبیدہ نے کہا کہ **ائت مسروق فسئله** مسروق سے دریافت کرلو، میں نے حضرت مسروق کے پاس جا کر پوچھا تو انہوں نے کہا علقمہ سے دریافت کرلو، میں نے عرض کیا کہ علقمہ ہی نے عبیدہ کے پاس بھیجا اور پھر عبیدہ نے آپ کے پاس، تب مسروق نے فرمایا کہ عبد الرحمٰن بن ابی لیلی کے پاس جاؤ، میں نے ان کے پاس جا کر سوال کیا تو انہوں نے میرے پوچھنے کو پسند نہیں فرمایا، میں

نے علقمہ کے پاس جا کر یہ ماجرا سنایا تو انہوں نے فرمایا: **أجرؤ القوم على الفتيا أدناهم علماً.** (الفقیہ المتفقہ ۲/۱۳)۔ فتویٰ دینے میں زیادہ جری وہی ہوتا ہے جو لوگوں میں سب سے کم علم ہوا کرتا ہے۔

اسی احتیاط کی بنیاد پر اہل علم نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ کسی عالم سے جو بھی سوال کیا جائے خواہ اس کے بارے میں اس کو تحقیق نہ ہو پھر بھی وہ جواب دیتا چلا جائے؛ چنانچہ امام نوویؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص ہر سوال کا جواب دے وہ مجنون ہے۔ **من أفتى عن كل ما يسئل فهو مجنون** (شرح المہذب ۱/۴۱)۔ اس لیے اس خدمت کو ہمیشہ اہل علم نے بڑی ذمہ داری سے انجام دیا ہے۔

بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ جیسے عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں فتاویٰ کی خدمات انجام دی جا رہی ہیں، برصغیر کا بھی اس میں نمایاں حصہ ہے، اور اس خطہ کے اہل علم جہاں کہیں بھی گئے وہ علم کی یہ سوغات اپنے ساتھ لے کر گئے اور جہاں انہوں نے علوم اسلامی کی تدریس کے لیے مسند بچھائی، دعوت وتبلیغ کی جد وجہد کو بڑھایا اور تزکیہ واحسان کے ذریعے دلوں کی سرد انگیٹھیوں کو گرم کیا، وہیں فتاویٰ کے ذریعہ دینی رہنمائی کا سلسلہ بھی جاری کیا اور جس نے جہاں اپنی چادر بچھائی، وہ وہاں تشنہ کاموں کا ملجا وماوی بن گیا۔

برصغیر کے علما نے جن علاقوں کو اپنے علم کے فیض سے آراستہ کیا، ان میں ایک اہم خطہ جنوبی افریقہ ہے، جہاں بحمد اللہ کئی نسلوں سے گجرات کے باحمیت مسلمان آباد ہیں، گجرات کے مسلمانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جہاں بھی پہنچے، سب سے پہلے مدرسہ ومسجد کی بنیاد رکھی، اور بچوں کی تعلیم کے لیے مکاتب اور بڑوں کی اصلاح وتربیت کے لیے تحریک دعوت وتبلیغ کا نظام قائم کیا، جنوبی افریقہ بھی اس کی بہترین مثال ہے، ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی بے حیائی اور بداخلاقی کے ماحول میں وہاں کے مسلمان بہت سی لہو ولعب سے محفوظ ہیں، اور انہوں نے اپنے دینی تشخص کو برقرار رکھا ہے۔

جنوبی افریقہ کا ایک ممتاز دینی ادارہ دار العلوم زکریا ہے، جس کی بنیاد شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ کی تمنا پر رکھی گئی، آپ ہی کی بابرکت نسبت سے یہ ادارہ موسوم ہے، ۱۹۸۳ء میں مدرسہ کا باقاعدہ افتتاح ہوا، حضرت قاری عبد المجید صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی صاحب کی باہمی رفاقت کے ساتھ

یہ کارواں آگے بڑھا، اور ۱۹۸۵ء تک قاری عبد الحمید صاحب اس ادارے کے مہتمم رہے، پھر جب انہوں نے جنوبی افریقہ چھوڑا تو اہتمام کی ذمہ داری حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی دامت برکاتہم سے متعلق ہوئی، اور اس وقت سے تا حال حضرت مولانا سالوجی صاحب کی قیادت میں علم وفکر کا یہ قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے، بحمد اللہ جامعہ ہذا میں پچاس سے زیادہ ملکوں کے طلبہ زیر تعلیم ہیں، اور نہ صرف تعلیم وتربیت کے مختلف شعبے کام کررہے ہیں؛ بلکہ ۱۹۸۷ء سے مستحکم بنیادوں پر دار الافتاء کا نظام بھی قائم ہے۔

مولانا سالوجی جوہر بھی ہیں اور جوہر شناس بھی، خود مرد کار ہیں اور مردان کار کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے لانے اور اپنے گلشن کو گلہائے رنگا رنگ سے سنوارنے کا ذوق بے بہا اور جذبہ بے کراں رکھتے ہیں؛ چنانچہ ان کی نگاہ مردم شناس نے صاحبِ فتاویٰ حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب دامت برکاتہم کو ڈھونڈ نکالا، اور نظر وفکر کا جو گلستاں انہوں نے لگایا تھا، اس کے ایک شجر سایہ دار وسدا بہار کی حیثیت سے وہ آپ کو پاکستان سے لے کر آگئے، حضرت مفتی صاحب ۱۹۵۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۷۰ء میں جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک سے فراغت پائی، ۷۳،۱۹۷۲ء میں جامعہ بنوری ٹاؤن میں تخصص کیا اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ جیسے قدآور محدث، فقیہ اور ادیب کے دامن تربیت سے وابستہ رہے، مفتی صاحب اب سالہا سال سے جامعہ زکریا میں بخاری شریف کا درس دے رہے ہیں، فقہ، تصوف، حدیث، قواعد صرف، فرائض اور شعر وادب وغیرہ پر ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں، آپ نے حضرت مولانا بنوریؒ کے زیر نگرانی اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر اپنا تفصیلی مقالہ تحریر فرمایا تھا، جو طبع ہو چکا ہے، بحمد اللہ آپ کے تلامذہ ومستفیدین کے دلوں میں آپ کی غیر معمولی محبت ہے اور طلبہ کے دلوں استاذ کی محبت علم وفضل اور اخلاق وکردار کی بلندی کے بغیر پیدا نہیں ہوتی، آپ نے اپنے زمانے کے ممتاز فقیہ اور اپنے بزرگوں اور خوردوں دونوں کے محبوب استاذ گرامی حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، اور احسان وسلوک میں ان کے مجاز بھی ہوئے۔

فتاویٰ دار العلوم زکریا آپ ہی کے گراں قدر فتاویٰ کا مجموعہ ہے، جن کی ۷ جلدیں طبع ہو چکی ہیں، اس مجموعے کے زیادہ تر فتاویٰ خود مفتی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں، مشاغل کی کثرت اور بالخصوص آنکھوں کی بیماری کی وجہ سے جب جامعہ میں شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء قائم ہوا تو مدرسہ کی عام روایت کے مطابق سوالات طلبہ

کے حوالہ کردیے جاتے، وہ آپ کے مشورہ سے جوابات لکھتے، پھر آپ کی نظر ثانی کے بعد طباعت ہوتی؛ اس لیے بجا طور پر اس کو مفتی صاحب کے افادات کی حیثیت سے اس مجموعہ میں شامل رکھا گیا ہے، مفتی صاحب کے دامن فیض سے وابستہ ان کے لائق تلمیذ مولانا محمد الیاس شیخ صاحب نے بڑی محنت، حسن ذوق اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب وتہذیب کا فریضہ انجام دیا ہے۔ نیز مفتی عبد الباری صاحب پہلی جلد میں ان کے ساتھ شریکِ کار رہے۔

اس حقیر کو فتاویٰ کے اس مجموعہ کی جو خصوصیات نظر آئیں، یہاں ان کا تذکرہ مناسب ہوگا:

❁ جنوبی افریقہ اور اس کے مضافات میں جو ممالک ہیں، وہ مختلف رنگ ونسل، مذاہب اور زبانوں کا مجموعہ ہیں، اور بڑی حد تک یہ خطہ مشرقی ومغربی تہذیب کا سنگم ہے؛ چونکہ یہ ممالک طویل عرصہ سے غلامی کی حالت میں تھے؛ اس لیے شخصی آزادی کے معاملہ میں یہاں بہت غلو بھی پایا جاتا ہے، نہ پاکستان وبنگلہ دیش کی طرح مسلم ملک ہے، اور نہ ہندوستان کی طرح وہاں مسلمانوں کے لیے قانونِ شریعت کو تسلیم کیا گیا ہے؛ اس لیے وہاں کے ماحول میں بمقابلہ برصغیر کے نئے مسائل زیادہ پیش آتے ہیں، غالباً اسی لیے ان فتاوی میں جدید مسائل کی اچھی خاصی تعداد آ گئی ہے۔

❁ عام طور پر اکابر کے یہاں حوالہ جات کا اہتمام کم ہوا کرتا تھا، حوالہ جات دیے جاتے تو کہیں صرف کتاب کا نام لکھ دیا جاتا، کہیں عبارت کا چھوٹا سا ٹکڑا؛ کیونکہ عوام کو حوالے کی ضرورت نہیں ہے، اور علماء کا علمی اشتغال اس درجہ تھا کہ یہ اشارہ بھی کافی ہو جاتا تھا؛ لیکن اب صورت حال یہ نہیں رہی، اگر مکمل حوالہ ہو اور حوالہ کی عبارت درج ہو تو تشفی کا باعث ہوتا ہے، اور بالخصوص اہل علم کے لیے اصل ماخذ تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے، اس مجموعہ میں اس کی پوری رعایت کی گئی ہے، حوالہ ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور عبادتیں بھی پوری پوری نقل کی گئی ہیں؛ اس لیے امید ہے کہ یہ خواص اور اہل علم کے لیے بھی تشفی کا سامان ہوگا۔

❁ مفتی صاحب نے صرف فقہی عبارتوں کو نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے؛ بلکہ کتاب وسنت کی نصوص بھی ذکر فرمائی ہیں اور خاص کر جہاں کسی حدیث کی تحقیق کی ضرورت تھی، وہاں اس پر شرح وبسط اور تحقیق کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

❁ مفتی صاحب کے فتاویٰ کی ایک اہم خصوصیت فقہی مسائل میں ان کا اعتدال ہے، انہوں نے کتاب وسنت کی نصوص کے ظاہری مفاہیم کے ساتھ ساتھ عرف وتعامل، مصالح اور موجودہ حالات کو بھی پیش نظر رکھا ہے، اور افراط وتفریط سے دامن بچا کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔

❁ مفتی صاحب نے تفسیر وحدیث کی اہم کتب اور متقدمین ومتأخرین کے اجتہادات سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے معاصر اہل علم سے استفادہ کرنے میں بھی تکلف سے کام نہیں لیا ہے، اور جن کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے، پوری دیانت کے ساتھ ان کے حوالہ جات ذکر کئے ہیں۔

❁ تقریباً ہر جلد میں ان مسائل کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے، جن پر مفتی صاحب نے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے، ان مسائل کا تعلق حدیث سے بھی ہے اور فقہ سے بھی۔

غرض کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو زبان میں فتاویٰ کے جو مجموعے آئے ہیں، ان میں یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

...دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو امت کے لیے نافع بنائے، علماء اور عام مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے،...اور ملتِ اسلامیہ پر تادیر صاحبِ فتاویٰ کا سایۂ عاطفت قائم رہے۔ **واللّٰہ المستعان .**

(حضرت مولانا مفتی) خالد سیف اللہ رحمانی (دامت برکاتہم العالیہ)

خادم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

۱۴/ ذوالقعدہ ۱۴۳۷ھ ، ۱۷/ اگست ۲۰۱۶ء

﴿فتاویٰ دارالعلوم زکریا پر تعارف وتبصرے﴾

تبصرہ از ماہنامہ ''الحق'' دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک:

فتویٰ اور افتاء کا تاریخی سلسلہ بہت ہی قدیم ہے۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آج تک علماء صالحین اس عظیم منصب پر فائز ہوتے چلے آرہے ہیں۔اور اکثریت کے صادر کردہ فتاویٰ کا مجموعہ کتابی شکل میں اس وقت دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود ہے۔جن سے اربابِ علم وکمال استفادہ کرتے ہیں اور اہل فتویٰ ،فتویٰ نویسی میں رہنمائی لیتے ہیں۔فتاویٰ دارالعلوم زکریا بھی اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے، جو حضرت مفتی رضاء الحق شاہ منصوری مدظلہ کے جاری کردہ فتاویٰ کا مجموعہ ہے،حضرت مفتی صاحب ایک باکمال، جامع صفاتِ علمی شخصیت ہیں اور آپ مدظلہ کا تعلق ضلع صوابی صوبہ سرحد کے ایک مشہور ومعروف گاؤں شاہ منصور کے زہد وتقویٰ ،علم وفضل کے پیکر خاندان سے ہے،اور جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے ان فرزندان میں سے ہیں جن پر جامعہ فخر کرتی ہے۔اللہ پاک جزاء دے مولانا عبدالباری صاحب اور مولانا محمد الیاس شیخ صاحب کو جنہوں نے حضرت مفتی صاحب کے ان گرانقدر علمی اور تحقیقی فتاویٰ کو جمع کرکے بہترین انداز میں مرتب کیا اور زمزم پبلشرز کراچی نے دیدہ زیب ٹائٹل ،عمدہ کتابت اور شاندار طباعت کے ساتھ علماء اور طلباء بلکہ ہر خاص اور عام پر احسان کرتے ہوئے اس گنجینہ علم کی پہلی جلد کو شائع کیا۔فتاویٰ کی یہ پہلی جلد کتاب الایمان والعقائد، کتاب التفسیر والتجوید، کتاب الحدیث والاثار، کتاب السلوک والطریقہ اور کتاب الطہارۃ پر مشتمل ہے۔فتاویٰ میں استفتاء کا ہر جواب انتہائی تدقیق اور تحقیق کے ساتھ دیا گیا،جس کے لئے ہر مذہب کے علماء،محدثین اور فقہاء کی کتابوں کی طرف مراجعت کی گئی ہے اور ہر کتاب کا مکمل حوالہ مع عبارت کے درج ہے،بعض ایسے جوابات بھی ہیں جو دوسرے فتاویٰ میں نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اجمالی ہے،اس لئے یہ فتاویٰ ہر خاص وعام کی علمی پیاس بجھانے کے لئے انتہائی مفید ہے اور ہر لائبریری کی زیب ہے، کتاب کا مطالعہ کرکے دل سے یہ دعاء نکلتی ہے کہ خدا کرے کہ یہ عظیم فقہی انسائیکلوپیڈیا پایۂ تکمیل تک پہنچ کر شائع ہوجائے۔(ماہنامہ ''الحق'' دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک)۔

تبصرہ از ماہنامہ ''البینات'' جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن:

ایک دور تھا جب افریقہ، امریکہ، کنیڈا اور دوسرے یورپی ممالک میں دینی مدارس کا خاطر خواہ نظام نہیں تھا اور وہاں کے متلاشیانِ علم وہنر ہندو پاک کا رخ کرتے تھے اور یہاں کے اربابِ فضل وکمال اور اصحابِ علم وتحقیق کی خدمت میں زانوئے تلمذ طے کر کے علم ومعرفت کے جام لنڈھاتے تھے۔

یہاں سے اکتسابِ فیض کے بعد مختلف ممالک کے مخلصین نے جب ضرورت محسوس کی تو انہوں نے اپنے اپنے علاقوں اور ممالک میں دینی مدارس کا جال بچھانا شروع کر دیا، چنانچہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے نامور فاضل تلامذہ میں سے حضرت مولانا شبیر احمد سالوجی مدظلہ اور ان کے رفقاء نے جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں دارالعلوم زکریا کے نام سے ادارہ قائم کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ترقیات کے مدارج طے کئے تو انہون نے اپنی سرپرستی اور اپنے دینی ادارے کی ترقی کے لئے اپنی مادرِ علمی سے ایک بڑے استاذ ومفتی اور شیخ الحدیث کی درخواست کی، اس پر اربابِ جامعہ علوم اسلامیہ نے اپنے ایک لائق، فائق، عظیم محقق مدرس اور مفتی حضرت مولانا رضاء الحق صاحب کو جنوبی افریقہ بھیج کر ایثار وقربانی کا ثبوت دیا۔ حضرت مولانا مفتی رضاء الحق دامت برکاتہم کی فیض رساں شخصیت نے افریقہ کو تعلیم وتدریس، علم وتحقیق اور فقہ وفتویٰ کے اعتبار سے بجا طور پر مستغنی کر دیا۔

پیش نظر فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی جلد اول انھیں کی علمی تحقیقات کا منہ بولتا ثبوت ہے، جس میں نہایت خوبصورت انداز میں کتاب الایمان، کتاب التفسیر، کتاب الحدیث والآثار، کتاب السلوک والطریقۃ اور کتاب الطہارۃ کو مرتب اور مدون کر کے کتابی شکل دی گئی ہے۔

بلاشبہ فتاویٰ میں درج مسائل واحکام اہل حق اسلاف اور اکابر دیوبند کی تحقیق کی ترجمانی کے علاوہ ان کے ذوق ومزاج کا آئینہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس فتاویٰ کے مرتبین مولانا مفتی عبدالباری اور مولانا مفتی محمد الیاس شیخ کو جزائے خیر عطا فرمائے، جنہوں نے اس اہم خدمت کو سرانجام دیا۔ امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدردانی میں بخل سے کام نہیں لیں گے، خدا کرے کہ فتاویٰ جلد از جلد مکمل ہو کر متلاشیانِ علم وتحقیق کی پیاس کو بجھائے، آمین۔ (ماہنامہ ''بیّنات'' رجب المرجب ۱۴۲۹ھ، اگست ۲۰۰۸ء)۔

تبصرہ

از حضرت مولانا مرغوب احمد لاجپوری صاحب مدظلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا مفتی رضاء الحق صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج سامی بخیر ہوگا، بندہ بھی اللہ تعالی کے فضل وکرم سے خیریت سے رہ کر بارگاہ ایزدی میں جناب والا کی خیر وعافیت کا طالب ہے۔غرض تحریر اینکہ حضرت والا کے فتاویٰ کا عظیم الشان مجموعہ ''فتاوی دارالعلوم زکریا'' ج۴ر وج:۶ر کے مکمل مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی ، بقیہ جلدوں کا بھی عنقریب مطالعہ کروں گا ، انشاء اللہ تعالی۔حضرت بلا مبالغہ فتاوی کا یہ مجموعہ ہمارے اکابر کے مطبوعہ فتاوی میں نہ صرف ایک قیمتی اضافہ بلکہ کئی فتاوی سے زیادہ ظاہری وباطنی حسن کا حامل ہے۔بہترین طباعت، صاف ستھری تحریر، عمدہ کاغذ، مضبوط اورخوبصورت جلد سے مزین حسن ظاہری میں تو اپنی مثال آپ ہے، مگر بہترین جوابات، علمی ٹھوس استدلال، قرآن کریم کی آیات، احادیث مبارکہ اورفقہاء امت کے فقہی ذخائر سے غیر معمولی اہمیت سے معمور فقہی عبارتوں سے مالا مال لاجواب مسائل کا بے انتہا مفید سے مفید تر مجموعہ ہیں، جزاکم اللہ تعالی احسن الجزاء فی الدارین خیرا۔دلی دعا ہے کہ اللہ تعالی اس مجموعہ کو امت کے لئے نافع اورآپ ومرتب مدظلہما کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے،آمین۔

یہ مجموعہ نہ صرف عوام بلکہ حضرات علماء کے لئے بھی قابل قدر ہیں، بلکہ ارباب افتاء کے لئے اس میں بہت کچھ کام کی باتیں اور مفید ہدایات آگئی ہیں۔بعض مسائل پر اس قدر سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ دوسرے فتاوی ان سے خالی ہے۔فتاوی کا یہ عمدہ ترین مجموعہ آپ کی فقہی بصیرت کا شاہد ہے۔دوران مطالعہ محسوس ہوا کہ حضرت والا میں نہ بعض متشدد ارباب افتاء والا جمود ہے اور نہ زمانہ کے بعض متساہل طبیعت والے مفتی والا تساہل، نہ ہر طرح کی آزادی اور نہ ضرورت کے وقت فقہاء امت کی دی ہوئی سہولت سے تنگی۔یقیناً اس میں ارباب افتاء کے لئے ایک قیمتی سبق ہے۔اللہ تعالی حضرات ارباب افتاء کو ان فتاویٰ سے مفید اسباق لینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

مرتب مدظلہ کی محنت بھی یقیناً قابل مبارک باد ہے کہ موصوف نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ان فتاوی

کومرتب کیا، اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو بھی ذریعۂ نجات ودارین میں فوز ودرجات کی بلندی کا ذریعہ بنائے، آمین۔ دوران مطالعہ بعض امور ذہن میں آئے ان کو عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں، امید کہ حضرت والا کی طبیعت پر گرانی کا باعث نہ ہوں گے۔

(۱):......آپ کی وسعت کے لئے صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں، حضرت والا نے دم بریدہ جانور کی قربانی کی جو تفصیل تحریر فرمائی ہے کہ ایسے جانور کی قربانی جائز ہے یا نہیں؟ اکثر عصر حاضر کے ارباب افتاء عدم جواز کے قائل ہیں، بعض حضرات نے جواز کا فتوی دیا ہے، حضرت والا نے دونوں طرف کے دلائل کے بعد جواز کی طرف رجحان ظاہر فرمایا، یہ وسعت نہ شرعی حدود سے باہر ہے اور نہ اس میں امت کے لئے تنگی ہے۔ اس فتویٰ کو حضرت والا نے جس قدر تفصیل سے باحوالہ اور مدلل تحریر فرمایا ہے، یہ واقعی وقت کی ضرورت اور حضرت کی فقہی بصیرت کی دلیل ہے۔ (ص ۳۷۰ ج ۶) اس کی ایک وجہ یہ بھی آپ جس ملک میں قیام فرما ہیں، ہمارے ایشیا کے اکثر ارباب افتاء اس ملک کے حالات سے پوری طرح واقف نہیں، سوائے ان چند حضرات کے جنہوں نے اس ملک کا سفر فرمایا ہے۔ واقعی ملک کے حالات کے پیش نظر بھی ملک میں مقیم حضرات مفتیان کرام کو خصوصی توجہ کرنی چاہئے۔

(۲):......محاسبی رحمہ اللہ کے اس جملہ نے "**یتداوی المتوکل اقتداء بسید المتوکلین**" یعنی "متوکل شخص سید المتوکلین کی اقتدا میں علاج کرائے" دوران مطالعہ بے اختیار ماشاء اللہ کی آواز زبان پر جاری کردی۔

(۳):......بندوق سے شکار کے جواز پر مشتمل رسالہ "**ابراز الدقائق فی حکم صید البنادق**" بھی ماشاء اللہ خوب سے خوب تر ہے، آپ نے اپنے موقف کو جس قوت اور حسن دلائل سے مزین فرمایا ہے، پڑھ کر بہت فائدہ ہوا۔ (۱۹۵ج۶)

(۴):......قربانی کے بعض مسائل سے بہت ہی فائدہ ہوا، اس لئے کہ ان مسائل کا تعلق اہل برطانیہ سے بھی ہے۔ ہندوپاک کے فتاویٰ میں وہ مسائل نہیں آئے جو اللہ تعالیٰ نے ان فتاویٰ میں جمع کروادیئے۔

(۵):......جلد چہارمؔ میں حضرت والا نے عورت کے دواوعلاج کا خرچ شوہر کے ذمہ وجوب کا جو قول اختیار فرمایا اور اپنی رائے کا ان الفاظ میں:

’’راقم کی رائے یہ ہے کہ دواعلاج وغیرہ خاص طور پراس زمانے میں انسان کی اس سے کم بنیادی ضرورت نہیں ہے جیسے کہ تیل، کنگھی اور صابن وغیرہ ہے۔ جب عورت کے جسم کی صحت وصفائی کے لئے ان چیزوں کے فراہم کرنے کوفقہاء نے واجب لکھا ہے تو پھر دواعلاج کیوں نہ واجب ہو؟ پھر فقہاء لکھتے ہیں کہ بالغ لڑکوں کا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہے، لیکن اگر کوئی بالغ لڑکا بیمار پڑ جائے تو اس کا نان نفقہ باپ پر ضروری ہوجاتا ہے، اور پھر یہ تو لڑکا ہے۔ فقہاء نے مضارب کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کو علاج کا خرچ بھی ملے گا، کیونکہ بغیر اس کے مضارب کا کام وہ نہیں کرسکتا، تو عورت سے جو فوائد متعلق ہیں ان کا لحاظ کر کے اس کے دواعلاج کا خرچ مرد پر ضروری کیوں نہ قرار دیا جائے‘‘۔ (ص ۳۶۸ ج ۴)

میں جو اظہار فرمایا ہے وہ واقعی قابل قدر اور زمانے کے حالات کے عین مطابق ہے۔

(۶):......فراغت کے بعد عالم دین کا ایک سال کے لئے جماعت میں جانے پر آپ کا فتویٰ بھی ماشاء اللہ لائق تحسین ہے، فتنہ کے اندیشہ کے ابطال پر جو آپ نے نظیر پیش فرمائی ہے:

’’علاوہ ازیں اس کی نظیر فقہاء کی عبارت سے ہم پیش کر سکتے ہیں کہ عنین کی زوجہ کو فقہاء ایک سال کی مہلت دیتے ہیں، اور مفقود کی زوجہ کو چار سال کی، حالانکہ اس طویل مدت میں بھی تو فتنہ کا اندیشہ ہوسکتا ہے‘‘۔ (ص ۴۳۹ ج ۴) بہت قابل غور اور قابل صد تحسین نظر ہے۔

(۷):......حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمہ اللہ راقم کے بھی استاذ ہیں، حضرت والا نے بعض جگہوں پر ان کی رائے نقل فرمائی ہے، کاش یہ پہلے مطالعہ میں آجاتی تو میں ان کے حالات میں جو میں نے مختصر طور پر لکھے ہیں، شامل کر لیتا، آئندہ طباعت میں ان شاء اللہ اسے شامل اشاعت کرلوں گا۔ اور واقعی حضرت رحمہ اللہ کی رائے بھی ان کی فقہی بصیرت اور حالات زمانے سے واقفیت کی بین دلیل ہے۔

آپ تحریر فرماتے ہیں: حضرت مفتی ولی حسن صاحب کے سامنے جب شوہر کے طلاق ثلاثہ کے انکار اور عورت کے طلاق ثلاثہ کے دعوے کا مسئلہ آتا اور حضرت کو حکم بنایا جاتا تو عورت سے گواہ طلب کرتے، اور جب عورت کے پاس گواہ نہ ہوتے تو شوہر سے قسم لیتے، اور جب شوہر قسم کھاتا کہ میں نے تین طلاقیں نہیں دیں تو بیوی سے فرماتے تم شوہر کے ساتھ رہ سکتی ہو اگر شوہر جھوٹا ہوگا تو گناہ شوہر پر ہوگا‘‘۔ (ص ۱۱۳ ج ۴)

پھر حضرت والا نے اپنا رجحان بھی ان الفاظ میں: ’’اس میں آسانی ہے اسی کی طرف بندہ کا میلان ہے‘‘ اسی

کی طرف ظاہر فرمایا ہے۔ واقعی بعض اوقات عورت کی مجبوری میں یہی رائے قابل اتباع ہونی چاہئے۔ جبکہ ’’بزازیہ‘‘ اور ’’خلاصۃ الفتاوی‘‘ کی عبارت بھی اس رائے کی موید ہے: ’’ان لم یکن بینة ترفع الی القاضی و تحلفه فان حلف فالاثم علیه‘‘۔ (خلاصۃ الفتاوی: ۲/۱۲۰، المکتبۃ الرشیدیہ) فان حلف ولا بینة لها فالاثم علیه۔ (فتاوی شامی ۳/۲۵۱، باب الرجعۃ، سعید)

(۸):...... زوجہ کی موجودگی میں تحریری طلاق واقع ہوجاتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں حضرت والا نے بڑی تفصیل اور دلائل سے فتوی تحریر فرما کر اس بات کو ثابت فرمایا کہ تحریری طلاق زبانی طلاق کی طرح ہے بیوی حاضر ہو یا غائب بہرصورت طلاق واقع ہوجاتی ہے، ہاں اگر کسی پر اکراہ کیا جائے تو مکرہ کی تحریر معتبر نہ ہوگی اور طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔ اور علامہ شامی رحمہ اللہ کے جزئیہ ’’وظاهره ان المعنون من الناطق الحاضر غیر معتبر‘‘ سے جو اشکال واقع ہوتا ہے اس کا جواب بھی خوب لکھا، نیز علامہ رافعی نے علامہ شامی کے ظاہر کہنے پر اشکال بھی فرمایا ہے، وغیرہ امور کو خوب صراحت سے مدلل فرما کر مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو بحسن وخوبی واضح فرمادیا، پھر نطق کو مؤثر اور کتابت کو غیر مؤثر مان لینے سے جن مسائل پر اثر پڑتا ہے ان نظائر کو بڑے دلچسپ انداز سے تحریر فرمایا۔ حضرت والا کی یہ اور اس طرح کی دوسری تحریروں کے مطالعہ سے بندہ بہت متأثر ہوا۔

(۹):...... تعلیق طلاق میں شافعی قاضی سے فیصلہ کرانے کا حکم کیا ہے؟ اس پر آپ نے جو فتویٰ تحریر فرمایا اور اس کے اثبات میں جو نظائر پیش فرمائے ہیں، واقعۃً بڑے قابل غور اور سائل کو منوا کر مطمئن کئے بغیر نہیں رہتے۔ اللہ تعالی آپ کو اس محنت شاقہ کا دارین میں بہترین بدلہ نصیب فرمائے۔

(۱۰):...... صفحہ نمبر: ۳۱۹/ پر دوران عدت گھر سے باہر نکلنے کے سلسلہ میں نمبر: ۷/ پر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ: ’’عورت عدالت میں جاسکتی ہے‘‘

اس کو اگر حضرت والا مناسب سمجھیں اور تھوڑی سی تبدیلی فرمادیں مثلا: اگر آسانی سے تاریخ مؤخر کی جاسکتی ہو تو تاریخ مؤخر کرانی چاہئے، ہاں اگر تاریخ کی تبدیلی ممکن نہیں اور مؤخر اکرانے میں واقعی مشقت ہو تو پھر جاسکتی ہے۔ هذا ما ظهر لی، یہ ایک طفل مکتب کی رائے ہے حضرت والا جبال علم ہیں ’’رأی العلیل علیل‘‘۔

فقط طالب دعا: مرغوب احمد لاجپوری، ۲/ ذی قعدہ ۱۴۳۶ھ مطابق: ۱۸/ اگست ۲۰۱۵ء، منگل۔

﴿دارالعلوم زکریا پر ایک طائرانہ نظر﴾

۞ ۱۹۸۱ء میں حضرت برکۃ العصر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ نے جنوبی افریقہ تشریف لاکر دعا فرمائی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور حضرت ہی کے نام پر دارالعلوم زکریا کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

۞ ۱۹۸۳ء دسمبر میں حضرت قاری عبدالحمید صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب اور ان کے رفقاء کی سرپرستی میں مدرسہ کا باقاعدہ افتتاح ہوا، اور ۱۹۸۵ء تک مہتمم قاری عبدالحمید صاحب رہے۔

۞ قاری عبدالحمید صاحب کے ہندوستان تشریف لے جانے کے بعد مولانا شبیر احمد سالوجی صاحب مہتمم اور حافظ بشیر صاحب ناظمِ مدرسہ مقرر ہوئے، اور تاہنوز خدمت انجام دے رہے ہیں، اور انھیں کی توجہات وشبانہ روز محنت سے دارالعلوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔فجزاهم الله تعالىٰ أحسن الجزاء.

﴿دارالعلوم زکریا کے مختلف شعبے﴾

۞ شعبۂ تحفیظ القرآن: اکابرین کی توجہ اور دعا کی برکت اور اساتذۂ کرام کی محنت سے ماشاءاللہ خوب رو بہ ترقی ہے۔ اساتذۂ درجاتِ حفظ کی تعداد: ۱۳، اور طلبائے عزیز کی تعداد: ۲۱۷، اور درسگاہوں کی تعداد: ۱۰ ہے۔

۞ درسِ نظامی: طلبائے کرام علومِ عالیہ وآلیہ سے تشنگی کی آگ بجھارہے ہیں۔ اساتذۂ کرام کی تعداد ۲۴ ہے۔ اور طلبائے کرام کی تعداد ۴۴۲ ہے، مقامی ان میں سے ۳۲ فیصد، اور دیگر ۵۷ ممالک کے ۶۸ فیصد طلباء تحصیلِ علم میں مشغول ہیں۔

۞ شعبۂ افتاء واستفتاء: ۱۹۸۷ء سے حضرت مفتی رضاء الحق صاحب کی نگرانی میں رواں دواں ہے

ابتدا میں حضرت بذاتِ خود تحریر فرماتے تھے پھر ۱۹۹۲ء میں مستقل دارالافتاء کا نظام شروع ہوا۔

۞ شعبۂ قراءت وتجوید: ۱۹۸۸ء میں قراءت وتجوید کا مستقل شعبہ شروع ہوا۔

۞ شعبۂ ''النادی العربی'': طلبائے عزیز کا عربی ادب سے ذوق وشوق بڑھا اور تقریراً وتحریراً اس میں حصہ لیا اور مستقل شعبہ ''النادی العربی'' کے نام سے شروع ہوا۔

۞ دارالعلوم زکریا کی شاخ: برائے حفظ منتظمین حضرات نے مدرسہ ہذا سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ۲۰۰۰ء میں جناب عبدالرحمٰن میاں صاحب کی درخواست پر ان کی والدہ کی خواہش پر انھیں کی زمین پر ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا ہے جس میں تقریباً ۱۰۰ طلباء اور ۵، اساتذۂ کرام ہیں، اور ۵ درسگاہیں ہیں۔

۞ اللہ تعالیٰ تمام اساتذۂ کرام ومنتظمین اور کارکنانِ مدرسہ ہذا کو جزاء خیر عطا فرمائیں۔ نیز دارالعلوم کو اور دیگر علمی اداروں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقیات سے نوازے اور ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ فرما کر اپنی رحمتِ خاصہ نازل فرمائیں۔ آمین۔

۞ اکابرین وائمہ اور دیگر مہمانانِ کرام کے قدوم میمنت لزوم سے یہ وادی خوشنما اور دلرُبا بنتی گئی۔ ان میں سے: حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ مفتیٔ دارالعلوم دیوبند۔ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ۔ حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحبؒ۔ حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ۔ ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانویؒ۔ حضرت حاجی فاروق صاحبؒ۔ حضرت مولانا عمر صاحب پالنپوریؒ۔ حضرت قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ۔ بھائی پاڈیا صاحبؒ۔ حضرت مولانا عمر جی صاحبؒ۔ حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی صاحب۔ حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحبؒ۔ حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی۔ حضرت مولانا ادریس صاحب میرٹھیؒ۔ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ صاحبؒ۔ شیخ عبدالرحمٰن السدیس۔ شیخ شریم۔ شیخ صالح بن حمید۔ شیخ عبدالرحمٰن حذیفی۔ شیخ سبیل۔ شیخ صلاح بدیر۔ شیخ محمد علی صابونی۔ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب۔ حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب۔ حضرت مولانا ارشد صاحب مدنی۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب۔ دکتور عبداللہ عمر نصیف صاحب۔ حضرت مولانا

سید رابع صاحب۔حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب۔حضرت مولانا سلمان صاحب۔حضرت حکیم اختر صاحب۔حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری۔حضرت مفتی فاروق صاحب میرٹھی۔حضرت مولانا یونس صاحب پوناؒ۔حضرت مولانا ابراہیم صاحب دیولا۔شیخ الحدیث مولانا یونس صاحب۔حضرت مولانا بدیع الزمان صاحبؒ۔حضرت مولانا سالم صاحب۔حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ۔حضرت بھائی طلحہ بن حضرت شیخ الحدیث۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ کشمیری صاحب۔حضرت مولانا ابوالقاسم بنارسی۔والشیخ محمد عوامہ ونجلہ الشیخ الدکتور محی الدین حفظہما اللہ تعالیٰ ورعاہما۔

بندۂ عاجز محمد الیاس بن افضل شیخ گھلا،سورت عفی عنہ
معین دار الافتاء دار العلوم زکریا،لینیشیا،جنوبی افریقہ
مؤرخہ:۱۶/شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ مطابق:۶/ جولائی ۲۰۱۲ء

باب......﴿۱﴾

طہارت سے متعلق متفرق مسائل

گندے، ناپاک پانی کو فلٹر کرنے کے بعد استعمال کرنے کا حکم:

سوال: آج کل کیمیکل کے ذریعہ گندے پانی کو فلٹر کر کے دوبارہ استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ اصل پانی سے بھی زیادہ صاف نظر آتا ہے۔فلٹر کرنے کے لیے گندے پانی کو درجِ ذیل چار مراحل سے گزارا جاتا ہے:

۱۔عمل ترسیب: اس عمل میں پانی کو ایک بڑے ٹینک میں جمع کر دیا جاتا ہے تا کہ ساری گندگی نیچے بیٹھ جائے۔۲۔اوپر کے صاف پانی کو چھان کر نکال لیا جاتا ہے۔

۳۔اس پانی میں موجود بیکٹر یا کو کیمیکل کے ذریعہ مار دیا جاتا ہے۔

۴۔کلورین کے ذریعہ بیکٹر یا کو دوبارہ پیدا ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔

ماہرین کے کہنے کے مطابق اِن مرحلوں کے بعد پانی کے رنگ، بو اور مزہ میں نجاست کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ایسا پانی شرعاً پاک سمجھا جائیگا اور اس عمل کو استحالہ کے عمل سے تعبیر کیا جائیگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسئلہ مذکورہ بالا کے بارے میں علمائے کرام کی دو جماعتیں ہیں:۱۔ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ فلٹر کے بعد پانی پاک ہو جاتا ہے اس لیے اس کا استعمال جائز اور درست ہوگا۔

یہ رائے اکثر عرب علماء کی ہے۔

۲۔ دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ پانی فلٹر کرنے کے بعد صاف تو ہو جاتا ہے لیکن پاک نہیں ہوتا۔ یہ دوسری رائے مزاجِ شریعت سے ہم آہنگ ہے اور ہمارے اکابرؒ کا فتویٰ بھی اسی پر ہے۔

ملاحظہ ہو نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

سوال کا ماحصل یہ ہے کہ؛ پیشاب کے اجزاء متعفنہ اور ضارہ کو ایک مشین سے کشید کر کے ختم کرنے کے بعد مثل پانی کر دیا، جس طرح سمندری پانی کو کھارے سے تبدیل کر کے میٹھا بنا لیتے ہیں؛ تو کیا یہ تقلیب ماہیت کے تحت آتا ہے یا نہیں؟

الجواب: اس کشید کا حاصل تو صرف یہ ہے کہ پیشاب کے اندر سے اس کے متعفن اور مضرت رساں اجزاء کو نکال دیا گیا، اور باقی جو اجزاء بچے وہ اسی پیشاب کے اجزاء ہیں، اور پیشاب بجمیع اجزاء نجس العین اور نجس بنجاستِ غلیظ ہے، اس لیے یہ باقی ماندہ اجزاء بھی نجس العین اور نجس بنجاستِ غلیظ ہی رہیں گے، اس میں تقلیبِ ماہیت کی کوئی صورت نہیں پائی گئی اس کو قلبِ ماہیت نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ تجزیہ اور تخرجہ ہوا، نہ کہ قلبِ ماہیت قلبِ ماہیت تو یہ ہے کہ سابق حقیقت معدوم ہو کر نئی حقیقت و نئی ماہیت بن جائے، نہ پہلی حقیقت و ماہیت باقی رہے نہ اس کا نام باقی رہے نہ اس کی صورت و کیفیت باقی رہے نہ اس کے خواص و آثار و امتیازات باقی رہیں، بلکہ سب چیزیں نئی ہو جائیں، نام بھی دوسرا، صورت بھی دوسری، آثار و خواص بھی دوسرے، اثرات و علامات اور امتیازات بھی دوسرے پیدا ہو جائیں، جیسے شراب سے سرکہ بنا لیا جائے۔ فقط واللہ اعلم۔ (نظام الفتاویٰ: ۱/۲۶، اسلامک فقہ اکیڈمی)۔

جدید فقہی مسائل میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب فرماتے ہیں:

پیشاب فلٹر کرنے کے بعد؛ ایک چیز ہے کسی شئی کی ماہیت و حقیقت کو تبدیل کر دینا اور دوسری اس کا تجزیہ کر گزرنا (decompose)، اگر کسی چیز کی حقیقت ہی یکسر بدل دی جائے تو اس کے احکام بھی بدل جائیں گے، اور اگر محض اس کے بعض اجزا کسی طرح الگ کر لیے جائیں تو اس کی وجہ سے اس کے احکام نہیں بدلیں گے۔ مثلاً پائخانہ جلا کر راکھ بنا دیا جائے تو اب وہ راکھ ناپاک شمار نہ ہوگی، شراب میں نمک ڈال کر سرکہ بنا دیا جائے تو اس کی حرمت اور ناپاکی ختم ہو جائے گی، لیکن اگر کسی طرح سائنٹفک طریقہ پر اس کے بعض اجزا نکال لیے جائیں جس سے بو ختم ہو جائے تو اس کے باوجود وہ ناپاک رہے گا۔

پیشاب فلٹر (filter) کرنے کی وجہ سے غالبًا اپنی حقیقت نہیں کھوتا بلکہ محض اس کے بدبودار اجزا نکال لیے جاتے ہیں، اس لیے وہ ناپاک ہی رہیں گے، ان کا پینا یا وضو وغسل وغیرہ کے لیے ان کا استعمال جائز نہ ہوگا اور وہ جسم کے جس حصے کو لگ جائے گا اسے ناپاک سمجھا جائیگا۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/۱۰۸، ط: کتب خانہ نعیمیہ)۔

آپ کے مسائل میں حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ فرماتے ہیں:

سوال: آج کل سائنس دانوں نے ایسا آلہ ایجاد کیا ہے کہ گندی نالیوں کے پانی کو صاف وشفاف بنا دیتے ہیں، بظاہر اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی، اب کیا یہ پانی پلید ہوگا یا نہیں؟ جواب: صاف ہوجائے گا پاک نہیں ہوگا، صاف اور پاک میں بڑا فرق ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/۱۰۰، مکتبہ لدھیانوی، طبع جدید)۔

مزید ملاحظہ ہو: (کتاب النوازل: ۳/۶۴، ط: مرکز علمی، واہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: ۸/۶۷، ط: اکل کوا، مہاراشٹر)۔

پاک نہ ہونے کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

شرح مختصر الطحاوی میں مرقوم ہے:

والدليل على تحريم استعمال الماء الذى فيه جزء من النجاسة وإن لم يتغير طعمه أو لونه أو رائحته ، قول الله تعالىٰ : ﴿ و يحرم عليهم الخبائث ﴾ والنجاسات من الخبائث ، لأنها محرمة . (شرح مختصر الطحاوى: ۱/۲۳۹، ط: دار البشائر السلامية).

محیط برہانی میں ہے:

اتفق أصحابنا أن الماء المستعمل ليس بطهور حتى لا يجوز التوضؤ به ، ولا يجوز غسل شيء من النجاسات به. (المحيط البرهانى: ۱/۱۲۹، ط: داراحياء التراث العربى). (وكذا فى الفتاوى الهندية: ۱/۲۲).

عرب علماء کے دلائل ملاحظہ فرمائیں:

فتاوى اللجنة الدائمة میں مرقوم ہے: **س: ماذا يقول العلماء الكرام فى الماء المستعمل فى المراحيض والحمامات ومع هذا الماء العذرة والبول ويروح هذا الماء إلى مكينة و يتغير الرائحة الكريهة من هذا الماء و يختلط مع هذا الماء بالأدوية ويختلط مع هذه الماء**

الطاهر و يرجع هذا الماء إلى المراحيض والحمامات ثانياً وإلى المطعم، هل يجوز استعمال هذا الماء فى الوضوء والاغتسال من جهة الشرع أم لا ؟

الجواب: والحمد لله وحده والصلاة والسلام على رسوله وآله وصحبه...وبعد لقد درس هذا الموضوع من قبل مجلس هيئة كبارالعلماء فى المملكة العربية السعودية و صدر فيه قرار هذا مضمونة : (اطلع المجلس على البحث المعد فى ذلك من قبل اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء كما اطلع المجلس على خطاب وبعد البحث والمداولة والمناقشة قررالمجلس ما يلي: بناء على ماذكره أهل العلم من الماء الكثير المتغير بنجاسة يطهر إذا زال تغيره بنفسه أو بإضافة ماء طهور إليه أو زال تغيره بطول مكث أو تأثير الشمس و مرور الرياح عليه أو نحو ذلك بزوال علته. وحيث إن المياه المتنجسة يمكن التخلص من نجاستها بعدة و سائل و حيث إن تنقيتها و تخليصها مما طرأ عليها من النجاسات بواسطة الطرق الفنية الحديثة لأعمال التنقية يعتبر من أحسن وسائل الترشيح والتطهير حيث يبذل الكثير من الأسباب المادية لتخليص هذه المياه من النجاسات كما يشهد ذلك ويقرره الخبراء المختصون بذلك ممن لايتطرق الشك إليهم في عملهم و خبرتهم وتجاربهم لذلك فإن المجلس يرى طهارتها بعد تنقيتها التنقية الكاملة بحيث تعود إلى خلقتها الأولى لا يرى فيها تغير بنجاسة في طعم ولا لون ولا ريح ويجوز استعمالها في إزالة الأحداث والأخباث وتحصل الطهارة بها منها كما يجوز شربها إلا إذا كانت هناك أضرار صحية تنشأ عن استعمالها فيمتنع ذلك محافظة على النفس وتفادياً للضرر لا لنجاستها. والمجلس إذ يقرر ذلك يستحسن الاستغناء عنها في استعمالها للشرب متى وجد إلى ذلك سبيل احتياطاً للصحة واتقاء للضرر وتنزهاً عما تستقذره النفوس وتنفرمنه الطباع . (فتاوى اللجنة الدائمة :۵/۷۹،۸۰،جمع وترتيب:الشيخ أحمد الدويش،رقم الفتویٰ :۲۴۶۸).

عربی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب گندے اورنجس پانی کومشینوں اورفلٹروں کے ذریعہ صاف کرلیا

جائے اوران میں نجاست کا کوئی اثر؛ رنگ، بو، مزہ وغیرہ باقی نہ رہے اورعمدہ صاف، شفاف ہوجائے تو پاک ہوجاتا ہے، بنابریں اس پانی سے طہارت حاصل کرنا نیز اس کو پینا بھی جائز ہے، البتہ طبی نقطہ نظر سے اگر یہ پانی مضراورضرررساں ہوتواس پانی کے پینے سے احتراز کرنا چاہیے۔

ہاں نجس پانی کو بہتے ہوئے پاک پانی میں ملادینے سے پاک ہوجاتا ہے جبکہ نجاست کا کوئی اثر؛ رنگ بو، مزہ وغیرہ باقی نہ رہے۔ ملاحظہ ہوفتاویٰ شامی میں ہے:

ثم المختار طهارة المتنجس بمجرد جريانه، و كذا البئر و حوض الحمام. أى يطهران من النجاسة بمجرد الجريان، وكذا ما في حكمه من العرف المتدارك. (الدر المختار مع ردالمحتار: ۱/۱۹۵،سعید).

ہدایہ میں ہے:

والماء الجاري إذا وقعت فيه نجاسة جازالوضوء منه إذا لم يرها أثر لأنها لا تستقر مع جريان الماء، والأثر: هو الرائحة أو الطعم أو اللون. (الهداية: ۱/۳۵،ط:شركة علمية).

کتاب النوازل میں ہے:

ناپاک پانی کی مشین کے ذریعہ صفائی موجبِ طہارت نہیں بن سکتی، لہٰذا ناپاک پانی جس طرح صاف کرنے سے پہلے ناپاک تھا، اسی طرح بعد میں بھی ناپاک رہے گا، اگروہ کپڑے یابدن پرلگ جائے توحسبِ قاعدہ اسے دھونا ضروری ہے۔ البتہ اگرنجس پانی کو پاک ماء جاری میں ملاکر بہادیا جائے اورنجاست کا کوئی اثر پانی میں ظاہر نہ ہوتو یہ سب پانی پاک ہوجاتا ہے۔ (کتاب النوازل:۳/۶۴،مرکزعلمی). واللہ ﷻ اعلم۔

نجس رنگ میں رنگے ہوئے کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ:

سوال: ایک آدمی نے کپڑوں کوسبز رنگ میں رنگ دیا، کپڑا سوکھ گیااوررنگ پکڑلیا، بعد میں معلوم ہوا کہ رنگ ناپاک تھا، اب کپڑے کا پختہ رنگ پکڑنے کے بعد کپڑے کی پاکی کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب: مسئلہ مذکورہ بالا کے بارے میں علماء کی تین آراء ہیں: (۱) تین مرتبہ دھونے سے کپڑا پاک

ہوجاتا ہے، چاہے رنگ چھوٹے یا نہ چھوٹے۔(۲) کپڑے کو اتنا دھویا جائے کہ صاف پانی ٹپکنے لگے یعنی پانی میں رنگ کا اثر باقی نہ رہے۔ یہ دوسری رائے راجح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔(۳) کپڑے سے صاف پانی ٹپکنے کے بعد تین مرتبہ دھویا جائے۔ دلائل ملاحظہ کیجیے:

قال في الفتاوى الخانية : إذا وقعت النجاسة في صبغ فإنه يصبغ به الثوب ثم يغسل ثلاثاً يطهر كالمرأة إذا اختضبت بحناء نجس . (فتاوى قاضيخان بهامش الفتاوى الهندية: ۱/۲۹).

محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: **قالوا : لو صبغ ثوبه أو يده بصبغ أوحناء نجسين فغسل إلى أن صفا الماء يطهر مع قيام اللون . وقيل: يغسل بعد ذلك ثلاثاً .** (فتح القدير: ۱/۲۰۹، ط:دار الفكر).

قال في رد المحتار: اعلم أنه ذكر في المنية أنه لو أدخل يده في الدهن النجس أو اختضبت المرأة بالحناء النجس أو صبغ بالصبغ النجس ثم غسل كل ثلاثاً طهر ثم ذكر عن المحيط أنه يطهر إن غسل الثوب حتى يصفو الماء ويسيل أبيض. وفي الخانية: إذا وقعت النجاسة في صبغ فإنه يصبغ به الثوب ثم يغسل ثلاثاً فيطهر كالمرأة إذا اختضبت بحناء نجس، وذكر مسألة الحناء في موضع آخر مطلقة أيضاً ثم قال: وينبغي أن لايطهر ما دام يخرج الماء ملوناً بلون الحناء فعلم أن اشتراط صفو الماء إما قول ثان كما يشعر به كلام المحيط أو هو تقييد لإطلاق القول الأول وبيان له كما يشعر به قول الخانية و ينبغي وعلى كل فكلام المحيط والخانية يشعر باختيار ذلك الشرط ولذا اقتصر على ذكره في الفتح ... وقد أطال في الحلية في تحقيق ذلك كما هو دأبه ثم جنح إلى البناء على الأول وقال: إنه الأشبه فليكن التعويل عليه في الفتوىٰ ، ولايخفى أنه ترجيح لما في المحيط والخانية والفتح . فكان على الشارح الجزم به إذ لم نر من رجح خلافه فافهم . (رد المحتار: ۱/۳۲۹، سعيد).

قال في حاشية الطحطاوي: فالثوب المصبوغ بمتنجس يطهر إذا صار الماء صافياً مع بقاء اللون وقيل يغسل بعده ثلاثاً . (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،ص ۱۶۰ ،قديمي).

ولـلاستـزادة ينظر: (البحر الرائق: ۱/۲۴۹، ماجديه، كوئٹه، والفتاوى الهندية: ۱/۴۲، وغنية المتملي في شرح منية المصلي، ص۱۷۳، وص۲۰۷، ط: سهيل، والنهر الفائق: ۱/۱۵۰، قديمي، والكفاية شرح الهداية بهامش فتح القدير: ۱/۱۸۴، رشيديه، والمحيط البرهاني: ۱/۲۲۰، رشيديه).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ یا کپڑا وغیرہ مہندی یا خضاب یا کسی اور ایسے رنگ نیل وغیرہ میں رنگ جائیں جو نجس ہو گیا تھا تو جب دھوتے دھوتے اس کا پانی صاف ہو جائے تو پاک ہو گیا اگر چہ ہاتھ یا کپڑے پر رنگ باقی ہو اور جب تک رنگ دار پانی آتا رہے پاک نہ ہوگا۔ (عمدۃ الفقہ: ۱/۲۶۹، ط: زوار اکیڈمی)۔

بہشتی زیور میں مرقوم ہے:

مسئلہ: نجس رنگ میں کپڑا رنگا تو اتنا دھووے کہ پانی صاف آنے لگے تو پاک ہو جاویگا چاہے کپڑے سے رنگ چھوٹے یا نہ چھوٹے۔ (بہشتی زیور، ص۱۲۵، ط: دارالاشاعت کراچی)۔

لیکن اگر رنگ کچا ہو اور نکلتا ہی رہتا ہو تو اس صورت میں صرف تین دفعہ دھونے سے کپڑا پاک ہو جائیگا۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

جب رنگ کچا ہے تو خوب پیٹ کر تین دفعہ دھویا جائے پھر بھی اس کا کچھ اثر رہے تو مضائقہ نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۲۵۰، ط: جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مشیمہ (جھلی) کی طہارت اور استعمال کا حکم:

سوال: مشیمہ یعنی وہ جھلی جس میں بچہ مادرِ رحم میں لپٹا ہوا ہوتا ہے اور بہ وقتِ ولادت بچہ کے ساتھ نکلتی ہے۔ کیا یہ نجس ہے یا نہیں؟ چاہے مذبوحہ کی ہو یا اسقاط کے بعد برآمد ہوئی ہو یا فطری طریقہ پر ولادت کے ذریعہ نکلی ہو۔ کیا مشیمہ کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟ کیا اس کا خارجی استعمال درست ہے، مثلاً: میک اَپ کا سامان، بدن پر ملنے والی کریم اور شیمپو وغیرہ؟ بینوا بالبرهان توجروا عند الرحمن۔

الجواب: احناف کے نزدیک گائے، بکری کی جھلی پاک اور حلال ہے، بنابریں اس کا داخلی اور خارجی

استعمال دونوں طرح جائز اور درست ہے۔ احناف کے نزدیک مذبوحہ شرعیہ مثلاً: بکری، گائے وغیرہ کے اعضاء اور اجزاء میں سے سات کے علاوہ سب کا کھانا جائز اور درست ہے۔ فقط سات اعضاء کا کھانا درست نہیں؛ وہ سات اعضاء یہ ہیں: دمِ مسفوح، شرمگاہ، خصیتین، غدود، مثانہ، پتہ اور آلہ تناسل۔ اور مشیمہ ان اعضاء میں سے نہیں ہے اس لیے اس کا داخلی استعمال جائز ہے۔ ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق میں روایت ہے:

عبد الرزاق، قال: أخبرنا الأوزاعي، عن واصل، عن مجاهد، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يكره من الشاة سبعاً: الدم، الحيا، والانثيين، والغدة، والذكر والمثانة، والمرارة، وكان يستحب من الشاة مقدمها. (مصنف عبد الرزاق: ۵۳۵/۴/۸۷۷۰، ط: المجلس العلمي افريقه).

قال في تنقيح الفتاوى الحامدية: والمكروه تحريماً من الشاة سبع الفرج والخصية والغدة والدم المسفوح والمرارة والمثانة وقد نظمها بعضهم بقوله:

إذا ما ذكيت شاة فكلها ، سوى سبع ففيهن الوبال

ففاء ثم خاء ثم غين ، و ذال ثم ميمان و دال .

أقول: وقد نظمتها بقولي إن الذي من الشاة يحرم يجمعه حروف فخذ مدغم. (تنقيح الفتاوىٰ الحامدية: ۳۶۷/۲، ط: دار الكتب العلمية بيروت).

نیز مشیمہ جسم کے ان اجزا میں سے ہے جن میں حیات حلول نہیں کرتی تو موت بھی اثر نہیں کرتی، بنابریں مشیمہ پاک ہے، اور اس کا خارجی استعمال جائز اور درست ہے۔ ہاں اگر مردار کی جھلی ہو تو پاک تو ہوگی لیکن جزء المیتۃ ہونے کی وجہ سے اس کا کھانا درست نہیں ہوگا۔

البحر الرائق میں ہے: والأصل أن كل ما لا تحله الحياة من أجزاء الهوية محكوم بطهارته بعد موت ما هي جزؤه: كالشعر والريش والمنقار والعظم والعصب والحافر والظلف واللبن والبيض الضعيف القشر. (البحر الرائق: ۱۱۲/۱، ط: دار المعرفة، بيروت).

قال في الدر المختار مع رد المحتار: كما ينتفع بما لا تحله الحياة منها، كعصبها

وصوفها، أدخلت الكاف عظمها وشعرها وريشها ومنقارها وظلفها وحافرها فإن هذه الأشياء طاهرة لا تحلها الحياة فلا يحلها الموت و يجوز بيع عظم الفيل والانتفاع به في الحمل والركوب والمقاتلة، منح ملخصاً. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۵/۷۳،سعيد).
(وكذا في فتح القدير: ۶/۴۲۷،دار الفكر).

وفي الفتاوى الهندية: البيضة إذا خرجت من دجاجة ميتة أكلت وكذا اللبن الخارج من ضرع الشاة الميتة كذا في السراجية. (الفتاوى الهندية: ۵/۳۳۹). **واللہ ﷻ اعلم۔**

واشنگ مشین میں کپڑوں کی دُھلائی کا حکم:

سوال: اگر بہت سارے کپڑے واشنگ مشین میں ایک ساتھ دھو لیے جائیں جن میں پاک و ناپاک مخلوط ہوں، تو کیا یہ سب کپڑے پاک ہو جائیں گے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: آج کل واشنگ مشین کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کپڑے اس میں بالکل صاف ستھرے اور پاک ہو جاتے ہیں؛ تفصیل اس کی یہ ہے کہ پہلے مرحلہ میں واشنگ مشین کپڑوں کو صابن لگا کر نجاست کو بھگا دیتی ہے، پھر دوسرے مرحلہ میں پانی سے اس کی دُھلائی کرتی ہے، پھر تیسرے مرحلہ میں صاف پانی سے کھنگال کر صاف کرتی ہے، پھر رَنز و اِسپِنز کے ذریعہ سے خوب صفائی کرتی ہے، اِن مذکورہ مراحل سے گزر کر کپڑے پاک ہو جاتے ہیں، اس میں تین مرتبہ سے زیادہ پانی بھی استعمال ہوتا ہے اور نچوڑنے کا کام بھی ہوتا ہے۔ کتبِ فقہیہ سے کپڑوں کی صفائی کے دلائل وشواہد ملاحظہ کیجیے:

قال في الهندية: ثوب نجس غسل في ثلاث جفان أو في واحدة ثلاثاً وعصر في كل مرة طهر لجريان العادة بالغسل هكذا فلولم يطهر لضاق على الناس. (الفتاوى الهندية: ۱/۴۲).

فتاویٰ تاتارخانیہ میں مرقوم ہے: **ويجب أن يعلم أن إزالة النجاسة واجبة وإن كانت مرئية بإزالة عينها وأثرها وإن كانت شيئاً يزول أثرها ولا يعتبر فيه العدد وإن كان شيئاً لا يزول أثرها فإزالتها بإزالة عينها ويكون ما بقي من الأثر عفواً وإن كان كثيراً...هذا إذا كانت**

النجاسة مرئية وإن كانت غير مرئية كالبول والخمر ذكر في الأصل وقال يغسلها ثلاث مرات ويعصر في كل مرة فقد شرط الغسل ثلاث مرات و شرط العصر في كل مرة . (الفتاوى التاتارخانية: ١/٣٠٦،ط:ادارة القرآن).

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح : ويطهر محل النجاسة غير المرئية بغسلها ثلاثاً وجوباً... والعصر كل مرة تقديراً لغلبة الظن في استخراجها في ظاهر الرواية وفي رواية يكتفي بالعصر مرة وهو أوفق و وضعه في الماء الجاري يغني عن التثليث والعصر كالإناء إذا وضعه فيه فامتلأ وخرج منه طهر إذا غسله في أوان فهي والمياه متفاوتة فالأولى تطهر وما تصيبه بالغسل ثلاثاً والثانية باثنتين والثالثة بواحدة . (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح ،ص ١٦١، باب الأنجاس ،ط: قديمي كتب خانه).

کتاب الفتاویٰ میں مذکور ہے: اگر کپڑوں میں نجاست لگ جائے اور وہ نظر آتی ہو تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نجاست اچھی طرح صاف ہو جائے اور نجاست نظر نہ آتی ہو اس میں ضروری ہے کہ اسے تین بار دھویا اور نچوڑا جائے ، تا کہ نجاست کے صاف ہونے کا اطمینان ہو جائے ، بعد کے فقہاء نے مطلقاً یہی فتویٰ دیا ہے کہ نجاست جیسی بھی ہو، کم سے کم کپڑے کو تین بار دھونا اور نچوڑنا چاہیے تا کہ نجاست کے نکل جانے اور کپڑے کے صاف ہو جانے کا اچھی طرح اطمینان ہو جائے...

اِس اصول کی روشنی میں واشنگ مشین میں کپڑے دھونے کے احکام اِس طرح ہوں گے:

(الف) اگر سارے کپڑے پاک تھے تو ظاہر ہے کہ وہ پاک ہی رہیں گے ، چاہے مشین میں اسے ایک بار گردش دی جائے یا کئی بار۔

(باء) اگر سارے کپڑے ناپاک تھے تو ضروری ہوگا کہ یا تو اسے تین پانی سے دھویا جائے یعنی ایک بار جب مشین کپڑے دھو کر پانی پھینک دے تو دوسری بار اور تیسری بار پھر پانی ڈالا جائے ، پہلی بار چونکہ میل کچیل کو بھی صاف کرنا مقصود ہوتا ہے اس لیے زیادہ دیر تک مشین چلائی جاتی ہے، دوسری اور تیسری بار چونکہ نچوڑ نا مقصود ہے اس لیے تھوڑی دیر چلا کر پانی کا اخراج ہو جائے یہ بھی کافی ہے ...۔ (کتاب الفتاویٰ: ۷/۳۴۳، ط: نعیمیہ دیوبند)۔

اہم مسائل جن میں ابتلاءعام ہے، میں مذکور ہے: مسئلہ: ناپاک کپڑوں کو واشنگ مشین میں اچھی طرح دھولیا جائے، پھر اِسپِنز مشین یعنی مشین کا وہ حصہ جس میں کپڑا ڈال کر گھمانے سے کپڑے اچھی طرح نچوڑ جاتے ہیں، اور کچھ حد تک خشک بھی ہوجاتے ہیں، ان کپڑوں کو ڈال دیا جائے اور اِسپِنز کے اوپر صاف پانی کا پائپ لگا کر اتنی دیر چلایا جائے کہ گندے پانی کی جگہ صاف پانی نیچے پائپ سے آنا شروع ہوجائے، تو یہ کپڑے پاک ہوجائیں گے، ہاتھ سے نچوڑنا ضروری نہیں ہے۔

والحجة على ما قلنا: ما في "الدرالمختار مع الشامية": أما لو غسل في غدير أو صب عليه ماء كثير، أوجرى عليه الماء طهر مطلقاً بلا شرط عصر وتجفيف وتكرار غمس، هو المختار. (۱/ ۵۴۲، كتاب الطهارة، باب الانجاس)، **ما في" الموسوعة الفقهية": ثم إن اشتراط الغسل والعصر ثلاثاً إنما هو إذا غمسه في إجانة ، أما إذا غمسه في ماء جار حتى جرى عليه الماء أو صب عليه ماء كثير، بحيث يخرج ما أصابه من الماء ويخلف غيره ثلاثاً ، فقد طهر مطلقاً بلا اشتراط عصر وتكرار غمس.** (الموسوعة: ۲۹/ ۹۹، طهارة، تطهير محل النجاسة، حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح: ص ۱۵۹، كتاب الطهارة، باب الانجاس والطهارة عنها، وفتاویٰ دارالعلوم دیوبند، رقم الفتویٰ ۴۷۸۸۶)، (اہم مسائل جن میں ابتلاءعام ہے، جلد ہفتم، ص ۳۱، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، مہاراشٹر)۔

مزید ملاحظہ ہو: (تبیین الحقائق: ۱/ ۷۵، امدادیہ، وفتاویٰ حقانیہ: ۲/ ۵۸۲، محقق ومدلل جدید مسائل، ص ۱۲۲)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

گھروں میں ٹنکی یا حوض کے پاک کرنے کا طریقہ:

سوال: آج کل عام شہروں میں گھروں کے اندر غسل خانوں وغیرہ میں پانی پہنچانے کے لیے پائپ سسٹم کا رواج ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ سرکاری پانی کو ایک جگہ ٹنکی یا حوض میں جمع کرکے ہینڈ پمپ کے ذریعہ گھر کے مختلف حصوں میں پہنچایا جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اگر ایسی ٹنکی ناپاک ہوجائے جو عام طور پر دہ در دہ سے بہت کم ہوتی ہے تو اس کے پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: اگر نیچے کا حوض یا اوپر کی ٹنکی میں نجاست ایسی

حالت میں گر جائے کہ اس کا پانی دونوں طرف سے جاری ہے مثلاً: سرکاری پانی ٹنکی میں آرہاہے اور دوسرے پائپ سے گھر کے مختلف حصوں میں جارہاہے تو اکثر فقہاء کے نزدیک یہ ٹنکی ماء جاری کے حکم میں ہونے کی وجہ سے ناپاک ہی نہیں ہوگی۔

اوراگر حوض یا ٹنکی دونوں طرف سے جاری نہ ہو، بلکہ دونوں یا کسی ایک طرف سے بند ہو تو پھر یہ حوض یا ٹنکی نجاست کے گرنے سے ناپاک ہوجائے گی، پھراس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جونجاست گری ہے اگر وہ ذی جرم، جسامت والی ہے تو پہلے اس کو نکال دیا جائے پھراس ٹنکی کو دونوں طرف سے جاری کردیا جائے تو دوسری طرف سے پانی نکلتے ہی یہ ٹنکی یا حوض پاک ہوجائیگا، البتہ بعض فقہاء کے نزدیک تین مرتبہ اور بعض کے نزدیک ایک مرتبہ ٹنکی میں پانی بھر کر نکال دیا جائے تو پاک ہوجائیگی، اس لیے ازراہِ احتیاط اس ٹنکی یا حوض میں ایک طرف پائپ سے اتنا پانی دوسری طرف نکالا جائے جتنا پانی ناپاک ہونے کے وقت اس میں موجود تھا۔

فقہاء کی عبارات ملاحظہ ہو؛ شرح منیہ میں مرقوم ہے:

عن فتاوی قاضي خان: فإن أدخل يده في الحوض وعليها نجاسة إن كان الماء ساكناً لا يدخل فيه شيء من انبوبه ولايغترف إنسان بالقصعة يتنجس ماء الحوض وإن كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ولا يدخل من الانبوب ماء أو على العكس اختلفوا فيه وأكثرهم على أنه يتنجس ماء الحوض وإن كان الناس يغترفون بقصاعهم ويدخل الماء من الانبوب اختلفوا فيه وأكثرهم على أنه لا يتنجس انتهى، فهذا هو الذى ينبغي أن يعتمد عليه.

(شرح منية المصلى، ص۱۰۲، سهيل اكيدمى).

وفيه أيضاً: فإن دخل الماء من جانب حوض صغير كان قد تنجس مائه وخرج من جانب قال أبوبكر بن سعيد الأعمش لا يطهر ما لم يخرج مثل ما كان فيه ثلث مرات فيكون ذلک غسلاً له كالقصعة حيث تغسل إذا تنجست ثلث مرات وقال غيره لايطهر ما لم يخرج مثل ما كان فيه مرة واحدة وقال أبوجعفر الهندواني يطهر بمجرد الدخول من جانب والخروج من جانب وإن لم يخرج مثل ما كان في الحوض وهو اختيار الصدرالشهيد

حسام الدين لأنه حينئذٍ يصير جارياً والجارى لا يتنجس ما لم يتغير بالنجاسة والكلام في غير المتغير . (شرح منية المصلي، ص ۱۰۱،ط: سهيل).

(ماخوذ از خیرالکلام فی حوض الحمام،آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام،ازمفتی محمد شفیع صاحبؒ از ص۱۹۵ تا ص۱۹۸،ط: کتب خانہ قاسمی)۔

اسلامی فقہ میں ہے: ٹنکی کی صفائی ؛ عام طور پرٹنکی اس طرح بنائی جاتی ہے کہ اوپر کے پمپ سے پانی آتا ہےاور نیچے کے پمپ سےنلوں میں جاتا ہے،اگر ایسی صورت ہےتو یہ جاری پانی کےحکم میں ہےاس میں نجاست یا کوئی جانور گرنے سےٹنکی کا پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ **إذا كان الحوض صغيراً يدخل فيه الماء من جانب و يخرج من جانب جاز الوضوء فيه من جميع جوانبه**. (فتاویٰ هنديه: ۱/ ۹)، اوراگر دونوں طرف سے یا کسی ایک طرف سے بند ہوتو ناپاک سمجھا جائے گا،اب اگراس حوض میں جتنا پانی تھااس کے بعد پائپ وغیرہ کے ذریعہ نکال دیا جائےتواس کو پاک سمجھا جائے گا،اس کے متعلق ایک بات یادرہنی چاہیے کہ اگر یہ نجاست محسوس جسامت رکھتی ہومثلاً چوہا، بلی ،مینگنی وغیرہ تو پہلے اس کونکال دیناضروری ہے، ہینڈ پائپ اورنل کا بھی یہی حکم ہے۔(اسلامی فقہ:۱/۱۶۲،ط: پروگریسوبکس،لاہور)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

کانوں کی صفائی کاحکم:

سوال: شریعت میں کپڑوں کی صفائی اور بالوں کی صفائی کاحکم ہے،کیا کانوں کی صفائی کے بارے میں کسی روایت میں کچھ مذکور ہے یانہیں؟ بینوابالدلیل۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں کپڑوں اور بالوں کی صفائی کے ساتھ کانوں کامیل،کچیل دورکرنے اور صفائی کرنے کاحکم ہے،شراحِ حدیث نے احادیث کی شروحات میں یہ بات لکھی ہے۔

ملاحظہ ہو: علامہ بدرالدین عینیؒ ابوداودشریف کی شرح میں فرماتے ہیں:

وغسل البراجم تنظيف المواضع التي تجتمع فيها الوسخ ويلحق بذلك ما يجتمع من الوسخ في معاطف الأذن . (شرح أبي داود: ۱/ ۱۶۵،مكتبة الرشد رياض).

امام نوویؒ شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:

قال العلماء: ویلحق بالبراجم مایجتمع من الوسخ في معاطف الأذن وهو الصماخ فیزیله بالمسح لأنه ربما أضرت کثرته بالسمع وکذلک ما یجتمع في داخل الأنف وکذلک جمیع الوسخ المجتمع علی أی موضع کان من البدن بالعرق والغبار ونحوهما، والله أعلم. (شرح صحیح مسلم: ۳/۱۵۰، ط: داراحیاء التراث العربی، بیروت).

فقہاء نے بھی کانوں کی صفائی کے بارے میں لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مذکور ہے:

قال بعض العلماء: ویلتحق بالبراجم ما یجتمع من الوسخ في معاطف الأذن وقعر الصماخ فیزیله بالمسح وکذلک جمیع الأوساخ. (البحر الرائق: ۱/۵۰، ط: دارالمعرفة).

مزید ملاحظہ ہو: (فتح الباری: ۱۰/۳۳۸، ط: دارنشر الکتب الاسلامیة، لاهور، وفیض القدیر: ۴/۳۱۶، ط: دارالفکر، ودلیل الفالحین: ۶/۲۶۵، ط: بیروت، ومرقاة المفاتیح، باب السواک: ۱/۳۹۸، ط: بیروت).

الدر المنضود میں ہے: انگلیوں کے جوڑ اور گرہیں اس کی خصوصیت اس لیے ہے کہ یہاں پر شکن ہونے کی وجہ سے میل جم جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا تعاہد اور خبر گیری رکھنی چاہیے، علماء نے لکھا ہے کہ جسم کے وہ تمام مواضع جہاں پسینہ اور میل جمع ہو جاتا ہے وہ سب اسی حکم میں ہیں جیسے اصول فخذین وابطین، کانوں کا اندرونی حصہ اور سوراخ وغیرہ۔ نیز یہ ایک مستقل سنت ہے وضو کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ (الدر المنضود: ۱/۱۶۹، ط: مکتبہ خلیلیہ، سہارنپور)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بلانیت وضو کرنے سے ثواب کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے وضو کیا لیکن وضو کی نیت نہیں کی تو اس کو وضو کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

الجواب: احناف کے نزدیک وضو میں نیت کرنا سنت ہے، وضو کی نیت سے وضو کیا جائے گا تو ثواب ملے گا ورنہ نہیں۔ ملاحظہ ہو امداد الفتاح میں ہے:

فإنها سنة لأنه صلی الله علیه وسلم لم یعلم الأعرابی النیة، حین علمه الوضوء مع جهله ولو کانت فرضاً لعلمه، ولقوله تعالیٰ ﴿ یأیها الذین آمنوا إذا قمتم إلی الصلاة فاغسلوا

وجوهكم وأيديكم﴾ أمر بالغسل والمسح مطلقاً عن شرط النية فلا يجوز تقييد المطلق إلا بدليل وقوله عليه السلام: إنما الأعمال بالنيات ولكل امرئ ما نوى، قلنا بموجبه لكمال المامورية أى ثواب العمل بحسب النية فالمنتفى ترتب الثواب على الفعل المجرد عن النية لعدم كون الوضوء ونحوه قربة إذا لم ينو. (إمداد الفتاح ،ص ۷۹،ط:بيروت).

غمز عيون البصائر شرح الأشباه والنظائر میں ہے:

أقول: فيه أنه ذكره في خزانة المفتين نقلاً أن الوضوء الغير المنوى مثاب عليه، وعند المتأخرين غير مثاب عليه، والصحيح قول المتأخرين كما فى البحر للمصنف فعلى هذا قوله هنا للإجماع أى إجماع المتأخرين، لا الإجماع مطلقاً . (غمزعيون البصائر: ۱/ ۲۶،ادارة القرآن).

آپ کے مسائل اوران کا حل میں مرقوم ہے:

نیت کرنا وضو میں فرض نہیں ہے اگر منہ، ہاتھ پاؤں دھولیے جائیں اور سر کا مسح کرلیا جائے کہ یہی چار چیزیں وضو میں فرض ہیں تو وضو ہو جاتا ہے، البتہ وضو کا ثواب تب ملے گا جب وضو کی نیت بھی کی ہو۔(آپ کے مسائل اوران کا حل:۳/ ۶۵،طبع جدید)۔

مزید ملاحظہ ہو: (الہدایۃ :۱/ ۲۰، ط:المصباح، والجوہرۃ النیرۃ :۱/ ۷، ط:امدادیہ، ملتان، وحاشیۃ الطحاوی مع مراقی الفلاح، ۷۳، ط:قدیمی کتب خانہ، وفیض الباری:۱/ ۶، وبدائع الصنائع:۱/ ۲۰، سعید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

جانور کی ہڈیوں سے بنا ہوا فلٹر استعمال کرنے کا حکم:

سوال: مختلف جانوروں کی ہڈیوں سے پانی فلٹر کرنے کا برتن بناتے ہیں، بعض کمپنیوں کا یہی طریقہ کار ہے، کیا اس برتن میں پانی رکھنا یا اس سے پینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: انسان اور خنزیر کے استثناء کے ساتھ تمام جانوروں کی ہڈیاں پاک ہیں، اوران سے بنائے ہوئے فلٹر کا استعمال بھی جائز اور درست ہے، وجہ یہ ہے کہ اگر جانور مذبوح ہے تو ان کا پاک ہونا ظاہر ہے اور اگر مردار ہے تو ہڈیوں میں حیات نہ ہونے کی وجہ سے موت حلول نہیں کرتی۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں مذکور ہے:

وشعر الميتة وعظمها طاهر. (الهداية: ۱/۴۱،ط:المصباح). **وفيه أيضاً: ولا بأس ببيع عظام الميتة وعصبها وصوفها وقرنها وشعرها ووبرها والانتفاع بذلك كله لأنها طاهرة لايحلها الموت لعدم الحياة.** (الهداية:۳/۵۵،ط:شركة علمية).

وفي البحر الرائق: وفي التجنيس: لا بأس ببيع عظام الموتى لأنه لا يحل العظام الموت وليس في العظام دم تتنجس فيجوز بيعها إلا بيع عظام الآدمي والخنزير، وفي المحيط: إن عظم الميتة إذا كان عليه دسومة ووقع في الماء نجسه. (البحرالرائق: ۱/۱۱۳).

و للاستزادة راجع: (الفتاوى الهندية: ۱/۲۴، والدرالمختار: ۱/۲۰۶،ط: سعيد، وبدائع الصنائع: ۵/۱۴۲، سعيد).

ہاں اگر مردار جانور کی ہڈی پر کچھ گوشت یا چکناہٹ ہو تو وہ ناپاک ہے پانی میں گر جائے تو پانی ناپاک ہوجائے گا۔ ملاحظہ ہو المحیط البرہانی میں مرقوم ہے:

فالحاصل: إن عظم ما سوى الخنزير والآدمي من الحيوانات، إذا كان الحيوان ذكاة أنه طاهر سواء كان العظم رطباً أو يابساً، وأما إذا كان الحيوان ميتاً، فإن كان عظمه رطباً فهو نجس، وإن كان يابساً فهو طاهر، لأن اليبس في العظم بمنزلة الدباغ من حيث أنه يقع الأمن في العظم باليبس عن الفساد كما يقع الأمن في الجلد بالدباغ، فكذا العظم باليبس، وأما عظم الخنزير فنجس. (المحيط البرهاني: ۲/۲۷،مكتبه رشيديه كوئٹه).

امدادالفتاویٰ میں ہے: مردار جانوروں کی کھال سوائے آدمی وخنزیر کے دباغت سے پاک ہوجاتی ہے اور ہڈی اور پیٹھ اور سینگ اور بال اور اون سب پاک ہیں، انتفاع ان سے جائز ہے اور چربی مردار کی ناپاک ہے اس کا کسی طرح استعمال نہ چاہیے۔ بحوالہ ہدایہ وعالمگیری۔ (امدادالفتاویٰ:۱/۱۰۹،ط: دارالعلوم کراچی)۔

مزید ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی: ۱۲/۵۱۲،ط: جامعہ فاروقیہ، واحسن الفتاویٰ: ۸/۱۲۸،ط:سعید، وفتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱/۲۷۳،ط: دارالاشاعت، وقاموس الفقہ: ۴/۳۹۹،ط: زمزم، وکتاب المسائل: ۱/۱۱۲،ط: نعیمیہ دیوبند)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سولر گیزر سے گرم شدہ پانی استعمال کرنے کا حکم:

سوال: آج کل پانی گرم کرنے کے لیے سولر گیزر کا استعمال عام ہوگیا ہے، یہ گیزر بجلی کی بجائے دھوپ سے پانی کو گرم کرتا ہے، تو کیا اس کا استعمال درست ہے یا نہیں؟ جبکہ حدیث شریف میں دھوپ کے تپے ہوئے پانی کے استعمال کی ممانعت وارد ہوئی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: پانی گرم کرنے کی جدید شکل سولر گیزر سے گرم شدہ پانی کا استعمال جائز اور درست ہے، اور اکثر محدثین کے نزدیک ممانعت میں وارد شدہ حدیث ضعیف ہے، یا خلافِ اولیٰ کے قبیل سے ہے، مکروہِ تحریمی یا حرمت اس سے مستفاد نہیں۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ کیجیے:

قال في الموسوعة الفقهية : الماء المسخن بتأثير الشمس فيه (المشمس)؛ يطلق الفقهاء على الماء المسخن بتأثير الشمس فيه اسم الماء المشمس، وقد اختلفوا في حكم استعماله على قولين: القول الأول: جواز استعماله مطلقاً من غير كراهة ، سواء أ كان هذا الاستعمال في البدن أم في الثوب، وبهذا قال الحنابلة وجمهور الحنفية وهو قول لبعض فقهاء المالكية والشافعية كالنووي والروياني .

القول الثاني: كراهة استعماله: وذهب إليه المالكية في المعتمد عندهم والشافعية في المذهب وبعض الحنفية . يقول الخطيب الشربيني: ويكره تنزيهاً الماء المشمس أي ماسخنته الشمس، أي يكره استعماله في البدن في الطهارة وغيرها كأكل وشرب ، لماروى الشافعي عن عمر رضي الله عنه أنه: كان يكره الاغتسال بالماء المشمس، وقال: يورث البرص .

لكن بشرط أن يكون ببلاد حارة أي تقلبه الشمس عن حالته إلى حالة أخرى، كما نقله في البحر عن الأصحاب في آنية منطبعة غير النقدين وهي كل ما طرق كالنحاس و نحوه ، وأن يستعمل في حال حرارته ، لأن الشمس بحدتها تفصل منه زهومة تعلو الماء ، فاذا لاقت البدن بسخونتها خيف أن تقبض عليه فيحتبس الدم فيحصل البرص ...وهذه

الکراهة طبية لا شرعية . (الموسوعة : ۳۶۴/۳۹،ط:وزارة الاوقاف ، الکویت).

وفي رد المحتار: أقول: وقدمنا في مندوبات الوضوء عن الإمداد أن منها أن لايكون بماء مشمس وبه صرح فی الحلية مستدلاً بما صح عن عمر رضی اللہ عنہ من النهى عنه ولذا صرح فی الفتح بكراهته ومثله فی البحر، وقال فی معراج الدراية وفی القنية وتكره الطهارة بالمشمس لقوله لعائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها حين سخنت الماء بالشمس لا تفعلی ياحميراء فإنه يورث البرص وعن عمر رضی اللہ عنہ مثله في رواية لا يكره وبه قال أحمد ومالك والشافعي يكره إن قصد تشميسه وفی الغاية وكره بالشمس في قطر حار في أوان منطبعة واعتبار القصد ضعيف وعدمه غيرمؤثر، ما فی المعراج : فقد علمت أن المعتمد الكراهة عندنا لصحة الأثر وأن عدمها رواية والظاهر أنها تنزيهية عندنا أيضاً بدليل عدة فی المندوبات فلا فرق حينئذٍ بين مذهبنا ومذهب الشافعی فاغتنم هذا التحرير. (فتاوی الشامی: ۱۸۰/۱،سعید).

وفي حاشية الطحطاوي: ومن الأدب أنه لا يتوضأ بماء مشمس لأنه يورث البرص. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح ،ص۷۸،ط:قدیمی).

ممانعت میں واردشدہ حدیث کی تحقیق ملاحظہ کیجیے:(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث:

قال ابن الملقن فی "البدرالمنير"(۴۲۱/۱): عن عائشة رضی اللّٰه عنها ، أن النبی صلى اللّٰه عليه وسلم ، نهانا عن التشميس ، وقال: إنه يورث البرص، هذا الحديث واهٍ جداً وله أربع طرق :

أولها : عن خالد بن إسماعيل المخزومي، عن هشام بن عروة ، عن أبيه ، عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها، قالت: دخل علي رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، وقد سخنت ماء في الشمس، فقال: لا تفعلي ياحميراء ، فإنه يورث البرص، رواه الدارقطني، والبيهقی في سننهما، وابن عدى في كامله ، وأبونعيم في كتاب الطب، بأسانيد هم إلى خالد به ، قال

الدارقطني: خالد هذا متروك .

قلت: هو كما قال، فقد ضعفه الأئمة ، قال ابن عدي: يضع الحديث على ثقات المسلمين ، وقال أبوحاتم بن حبان: لا يجوز الاحتجاج به بحال، وقال الأزدى: كذاب ، يحدث عن الثقات بالكذب. لا جرم أن البيهقى لما ذكره في سننه قال: هذا حديث لايصح.

وثانيها: عن عمرو بن محمد ، عن فليح ،عن الزهرى ، عن عروة ، عن عائشة ،قالت: نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، أن يتوضأ بالماء المشمس، أو يغتسل به، وقال: إنه يورث البرص. رواه الدارقطني في سننه ، ثم قال: عمرو بن محمد الأعسم منكر الحديث ، و لم يروه عن فليح غيره ، ولا يصح عن الزهري. وقال أبوحاتم بن حبان: عمروهذا يروى عن الثقات المناكير، ويضع أسامى المحدثين، لا يجوز الاحتجاج به بحال .

وثالثها: عن وهب بن وهب ، عن هشام بن عروة ، عن أبيه ، عن عائشةؓ ...رواه ابن عدى، وقال: وهب أشر من خالد بن إسماعيل. قلت: بلا شك ، وهو وهب بن وهب بن كبير؛ وهو من رؤساء الكذابين ، قال أحمد: كان يضع الحديث. وقال أبوبكر بن عياش، وابن المدينى، والرازى: كان كذاباً ...

ورابعها: عن الهيثم بن عدى، عن هشام بن عروة ، عن أبيه ، عن عائشةؓ ...رواه الدارقطنى. والهيثم هذا: هو أبوعبد الرحمن الطائى، أحد الهلكى، قال يحيى: كان يكذب، ليس بثقة. وقال علي: لا أرضاه في شيء . وقال السعدى: ساقط ، قد كشف قناعه . وقال أبوداود: كذاب. وقال النسائي ، والرازى، والأزدى: متروك الحديث...قلت: ولحديث عائشةؓ طريق خامس ... ولا يصح ...الخ .

(۲) **حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث:** یہ حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: من اغتسل بماء مشمس فأصابه وضح ، فلا يلومن إلا نفسه. هذا الحديث غريب جداً ، ليس فى السنن الأربعة قطعاً

حاشا الصحيحين منه، وليس هو في السنن الكبير، والمعرفة للبيهقي، ولا في سنن الدارقطني، وعلله، ولا في المسانيد، فيما فحصت عنه عدة سنين فوق العشرة ،وسؤالى لبعض الحفاظ بمصر، والقدس، ودمشق عنه ، فلم يعرفوه . إلا أني ظفرت به في مشيخة قاضى المرستان، في أواخر الجزء الخامس منها ، وقد أخبرنا بها: المسند أبوعبد الله ، محمد بن أحمد بن خالد الفاروقي، أنا العز الحراني سماعاً ، والنجيب إجازة ، أخبرنا ابن الخريف ، ضياء الدين بن أبى القاسم ، سماعاً ، أنا القاضي أبوبكر محمد بن عبد الباقى البزاز، المعروف بقاضى المرستان، أنا أبوالحسن على بن جامع النيسابورى ، أنا أبوبكر بن عبد ربه ، أنا أبومسلم فارس بن المظفر بن غالب ، أنا أبوعمرمحمد بن عمرو بن أحمد المقرئ...حديث واهٍ ، عمر بن صبح كذا ب ، اعترف بالوضع ، والضحاك: لم يلق ابن عباس رضي الله عنه وابن المجدر: صدوق لكنه ناصبى منحرف عن الحق . (البدرالمنير : ۱/۴۲۷،الرياض).

(۳) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر:

وذكر الإمام الرافعى فيه من الآثار: أثر عمر بن الخطاب رضي الله عنه: أنه كره الماء المشمس وقال: إنه يورث البرص وهذا الأثر روى من طريقين: أحدهما: من رواية جابر رضي الله عنه عنه ، كذلک رواه الإمام الشافعي فى الأم ، عن إبراهيم بن محمد ، عن صدقة بن عبد الله ، عن أبى الزبير، عن جابر، عنه به ...وهذه الطريقة معلولة من وجهين ...فتلخص: أن هذا الأثر ضعيف ، للعلتين المذكورتين ...

الطريق الثانى: من رواية حسان بن أزهر، عنه ، أنه قال: لا تغتسلوا بالماء المشمس، فإنه يورث البرص، رواه الدارقطني، عن سهل بن زياد ، ثنا إبراهيم الحربي، ثنا داود بن رشيد ، ثنا إسماعيل بن عياش، قال: حدثني صفوان بن عمرو، عن حسان به. وهذا إسناد جيد ، وإسماعيل بن عياش: فيه مقال، تقدم فى الكلام على حديث هوالطهور ماء ه ، وقد قال البخاري في حقه : إذا روى عن أهل حمص يكون حديثه صحيحاً...ولم ينفرد

إسماعيل به، بل توبع عليه . (البدرالمنير: ۱/۴۴۴، الرياض).

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر اسماعیل بن عیاش کے طریق سے ٹھیک ہے، لیکن کراہتِ تنزیہی اور خلافِ اولیٰ پر محمول ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

آئل پینٹ دیوار پر تیمّم کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی دیوار پر آئل پینٹ کیا گیا ہو تو اس پر تیمّم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: تیمّم ہر اس چیز پر جائز ہے جو زمین کی جنس سے ہو اور جلانے سے نہ جلے اور پگھلانے سے نہ پگھلے، اور آئل پینٹ زمین کی جنس سے نہیں ہے اور پگھلانے سے پگھل جاتا ہے، نیز دیوار پر آئل پینٹ کی تہہ بن جاتی ہے جو اصل دیوار پر ہاتھ پہنچنے سے مانع ہوتی ہے، بایں وجہ آئل پینٹ والی دیوار پر تیمّم جائز اور درست نہیں۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

بمطهر من جنس الأرض وإن لم يكن عليه نقع أى غبار...فلا يجوز لؤلؤ ولو مسحوقاً لتولده من حيوان البحر ولا بمرجان لشبهه بالنبات لكونه أشجاراً نابتة في قعر البحر...ولا بمنطبع كفضة وزجاج ومترمد بالاحتراق إلا رماد الحجر فيجوز كحجر مدقوق أو مغسول وحائط مطين أو مجصص و أوان من طين غير مدهونة...وفى الشامية: قوله غير مدهونة أو مدهونة بصبغ هو من جنس الأرض كما يستفاد من البحر كالمدهونة بالطفل والمغرة . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۱/۲۴۰، سعيد).

(وكذا فى البحرالرائق: ۱/۱۴۷، ط: كوئٹه، والفتاوى الهندية: ۱/۲۷).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

لیکن ان پر ایسی چیز کا رنگ ہو جو زمین کی جنس سے نہیں ہے تو جائز نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ چینی کے برتنوں سے تیمّم جائز نہیں اس لیے کہ ان پر کانچ کا روغن ہوتا ہے، ہاں اگر جنس زمین سے روغن ہو جیسے گیرو سے تو جائز ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۱/۲۳۹، ط: زوار اکیڈمی)۔

آپ کے مسائل میں ہے: سوال: آئل پینٹ لگی ہوئی خشک دیوار پر تیمّم ہوجاتا ہے؟ جواب: جائز نہیں۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل:۳/۱۲۹،ط:طبع جدید)۔

فتاویٰ قاسمیہ میں ہے:

جس دیوار کو پینٹ سے رنگ دیا گیا ہے، اس دیوار پر تیمّم کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ پینٹ رنگ ہے مٹی کی جنس سے نہیں؛ البتہ جس دیوار کو چونے یا سموسم سے رنگ دیا گیا ہے، اس پر تیمّم درست ہے، اس لیے کہ چونا اور سموسم بھی مٹی کی جنس سے ہوتا ہے۔

وكذا بالخزف الخالص إلا إذا كان مخلوطاً بما ليس من جنس الأرض أو كان عليه صبغ ليس من جنس الأرض . (البحر الرائق ، باب التيمم ، ١/١٤٨)، (فتاویٰ قاسمیہ:۵/۱۶۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بوقتِ جماع قبلہ رو ہونے کا حکم:

سوال: بیوی سے جماع کے وقت استقبالِ قبلہ اور استدبار کا کیا حکم ہے؟

الجواب: عام طور پر اردو فتاویٰ میں کراہت والا قول منقول ہے، مگر علامہ طحطاویؒ نے فرمایا ہے کہ بوقتِ جماع استقبالِ قبلہ میں کوئی کراہت نہیں ہے، ہاں خلافِ اولیٰ کے قبیل سے ہے۔ لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب حدثِ اصغر پیشاب اور قضائے حاجت میں استقبالِ قبلہ ممنوع ہے تو حدثِ اکبر جو موجبِ غسل ہے اس میں بطریق اولیٰ ممنوع ہونا چاہیے۔ ملاحظہ ہو حاشیۃ الطحطاوی میں رقمطراز ہیں:

قوله حال قضاء الحاجة ، خرج حال الجماع لما نقله ابن أمير حاج عن النووي في شرح مسلم يجوز الجماع مستقبل القبلة فى الصحراء ، والبنيان هذا مذهبنا، ومذهب أبي حنيفةؒ، وأحمدؒ وداودؒ، واختلف فيه أصحاب مالكؒ فجوزه ابن القاسم، وكرهه ابن حبيب والصواب الجواز فإن التحريم إنما يثبت بالشرع ، ولم يرد فيه نهى، والأولى أن يقال: إنه خلاف الأولىٰ . (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح ،ص ٥٢ ،فصل فيمايجوزبه الاستنجاء ،ط:قديمى).

اردو فتاویٰ کی عبارات ملاحظہ کیجئے: فتاویٰ رحیمیہ میں ہے: بوقتِ صحبت قبلہ کی طرف رخ نہ کرے

بحوالہ غنیۃ الطالبین۔ (فتاویٰ رحیمیہ:۴/ ۲۸۷، ط:الاحسان، دیوبند)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے: قبلہ کی طرف پیر کر کے بیوی سے صحبت کرنا بھی مکروہ ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۸/ ۶۲۹، جامعہ فاروقیہ)۔

فتاویٰ حقانیہ میں مذکور ہے: من آداب الجماع: قبلہ رخ نہ ہو۔ بحوالہ الفقہ الاسلامی وادلتہ۔ (۴/ ۴۳۷)۔

جامع الفتاویٰ میں ہے:

قبلہ کی طرف پیر کر کے بیوی سے صحبت کرنا بھی مکروہ ہے۔ (جامع الفتاویٰ:۳/ ۲۳۳)۔

عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل اوران کاحل میں مرقوم ہے: بوقتِ صحبت قبلہ کی طرف رخ نہ کرے۔ بحوالہ غنیۃ الطالبین۔ (۲/ ۴۶۷، ط:الطاف)۔

حلال وحرام میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب لکھتے ہیں: جماع اس طرح نہ ہو کہ قبلہ کے استقبال کی نوبت ہو، چنانچہ عمرو بن حزم اور عطاء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے؛ **لايستقبل القبلة حال الجماع.** "**المغنی لابن قدامة الحنبلی**"۔ (۸/ ۱۳۶، ط:بیروت)۔ (حلال وحرام، ص ۲۷۷، ط:نعیمیہ)۔

عباراتِ بالا سے معلوم ہوا کہ اردو فتاویٰ کا مرجع یا تو شافعی فقہ ہے یا حنبلی۔ لیکن مغنی المحتاج جو کہ فقہ شافعی میں ہے اس میں اس کے خلاف مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو: **ولا يحرم ولا يكره استقبال القبلة ولا استدبارها حال الاستنجاء أو الجماع أو إخراج الريح إذ النهى عن استقبالها واستدبارها مقيد بحالة البول والغائط وذلک منتف فى الثلاثة .** (مغنى المحتاج الى معرفة معانى الفاظ المنهاج للشيخ محمد الخطيب الشربينى: ۱/ ۱۵۶،ط:دارالكتب العلمية،بيروت).

امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے: **يجوز الجماع مستقبل القبلة فى الصحراء والبنيان ...الخ.** (شرح مسلم:۳/ ۱۵۶، باب الاستطابة،ط: بيروت،وكذا فى المجموع شرح المهذب: ۲/ ۸۰، ط:دارالفكر، وروضة الطالبين: ۱/ ۶۶، المكتبة الاسلامى،بيروت).

مالکیہ کے یہاں بھی مکان میں استقبالِ قبلہ مکروہ نہیں ہاں صحراء یا چھت پر مکروہ ہے۔ ملاحظہ ہو مواہب الجلیل میں ہے: **وإن كان في برية أوعلى سطح فلا يجامع مستقبل القبلة ولا مستدبرها وإن كان في بيت فيختلف فيه بالجواز والكراهة والمشهور الجواز ،انتهى.** (۱/ ۴۰۶، ط: دارعالم الكتب).

موسوعۃ الفقہیہ میں بوقتِ جماع رو بہ قبلہ نہ ہونے کو مستحب قرار دیا ہے بیت اللہ کے اکرام میں۔

قال: يستحب الانحراف عن القبلة، فلا يستقبلها بالوقاع إكراماً لها. (الموسوعة الفقهية الكويتية: ۱٦/۴۴، ط: الكويت). واللہ تعالیٰ اعلم۔

رحم دانی نکالنے کے بعد آنے والے خون کا حکم:

سوال: اگر کسی عورت کی بچہ دانی نکال دی گئی ہو اور کچھ دِنوں کے بعد اس کو خون کے داغ نظر آتے ہوں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ یعنی حیض شمار ہوگا یا نہیں؟

الجواب: عورت کو مخصوص ایام میں رحم دانی سے آنے والے خون کو حیض کہا جاتا ہے لیکن جب رحم دانی نکال دی گئی تو حیض شمار نہیں ہوگا، بلکہ استحاضہ ہے۔ ملاحظہ ہو ملتقی الابحر میں ہے:

هو دم ينفضه رحم امرأة بالغة لا داء بها. (ملتقى الأبحر، ص ۴۲، ط: دار البيروتي).

مجمع الانہر میں ہے: **واحترز بقيد الرحم عن الرعاف والدماء الخارجة عن الجراحات ودم الاستحاضة فإنها دم عرق لا دم رحم.** (مجمع الانهر: ۱/۷۷، ط: بيروت). (وكذا في تبيين الحقائق: ۱/۵۴، ط: امداديه، ملتان). واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسجد میں داخل ہونے کے لیے وضو کا حکم:

سوال: کیا مسجد میں داخل ہونے کے لیے باوضو ہونا فرض ہے یا واجب؟

الجواب: مسجد میں داخل ہونے کے لیے باوضو ہونا نہ فرض ہے نہ واجب بلکہ مستحب ہے، ہاں اگر کوئی مسلمان جنابت کی حالت میں ہو تو اس کے لیے غسل کرنا واجب ہے بلا غسل مسجد میں داخل ہونا ممنوع اور ناجائز ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

دخول المسجد للمحدث فإنه يحل بدون الطهارة من الحدث الأصغر. (فتاوى الشامي: ۱/۲۴۳، سعيد).

بدائع الصنائع میں مرقوم ہے: **ولا یباح للجنب دخول المسجد** . (بدائع الصنائع: ۱/ ۳۸،سعید). (وکذا فی النتف فی الفتاویٰ،ص ۳۱،ط:بیروت).

قاموس الفقہ میں ہے: جن صورتوں میں وضوکرنا مستحب ہے ....مسجد میں داخل ہونے کی غرض سے ۔ (قاموس الفقہ :۵/ ۲۸۷،ط: زمزم)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بالوں پرایک خاص قسم کا موادلگانے سے وضواورغسل کا حکم:

سوال: آج کل بالوں کوٹھیک کرنے کے لیےایک خاص قسم کا موادا ستعمال کیا جاتا ہے، جو بالوں کو جما دیتاہے جس کو انگریزی میں (Brasil Cacau Keratin) کہاجاتا ہے،اورعام طور پر یہ تین مہینے تک باقی رہتاہے،اس کےازالہ کا کوئی آسان طریقہ نہیں،اب جولوگ استعمال کرتے ہیں ان کی طہارت، وضو،غسل اورنماز وغیرہ کی صحت کا کیا مسئلہ ہوگا؟ کیااس کا استعمال جائز ہوگا یانہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگراس موادکی پلاسٹر کی طرح تہہ بن جاتی ہےتومشہورقول کےموافق جمہور علماء کےنزدیک مانع وضووغسل ہےلہٰذااس کوزائل کیے بغیر وضواورغسل درست نہیں ہوگا،جس کی وجہ سےنماز بھی درست نہیں ہوگی، ہاں بعض علماء کےنزدیک اس کےازالہ میں حرج ہوتو وضواورغسل ہوجائے گا،اس کاحکم ناخن پالش کی طرح ہے،لیکن اگر پلاسٹر کی طرح تہہ نہیں بنتی بلکہ مہندی کےرنگ کی طرح ہےتو پھرکسی کےنزدیک اس کا ازالہ ضروری نہیں۔تاہم ایسی مشکوک چیزوں کےاستعمال کرنے سےاجتناب کرنا چاہیے۔

ملاحظہ ہودرمختار میں ہے:

ولا يمنع ما على ظفر صباغ ولا طعام بين أسنانه أو في سنه المجوف به يفتى. وقيل: إن صلبا منع وهو الأصح . وفي رد المحتار: قوله وإن صلبا ، أى إن كان ممضوغاً مضغاً متأكداً بحيث تداخلت أجزاؤه وصار له لزوجة وعلاكة كالعجين شرح المنية ، قوله وهو الأصح صرح به في شرح المنية وقال: لامتناع نفوذ الماء مع عدم الضرورة والحرج .

(الدرالمختارمع ردالمحتار: ۱/ ۱۵۴،سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

والدرن اليابس فی الأنف يمنع تمام الغسل كذا فی الزاهدی ، والعجين فی الظفر يمنع تمام الاغتسال والوسخ والدرن لا يمنع...والتراب والطين فی الظفر لا يمنع والصرام والصباغ ما في ظفرهما يمنع تمام الاغتسال وقيل كل ذلك يجزيهم للحرج والضرورة ومواضع الضرورة مستثناة عن قواعد الشرع كذا فی الظهيرية . (الفتاوى الهندية : ۱/۱۳).

قال فی البحر: ولو لصق بأصل ظفره طين يابس وبقي قدر رأس إبرة من موضع الغسل لم يجز . (البحر الرائق: ۱/۱۴،ط:دارالمعرفة،وفتح القدير: ۱/۱٦،دارالفكر).

احسن الفتاویٰ میں ہے:

جو چیز بدن تک پانی پہنچنے سے مانع ہواس کی موجودگی میں وضواور غسل صحیح نہیں ہوتا اگر بال برابر بھی جگہ خشک رہ گئی تو وضواور غسل نہ ہوگا، حضراتِ فقہاءؒ نے گوندھے ہوئے خشک آٹے کوصحتِ وضو سے مانع قرار دیا ہے حالانکہ وہ ناخن پالش جتنا سخت نہیں اوراس کی ضرورت بھی ہے تو ناخن پالش کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے، جتنی بھی نمازیں ناخن پالش لگا کر پڑھی ہیں وہ واجب الاعادہ ہیں اور ساتھ ساتھ توبہ واستغفار بھی کرے۔(احسن الفتاویٰ: ۲/۲٦،ط:سعید)۔

جدید فقہی مسائل میں ہے:

واقعی ضرورت کے بغیر ایسی چیز لگالینا جو پانی کوجسم تک پہنچنے نہ دے وضو کے درست ہونے میں رکاوٹ ہے۔وضواسی وقت صحیح ہوگا جب اس کو کھرچ دیا جائے...اس قسم کے پینٹ جوخواتین لگایا کرتی ہیں ضرورت نہیں ہیں، محض زینت ہیں۔اس لیے وضوکرتے وقت ضروری ہوگا کہ ان کو کھرچ کرتہہ تک پانی پہنچایا جائے۔جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے: **أو لزق بأصل ظفره طين يابس أو رطب لم يجز .**

(جدید فقہی مسائل:۱/۸۷،ط:نعیمیہ)۔ مزید ملاحظہ ہو: (کتاب المسائل:۱/۱۷۷،ط:کتب خانہ نعیمیہ)۔

بعض علماء کے نزدیک ازالہ میں حرج ہوتو مانع نہیں ہے۔ملاحظہ ہو: فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

موجودہ دور کے نامور علماء ناخون پالش کے عدمِ جواز کے قائل ہیں، کیونکہ ناخون پالش سے ناخن کا جسم

مستور ہو کر وضو اور غسل میں اس کو پانی پہنچنا ممکن نہیں رہتا، اس لیے گوندھے ہوئے آٹے کی طرح مانع وضو اور غسل ہے، لیکن بعض دوسرے علماء کے نزدیک ناخن پالش اگر عورت کی زینت مان لی جائے تو پھر ایسی صورت میں اگر ازالہ میں دشواری نہ ہو تو وضو اور غسل کے لیے ازالہ ضروری ہوگا اور اگر ازالہ میں حرج ہو لیکن اس کی تہہ نہ بنی ہو تو پھر اس کا حکم مہندی کی طرح ہوگا اور تہہ بن جانے کی صورت میں اس کے ازالہ میں حرج ہو تو موجبِ حرج ہونے کی وجہ سے پانی کا ایصال ضروری نہیں۔ (فتاویٰ حقانیہ: ۲/۵۰۱)۔

فتاویٰ فریدیہ میں مرقوم ہے:

اگر ناخن پالش چاقو وغیرہ آلات کے بغیر زائل نہیں ہوتا ہے تو پھر حرج کی وجہ سے وضو اور غسل سے مانع نہ ہوگا، دوسری جگہ مذکور ہے: احتیاط ازالہ میں ہے البتہ بقا کی صورت میں بھی گنجائش ہے۔ (فتاویٰ فریدیہ: ۲/۵۲و۵۴)۔

فتاویٰ دار العلوم کراچی میں بدرجہ مجبوری وضو اور غسل کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ناخن پالش ایک سیال مادہ ہے جو ناخنوں پر لگانے کے بعد جم جاتا ہے اور پانی کے پہنچنے سے مانع ہوتا ہے لہٰذا وضو اور غسل میں اس کا چھڑانا ضروری ہے اس کی موجودگی میں وضو اور غسل نہیں ہوگا، آج کل ایسا کیمیکل بھی مارکیٹ میں دستیاب ہے، جس سے ناخن پالش آسانی سے صاف ہو جاتا ہے، البتہ اگر ایسا کیمیکل بھی اس وقت موجود نہ ہو جس سے ناخن پالش صاف ہو سکتا ہو اور کوشش کے باوجود وہ رنگ نہ اتر رہا ہو اور دوسری طرف نماز کے فوت ہونے کا بھی خطرہ ہو اور فی الحال اُتارنا ممکن نہ ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں ناخن پالش کے باوجود مجبوری کی وجہ سے وضو اور غسل ہو جائے گا۔ (فتاویٰ دار العلوم کراچی: ۱/۵۱۹)۔

لیکن اکثر علمائے کرام کے نزدیک مانع وضو و غسل ہے، لہٰذا محتاط قول پر عمل کرنا چاہیے، تاکہ عبادت کا اہم فریضہ بالیقین ذمہ سے فارغ ہو۔ **قال العلامة السرخسيؒ في المبسوط: وفي العبادات يؤخذ بالاحتياط.** (۱/۲۵۴، ط: دار الفكر، و۳۰/۱۹۴).

وللاستزادة انظر: الفتاوى الهندية ۱/۱۲۴، والبحر الرائق: ۱/۳۲، دار المعرفة، واللباب في شرح الكتاب: ۱/۲۹، ط: دار الكتاب العربي، وفتاوى الشامي: ۲/۳۶۲، سعيد، وحاشية الطحطاوي على مراقي

الفلاح، ۱۵۲، ط؛مصر، والعناية شرح الهداية).

حضرت مفتی سعید احمد پالنپوری صاحبؒ رقمطراز ہیں:

امام اعظمؒ کا مزاج یہ ہے کہ وہ عبادات کے باب میں اُس نص پر مسئلہ کا مدار رکھتے ہیں جس میں احتیاط ہوتی ہے اور یہاں احتیاط یہ ہے کہ جمہور کی رائے کے مطابق عمل کیا جائے۔ (تحفۃ الالمعی: ۱/۴۴۰، ط: زمزم، بتغییر یسیر)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ناپاک اجزا ملائے ہوئے شیمپو کے استعمال کا حکم:

سوال: آج کل بالوں کے دھونے کی مختلف اشیاء تیار ہو رہی ہیں، جیسے شیمپو، کریم، صابن وغیرہ، بعض مرتبہ ان میں غیر مذبوحہ جانور یا خنزیر کے اجزاء بھی شامل ہوتے ہیں، تو کیا سر یا کپڑے دھونے میں اس کا استعمال درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مزاجِ شریعت یہ ہے کہ اس قسم کی مشکوک چیزوں کے استعمال سے احتراز کیا جائے، لیکن اگر کوئی دوسری چیز دستیاب نہ ہو اور اس کے استعمال کی ضرورت ہو تو پھر حکم یہ ہے کہ ناپاک اشیاء کی حقیقت اور ماہیت بدل جانے سے اس کا سابق حکم باقی نہیں رہتا، حقیقت تبدیل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلا مصداق و مفہوم بالکل بدل جائے یا اس کی مخصوص صفات باقی نہ رہیں، تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ شیمپو، صابن اور کریم وغیرہ میں ناپاک اجزاء اپنی حقیقت کھو دیتے ہیں بنابریں ان کے استعمال کی اجازت ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں مرقوم ہے:

لأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة وتنتفي الحقيقة بانتفاء بعض أجزاء مفهومها فكيف بالكل فإن الملح غير العظم واللحم فإذا صار ملحاً ترتب حكم الملح ونظيره في الشرع النطفة نجسة وتصير علقة وهي نجسة وتصير مضغة فتطهر و العصير طاهر فيصير خمراً فينجس ويصير خلاً فيطهر فعرفنا أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها وعلى قول محمد فرعوا الحكم بطهارة صابون صنع من زيت

نجس . (فتح القدير: ١/٢٠١،ط:دارالفكر). (وكذا مجمع الانهر: ١/٩١ ،ط: دارالكتب العلمية ،وفتاوى الشامي: ١/٣٢٧، سعيد، وبداية المجتهد: ١/٣٤٩).

البحرالرائق میں ہے:

انقلاب العين ، فإن كان في الخمر فلا خلاف في الطهارة ، وإن كان في غيره كالخنزير والميتة تقع في المملحة فتصير ملحاً يؤكل والسرقين والعذرة تحترق فتصير رماداً تطهر عند محمد خلافاً لأبي يوسف ؒ وضم إلى محمد ؒ أباحنيفة ؒ في المحيط وكثير من المشايخ اختاروا قول محمد ؒ وفي الخلاصة وعليه الفتوىٰ . (البحرالرائق: ١/٢٢٧،كوئٹه).

بحوث فی قضایافقہیۃ معاصرہ میں مرقوم ہے:

الخمائر والجلاتين من الخنزير: إن كان العنصر المستخلص من الخنزير تستحيل ماهيته بعملة كيمياوية ، بحيث تنقلب حقيقته تماماً ، زالت حرمته ونجاسته وإن لم تنقلب حقيقته بقي على حرمته ونجاسته ، لأن انقلاب الحقيقة مؤثر في زوال الطهارة والحرمة عند الحنفية . (بحوث في قضايافقهية معاصرة : ١/٣٤١،ط:دارالعلوم كراچی).

کفایت المفتی میں مذکور ہے:

واضح ہو کہ انقلابِ حقیقت سے مراد یہ ہے کہ وہ شئی فی نفسہا اپنی حقیقت چھوڑ کر کسی دوسری حقیقت میں متبدل ہو جائے جیسے شراب سرکہ ہو جائے یا خون مشک بن جائے یا نطفہ گوشت کا لوتھڑا وغیرہ وغیرہ کہ ان صورتوں میں شراب نے فی نفسہا اپنی حقیقت خمریہ اور خون نے اپنی حقیقتِ دمویہ اور نطفہ نے اپنی حقیقتِ منویہ چھوڑ دی اور دوسری حقیقتوں میں متبدل ہو گئے حقیقت بدل جانے کا حکم اسی وقت دیا جا سکتا ہے کہ حقیقتِ اولیٰ منقلبہ کے آثارِ مختصہ اس میں باقی نہ رہیں جیسا کہ امثلہ مذکورہ میں پایا جاتا ہے کہ سرکہ بن جانے کے بعد شراب کے آثارِ مختصہ بالکل زائل ہو جاتے ہیں۔ بعض آثار کا زائل ہو جانا یا بوجہ قلت آثار کا محسوس نہ ہونا موجبِ انقلاب نہیں...الخ۔ (کفایت المفتی:۲/۳۳۳،ط:دارالاشاعت)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:٦/٦٠٠،زمزم،وجدید فقہی مسائل:١/١١٥،نعیمیہ)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

اسکول کے غیر مسلم بچوں کو مسجد میں سیر کرانے کا حکم:

سوال: دعوت وتبلیغ کے لیے اسکول کے غیر مسلم بچوں کو مسجد میں سیر کرانا جائز ہے یا نہیں؟ نیز مردوں اورعورتوں کو لانا جن میں غیر مسلم حائضہ عورتیں بھی ہوں تو جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بہتر اور افضل یہ ہے کہ مسجد کے صحن میں مسجد کی حدود سے باہر انتظام کیا جائے اور وہاں دعوت پیش کی جائے۔لیکن اگر مسجد میں لانا ضروری ہو تو غیر مسلم مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں جب تک کسی ظاہری ناپا کی کا علم نہ ہو نیز دوسری کوئی مضرت ،مفسدہ اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، پھر مردوں اور عورتوں کے درمیان پردے کا انتظام کیا جائے ۔اسی طرح غیر مسلم جنبی مرد اور غیر مسلم حائضہ عورت سب مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں جب تک کہ جسم کسی ظاہری نجاست سے ملوث نہ ہو۔ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

ولا بأس أن يدخل الكافر وأهل الذمة المسجد الحرام وبيت المقدس وسائر المساجد لمصالح وغيرها من المهمات. (البحر الرائق : ۵/ ۲۷۱،ط:دارالکتاب الإسلامی). (وكذا فی الدر المختار : ۳۷۸/۴،سعید).

فتاویٰ الشامی میں ہے: **قوله وجاز دخول الذمي مسجداً ، ولو جنباً كما في الأشباه .** (فتاوی الشامی: ۳۸۷/۶،سعید).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

مضائقہ نہیں، مسجد میں ہندو،عیسائی اور دیگر غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع نہیں، جامع مسجد میں سیر وتفریح کے لیے روزانہ غیر مسلم داخل ہوتے ہیں تو ایک صحیح غرض اتحاد وقیامِ امن کے لیے داخل ہونے میں کیا مضائقہ ہے۔ (کفایت المفتی :۳۷۶/۱۰،ط: جامعہ فاروقیہ)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ڈھکن دار بیت الخلا میں دعا پڑھنے کی قرآن وحدیث سے دلیل:

سوال: ایک عالمِ دین نے یہ مسئلہ بیان کیا کہ اگر کرسی والے بیت الخلا کا ڈھکن بند ہو تو اس میں وضو

کے اذکار پڑھ سکتے ہیں، اس پر ایک طالبِ علم نے ان سے سوال کیا کہ قرآن وحدیث میں اس کی دلیل ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں تلاش کر کے بتاؤں گا، اگر قرآن وحدیث اور فقہ میں اس کی کوئی دلیل ہو تو تحریر کریں؟

الجواب: قرآن سے دلیل ملاحظہ ہو: جب حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تھے تو انہوں نے اپنی نجات کے لیے دعا کی تھی۔ یہ دعا قرآن میں مذکور ہے: **وذا النون إذ ذهب مغاضباً فظن أن لن نقدر عليه فنادى في الظلمات أن لا إله إلا أنت سبحانك إني كنت من الظالمين﴾** [الانبیاء:۸۷]، اور مچھلی کے پیٹ میں غلاظت ہوتی ہے اس کے قریب ذکر کو جاری رکھا، اس سے معلوم ہوا کہ یونس علیہ السلام نے گندگی کے قریب دعا کی لیکن چونکہ گندگی چھپی ہوئی تھی اس لیے دعا کرنا صحیح تھا۔

حدیث شریف سے دلیل ملاحظہ کیجئے:

(۱) عن عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنها أنها حدثت : أن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم كان يتكئ في حجري وأنا حائض ثم يقرأ القرآن. (صحیح البخاری: ۱/ ۴۴،فیصل، ومسلم: ۱/۱۴۳، باب قراءة الرجل فی حجر امرأته وهي حائض،فیصل).

و في عمدة القاري : و غرض البخاری الدلالة على جواز القراءة بقرب موضع النجاسة . (عمدة القاری :۵/۳۷۴،باب قراءة الرجل فی حجر امرأته وهی حائض).

فیض الباری میں ہے:

إنه يكره قراءة القرآن عند الجنازة قبل الغسل وحوالی النجاسة ، وليس هكذا فی الحائض، فإن نجاستها مستور تحت الثياب . (فیض الباری : ۱/۳۷۶،ط:القاهرة).

(۲) عن عائشة رضي اللّٰہ تعالیٰ عنها، قالت: اعتكف مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم امرأة من أزواجه فكانت ترى الدم والصفرة و الطست تحتها و هي تصلي. (صحیح البخاری: ۱/۲۷۳، باب اعتكاف المستحاضة،ط:قدیمی کتب خانه).

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں مستحاضہ عورت کا مسجد میں اعتکاف کرنا ثابت ہے، یہاں مستحاضہ کی نجاست تھی لیکن چھپی ہوئی تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر نہیں

فرمائی۔اوراعتکاف کی حالت میں ذکرواذکارمقصود ہوتے ہیں۔

کتبِ فقہ سے دلائل ملاحظہ ہو:

(۱) و البداء ة بالتسمية قولاً ، و تحصل بكل ذكر ، لكن الوارد عنه عليه الصلاة والسلام ، باسم الله العظيم ، والحمد لله على دين الإسلام قبل الاستنجاء وبعده ، إلا حال انكشاف وفي محل نجاسة فيسمي بقلبه . (الدر المختار: ۱/۱۰۸، كتاب الطهارة،سعيد).

(۲) مطلب سنن الغسل قوله وسننه... كسنن الوضوء أى من البداء ة بالنية والتسمية والسواك والتخليل والدلك والولاء...قال الشرنبلالي: ويستحب أن لا يتكلم بكلام مطلقاً أما كلام الناس فلكراهته حال الكشف وأما الدعاء فلأنه في مصب المستعمل ومحل الأقذار والأوحال، أقول: قد عد التسمية من سنن الغسل فيشكل على ما ذكره ، تأمل...

أقول: أو المراد الكراهة حال الكشف فقط كما أفاده التعليل السابق والظاهر من حاله عليه الصلاة والسلام أنه لايغتسل بلا ساتر ، قوله مع كشف عورة ، فلو كان متزراً فلا بأس به كما في شرح المنية والإمداد . (فتاوى الشامي: ۱/۱۵٦،سعيد).

مذکورہ عبارات سے معلوم ہوا کہ سترکھولنے سے پہلے تسمیہ پڑھنا چاہیے سترکھولنے کے بعدمکروہ ہے اسی طرح محل نجاست ظاہر ہوتو تسمیہ مکروہ ہےلیکن نجاست اورگندگی چھپی ہوئی ہوتو کراہت نہیں ہے۔

تحفۃ الالمعی میں مفتی سعید پالنپوریؒ صاحب لکھتے ہیں:

اگرکوئی شخص باہردعاپڑھنا بھول جائے اوراندرجانے کے بعد یادآئے تواگر بیت الخلاصاف ستھرا ہے جیسےفلش، جہاں بالفعل گندگی نہیں ہوتی تو وہ جنگل کےحکم میں ہےسترکھولنے سے پہلے دعاپڑھ سکتاہےاور بعدکی دعاباہرنکل کر پڑھنی چاہیے، کیونکہ استنجاء کے بعد بیت الخلا میں گندگی ہو یاصاف نہ ہونے کی وجہ سے بد بو ہوتو دعا دل میں پڑھے،زبان سے نہ پڑھے کیونکہ گندگی کےقریب اللہ کا ذکرکرنا مکروہ ہے۔(تحفۃ الالمعی:۱/۲۰۲،دیوبند)۔

لیکن علامہ شامیؒ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ مصب الماءالمستعمل اورمحل الاقذار ہے، بنابریں جب بیت الخلا کھلا ہواہوتو ذکرودعا اندرنہیں پڑھنا چاہیے۔

(۳) فقہانے لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ کے اوپر کا حصہ پاک ہو اور نیچے کا حصہ ناپاک ہو تو اس پر نماز پڑھنا یا دعا کرنا درست ہے۔

قال في البحر: و لو صلى على ماله بطانة متنجسة وهوقائم على مايلي موضع النجاسة من الطهارة عن محمد يجوز وعن أبي يوسف لايجوز وقيل: جواب محمد في غير المضرب فيكون حكمه حكم ثوبين وجواب أبي يوسف في المضرب فحكمه حكم ثوب واحد فلا خلاف بينهما...لو بسط الثوب الطاهر على الأرض النجسة وصلى عليه جاز .

(البحرالرائق: ۱/۲۸۲،دارالمعرفة). (وكذا في فتح القدير: ۱/۱۹۲،دارالفكر).

کتاب المسائل میں ہے:

اگر ناپاک تر یا خشک زمین پر ایسا موٹا کپڑا یا چٹائی یا پلاسٹک بچھا کر نماز پڑھیں جس سے نجاست اوپر معلوم نہ ہو تو نماز درست ہو جائے گی۔ **و لو كان رقيقاً وبسطه على موضع نجس إن صلح ساتراً للعورة تجوز الصلاة .** (شامی)،(کتاب المسائل:۱/۲۶۷)۔ مزید ملاحظہ ہو: (کتاب الفتاویٰ:۲/۴۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

خفین کی زِپ (zip) کھلی رہ جانے پر مسح کا حکم:

سوال: اگر خفین یعنی چمڑے کے موزوں کی زپ کھلی رہ گئی تو مسح ٹوٹ گیا یا نہیں؟ کیا وضو دہرانا پڑے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر کعبین کے اوپر زپ کھل گئی تو کوئی حرج نہیں اور اگر نیچے کھل گئی اور چلتے وقت تین انگلیوں کی مقدار پیر نظر آتا ہو تو مسح ٹوٹ جائے گا۔ملاحظہ ہو شرح منیۃ المصلی میں ہے:

وكذا الحكم لو انفتق خرزه أى خرز الخف إلا أنه أى الشأن لا يرى شيء من قدمه يجوز المسح لما قلنا ، ولوكان الشيء من قدمه والمراد به المقدار المقدر بحيث يبدو أى يظهر حالة المشي أى حالة رفع القدم ولكن لا يبدوحالة الوضع يمنع جواز المسح لأن المعتبر حال المشي كذا ذكره في المحيط ولوكان الأمر بالعكس لا يمنع وكذا الخرق

الكبير إذا كان فوق الكعب لا يمنع لأن ستر الخف لما فوق الكعب ليس بشرط لجواز المسح . (شرح منية المصلى ، ص ۱۱۴ ،ط:سهيل اكيڈمی).

بہشتی زیور میں مرقوم ہے:

اگر موزے کی سیون کھل گئی لیکن اس میں سے پیر نہیں دکھائی دیتا تو مسح درست ہے، اور اگر ایسا ہو کہ چلتے وقت تین انگلیوں کے برابر پیر دکھائی دیتا ہے، یوں نہیں دکھائی دیتا تو مسح درست نہیں ۔ (بہشتی زیور، حصہ اول، ص ۹۳، دارالاشاعت)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دوموزے ایک ساتھ پہننے پر مسح کا حکم:

سوال: اگر کسی آدمی نے دوموزے ایک ساتھ ایک دوسرے کے اوپر پہنے ہوں تو اوپر والے پر مسح کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر اوپر والے پر مسح کیا پھر اتار دیا تو نیچے والے پر دوبارہ مسح کرنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ مسح کے لیے اوپر والے موزے کا اعتبار ہوگا، اگر اوپر والے موزے کو اتار دیا تو نیچے والے پر دوبارہ مسح کرنا لازم ہوگا۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

ثم إنما يجوز المسح على الجرموقين عندنا إذا لبسهما على الخفين قبل أن يحدث فإن أحدث ثم لبس الجرموقين لا يجوز المسح عليهما سواء مسح على الخفين أولا ... و لو مسح على الجرموقين ثم نزع أحدهما مسح على الخف البادى وأعاد المسح على الجرموق الباقي في ظاهر الرواية . (بدائع الصنائع : ۱/۱۱، سعيد).

(وكذا فى الفتاوى الهندية : ۱/۳۲،وردالمحتار : ۱/۲۷۰،سعيد،والمحيط البرهانى : ۱/۱۲/۲۱۱).

ایضاح المسائل میں ہے:

اگر کوئی شخص چمڑے کے دوموزے ایک ساتھ پہن لے تو اوپر والے موزے کا اعتبار ہوگا، لہٰذا اگر اوپر والے پر مسح کر لیا ہے اس کے بعد اس کو اتار دیتا ہے تو مسح ختم ہو جائیگا، نیچے والے پر دوبارہ مسح کرنا لازم ہوگا۔ (ایضاح المسائل، ص ۲۰، ط: نعیمیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ولادت سے پہلے آنے والے خون کا حکم:

سوال: ایک عورت حاملہ تھی اس نے صبح کے وقت ولادت سے پہلے خون دیکھا، اس کے بعد خون نظر نہیں آیا پھر رات کو ولادت ہوئی، اس درمیان اس نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء نہیں پڑھی، تو کیا ان نمازوں کا چھوڑنا اس کے لیے صحیح تھا اور ان کی قضا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: حاملہ عورت کو حیض نہیں آتا، کیونکہ حمل کی وجہ سے رحم دانی کا منہ بند ہوجاتا ہے اور ولادت کے بعد آنے والے خون کو نفاس کہا جاتا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں ولادت سے پہلے آنے والا خون استحاضہ ہے یہ مانعِ صلاۃ نہیں، لہٰذا اس کے لیے نمازوں کا چھوڑنا صحیح نہیں تھا، اب نفاس سے پاک ہونے کے بعد ظہر، عصر اور مغرب کی قضا ضروری ہے ہاں عشاء کی قضا نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو سنن دارمی میں روایت ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، قالت: إن الحبلى لا تحيض، فإذا رأت الدم، فليغتسل، ولتصلي. قال المحقق: الشيخ حسين سليم أسد: إسناده حسن من أجل سليمان بن موسى. (سنن الدارمي: ۱/۶۶۳، ط: دار المغني).

وفيه أيضاً: عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، قالت: في الحامل ترى الدم، قالت: لا يمنعها ذلك من صلاة. (سنن الدارمي: ۱/۶۶۰، ط: دار المغني).

امام سرخسیؒ کی مبسوط میں مرقوم ہے:

ومن الدماء الفاسدة ما تراه الحامل فقد ثبت لنا أن الحامل لا تحيض، وذلک مروي عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، وعرف أنها إذا حبلت انسد فم رحمها فالدم المرئي ليس من الرحم فيكون فاسداً. (المبسوط: ۳/۱۴۹، ط: دار المعرفة، بيروت). (وكذا في الهداية: ۱/۶۹، المصباح، والمحيط البرهاني: ۱/۲۱۱، بيروت، والاختيار لتعليل المختار: ۱/۲۷، بيروت، وملتقى الابحر: ۱/۴۵، دار البيروتي، وتبيين الحقائق: ۱/۶۷، القاهرة).

پروفیسر ڈاکٹر نجیب الحق صاحب علم تشریح الابدان میں لکھتے ہیں:

اگرفرٹیلائزیشن ہوجاتی ہےتو جنین کچھ خاص مادوں کےمخصوص مہیجی پیغامات جاری کرتا ہےجس کی وجہ سے ماں کو ماہواری آنا بند ہوجاتی ہے، یہی عموماً حمل کی پہلی علامت ہوتی ہے۔(علم تشریح الابدان،ص۵۲)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

ایک پیر پر پٹی ہونے پردوسرے پیر پرمسح کاحکم:

سوال: اگرکسی شخص نے اپنے ایک پیر پر پٹی باندھی ہوتو دوسرے پیر پرموزہ پہن کرمسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ جبیرہ اور پٹی پرمسح دھونے کےحکم میں ہےلیکن خف اورموزے پرمسح دھونے کےحکم میں نہیں ہے بلکہ دھونے کا بدل ہے، بنابریں غسل اورمسح دونوں کوجمع نہیں کرسکتے ہیں،لہٰذاایک پیر کی پٹی پرمسح اوردوسرے پیر کےموزے پرمسح کرنا درست نہیں ہے، بلکہ دوسرے موزے کونکال کر پیر دھونا ضروری ہے ہاں اگر پٹی پرمسح کر کےموزہ پہن لیاتو پھر دونوں موزوں پرمسح درست ہے۔

ملاحظہ ہوالمحیط البرہانی میں ہے:

قال محمد في الزيادات: رجل بإحدى رجليه جراحة لا يستطيع غسلها ، ولكن يستطيع أن يمسح على الخرق التي عليها ، فإنه يتوضأ ويمسح على الخرق التي عليها و يغسل الرجل الصحيحة ، فإن توضأ وغسل الرجل الصحيحة ولبس الخف عليها ومسح على الخرقة التي على الرجل الأخرى إلا أنه لم يستطع أن يلبس الخف عليها ثم أحدث و توضأ لا يجوز له المسح على الخف الذي لبسه على الرجل الصحيحة ؛ لأنه لو مسح على الخف مسح على الجبيرة ، والمسح على الجبيرة بمنزلة غسل ما تحتها ، فيجتمع له البدل والمبدل في وظيفة واحدة ، وذلك لا يجوز ...

وإن كان حين غسل الرجل الصحيحة ومسح لبس الخفين ثم أحدث جاز المسح على الخفين على الجبائر بمنزلة غسل ما تحتها، فصار كأنه لبس الخفين بعد غسل الرجلين

وهناک يجوز المسح ؛ لأنه لو مسح مسح على الخفين ، فلا يؤدى إلى الجمع بين البدل والمبدل في وظيفة واحدة . (المحيط البرهاني : ۱/۱۸۱،الفصل السادس فى المسح على الخفين).

العنایہ شرح الہدایہ میں مذکور ہے:

لو مسح على جبيرة إحدى الرجلين لايجوز المسح على الخف الرجل الأخرى لئلا يكون جامعاً بين الغسل حكماً وبين المسح . (العناية شرح الهداية: ۱/۱۵۹،ط: دارالفكر).

(وكذا فى البناية شرح الهداية: ۱/۲۱۸، ومجمع الانهر فى شرح ملتقى الابحر: ۱/۵۰، وحاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح ،ص۱۲۹، والفتاوى الهندية : ۱/۳۵، وفتاوى الشامى: ۱/۲۶۰،سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

موزے کو اسپرے کے ذریعہ واٹر پروف بنا کر مسح کرنے کا حکم:

سوال: مجھے یہ مسئلہ معلوم ہے کہ خفین پر مسح کے لیے تین شرائط ہیں: ۱، پانی نہ چھنے۔۲، مستمسک بغیر استمساک ہو۔۳، تتابع مشی ممکن ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سیل اِسکین پر مسح کرنا جائز ہے۔لیکن عام موزے جو سوتی ہوں پانی چھنتا ہو، ایسے موزوں کو اِسپرے کے ذریعہ واٹر پروف بنادیا جائے تو ان پر مسح کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ یہ اِسپرے ۲۴ گھنٹے تک پانی سرایت کرنے سے روکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ موزوں پر مسح کے لیے موزوں کی بناوٹ ہی ایسی ہونی چاہیے جس میں مذکورہ شرائط پائی جائیں، شرائط کی تکمیل خارجی چیز سے نہ کی گئی ہو، چنانچہ عام موزوں پر مسح جائز نہیں ہے اور اِسپرے ایک خارجی چیز ہے اس کا اعتبار نہیں۔ ملاحظہ ہو درمختار میں منقول ہے:

شرط مسحه ثلاثة أمور الأول كونه ساتر محل فرض الغسل القدم مع الكعب أو يكون نقصانه أقل من الخرق المانع...والثاني كونه مشغولاً بالرجل ليمنع سراية الحدث ... والثالث كونه مما يمكن متابعة المشي المعتاد فيه فرسخاً فأكثر ...(الدرالمختار: ۱/۲۶۱، ۲۶۴، سعيد).

امدادالفتاح میں ہے:

والشرط الخامس: استمساكهما على الرجلين من غير شد لثخانته... لأن الرقيق لايجوز المسح عليه اتفاقاً، لعدم صلاحيته لقطع المسافة. والشرط السادس: منعهما وصول الماء إلى الجسد فلا يشفان الماء لثخانتهما وصلابتهما...وإنما يجوز المسح على الموقين عندنا إذا كانا صالحين للمسح باستقلالهما كالثخين. (امداد الفتاح،ص ۱۳۵،ط: بیروت).

تذکرۃ الرشید میں ہے:

ایسا دبیز کپڑا کہ پانی کو نشف نہ کرے اور چلنے میں گرے نہیں اس کا موزہ درست ہے اور مسح اس پر جائز ہے۔(تذکرۃ الرشید،ص ۱۳۶،ط: ادارۂ اسلامیات، کراچی)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

اگر چمڑے کے موزے نہیں بلکہ سوت یا اون کے ہیں تو فقہاء کرام نے ایسے موزوں پر جوازِ مسح کے لیے یہ شرطیں تحریر فرمائی ہیں کہ وہ ایسے دبیز موٹے اور مضبوط ہوں کہ صرف ان کو پہن کر تین میل چلنا ممکن ہو۔ دوسرے یہ کہ پنڈلی پر بغیر باندھے (کپڑے کے موٹا ہونے کی وجہ سے) قائم رہ سکیں۔تیسرے یہ کہ اس میں پانی نہ چھنے اور جذب ہو کر پاؤں تک نہ پہنچے، سوت (کوٹن) یا اون کے ایسے موزے ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔اس لیے کہ ایسے موزے (چمڑے) کے موزے کے حکم میں آجاتے ہیں۔(فتاویٰ رحیمیہ: ۳۴۱/۲)۔

مزید ملاحظہ ہو: (نظام الفتاویٰ: ۴۲/۱، وفتاویٰ محمودیہ: ۱۹۶/۵،ط: جامعہ فاروقیہ، وفتاویٰ فریدیہ: ۱۰۴/۲، وفتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۷۲۱/۱، زمزم)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تجارتی مقام پر دیواروں پر پیشاب داں لگانے کا حکم:

سوال: عام تجارتی جگہوں پر یا گراجوں پر لوگوں کے لیے پیشاب داں بنائے جاتے ہیں، اور یہ عام طور پر دیواروں پر لگاتے ہیں، اکثر غیر مسلم مرد ان کو استعمال کرتے ہیں، نیز مغربی طرز کے بیت الخلا میں بھی مرد کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں، تو کیا ایسے بیت الخلا اور پیشاب داں بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قضائے حاجت کا فطری اور سنت طریقہ یہ ہے کہ بیٹھ کر قضائے حاجت کی جائے یہ ہی

زیادہ آرام دہ، باوقار اور شرم وحیا والا ہے نیز پیشاب کے چھینٹوں سے بھی امن رہتا ہے باقی کھڑے کھڑے پیشاب کرنا خلافِ مروت، خلافِ سنت اور مکروہ ہے، ہاں اگر کوئی معقول عذر ہو تو ٹھیک ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

ویکره أن یبول قائماً أو مضطجعاً أو متجرداً عن ثوبه من غیر عذر فإن کان لعذر فلا بأس لأنه علیه الصلاة والسلام بال قائماً لوجع فی صلبه . (البحر الرائق: ۱/۲۵۶،دارالمعرفة).

(وکذا فی الدر المختار: ۱/۳۴۴،سعید،والفتاوی الهندیة: ۱/۵۰).

فتاوی الشامی میں ہے:

قوله وأن یبول قائماً لما ورد من النهی عنه ولقول عائشة رضی اللّٰه تعالیٰ عنها من حدثکم أن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم کان یبول قائماً فلا تصدقوه ما کان یبول إلا قاعداً رواه أحمد والترمذي والنسائي وإسناده جید ، قال النووي في شرح مسلم وقد روي فی النهي أحادیث لا تثبت ولکن حدیث عائشةؓ ثابت فلذا قال العلماء : یکره إلا لعذر وهي کراهة تنزیه لا تحریم . (فتاوی الشامی : ۱/۳۴۴،سعید).

مغربی طرز کے پیشاب دانوں میں بے حیائی زیادہ ہے نیز قریب قریب ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ستر کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں جبکہ ستر دیکھنا دکھانا حرام ہے، اور ایک دوسرے سے بات چیت بھی ہوتی ہے، حدیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ ابوداود شریف میں ہے:

عن أبي سعید ؓ قال سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: لا یخرج الرجلان یضربان الغائط کاشفین عن عورتهما یتحدثان فإن اللّٰه عزوجل یمقت علی ذلک. (سنن ابی داود: ۱/۷، رقم :۱۵، باب کراهیة الکلام عند الحاجة، بیروت).

لہٰذا مسلمانوں کو ایسے پیشاب داں کے استعمال سے اجتناب لازم اور ضروری ہے۔ ہاں غیر مسلم احکامِ شریعت کے پابند نہیں ہیں اور وہ کھڑے کھڑے پیشاب کرنے کے عادی ہیں، ان کو سمجھانا بھی مشکل ہے بنابریں ان کے لیے بنانا درست ہے ورنہ دیواروں پر یا باغیچوں میں پیشاب کریں گے، البتہ درمیان میں حائل بنایا جائے

تا کہ بے حیائی نہ ہو اور ضرورت کی چیز تا حد ضرورت ہونی چاہیے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حائضہ کے لیے عبادات کا حکم:

سوال: حائضہ کونسی عبادت کرسکتی ہے اور کونسی نہیں کرسکتی؟ کیا مصحف کو دیکھ کر زبانی قرآن پڑھ سکتی ہے؟ کیا درود شریف پڑھ سکتی ہے؟ کیا دعا کرسکتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حائضہ عورت کے لیے نماز، روزہ، طواف کرنا، تلاوتِ قرآنِ کریم، قرآنِ مجید کو چھونا اور مسجد میں داخل ہونا، یہ سب عبادات ناجائز ہیں، ہاں ذکر واذکار، قرآن وحدیث کی دعائیں، دعا کی نیت سے پڑھنا یا دعا مانگنا، یہ سب جائز ہیں، نیز حائضہ معلّمہ آیتِ کریمہ کو قطع کر کے پڑھا سکتی ہے۔ نیز قرآنِ مجید کی بعض آیات مثلاً: ﴿لا إلـه إلا أنت سبحانک إني كنت من الظالمين﴾ بہ نیتِ ذکر ودعا پڑھ سکتی ہے ہاں بہ نیتِ تلاوت جائز نہیں۔ ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

ثـم ذكـر أحـكـامه بقوله يمنع صلاة مطلقاً ولو سجدة شكر وصوماً وجماعاً وتقضيه لـزومـاً دونهـا للحرج ...ويمنع حل دخول مسجد وحل الطواف...وقراءة القرآن بقصده ومسه. (الدر المختار: ۱/ ۲۹۰، سعيد).

امداد الفتاح میں ہے:

ويـحـرم بالحيض والنفاس ثمانية أشياء : الصلاة والصوم ، ولا يصحان لفوات شرط الـطهـارة منها ، ويحرم قراءة آية من القرآن إلا بقصد الذكر ، إن كانت مشتملة عليه ، لا عـلى حكم أو خبر ...لقول النبي صلى الله عليه وسلم: لا تقرأ الحائض، لا الجنب شيئاً من الـقرآن ، والنفساء كالحائض ويحرم مسها أى: الآية ، لقوله تعالىٰ: لايمسه إلا المطهرون ، ولـقـولـه صـلـى الـلّٰه عليه وسلم : لا تمس القرآن إلا وأنت طاهر ، وسواء كان مكتوباً على قـرطـاس أو درهـم أو حـائط ، إلا بغلاف متجاف عن القرآن وعن الحامل...ويحرم دخول مسـجـد لـقوله صلى الله عليه وسلم: لا أحل المسجد لجنب ولا حائط...ويحرم الطواف

بـالكعبة ، لقول النبي صلى الله عليه وسلم لعائشةؓ حين حاضت: فافعلي ما يفعل الحاج غير أن لا تطوفي بالبيت حتى تطهري ، متفق عليه ، . . . (امداد الفتاح ،ص ۱۴۶).

فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله قراء ة قرآن أى و لو دون آية من المركبات لا المفردات لأنه جوز للحائض المعلمة تعليم كلمة كلمة... قوله بقصده فلو قرأ الفاتحة على وجه الدعاء أوشيئاً من الآيات التي فيها معنى الدعاء ولم ترد القراء ة لا بأس به . (فتاوى الشامى : ۱/۲۹۳،سعيد).

(وكذا فى البحرالرائق: ۱/۱۹۹،دارالمعرفة).

ذکرواذکاراوردرودشریف وغیرہ پڑھنا جائز ہے۔ **قال فى الدرالمختار : ولا باس لحائض و جنب بقراء ة أدعية ومسها وحملها وذكر الله تعالىٰ ، وتسبيح .** (الدرالمختار: ۱/۲۹۳،سعيد).

کفایت المفتی میں ہے:

سوال: جس عورت کوحیض آتا ہو، وہ درودشریف دلائل الخیرات پڑھ سکتی ہے یانہیں؟

الجواب: ہاں! سوائے قرانِ مجید کے تمام اذکار کا پڑھنا مباح ہے۔ (کفایت المفتی :۳/۴۱۲،جامعہ فاروقیہ)۔

کتاب المسائل میں ہے:

اگرتلاوت کی نیت نہ ہو؛ بلکہ حمدِ خداوندی، دعااورذکر کے مقصد سے قرآنِ کریم کی آیات حالتِ حیض میں پڑھی جائیں ،تواس میں یہ تفصیل ہے کہ دعااور حمد کے مضامین پر مشتمل آیات میں توان کا پڑھنا مطلقاً جائز ہےخواہ آیات طویل ہوں یامختصر...

حالتِ حیض میں ہرطرح کی دعائیں پڑھنا جائز ہےحتی کہ وہ دعائیں بھی پڑھی جاسکتی ہیں جن کے الفاظ قرآنِ کریم اوراحادیثِ طیبہ میں وارد ہیں،اس حال میں دعائے قنوت پڑھنا بھی درست ہے۔

...ناپاکی کے ایام میں دینی کتابوں کا پڑھنا،مطالعہ کرنااوردرس دیناجائز ہے،لیکن ان میں جہاں قرآنِ کریم کی آیت لکھی ہواس جگہ ہاتھ لگانااوروہ آیت زبان سے پڑھناجائزنہیں ہے۔ (کتاب المسائل:۱/۲۲۲،۲۲۳)۔

مزیدملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۱/۷۵۶،ط:بمبئی)۔واللہ ﷻ اعلم۔

مسجدِ حرام میں عورت کو حیض شروع ہوجائے تو باہر نکلنے کا حکم:

سوال: ایک عورت مسجدِ حرام میں بیٹھی ہے، اس کو حیض آیا اب کثرتِ اژدحام کی وجہ سے اس کا فی الفور نکلنا مشکل ہے، تو وہ کیا کرے گی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عورت کو حیض آتے ہی مسجد سے باہر نکل جانا چاہیے لیکن ہجوم کی وجہ سے نکلنا دشوار ہو تو بدرجہ مجبوری تیمّم کر کے وہی بیٹھی رہے اور حتی الامکان باہر نکلنے کی کوشش کرتی رہے۔ جیسے جنبی کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ مسجد میں احتلام ہوجائے تو فی الفور مسجد سے نکل جائے لیکن اگر باہر جانے میں خوف ہو تو تیمّم کر کے مسجد میں رہ سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں مذکور ہے:

ولو كان نائماً فيه فاحتلم والماء خارجه وخشي من الخروج يتيمم وينام فيه إلى أن يمكنه الخروج، قال في المنية وإن احتلم في المسجد تيمم للخروج إذا لم يخف وإن خاف يجلس مع التيمم ولا يصلي ولا يقرأ. (فتاوى الشامي: ١/٢٤٣، سعيد).

(وكذا في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص ١٤٤، والبحر الرائق: ١/٢٠٦، دار المعرفة).

عمدۃ الفقہ میں مولانا سید زوار حسین صاحب فرماتے ہیں: اگر کسی کو مسجد میں احتلام ہوجائے تو وہ تیمّم کر کے جلد باہر نکلے یہ تیمّم جائز ہے واجب نہیں اور اگر دشمن یا جانور کے خوف کی وجہ سے جلد نہ نکلے اور وہیں ٹھہرا رہے تو تیمّم کر کے ٹھہرے یہ تیمّم واجب ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۱/۲۵۹، ط: زوار اکیڈمی)۔

مزید ملاحظہ ہو: (کتاب الفتاویٰ: ۴/۲۶۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عورت کے سر کے مسح کا طریقہ:

سوال: عورت کے سر کے مسح کا طریقہ کیا ہے؟

الجواب: عورتوں کے سر کے مسح کا طریقہ بھی وہی ہے جو مردوں کا ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، کتبِ فقہ میں عورتوں کے لیے الگ سے کوئی خاص طریقہ مذکور نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

وتكلموا في كيفية المسح ، والأظهر : أن يضع كفيه وأصابعه على مقدم رأسه ويمدهما إلى القفا على وجه يستوعب جميع الرأس ...(فتاوى الشامي : ۱/۱۲۱،سعيد).

فتح القدیر میں مرقوم ہے:

والمسنون في كيفية المسح أن يضع كفيه وأصابعه على مقدم رأسه آخذاً إلى فقاه على وجه يستوعب ...(فتح القدير : ۱/۲۰، دارالفكر). (وكذا فى تبيين الحقائق: ۱/۵،امداديه).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا، جلداول،ص۶۸۰،ط:بمبئی)۔واللہ ﷻ اعلم۔

وضو میں ترکِ مسح پر نماز کے اعادہ کا حکم:

سوال: ایک لڑکی بالغ ہونے کے بعد نماز کے لیے جب بھی وضو کرتی تھی تو سر کا مسح نہیں کرتی تھی اس کو معلوم نہیں تھا کہ سر کا مسح بھی فرض ہے بعد میں مدرسہ میں پڑھنے کے لیے گئی تو معلوم ہوا اب بالغ ہونے کے بعد سے جو نمازیں پڑھی ہیں ان کا اعادہ لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: فی زماننا کسی مسلمان کا اسلام کے فرائض سے ناواقف ہونا کوئی مقبول عذر نہیں ہے، کیونکہ اسلام کی بنیادی چیزوں کا علم حاصل کرنا بالغ ہونے کے بعد نہایت اہم اور ضروری ہے، بنابریں صورتِ مسئولہ میں بلوغ کے بعد سے تمام نمازوں کی قضا لازم اور ضروری ہے۔ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

طلب العلم فريضة بقدر الشرائع وما يحتاج إليه لأمر لا بد منه من أحكام الوضوء و الصلاة و سائر الشرائع ولأمور معاشه وما وراء ذلك ليس بفرض.(الفتاوى الهندية: ۵/۳۷۷).

التيسير بشرح الجامع الصغير میں ہے:

طلب العلم فريضة على كل مسلم ، وهو العلم الذي لا يعذر المكلف فى الجهل به والعلم ستة أقسام فرض كفاية إذا قام به البعض سقط الحرج عن الكل وإلا أثم الكل و فرض عين وهو مايحتاجه المكلف فى الفرض كوضوء وصلاة وصوم ... (التيسير: ۱/۳۲۹، ط:الرياض).

مجمع الانهر فی شرح ملتقی الابحر میں ہے:

وفي البزازية : طلب العلم والفقه...وهو أقسام فرض وهو مقدار ما يحتاج إليه لإقامة الفرائض ومعرفة الحق والباطل والحلال والحرام . (مجمع الانهر:۱۸۴/۴،ط:بیروت).

قاموس الفقہ میں ہے:

دنیوی حکم کے اعتبار سے جہل کی کئی قسمیں اور صورتیں ہیں: پہلی صورت: شریعت نے جس چیز کا حکم دیا اسے انجام نہ دیا تو اس کی وجہ سے یہ فرض اس سے معاف نہ ہوگا بلکہ اس کا تدارک واجب ہوگا اور چونکہ تعمیل امر ہی نہیں کیا اس لیے اس کے ثواب واجر سے بھی محروم رہے گا، مثلاً: کپڑے وجسم میں اتنی نجاست لگی تھی کہ اس کے ساتھ نماز درست نہیں ہوتی بے خبری میں نجاست کے ساتھ نماز ادا کر لی بعد میں معلوم ہوا تو قضا واجب ہوگئی۔

(قاموس الفقہ :۱۶۸/۳)۔ مزید ملاحظہ ہو: (نورالانوار،ص۲۹۹،واصول البزدوی ،ص۳۳۸،ط:کراتشی،وکشف الاسرار: ۴۵۷/۴،ط:بیروت). واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسواک کرنے کا صحیح طریقہ:

سوال: مسواک طولاً کیا جاتا ہے یا عرضاً، حدیث شریف سے اس بارے میں کچھ ثابت ہے یا نہیں؟ نیز فقہ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بعض ضعیف احادیث میں عرضاً مسواک کرنے کی ترغیب وارد ہوئی ہے، اور بعض فقہاء نے طولاً فرمایا ہے، لیکن اس کا مطلب زبان میں طولاً مسواک کرنا ہے کیونکہ دانتوں میں طولاً مسواک کرنے سے مسوڑوں کے زخمی ہونے کا اندیشہ ہے، ہاں اگر زخمی ہونے کا خطرہ نہ ہو تو طولاً کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو'' المقاصد الحسنۃ'' میں امام سخاویؒ فرماتے ہیں:

حديث: " استاكوا عرضاً وادهنوا غباً واكتحلوا وتراً . قال ابن الصلاح بحثت عنه فلم أجد له أصلاً و لا ذكراً في شيء من كتب الحديث قال: وقد عقد البيهقي باباً في الاستياك عرضاً ولم يذكر فيه حديثاً يحتج به يشير بذلك إلى ما أخرجه أبوداود في

مـراسيـله والبيهقي من جهته من حديث محمد بن خالد القرشي عن عطاء بن أبي رباح قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا شربتم فاشربوا مصاً وإذا استكتم فاستاكوا عرضاً.

وعـنـد البيهـقـي والبـغـوي والـعـقيلي وابن عدي وابن منده وابن قانع والطبرانى من حـديـث ثبيـت بن كثير وهوضعيف عن يحيى بن سعيد عن سعيد بن المسيب عن بهز قال: كـان الـنـبـي صلى الله عليه وسلم يستاک عرضاً ويشرب مصاً ويتنفس ثلاثاً ويقول هو أهنأ وأمـرأ وأبـرأ وذكـر أبـونـعـيـم فـى الـصـحـابة مـا يدل على أن بهزاً هو ابن حكيم بن معاوية الـقشيـري وعـلـى هـذا فهو منطقع وهو من رواية الأكابر عن الأصاغر وحكى ابن منده مما يـؤيد ذلک أن مخيس بن تميم رواه عن بهز بن حكيم عن أبيه عن جده لكن قد اختلف في رواية بهـز الأولـى عـلـى راويهـا يـحـيـى بـن سعيد فقال ثبت كما تقدم ورواه على بن ربيعة الـقـرشـى الـمـدنـي عـنـه عـن سـعيد بن المسيب فقال: عن ربيعة بن أكثم بدل بهز أخرجه البيهـقـى والعقيلى وسنده ضعيف جداً بل قال ابن عبد البر ربيعة قتل فلم يدركه سعيد وقال فـى التـمهيـد لا يـصـحـان مـن جهة الإسناد ورواه وأبونعيم في كتاب السواک من حديث عـائشةؓ قـالـت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يستاک عرضاً ولا يستاک طولاً وفي سنده عبد الله بن حكيم وهو متروک . (المقاصد الحسنة ، رقم: ۹۸،ط:دارالكتاب العربى).

وللمزيد راجع : (البـدرالمنير للشيخ ابن الملقن : ۱/۲۲۷،الحديث السادس عشر، ط: السعودية، والتلخيص الحبير: ۱/۲۳۸،ط: دارالكتب العلمية بيروت).

خلاصہ یہ ہے کہ عرضاً مسواک والی روایت تین صحابہ کرام سے مروی ہے(۱) بہز بن حکیم۔(۲) ربیعہ بن اکثم۔(۳) عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔اور یہ تینوں روایات ضعیف ہیں۔

فقہاء کی عبارات ملاحظہ کیجئے: علامہ زیلعیؒ تبیین الحقائق میں فرماتے ہیں: ويـنـبـغـي أن يستاک عرضاً بعود في غلظ الخنصر ثم يغسل فمه بعده . (تبيين الحقائق: ۱/۳۳۲،ط:القاهرة).

فتاوی الشامی میں ہے:

قوله ويستاك عرضاً لا طولاً أى لأنه يخرج لحم الأسنان وقال الغزنوى: طولاً و عرضاً والأكثر على الأول بحر، لكن وفق فى الحلية (الحَلْبَة) بأنه يستاك عرضاً فى الأسنان وطولاً فى اللسان جمعاً بين الأحاديث . (فتاوى الشامى: ١/١١٤، سعيد).

قال في حلبة المجلي: الاستياك طولاً إنما ورد فى اللسان خاصة، والاستياك عرضاً ورد مطلقاً، فيبقى الأول على خصوصه، ويحمل المطلق على ما إذا كان فى الأسنان . (حلبة المجلي وبغية المهتدى في شرح منية المصلي وغنية المبتدى، ص ٦٢، ط: بيروت).

علامہ عینیؒ شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

وكيفيته عندنا : أن يستاك عرضاً لا طولاً عند مضمضة الوضوء وأخرج أبونعيم من حديث عائشةؓ قالت: كان يستاك عرضاً لا طولاً. (عمدة القارى: ٢/٢٩٢، ط: دارالحديث ملتان).

(وكذا فى البحر الرائق: ١/٢٠، الماجدية، ودررالحكام شرح غررالاحكام: ١/١٠، ومرقاة المفاتيح: ٢/٢، مكتبه امداديه).

امام نوویؒ نے فرمایا کہ دانتوں میں طولاً مسواک کرنے سے مسوڑھوں کے زخمی ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے مکروہ ہے؛ **قال: والمستحب أن يستاك عرضاً ولا يستاك طولاً لئلا يدمى لحم أسنانه فإن خالف واستاك طولاً حصل السواك مع الكراهة .** (شرح النووى على مسلم : ٣/١٤٣، ط: بيروت). واللہ سبحانہ اعلم۔

نجاست قدرِ درہم سے متجاوز ہوتو ٹیشو پیپر پر اکتفا کرنے کا حکم:

سوال: جب نجاستِ غیر مائعہ قدرِ درہم سے زائد محل استنجا میں ہوتو کونسا استنجا فرض ہے؛ بالماء یا بالحجر؟ نیز قدرِ درہم سے کیا مراد ہے؛ وزناً یا مساحۃً؟ اور قدرِ درہم نجاست کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر نجاست محل استنجا میں قدرِ درہم سے زائد لگ جائے تو پانی سے استنجا واجب ہے، استنجا بالحجر کافی نہیں ہے، اور قدرِ درہم سے مراد وزناً ہے جبکہ نجاست جسم والی ہو اور اگر جسم والی نہ ہوتو

مساحۃً مراد ہے، نیز قدرِ درہم نجاست مانع نہیں ہے ہاں اس کے ساتھ نماز مکروہ ہوگی۔

دلائل حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں: **قال في تبيين الحقائق: قوله: ويجب إن جاوز النجس المخرج ؛ أي يجب الاستنجاء بالماء إذا جاوزت النجاسة المخرج لأن ما على المخرج من النجاسة إنما اكتفى فيه بغير الماء للضرورة ولا ضرورة في المتجاوز فيجب غسله .**

(تبيين الحقائق: ١/٧٨،و البحر الرائق: ١/٢٤٢،كوئٹه). (وكذا في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص ٤٤،وفتاوى الشامي: ١/٣٣٩، سعيد).

کتاب المسائل میں ہے: اگر نجاست مخرج سے ایک درہم تک تجاوز کر جائے تو پانی سے ازالہ نجاست واجب ہوگا، ڈھیلے وغیرہ کا استعمال کافی نہیں۔ **وإن تجاوز المخرج وكان المتجاوز قدر الدرهم لا يسمى استنجاء، ووجب إزالته بالماء أو المائع لأنه من باب إزالة نجاسة فلا يكفي مسحه بالحجر.**

(حاشية الطحطاوي مع المراقي،٤٤)، (کتاب المسائل:١/١٢٣)۔

قال في الجوهرة: قوله:مقدارالدرهم: يعني المثقال الذي وزنه عشرون قيراطاً ثم قيل المعتبر بسط الدرهم من حيث المساحة ، وقيل وزنه ، والتوفيق بينهما: أن البسط في الرقيق والوزن في الخثين . (الجوهرة النيرة: ١/٤٥،ط:امداديه ،ملتان).

قال في البدائع: قال الفقيه أبو جعفر الهندواني: لما اختلف عبارات محمد في هذا، فنوفق: ونقول: أراد بذكرالعرض تقدير المائع كالبول والخمر و نحوهما، وبذكر الوزن تقدير المتجسد كالعذرة ونحوها. (بدائع الصنائع: ١/٨٠،سعيد).

قال في الهداية: وقدرالدرهم وما دونه من النجس المغلظ كالدم والبول...جازت الصلاة معه و إن زادت لم تجز . (الهداية: ١/٧٤، ط: المصباح). (و كذا في الفتاوى الشامي : ١/ ٣٣٦، سعيد، وتبيين الحقائق: ١/٧٨،ط:امداديه ملتان).

قال في الجوهرة: و هل يكره إن كانت قدر الدرهم ، يكره إجماعاً وإن كانت أقل .

(الجوهرة النيرة: ١/٤٥،ط:امداديه ملتان). **واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

وضو کی فضیلت میں ایک حدیث کی تحقیق:

سوال: ایک حدیث کی تحقیق مطلوب ہے؛ **من توضأ فأحسن الوضوء خرجت خطاياه من جسده حتى تخرج من أظفاره .** اس حدیث کا کیا درجہ ہے؟

الجواب: یہ حدیث بعض کتابوں میں مذکور ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔

ملاحظہ ہو حافظ ابن حجرؒ اتحاف المہر ہ میں لکھتے ہیں:

وعن عفان(ثقة) ، عن عبد الواحد بن زياد (ثقة)، عن عثمان بن حكيم (ثقة)، عن محمد بن المنكدر(ثقة)، عن حمران(مختلف فيه)، عن عثمانؓ بلفظ: من توضأ فأحسن الوضوء خرجت خطاياه من جسده حتى تخرج من أظفاره . (اتحاف المهرة : ۱۱/۲۳/ ۱۳۶۴۵ ،مجمع الملک فهد مدينه منوره) .

اس روایت کے تقریباً سب راوی ثقہ ہیں صرف ایک راوی حمران کے بارے میں ملاحظہ ہو میزان الاعتدال میں امام ذہبی لکھتے ہیں:

حمران بن أبان مولى عثمان ثقة من سبى عين التمر...وقد ذكره ابن سعد فى الطبقات ، فقال: لم أرهم يحتجون به، وقد أورده البخارى فى الضعفاء ، لكن قال: ما بليته قط . (الميزان :۲/۱۲۷/۲۲۹۱).

قال الذهبي: قال الحاكم: تكلم فيه بما لايؤثر فيه ، قلت هو ثبت. (الرواة الثقات المتكلم فيهم بمالايوجب ردهم،ص۸۸،ط:بيروت) .

لیکن دکتور شعیب ارنؤ وط اور دکتور بشار عواد تحریر تقریب میں لکھتے ہیں: **فما وجدت أحداً وثقه سوى ابن حبان والذهبي وقال ابن سعد: لم أرهم يحتجون بحديثه وأورده البخارى فى الضعفاء ، وقلت: يظهر من جماع ترجمته إن الرجل لم يكن أميناً الأمانة التي تؤدى إلى توثيقه توثيقاً مطلقاً فلعل هذا تبين للبخارى على أن البخارى ومسلم احتجا به فى الصحيح.**

(تحرير تقريب التهذيب : ۱/۳۲۲).

یقول العبد الضعیف: لعلهما احتجا به في فضائل الأعمال التي یتحمل فیها الحدیث الضعیف . واللہ ﷻ اعلم۔

نماز میں قہقہہ مار کر ہنسنے سے وضوٹوٹنے والی روایت کی تحقیق:

سوال: اگر کوئی شخص نماز میں قہقہہ مار کر ہنسے تو وضوٹوٹ جاتا ہے، کیا یہ حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہے تو حدیث کا کیا درجہ ہے؟ برائے کرم باحوالہ جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب: نماز میں کھل کھلا کر ہنسنے سے وضوٹوٹنے کے بارے میں کثیر تعداد میں روایات مروی ہیں؛ بعض ان میں سے مرسل ہیں اور بعض ضعیف، امام دارقطنیؒ نے اپنی سنن میں تقریباً ۴۸، احادیث ذکر کرنے کے بعد ہر ایک کی سند پر کلام کیا ہے، اور امام زیلعیؒ نے نصب الرایہ میں تمام احادیث کی تخریج کی ہے، ہاں بعض روایات صحیح بھی ہیں؛ ملاحظہ ہو سنن دارقطنی میں مذکور ہے:

۱۔ فحدثنا به أبوبكر الشافعي (ثقة) وأحمد بن محمد بن زیاد (ثقة) وآخرون قالوا: حدثنا إسماعیل بن محمد بن أبي كثیر القاضي(ثقة) حدثنا مكی بن إبراهیم (ثقة)ناأبوحنیفة (ثقة) عن منصور بن زاذان (ثقة)، عن الحسن (ثقة)، عن معبد (الخزاعی، الصحابی)، عن النبي صلى اللّٰه علیه وسلم قال: بینما هو فی الصلاة إذ أقبل أعمی یرید الصلاة فوقع فی زبیة فاستضحک القوم حتی قهقهوا فلما انصرف النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال: من كان منكم قهقه فلیعد الوضوء والصلاة. (سنن الدارقطنی : ۱/۳۰۶/۶۲۲،ط:بیروت،لبنان) امام دارقطنیؒ نے اس سند کے بارے میں یہ فرمایا کہ معبد جہنی صحابی نہیں اس لیے یہ سند ٹھیک نہیں، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں معبد جہنی مراد نہیں بلکہ معبد الخزاعی صحابی مراد ہے۔ ملاحظہ ہو محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

قیل: ومعبد هذا لا صحبة له فهو مرسل أیضاً ، فیه نظر، فإن معبداً الذي لا صحبة له هو معبد البصری الجهني كان الحسن یقول فیه : إیاكم ومعبداً فإنه ضال مضل، ومعبد هذا هو الخزاعي كما هو مصرح به في مسند أبي حنیفةؒ ولا شک في صحبته ، ذكره ابن منده

وأبو نعيم في الصحابة ...الخ . (فتح القدير: ۱/۱۵، دار الفكر).

اسی طرح ملاعلی قاریؒ نے شرح النقایہ میں لکھا ہے، ملاحظہ ہو: (فتح باب العنایۃ: ۱/۵۹، ط: بیروت)۔

۲ــ حدثنا عثمان (بن محمد بن بشر، ثقة)، نا إبراهيم (ابن إسحاق)، ثنا عبيد الله (ثقة) نا معتمر (ثقة)، عن سلم يعني ابن أبي الذيال (ثقة)، عن قتادة (ثقة)، قال: بلغنا عن النبي صلى الله عليه وسلم مثله ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يصلي بأصحابه ، فجاء ضرير فتردى في بئر فضحك القوم ، فأمر رسول الله صلى الله عليه وسلم الذين ضحكوا: أن يعيدوا الوضوء والصلاة. (سنن الدارقطني: ۱/۱۶۳/۶،۱۰، باب احاديث القهقهة في الصلاة).

الآثار میں امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے:

يوسف عن أبيه عن أبي حنيفةؒ ، عن منصور بن زاذان ، عن الحسن ، عن معبد رضي الله عنه، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه بينما هو في الصلاة إذ أقبل أعمى يريد الصلاة ، فوقع في زبية (الحفرة) فاستضحك بعض القوم حتى قهقه ، فلما انصرف النبي صلى الله عليه وسلم قال: من كان منكم قهقه فليعد الوضوء والصلاة . (الآثار للامام ابي يوسفؒ: ۱۳۳، رقم الحديث: ۱۴۰).

الآثار میں محمدؒ سے روایت ہے:

محمد ، قال: أخبرنا أبو حنيفةؒ قال: حدثنا منصور بن زاذان ، عن الحسن البصري، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: بينما هو في الصلاة إذ أقبل أعمى من قبل القبلة يريد الصلاة ، والقوم في صلاة الفجر...الخ . (الآثار للامام محمدؒ، ص: ۲۱۰، رقم: ۱۶۲).

ملاعلی قاریؒ شرح نقایہ میں فرماتے ہیں:

و لنا أن القياس ما ذكروه ولكن تركناه فيما إذا كانت القهقهة في ذات ركوع و سجود بما رواه الدارقطني عن أبي هريرةؓ وعمران بن حصينؓ ، والطبراني عن أبي موسى الأشعريؓ... و لنا أيضاً ما قدمناه من قوله عليه الصلاة والسلام: يعاد الوضوء من سبع، وقوله : من ضحك في الصلاة قهقهة فليعد الوضوء والصلاة ، فإنه روى مرسلاً ومسنداً ،

وقد اعترف أهل الحديث كلهم بصحته مرسلاً ، والمرسل حجة عندنا وعند الجمهور ، وأما روايته مسنداً ، فعن عدة من الصحابة كابن عمرؓ ، و معبد الخزاعيؓ ، و أبي موسى الأشعريؓ ، وأبي هريرةؓ، وأنسؓ، وجابرؓ، وعمران بن حصينؓ، وقد استوفى صاحب التخريج الكلام على الطرق كلها ونقتصر منها على طريقين :

طريق ابن عمرؓ ، وهو ما روى ابن عدى فى الكامل، من حديث عطية بن بقية : حدثنا أبي: حدثنا عمرو بن قيس السكوني، عن عطاء ، عن ابن عمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ضحک فى الصلاة قهقهة فليعد الوضوء والصلاة . وأما الطعن فيه بأن بقية مدلس، فكأنه سمعه من بعض الضعفاء وحذف اسمه: فمدفوع بأنه صرح فيه بالتحديث ، والمدلس الصدوق إذا صرح بالتحديث تزول تهمة التدليس ، وبقية من هذا القبيل .

وطريق معبد، وهو ما روي أبوحنيفةؒ في مسنده عن منصوربن زاذان الواسطى... (فتح باب العناية : ۱/۵۸،بيروت).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (سنن الدارقطنی ،جلد اول ، ونصب الراية : ۱/۴۸، والكامل فى ضعفاء الرجال :۵/۱۸ ،ط:الرشد،وفتح القدير: ۱/۵۱،دارالفكر).

مرسل حدیث جمہور کے نزدیک حجت ہے۔ملاحظہ ہو: (أصول السرخسي: ۱/۳۵۹، وتيسير أصول الفقه ، ص۹۸، والتمهيد : ۱/۲). واللہ ﷻ اعلم۔

کیتھیٹر (catheter/عمل جراحی) سے پیشاب نکالنے پر غسل کا حکم:

سوال: ایک عورت نے کیتھیٹر (catheter) کے عمل سے پیشاب نکلوایا، کیا اس سے غسل واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: کیتھیٹر علاج کا ایک طریقہ ہے جس میں مریض کی شرمگاہ میں ٹیوب (tube) داخل کر کے اس سے پیشاب خارج کیا جاتا ہے، اس عمل سے غسل واجب نہیں ہوتا، ہاں پیشاب نکلنے کی وجہ سے وضو

ٹوٹ جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار مع ردالمحتار میں مرقوم ہے:

ولا يجب الغسل عند إدخال أصبع ونحوه كذكر غير آدمي وذكر خنثى وميت وصبي لايشتهي وما يصنع من نحو خشب في الدبر أو القبل على المختار، وفي الشامي: قوله على المختار قال في التجنيس: رجل أدخل أصبعه في دبره وهو صائم اختلف في وجوب الغسل والقضاء، والمختار أنه لا يجب الغسل والقضاء؛ لأن الأصبع ليس آلة للجماع فصار بمنزلة الخشبة، ذكره في الصوم. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ١٦٦/١، سعيد).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مرقوم ہے:

(۱) مرد نے قصداً عورت کی پیشاب گاہ میں انگلی کر دی اس حالت میں عورت پر غسل واجب ہوا یا نہیں؟

(۲) ایک عورت دوسری عورت کے جسم میں دوا پہنچانے یا اندرونی خرابی دیکھنے کو ہاتھ یا انگلی کرے یا خواہ مخواہ ہی کر دے تو غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب: (۱) اور (۲) اس میں غسل واجب نہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند [عزیز الفتاویٰ]: ۱۸۱/۱، کراچی)۔

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

زید نے اپنی زوجہ کی شرمگاہ میں مع کپڑے کے یا بغیر کپڑے کے انگلی داخل کی تو زوجہ کا وضو ٹوٹ گیا یا نہیں؟ الجواب: وضو ٹوٹ گیا خواہ انگلی پر کپڑا ہو یا نہ ہو، اس لیے کہ جب انگلی نکلے گی تو اس پر نجاست ضرور لگی ہوگی اور خروجِ نجاست ناقضِ وضو ہے، البتہ اگر انگلی فرجِ داخل یعنی گول سوراخ کے اندر نہیں گئی تو وضو نہیں گیا۔ (احسن الفتاویٰ: ۲۰/۲، سعید)۔

بہشتی زیور میں مذکور ہے:

اگر کوئی عورت شہوت کے غلبہ میں اپنے خاص حصہ میں کسی بے شہوت مرد یا کسی جانور کے خاص حصہ کو یا کسی لکڑی وغیرہ یا خنثیٰ یا میت کے ذکر کو یا اپنی انگلی کو داخل کرے تب بھی اس پر غسل فرض ہو جائے گا، منی گرے یا نہ گرے مگر یہ شارحِ منیہ کی رائے ہے اور اصل مذہب میں بدونِ انزال غسل واجب نہیں۔ (بہشتی زیور، ص ۸۶۹، گیارہواں حصہ، دارالاشاعت)۔

شارحِ منیہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

وفي وجوب الغسل بإدخال الأصبع فى القبل أو الدبر خلاف والأولى أن يوجب فى القبل إذا قصد الاستمتاع لغلبة الشهوة ...الخ. (شرح منية المصلى، ص ٤٦، ط: سهيل).

لیکن یہاں استمتاع مقصود نہیں ہے بلکہ علاج مقصود ہے، لہٰذا وجوبِ غسل کی کوئی قوی وجہ موجود نہیں ہے۔

جدید فقہی مسائل میں مذکور ہے:

کسی شخص کا آپریشن کیا جائے اور پیشاب کے باہر نکلنے کے لیے خصوصی نلکی لگادی جائے جس سے پیشاب آتا رہے تو اس نلکی سے بھی پیشاب کا آنا ناقض وضو ہے۔ کیوں کہ نجاست متعینہ مقام سے نکلے یا کسی اور جگہ سے بہر حال ناقض وضو ہے۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/۹۲، ط: نعیمیہ)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے: ٹیوب کے ذریعہ منی عورت کے رحم میں پہنچانا موجبِ غسل نہیں، اس سرنج یا ٹیوب کا داخل کرنا ایسا ہی ہے جیسے عورت کے رحم میں انگلی داخل کرنا، لہٰذا جس طرح یہ موجبِ غسل نہیں، اسی طرح ٹیوب کا داخل کرنا بھی موجبِ غسل نہ ہوگا۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/۹۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بیت الخلا کا رخ جانبِ قبلہ سے ۴۵ درجہ ہٹ کر ہونا ضروری ہے:

سوال: مصلی اگر نماز میں ۴۵ درجہ سمتِ قبلہ میں ہے تو اس کی نماز ہو جائے گی، یعنی ۴۵ درجہ سمتِ قبلہ سمجھی جائے گی تو کیا اگر بیت الخلا بنانی ہو تب بھی ۴۵ درجہ قبلہ سے ہٹ کر تعمیر کرنا ضروری ہوگا یا عین قبلہ سے تھوڑا سا انحراف کافی ہو جائیگا اور وعید سے نکل جائے گا؟ بینوا بالدلیل توجروا بالاجر الجزیل۔

الجواب: علماء نے لکھا ہے کہ جس طرح نماز کی صحت کا مدار ۴۵ درجہ کے اندر ہونے پر موقوف ہے اسی طرح بیت الخلا بناتے وقت بھی ۴۵ درجہ کا اعتبار کیا جائے گا یعنی بیت الخلا کا رخ سمتِ قبلہ سے ۴۵ درجہ ہٹ کر ہونا ضروری ہوگا، ورنہ بیت الخلا کا رخ سمتِ قبلہ ہونے کا گناہ لازم آئے گا۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری شریف میں ہے:

عن أبي أيوب الأنصاري، أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا أتيتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة، ولا تستدبروها ولكن شرقوا أو غربوا، قال أبو أيوب: فقدمنا الشام

فوجدنا مراحيض بنيت قبل القبلة فننحرف ونستغفر الله . (صحيح البخارى،رقم: ۳۹۴).

درمختار میں مذکور ہے:

ويكره تحريماً استقبال القبلة بالفرج ولو فى الخلاء بالمد ، بيت التغوط ، وكذا استدبارها فى الأصح ، وفى الشامي: قوله تحريماً، لما أخرجه الستة عنه صلى الله عليه وسلم: إذا أتيتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها ولكن شرقوا أو غربوا ، ولهذا كان الأصح من الروايتين كراهة الاستدبار كالاستقبال، قوله استقبال القبلة بالفرج يعم قبل الرجل و المرأة ، و الظاهر أن المراد بالقبلة جهتها كما فى الصلاة ، وهو ظاهر الحديث المار وأن التقييد بالفرج يفيد ما صرح به الشافعية أنه لو استقبلها بصدره وحول ذكره عنها لم يكره بخلاف عكسه كما قدمناه في باب المسجد ... ولو غفل عن ذلک و جلس يقضى حاجته ثم وجد نفسه كذلک فلا بأس، لكن إن أمكنه الانحراف ينحرف فإنه عد ذلک من موجبات الرحمة فإن لم يفعل فلا بأس . (الدرالمختار مع رد المحتار: ۱/۶۵۵،سعيد).

جواہر الفقہ میں مرقوم ہے:

في رد المحتار فعلم أن الانحراف اليسير لا يضر، وهو الذي يبقى معه الوجه أو شيء من جوانبه مسامتاً لعين الكعبة أو لهوائها ، بأن يخرج الخط من الوجه أو من بعض جوانبه و يمر على الكعبة أو هوائها مستقيماً ولا يلزم أن يكون الخط الخارج على استقامة خارجاً من جبهة المصلى بل منها أو من جوانبها ...

وفى الخيرية : تحت قوله (سئل) ومن القواعد الفلكية إذا كان الانحراف عن مقتضى الأدلة أكثر من خمس وأربعين درجة يمنة أو يسرة يكون ذلک الانحراف خارجاً عن جهة الربع الذي فيه مكة المشرفة من غير إشكال ...

أجاب: حيث زالت بالانحراف المذكور المقابلة بالكلية ، بحيث لم يبق شيء من سطح الوجه مسامتاً للكعبة عدم الاستقبال المشروط لصحة الصلاة بالإجماع ، وإذا عدم

الشرط عدم المشروط .

عباراتِ مذکورہ سے سمتِ قبلہ کی جو حد ضروری معلوم ہوئی ہے، اس کا حاصل سہل اور عامیانہ عبارت میں یہ ہے کہ انسان کے چہرہ کا کوئی ذرا سا ادنیٰ حصہ خواہ وسط چہرہ کا ہو یا داہنی، بائیں جانب کا، بیت اللہ شریف کے کسی ذرا سے حصے کے ساتھ مقابل ہو جاوے اور فن ریاضی کی اصطلاحی عبارت میں یہ ہے کہ عین کعبہ سے پینتالیس درجہ تک بھی انحراف ہو جاوے تو استقبال فوت نہیں ہوتا اور نماز صحیح ہو جاتی ہے، اس سے زائد انحراف ہو تو استقبال فوت ہو کر نماز فاسد ہو جائے گی۔ (جواہر الفقہ :۲/ ۳۵۸،۳۶۰، ط: دار العلوم کراچی)۔

مذکورہ بالا عباراتِ فقہیہ سے معلوم ہوا کہ ۴۵ درجہ تک انحراف جہتِ قبلہ میں شامل ہے، لہٰذا بیت الخلا بناتے وقت ۴۵ درجہ سے زیادہ ہٹ کر بنائی جائے، تاکہ حدیث شریف کی وعید میں شامل نہ ہو۔

فتاویٰ حقانیہ میں مذکور ہے:

احادیثِ مبارکہ میں قبلہ کی طرف استنجاء کے وقت منہ یا پشت کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے متبادل بقیہ دونوں طرف منہ یا پشت کرنے کا حکم ہوا ہے اب یہ دونوں اطراف کے علاقے جغرافیائی نظام کے مطابق ہوں گے، یعنی جہاں کعبہ مغرب یا مشرق کی جانب ہو تو اس کے دونوں اطراف شمال وجنوب ہے اور جہاں کعبہ شمال یا جنوب کی طرف ہو تو وہاں کے رہنے والوں کو مشرق ومغرب کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے۔
(فتاویٰ حقانیہ:۲/۵۹۴، ط: اکوڑہ خٹک)۔

مزید ملاحظہ ہو: (الفتاوی الہندیۃ :۱/ ۵۰، والھدایۃ :۱/ ۶۵، وتبیین الحقائق :۱/ ۱۶۷، وبدائع الصنائع :۵/ ۱۲۶، والبحر الرائق :۲/ ۳۶، ومراقی الفلاح ،ص ۲۷، وفتاویٰ محمودیہ: ۵/ ۳۰۰، وفتاویٰ رحیمیہ : ۲/ ۳۵۹، وعمدۃ الفقہ : ۱/ ۲۸۵، وخیر الفتاویٰ : ۲/ ۱۷۴، وفتاویٰ فریدیہ:۲/ ۱۲۵، وکتاب الفتاویٰ :۲/ ۶۸)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

سانپ کے زہر کی پاکی، ناپاکی اور اس کے استعمال کا حکم:

سوال: سانپ کے زہر سے متعلق تحقیق مطلوب ہے کہ پاک ہے یا ناپاک؟ اور اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ نیز خارجی وداخلی استعمال کے اعتبار سے کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟ سانپ کا زہر بعض دواؤں میں اور بعض کوسمٹک (cosmetic) میں استعمال ہوتا ہے، تو کیا ایسی چیزیں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بینوا بالتفصیل۔

الجواب: سانپ کی کھال، گوشت اور زہر سب ناپاک ہیں اور ان کا خارجی و داخلی استعمال ناجائز ہے کیونکہ زہر؛ نجاست، خباثت اور ضرر تین چیزوں کا مجموعہ ہے، ہاں اگر دواؤں میں ڈالنے کی وجہ سے اس کی حقیقت و ماہیت تبدیل ہوجاتی ہو اور یہ تینوں چیزیں؛ نجاست، خباثت اور ضرر زائل ہوجائیں تو پھر ان دواؤں کا خارجی و داخلی استعمال جائز اور درست ہے۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وأما الذي يعيش في البر فأنواع ثلاثة : ما ليس له دم أصلاً، وما ليس له دم سائل، و ما له دم سائل، مثل الجراد والزنبور والذباب والعنكبوت...لا يحل أكله إلا الجراد خاصة ؛ لأنها من الخبائث لاستبعاد الطباع السليمة إياها وقد قال الله تبارک وتعالیٰ: ﴿ويحرم عليهم الخبائث﴾...وكذلک ماليس له دم سائل مثل الحية والوزغ...وجميع الحشرات وهوام الأرض، من الفار والقراد والقنافذ...ولا خلاف في حرمة هذه الأشياء إلا في الضب فإنه حلال عند الشافعيؒ. (بدائع الصنائع: ۳۶/۵،سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے:

جلد الحية نجس وإن كانت مذبوحة ؛ لأنه لا يحتمل الدباغة ، هكذا في الظهيرية. (الفتاویٰ الهندية: ۴۶/۱). (لیکن فی زماننا کیمیکل سے دباغت ممکن ہے لہٰذا پاک ہوجائے گی۔)

علامہ ابن حجر ہیتمی شافعیؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

وسئل: أمدنا الله من مدده ...هل سم الحيات ونحوها نجس؟

فأجاب : أفاض الله على من فيض مدده...سم الحيات نجس كما صرح به جمع متقدمون ومتأخرون ، والله سبحانه وتعالیٰ أعلم . (الفتاوى الفقهية الكبرى: ۲۸/۱،دارالفكر).

اسنی المطالب میں مذکور ہے:

وممن صرح بنجاسة سم الحيات العجلي . (أسنى المطالب: ۱۷۲/۱،دارالكتاب الإسلامي).

حرمت کے اسباب میں سے ایک سبب زہر بھی ہے چونکہ انسانی جسم کو نقصان دہ ہے اس وجہ سے ممنوع ہے۔

ملاحظہ ہوالانتفاع بالاعیان المحرمۃ میں مذکور ہے:

الأسباب الشرعية العامة فى التحريم ؛ تختلف الأسباب الكامنة وراء تحريم أى عين من الأعيان وتتعدد بحسب ماهية العين المحرمة، ويمكن إجمال تلك الأسباب بنقاط كما يأتي: أولاً : الأعيان المحرمة بسبب الضرر، كثيرة ولا حصر لها، من ذلک الأعيان السامة سواء أكانت السموم فيها مضرة على الفور كبعض أنواع من العقارب والحيات أم كانت سمومها ملحقة للإنسان بالضرر على المدى الطويل كالدخان . (الانتفاع بالاعيان المحرمة ،ص ٢٦ ،ط:دار النفائس اردن).

بہشتی زیور میں ہے: جاننا چاہیے کہ شریعتِ مطہرہ میں استعمال کے منع ہونے کی وجہیں چار ہیں: ۱۔ نجاست جیسے پیشاب پاخانہ وغیرہ،۲۔مضر ہونا جیسے سنکھیا میں اور،۳استخباث یعنی طبیعتِ سلیمہ کا اس سے گھن کرنا جیسے کیڑے مکوڑوں میں اور،۴نشہ لانا۔(بہشتی زیور،ص۹۸،نواں حصہ،ط:دارالاشاعت،کراچی)۔

امدادالفتاویٰ میں مذکور ہے:

اژدہا سانپ کا پتہ (زہرہ) ہمارے یہاں بچوں کو دوا میں بکثرت استعمال کراتے ہیں؛ بلکہ ماں بچہ دونوں کو کھلاتے ہیں، کسی طرح جائز ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ہمارے یہاں شاید کہ کوئی ایسا ہوگا کہ اس کو نہ کھایا ہو؟

الجواب: جائز نہیں۔اس پر محشی مفتی شبیر احمد قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

اس لیے کہ ناپاک اور نجس چیز سے دوا کرنا اصل مذہب میں ناجائز ہے اور متاخرین فقہاء نے تداوی بالمحرم کی جو اجازت دی ہے وہ اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ جب کوئی ڈاکٹر اس نجس دوا کے فائدہ مند ہونے کو بیان کرے اور کوئی دوسری دوا حلال و پاک اس کے قائم مقام نہ ہوسکے،تو اس نجس دوا کو استعمال کرسکتا ہے اور صورتِ مسئولہ فی السوال سے معلوم ہوتا ہے کہ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو ہر حال میں پتہ بچوں اور ماں کو کھلاتے ہیں اور یہ پتہ چونکہ ایک نجس و ناپاک چیز ہے؛ کیونکہ ہر جاندار کے پتہ کا وہی حکم ہے جو اس کے پیشاب کا ہے، لہٰذا اس کو بلاضرورت استعمال کرنا جائز نہیں۔(امدادالفتاوی مع الحاشیہ:۹/۲۶۴،ط:زکریا بک ڈپو،انڈیا)۔

ہاں اگر دواؤں میں ڈالنے کی وجہ سے انقلابِ عین ہوجاتا ہے تو اس کے استعمال کی اجازت ہوگی۔

کیونکہ انقلابِ عین مطہرات میں سے ہے۔ ملاحظہ ہو محقق ابن ہمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

وكثير من المشايخ اختاروا قول محمدؒ وهو المختار لأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة، وتنتفي الحقيقة بانتفاء بعض أجزاء مفهومها فكيف بالكل؟ فإن الملح غير العظم واللحم، فإذا صار ملحاً ترتب حكم الملح. ونظيره في الشرع: النطفة نجسة وتصير علقة وهي نجسة، وتصير مضغة فتطهر، والعصير طاهر فيصير خمراً فينجس، ويصير خلاً فيطهر، فعرفنا أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها. وعلى قول محمدؒ فرعوا الحكم بطهارة صابون صنع من زيت نجس. (فتح القدير: ۱/۲۰۰، دارالفکر).

قال ابن رشد: إنه قد علم من ضرورة الشرع أن الأحكام المختلفة إنما هي لذوات المختلفة، وأن الخمر غير ذات الخل، والخل بإجماع حلال، فإذا انتقلت ذات خمر إلى ذات الخل، وجب أن يكون حلالاً كيفما انتقل. (بداية المجتهد: ۱/۳۴۹، الاطعمة).

مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

الخمائر والجلاتين المتخذة من الخنزير: إن كان العنصر المستخلص من الخنزير تستحيل ماهيته بعملة كيمياوية، بحيث تنقلب حقيقته تماماً، زالت حرمته ونجاسته، وإن لم تنقلب حقيقته بقي على حرمته ونجاسته، لأن انقلاب الحقيقة مؤثر في زوال الطهارة والحرمة عند الحنفية. (بحوث في قضايا فقهية معاصرة: ۱/۳۴۱، مكتبة دارالعلوم كراتشي).

للمزيد من البحث راجع: (بدائع الصنائع: ۱/۸۵، سعيد، و مجلة المجمع الفقهي الاسلامي، ص۱۸۹. ۱۹۰، الاستحالة واحكامها في الفقهي الاسلامي، والموسوعة الفقهية: ۱۰/۲۷۸، والفقه الاسلامي وادلته: ۱/۱۰۰، دارالفكر، وجدید فقہی تحقیقات، از اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا مرتبہ: حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند).

انقلابِ حقیقت سے متعلق حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تحریر چشم کشا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

انقلابِ حقیقت سے مراد یہ ہے کہ وہ شے فی نفسہٖ اپنی حقیقت چھوڑ کر کسی دوسری حقیقت میں متبدل ہو جائے جیسے شراب سرکہ ہو جائے یا خون مشک بن جائے یا نطفہ گوشت کا لوتھڑا وغیرہ وغیرہ کہ ان صورتوں میں

شراب نے فی نفسہٖ اپنی حقیقتِ خمریہ اور خون نے اپنی حقیقتِ دمویہ اور نطفہ نے اپنی حقیقتِ منویہ چھوڑ دی اور دوسری حقیقتوں میں متبدل ہوگئے حقیقت بدل جانے کا حکم اسی وقت دیا جاسکتا ہے کہ حقیقتِ اولیٰ منقلبہ کے آثارِ مختصہ اس میں باقی نہ رہیں جیسا کہ امثلہ مذکورہ میں پایا جاتا ہے کہ سرکہ بن جانے کے بعد شراب کے آثارِ مختصہ بالکل زائل ہوجاتے ہیں۔

بعض آثار کا زائل ہوجانا یا بوجہ قلت آثار کا محسوس نہ ہونا موجبِ انقلاب نہیں جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر آٹے میں کچھ شراب ملا کر گوندھ لیا جائے اور روٹی پکالی جائے تو وہ روٹی ناپاک ہے یا گھڑے دو گھڑے پانی میں تولہ دو تولہ شراب یا پیشاب ملا دیا جائے تو وہ پانی ناپاک ہے حالانکہ روٹی یا پانی میں اس قلیل المقدار شراب کا کوئی اثر محسوس نہ ہوگا لیکن چونکہ شراب نے ان صورتوں میں فی نفسہٖ اپنی حقیقت نہیں چھوڑی ہے اس لیے ناپاکی کا حکم باقی ہے اور محسوس نہ ہونا بوجہ قلت اجزاء کے ہے چونکہ شراب کے اجزاء کم تھے اور آٹے کے زیادہ اس لیے وہ روٹی میں محسوس نہیں پس یہ اختلاط ہے نہ کہ انقلاب۔

اسی طرح حقیقتِ منقلبہ کی بعض کیفیات غیر مختصہ کا باقی رہنا مانع انقلاب نہیں جیسے شراب کے سرکہ بن جانے کے بعد بھی اس کی رقت باقی رہتی ہے یا صابون میں قدرے دسومت روغن نجس کی باقی رہتی ہے کیونکہ رقت حقیقتِ خمریہ کے ساتھ اور دسومت حقیقتِ دہنیہ کے ساتھ مختص نہیں ہے، پس انقلابِ عین کی وجہ سے تبدل احکام کا حکم کرتے وقت بہت غور و احتیاط سے کام لینا ضروری ہے کیونکہ بسا اوقات انقلاب واختلاط میں اشتباہ پیش آجاتا ہے اور انقلاب کو اختلاط یا اختلاط کو انقلاب سمجھ لیا جاتا ہے۔ واللہ الموفق۔ (کفایت المفتی: ۲/۳۳۳، ط: دار الاشاعت، کراچی)۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ رقمطراز ہے:

تبدیل ماہیت کا بیان: تبدیل ماہیت سے احکام بھی بدل جاتے ہیں مثلاً انگور کا پانی پاک ہے لیکن جب کہ وہ ایک دوسری چیز یعنی شراب بن گیا تو وہ نجس ہوگیا اور شراب جب پھر دوسری چیز بن گئی، یعنی سرکہ ہوگئی تو پاک ہوگئی۔ تبدیل ماہیت کے یہ معنی ہیں کہ ایک چیز سے ایسی دوسری چیز بن جائے جس کا حکم شی اول کے بالکل خلاف ہے، مثلاً ناپاک چیز ایک ایسی چیز کی طرف مستحیل ہوگئی کہ وہ چیز پاک ہے تو وہ ناپاک چیز پاک ہوگئی جیسے کھاد ناپاک ہے مگر جب مٹی ہوگیا تو مٹی ایک پاک چیز ہے تو وہ پاک ہوگیا، یا انڈا پاک ہے مگر خون بن گیا اور

خون ایک ناپاک چیز ہے تو انڈا ناپاک ہوگیا اور جب اس خون کا مضغہ گوشت بن گیا تو گوشت پاک چیز ہے پھر پاک ہوگیا، اور اگر انقلاب ایسی چیز کی طرف ہوا جس کا حکم ویسا ہی ہے جیسا اس کا قبل انقلاب کے تھا تو وہ ہی حکم رہے گا پاک تھی تو پاک ناپاک تھی تو ناپاک مثلاً پاک ہڈی جل کر راکھ ہوگئی تو انقلاب تو ہوا مگر حکم وہی رہا کیونکہ راکھ بھی پاک ہے، اور اگر نطفہ خون بن گیا تو انقلاب تو ہوا مگر ناپاک کا ناپاک کی طرف اور حکم بدستور رہا، ہاں جب مضغہ گوشت بن گیا تو پاک ہوگیا کیونکہ مضغہ گوشت پاک ہے اور اگر انقلاب ہی ناتمام ہوا تو یعنی دوسری چیز مغائر شئ اول کے نہیں بن گئی صرف ایک گونہ تبدیلی ہوگئی تو احکام نہ بدلیں گے جیسے ناپاک گیہوں کی روٹی پکالی کہ بجائے گیہوں کی صورت کے روٹی کی صورت پیدا ہوگئی لیکن یہ دوسری چیز بن جانا نہیں سمجھا جاتا۔ (بہشتی زیور، نواں حصہ، ص۸۲۷، ط: دارالاشاعت)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

سانپ کے زہر سے بنی ہوئی کریم استعمال کرنے کا حکم:

سوال: آج کل بناؤ سنگھار اور مختلف دواؤں میں سانپ کا زہر استعمال ہوتا ہے، مثلاً: ایک کریم ملتی ہے اس میں سانپ کا زہر استعمال کرتے ہیں، یہ کریم چہرے پر لگائی جاتی ہے تاکہ بوڑھاپے کے آثار چہرے پر نمایاں نہ ہوں، تو کیا ایسی کریم کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: احناف کے نزدیک سانپ حرام جانوروں میں سے ہے اور اس کا زہر نجس ہے۔ اگر دواؤں میں اس کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی ہے تو بوقتِ ضرورت بغرض علاج اس کا خارجی استعمال درست ہے ورنہ نہیں، اور صورتِ مسئولہ میں بناؤ سنگھار کوئی ضرورت کی چیز نہیں ہے، اس لیے نجس چیز کا استعمال جائز اور درست نہیں۔ ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں ہے:

في الحاوی الزاهدی: يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع منها للأدوية وما جاز الانتفاع بجلده أوعظمه أی من حيوانات البحر أو غيرها . (رد المحتار: ۵ /۶۸، سعید).

وقال العلامة الرافعي: قوله يجوز بيع الحيات، هي وإن كان فيها نفع إلا أنه يحرم أكلها فليحرر حموی ، سندی . (التحرير المختار: ۵/ ۱۴۱، سعید).

فتاوی ہندیہ میں مرقوم ہے:

و يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها في الأدوية وإن كان لا ينتفع بها لا يجوز والصحيح أنه يجوز بيع كل شيء ينتفع به كذا في التتارخانية . (الفتاوى الهندية: ۱۱۴/۳).

وينظر للمزيد : (فتح القدير: ۱۱۸/۷، ط: دار الفكر). **واللہ ﷻ اعلم۔**

باب ...... ﴿۲﴾
نماز سے متعلق متفرق مسائل

نماز میں آیتِ کریمہ غلط پڑھنے پر فسادِ نماز کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے فجر کی نماز میں سورۂ اعلیٰ کی آیتِ کریمہ ﴿ ویتجنبها الأشقى، الذي يصلى النار الكبرى﴾ [الأعلى: ۱۲] کی جگہ یوں پڑھا، ﴿وسيجنبها الأتقى، الذي يؤتي ماله يتزكى﴾ [الليل: ۱۷، ۱۸]، کیا نماز ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نماز میں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت پڑھنے کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کی وجہ سے معنی میں فساد نہیں آیا تو بالاتفاق نماز صحیح اور درست ہے، لیکن اگر معنی میں فساد آیا تو اگر پہلی آیت پر وقف کر کے دوسری آیت پڑھی تو نماز درست ہوگئی ورنہ نہیں۔ بنابریں صورتِ مسئولہ میں اگر امام صاحب نے "من يخشى" پر وقف کر کے "وسيجنبها الأتقى"، پڑھا تو نماز ہوگئی ورنہ نہیں۔ ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وصحح الباقاني الفساد إن غير المعنى نحو، رب رب العالمين للإضافة كما لو دل كلمة بكلمة وغير المعنى نحو: إن الفجار لفي جنات؛ قال في رد المحتار: وقيد الفساد فى الفتح وغيره بما إذا لم يقف وقفاً تاماً، أما لو وقف ثم قال: لفي جنات ، فلا تفسد. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۶۳۳، ۶۳۴، سعید).

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

و يتجنبها الأشقى قرأ الأتقى بالتاء وقال: إن وصل به الذي يصلى النار الكبرى تفسد

صلاته وإن لم يصل بل وقف ثم ابتدأ بالذى يصلى النار الكبرى لا تفسد صلاته وكذا لو قرأ وسيجنبها الأتقى الذي، سيجنبها الأشقى الذي إن وصل به الذي يؤتى ماله يتزكى تفسد صلاته وإلا فلا . (فتاویٰ قاضی خان علی هامش الفتاوى الهندية: ۱/ ۱۴۶،ط: دارصادر).

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے نمازِ جمعہ پڑھاتے ہوئے پہلی رکعت میں سورۂ اعلیٰ پڑھی اوراس کی آیت: سيذكر من يخشى ويتجنبها الأشقى الذى يصلى النار الكبرى، کی بجائے ويتجنبها الأتقى الذي يؤتى ماله يتزكى، وما لأحد عنده من نعمة تجزى، إلى آخر سورة الليل ختم کردی، پھر بغیر درست کیے پہلی رکعت کا رکوع کر دیا، نماز درست ہوگئی یا فاسد ہوگئی؟

جواب: اگر يخشى پر وقف کر کے آگے پڑھا تو نماز ہوگئی ورنہ نہیں۔ (احسن الفتاویٰ: ۳/ ۴۴۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

امام سے آیتِ سجدہ سن کر دوسری رکعت میں شامل ہونے پر سجدۂ تلاوت کا حکم:

سوال: ایک شخص وضو کر رہا تھا، امام صاحب جمعہ کی صبح سورۂ الم سجدہ پڑھ رہے تھے، لاؤڈ اسپیکر سے اس نے آیتِ سجدہ سنی، پھر وہ دوسری رکعت میں شامل ہوا، کیا اس پر سجدۂ تلاوت ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور پر سجدۂ تلاوت واجب ہے، نماز کے بعد اس کو ادا کر لیوے۔ ہاں اگر آیتِ سجدہ خارجِ نماز سن کر اسی رکعت میں شامل ہو جائے تو امام کا سجدہ کافی ہو جائیگا اب دوبارہ سجدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں مذکور ہے:

قال المرغيناني: فإن قرأها الإمام وسمعها رجل ليس معه فى الصلاة فدخل معه بعدها سجدها الإمام لم يكن عليه أن يسجدها ، لأنه صار مدركاً لها بإدراك الركعة ، وفي حاشية اللكنوي: هذا إذا أدركه في آخر تلك الركعة، أما لو أدركه فى الركعة الأخرى يسجدها بعد الفراغ لأنه لا يصير مدركاً لتلك القراءة ولا لما تعلق بتلك القراءة من السجدة . (الهداية: ۱/ ۱۶۴، رقم الحاشية ۲،ط: شركة علمية).

قال في فتح القدير: قوله فدخل معه، بعد ما سجدها يعني دخل معه في تلك الركعة أما لو دخل فى الثانية كان عليه أن يسجدها بعد الفراغ. (فتح القدير: ۲/۱۷، دارالفکر).

(وكذا فى تبيين الحقائق: ۱/۲۰۷،امدادیه، والدرالمختار: ۲/۱۱۰،سعید).

فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے:

اگرامام کے سجدہ کرنے سے پہلے یا سجدہ کرنے کے بعد اس رکعت کے آخر میں امام کے پیچھے نیت باندھ لی اور نماز میں شامل ہو گئے تو امام کا سجدہ آپ کے لیے بھی کافی ہے علیحدہ سجدہ کرنا نہیں ہوگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۳/۳۴۰، مکتبۃ الاحسان، دیوبند)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

اشراق کی نماز پڑھنے کا صحیح وقت:

سوال: ساؤتھ افریقہ میں طلوعِ آفتاب کے کتنی منٹ بعد اشراق کی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے؟

الجواب: سورج طلوع ہونے کے بعد جب اتنا اونچا ہو جائے کہ اس پر آنکھ اچھی طرح ٹھہر نہ سکے اُس وقت سے اشراق کا وقت شروع ہوتا ہے، اور یہ طلوعِ شمس کے دس منٹ بعد ہوتا ہے لہٰذا دس، بارہ منٹ کے بعد اور احتیاطاً پندرہ، بیس منٹ کے بعد اشراق کی نماز پڑھنی چاہیے۔ ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں مرقوم ہے:

واختلف أصحابنا في قدر الوقت الذي تباح فيه الصلاة بعد الطلوع قال فى الأصل: حتى ترتفع الشمس قدر رمح أو رمحين وقال أبوبكر محمد بن الفضل ما دام الإنسان يقدر على النظر إلى قرص الشمس لا تباح فيه الصلاة فإن عجز عن النظر تباح. (عمدة القارى: ۴/۱۲۵، باب الأذان بعد ذهاب الوقت، ط: دارالحديث، ملتان).

حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح میں ہے:

أولها عند طلوع الشمس إلى أن ترتفع وتبيض قدر رمح أو رمحين... وحده أن لاتحار العين فى العين هو الصحيح. (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، ص۱۸۶، ط: قديمى).

فتاوى الشامى میں مذکور ہے:

وکره تحريماً مع شروق، قوله مع شروق وما دامت العين لا تحار فيها فهي في حكم الشروق كما تقدم في الغروب أنه الأصح كما في البحر، أقول: ينبغي تصحيح ما نقلوه عن الأصل للإمام محمد من أنه ما لم ترتفع الشمس قدر رمح فهي في حكم الطلوع لأن أصحاب المتون مشوا عليه في صلاة العيد حيث جعلوا أول وقتها من الارتفاع ولذا جزم به هنا في الفيض ونور الإيضاح . (فتاوى الشامي: ۱/ ۳۷۱،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے: سورج جب نکلنا شروع ہوتا ہے تو دومنٹ چوبیس سکنڈ میں پورا نکل آتا ہے، پھر جب اس کی طرف نظر نہ کی جاسکے اور بالکل سفید ہوجائے، تب اشراق کا وقت شروع ہوجاتا ہے، عامۃً بیس منٹ کے بعد بالکل سفید ہوجاتا ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۵/۳۳۴، جامعہ فاروقیہ)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں مرقوم ہے: اشراق کی نماز کا وقت طلوعِ آفتاب کے بعد تقریباً ۱۲۔۱۵ منٹ پر شروع ہوجاتا ہے۔(فتاویٰ رحیمیہ:۲/ ۳۶۸،الاحسان، دیوبند)۔

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے: طلوع کے بعد جب آفتاب میں اتنی تیزی آجائے کہ اس پر کچھ دیر تک نظر جمانا مشکل ہو، تو اشراق کا وقت شروع ہوجاتا ہے، اس کی مقدار ہر مقام اور ہر موسم میں مختلف ہوتی ہے....۔ (احسن الفتاویٰ:۳/ ۴۶۷)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

بڑے شہروں میں چونکہ طلوع اور غروب کے وقت آفتاب کا مشاہدہ مشکل ہے، اس لیے اس کا معیار متعین کرنے کی ضرورت ہے، الخ، چنانچہ حسبِ ہدایت ومشاہدات سے ثابت ہوا کہ طلوع سے نومنٹ بعد آفتاب میں معہود تمازت آگئی، اور یہ فیصلہ بہت احتیاط سے کیا گیا ہے، ...کراچی میں مارچ اور ستمبر میں طلوع کے بعد نومنٹ اور جون اور دسمبر میں گیارہ منٹ پر مکروہ وقت ختم ہوجاتا ہے۔(احسن الفتاویٰ:۲/۱۴۲)۔واللہ ﷻ اعلم۔

سجدۂ تلاوت میں تاخیر کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب ہونے کا حکم:

سوال: ایک امام نے سجدۂ تلاوت کی آیت پڑھی اور اس وقت سجدہ نہیں کیا، چار پانچ آیات کے بعد

سجدہ کیا تو سجدۂ سہو واجب ہوا یا نہیں؟ آخری رکعت میں سجدۂ تلاوت کا کیا حکم ہے؟ اگر کسی امام نے سجدۂ تلاوت کے بعد کھڑے ہوکر سوۂ فاتحہ شروع کردی پھر لقمہ دینے پر قراءت شروع کی تو کیا سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ فصل کبیر کی وجہ سے اصح قول یہ ہے کہ سجدۂ سہو واجب ہوگا، سجدۂ سہو کرنے سے نماز صحیح ہوجائے گی، اسی طرح جس رکن میں یاد آئے سجدہ کرلے، امام نے سجدۂ تلاوت کے بعد سورۂ فاتحہ شروع کی تو سجدۂ سہو واجب نہیں کیونکہ تکرارِ فاتحہ ضم سورت کے بعد ہے۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

قال في الفتاوى الهندية: المصلي إذا تلا آية سجدة ونسي أن يسجد لها ثم ذكرها وسجدها وجب عليه سجود السهو، لأنه تارک للوصل وهو واجب وقيل: لا سهو عليه والأول أصح كذا في التتارخانية . (الفتاوى الهندية: ۱/۱۲۷).

وفي رد المحتار: قوله فعلى الفور، جواب شرط مقدر تقديره فإن كانت صلوية فعلى الفور، ثم تفسير الفور عدم طول المدة بين التلاوة والسجدة بقراء ة أكثر من آيتين أو ثلاث. (فتاوى الشامي: ۲/۱۱۰، سعيد).

وفي الدرالمختار: ولو تذكر المصلي في ركوعه أو سجوده أنه ترک سجدة صلبية أو تلاوية فانحط من ركوعه بلا رفع أو رفع من سجوده فسجدها عقب التذكر أعادهما أي الركوع والسجود ندباً لسقوطه بالنسيان وسجد للسهو. وفي الشامية: قوله لسقوطه، أي سقوط وجوب الإعادة المبني على وجوب الترتيب؛ فإن الترتيب فيما شرع مكرراً من أفعال الصلاة واجب؛ يأثم بتركه عمداً، ويسقط بالنسيان، وينجبر بسجودالسهو. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۲۱۲، سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

اگر آیتِ سجدہ پڑھ کر فوراً یاد نہیں آیا بلکہ اس کے بعد تین آیت پڑھ کر یاد آیا اور سجدۂ تلاوت کرلیا تو سجدۂ سہو لازم نہیں اگر اس سے زائد پڑھ کر یاد آیا اور پھر سجدۂ تلاوت کیا تو سجدۂ سہو لازم ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۱/۵۴۳،

مکتبہ محمودیہ)۔

وقال فی الجوهرة : ولو قرأ فيهما الفاتحة ثم السورة ثم الفاتحة ساهياً لم يجب عليه سهو وصار كأنه قرأ سورة طويلة . (الجوهرة النيرة : ۱/ ۹۲).

وفی الفتاوی الهندية : ولو قرأ الفاتحة ثم السورة ثم الفاتحة لا سهو عليه كذا فی الظهيرية وهكذا فی التجنيس و هو الأصح هكذا فی الزاهدی . (الفتاوی الهندية : ۱/ ۷۱).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے: سوال: امام نے الحمد کے بعد ایسی سورت پڑھی جس میں آیتِ سجدہ آ گئی اور سجدۂ تلاوت کیا پھر کھڑے ہوکر الحمد پڑھی تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

جواب: ایسی حالت میں سجدۂ سہو واجب نہیں اگر الحمد دو دفعہ مسلسل پڑھتا یعنی درمیان میں کسی اور قراءت کا فصل نہ ہوتا تب سجدۂ سہو واجب ہوتا۔ فتاویٰ قاضی خان۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۱/ ۴۸۴، مکتبہ محمودیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

آیتِ سجدہ تلاوت کرنے کے بعد دو سجدے کرنے سے نماز کا حکم:

سوال: ایک حافظ صاحب نے نماز میں آیتِ سجدہ پڑھی اور ایک سجدہ کی بجائے دو سجدے کر لیے، کیا نماز ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایک زائد سجدہ کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم ہوا، لہٰذا سجدۂ سہو کرنے سے نماز ہو جائے گی۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے:

إذا سجد في موضع الركوع أو ركع في موضع السجود أو كرر ركناً أو قدم الركن أو أخره ففي هذه الفصول كلها يجب سجود السهو. (الفتاوی الهندية: ۱/ ۱۲۷، دار الفكر).

قال فی الاختيار لتعليل المختار: قال: ويجب إذا زاد في صلاته فعلاً من جنسها ، كزيادة ركوع أو سجود أو قيام أو قعود ، لأنه لا يخلو عن ترك واجب أو تأخره عن محله وذلك موجب للسهو، لأنه عليه الصلاة والسلام ، قام إلى الخامسة فسبح به فعاد وسجد للسهو . (الاختيار لتعليل المختار: ۱/ ۷۳، ط: القاهرة).

(وكـذا فـي الهـداية : ۱/ ۱۱۹، بيـروت،وشـرح مـنية المـصـلى ،ص ۴۵۶،ط:سهيل اكيڈمى،وفتاوىٰ رحيميه:۵/۲۰۵، كراچى). واللہ ﷻ اعلم۔

درجہ حفظ میں سبق یاد کرتے وقت، سناتے وقت تکرارِ آیت پر تکرارِ سجدہ کا حکم:

سوال: درجہ حفظ میں طلبہ اپنی جگہ پر سبق یاد کرتے ہیں، پھر استاذ صاحب کے پاس جا کر سناتے ہیں تو کیا یہ تبدیل مجلس کے حکم میں ہوگا اور دو سجدے واجب ہوں گے یا ایک؟ ۲۔ جب استاذ کسی طالبِ علم کی اصلاح کرے تو کتنے سجدے واجب ہوں گے؟ ۳۔ طالبِ علم اپنا دور یاد کرتے ہوئے تھوڑا وقفہ لیکر پانی پینے کے لیے چلا جائے تو تبدیل مجلس کے حکم میں ہوگا یا نہیں؟ **بينوا بالتفصيل توجروا بالأجر الجزيل .**

الجواب: ۱۔ بصورتِ مسئولہ اگر استاذ اور طالبِ علم کا مکان متحد ہو تو دونوں پر ایک ہی سجدہ واجب ہوگا اور دو تین قدم کی حرکت مضر نہیں ہے، اور اگر دونوں کا مکان مختلف ہے تو دو سجدے واجب ہوں گے۔

۲۔ اصلاح اور تنبیہ کرتے وقت اگر سجدہ کے لفظ کے ساتھ اکثر آیت پڑھی تو سجدہ واجب ہوگا ورنہ نہیں۔ ہاں ایک مجلس میں ایک آیتِ سجدہ پڑھی پھر وہی آیت دوسرے سے بھی سنی تب بھی ایک سجدہ واجب ہوگا۔

۳۔ طالبِ علم آموختہ یاد کرتے وقت اپنی جگہ پر ہی بیٹھے بیٹھے چند گھونٹ پانی پی لے تو تبدیل مجلس نہیں ہوگی، ہاں باہر چلا جائے تو مجلس بدل جائے گی اور تکرارِ آیت سے تکرارِ سجدہ کا حکم عائد ہوگا۔

۱، اور ۳ کے دلائل ملاحظہ فرمائیں؛ درمختار مع ردالمحتار میں منقول ہے:

ولـو كـررها في مجلسين تكررت وفي مجلس واحد لا تتكرر بل كفته واحدة . وفي رد المـحتـار: قـوله ولو كررها...الأصل أنه لا يتكرر الوجوب إلا بأحد أمور ثلاثة اختلاف التلاوة أوالسماع أو المجلس أما الأولان فالمراد بهما اختلاف المتلو والمسموع حتى لو تـلا سـجـدات القرآن كلها أو سمعها في مجلس أو مجالس وجبت كلها ، وأما الأخير فهو قسـمـان حـقيقي بالانتقال منه إلى آخر بأكثر من خطوتين كما في كثير من الكتب أو بأكثر مـن ثـلاث كـمـا فى المحيط مالم يكن للمكانين حكم الواحد كالمسجد والبيت والسفينة

ولو جارية والصحراء بالنسبة للتالی فی الصلاة راكباً وحكمی وذلک بمباشرة عمل يعد فی العرف قطعاً لما قبله كما لو تلا ثم أكل كثيراً أو نام مضطجعاً...بخلاف ما إذا طال جلوسه أو قراء ته أو سبح أو هلل أو أكل لقمة أو شرب شربة أو نام قاعداً أو كان جالساً فقام أو مشی خطوتين أو ثلاثاً ...الخ. (فتاوی الشامی: ۲/۱۱۴،سعيد).

مراقی الفلاح میں علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں:

ولا يتبدل مجلس السماع والتلاوة بزوايا البيت الصغير ولايتبدل مجلس التلاوة بزوايا المسجد و لوكان كبيراً لصحة الاقتداء مع اتساع الفضاء فيه . (مراقی الفلاح مع حاشية الطحطاوی ،ص ۴۹۵،ط:قديمی).

بدائع الصنائع میں مذکور ہے:

الأصل فيه ماروی أن جبرئيل عليه السلام كان ينزل بالوحی فيقرأ آية السجدة علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم، ورسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم كان يسمع ويتلقن ثم يقرأ علی أصحابه وكان لا يسجد إلا مرة واحدة و روي عن أبی عبد الرحمن السلمی معلم الحسن والحسين رضی اللّٰه تعالیٰ عنهم، نه كان يعلم الآية مراراً وكان لا يزيد علی سجدة واحدة والظاهر أن علياً رضي اللّٰه تعالیٰ عنه كان عالماً بذلک ولم ينكر عليه .

وروی عن أبي موسی الأشعري، رضي اللّٰه تعالیٰ عنه ، أنه كان يكرر آية السجدة حين كان يعلم الصبيان وكان لا يسجد إلا مرة واحدة ولأن المجلس الواحد جامع للكلمات المتفرقة كما فی الإيجاب والقبول ولأن في إيجاب السجدة في كل مرة إيقاع فی الحرج لكون المعلمين مبتلين بتكرار الآية لتعليم الصبيان والحرج منفی بنص الكتاب.
(بدائع الصنائع : ۱/۱۸۱،سعيد).

زبدۃ الفقہ میں حضرت مولانا سیدزوارحسین صاحبؒ فرماتے ہیں:

مجلس بدلنے کی دوقسمیں ہیں: حقیقی یعنی ایک مجلس سے دوسری مجلس میں دوقدم سے زیادہ چل کر جانا،

اب اگر وہ اسی جگہ آکر دوبارہ وہی آیت سجدہ پڑھے تب بھی دو سجدے واجب ہوں گے اور بعض کے نزدیک تین قدم سے زیادہ چل کر جانا لیکن اگر وہ جگہ مکان واحد کے حکم میں ہو مثلاً: چھوٹی مسجد ہو یا چھوٹا گھر یا کمرہ یا کوٹھڑی ہو تو اس میں مختلف جگہ تلاوت سے ایک ہی سجدہ واجب ہوگا۔۔۔

دوم حکمی یعنی ایک ہی آیتِ سجدہ دو دفعہ پڑھنے کے درمیان عمل کثیر کرنا مثلاً خرید وفروخت کرنا ایک دو لقمے سے زیادہ کھانا لیٹ کر سونا۔۔۔تو اس صورت میں سجدۂ تلاوت مکرر واجب ہوگا۔(زبدۃ الفقہ ا/۳۳۲)۔

جواب۲ کے دلائل ملاحظہ فرمائیں: فتح باب العنایہ میں مذکور ہے:

و لو قرأ آية السجدة إلا الحرف الذي في آخرها لا يسجد و لو قرأ الحرف الذي يسجد فيه وحده لا يسجد إلا أن يقرأ أكثر آية السجدة معه . (فتح باب العناية : ۱/۳۸۸، وكذا في الفتاوى الهندية : ۱/۱۳۲). مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۲/۴۷۹)۔واللہ ﷻ اعلم۔

قعدۂ اولیٰ میں سہواً سلام پھیرنے سے نماز کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے قعدۂ اولیٰ میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا مقتدیوں کے لقمہ دینے سے امام کو تنبہ ہوا، اب فقہ کی روشنی میں نماز ہوئی یا نہیں؟ سجدۂ سہو لازم ہوا یا نہیں؟ جبکہ امام کا مقصد سلام پھیرنا نہیں تھا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ سہواً لفظِ سلام کہنے سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی، البتہ تیسری رکعت کی طرف کھڑے ہونے میں تاخیر کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب ہوا۔سجدۂ سہو کرنے سے نماز صحیح ہو جائے گی۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

إن كل سلام ينبغي أن يكون مخرجاً لأنه جعل محللاً شرعاً لقول النبي صلى الله عليه وسلم : وتحليلها التسليم ولأنه من باب الكلام على ما مر إلا أنه منع من الإخراج حالة السهو دفعاً للحرج لكثرة السهو وغلبة النسيان. (بدائع الصنائع : ۱/۱۷۰، سعيد). (وكذا في فتح القدير : ۱/۵۱۷، دار الفكر).

وفي الفتاوى الهندية: ولا يجب السجود إلا بترك واجب أو تأخيره أو تأخير ركن

أو تقديمه أو تكراره أو تغيير واجب. (الفتاوى الهندية : ١/ ١٢٦).

(وكذا في شرح منية المصلى ،ص ۴۵۵،سهيل اكيڈمى). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مسجد میں تمباکو کھانے اور سگریٹ پینے کا حکم:

سوال: مسجد میں تمباکو کھانا اور سگریٹ پینا کیسا ہے؟

الجواب: مسجد میں بیڑی سگریٹ پینا اور تمباکو کھانا جائز اور درست نہیں، وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں عام طور پر بدبو ہوتی ہے اور بدبودار چیزیں مسجد میں کھانا درست نہیں۔ مسجد میں فرشتوں کو بدبودار چیزوں سے تکلیف ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح مسلم شریف میں روایت ہے:

عن جابر ﷺ قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن أكل البصل والكراث فغلبتنا الحاجة فأكلنا منها فقال: من أكل من هذه الشجرة المنتنة فلا يقربن مسجدنا فإن الملائكة تأذى مما يتأذى منه الإنس. وفي رواية حرملة وزعم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من أكل ثوماً أو بصلاً فليعتز لنا أو ليعتزل مسجدنا وليقعد في بيته ...الخ. (رواهما مسلم ، رقم : ۵۶۴، باب نهى من اكل ثوماً اوبصلاً او كراثاً اونحوهما).

قال الشيخ عطيه سالم في شرح بلوغ المرام: وفرع العلماء على هذا :كل ذى رائحة مؤذيه مطلقاً ، وعلماء العصر الحاضر يمثلون ذلك برائحة التبغ والدخان . (شرح بلوغ المرام : ٩/ ٢١،الشبكة الاسلامية).

قال في الدر المختار: وأكل نحو ثوم ويمنع منه وكذا كل مؤذ ولو بلسانه . وفي الشامية : قوله ، وأكل نحو ثوم ، أى كبصل ونحوه مما له رائحة كريهة للحديث الصحيح في النهي عن قربان آكل الثوم والبصل المسجد قال الإمام العيني في شرحه على صحيح البخاري قلت: علة النهى أذى الملائكة وأذى المسلمين ولا يختص بمسجده عليه الصلاة والسلام بل الكل سواء لرواية مساجدنا بالجمع... ويلحق بما نص عليه في الحديث كل

ماله رائحة كريهة مأكولاً أو غيره . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۱/ ۶۶۱، سعيد).

وفيه أيضاً: فيفهم منه حكم النبات الذي شاع في زماننا المسمى بالتتن فتنبه ، قد كرهه شيخنا العمادي في هديته، قوله كرهه شيخنا العمادى في هديته ، أقول: ظاهر كلام العمادي أنه مكروه تحريماً ويفسق متعاطيه . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۶/ ۴۶۰، سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مسجد میں قہقہہ مار کر ہنسنے کا حکم:

سوال: مسجد میں زور سے ہنسنے کا کیا حکم ہے؟ اور ضحک اور قہقہہ میں کیا فرق ہے؟ مسجد میں دونوں کی اجازت ہے یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ کیا تھی، تبسم، ضحک یا قہقہہ؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسجد میں شوروغوغا مکروہ اور منع ہے، اسی طرح زور سے کھل کھلا کر ہنسنا بھی مکروہ ہے یہ آدابِ مسجد میں مخل ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ عام طور پر تبسم فرمانے کی تھی، مسلم شریف کی روایت میں ہے ؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فجر کے بعد آفتاب کے طلوع ہونے تک اپنی جگہ پر تشریف فرما ہوتے، صحابہ کرام زمانہ جاہلیت کی باتیں کرتے اور ہنستے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تبسم فرماتے۔

مسلم شریف میں روایت ہے:

عن سماک بن حرب قال: قلت لجابر بن سمرة أكنت تجالس رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: نعم، كثيراً كان لايقوم من مصلاه الذى يصلى فيه الصبح أو الغداة حتى تطلع الشمس فإذا طلعت الشمس قام وكانوا يتحدثون فيأخذون في أمر الجاهلية فيضحكون ويتبسم . (رواه مسلم ، رقم: ۶۷۰، باب فضل الجلوس فى مصلاه بعدالصبح...).

تبسم مسکرانے کو کہتے ہیں جس میں آواز بالکل نہ ہو، ضحک وہ ہے جس میں کچھ ہلکی آواز ہو کہ دوسرے لوگ نہ سنیں اور قہقہہ وہ ہے جس میں اتنی زور سے آواز ہو کہ دوسرے لوگ بھی سن لیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ عمومی طور پر تبسم فرمانے کی تھی، ہاں کبھی کبھی ضحک فرماتے تھے جیسا کہ روایت میں آتا ہے ”**حتى بدت نواجذه**“، یہ مبالغہ کے لیے اور مراد انیاب ہیں، اس سے قہقہہ ثابت نہیں ہوتا۔

فتح الملہم میں مذکور ہے:

قوله: فيضحكون ويتبسم الخ؛ قال أهل اللغة: التبسم مبادئ الضحک، والضحک انبساط الوجه حتى تظهر الأسنان من السرور، فإن كان بصوت وكان بحيث يسمع من بعد فهو القهقهة، وإلا فهو الضحک، وإن كان بلا صوت فهو التبسم، وتسمى الأسنان فى مقدم الفم الضواحک، وهي الثنايا والأنياب وما يليها تسمى النواجذ. (فتح الملهم: ۴/ ۴۴۸، ط: دارالعلوم كراتشى).

عمدۃ القاری میں ہے:

التبسم ظهور الأسنان عند التعجب بلا صوت، وإن كان مع الصوت فهو إما بحيث يسمع جيرانه أم لا، فإن كان فهو القهقهة وإلا فهو الضحک، وقال أصحابنا: الضحک أن يسمع هو نفسه فقط، والقهقهة أن يسمع غيره، والتبسم لا يسمع هو ولا غيره. (عمدة القارى: ۱۵/ ۲۳۳، ط: دارالحديث، ملتان).

مسلم شریف کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو:

عن عائشةؓ زوج النبي صلى الله عليه وسلم أنها قالت: ما رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم مستجمعاً ضاحكاً حتى أرى منه لهواته إنما كان يتبسم. الخ. (رواه مسلم، رقم ۸۹۹).

وفي تفسير النيسابوري قال: وما روي أنه صلى الله عليه وسلم ضحک حتى بدت نواجذه فعلى وجه المبالغة فى الضحک النبوى. (تفسير النيسابورى: ۵/ ۳۰۰). (وكذا فى تحفة الأحوذى: ۱۰/ ۸۷، ط: بيروت، ومرقاة المفاتيح: ۱۶/ ۹۲).

قہقہہ مار کر ہنسنا شرعاً مکروہ اور منع ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: والذي يظهر من مجموع الأحاديث أنه صلى الله عليه وسلم كان في معظم أحواله لا يزيد على التبسم وربما زاد على ذلک فضحک والمكروه من ذلک إنما هو الإكثار منه أو الإفراط فيه لأنه يذهب الوقار... فقد روى البخارى فى الأدب المفرد وابن ماجه من وجهين عن أبي هريرة ﷺ رفعه لا تكثر الضحک فإن كثرة الضحک تميت

القلب . (فتح الباری: ۱۰/۵۰۵).

مرقاۃ المفاتیح میں ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں:

عن قتادة من أكابر التابعين قال : سئل ابن عمر رضي الله عنه : هل كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يضحكون؟ قال: نعم والإيمان ، أي نعم يضحكون ، والحال أن عظمة الإيمان وجلالته ، في قلوبهم أعظم من الجبل، فكانوا في غاية من الوقار والثبات على قواعد الآداب الشرعية ، وفي نهاية من مراعات مكارم الأخلاق الرضية ؛ حيث لم يتجاوزوا في حال الضحک وغيره عن دائرة الأمور الدينية ، وقال الطيبي: هو من باب الرجوع والقول بالموجب، أي؛ نعم كانوا يضحكون، لكن لا يتجاوزون إلى ما يميت قلوبهم ويتزلزل به إيمانهم من كثرة الضحک . (مرقاۃ المفاتیح : ۹/۱۰۳ ، باب الضحک،ط:ملتان). **واللہ ﷻ اعلم۔**

جمعہ کی فجر میں سورۂ روم پڑھنے کا ثبوت:

سوال: کیا جمعہ کے دن نمازِ فجر میں سورۂ روم کا پڑھنا کسی حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب: جمعہ کے دن نمازِ فجر میں سورۂ روم کا پڑھنا بعض روایات سے ثابت ہے، بنابریں گاہے گاہے پڑھنا مستحب ہے، ہاں بعض روایات میں مطلق نمازِ فجر میں سورۂ روم پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے اس میں جمعہ کی تخصیص نہیں ہے۔ دونوں قسم کی روایات ملاحظہ کیجیے: مصنف عبدالرزاق میں ہے:

عبد الرزاق عن معمر عن عبد الملک بن عمير أن النبي صلى الله عليه وسلم قرأ فی الفجر يوم الجمعة بسورة الروم . (مصنف عبدالرزاق: ۲/۱۱۷/۲۷۳۰ ،باب القراءۃ فی صلاۃ الصبح).

نسائی شریف کی روایت میں ہے:

عن سفيان عن عبد الملک عن شبيب أبي روح عن رجل من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم أنه صلى صلاة الصبح فقرأ الروم والتبس عليه فلما صلى قال: ما بال أقوام يصلون معنا لا يحسنون الطهور فإنما يلبس علينا القرآن أولئک. (سنن النسائی الکبری:

۱/۳۲۸/۱۰۲۱، القراء ۃ فی الصبح بالروم). و (مصنف عبدالرزاق : ۲/۱۱۶/۲۷۲۵).

خلاصہ یہ ہے کہ مصنفِ عبدالرزاق کی مرسل روایت سے جمعہ کی فجر میں سورۂ روم پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، اور نسائی کی روایت میں جمعہ کی تخصیص نہیں ہے لہٰذا کبھی کبھی جمعہ کی فجر میں سورۂ روم پڑھنا درست ہے، ہاں اس کو سنت نہیں سمجھنا چاہیے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دورانِ خطبہ سامع کے لیے درود شریف پڑھنے کا حکم:

سوال: جمعہ کے خطبہ کے دوران سامع جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی سنے یا آیتِ کریمہ: ”إن اللّٰه وملائكته يصلون على النبي...الخ. سنے تو جہراً درود شریف پڑھے یا سراً، بنگاہِ شریعت اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: سامع کے لیے خطبہ کے دوران آیتِ کریمہ: ” إن اللّٰه وملائكته...الخ “ سنتے وقت زور سے درود شریف پڑھنا منع ہے، ہاں دل ہی دل میں پڑھے یا سراً پڑھے، بوقتِ خطبہ جہراً درود شریف پڑھنا درست نہیں ہے۔ دلائل حسبِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

قال في الدرالمختار: والصواب أنه يصلي على النبي صلى اللّٰه عليه وسلم عند سماع اسمه في نفسه، وقال الشامي: وكذلك إذا ذكر النبي صلى اللّٰه عليه وسلم لا يجوز أن يصلوا عليه بالجهر بل بالقلب وعليه الفتوى، رملي. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۲/۱۵۸، ۱۵۹، سعيد).

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: وإذا أمر الخطيب بالصلاة على النبي صلى اللّٰه عليه وسلم، قوله يصلي سراً، بحيث يسمع نفسه كذا أفاده القهستاني وفي الشرح عن الحسامي يصلي في نفسه وفي الفتح عن أبي يوسف ينبغي في نفسه لأن ذلك مما لا يشغله عن سماع الخطبة فكان إحرازاً للفضيلتين وهو الصواب. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص ۵۱۹، باب الجمعة، قديمي).

وفي فتاوى الشامي: قوله في نفسه: أى بأن يسمع نفسه أو يصحح الحروف فإنهم فسروه به وعن أبي يوسفؒ قلباً ائتماراً لأمرى الإنصات والصلاة عليه صلى الله عليه وسلم كما في الكرماني قهستاني قبيل باب الإمامة. (فتاوى الشامي: ۱۵۹/۲، سعيد).

وللاستزادة راجع: (الهداية: ۱۲۱/۱، وحاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص۵۱۸، والعناية شرح الهداية: ۶۷/۲، والبناية شرح الهداية: ۳۸۰/۲، وفتح القدير: ۲۹۹/۱، وبدائع الصنائع: ۲۰۵/۲، سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

ایسی حالت میں درود شریف دل میں پڑھ لے؛ والصواب أن يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم عند سماع اسمه في نفسه، قوله: في نفسه، بأن يسمع نفسه أو يصحح الحروف ... الخ. (فتاویٰ محمودیہ: ۲۸۲/۸، جامعہ فاروقیہ)۔

مزید ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی: ۲۳۶/۵، جامعہ فاروقیہ، وفتاویٰ رحیمیہ: ۳۸۷/۳، وکتاب المسائل: ۴۶۴/۱)۔

ہاں بعض جگہوں پر یہ دستور ہے کہ خطیب کے آیت کریمہ: "إن الله وملائكته" پڑھتے وقت سامعین زور زور سے درود شریف پڑھتے ہیں، یہ درست نہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سنتِ فجر کی تحریمہ کے ساتھ نمازِ فجر کی جماعت میں شریک ہونے کا حکم:

سوال: ایک آدمی صف میں فجر کی سنت پڑھ رہا تھا کہ فجر کی جماعت شروع ہوگئی، تو اس آدمی نے نیت توڑے بغیر فرض کی نیت کر لی اور امام کے ساتھ نماز پڑھی۔ کیا اس شخص کی نماز درست ہوئی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور نے اگر دوبارہ تحریمہ کی ہے تو فجر کا فرض ادا ہوگیا لیکن اگر سنت کی تحریمہ سے اقتداء کر لی اور نماز پوری کی تو فرض ادا نہیں ہوا سنت ادا ہوئی فرض دوبارہ پڑھ لے۔ اور آئندہ ایسا نہ کرے بلکہ سنت جلدی سے ختم کر کے فرض میں شریک ہوجانا چاہیے۔ ملاحظہ ہو در مختار میں ہے:

ولا تبطل بنية القطع ما لم يكبر بنية مغايرة. وفي الشامي: وكذا بنية الانتقال إلى غيرها، قوله ما لم يكبر بنية مغايرة، بأن يكبر ناوياً النفل بعد شروع الفرض وعكسه، أو

الـفـائتة بعد الوقتية وعكسه ، أو الاقتداء بعد الانفراد وعكسه وأما إذا كبر بنية موافقة كأن نـوى الـظهر بعد ركعة الظهر من غير تلفظ بالنية فإن النية الأولى لا تبطل ويبنى عليها ، و لو بنى على الثانية فسدت الصلاة . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۱/ ۴۴۱،سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ولو افتتح الظهر ثم نوى التطوع أو العصر أوالفائتة أو الجنازة وكبر يخرج عن الأول و يشرع فى الثاني والنية بدون التكبير ليس بمخرج ، كذا فى التتارخانية ناقلاً عن العتابية . (الفتاوى الهندية: ۱/ ۶۶).

وفيـه أيـضـاً: ولـوكبر للتطوع ثم كبر ينوى به الفرض يصير شارعاً فى الفريضة ،كذا في فتاوى قاضي خان . (الفتاوى الهندية: ۱/ ۹۶).

ويـنـظر: (حـاشية الـطـحـطـاوى عـلـى مـراقـى الـفـلاح ،ص ۳۳۴،ط:قديمى ، وأوجز المسـالك :۳/ ۵۵،ط:دمشق، ولامع الدرارى: ۱/ ۲۷۴، وفيض البارى: ۲/ ۲۲۳، وفتح الملهم: ۳/ ۵۸۱).

کتاب المسائل میں مذکور ہے:

اگرکوئی شخص نماز پڑھ رہاتھا، پھراس نے ارادہ کیا کہ اس نماز کوچھوڑ کر دوسری نماز شروع کرے اوراس نیت سے اس نے ’’اللہ اکبر‘‘ کہا تو اللہ اکبر کہتے ہی اس کی پہلی نماز فاسد ہوجائے گی۔(کتاب المسائل:۱/ ۳۹۹)۔

بہشتی زیور میں لکھا ہے:

اگرکوئی شخص نفل نماز شروع کر چکا ہواورفرض جماعت سے ہونے لگے تو نفل نماز کو نہ توڑے بلکہ اس کو چاہیے کہ دورکعت پڑھ کرسلام پھیر دے اگر چہ چار رکعت کی نیت کی ہو۔(بہشتی زیور،ص۹۱۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

متیمم من الجنابۃ و متیمم من الحدث الاصغر میں سے کون امامت کا حقدار ہے؟

سوال: دوآدمی زیداوربکرحالتِ سفر میں تھے،گرمی کا موسم تھا قریب میں کوئی پانی نہیں تھا،ان میں سے ایک کورات کے وقت احتلام ہوا،دونوں نے تیمّم کیا۔اب ان میں سے کون امامت کا مستحق ہوگا؟

الجواب: مسئلہ بالا میں فقہاء کے دو اقوال کتابوں میں مرقوم ہیں؛ ایک قول یہ ہے کہ جس نے حدثِ اصغر سے تیمّم کیا وہ امامت کا مستحق ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ بے وضو ہونا جنابت کے مقابلہ میں ہلکا حدث ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جس نے حدثِ اکبر سے تیمّم کیا وہ امامت کا حقدار ہے کیونکہ حدثِ اکبر سے تیمّم یہ غسل کے درجہ میں ہے جو زیادہ قوی ہے اور وضو سے افضل ہے۔ اکثر مشہور و معروف فقہاء نے اس دوسرے قول کو اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں مذکور ہے:

قوله ثم المتيمم عن حدث على المتيمم عن جنابة ،كذا أجاب به الحلواني كما فى التتمة وجزم به فى الفيض وجامع الفتاوىٰ كذا فى الأحكام للشيخ إسماعيل ومثله فى التاترخانية ولعل وجهه أن الحدث أخف من الجنابة لكن في منية المفتى المتيمم عن الجنابة أولى بالإمامة من المتيمم عن حدث ونقله فى النهر عنها مقتصراً عليه ولعل وجهه أن طهارته أقوى لأنها بمنزلة الغسل لا يبطلها الحدث . (فتاوى الشامي: ۱/۵۵۸،سعيد).

شامی کی عبارت پر علامہ رافعیؒ فرماتے ہیں: **قوله ، ولعل وجهه أن الحدث أخف من الجنابة: لا يظهر هذا التوجيه فإنه بالتيمم ارتفع كل منهما وتساوى الجنب والمحدث فى الطهارة ولعل مراده ما ذكره السندي تعليلاً بقوله للخلاف في كون التيمم هل يرفع الحدث أم لا والجنابة أغلظ .** (تقريرات الرافعى : ۱/۷۱).

قال في حاشية تبيين الحقائق: قوله وهومتيمم عن الجنابة إلى آخره، والمحدث المتيمم أولى بالإمامة من الجنب المتيمم،كنوز الفقه للمرعشى. (حاشية تبيين الحقائق للشيخ أحمد الشلبى: ۱/۱۴۲،امداديه ،ملتان).

وفى الأشباه والنظائر: ثم المتيمم عن الحدث على المتيمم عن الجنابة . (الأشباه و النظائر:۳/۱۶۵، مسائل اجتماع الفضيلة والنقيصة، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية).

وفى الفتاوى الهندية: وفي منية المصلي: المتيمم من الجنابة أولى من المتيمم من الحدث كذا فى النهر الفائق . (الفتاوى الهندية: ۱/۸۴).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

وہ شخص جس نے حدثِ اصغر سے تیمّم کیا ہو بہ نسبت اس شخص کے جس نے حدثِ اکبر سے تیمّم کیا ہو مقدم ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بے وضو ہونا جنابت سے ہلکا ہے اور بعض کے نزدیک حدثِ اکبر سے تیمّم کرنے والا حدثِ اصغر سے تیمّم کرنے والے پر مقدم ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی طہارت وضو کے تیمّم کی طہارت سے اقویٰ ہے کیوں کہ وہ بمنزلہ غسل کے ہے جو کہ وضو سے افضل ہے اور غسل حدث سے باطل نہیں ہوتا۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/۲۰۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سنتِ مؤکدہ کی چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کی جگہ تشہد پڑھنے سے نماز کا حکم:

سوال: زید سنتِ مؤکدہ کی چار رکعت پڑھ رہا تھا، چوتھی رکعت میں بجائے سورۂ فاتحہ کے التحیات شروع کر لی پھر یاد آنے کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھی، اب سجدۂ سہو واجب ہوا یا نہیں؟

الجواب: سنت اور نفل کی تمام رکعتوں میں قراءت کرنا واجب اور لازم ہے، اور چوتھی رکعت میں تشہد شروع کیا جس کی وجہ سے سورۂ فاتحہ میں تاخیر ہوئی، لہٰذا سجدۂ سہو واجب ہوگا، ہاں پہلی رکعت میں اگر ایسا کیا تو سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا کیونکہ وہ محل ثنا ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

و تجب قراء ة الفاتحة و ضم السورة أو ما يقوم مقامها من ثلاث آيات قصار أو آية طويلة فى الأولیین بعد الفاتحة كذا فى النهر الفائق وفي جميع ركعات النفل و الوتر هكذا فى البحر الرائق، ويجب تقديم الفاتحة على السورة . (الفتاوى الهندية: ۱/۷۱).

قال فى التبيين: وعن محمدؒ: لو تشهد في قيامه قبل قراء ة الفاتحة فلا سهو عليه و بعدها يلزمه سجود السهو و هو الأصح لأن بعد الفاتحة محل قراء ة السورة فإذا تشهد فيه فقد أخر الواجب وقبلها محل الثناء . (تبيين الحقائق: ۱/۱۹۳، ط:امداديه).

وفى الهندية: ولا يجب السجود إلا بترک واجب أو تاخيره أو تأخير ركن أو تقديمه أو تكراره أو تغيير واجب بأن يجهر فيما يخافت وفى الحقيقة وجوبه بشيء واحد

وهو ترک الواجب کذا في الکافي . (الفتاوی الهندیة : ۱/۱۲۶).

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

سوال: الحمد کی جگہ ’’التحیات للہ والصلوات‘‘ تک پڑھ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: فاتحہ سے قبل تشہد پڑھنے سے فرض قراءت میں تاخیر ہوئی، اور فرض میں تاخیر بقدر تین بار سبحان ربی الاعلیٰ موجبِ سہو ہے، اس کے مجموعہ حروف مقروءہ بیالیس ہیں اور تشہد میں ایہا کی ھ تک بیالیس حروف مقروءہ ہو جاتے ہیں، لہٰذا سہواً یہاں تک پڑھ گیا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا اس سے کم پر نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

(احسن الفتاویٰ: ۴/۳۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

احناف کے نزدیک رفع یدین کی سنیت منسوخ ہے:

سوال: کیا رفع یدین منسوخ ہے؟ اگر منسوخ ہے تو احناف کیوں کہتے ہیں کہ ترکِ رفع افضل ہے؟

الجواب: احناف کے یہاں رفع یدین کی سنیت منسوخ ہے، یعنی نماز میں تکبیر تحریمہ کے بعد کسی اور موقع پر ہاتھ اٹھانا مسنون نہیں ہے ہاں اگر کوئی اٹھالے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کی نماز فاسد ہوگئی البتہ اس نے خلافِ اولیٰ پر عمل کیا۔ یہ مسئلہ اولیٰ اور خلافِ اولیٰ کا ہے کوئی جھگڑے کا مسئلہ نہیں، جس کے باپ دادا پورا خاندان اور وہ خود شافعی یا حنبلی ہیں وہ رفع یدین پر عمل کرتے رہیں اور جس کے باپ دادا حنفی مالکی ہیں وہ ترکِ رفع یدین پر عمل کرتے رہیں۔ ملاحظہ ہو مراقی الفلاح میں مرقوم ہے:

ولا یرفع یدیه إذ لا یسن رفع الیدین في حالتي الرکوع وقیامه ولا یفسد الصلاة فی الصحیح فلا یسن إلا عند افتتاح کل صلاة وعند تکبیر القنوت فی الوتر وتکبیرات الزوائد فی العیدین لاتفاق الأخبار . (مراقی الفلاح، ص۱۳۷).

وقال فی البحر الرائق: ولا یرفع یدیه علی وجه السنة المؤکدة إلا في هذه المواضع، و لیس مراده النفي مطلقاً لأن رفع الأیدي وقت الدعاء مستحب کما علیه المسلمون في سائر البلاد فلا یرفع یدیه عند الرکوع ولا عند الرفع منه ولا في تکبیرات الجنائز لحدیث

أبي داود عن البراء ﷺ قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يرفع يديه حين افتتح الصلاة ثم لم يرفعهما حتى انصرف و لحديث مسلم عن جابر بن سمرةؓ قال: خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ما لي أراكم رافعي أيديكم كأنها أذناب خيل شمس اسكنوا في الصلاة ...(البحر الرائق: ۱/ ۳۴۱، آداب الصلاة).

وفي فتح القدير: واعلم أن الآثار عن الصحابة والطرق عنه كثيرة جداً والكلام فيها واسع من جهة الطحاوي وغيره والقدر المتحقق بعد ذلک كله ثبوت رواية كل من الأمرين عنه عليه الصلاة والسلام الرفع عند الركوع (كما رواه الأئمة الستة في كتبهم عن ابن عمرﷺ) وعدمه (كما رواه أبوداود وغيره عن ابن مسعودﷺ وغيره) فيحتاج إلى الترجيح لقيام التعارض ويترجح ماصرنا إليه بأنه قد علم أنها كانت أقوال مباحة فى الصلاة وأفعال من جنس هذا الرفع وقد علم نسخها فلا يبعد أن يكون هو أيضاً مشمولاً بالنسخ خصوصاً وقد ثبت ما يعارضه ثبوتاً لا مرد له بخلاف عدمه فإنه لا يتطرق إليه احتمال عدم الشرعية لأنه ليس من جنس ما عهد فيه ذلک بل من جنس السكون الذي هوطريق ما أجمع على طلبه فى الصلاة أعنى الخشوع وكذا بأفضلية الرواة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم كما قاله أبوحنيفةؒ للأوزاعي . (فتح القدير: ۱/ ۳۱۲،دار الفكر).

وقال فى البدائع : وأما رفع اليدين عند التكبير فليس بسنة فى الفرائض عندنا إلا في تكبيرة الافتتاح . (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۰۷،سعید). واللہ سبحانہ اعلم۔

بواسیر کے مرض کے سبب جمعہ میں شرکت کا حکم:

سوال: ایک آدمی کو بواسیر کی بیماری ہے مقعد کی تکلیف کی وجہ سے اس کے لیے سجدہ اور قعدہ دشوار ہے نیز بعض مرتبہ تکلیف بڑھ جاتی ہے تو رکوع کرنا اور چلنا بھی مشکل ہوتا ہے، ایسا شخص نماز کس طرح پڑھے؟ کیا کھڑے ہوکر یا کروٹ پر لیٹ کر؟ کیا اس کے لیے جماعت میں شرکت کرنا ضروری ہے؟ نیز اس کے حق میں

نمازِ جمعہ ساقط ہوگی یا نہیں؟ أفیدونا بالجواب .

الجواب: بواسیر کی بیماری کی وجہ سے بیٹھنا اورسجدہ کرنا دشوار ہے تو کھڑے ہوکر نماز پڑھے، رکوع کرے اورسجدہ اورقعدہ کے لیے اشارہ کرے، یا کروٹ پر لیٹ کر نماز پڑھے اوررکوع ،سجدہ اورقعدہ کے لیے اشارہ کرے، ہاں جمعہ اور جماعت میں شرکت ضروری ہے، الا یہ کہ تکلیف بڑھ جائے اور چلنا پھرنا بھی مشکل ہو جائے تو جمعہ وجماعت میں شرکت ضروری نہیں۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن عمران بن حصين رضي الله عنه قال: كانت بي بواسير، فسألت النبي صلى الله عليه وسلم عن الصلاة ، فقال: صل قائماً ، فإن لم تستطع فقاعداً ، فإن لم تستطع فعلى الجنب . (رواه البخاري ، رقم: ۱۱۱۷، باب اذا لم يطق قاعداً صلى على جنب).

ہدایہ میں مرقوم ہے:

فإن لم يستطع القعود استلقى على ظهره وجعل رجليه إلى القبلة وأومأ بالركوع والسجود لقوله صلى الله عليه وسلم يصلى المريض قائماً فإن لم يستطع فقاعداً فإن لم يستطع فعلى قفاه يؤمى إيماء فإن لم يستطع فالله تعالىٰ أحق بقبول العذر منه ، قال: وإن استلقى على جنبيه ووجهه إلى القبلة فأومأ جاز لما روينا من قبل إلا أن الأولى هي الأولى عندنا. وإن قدر على القيام ولم يقدر على الركوع والسجود لم يلزمه القيام ويصلى قاعداً يومى إيماء . (الهداية : ۱/۱۶۲،ط:شركة علمية).

وفي فتاوى الشامي: وقدرته على المشي، فلا تجب على المقعد وإن وجد حاملاً اتفاقاً خانيه، لأنه غير قادر على السعي أصلاً فلا يجري فيه الخلاف فى الأعمى . (فتاوى الشامي: ۲/۱۵۴، سعيد).

وفيه أيضاً: وقال:لم يقدرعلى الإيماء قاعداً،كمالوكان بحال لوصلى قاعداً يسيل بوله أو جرحه ولو مستلقياً لا، صلى قائماً بركوع وسجود لأن الاستلقاء لا يجوز بلا عذر كالصلاة مع الحدث فيترجح ما فيه الإتيان بالأركان كما فى المنية وشرحها.(رد المحتار: ۲/۹۶، سعيد)

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

سوال: ایسا شخص جو چلنے پر قادر نہ ہو اس کے لیے نمازِ جمعہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب: جب کسی قریبی جامع مسجد تک نمازِ جمعہ کے لیے پہنچنے پر قادر نہ ہو تو ایسا شخص دوسرے معذورین کے حکم میں ہو کر نمازِ جمعہ کے وجوب سے مستثنیٰ ہے۔ (فتاویٰ حقانیہ:۳/۳۸۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں خطبۃ الوَداع کا حکم:

سوال: بعض بستیوں میں یہ رواج ہے کہ رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں خطیب حضرات وداعی الفاظ کہتے ہیں جیسے رمضان کو رخصت کر رہے ہوں، کیا ایسا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب: رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں خطبۃ الوَداع پڑھنا قرونِ مشہود لہا بالخیر سے ثابت نہیں ہے، ہاں اگر خطبہ میں کچھ نصیحت کی جائے اور آخری ایام کی قدردانی کی ترغیب دی جائے اور رمضان المبارک کے رخصت ہونے پر کچھ کلماتِ حسرت کہے جائیں تو چنداں حرج نہیں، لیکن اگر عوام اس کو سنت یا لازم سمجھتے ہوں تو اس کا ترک کرنا لازم ہے۔ ملاحظہ ہو مجموعۃ الفتاویٰ میں ہے:

الوداع یا الفراق در خطبہ جمعہ آخر رمضان خواندن وکلماتِ حسرت ورخصت ادا کردن فی نفسہ امر مباح است بلکہ این کلمات باعثِ ندامت وتوبہ سامعان شود، امید ثواب است مگر ثبوتِ این طریق در قرونِ ثلاثہ نیست وشاید کسے کہ ایجاد ایں طریق کردہ، البتہ در آخر شعبان خطبہ استقبالِ رمضان در احادیث وارد است ... وشاید کسے کہ ایجاد ایں طریق کردہ خطبہ آخر رمضان را بر خطبہ استقبال قیاس کردہ، لیکن اہتمام خطبہ وداع کردن چنانکہ دریں زمانہ مروج است وآں را تا بحدِ التزام رسانیدن خالی از ابتداع نیست، علماء معتمدین را لازم است کہ التزام ایں طریق را ترک کنند تا عوام از اعتقادِ استحباب وسنیت بلکہ از ضروری بودنِ ایں طریق خاص نجات یابند۔ (مجموعۃ الفتاویٰ بہامش خلاصۃ الفتاویٰ:۴/۳۲۹، کتاب الکراہیۃ، ط: المکتبۃ الرشیدیۃ)۔

اشرف الاحکام (تتمہ امداد الفتاویٰ) میں مرقوم ہے:

فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخر جمعوں میں ایک خطبہ (آمد رمضان کے موقع پر) پڑھا

جواور جمعوں میں نہ پڑھتے تھے۔مسلمانوں سے تعجب ہے کہ انہوں نے منصوص خطبہ پر کوئی توجہ نہ کی اور شعبان کے آخری جمعہ کے لیے کوئی خاص خطبہ تجویز نہ کیا۔جس سے وہ عامل بالسنہ ہوتے اس کے بجائے رمضان کے آخری جمعہ کے لیے ایک خاص خطبۃ الوداع تجویز کیا جس کا کہیں حدیث میں پتہ نہیں اور پھر اس کے ساتھ ایسا شغف ہوا کہ بغیر اس خاص خطبہ کے پڑھے گویا جمعہ ہی نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ الوداعی خطبہ کو آخری جمعہ رمضان کا لازمی جزو سمجھتے ہیں اور بڑا تعجب تو یہ ہے کہ بعض اہل علم کو بھی دھوکا ہو گیا اور وہ سخت غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ کہتے ہیں کہ اگر چہ آخر جمعہ کے لیے کوئی خاص خطبہ تجویز کرنا بدعت ہے ۔لیکن چونکہ اس کی وجہ سے لوگ اکثر جمع ہو جاتے ہیں، اس لیے اس کو اجتماع کے لیے معین اور ادائے صلاۃ کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے باقی رکھنا چاہیے حالانکہ یہ سخت غلطی اور من وجہ خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا ہے۔(اشرف الاحکام ،ص۱۲۶،ادارۂ اسلامیات،لاہور)۔

وفي ردع الاخوان عن محدثات جمعة آخر رمضان: ومن الأمور المحدثة : ما شاع في أكثر بلاد الهند والدكن وغيرهما من تسمية خطبة الجمعة الأخيرة بخطبة الوداع ، و تضمينها جملاً دالة على التحسر بذهاب ذلک الشهر ، فيدرجون جملاً دالة على فضائل ذلک الشهر ، ويقولون بعد جملة أو جملتين: الوداع والوداع ، أو الفراق والفراق لشهر رمضان أو الوداع والوداع يا شهر رمضان ، ونحو ذلک من الألفاظ الدالة على ذلک ، و منهم من يقرأ خطبة الوداع يوم عيد الفطر . وهذا المحدث لا يدرى من أي زمان حدث، وأين حدث ؟ وكتب الفقه والحديث من المتقدمين والمتأخرين لا يوجد فيها أثر من ذلک

(ردع الاخوان عن محدثات جمعة آخر رمضان، مجموعة رسائل اللكنوى: ۲/ ۳۶۹،ط:ادارة القرآن كراچی).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

یہ خطبۃ الوداع پڑھنا قرونِ مشہود لہا بالخیر سے ثابت نہیں،فقہاء نے اس کے پڑھنے کا ذکر نہیں کیا مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ نے اس کے بدعت ممنوع ہونے کو تفصیل سے مدلل بیان فرمایا ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۸/ ۲۹۵، جامعہ فاروقیہ)۔

باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ میں مذکور ہے: خطبہ میں الوداع پڑھنا بدعت ہے۔(باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ،ص۱۸۶)۔

عزیز الفتاویٰ میں ہے: خطبہ الوداع سلف سے ثابت نہیں۔ (عزیز الفتاویٰ: جلد اول، ۳۰۶، دارالاشاعت)۔

مزید ملاحظہ ہو: (امداد الفتاویٰ: ۱/ ۵۳۹، تحقیق خطبۃ الوداع)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نوافل میں رکوع وسجود کی تسبیحات کی مقدار:

سوال: ایک شخص نے اپنے بیان میں یہ کہا کہ رکوع وسجود کی تسبیحات تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ کی مقدار یہ ان فرائض کے لیے ہیں جو جماعت کے ساتھ پڑھے جائیں اور مسافر کے لیے ہیں، عام حالات میں گیارہ مرتبہ پڑھنی چاہیے، کیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟ افیدونا ماجورین۔

الجواب: علماء نے لکھا ہے کہ رکوع وسجود کی تسبیحات کی کم سے کم مقدار تین مرتبہ ہے اور تین مرتبہ سے زیادہ پڑھنا بہتر ہے، ہاں امام کو پانچ مرتبہ سے زیادہ نہیں پڑھنا چاہیے تاکہ مقتدیوں پر مشقت نہ ہو، اور منفرد کے لیے تین مرتبہ سے زیادہ بہتر ہے، اور مسافر کے لیے تین مرتبہ کافی ہے عجلت کی وجہ سے، لیکن اگر کوئی غیر مسافر تین مرتبہ پر اکتفا کردے تب بھی بلا کراہت اس کی نماز درست ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ويقول سبحان ربي العظيم ثلاثاً وذلک أدناه ، لقوله عليه الصلاة والسلام : إذا ركع أحدكم فليقل في ركوعه سبحان ربي العظيم ثلاثاً وذلک أدناه ، أى أدنى كمال الجمع .
(الهداية : ١/ ١٠٦ ، ط: المصباح).

دوسری جگہ مذکور ہے:

ويستحب أن يزيد على الثلاث فى الركوع والسجود بعد أن يختم بالوتر لأنه عليه الصلاة والسلام كان يختم بالوتر ، وإن كان إماماً لا يزيد على وجه يمل القوم حتى لا يؤدى إلى التنفير . (الهداية : ١/ ١١٠ ،ط: المصباح).

(وكذا فى الفتاوى الهندية: ١/ ٧٥،وشرح منية المصلى ،ص ٣١٦،باب صفة الصلاة ، سهيل اكيڈمى).

وفى الخلاصة : ولو زاد على الثلاث فذلک أفضل بعد أن يختم على وتر خمس أو سبع أو تسع ولكن إن كان إماماً لا يطول وقال سفيان الثورى: ينبغي أن يقول خمساً حتى

يتمكن القوم أن يقولوا ثلاثاً . (خلاصة الفتاویٰ: ۱/۵۴، رشيديه).

امام کے لیے پانچ مرتبہ مستحب ہے۔

ونقل في الحلية (اَلْحَلْبَة) عن عبد اللّٰه بن المبارك وإسحاق وإبراهيم والثوري أنه يستحب للإمام أن يسبح خمس تسبيحات ليدرك من خلفه الثلاث . (فتاوى الشامي : ۱/۴۹۵،سعيد).

گیارہ مرتبہ تسبیحات پڑھنے کوعلامہ لکھنویؒ نے کمال کا اعلیٰ درجہ بیان کیا ہےاوراحادیث سے ثابت کیا ہے۔

قال العلامة اللكنويؒ في السعاية : رواه أبوداود والنسائي عن سعيد بن جبير قال: سمعت أنس بن مالك ﷺ يقول: ما صليت بعد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وعلى آله وسلم وراء أحد أشبه بصلاته من هذا الفتى يعني عمر بن عبد العزيز قال سعيد: فحزرنا ركوعه عشر تسبيحات وسجوده عشر تسبيحات ،انتهى. قال ابن حجرؒ في شرح المشكاة بهذا الخبر وبحديث: إن اللّٰه وتر يحب الوتر يستدل لما ذهب إليه ائمتنا أن أعلى الكمال إحدى عشر مرات ، انتهى . (السعاية : ۲/ ۱۸۳،سهيل اكيڈمی). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

بہ سببِ عذر ڈاڑھی صاف کرانے والے کی امامت کا حکم:

سوال: کیا ایسا شخص امام بن سکتا ہے جس کو میڈیکل وجوہات (مثلاً اُکنی،acne) کی وجہ سے ڈاڑھی صاف کرانے کی ضرورت پڑی ہو؟ نیز دیگر علماء وحفاظ کی موجودگی میں ایسے شخص کی امامت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: کسی عذر کے سبب ڈاڑھی صاف کرانے والا بہ نگاہِ شریعت فاسق وگنہگار نہیں ہے جبکہ گناہ کی کوئی اور بات اس میں موجود نہ ہو، بنابریں ایسا شخص امامت کراسکتا ہے، ہاں اگر مقتدیوں کے لیے یہ بات قابل نفرت ہوتو امامت نہیں کرنی چاہیے، نیز جب دیگر علماء وحفاظ موجود ہیں جن میں امامت کی شرائط علی وجہ الاتم پائی جاتی ہیں تو وہ زیادہ مستحق ہیں تاہم اگر یہ معذور شخص ان کی موجودگی میں امامت کرلے تب بھی نماز درست ہوجائے گی۔ اسی طرح کینسر کی وجہ سے بال گرجاتے ہیں اس کا بھی یہی حکم ہے۔

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

سوال: ایک شخص ہے جس کی ڈاڑھی میں روگ لگ گیا ہے، جس کا کافی علاج بھی کیا گیا،لیکن کوئی فائدہ نہیں ہے، نیز ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ڈاڑھی صاف کرادیجیے، اس کے بعد آپ کا علاج کامیاب ہوجائے گا، کیا ایسی صورت میں ڈاڑھی صاف کرانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب: امراض کے علاج کے لیے جب کوئی جائز دوا مفید نہ ہوتو مجبوراً نجس اور حرام دوا کے استعمال کی بھی اجازت ہے، جبکہ تجربہ کار اور دیندار معالج تجویز کردے، کہ شفا حرام چیز سے ہی ہوسکتی ہے، اسی طرح اگر بغیر ڈاڑھی صاف کرائے صحت نہیں ہوسکتی تو مجبوراً تحصیل صحت کے لیے اس کی گنجائش ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۲۷/ ۴۹۸، ط: مکتبہ محمودیہ)۔

وبهامشه: قال: يجوز للعليل شرب الدم والبول وأكل الميتة للتداوي إذا أخبره طبيب مسلم إن شفاءه فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامه، الخ. (عالمگیری:۵/۳۵۵).

والضرورات تبيح المحظورات، الخ. (الاشباه والنظائر،ص ۱۴۰،ط:ديوبند).

فتاوی الشامی میں ہے:

مطلب في إمامة الأمرد، قوله وكذا تكره خلف أمرد، الظاهر تنزيهية أيضاً، والظاهر أيضاً كما قال الرحمتي: إن المراد به الصبيح الوجه لأنه محل الفتنة وهل يقال: هنا أيضاً إذا كان أعلم القوم تنفي الكراهة فإن كانت علة الكراهة خشية الشهوة وهو الأظهر فلا، وإن كانت غلبة الجهل أو نفرة الناس من الصلاة خلفه فنعم فتأمل. (فتاوى الشامي: ۱/۵۶۲،سعيد).

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

جو شخص جسمانی طور پر معذور ہو،لیکن رکوع اور سجدہ کرسکتا ہو، اس کی امامت درست ہے،لیکن چوں کہ عام طور پر لوگ ایسے شخص کے پیچھے پڑھنے میں کراہت محسوس کرتے ہیں، اور امام ایسے شخص کو ہونا چاہیے جس کی اقتدا لوگ رغبت کے ساتھ کریں، تاکہ نماز میں خشوع وخضوع کی کیفیت باقی رہے، اس لیے فقہاء نے ایسے لوگوں کی امامت کو مکروہ قرار دیا ہے، علامہ شامیؒ نے مفلوج، لنگڑے اور لنجے کے بارے میں یہی بات لکھی ہے:

(قوله ومفلوج وأبرص شاع برصه) وكذلك أعرج يقوم ببعض قدمه، فالاقتداء بغيره أولى تتارخانية ، وكذا أجزم برجندى، ومجبوب وحاقن ، ومن له يد واحدة فتاوى الصوفية عن التحفة ، والظاهر أن العلة النفرة . (ردالمحتار : ۱/ ۵۶۲) اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی شخص جسمانی اعتبار سے عیب زدہ ہو،لیکن اس کے علم وتقویٰ کی وجہ سے لوگ اس کے پیچھے نماز پڑھنے کو پسند کرتے ہیں، تو ایسے شخص کی امامت میں کوئی حرج نہیں۔(کتاب الفتاویٰ:۲/ ۲۹۷)۔واللہ ﷻ اعلم۔

تراویح میں سراً تسمیہ پڑھنے سے مقتدیوں کے ختم کا حکم:

سوال: تراویح کے ختمِ قرآن میں امام نے قل ھواللہ احد سے پہلے آہستہ آواز سے بسم اللہ پڑھی تو مقتدیوں کی سنتِ ختم ادا ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: علمائے کرام نے صراحت کی ہے کہ تسمیہ قرآنِ کریم کا جزو ہے،لہٰذا امام کو پورے قرآن میں کسی بھی سورت سے پہلے ایک مرتبہ تسمیہ جہراً پڑھنا سنت ہے تاکہ ختمِ قرآنِ کریم کی فضیلت حاصل ہوجائے۔ صورتِ مسئولہ میں چونکہ امام صاحب نے سراً پڑھی اور مقتدیوں نے نہیں سنی اس لیے مقتدیوں کی ختمِ قرآنِ کریم کی سنت ادا نہیں ہوئی۔ملاحظہ ہو علامہ لکھنویؒ فرماتے ہیں:

قد صرحوا إن ختم القرآن بجميع أجزاءه فى التراويح مرة سنة مؤكدة ، حتى لو ترك آية منه لم يخرج عن العهدة ، وقد ثبت أن البسملة أيضاً آية منه على الأصح ، فيستخرج منه أنه لو قرأ تمام القرآن فى التراويح ، ولم يقرأ البسملة فى ابتداء سورة من السور سوى ما في سورة النمل، لم يخرج عن عهدة السنية ، ولو قرأها الإمام سراً خرج عن العهدة ، لكن لم يخرج المقتدون عن العهدة ، و به أفتيت حين سئلت . (احكام القنطرة فى احكام البسملة ، مجموع رسائل اللكنوى: ۱/ ۱۷،ط:ادارة القرآن كراچى).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

جہر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک جگہ اس لیے ہے کہ وہ تمام قرآن کا جزء ہے،اور ایک جگہ بھی جہر نہ ہونے میں

سامعین کا قرآن سننا پورا نہ ہوگا، پس یہ بناء جہر کی معلوم ہوتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جزوقرآن شریف ہونا جہر کو مستلزم نہیں ؛ مگر چونکہ تمام قرآن شریف کا ختم تراویح میں مسنون ہے، اس لیے جہر بالتسمیہ کو بھی سنت کہا گیا۔
(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۲۶۲/۴، کبیر، دارالاشاعت)۔

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

تراویح میں ایک بار جہر ضروری ہے تاکہ مقتدیوں کا قرآن مکمل ہوجائے۔(احسن الفتاویٰ:۵۱۹/۳)۔

امدادالاحکام میں مذکور ہے:

بہتر یہ ہے کہ ایک دفعہ تراویح میں اس آیت کو جہراً پڑھا جائے ؛ جیسا کہ تراویح میں سارا قرآن جہر سے پڑھا جاتا ہے، اگر امام کسی جگہ بھی بسم اللہ کو جہر سے نہ پڑھے ؛ بلکہ کسی ایک جگہ سراً پڑھ لے تو امام کا ختم تو پورا ہوجائے گا، لیکن سامعین کے ختم میں ایک آیت کی کمی رہے گی۔(امدادالاحکام:۶۳۰/۱)۔واللہ ﷻ اعلم۔

صاحبِ ترتیب کا وتر بھول کر وقتی نماز ادا کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی صاحبِ ترتیب وتر بھول جائے اور پانچ نمازوں کے بعد یاد آئے تو وتر کے ساتھ دوسری نمازیں بھی قضا کرے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر بھول کر وقتیہ نمازیں ادا کر چکا ہے تو یاد آنے کے بعد فقط وتر کی قضا واجب ہے باقی نمازیں صحیح اور درست ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

ثم الترتيب يسقط بالنسيان وبما هو في معنى النسيان كذا فى المضمرات . ولو تذكر صلاة قد نسيها بعد ما أدى وقتية جازت الوقتية كذا في فتاوى قاضيخان . (الفتاوى الهندية : ۱۲۲/۱). (وكذا فى الهداية : ۷۳/۱،المكتبة الاسلامية،والمحيط البرهانى : ۳۴/۲،ط:داراحياء التراث).

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مرقوم ہے:

صاحبِ ترتیب کے لیے ضروری ہے کہ پہلے فوت شدہ نماز کی قضا کرے پھر وقتی نماز پڑھے، لیکن اگر بھول کر وقتی نماز ادا کرلی پھر بعد میں فوت شدہ نماز یاد آئی تو اس کی وقتی نماز صحیح ہوگئی اور فوت شدہ نماز کو قضا کر

لے اور اگر وقتی نماز شروع کرنے سے پہلے اس کو فوت شدہ نماز یاد تھی یا نماز کے دوران یاد آ گئی تو فوت شدہ نماز کو قضا کر کے وقتی نماز کو دوبارہ پڑھے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/۶۲۴)۔

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

اگر وقت کی نماز ادا کرنے کے بعد کوئی بھولی ہوئی قضا نماز یاد آئی تو وقت کی نماز جائز ہوگئی اس کے لوٹا نے کی ضرورت نہیں۔۔۔ قضا نماز کے بھولنے سے اور ان چیزوں سے جو بھولنے کے حکم میں ہیں ترتیب ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ بھولنا آسمانی عذر ہے اس میں بندہ کو اختیار نہیں ہے اور بھولنے کی صورت میں قضا نماز پڑھنے میں ترتیب کا حکم یاد آنے پر مشروط ہے یعنی اس کا وقت یاد آنے سے ہوتا ہے جب تک یاد نہ آئے گی اس وقت تک وقت نہیں ہوگا اور ترتیب لازم نہیں ہوگی۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/۳۵۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

امام کے لیے دعائے قنوت جہراً پڑھنے کا حکم:

سوال: کیا امام کے لیے رمضان المبارک میں دعائے قنوت جہراً پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: افضل اور بہتر یہ ہے کہ امام دعائے قنوت آہستہ آواز سے پڑھے، تاکہ مقتدیوں کو پڑھنے میں خلل نہ ہو، تاہم اگر امام نے جہراً پڑھا تب بھی کوئی حرج نہیں ہے نماز ہو جائے گی۔ ہاں آہستہ پڑھنا سنت ہے۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

وأما صفة دعاء القنوت من الجهر والمخافتة فقد ذكر القاضي في شرحه مختصر الطحاوي أنه إن كان منفرداً فهو بالخيار إن شاء جهر وأسمع غيره وإن شاء جهر وأسمع نفسه وإن شاء أسر كما في القراء ة وإن كان إماماً يجهر بالقنوت لكن دون الجهر بالقراء ة في الصلاة والقوم يتابعونه ... و اختار مشايخنا بما وراء النهر الإخفاء في دعاء القنوت في حق الإمام والقوم جميعاً لقوله تعالىٰ: ﴿ادعوا ربكم تضرعاً وخفية﴾ وقول النبي صلى الله عليه وسلم: خير الدعاء الخفي. (بدائع الصنائع: ۱/۲۷۴، سعید).

مراقی الفلاح میں مرقوم ہے:

والمؤتم يقرأ كالإمام على الأصح ويخفى الإمام والقوم على الصحيح لكن استحب للإمام الجهر في بلاد العجم ليتعلموه كما جهر عمر رضي الله عنه بالثناء حين قدم وفد العراق ولذا فصل بعضهم إن لم يعلم القوم فالأفضل للإمام الجهر ليتعلموه وإلا فالإخفاء أفضل. (مراقی الفلاح مع حاشية الطحطاوی، ص ۳۸۲، ط: قديمی).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

پھر دعائے قنوت پڑھے، مختار یہ ہے کہ خواہ امام ہو یا مقتدی ہو یا منفرد ہو، اور خواہ نماز وتر ادا ہو یا قضا اور خواہ رمضان المبارک میں ہو یا اور دنوں میں دعائے قنوت آہستہ پڑھیں اور آہستہ پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/۲۹۲)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تاخیر رکن کی صحیح مقدار جس سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے:

سوال: تاخیر رکن کی صحیح مقدار کیا ہے جس سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے؟ کیا ایک مرتبہ سبحان ربی العظیم ہے یا تین مرتبہ، یا فقط سبحان اللہ؟ راجح قول کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: راجح قول کے مطابق تاخیر رکن کی مقدار جس سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے بقدرِ تین تسبیحات ہیں؛ یعنی تین مرتبہ سبحان ربی العظیم یا سبحان ربی الاعلی کے برابر ہے۔ اس سے کم مقدار تاخیر میں سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں:

إن كان قدر أداء ركن وجب عليه سجود السهو، قوله وجب عليه سجود السهو، إذا شغله التفكر عن أداء واجب بقدر ركن ...ولم يبينوا قدر الركن وعلى قياس ما تقدم أن يعتبر الركن مع سنته، وهو مقدر بثلاث تسبيحات. (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ص ۴۷۴، قديمی كتب خانه).

قال العلامة الشامي في حاشية البحر: تقييد الركن، هل المراد منه قدر ركن طويل بسنته كالقعود الأخير أو القيام المشتمل على قراءة المسنون أو قدر ركن قصير كالركوع

أو السجود بسنته أی قدر ثلاث تسبیحات وبالثاني جزم البرهان إبراهیم الحلبي في شرح المنیة حیث قال: وذلک مقدار ثلاث تسبیحات فأفاد أن المراد أقصر رکن لأنه الأحوط واللّٰہ أعلم . (منحة الخالق حاشیة البحرالرائق: ۱/۲۷۲،ط: کوئٹه).

احسن الفتاویٰ میں تاخیر رکن کی مقدار بقدرِ تین تسبیحات لکھی ہے؛ ملاحظہ ہو: تین بار سبحان ربی الاعلی کہنے کی مقدار خاموش رہا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا ورنہ نہیں، فقط واللہ تعالیٰ اعلم ۔(احسن الفتاویٰ:۴/۴۷)۔

مزید ملاحظہ ہو: (عمدۃ الفقہ :۲/۲۷۱،وکفایت المفتی :۵/۳۶)۔واللہ ﷻ اعلم ۔

تشہد میں اشارہ کے بعد انگلی جھکانے سے متعلق حدیث کی تحقیق:

سوال: تشہد میں اشارہ کے بعد انگلی جھکانے کو محققین علماء نے ترجیح دی ہے اور مستحب لکھا ہے اور دلیل میں نسائی شریف کی روایت کا حوالہ پیش کیا ہے جیسا کہ حضرت تھانویؒ اور ملاعلی قاریؒ نے فرمایا ہے، لیکن بعض سلفی حضرات کہتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے، اس کی تحقیق مطلوب ہے؟ بینوا بالبرہان توجروا عندالرحمٰن ۔

الجواب: سنن نسائی شریف کی روایت ملاحظہ فرمائیں: أخبرني أحمد بن یحیی الصوفی، قال: حدثنا أبونعیم قال: حدثنا عصام بن قدامة الجدلی، قال: حدثنا مالک بن نمیر الخزاعي من أهل البصرة أن أباه حدثه أنه: رأی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قاعداً فی الصلاة واضعاً ذراعیه الیمنی علی فخذه رافعاً اصبعه السبابة قد أحناها شیئاً و هو یدعو . (سنن النسائی المجتبی ، رقم: ۱۲۷۴).

یہ روایت مرتبہ میں حسن سے کم نہیں اور جو شیخ البانی صاحب نے تعلیق میں لکھا ہے کہ یہ روایت احناء کی زیادتی کے ساتھ منکر ہے، یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ شیخ البانی صاحب کے کلام میں تناقض ہے بعض جگہ تصحیح کی ہے اور بعض جگہ تضعیف کی ہے۔ ملاحظہ ہو التعریف باوہام من قسم السنن الی صحیح وضعیف میں مرقوم ہے:

ذکره في ضعیف أبوداود، وفي ضعیف النسائی، وقال: منکر بزیادة الإحناء ، قلت: بل، صحیح والنکارة تستوجب المخالفة غالباً ، ولا أعرف من خالفه هنا، رجال إسناده

ثقات ، وقد يتعلق المضعِّف بوجود مالک بن نمير الخزاعی في إسناده فقد قال عنه الحافظ فی التقريب (رقم:۶۴۵۴) : مقبول .

قلت: مالک بن نمير الخزاعی تابعی معروف ، قال عنه الدارقطنی فی سؤالات البرقانی (۴۹۶): يعتبر به .

وذكر ابن حبان في ثقاته (۳۸۶/۵) وصحح حديثه (الاحسان ۲۷۳/۵) وصححه أيضاً ابن خزيمة (۳۵۴/۱، رقم:۷۱۵،۷۱۶) ، وابن السكن (تحفة المحتاج ۳۲۵/۱) وسكت عليه أبوداود ، والمنذری (۴۵۸/۴۵۷/۱).

وعليه فقد أجاد عبد الحق الاشبيلی بتصحيحه له فأودعه أحكامه الصغرى الصحيحة (۲۴۹/۱)، وهو فی الوسطى أيضاً (۴۰۸/۱)، وذكره الحافظ ابن الملقن في تحفة المحتاج (۳۲۵/۱) ونقل تصحيح ابن حبان وابن السكن له ، فهو صحيح عنده كما شرطه في كتابه واقتصاره على نقل تصحيح ابن حبان وابن السكن للحديث .

والأحاديث التي فيها الإشارة فی التشهد تشهد لهذا الحديث ، وهي مستفيضة عن جماعة من الصحابة كوائل بن حجر ، وعبد اللّٰه بن عمر ، وعبد اللّٰه بن الزبير ، وأبي هريرة ، وسعد بن أبي وقاص وغيرهم رضی اللّٰه تعالىٰ عنهم .

وأكثر من هذا أن تفسير الإحناء بمعنى الإشارة وقع في رواية ابن ماجه لعين الحديث الذی ضعفه الألباني .

وأعجب أكثر إذا عرفت أنه أودعه بنفس الإسناد في صحيح ابن ماجه (۹۱۱/۱۵۰/۱) فقال: عن مالک بن نمير الخزاعي عن أبيه قال: رأيت النبي صلى اللّٰه عليه وسلم واضعاً يده اليمنى على فخذه اليمنى فی الصلاة ويشير بأصبعه. قال الشيخ الألباني: صحيح. وفی المسند (۴۷۱/۳): قد أحناها شيئاً وهو يدعو ، وهي رواية ابی داود ، وفيه أيضاً (۴۷۱/۳): يشير بأصبعه ، وهي رواية فی صحيح ابن خزيمة (رقم: ۷۱۵). فالإشارة لا تنافی الحنو ، فهو

إشارة مع إمالة بسيطة . (النهاية : ۱/۴۵۳) **فالحديث صحيح أو حسن ، والله أعلم بالصواب.**
(التعريف بأوهام من قسم السنن: ۴/۹،ط:دارالبحوث دبئی).

رسائل سقاف کی تعلیقات میں مذکور ہے:

هذا الحديث صححه الحافظ ، ومالک بن نمير الخزاعی الذی في سنده مقبول كما فی التقريب وهو وإن لم يرو عنه إلا واحد فقد صحح الحافظ حديثه ، وكثير من الثقات المتفق على ثقتهم لم يرو عنهم غير واحد فقط ،كثابت بن قيس الزرقی المدنی وقد فصلت هذا الأمر في (امتاع الالحاظ بتوثيق الحفاظ) وقد نص على صحة حديث مالک بن نمير عن أبيه ابن خزيمة في صحيحه (۱/۳۵۴) **أقر تصحيحه الحافظ فی الإصابة في ترجمة رقم : ۸۸۰۷، وروى الحديث ابن حبان في صحيحه كما فی الإحسان** (۳/۲۰۲/۱۹۴۳) **وسكت عليه أبوداود** (۱/۲۶۰/۹۹۱) **وهذا كاف فی الحكم على الحديث بالصحة خلافاً لكلام الألباني في تمام المنة ، ثم رأيته تناقض !! فصحح لمالک بن نمير الخزاعی في" صحيح سنن النسائی"** (۱/۲۷۲) **فتأملوا !!** (۲/۲۴۶،ط:دارالرازی).

عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ جس راوی کا ایک تلمیذ ہو وہ مجہول ہوتا ہے لیکن یہ علی الاطلاق نہیں بلکہ جس راوی کی توثیق ہوجائے اس کو معروف اور ثقہ کہیں گے اگرچہ اس کا ایک تلمیذ ہو۔جیسا کہ حسن بن علی السقاف کی عبارت سے واضح ہوا۔

موارد الظمآن کی تعلیقات میں اس حدیث کو جید کہا ہے؛

إسناده جيد، مالک بن نمير الخزاعی ترجمه البخاری فی الكبير (۷/۳۰۸) **ولم يورد فيه جرحاً ولا تعديلاً و تبعه على ذلک ابن أبي حاتم فی الجرح والتعديل** (۸/۲۱۶-۲۱۷) **وقال الدارقطنی: يعتبر به ، ووثقه الحافظ ابن حبان ، وصحح ابن خزيمة حديثه ، وقال الذهبی في كاشفه : وثق .** (تعليق مواردالظمان الى زوائدابن حبان: ۲/۲۱۴/۴۹۹، باب صفة الصلاة).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

انگلی ہلانے والی روایت ضعیف اور شاذ ہے:

سوال: بعض اہل حدیث اشارہ فی التشہد میں انگلی کو ہلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث سے ثابت ہے ان کی کیا دلیل ہے؟ کیا حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور حدیث سے ثابت ہے تو اس کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب: یہ روایت مختلف کتابوں میں مذکور ہے لیکن شیخ شعیب الارنؤوطؒ نے مسند امام احمد بن حنبل کی تعلیقات میں لکھا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے البتہ "فرأيته يحركها يدعوبها" کی زیادتی یعنی انگلی ہلانے والا جملہ شاذ اور ضعیف ہے یہ زائدہ راوی کا تفرد ہے، عاصم بن کلیب کے دوسرے شاگردوں نے بیان نہیں کیا۔ حدیث اور اس کی تحقیق ملاحظہ ہو:

أخرج الإمام أحمد بن حنبل في مسنده(١٨٨٧٠) قال حدثنا عبد الصمد ثنا زائدة ثنا عاصم بن كليب أخبرني أبي أن وائل بن حجر الحضرمي أخبره قال: قلت: لأنظرن إلى رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم كيف يصلي قال: فنظرت إليه قام فكبر و رفع يديه حتى حاذتا أذنيه...ثم قعد فافترش رجله اليسرى فوضع كفه اليسرى على فخذه و ركبته اليسرى وجعل حد مرفقه الأيمن على فخذه اليمنى ثم قبض بين أصابعه فحلق حلقة ثم رفع أصبعه فرأيته يحركها يدعوبها ...الخ .

قال الشيخ شعيب: حديث صحيح دون قوله: فرأيته يحركها يدعو بها، فهو شاذ انفرد به زائدة ـ و هو ابن قدامة ـ من بين أصحاب عاصم بن كليب كما سيأتي مفصلاً ، و رجال الإسناد ثقات ، عبد الصمد : هو ابن عبد الوارث بن سعيد العنبرى. وأخرجه الدارمي (١٣٥٧)، والبخاري في رفع اليدين (٣١)، وأبوداود (٧٢٧)، وابن الجارود (٢٠٨)، والنسائي فى المجتبى(٢/١٢٦ـ١٢٧و٣/٣٧) وفى الكبرى (١١٩١)، وابن خزيمة (٤٨٠) و(٧١٤) ، وابن حبان (١٨٦٠)، والطبراني (٢٢/رقم:٨٢) والبيهقي(٢/٢٧ـ٢٨) من طرق عن زائدة ، بهذا الإسناد . وقال ابن خزيمة : ليس في شيء من الأخبار" يحركها " إلا في هذا الخبر، زائدة

ذکره ، وقال البيهقي (۱۳۲/۲):فيحتمل أن يكون المراد بالتحريک الإشارة بها لا تكرير تحريكها ...

وقوله: فرأيته يحركها يدعو بها، انفرد بها زائدة من بين أصحاب عاصم بن كليب ، وهم: عبد الواحد بن زياد ، وشعبة ، وسفيان الثورى ، وزهير بن معاوية ، وسفيان بن عيينة ، وسلام بن سليم أبوالأحوص، وبشر بن المفضل، وعبد الله بن إدريس، وقيس بن الربيع ، وأبو عوانة ، وخالد بن عبد الله الواسطى .

فحديث عبد الواحد بن زياد العبدرى ، سلف (۱۸۸۵۰)، ولفظه: وأشار باصبعه السبابة .

وحديث شعبة ، سلف (۱۸۸۵۵) وسيرد (۱۸۸۷۷)، ولفظه : وأشار باصبعه السبابة .

وحديث سفيان الثورى ، سلف(۱۸۸۵۸) وسيرد (۱۸۸۷۱)، ولفظه: ثم أشار بسبابته .

وحديث زهيربن معاوية ، سيرد (۱۸۸۷۶) ولفظه : وقبض ثلاثين وحلق حلقة ، ثم رأيته يقول هكذا ، وأشار زهير بسبابته الأولى، وقبض أصبعين ، وحلق الإبهام على السبابة الثانية .

وحديث سفيان بن عيينة عند الحميدي (۸۸۵)، والنسائي(۳۴/۳،۳۵)، والطبراني (۲۲/رقم: ۸۷و۸۵) ولفظه : وأشار بالسبابة .

وحديث أبى الأحوص سلام بن سليم عند الطيالسى(۱۰۲۰) بلفظ : جعل يدعو هكذا ، يعني بالسبابة يشير بها .

وحديث بشر بن المفضل عندالنسائي (۳۶/۳،۳۶) ولفظه: رأيت النبي صلى الله عليه وسلم قد حلق الإبهام والوسطى، ورفع التي تليهما يدعو بها فى التشهد .

وحديث قيس بن الربيع عند الطبراني (۲۲/رقم: ۷۹) ولفظه: وأشار بالسبابة .

وحديث أبي عوانة عند الطبراني (۲۲/رقم: ۹۰) ولفظه : ودعا بالسبابة .

وحديث خالد بن عبد الله الواسطي عند البيهقي(۱۳۱/۲)، ولفظه: وأشار بالسبابة .

قلنا: فهؤلاء الثقات الأثبات من أصحاب عاصم لم يذكروا التحريک الذى خالف

به زائدة ، وهذا من أبين الأدلة على وهم زائدة فيه ، وليس هو من باب زيادة الثقة كما توهم بعضهم، لا سيما أن روايتهم تتأيد بأحاديث صحيحة ثابتة عن غير وائل بن حجر، ولم يرد فيها التحريک ، وجاء في بعضها إثبات الإشارة ونفي التحريک،كما ستقف عليه. (تعليقات الشيخ شعيب على مسند الامام احمد : ۳۱/۱۶۰/۱۸۸۷۰).

(۲) أخرج الإمام البيهقي في سننه الكبرى (۲/۱۸۹/۲۹۰۰)قال: أخبرنا أبوعبد اللّٰه الحافظ أخبرنا أبوبكر: محمد بن إبراهيم الشافعي ببغداد حدثنا محمد بن الفرج حدثنا الواقدي حدثنا كثير بن زيد عن نافع عن ابن عمر رضی اللّٰه تعالیٰ عنه أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم، قال:’’ تحريک الأصبع فی الصلاة مذعرة للشيطان‘‘ تفرد به محمد بن عمر الواقدي وليس بالقوي.

قال ابن التركماني فی الجوهرالنقي: قلت: أغلظ الناس القول فيه والبيهقي ألان القول فيه هنا وضعفه في باب قتل الفيلة وغيره . (۲/۱۳۱).

قال ابن حجر: وخبرتحريک الأصابع مذعرة للشيطان ضعيف . (اوجزالمسالک:۲/۲۰۸، ط:دارالقلم دمشق). (وكذا فی مرقاة المفاتيح:۳/۴۵۴،باب التشهد). واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تحریک انگشت کی نفی والی روایت ملاحظہ کیجیے:

أخرج الإمام أبوداود في سننه(رقم:۹۸۹) ، والنسائي (۳/۳۷)، وأبوعوانة(۲/۲۲۶)، والبيهقي (۲/۱۳۱) من طرق عن حجاج بن محمد الأعور(ثقة،ثبت) عن ابن جريج (ثبت) عن زياد بن سعيد(ثقة) عن محمد بن عجلان (ثقة)عن عامر بن عبد اللّٰه (ثقة) عن عبد اللّٰه بن الزبير أنه ذكر أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم كان يشير باصبعه إذا دعا ولا يحركها .

ابوداود شریف کی سند کی تحقیق ملاحظہ کیجیے:

۱ ـ إبراهيم بن الحسن المصيصی: قال الحافظ في تقريب التهذيب: ثقة .

۲ ـ حجاج بن محمد الأعور: قال على ابن المدينی: ثقة صدوق وقال الحافظ فی

تقریب التهذیب: ثقة ، ثبت .

۳ ـ ابن جريج: قال أحمد: ابن جريج ثبت صحيح الحديث لم يحدث بشيء إلا أتقنه .

۴ ـ زياد بن سعيد: قال أحمد: خراساني، ثقة، وفي التقريب: ثقة ، ثبت .

۵ ـ محمد بن عجلان: قال في الميزان: إمام صدوق، مشهور، وثقه أحمد وابن عيينة وأبوحاتم .

۶ ـ عامر بن عبد الله بن الزبير: قال الإمام أحمد: ثقة من أوثق الناس وفي التقريب: ثقة ، عابد من رجال الستة . سب راوی ثقہ ہیں لہٰذا یہ روایت صحیح ہے۔

قال الإمام النووي في شرح المهذب (۴۵۴/۳): ذكر البيهقي بإسناد صحيح عن ابن الزبير أن النبي صلى الله عليه وسلم يشير باصبعه إذا دعا ولا يحركها . رواه أبوداود بإسناد صحيح . (رسائل السقاف : ۲۴۲/۲).

قال الشيخ شعيب الأرناؤوط: حديث صحيح، وابن جريج وهو عبد الملك بن عبد العزيز، وإن كان مدلساً قد صرح بالتحديث عند النسائي (وأبي عوانة)... وعنوان هذا الحديث عند أبوعوانة: بيان الإشارة بالسبابة إلى القبلة ورمى البصر إليها وترك تحريكها في الإشارة... ولا يعارض هذا الحديث حديث وائل بن حجرعند النسائي... فالإشارة هي السنة لا التحريك وقد أخطأ الألباني خطأ مبيناً في صفة الصلاة (ص۱۵۸) فجعل التحريك هو الأصل وهو السنة الثابتة بناء على اللفظة الشاذة التي انفرد بها زائدة... وقد قول الإمام أحمد ما لم يقل ...الخ . (التعليقات على سنن ابى داود: ۲۳۲/۲ـ ۲۳۳رقم: ۹۸۹). واللہ ﷻ اعلم۔

اشارہ بالسبابہ میں تحریک کے متعلق مذاہب کی تفصیل:

احناف، شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں اشارہ بالسبابہ میں تحریک الاصبع نہیں ہے؛ بلکہ حرکت دینا مکروہ ہے۔

احناف کے دلائل ملاحظہ فرمائیں: ويكره عندنا تحريك المسبحة لأنه عليه السلام كان يتركه .

(مرقاة المفاتيح ۲/۲۶۴،ط:امداديه، ملتان).

وفي حاشية الطحطاوي على مراقى الفلاح : وتسن الإشارة أى من غير تحريک فإنه مكروه عندنا كذا في شرح المشكاة للقاري. (حاشية الطحطاوى ص ۲۶۹،ط:قديمى).

الشافعية: قال الإمام النووي: وهل يحركها عند الرفع بالإشارة فيه أوجه الصحيح الذي قطع به الجمهور أنه لا يحركها فلو حركها كان مكروهاً...الخ.(شرح المهذب:۳/۴۵۴).

حنابلہ کے دلائل ملاحظہ فرمائیں:

قال ابن قدامة فى المغنى: ويشير بالسبابة... ولا يحركها لما روى عبد اللّٰه بن الزبير أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم كان يشير باصبعه ولا يحركها رواه أبوداود . (المغنى لابن قدامة : ۱/۶۰۷،دارالفكر).

وفى الفروع : ولا يحركها فى الأصح ، لأنه عليه السلام كان لا يحركها . (الفروع لابن مفلح الحنبلى :۲/۲۱۰،ط: مؤسسة الرسالة).

مالکیہ کے ہاں دو اقوال ہیں، ان میں سے مشہور قول تحریک کا ہے لیکن شیخ ابن العربی نے اس کا انکار کیا ہے؛

والمشهور عند المالكية التحريک لكن أنكره ابن العربي. (اوجزالمسالک :۲/۲۰۷).

قال الإمام الباجى الأندلسي: وقد روي عن مالک أنه كان يخرجها من تحت البرنس ويواظب على تحريكها وقال ابن القاسم يمدها من غير تحريک ويجعل جنبها الأيسر من فوق . (المنتقى شرح الموطا: ۱/۱۶۵،ط:دارالكتاب العربى).

عارضۃ الاحوذی میں شیخ ابن العربی لکھتے ہیں:

وإياكم وتحريک أصابعكم فى التشهد ولا تلتفتوا إلى رواية العتبية فإنها بلية ، وعجباً ممن يقول إنها مقمعة للشيطان إذا حركت ! ! واعلموا أنكم إذا حركتم للشيطان اصبعاً حرک لكم عشراً إنما يقمع الشيطان بالإخلاص والخشوع والذكر والاستعاذة ، فأما بتحريكه فلا . (عارضة الاحوذى : ۲/۸۵)، ماخوذ من (رسائل السقاف :۲/۲۴۰).

وقال فى الفقه على المذاهب الأربعة : ومنها أن يشير بسبابته فى التشهد على

تفصيل في المذاهب : المالكية قالوا: يندب في حالة الجلوس للتشهد أن يقعد ماعدا السبابة والإبهام تحت الإبهام من يده اليمنى وأن يمد السبابة والإبهام وأن يحرك السبابة دائماً يميناً وشمالاً تحريكاً وسطاً .

الحنفية قالوا: يشير بالسبابة من يده اليمنى فقط بحيث لو كانت مقطوعة أو عليلة لم يشر بغيرها من أصابع اليمنى ولا اليسرى عند انتهائه من التشهد بحيث يرفع سبابته عند نفي الألوهية عما سوى اللّٰه تعالىٰ بقوله: لا إله إلا اللّٰه ، ويضعها عند إثبات الألوهية للّٰه وحده بقوله: إلا اللّٰه فيكون الرفع إشارة إلى النفي والوضع إلى الإثبات .

الحنابلة قالوا: يعقد الخنصر والبنصر من يده ويحلق بإبهامه مع الوسطى ويشير بسبابته في تشهد ودعاء ه عند ذكر لفظ الجلالة ولا يحركها .

الشافعية قالوا: يقبض جميع أصابع يده اليمنى في تشهد إلا السبابة وهي التي تلي الإبهام ويشير بها عند قوله: إلا اللّٰه ويديم رفعها بلا تحريك إلى القيام في التشهد الأول والسلام في التشهد الأخير... (الفقه على المذاهب الاربعة: ۱/۱۱۴ ،مكتبة الثقافة).

دونوں احادیث کے مابین تطبیق:

قال الإمام البيهقي: فيحتمل أن يكون المراد بالتحريك الإشارة بها لا تكرير تحريكها، فيكون موافقاً لرواية ابن الزبير واللّٰه تعالىٰ أعلم . (السنن الكبرى : ۲/۱۸۹).

قال الشيخ خليل أحمد السهارنفوري: وعند الحنفية لا تعارض بين الحديثين فإنهم يقولون إنه إذا أشار يرفعها عند النفي ويضعها عند الإثبات فهذا هو محمل التحريك عند الرفع والوضع وأما عدم التحريك فمحمول على ما سوى ذلك كما يفعله بعض أهل الحديث . واللّٰه تعالىٰ أعلم . (بذل المجهود: ۴/۵۴۸،دار البشائر الاسلامية). واللہ ﷻ اعلم۔

معذور شخص کا چارزانو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم:

سوال: ایک شخص ایسا معذور ہے کہ وہ کھڑے ہوکر رکوع، سجدہ کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا ہے، بلکہ بستر سے اترنے کی بھی طاقت نہیں ہے تو کیا بستر پر چوکڑی مار کر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر معذور شخص رکوع، سجدہ پر قادر نہیں ہے، تو وہ چار پائی پر چار زانو بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے، بشرطیکہ چار پائی پاک صاف ہو، لیکن اگر رکوع سجدہ کی طاقت ہے اور قیام کی طاقت نہیں ہے تو پھر چار پائی پر بیٹھ کر رکوع سجدہ کے ساتھ نماز پڑھنا درست ہے۔ رکوع، سجدہ کا اشارہ کافی نہ ہوگا۔

ملاحظہ ہو مبسوط میں مذکور ہے:

وأما إذا كان قادراً على القيام وعاجزاً عن الركوع والسجود ، فإنه يصلي قاعداً بإيماء وسقط عنه القيام ؛ لأن هذا القيام ليس بركن ؛ لأن القيام إنما شرع لافتتاح الركوع والسجود به، فكل قيام لا يعقبه سجود لا يكون ركناً ، ولأن الإيماء إنما شرع للتشبه بمن يركع ويسجد والتشبه بالقعود أكثر . (المبسوط للامام السرخسي : ۱/۲۱۳،دارالمعرفة،بيروت).

قال في الدرالمختار : من تعذر عليه القيام لمرض قبلها أو فيها أو خاف زيادته أو بطء برئه بقيامه أو دوران رأسه أو وجد لقيامه ألماً شديداً أو كان لو صلى قائماً سلسل بوله أو تعذر عليه الصوم ،صلى قاعداً ولو مستنداً إلى وسادة... فإنه يلزمه ذلك على المختار، كيف شاء بركوع وسجود وإن قدر على بعض القيام قام . (الدرالمختار: ۲/۹۵،سعيد).

وفي الشامية : قوله كيف شاء أي كيف تيسر له بغير ضرر من تربع أو غيره . (ردالمحتار: ۲/۹۷،سعيد). (وكذا في تبيين الحقائق : ۱/۲۰۲،والعناية : ۲/۲،والفتاوى الهندية: ۱/۱۳۶).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

کوئی شخص مسجد میں آ سکتا ہے لیکن بوجہ مرض کھڑا ہوکر با جماعت نماز نہیں پڑھ سکتا، ایسے شخص کو بیٹھ کر با جماعت فرض نماز ادا کرنا جائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۷/۵۶۳، جامعہ فاروقیہ)۔

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے: معذوروں کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۲/۴۶۷)۔

فتاویٰ حقانیہ میں مذکور ہے:

نماز میں قیام فرض ہے، البتہ اگر مریض کو قیام پر قدرت حاصل ہو اور مرض کی زیادتی کا اندیشہ نہ ہو، کھڑے ہونے سے کوئی تکلیف بھی نہ ہوتی ہو تو بلا عذر قیام ترک کرنا جائز نہیں، البتہ معذور شخص کو قیام ترک کرنا مرخص ہے۔ (فتاویٰ حقانیہ:۳/۳۳۳، وکذا فی فتاویٰ رحیمیہ:۳/۳۶۳)۔

بعض احادیث میں مریض کے لیے چارزانو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے؛

أخرج الإمام البخاري في صحيحه(۸۲۷) بسنده عن عبد الرحمن بن قاسم عن عبدالله بن عبد الله أنه أخبره أنه كان يرى عبد الله بن عمر رضي الله عنه يتربع فى الصلاة إذا جلس ففعلته وأناْ يومئذٍ حديث السن فنهاني عبد الله بن عمر وقال: إنما سنة الصلاة أن تنصب رجلك اليمنى وتثنى اليسرى فقلت: إنك تفعل ذلك فقال: إن رجلي لا تحملاني.

وأخرج الإمام محمد بن حسن فى مؤطا (۱۵۲) عن مالك عن عبد الله بن دينارعن ابن عمر رضي الله عنه: أنه صلى إلى جنبه رجل فلما جلس الرجل تربع وثنى رجليه فلما انصرف ابن عمر رضي الله عنه عاب ذلك عليه قال الرجل: فإنك تفعله قال: إني أشتكي. واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فوت شدہ پانچ نمازیں رہ جانے پر ترتیب کے عود کرنے کا حکم:

سوال: صاحبِ ترتیب نے اپنی فوت شدہ نمازیں قضا پڑھ لیں تو ترتیب واپس آئی یا نہیں؟ نیز اگر پڑھتے پڑھتے پانچ نمازیں رہ گئیں تو ان پانچ میں ترتیب ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: صاحبِ ترتیب وہ شخص کہلاتا ہے جس کے ذمہ کوئی قضا نماز نہ ہو، تو جب سب نمازیں قضا کر چکا تو اب صاحبِ ترتیب شمار ہوگا، لیکن پانچ نمازیں باقی ہیں تو اس میں دو قول ہیں؛ اصح یہ ہے کہ ترتیب عود کر نہیں آئے گی جب تک تمام نمازیں قضا نہ کر لیں، یعنی صورتِ مسئولہ میں پانچ نمازیں بغیر ترتیب کے پڑھ سکتا ہے اگرچہ ترتیب وار پڑھنا بہتر ہے۔ فتاویٰ شامی میں ہے:

وقيد بقضاء البعض، لأنه لو قضى الكل عاد الترتيب عند الكل كما نقله القهستاني.

(فتاوی الشامی: ۲/۷۰، سعید).

شرح وقایہ میں مذکور ہے:

فإنه لما قضى صلاة الشهر إلا فرضاً أو فرضين قلت الفوائت بعد الكثرة فلا يعود الترتيب إلا أن يقضي الكل . (شرح الوقاية : ۱/۱۸۳،قضاء الفوائت). (ومثله فی البحرالرائق: ۲/۸۶).

وفي فتح القدير: عاد الترتيب عند البعض وهو الأظهر، خلاف ما اختاره شمس الأئمة وفخر الإسلام وصاحب المحيط وقاضي خان وصاحب المغنى والكافي وغيرهم، وما استدل به عن محمد فيه نظر...فالأصح أن الترتيب إذا سقط لايعود...الخ . (فتح القدير: ۱/۴۹۳، دارالفكر). (وكذا فی امدادالفتاح ،ص: ۸۴۹). (وفتاویٰ دارالعلوم زکریاجلد دوم ،ص ۵۳۶، ط: المجلس العلمی ، بمبئی). واللہ ﷻ اعلم۔

جمعہ کی نمازِ فجر میں سورۂ تبارک پڑھنے کا ثبوت:

سوال: ایک امام صاحب کبھی کبھی جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۂ ملک پڑھتے ہیں، کیا یہ حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: جمعہ کی نمازِ فجر میں سورۂ ملک پڑھنا ایک روایت سے ثابت ہے، لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔ ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق میں ہے:

عبد الرزاق عن ابن جريج قال: أخبرت عن ابن مسعود ﷺ قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ في صلاة الجمعة بسورة الجمعة وسبح اسم ربك الأعلى وفي صلاة الصبح يوم الجمعة ألم تنزيل وتبارك الذي بيده الملك . (مصنف عبدالرزاق:۳/۱۸۱،رقم : ۵۲۳۸، باب القراءة فی یوم الجمعة،ادارة القرآن كراچی).

اس روایت میں ابن جریج کہتے ہیں: أخبرت عن ابن مسعود ،اورمحدثین کے یہاں ابن جریج جب اس طرح کے الفاظ سے روایت کرے تو اس کا اعتبار نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو حافظ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب میں فرماتے ہیں:

وقال الأثرم عن أحمد: إذا قال ابن جريج قال فلان، وقال فلان وأخبرت ، جاء بمناكير وإذا قال: أخبرني وسمعت فحسبك به . (تهذيب التهذيب: ۳۵۹/۶،ط: دارالفكر).

(وكذا في منهج الامام احمد في اعلال الاحاديث: ۷۳۱/۲، ط: وقف السلام،وموسوعة اقوال الامام احمد في الجرح والتعديل: ۳۷۹/۴،وسير اعلام النبلاء: ۳۲۸/۶).

میزان الاعتدال میں حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

قال عبد الله بن أحمد بن حنبلؒ: قال أبي: بعض هذه الأحاديث التي كان يرسلها ابن جريج أحاديث موضوعة كان ابن جريج لا يبالي من أين يأخذها ، يعني قوله : أخبرت ، وحدثت عن فلان. (ميزان الاعتدال: ۳۷۳/۳، رقم:۵۲۷۷).

دوسری وجہِ ضعف یہ ہے کہ ابن جریج اور عبداللہ بن مسعودؓ کے درمیان طویل فاصلہ ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وفات ۳۲ یا ۳۳ ہجری میں ہوئی (سیر اعلام النبلاء: ۴۹۹/۱) اور ابن جریجؒ ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے۔ (الطبقات الکبری لابن سعد: ۴۹۲/۵) معلوم ہوا سند میں انقطاع ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دو وجوہات کی بنا پر یہ روایت ضعیف ہے اور اس روایت سے استدلال مشکل ہے۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق فضائل سے ہے بنا بریں کبھی کبھی اس پر عمل کرنا درست ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

وقت تنگ ہونے کی وجہ سے تیمّم کر کے نماز پڑھنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے پاس پانی موجود نہیں ہے اور وقت تنگ ہے کہ اگر ایک میل تلاش کرنے جائے گا تو وقت نکل جائے گا اور نماز قضا ہو جائیگی، جبکہ پانی میل شرعی کے اندر موجود ہے، تو یہ شخص تیمّم کر کے نماز پڑھے گا یا نہیں؟ اگر پڑھی تو بعد میں وضو کر کے اعادہ کریگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اکثر فقہاء کے نزدیک تیمّم جائز نہیں ہے بلکہ پانی تلاش کر کے وضو کریگا اور نماز پڑھے گا اگر چہ وقت نکل جائے، لیکن امام زفرؒ کے نزدیک وقت تنگ ہو جائے تو تیمّم کر کے نماز پڑھے گا، اگر چہ پانی

قریب ہو، اسی وجہ سے بعض علماء نے لکھا ہے کہ احتیاط یہ ہے کہ تیمّم کر کے نماز پڑھے پھر وضو کر کے اعادہ کر لے۔

قال فی الفتاوی الخانية: فإن كان الماء قريباً منه لا يجوز له التيمم وإن خاف خروج الوقت اختلفوا في حد القرب قال الفقيه أبوجعفرؒ: أجمع أصحابنا على أنه يجوز للمسافر أن يتيمم إذا كان بينه وبين الماء ميل وإن كان أقل من ذلک لا يجوز إذا كان يعلم به المسافر وإن خاف خروج الوقت . (فتاوی قاضی خان بهامش الفتاوى الهندية: ۱/۵۴).

وفی الهداية: والمعتبر المسافة دون خوف الفوت. (الهداية: ۱/۴۹،ط: مکتبه شركة علميه).

وفي حاشية الطحطاوي على مراقی الفلاح : وخوف فوت الوقت ، وقيل : يتيمم لخوف فوت الوقت قال الحلبي: والأحوط أنه يتيمم ويصلي ويعيد ذكره السيد . (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح،ص ۱۱۸،ط: قدیمی).

وفي شرح المنية : وحينئذٍ فالاحتياط أن يصلى بالتيمم فی الوقت ثم يتوضأ ويعيد ليخرج عن العهدتين . (شرح المنية ، ص ۸۳،ط: سهيل اکیڈمی).

امام زفرؒ کے قول کی ترجیح علامہ شامیؒ کی عبارت میں:

قوله وقيل يتيمم ، هوقول زفرؒ وفی القنية: أنه رواية عن مشايخنا، بحر، قوله قال الحلبي، أی البرهان إبراهيم الحلبي في شرحه على المنية وذكر مثله العلامة ابن أمير حاج الحلبي فی الحلية (الصحيح الحَلْبَة) شرح المنية حيث ذكر فروعاً عن المشايخ ثم قال: ما حاصله ولعل هذا من هؤلاء المشايخ اختيار لقول زفر لقوة دليله وهو أن التيمم إنما شرع للحاجة إلى أداء الصلاة فی الوقت فيتيمم عندخوف فواته ، قال شيخنا ابن الهمام: ولم يتجه لهم عليه سوى أن التقصير جاء من قبله فلا يوجب الترخيص عليه وهو إنما يتيمم إذا أخر لا لعذر...فينبغي أن يقال: يتيمم ويصلي ثم يعيد الوضوء كمن عجز بعذر قبل العباد وقد نقل الزاهدي في شرحه هذا الحكم عن الليث بن سعد...قلت: وهذا قول متوسط بين القولين وفيه الخروج عن العهدة بيقين فلذا أقره الشارح ثم رأيته منقولاً فی التاتارخانية عن

أبي منصور بن سلام وهو من كبار الأئمة الحنفية قطعاً فينبغي العمل به احتياطاً ولا سيما و كلام ابن الهمام يميل إلى ترجيح قول زفر كما علمته. (فتاوى الشامي: ۱/۲۴۶، سعيد).

پھر علامہ شامیؒ باب النفقہ میں ان مسائل کے تحت فرماتے ہیں جن میں امام زفرؒ کے قول پر فتویٰ دیا گیا ہے۔

قال: هذا وقد زدت على ذلك ثماني مسائل... جواز التيمم لمن خاف فوت الوقت إذا توضأ وهو قول زفرؒ وقدمنا في التيمم ترجيحه لكن مع الأمر بالإعادة احتياطاً. (فتاوى الشامي: ۶۰۸/۳، سعيد).

امداد الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

اگر پانی ایک میل شرعی کے اندر ہو جو کہ میل انگریزی سے کچھ زیادہ ہوتا ہے تو تیمّم جائز نہیں، اگرچہ نماز قضا ہو جائے پانی تلاش کر کے وضو کرے اور نماز قضا پڑھے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تعلیق میں اس مسئلہ کے تحت لکھتے ہیں: اولیٰ یہ ہے کہ احتیاطاً اس وقت تیمّم کر کے نماز پڑھ لے اور پھر پانی ملنے کے بعد وضو کر کے اعادہ کر لے۔ (امداد الفتاویٰ: ۹۶/۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نمازِ فجر کے دوران طلوعِ شمس سے نماز کی صحت کا حکم:

سوال: یہ مسئلہ تو مجھے معلوم ہے کہ نمازِ فجر کے دوران سورج طلوع ہو جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے، لیکن اگر عوام کو دوبارہ پڑھنے کے لیے کہا جائے گا تو ان کے لیے ایک مرتبہ مشکل ہے تو دوبارہ کہاں پڑھیں گے۔ ایسی صورت میں ان لوگوں کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟ کیا کسی کتاب میں صحت کا قول منقول ہے یا نہیں؟

الجواب: اگر عوام سستی کی وجہ سے اعادہ نہ کرتے ہوں یا ان کے لیے اعادہ مشکل ہو تو بعض فقہاء کے قول کے مطابق ان کی نماز درست ہو جائے گی، کیونکہ منع کرنے کی صورت میں نماز ہی چھوڑ دیں گے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مرقوم ہے:

وفي القنية: كسالى العوام إذا صلوا الفجر وقت الطلوع لا ينكر عليهم لأنهم لو منعوا يتركونها أصلاً ظاهراً ولو صلوها تجوز عند أصحاب الحديث والأداء الجائز عند

البعض أولى من الترک أصلاً . (البحرالرائق: ۱/۲۵۱،ط: کوئٹه).

وفيـه أيضاً: قال في التجنيس: سئل شمس الائمة الحلواني أن کسالى العوام يصلون الفجر عند طلوع الشمس أفنزجرهم عن ذلک قال: لا ، لأنهم إذا منعوا عن ذلک ترکوها أصلاً وأداؤها مع تجويز أهل الحديث لها أولى من ترکها أصلاً . (البحرالرائق:۲/۱۷۳،باب العيدين ، ط: دارالمعرفة، بيروت). (وکذا في فتاوى الشامي نقلاً عن البحر:۲/۱۷۱، سعيد).

وفي مراقي الفلاح : ولا ننهى کسالى العوام عن صلاة الفجر وقت الطلوع لأنهم قد يترکونها بالمرة والصحة على قول مجتهد أولى من الترک . (مراقي الفلاح،ص۷۶).

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: وروي عن أبي يوسفؒ أيضاً جواز الفجر إذا لم يکن تأخيره إلى الطلوع قصداً . (حاشية الطحطاوى على مراقي الفلاح،ص۱۸۶، قديمى). (وکذا في فقه العبادات ،ص۷۰). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

نماز میں ٹخنے سے نیچے ازار موڑنے کا حکم اور حدیث میں وارد شدہ ممانعت کا مطلب:

سوال: بعض لوگ لمبی شلوار یا پاجامہ یا پتلون پہنتے ہیں،اس میں ٹخنے ڈھکے ہوتے ہیں، یہ مکروہ ہے، اب یہ لوگ نماز کے وقت شلوار یا پاجامہ یا پتلون کو موڑتے ہیں تا کہ نماز میں کراہت سے بچ جائیں،جبکہ حدیث میں نماز میں کپڑا موڑنے اور بال موڑنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے،اس کا کیا مطلب ہوگا؟

الجواب: نماز میں ٹخنے سے نیچے کپڑا لٹکانا مکروہِ تحریمی ہے،لہٰذا نماز سے پہلے ٹخنے سے اوپر کر لینا چاہیے،اور زیادہ لمبا ہوتو موڑ لینا چاہیے،اور حدیث کا واضح اور بے غبار مطلب یہ ہے کہ سجدہ میں جاتے وقت کپڑوں کو نہیں سمیٹنا چاہیے۔روایت ملاحظہ کیجیے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: أمرت أن أسجد على سبعة أعظم لا أکف شعراً ولا ثوباً .

(رواه البخاري: ۱/۱۱۳/۸۱۶،باب لايکف ثوبه في الصلاة)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں اور کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹوں۔ملاحظہ ہو فقہاء لکھتے ہیں:

سجدہ میں جاتے وقت کپڑوں کو نہیں سمیٹنا چاہیے۔ **قال في الكفاية: والكف أن يرفع الثوب من بين يديه أو من خلفه إذا أراد السجود كذا في المغرب .** (الكفاية شرح الهداية: ۱/۳۵۹،ط:رشيديه).

قال في حاشية السندي: أكف، أي أضم في السجود احترازاً عن التراب . (حاشية السندى على ابن ماجه،ص۱۰۴).

وفي البناية : المراد من كف الثوب القبض والضم وأن يرفعه بين يديه أو من خلفه إذا أراد السجود. (البناية شرح الهداية:۲/۵۳۲،رشيديه).

قال الحافظ ابن حجرؒ: و يؤخذ منه أن النهي عن كف الثياب في الصلاة محله في غير ذيل الإزار . (فتح الباري :۱۰/۲۵۶).

علماء نے اس کی تین علتیں بیان کی ہیں:

۱۔ بار بار کپڑا سمیٹنے کی وجہ سے نماز سے اعراض اور کپڑوں کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ **قال في لامع الدراري: لما فيه من ترك الخشوع والالتفات إلى الغير.** (لامع الدراری: ۱/۳۲۸،سعيد).

قال في فتح الباري لابن رجب: بخلاف كف الثوب فإنه إنما يكره فعله في الصلاة خاصة لما فيه من العبث...قلت لأحمد: الرجل يقبض ثوبه من التراب إذا ركع وسجد ؛لئلا يصيب ثوبه ؟ قال: لا؛ هذا يشغله عن الصلاة . (فتح الباری :۵/۱۲۸،ط: دارابن الجوزی).

۲۔ جب آدمی سجدہ کرتا ہے تو کپڑے، بال، اور سب اعضا سجدہ کرتے ہیں، اس لیے سمیٹنا مکروہ ہے۔

قال في فتح الملهم : لا يضمهما إلى نفسه وقاية لهما من التراب، بل يتركهما حتى يقعا على الأرض ليسجد بجميع الأعضاء والثياب . (فتح الملهم :۳/۲۶۱).

قال في حاشية لامع الدراري: فإن الشعر والثوب يسجد معه . (حاشية لامع الدراری: ۱/۳۲۸).

قال الإمام أحمد : إذا صلى فلا يرفعن ثوبه ولا شعره ولا شيئاً من ذلك لأنه يسجد. (فتح الباری لابن رجب:۵/۱۲۷).

قال في مجمع بحار الأنوار : لا يضمهما (الشعر والثوب) وقاية لهما عن التراب بل يتركهما حتى يقعا على الأرض معه. (مجمع بحار الانوار: ۲۳/۳).

۳۔ تکبر سے حفاظت ہے، کیونکہ سجدے میں جاتے وقت کپڑے سمیٹنا متکبرین کا شیوہ ہے، اور اس میں اپنی شان دکھانے کا شبہ ہے۔ **قال في فتح الملهم : والحكمة أنه إذا رفع ثوبه وشعره عن مباشرة الأرض أشبه المتكبر والمقام مقام الخشوع والتواضع .** (فتح الملهم: ۱۴۱/۳).

وفي حاشية اللامع : أنه إذا رفع شعره أو ثوبه عن مباشرة الأرض أشبه المتكبرين . (حاشية اللامع: ۳۲۸/۱، سعيد).

وفي الهداية : ولا يكف ثوبه لأنه نوع تجبر . (الهداية: ۱۴۱/۱، المصباح).

ہاں حدیث شریف کے ظاہری الفاظ سے کپڑا موڑنے کی کراہت پر استدلال کیا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ بلاعذر آستین چڑھا کر یا شلوار موڑ کر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے۔

قال في عمدة القاري: وفي التلويح اتفق العلماء على النهي عن الصلاة وثوبه مشمراً أو كمه أو رأسه معقوص أو مردود شعره تحت عمامته أو نحو ذلك وهو كراهة تنزيه فلو صلى كذلك فقد أساء وصحت صلاته . (عمدة القاري: ۵۵۷/۴، وحاشیۃ اللامع: ۳۲۷/۱).

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ نماز میں کپڑا موڑنا مکروہِ تنزیہی ہے، جبکہ ٹخنے ڈھکے ہوئے نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، جو زیادہ سخت ہے اس لیے اہون البلیتین پر عمل کرتے ہوئے ٹخنے موڑنا ہی بہتر ہوگا تاکہ شدید وعید سے بچ جائے۔ ملاحظہ کیجیے آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مرقوم ہے:

شلوار ٹخنوں سے نیچے رکھنا حرام ہے اور حرام فعل کا ارتکاب نماز میں اور بھی برا ہے، اس لیے نماز سے پہلے شلوار اوپر کرلینا ضروری ہے، اور مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پاجامہ ہمیشہ ٹخنوں سے اوپر رکھنا چاہیے۔ **عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: بينما رجل يصلي مسبلاً إزاره قال له رسول الله صلى الله عليه وسلم : اذهب فتوضأ ، فذهب فتوضأ ، ثم جاء ،ثم قال: اذهب فتوضأ ، فذهب فتوضأ ، ثم جاء فقال له رجل يا رسول الله مالك امرته أن يتوضأ ، ثم سكت عنه ،**

فقال: إنه كان يصلي وهو مسبل إزاره وأن الله تعالىٰ لا يقبل صلاة رجل مسبل إزاره. (سنن ابی داود: ۱/۱۰۲، ۶۳۸)، (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/۳۲۱)۔

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹخنے سے نیچے کپڑا رکھنے سے مردوں کو منع فرمایا ہے، اور اس پر دوزخ کی وعید ہے۔ (**ما أسفل من الكعبين من الإزار في النار**، بخاری ۵۷۸۷، کتاب اللباس، ۲/۸۶۱)، اس لیے یوں تو عام اوقات میں بھی ٹخنے سے نیچے کپڑوں کا لٹکانا مکروہ ہے، لیکن خاص کر نماز کی حالت میں اس کی کراہت اور زیادہ ہے، اس لیے کہ اس طرح کپڑے لٹکانے کو حدیث میں کبر کی علامت قرار دیا گیا ہے، (**وارفع إزارك إلى نصف الساق فإن أبيت فإلى الكعبين وإياك وإسبال الإزار فإنها من المخيلة وإن الله لا يحب المخيلة** . سنن ابی داود، ۴۰۸۴، باب ماجاء فی اسبال الازار، ۲/۲۱۰، امدادیہ) بلکہ بعض روایات میں تو اس کو منافق کی علامت بتایا گیا ہے: **علامة المنافق تطويل سراويله** (کنز العمال، ۴۱۱۹۸ وعزاہ الی الدیلمی)، اور نماز تو کمالِ تواضع اور فروتنی کا مقام ہے، اس لیے یہاں بدرجہ اولیٰ ٹخنوں سے نیچے رکھنا مکروہ ہوگا، لہٰذا یہ کہنا کہ نماز کی حالت میں پینٹ کو اوپر کی طرف موڑ لینا مکروہِ تحریمی ہے، درست نہیں، ہاں! یہ ضرور ہے کہ عام حالات میں بھی ٹخنے سے نیچے کپڑا رکھنا نہیں چاہیے، کیونکہ یہ عمل ہر حال میں مکروہ ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۲/۲۲۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نماز میں چھینک آنے پر ’’اللہ کا شکر ہے‘‘ کہنے سے نماز کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے نماز میں چھینک آنے پر الحمد للہ کہنے کے بجائے یہ کہا: اللہ کا شکر ہے، تو اس کی نماز فاسد ہوگئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نماز میں چھینک آنے پر الحمد للہ اور اللہ کا شکر ہے دونوں نہیں کہنا چاہیے لیکن اگر اللہ کا شکر ہے کہا تو نماز فاسد نہیں ہوئی، البتہ مکروہِ تحریمی ہونے کی وجہ سے اعادہ واجب ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ مکروہِ تنزیہی ہوئی اعادہ واجب نہیں۔ ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں منقول ہے:

لكن المنقول عندنا الكراهة فقد قال في غرر الأفكار شرح درر البحار في هذا المحل وكره الدعاء بالعجمية لأن عمر نهى عن رطانة الأعاجم، والرطانة كما فى القاموس الكلام بالأعجمية...وأما بقية أذكار الصلاة فلم أر من صرح فيها بالكراهة سوى ما تقدم ولا يبعد أن يكون الدعاء بالفارسية مكروهاً تحريماً فى الصلاة ...الخ. (فتاوى الشامي: ۱/ ۵۲۱، سعيد).

وللمزيد راجع: (تقريرات الرافعي : ۱/ ۸۰،سعيد،وفتاویٰ قاضي خان بهامش الهندية : ۱/ ۸٦).

احسن الفتاوی میں مذکور ہے:

اگر کسی نے نماز میں عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں دعا کی تو نماز صحیح ہوجائے گی؟

الجواب: اس میں تین قول ہیں؛ حرام، مکروہِ تحریمی، مکروہِ تنزیہی کراہتِ تحریمیہ کا قول ارجح واوسط ہے، لہٰذا اس نماز کا اعادہ واجب ہے، قال شارح التنويرؒ: ودعا بالعربية، وحرم بغيرها، نهر، وقال ابن عابدينؒ بعد ذكر الأقوال: ولا يبعد أن يكون الدعاء بالفارسية مكروهاً تحريماً فى الصلاة وتنزيهاً خارجها، فليتأمل وليراجع. (ردالمحتار : ۱/ ۱۲۵)، (احسن الفتاوی: ۳/ ۴۳۳)۔

فتاویٰ حقانیہ میں مرقوم ہے:

مسنون طریقہ یہ ہے کہ نماز میں صرف عربی زبان میں دعا کی جائے، اگر کسی اور زبان میں دعا کی جائے تو نماز کراہت سے خالی نہ ہوگی۔ (فتاویٰ حقانیہ: ۳/ ۲۰۹)، و(فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۲/ ۳۹۷، ط: بمبئی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

چست اور تنگ لباس میں نماز کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص ایسی تنگ پتلون پہن کر نماز پڑھے جس میں اعضائے ستر کی ہیئت نظر آتی ہو تو کیا نماز درست ہوگی یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہوئی تو قضا واجب ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ایسی تنگ اور چست پتلون پہن کر نماز پڑھنا مکروہ ہے تاہم نماز کراہت کے ساتھ ہوجائیگی اعادہ واجب نہیں ہے، اور ایسا چست لباس پہننا خارجِ نماز بھی مکروہ ہے۔ فتاویٰ شامی میں مذکور ہے:

قوله ولا يصف ما تحته بأن لا يرى منه لون البشرة احترازاً عن الرقيق ونحو الزجاج ، قوله ولا يضر التصاقه أى بالالية مثلاً وقوله وتشكله من عطف المسبب على السبب وعبارة شرح المنية أما لو كان غليظاً لايرى منه لون البشرة إلا أنه التصق بالعضو وتشكل بشكله فصار شكل العضو مرئياً فينبغي أن لايمنع جواز الصلاة لحصول الستر. (فتاوى الشامى: ۱/ ۴۱۰، سعيد).

کتاب المسائل میں مرقوم ہے:

ایسا چست لباس پہننا جس سے اعضاء مستورہ کی ہیئت ظاہر ہو جائے اگرچہ مکروہ اور بے حیائی کی دلیل ہے ؛ تاہم اگر کپڑا اتنا دبیز ہو کہ اندر کی کھال نظر نہ آئے تو اس میں نماز پڑھنا درست ہے۔ (کتاب المسائل: ۱/۲۷۳)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے: کسی ہوئی جینز اور ٹی شرٹ پہن کر نماز پڑھنے سے گو کہ نماز بہ کراہت درست ہو جاتی ہے؛ لیکن ہمارے عرف میں یہ لباس صالحین کے لباس کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ (کتاب المسائل: ۱/۲۷۱)۔

فتاویٰ دارالعلوم زکریا میں مرقوم ہے:

لباس کے چند بنیادی اصول:...(۶) نیچے پتلون اور اوپر شرٹ پہن لیا تو یہ لباس ناجائز تو نہیں، لیکن صلحاء کا لباس نہ ہونے کی وجہ سے خلافِ اولیٰ ہے اور اگر اس میں اعضائے مستورہ کی بناوٹ ظاہر ہوتی ہے تو مزید کراہت پیدا ہو جائے گی۔

...وأما اللباس المكروه فعلى ثلاثة أوجه : ... والثاني: لباس الرقاق الذى يبين منه البدن لأنه لباس أهل التكبر والخيلاء والأشر، ومن لا اهتمام له بأمر الآخرة... (النتف فى الفتاوىٰ، ص ۱۶۱، ۱۶۲). (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۷/۸۲، ط: زمزم پبلشرز)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وتر کو نمازِ تہجد کے بعد پڑھنے کا حکم:

سوال: میری والدہ جاننا چاہتی ہے کہ کیا نمازِ وتر کو نمازِ تہجد کے بعد پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: افضل اور بہتر یہی ہے کہ نمازِ وتر نمازِ تہجد کے بعد ادا کی جائے، یہ بات بہت ساری احادیث سے ثابت ہے، چند احادیث حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں؛ بخاری شریف میں ہے:

عن ابن عمر رضي الله عنه أن رجلاً سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صلاة الليل، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صلاة الليل مثنى مثنى، فإذا خشي أحدكم الصبح صلى ركعة واحدة توتر له ما قد صلى. (صحيح البخارى: ۱/۱۳۵/۹۹۰،قديمى).

وعن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي من الليل حتى يكون آخر صلاته الوتر. (صحيح مسلم :۳/۶۲/۱۷۲۶،مكتبة البشرى).

وعن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ، كان يصلى صلاته بالليل وهي معترضة بين يديه ، فإذا بقي الوتر أيقظها فأوترت. (صحيح مسلم :۳/ ۶۳/ ۱۷۳۴، البشرى).

وعن مسروق، أنه سأل عائشة رضى الله تعالىٰ عنها عن وتر رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقالت: من كل الليل قد أوتر أوله، وأوسطه ، وآخره ، فانتهى وتره حين مات إلى السحر... حديث عائشةؓ حديث حسن صحيح ، وهو الذي اختاره بعض أهل العلم الوتر من آخر الليل. (جامع الترمذى: ۱/۲۳۱/۴۵۶،ط:الطاف).

وعن عبد الله بن عمر رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: اجعلوا آخر صلاتكم بالليل وتراً. (صحيح البخارى : ۱/۱۳۶/۹۹۸، قديمى).

مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اکثر معمول وتر تہجد کے بعد پڑھنے کا تھا اور یہی بہتر طریقہ ہے ہاں عشا کے بعد سونے سے پہلے پڑھ لینا بھی جائز ہے کہ بعض صحابہ کا یہ معمول تھا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تہجد سے پہلے وتر پڑھنے کا حکم:

سوال: وتر کو تہجد سے پہلے پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: وتر کی نماز تہجد کی نماز سے پہلے بھی پڑھنا جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ بعد میں پڑھے۔

قال في البحر الرائق: قوله الوتر إلى آخر الليل لمن يثق بالانتباه ، أي وندب تأخيره لرواية الصحيحين : اجعلوا آخر صلاتكم وتراً ، والأمر للندب لرواية الترمذي: من خشي منكم أن لا يستيقظ من آخر الليل فليوتر أوله ومن طمع منكم أن يوتر في آخر الليل فليوتر من آخر الليل فإن قراء ة القرآن في آخر الليل محضورة ، وهي أفضل وهو دليل مفهوم قوله لمن يثق وإذا أوتر قبل النوم ثم استيقظ وصلى ما كتب له لا كراهة فيه ولا يعيد الوتر ولزمه ترك الأفضل المفاد بحديث الصحيحين . (البحر الرائق: ۱/۲۴۸،ط: کوئٹہ).

وفي الشامية : قوله فإن أفاق، أي إذا أوتر قبل النوم ثم استيقظ يصلي ما كتب له ولا كراهة فيه بل هو مندوب ولا يعيد الوتر . (فتاوى الشامي: ۱/۳۶۹،سعيد).

وللمزيد راجع : (تبيين الحقائق: ۱/۸۴،ط: امداديه،وفتح القدير: ۱/۴۳۸،دارالفكر،ومجمع الانهر : ۱/۱۰۹، بيروت).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مرقوم ہے:

سوال: جونمازی تہجد گزار ہیں وہ تہجد کے وقت وتر ادا کرتے ہیں۔اگر پہلے ہی نمازعشاء کے وقت وتر پڑھ لیں تو اس میں کچھ حرج ہے یانہیں؟ اکثر آدمی کہتے ہیں کہ وتر کے بعد صبح تک کوئی نماز نہیں۔

الجواب: اس میں کچھ حرج نہیں ، کہ جولوگ تہجد گزار ہیں وہ بھی وتر کو بعد عشا پڑھ لیویں بلکہ یہ احوط ہے، پھر اگر اُٹھیں تو تہجد پڑھ لیں۔(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۴/۱۶۵،ط: دارالاشاعت)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

بعض صحابہ کرام کا معمول سونے سے پہلے وتر پڑھنے کا تھا:

سوال: وہ کون سے صحابہ کرام تھے جو عشا کے بعد سونے سے پہلے وتر پڑھتے تھے، پھر حسبِ توفیق الٰہی تہجد کے لیے اٹھتے تھے اور تہجد بھی ادا فرماتے تھے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: کتبِ حدیث میں چند صحابہ کرام کا تذکرہ ملتا ہے جو سونے سے پہلے وتر پڑھتے تھے اور تہجد

بھی ادا فرماتے تھے، ان کے اسماء یہ ہیں: حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت رافع بن خدیجؓ، حضرت ابوالدرداءؓ۔ ملاحظہ ہو شرح معانی الآثار میں ہے:

عن ابن المسيب أن أبابكر وعمر رضى الله تعالىٰ عنهما تذاكرا الوتر عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: أبوبكرؓ: أما أناْ فأصلي ثم أنام على وتر فإذا استيقظت صليت شفعاً حتى الصباح فقال عمرؓ: لكني أنام على شفع ثم أوتر من آخر السحر فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لأبي بكرؓ: حذر هذا ، وقال لعمرؓ: قوى هذا ، فدل قول رسول الله صلى الله عليه وسلم لا وتران في ليلة على ما ذكرنا من نفى إعادة الوتر و وافق ذلك قول أبي بكرؓ أما أناْ فأوتر أول الليل فإذا استيقظت صليت شفعاً حتى الصباح وترک رسول الله صلى الله عليه وسلم النكير عليه دليل على أن حكم ذلك كما كان يفعل وأن الوتر لا ينقضه النوافل التي يتنفل بها بعده وقد روى ذلك أيضاً عن جماعة من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم . (شرح معانى الآثار: ۱/۲۳۸، المكتبة الامدادية).

و عن قتادة و مالک بن دينار أنهما سمعا خلاساً قال: سمعت عمار بن ياسر وسأله رجل عن الوتر، فقال: أما أناْ فأوتر ثم أنام فإن قمت صليت ركعتين ركعتين...الخ.

و عن أبي مرة مولى عقيل بن أبي طالبؓ: أنه سأل أباهريرةؓ كيف كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر فقال: إن شئت أخبرتک كيف أصنع أنا، قلت : أخبرني قال: إذا صليت العشاء صليت بعدها خمس ركعات ثم أنام فإن قمت من الليل صليت مثنى مثنى وإن أصبحت أصبحت على وتر. (شرح معانى الآثار: ۱/۲۳۸).

وعن جبير بن نفير عن أبى الدرداء، قال؛ أوصاني خليلى صلى الله عليه وسلم بثلاث لا أدعهن لشيء ؛ أوصاني بصيام ثلاثة أيام من كل شهر ، ولا أنام إلا على وتر، وبسبحة الضحى فى السفر والحضر. (سنن ابى داود: ۱/۲۰۳، ط:فيصل).

وقال في نخب الأفكار: وكان بعض السلف يوترون أول الليل ؛ منهم : أبوبكر، و عثمان، و

أبوهريرة ، و رافع بن خديج ، وبعضهم يوترون آخر الليل منهم : عمر بن الخطاب ، وعلى ابن أبى طالب ، وابن مسعود ، وأبوالدرداء ، وابن عباس ، وابن عمر وغيرهم من التابعين رضى اللّٰه تعالىٰ عنهم أجمعين. (نخب الافكار: ۵۲۲/۳،ط: الوقف المدنی).

اور وتر کے بعد تہجد پڑھنا اس حدیث کے منافی نہیں جس میں " اجعلوا آخر صلاتكم بالليل وتراً " آیا ہے اس لیے کہ آخر کا لفظ متعدد کی طرف مضاف ہوتا ہے تو صلاۃ سے مراد صلوات ِثلاثہ یا صلاتین ہیں تو معنی یہ ہے کہ مغرب، عشا اور وتر جن کا پڑھنا لازم ہے یا عشا اور وتر اِن میں وتر کو مؤخر کر و وتر کو عشا سے پہلے مت پڑھو، یہ مطلب نہیں کہ وتر کے بعد نفل پڑھنا ممنوع ہے اس لیے کہ وتر کے بعد نوافل صحابہ کرام سے ثابت ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی رکعتین بعد الوتر ثابت ہیں جو کسی بھی احادیث پڑھنے والے پر مخفی نہیں اور بعض صحابہ کرام کا معمول بھی یہ تھا کہ وتر اول اللیل میں پڑھتے تھے پھر اگر تہجد کی توفیق ملتی تو تہجد پڑھ لیتے تھے ورنہ سابقہ وتر پر اکتفا کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وتر کی کیفیت کے بارے میں تین مرتبہ سوال کیا، اور آپؐ خاموش رہے، پھر فرمایا: اگر تم چاہتے ہو تو میں اپنی وتر کی کیفیت بیان کروں، سائل نے حضرت ابو ہریرہؓ سے کہا بتلا دیجیے، انہوں نے فرمایا: میں عشا کی نماز کے بعد ۵ رکعتیں؛ دو سنت تین وتر پڑھتا ہوں پھر سو جاتا ہوں پھر اگر رات کو بیدار ہو جاؤں تو دو دو رکعتیں یعنی تہجد پڑھ لیتا ہوں اور اگر صبح کو اٹھوں تو صبح سے پہلے وتر پڑھ چکا ہوں، امام محمدؒ نے موطا (باب الوتر، رقم ۲۵۰) میں یہ روایت ذکر فرما کر یہ لکھا ہے: قال محمد: وبقول أبي هريرةؓ نأخذ لا نرى أن يشفع إلى الوتر بعد الفراغ من صلاة الوتر ولكنه يصلي بعد الوتر ما أحب ولا ينقض وتره وهو قول أبي حنيفةؒ .

مولانا یونس صاحبؒ لکھتے ہیں: صحابہ کرام کی ایک جماعت جن میں: ابوبکر صدیقؓ (ابن ابی شیبہ: ۲/۲۸۴، و طحاوی: ۱/ ۱۶۸) سعد بن ابی وقاصؓ (ابن ابی شیبہ: ۱/۲۸۴) عمار بن یاسرؓ (ابن ابی شیبہ: ۱/۲۸۴، طحاوی شریف: ۱/ ۱۶۸)، ابو ہریرہؓ (طحاوی شریف: ۱/ ۱۶۹)، وابن عباسؓ (ابن ابی شیبہ: ۲/ ۲۸۵، ومصنف عبدالرزاق: ۳/ ۳۰، ۳۱)، ورافع بن خدیجؓ (ابن ابی شیبہ: ۲/ ۲۸۵، طحاوی شریف: ۱/ ۱۶۸)، وحضرت عائشہؓ (ابن ابی شیبہ: ۲/ ۲۸۵، ومصنف عبدالرزاق: ۳/ ۳۱، وطحاوی شریف: ۱/ ۱۶۹)۔

اور فقہائے کرام میں: علقمہ، طاؤس، ابومجلز، ابراہیم نخعی، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، ابو یوسف، محمد، ابوثور رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر کسی شخص نے اول شب میں وتر پڑھ لی اور پھر آخر شب میں بیدار ہو گیا اور تطوع اور نوافل پڑھنا چاہتا ہے تو بلا کسی شرط وقید کے پڑھ سکتا ہے۔ (الیواقیت الغالیہ: ۲/ ۲۳۹)۔

معاصر عالمِ دین مولانا مرغوب احمد لاجپوری حفید نے اس مسئلہ پر رسالہ تحریر فرمایا ہے، تفصیل اسی میں ملاحظہ کیجیے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مساجد کا انشورنس کرانے کا حکم:

سوال: مغربی ملک میں ہم نے ایک مسجد بنائی، اور عام طور پر غیر مسلم وہاں مساجد کو منہدم کر دیتے ہیں تو کیا ہم مساجد کا انشورنس کر سکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عام علماء کے نزدیک انشورنس کرانا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ سود وقمار پر مشتمل ہے، لیکن بعض علماء درج ذیل دو صورتوں میں جائز قرار دیتے ہیں، تاہم اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ انشورنس سے اجتناب کیا جائے، خصوصاً مساجد اور اوقاف وغیرہ کے بارے میں تو احتیاط ہی بہتر ہے۔ فتاویٰ رحیمیہ میں بوقتِ ضرورت اجازت دی گئی، ملاحظہ ہو: (فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۱۷۴، ط: دیوبند) بعض علماء کے نزدیک جواز کی دو صورتیں ہیں وہ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ صاحبِ انشورنس، انشورنس کمپنی سے اتنا ہی وصول کرے جتنا اس نے قسطوار ادا کیا تھا، اگر انشورنس کمپنی زیادہ دے تو اس کو ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کر دیا جائے، یہ زیادتی بالاتفاق ناجائز ہے۔

۲۔ انشورنس کمپنی کوئی رقم ادا نہ کرے بلکہ خدمت یعنی مرمت کی ذمہ داری اٹھالے تو یہ صورت جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مبادلۃ المال بالمال نہیں ہوا بلکہ مال کے بدلہ میں خدمت ہے۔ جیسے میڈیکل ایڈ، یہ صورت اجارہ کے ضمن میں آئے گی۔

ہاں اس صورت میں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ ایک طرف سے مال کی ادائیگی لازم ہے اور دوسری طرف سے موہوم ہے یقینی نہیں ہے تو اس میں غرر ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں غرر یسیر ہے جو مفضی الی المنازعہ نہیں اس وجہ سے گنجائش ہے۔ اوجز المسالک میں مذکور ہے:

قال الباجي: ما كثر فيه الغرر و غلب عليه حتى صار البيع يوصف بالغرر فهذا الذي لاخلاف في المنع منه . وأما يسير الغرر فإنه لايؤثر في فساد عقد بيع فإنه لا يكاد يخلو عقد منه . (اوجز المسالک: ۱۳/۸۸).

زاد المعاد میں ہے: ليس كل غرر سبب للتحريم ، والغرر إذا كان يسيراً أو لا يمكن الاحتراز منه لم يكن مانعاً من صحة العقد . (زاد المعاد: ۵/۸۲۰).

عام حالات میں انشورنس ممنوع اور ناجائز ہے۔ ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

بیمہ باعتبارِ صورت قمار ہے، لأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين اور باعتبار حقیقت سود ہے، لعدم اشتراط المساواة في الجانبين فيما يجب فيه المساواة ، اور قمار اور سود دونوں حرام ہیں۔ (امداد الفتاویٰ: ۳/۱۶۱)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا، جلد پنجم ، ص ۴۴۲، و ۵/۴۲۷، ط: زمزم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

وتر کی نماز یاد ہوتے ہوئے فجر پڑھنے سے نمازِ فجر کا حکم:

سوال: اگر کوئی صاحبِ ترتیب رات کو وتر کی نماز نہ پڑھے اور اگلے دن فجر کی نماز پڑھے، تو کیا اس کی نمازِ فجر ادا ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر صاحبِ ترتیب نے وتر یاد ہوتے ہوئے اگلے دن فجر کی نماز پڑھ لی تو فجر کی نماز فاسد ہوئی، لیکن یہ فساد پکا نہیں، اگر اس طرح نمازیں پڑھتا رہا یہاں تک کہ چھ نمازیں ہوگئیں تو سب نمازیں خود بخود صحیح ہوجائیگی اور یہ احناف کا مذہب ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں مذکور ہے:

و لو صلى الفجر وهو ذاكر أنه لم يوتر فهي فاسدة عند أبي حنيفةؒ خلافاً لهما وهذا بناء على أن الوتر واجب عنده ، سنة عندهما ولا ترتيب فيما بين الفرائض والسنن وعلى هذا إذا صلى العشاء ثم توضأ وصلى السنة والوتر ثم تبين أنه صلى العشاء بغير طهارة فعنده يعيد العشاء والسنة دون الوتر لأن الوتر فرض على حدة عنده وعندهما يعيد الوتر أيضاً

لكونه تبعاً للعشاء . (الهداية: ۱/۱۵۶، ط: مكتبه شركة علمية).

يفسد فساداً موقوفاً حتى لو صلى ست صلوات ولم يعد انقلب الكل جائزاً عند أبي حنيفةؒ ... (الهداية: ۱/۱۵۶. ط: مكتبه شركة علمية).

وفي الفتاوى السراجية: إذا صلى الفجر وهو ذاكر أنه لم يوتر لم يجز عند أبي حنيفةؒ إلا أن يكون في آخر الوقت . (الفتاوى السراجية، ص ۱۰۱، ط:زمزم پبلشرز).

بہشتی زیور میں ہے: اگر وتر کی نماز قضا ہوگئی اور سوائے وتر کے کوئی اور نماز اس کے ذمہ قضا نہیں ہے تو بغیر وتر کی قضا پڑھے ہوئے فجر کی نماز درست نہیں ہے، اگر وتر کا قضا ہونا یاد ہو پھر بھی پہلے قضا نہ پڑھے بلکہ فجر کی نماز پڑھ لیوے تو اب قضا پڑھ کے فجر کی نماز پھر پڑھنی پڑے گی۔ (بہشتی زیور، ص۱۵۶، مسئلہ۱۱، ط: دارالاشاعت)۔

عمدۃ الفقہ میں ہے: اسی طرح اگر فجر کی نماز پڑھی اور اس کو یاد تھا کہ وتر نہیں پڑھے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ نماز فاسد ہوجائے گی۔ (عمدۃ الفقہ :۲/۳۴۶)۔ مزید ملاحظہ ہو: (عمدۃ الفقہ :۲/۳۵۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

درود شریف کے بعد سجدۂ سہو کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص وتر میں دعائے قنوت پڑھنا بھول جائے اور درود شریف پڑھنے کے بعد سجدۂ سہو کرے تو اس کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: درود شریف پڑھنے کے بعد سجدۂ سہو کرے یا پہلے کرے دونوں صورتوں میں نماز درست ہے، البتہ مختار قول یہ ہے کہ تشہد کے بعد سجدۂ سہو کرے اور بعد میں تشہد، درود اور دعا پڑھ کر سلام پھیردے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ قاضی خان میں مرقوم ہے:

ومن عليه السهو يصلى على النبي عليه الصلاة والسلام فى القعدة الأولى في قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ وفي قول محمدؒ فى القعدة الثانية والأحوط أن يصلي فى القعدتين . (فتاوى قاضى خان : ۱/۱۲۱).

وفى الفتاوى الهندية : و يأتي بالصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم والدعاء في

قعدة السهو هو الصحيح و قيل : يأتي بهما في القعدة الأولى كذا في التبيين . (الفتاوى الهندية : ۱۲۵/۱).

درمختار میں مذکور ہے:

و يأتي بالصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم و الدعاء في القعود الأخير في المختار، وقيل فيهما احتياطاً . (الدرالمختار: ۷۹/۲، سعید).

و في الهداية : و يأتي بالصلاة على النبي عليه الصلاة والسلام والدعاء في قعدة السهو هو الصحيح لأن الدعاء موضعه آخر الصلاة . (الهداية: ۱۵۷/۱، ط: مكتبه شركة علمية).

آپ کے مسائل اوران کا حل میں مرقوم ہے:

اگر درود شریف پڑھنے کے بعد سجدۂ سہو کیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں، سجدۂ سہو کے بعد دوبارہ التحیات پڑھیں اور درود شریف اور دعا پڑھ کر نماز پوری کریں۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل:۶۳/۴)۔

قاموس الفقہ میں ہے:

قولِ صحیح کے مطابق درود ودعا دوسرے سلام سے پہلے والے قعدہ میں پڑھے گا، صاحبِ ہدایہ اور علامہ حصکفیؒ وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے، امام طحاویؒ کا خیال ہے کہ دونوں ہی قعدہ میں درود پڑھنا چاہیے۔ (قاموس الفقہ :۱۳۳/۴)۔ (وکذا فی احسن الفتاویٰ:۴۱/۴، وکتاب النوازل:۲۰۸/۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سجدۂ سہو کا طریقہ:

سوال: تحفۃ الالمعی میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سجدۂ سہو کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام دعا پڑھ لے پھر دائیں طرف سلام پھیر دے پھر دو سجدۂ سہو کرے پھر صرف تشہد پڑھ لے اور سلام پھیرے۔ کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ کتبِ احناف میں اس سے متعلق کیا مرقوم ہے؟

الجواب: یہ مسئلہ مذہبِ احناف میں ائمہ ثلاثہ کے درمیان مختلف فیہ ہے؛ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سجدۂ سہو سے پہلے سب پڑھنا چاہیے یعنی تشہد، درود ودعا سب پڑھے پھر دائیں طرف سلام

پھیرے اور دو سجدۂ سہو کرے اور دوسرے قعدہ میں تشہد پر اکتفا کافی ہے۔

اور امام محمدؒ کے نزدیک سجدۂ سہو سے پہلے تشہد پر اکتفا کرے، اور درود شریف وغیرہ سجدۂ سہو کے بعد نماز کے آخر میں پڑھے۔ امام طحاویؒ کے نزدیک سجدۂ سہو سے پہلے اور بعد دونوں میں سب پڑھنا چاہیے۔

صاحبِ ہدایہ، صاحبِ درمختار اور امام کرخیؒ وغیرہ نے امام محمدؒ کے قول کو صحیح اور مختار کہا ہے، اور اکثر اکابرینؒ نے اپنے فتاویٰ میں اسی قول کو اختیار کیا ہے اور فی زماننا اِسی پر عمل درآمد ہے البتہ مفتی رشید احمد صاحبؒ نے احسن الفتاویٰ (۴/۴۱) میں امام طحاویؒ کے قول کو بہتر فرمایا ہے۔

ملاحظہ ہو مفتی سعید احمد صاحب تحفۃ الالمعی میں لکھتے ہیں:

مذہبِ حنفیہ میں سجدۂ سہو کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں سب کچھ پڑھ لے: تشہد بھی درود بھی اور دعا بھی، اس کے بعد سلام پھرے، پھر دو سجدے کرے، پھر صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے۔ مگر جماعت کی نماز میں عارضی مصلحت سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے پھر سجدے کیے جائیں اور درود و دعا سہو کے قعدہ میں تشہد کے بعد پڑھے جائیں، اور ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ مسبوق جان لیں کہ یہ ایمرجنسی سلام ہے اور وہ کھڑے ہونے میں جلدی نہ کریں، مگر اب طریقہ یہ چل پڑا ہے کہ ہر نماز میں صرف تشہد پڑھ کر سلام پھر دیتے ہیں، بلکہ بعض کتابوں میں یہی مسئلہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ امام اعظمؒ کے قول کی صحیح صورت وہ ہے جو میں نے بیان کی، ائمہ کے اختلاف کو اور احادیث کے مطلب کو سمجھنے کے لیے مذہب کی اصل صورت سے واقف ہونا ضروری ہے۔ (تحفۃ الالمعی: ۲/۲۱۹)۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

ویأتي بالصلاة علی النبي صلی اللّٰه علیه وسلم والدعاء في قعدة السهو هو الصحیح لأن الدعاء موضعه آخر الصلاة . (الهداية: ۱/۱۵۷، ط: مكتبة شركة علمية).

عنایہ شرح ہدایہ میں مرقوم ہے:

وقوله (ویأتي بالصلاة علی النبي صلی اللّٰه علیه وسلم) اختلفوا فی الصلاة علی النبي صلی اللّٰه علیه وسلم والدعوات أنها في قعدة الصلاة أو في قعدة السهو ، فقال الطحاويؒ:

يأتي بهما فيهما، لأن كل قعدة في آخرها سلام ففيها صلاة على النبي صلى الله عليه و سلم، وقال الكرخيؒ: في قعدة السهو، واختاره فخر الإسلام والمصنف وقال: وهو الصحيح ؛ لأن الدعاء موضعه آخر الصلاة ومنهم من قال فى المسألة اختلاف بين العلماء؛ عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ فى القعدة الأولى وعند محمد فى الأخيرة بناء على أصله ، وهو أن سلام من عليه السهو يخرجه من الصلاة عندهما فكانت القعدة الأولى قعدة الختم ، وعند محمد على خلافه وفيه نظر؛ لأن الأصل المذكور متقرر، فلو كانت هذه المسألة مبنية على ذلك لكان الصحيح مذهبهما . (العناية شرح الهداية بهامش فتح القدير: ۱/ ۵۰۱،دارالفكر).

وفي فتح القدير: قوله هو الصحيح احتراز عما قال الطحاويؒ فى القعدتين لأن كلاً منهما آخر، وقيل: قبل السجود عندهما وعند محمد بعده لأن سلام من عليه السهو يخرجه عندهما خلافاً له، وقول الطحاويؒ أحوط كذا فى فتاوى قاضى خان . (فتح القدير: ۱/ ۵۰۱،ط:دارالفكر).

قال فى البدائع: وإذا عرف أن محله المسنون بعد السلام فإذا فرغ من التشهد الثاني يسلم ثم يكبر ويعود إلى سجود السهو ، ثم يرفع رأسه مكبراً ، ثم يتشهد ويصلى على النبى صلى الله عليه وسلم ويأتي بالدعوات ، وهو اختيار الكرخىؒ واختيار عامة مشايخنا بماوراء النهر، وذكر الطحاويؒ أنه يأتي بالدعاء قبل السلام وبعده وهو اختيار بعض مشايخنا، والأول أصح ؛لأن الدعاء إنما شرع بعد الفراغ من الأفعال والأذكار والموضوعة فى الصلاة ، و من عليه السهو قد بقي عليه بعد التشهد الأول من الأفعال و الأذكار و هو سجود السهو . (بدائع الصنائع: ۱/ ۱۷۳،ط:سعيد).

(وكذا فى المحيط البرهانى: ۲/ ۵۴، ۵۵،ط:مكتبه رشيديه، والدرالمختار: ۲/ ۷۹،سعيد، والنهر الفائق: ۱/ ۳۲۲، ط:قديمى، والفتاوى الهندية: ۱/ ۱۲۵).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

درود اور دعا سجدۂ سہو کے بعد کے قعدہ میں پڑھے یہی صحیح اور مختار ہے اور بعض کے نزدیک سجدۂ سہو کرنے

سے پہلے کے قعدہ میں پڑھ لے بعد کے قعدہ میں نہ پڑھے اور بعض کے نزدیک زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ سجدہ سہو سے پہلے اور بعد دونوں قعدوں میں التحیات کے ساتھ درود و دعا پڑھ لے اس لیے پہلی جگہ بھی پڑھ لینا ہی بہتر ہے لیکن نہ پڑھنے میں بھی نقصان نہیں۔(عمدۃ الفقہ :۲/۳۶۱)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ:۷/۴۳۶، جامعہ فاروقیہ، وفتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۴/۳۹۸، ط: دارالاشاعت، واحسن الفتاویٰ:۴/۴۱)۔واللہ ﷻ اعلم۔

نفل کی چار رکعات کے قعدۂ اولیٰ میں درود و دعا پڑھنے کا حکم:

سوال: نفل کی چار رکعات کے قعدۂ اولیٰ میں درود شریف اور دعا پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص پڑھے گا تو نماز کا کیا حکم ہوگا؟ نیز سنتِ مؤکدہ وغیر مؤکدہ میں اس طرح کرنے سے کچھ فرق ہوگا یا نہیں؟

الجواب: مذہبِ احناف میں بعض متأخرین فقہاء سے یہ مروی ہے کہ سنتِ غیر مؤکدہ اور نفل کی چار رکعات کے قعدۂ اولیٰ میں درود شریف اور دعا پڑھنا درست ہے اس سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آئے گی، کیونکہ نفل کی ہر دو رکعت مستقل نماز کے حکم میں ہے، البتہ متقدمین فقہاء سے یہ بات مروی نہیں ہے، بنابریں اس طرح نہیں کرنا چاہیے، عام طریقہ کے مطابق نماز پڑھنی چاہیے یعنی چار رکعات والی سنتِ غیر مؤکدہ و نفل نماز کے قعدۂ اولیٰ میں فقط تشہد پر اکتفا کر لینا بہتر ہے۔

ہاں سنتِ مؤکدہ میں پڑھنا درست نہیں، اگر کوئی شخص سنتِ مؤکدہ کی چار رکعات کے قعدۂ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود شریف اور دعا پڑھے گا تو اصح قول کے موافق سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

ملاحظہ ہو الدر المختار میں مرقوم ہے:

ولا يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم فى القعدة الأولى فى الأربع قبل الظهر والجمعة وبعدها ولو صلى ناسياً فعليه السهو وقيل لا، شمنى ، ويستفتح إذا قام إلى الثالثة منها أشبهت الفريضة وفى البواقي من ذوات الأربع يصلي على النبي صلى الله عليه وسلم و يستفتح ويتعوذ ولو نذراً لأن كل شفع صلاة وقيل لا يأتي فى الكل وصححه فى القنية .

(الدر المختار: ۲/ ۱٦، سعيد). (وكذا في البحر الرائق: ۱/ ۳٤٦، ط: بيروت).

قال في رد المحتار: الأصح أنه لا يصلي ولا يستفتح في سنة الظهر والجمعة وكون كل شفع صلاة على حدة ليس مطرداً في كل الأحكام ... لوقوعه في وسط الصلاة لأن الأصل كون الكل صلاة واحدة للاتصال واتحاد التحريمة ومسألة الاستفتاح ونحوه ليست مروية عن المتقدمين وانمااختيار بعض المتأخرين. (ردالمحتار: ۲/ ۱٦، سعيد).

(وكذا في مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، ص ۳۹۲، ط: قديمي، وامدادالفتاح، ص ۴۳۱).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

چار رکعتی سنتِ مؤکدہ یعنی ظہر اور جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد کی چار رکعتیں پڑھے تو ان کے پہلے قعدہ میں درود شریف نہ پڑھے صرف التحیات پڑھ کر کھڑا ہو جائے اور اگر بھول کر درود شریف پڑھ لیا تو سجدۂ سہو کرے ... ان کے علاوہ جب چار رکعات والی سنتِ غیر مؤکدہ یا نفل نماز پڑھے تو اختیار ہے خواہ پہلے قعدہ میں درود شریف ودعا بھی پڑھے اور تیسری رکعت میں سبحانک اللہ اور اعوذ باللہ بھی پڑھے کیونکہ نوافل کا ہر دوگانہ جدا نماز ہے اور خواہ فرضوں کی طرح صرف التحیات پڑھ کر کھڑا ہو جائے اور تیسری رکعت میں ثنا اور اعوذ بھی نہ پڑھے اور صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر الحمد شریف شروع کر دے اور آخری قعدہ میں درود ودعا پڑھ کر سلام پھیر دے، صحیح تر قول میں یہی دوسری صورت افضل ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/ ۳۱۰، سنن ونوافل کے مخصوص مسائل)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مسبوق کا امام کے ساتھ قعدۂ اخیرہ میں درود پڑھنے کا حکم:

سوال: مسبوق قعدۂ اخیرہ میں تشہد پر اکتفا کرے گا اور خاموش رہے گا یا اگر درود شریف پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ تشہد پر اکتفا کر کے خاموش رہے گا۔ بینوا توجروا۔

الجواب: مشہور قول یہ ہے کہ مسبوق تشہد پر اکتفا کریگا، کیونکہ درود اور دعا قعدۂ اخیرہ کے لیے ہیں اور یہ قعدہ مسبوق کے حق میں قعدۂ اخیرہ نہیں ہے، پھر مسبوق کو چاہیے کہ تشہد آہستہ آہستہ پڑھے تاکہ امام درود مع دعا سے فارغ ہو جائے، اور اگر مسبوق پہلے فارغ ہوتا ہے تو شہادتین "أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن

محمداً عبده ورسوله " کو بار بار دہراتا رہے۔ یا یہ کہ خاموش بیٹھا رہے۔

لیکن اس بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ مسبوق امام کی اتباع میں درود و دعا پڑھ سکتا ہے۔

قال في الدرالمختار: و لو فرغ المؤتم قبل إمامه سكت اتفاقاً وأما المسبوق فيترسل ليفرغ عند سلام إمامه وقيل: يتم وقد يكرر كلمة الشهادة . وقال في ردالمحتار: قوله فيترسل، أى يتمهل وهذا ما صححه فى الخانية وشرح المنية في بحث المسبوق من باب السهو و باقى الأقوال مصحح أيضاً قال فى البحر: وينبغى الإفتاء بما فى الخانية كما لايخفى ولعل وجهه كما فى النهر انه يقضي آخر صلاته في حق التشهد ويأتي فيه بالصلاة والدعاء وهذا ليس آخراً ، قال ح: وهذا في قعدة الإمام الأخيرة كما هو مصرح قوله ليفرغ عند سلام إمامه وأما فيما قبلها من القعدات فحكمه السكوت كما لايخفى، و مثله فى الحلية [الحلبة]، قوله وقيل يكرر كلمة الشهادة كذا في شرح المنية ، قوله وقيل يكرر كلمة الشهادة كذا في شرح المنية و الذى فى البحر و الحلية [الحلبة] و الذخيرة يكرر التشهد . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۱/۱۱ ۵،سعید).

قال فى البحرالرائق: وأما فى الصلاة والدعاء فاختلفوا على أربعة أقوال ؛ اختار ابن شجاع تكرار التشهد وأبوبكرالرازى السكوت ، وصحح قاضي خان في فتاواه أنه يترسل فى التشهد حتى يفرغ منه عند سلام الإمام ، وصحح صاحب المبسوط أنه يأتي بالصلاة والدعاء متابعة للإمام ؛ لأن المصلي لا يشتغل بالدعاء في خلال الصلاة لما فيه من تأخير الأركان وهذا المعنى لا يوجد هنا، لأنه لا يمكنه أن يقوم قبل سلام الإمام وينبغى الإفتاء بما فى الفتاوى كما لا يخفى . (البحرالرائق: ۱/۳۲۹، الماجدیه ، کوئٹه).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

سوال: مسبوق جس کو امام کے ساتھ کل یا بعض رکعات شروع میں نہ ملی ہوں، امام کے ساتھ قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھ کر کیا کرے خاموش رہے یا کچھ اور حکم ہے؟

جواب: اس کے بارے میں چار قول ہیں، اور چاروں مختار ہیں:

(۱) تشہد میں ترسیل اختیار کرے، یعنی تشہد اتنا ٹھہر ٹھہر کر پڑھے کہ امام کے سلام تک فارغ ہو، قاضی خان نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۲) تشہد سے فارغ ہو کر کلمہ شہادت: اشہدان لا الہ الا اللہ کا تکرار کرے، یہ محمد بن شجاع کا قول ہے۔

(۳) تشہد کے بعد سکوت اختیار کرے یہ قول ابوبکر رازی کا ہے۔

(۴) بعد تشہد درود و دعا میں مشغول ہو جائے مثل مدرک کے یہ قول صاحب مبسوط کا ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۳۰/ ۴۳۵، ضمیمہ مسائل نماز، ط: مکتبہ محمودیہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسبوق تشہد کے بعد درود و دعا بھی پڑھ سکتا ہے، یہ قول علامہ سرخسیؒ کا ہے اور فقہاء میں ان کا درجہ بہت عالی ہے نیز امام کی تابعداری کا تقاضا بھی یہی ہے پھر درود و دعا مسلمان کے لیے ایک محبوب عمل ہے اس لیے اس قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

خطیب کا قال اللّٰہ تعالیٰ بعد أعوذ باللّٰہ کہنے کا حکم:

سوال: اکثر خطباء اپنے خطبوں اور بیانات وغیرہ میں اس طرح آیت پڑھتے ہیں: **قال اللّٰہ تعالیٰ بعد أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم إنما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء**، حالانکہ **إنما یخشی اللّٰہ** سے پہلے **أعوذ باللّٰہ** نہیں ہے، اور اگر یوں کہدے: **قال اللّٰہ تعالیٰ بعد ما أقرأ أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم**، تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: افضل اور بہتر یہ ہے کہ **قال اللّٰہ تعالیٰ** نہ کہے، سلفِ صالحین اور متقدمین کے کلام میں کہیں منقول نہیں ہے، ہاں سلف کے کلام میں **قال اللّٰہ تعالیٰ**، یا **قولہ تعالیٰ** ملتا ہے لیکن **أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم** کا اضافہ نہیں ہے، نیز اگر یہ کہے: **قال اللّٰہ تعالیٰ بعد ما أقرأ** تو یہ بھی خلافِ اولیٰ ہے ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو: الحاوی للفتاوی میں علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:

فأقول: الذي ظهر لي من حيث النقل والاستدلال أن الصواب أن يقول: قال الله

تعالیٰ، و یذکر الآیة و لا یذکر الاستعاذة ، فهذا هو الثابت فی الأحادیث والآثار من فعل النبي صلی اللّٰه علیه وسلم ، والصحابة والتابعین فمن بعدهم ، أخرج أحمد والبخاری ومسلم والنسائي عن أنسؓ قال: قال أبو طلحةؓ: یا رسول اللّٰه ! إن اللّٰه یقول: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ، [ثم ذکر روایات أخری حول هذه الآیة ، وأحادیث ، ثم قال:] والأحادیث والآثار في ذلک أکثر من أن تحصر ، فالصواب علی إیراد الآیة من غیر استعاذة اتباعاً للوارد في ذلک، فإن الباب باب اتباع ، والاستعاذة المأمورة بها في قوله تعالیٰ: فإذا قرأت القرآن فاستعذ ، إنما هي عند قراء ة القرآن للتلاوة ، أما إیراد آیة منه للاحتجاج والاستدلال علی حکم فلا . (الحاوی للفتاوی ،رسالة:القذاذة فی تحقیق محل الاستعاذة : ۱/۳۵۲ ، ۳۵۳، ط:فاروقی کتب خانه). (وکذا فی شرح سنن ابی داود للشیخ عبد المحسن : ۳۶۵/۶).

فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

مطلب في قول الخطیب: قال اللّٰه تعالیٰ أعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم ، تنبیه : جرت العادة إذا قرأ الخطیب الآیة أنه یقول : قال اللّٰه تعالیٰ بعد أعوذ باللّٰه من الشیطان الرجیم ﴿ من عمل صالحاً ﴾ وفیه إیهام أن أعوذ باللّٰه من مقول اللّٰه تعالیٰ و بعضهم یتباعد عن ذلک فیقول قال اللّٰه تعالیٰ کلاماً أتلوه بعد قولي أعوذ باللّٰه الخ، ولکن فی حصول سنة الاستعاذة بذلک نظر لأن المطلوب إنشاء الاستعاذة ولم تبق کذلک بل صارت محکیة مقصوداً بها لفظها وذلک ینافی الإنشاء کما لا یخفی فالأولی أن لا یقول: قال اللّٰه تعالیٰ .

(فتاوی الشامی: ۱۴۸/۲ ،سعید). واللہ ﷻ اعلم۔

رکعتین قبل المغرب کے بارے میں روایت کی تحقیق:

سوال: مشہور یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکعتین قبل المغرب نہیں پڑھی، لیکن بعض علماء صحیح ابن حبانؒ اور محمد بن نصر مروزیؒ کے حوالے سے ایک روایت نقل کرتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: روایت درجِ ذیل ملاحظہ فرمائیں؛ صحیح ابن حبان میں ہے:

عن عبد اللّٰہ بن بريدة؛ إن عبد اللّٰہ المزني حدثه أن رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم صلى قبل المغرب ركعتين ثم قال:"صلوا قبل المغرب ركعتين" ثم قال عند الثالثة:" لمن شاء " خاف أن يحسبها الناس سنة . قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: إسناده صحيح على شرط مسلم. (صحيح ابن حبان : ۴/۴۵۷/۱۵۸۸،ط: الرسالة).

مختصر قیام اللیل میں محمد بن نصر مروزی روایت کرتے ہیں:

حدثني عبد الوارث بن عبد الصمد بن عبد الوارث بن سعيد، ثنا حسين، عن ابن بريدة ، أن عبد اللّٰہ المزني حدثه أن رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم صلى قبل المغرب ركعتين . (مختصر قيام الليل : ۱/۵۲).

قال في عون المعبود بعد أن أورده: قال العلامة أحمد بن على المقريزي في مختصره: هذا إسناد صحيح على شرط مسلم فإن عبد الوارث بن عبد الصمد احتج به مسلم والباقون احتج بهم الجماعة ، وقد صح في ابن حبان حديث آخر... (عون المعبود: ۲۳۸/۲۵).

انوار المحمود علی سنن ابی داود میں مرقوم ہے:

وما زاد ابن حبان على ما فى الصحيحين من أن النبي صلى اللّٰہ عليه وسلم صلاهما لايعارض ما أرسله النخعي من أنه صلى اللّٰہ عليه وسلم لم يصلهما لجواز كون ما صلاه قضاء عن شيء فاته وهو الثابت روى الطبراني في مسند الشاميين عن جابر رضي اللّٰہ عنه قال: سألنا نساء رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم هل رأيتن رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم يصلى الركعتين قبل المغرب الحديث فأجاب نساءه اللاتي يعلمن من علمه ما لايعلمه غيرهن بالنفي عنه وأجاب ابن عمر رضي اللّٰہ عنه بنفيه عن الصحابة أيضاً. (انوارالمحمود على سنن ابى داود: ۱/۴۱۶،ط:ادارة القرآن). (وكذا فى بذل المجهود :۵۰۲/۵).

وفي مسند الشاميين عن جابر رضي الله عنه قال: طفنا في نساء رسول الله صلى الله عليه وسلم فسألناهن هل رأيتن رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي هاتين ركعتين قبل المغرب حين يؤذن المؤذن فقلن لا غير أم سلمة قالت: صلاها عندي حين أذن بلال للمغرب فقلت يا نبي الله ما هذه الصلاة هل حدث شيء قال : لا ، و لكن كنت أصليهما ركعتين قبل العصر فنسيتهما فصليتهما الآن . (مسند الشاميين للطبراني:۳/۲۱۲/۲۱۱۰،ط:الرسالة).

خیر الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ہمنے ازواجِ مطہرات سے نماز مغرب سے قبل دو رکعتوں کے متعلق خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کیا تو سب ازواجِ مطہرات نے بیک زبان ہوکر کہا کہ آپ کا یہ معمول نہ تھا، صرف حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ میرے ہاں صرف ایک مرتبہ ادا کی تھی حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا یا رسول اللہ یہ کیا نماز ہے؟ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ عصر کے قبل دو رکعتیں پڑھنا بھول گیا تھا وہ اب پڑھی ہے... اس سے معلوم ہوا کہ آپ بھی رکعتیں قبل المغرب نہیں پڑھتے تھے۔ (خیر الفتاویٰ:۲/۴۹۲،ط:امدادیہ)۔

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہوا کہ یہ رکعتیں قبل العصر کی رہ گئی تھیں وہ پڑھی ورنہ آپ کا معمول نہیں تھا، اور اگر بالفرض رکعتیں قبل المغرب نفل کی نیت سے پڑھی ہوں تو ممکن ہے کہ احیاناً اباحت کے لیے ایسا فرمایا ہو، بنابریں اگر مغرب کی نماز میں کچھ تاخیر ہو تو اس کا پڑھنا محقق ابن ہمام کے نزدیک مباح ہے۔

قال العلامة ظفر أحمد العثماني في إعلاء السنن : فحملناها على الأقل المتيقن وهو الإباحة فارتفع التعارض بأن المباح لا يلام على تركه فمن شاء فعل ومن شاء ترك . (اعلاء السنن: ۲/۶۹،ط:ادارة القرآن).

فتح القدیر میں مرقوم ہے:

ثم الثابت بعد هذا هو نفي المندوبية ، أما ثبوت الكراهة فلا... فقد قدمنا من القنية استثناء القليل والركعتان لا تزيد على القليل . (فتح القدير: ۱/۴۴۶،دارالفكر).

کتاب الفتاویٰ میں مذکور ہے:

حنفیہ اور مالکیہ کے نزدیک اس وقت نماز پڑھنا مستحب نہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس نماز کا پڑھنا مکروہ ہے، بلکہ مباح اور جائز ہے، جب مغرب کی نماز میں تاخیر ہوتی ہی ہو تو پڑھ لینا بہتر ہے... علامہ ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ دو رکعت کے بقدر تاخیر میں کوئی کراہت نہیں، اس لیے ان دو رکعتوں کا پڑھ لینا جائز ہے۔

(کتاب الفتاویٰ: ۲/۳۵۲)۔ مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا، جلدِ دوم ص ۴۵۸، ط: بمبئی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

منحرف مسجد کے قبلہ کو درست کرنے کا حکم:

سوال: ایک مصلےٰ کے قبلہ کا رخ تقریباً ۴۵ درجہ منحرف ہے، اور علماء کا کہنا ہے کہ ۴۵ درجہ تک انحراف ہو تو نماز ہو جاتی ہے، اور اس سے زیادہ مفسد ہے، لیکن قبلہ میں انحراف ہے، تو کیا اس کو ٹھیک کرنا چاہیے یا چھوڑ دینا چاہیے، جبکہ چھوڑنے میں غلطی کو قائم دائم رکھنا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: افضل اور بہتر یہ ہے کہ مسجد، مصلےٰ کے قبلہ کا رخ بالکل صحیح اور درست ہو اور بالکل انحراف نہ ہو تاکہ نماز بالکل صحیح سمتِ قبلہ کی طرف ادا ہو، بنابریں درست کر لینا زیادہ اچھا ہے۔

علامہ شامیؒ نے البحر الرائق کے حاشیہ میں سمتِ قبلہ کے بارے میں ایک وسعت والا قول لکھا ہے اور دوسرا محتاط قول ذکر کرنے کے بعد اول کو جائز اور ثانی کو مستحب قرار دیا ہے یعنی محتاط قول پر عمل مستحب ہے اور بحوالہ مجموع النوازل اس کو مختار فرمایا ہے۔ منحۃ الخالق کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

في منية المصلي عن أمالي الفتاوی حد القبلة في بلادنا يعني سمرقند ما بين المغربين مغرب الشتاء ومغرب الصيف فإن صلی إلی جهة خرجت من المغربين فسدت صلاته، قال شارحها ابن أمير حاج: وذكر هذه العبارة في الملتقط مع زيادة وهي: وقال أبومنصور: ينظر إلی أقصر يوم في الشتاء وإلی أطول يوم في الصيف فيعرف مغربيهما ثم يترك الثلثين عن يمينه والثلث عن يساره ويصلي فيما بين ذلک وهذا استحباب والأول للجواز، ومشی علی الأول الرستغفني وجعل في مجموع النوازل ما ذكره أبومنصور هو المختار. (منحة

الخالق حاشية البحر الرائق: ۱/ ۲۸۵، ط: کوئٹه).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مرقوم ہے:

علمائے امت وفقہائے ملت نے قاطبۃً بلا اختلاف تصریح فرمائی ہے کہ سمتِ قبلہ کا مدار آلاتِ رصدیہ و حساباتِ ریاضیہ پر نہیں، بلکہ اس میں مساجدِ قدیمہ کا اتباع وتوافق کافی ہے، جس کی بنا امارات وعلاماتِ عرفیہ پر ہے اگر چہ قواعدِ ہیئت کی رو سے ان میں سمتِ حقیقی سے کچھ انحراف بھی ہو، جس میں اصل قاعدہ سے ربع دائرہ (۹۰ درجہ) کے قریب تک یعنی دونوں جانب ثمن ثمن دائرہ (۴۵-۴۵ درجہ) تک اور بنا بر احتیاط مابین المغربین یعنی ہر طرف ۲۴ درجہ مجموعی ۴۸ درجہ تک گنجائش ہے۔ لما في حاشية البحر للشامي بعد نقل القولين: وهذا استحباب والأول للجواز. (۱/ ۲۸۵)،

اس بنا پر دونوں انحراف مذکور فی السوال کے ہوتے ہوئے بھی نماز صحیح ہوجائے گی لیکن اولیٰ یہ ہے کہ دوسری مساجدِ قدیمہ خواہ اس بستی میں ہوں یا قرب وجوار میں ہوں ان کے موافق اس مسجد کو درست کرلیا جاوے، کتبه: أشرف علي عفی عنه. (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، امداد المفتین: ۲/ ۳۶۲، ط: دارالاشاعت)۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

اگر بیس ڈگری محراب قبلہ سے منحرف ہے پھر بہتر تو یہ ہے کہ محراب درست کرلی جائے تاکہ نمازی بلا انحراف صحیح سمتِ قبلہ کا استقبال کریں، جب تک محراب درست نہ ہو تو بیس ڈگری تک انحراف کی گنجائش ہے، جو نمازیں پڑھی جاچکی ہیں وہ صحیح ہوگئیں۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل: ۳/ ۳۴۳، مکتبہ لدھیانوی)۔

جواہر الفقہ میں ہے: جو مسجدیں سمتِ قبلہ کے مطابق ہیں، خواہ وہ نئی ہوں یا پرانی ان کی نمازوں کے سمتِ قبلہ کے موافق ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، اور جن مسجدوں کے قبلے صحیح سمت نہیں ہیں اگر وہ پینتالیس درجہ کے اندر تک ہیں جب بھی نماز صحیح ہوجائے گی، لیکن قاعدہ کے مطابق ان کی سمتِ قبلہ صحیح کرلینا ضروری ہے، لیکن اگر ان کی موجودہ حالت میں بھی ان میں نمازیں پڑھی جائیں، جب بھی ہوجائے گی۔ (جواہر الفقہ: ۲/ ۴۲۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

صف کی ایک جانب میں راستہ چھوڑنے کا حکم:

سوال: نماز کے فوراً بعد لوگوں کے نکلنے کے لیے آسانی کی خاطر ہماری مسجد میں صف کی ایک جانب

میں راستہ چھوڑ دیا جاتا ہے ،یعنی صف دیوارتک مکمل نہیں ہوتی ،اس کی وجہ سے کوئی گناہ ہوگا، یانہیں؟ یا کوئی کراہت پیدا ہوگی یانہیں؟ شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسجد میں صف کی ترتیب ایک دیوار سے دوسری دیوار تک ہوتی ہے لیکن کسی عذر کی وجہ سے صف مصنوعی راستہ تک روک دی جائے تو بھی بلا کراہت درست ہے، جیسے مسجد میں منبر، تپائیاں اور ستون وغیرہ کی وجہ سے جگہ چھوڑ دی جاتی ہے۔اور یہ جگہ نماز سے مستثنیٰ ہوتی ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

لأنه صف في حق كل فريق وإن لم يكن طويلاً وتخلل الأسطوانة بين الصف كتخلل متاع موضوع أو كفرجة بين رجلين وذلك لا يمنع صحة الإقتداء ولا يوجب الكراهة . (المبسوط: ۶۲/۲،ط: بیروت ، لبنان).

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: **يكون الصف ما يلي الإمام في داخلها وما اتصل به من طرفيها خارجاً عنها من أول الجدار إلى آخره فلا ينقطع الصف ببنائها** (المقصورة) **كما لاينقطع بالمنبر الذي هو داخلها فيما يظهر و صرح به الشافعية .** (فتاوی الشامی: ۵۶۹/۱، سعید).

امداد المفتین میں مذکور ہے: **في رد المحتار: فلا ينقطع الصف ببنائها** (المقصورة) **كما لاينقطع بالمنبر الذي هو داخلها فيما يظهر حرج صرح به الشامية ،** (شامی : ۵۳۲/۱)، **وفي الدر المختار بعد ذلك ولو صلى على رفوف المسجد إن وجد في صحنه مكاناً كره كقيامه في صف خلف صف .** (الدرالمختار: ۱ :۵۳۳) عبارت نمبر ا سے معلوم ہوا کہ منبر کے دائیں بائیں صف بنائی جاوے تو منبر کی وجہ سے صف کو منقطع نہ قرار دیا جاوے گا اور کوئی کراہت نہ ہوگی اور عبارت نمبر ۲ سے معلوم ہوا کہ ضرورت اور تنگی سے انقطاعِ صف کی رعایت بھی ساقط ہو جاتی ہے کراہت نہیں رہتی۔(امداد المفتین :۲/ ۲۹۲،ط: دارالاشاعت)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

اگر منبر صف کے درمیان آجائے کہ کچھ مقتدی صف کی ایک جانب ہوں اور کچھ دوسری جانب ہوں تو اس

کی وجہ سے صف میں خلل نہیں آتا، صف درست ہوجائے گی، مبسوط سرخسی میں ایسا ہی مذکور ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۶/ ۵۳۰، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

صفوف کی درستگی سے متعلق چند مسائل:

سوال: (۱) کیا نماز باجماعت میں صفوف کی درستگی کا حکم دینا امام کی ذمہ داری ہے؟

(۲) اگر مصلیوں کی بڑی تعداد ہے تو کیا امام یہ کام اپنے نائبین سے لے سکتا ہے کہ وہ صف بندی کریں اور امام کو مطلع کردیں؟

(۳) آج کل صفوف کی درستگی میں بڑی کوتاہی ہے تو کیا اس کو دور کرنے کے لیے امام اقامت سے پہلے صفوف درست کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟ ہمارے فقہاء اور علمائے دیوبند کی تحقیقات کی روشنی میں تسویۂ صفوف کا حکم کیا ہے؟

(۴) کیا ہماری فقہ کی کتابوں میں تسویۃ الصفوف کا ذکر ہے یا نہیں؟ کیا امام بخاریؒ کے ذکر کردہ باب ”**باب تسوية الصفوف عند الإقامة وبعدها**“ میں **بعدها** کے مقابلہ میں **عند الإقامة** سے **قبلها** لینے کی گنجائش ہوسکتی ہے یا نہیں؟ **بینوا توجروا**۔

الجواب: (۱) مقتدی حضرات کو خود صفوف درست کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے، البتہ مقتدی حضرات اہتمام نہ کرتے ہوں تو امام کے لیے بہتر یہ ہے کہ صف درست کرنے کا حکم دے، صحیح ابن حبان میں باب قائم کیا ہے کہ امام کے لیے مستحب یہ ہے کہ مقتدیوں کو صف درست کرنے کا حکم کرے، **ذكر الاستحباب للإمام أن يأمر المأمومين بتسوية الصفوف واعتدالها عند قيامه إلى الصلاة** . (صحيح ابن حبان:۴/۳۰۰، الاثرية).

قال في البحر الرائق: وينبغي للقوم إذا قاموا إلى الصلاة أن يتراصوا ويسدوا الخلل ويسووا بين مناكبهم في الصفوف ولا بأس أن يأمرهم الإمام بذلك .
(البحر الرائق: ۱/۳۵۳، ط: كوئٹه).

(وكذا في الفتاوى الهندية: ۱/۸۹، وتبيين الحقائق: ۱/۱۳۶، امداديه، ملتان).

وقال فی الدر المختار: ویصف أی یصفهم الإمام بأن یأمرهم بذلک قال الشمني: و ینبغي أن یأمرهم بأن یتراصوا ویسدوا الخلل ویسووا مناکبهم ویقف وسطاً. (الدرالمختار: ۱/ ۵۶۸، سعید).

(۲) اگر مصلیوں کی تعداد زیادہ ہو، تو امام چند آدمیوں کو صفوف درست کرنے کی خاطر مقرر کرسکتا ہے، جب وہ صفوف درست کرلیں تو امام کو مطلع کردیں، جیسا کہ حضرت عمر وعثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے تھے۔

وفي شرح صحیح البخاری لابن بطال: تسویة الصفوف من سنة الصلاة عند العلماء وأنه ینبغي للإمام تعاهد ذلک من الناس، وینبغي للناس تعاهد ذلک من أنفسهم، وقد کان لعمرؓ وعثمانؓ رجال یوکلونهم بتسویة الصفوف، فإذا استوت کبرا. (شرح صحیح البخاری لابن بطال: ۲/ ۳۴۴، ط: الریاض). (وکذا فی شرح ابی داود للعینی: ۳/ ۲۱۲، ط: مکتبة الرشد).

مؤطا امام مالک میں روایت ہے: مالک عن نافع أن عمر بن الخطاب ﷺ کان یأمر بتسویة الصفوف فإذا جاء وہ فأخبروہ أن قد استوت کبر. (المؤطا للإمام مالک: ۲/ ۲۱۹/ ۵۴۲).

(۳) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے لامع الدراری میں تحریر فرمایا ہے کہ صفوں کو اقامت کے دوران یا اس کے بعد تکبیر سے پہلے ٹھیک کرنے کو خاص ومقید نہ کیا جائے کیونکہ سووا صفوفکم (صحیح البخاری، رقم: ۷۲۳)، کے عموم سے پتا چلتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کی جاسکتی ہے، مزید یہ کہ ’’إني أراکم خلف ظهری‘‘ (صحیح البخاری، رقم: ۷۲۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہی امام کی نظر مقتدیوں پر پڑے صفوں کو ٹھیک کرلیا جائے۔

قال الشیخ في لامع الدراري: باب تسویة الصفوف عند الإقامة وبعدها والحجة علیها عموم قوله: سووا صفوفکم وإطلاقه فلا یتقید ولا یختص بوقت وأیضاً فإن قوله إني أراکم خلف ظهري یقتضی الاهتمام بتسویة الصفوف إذا وقعت ناظرة الإمام علیهم. (لامع الدراری: ۱/ ۲۷۸، ط: سعید، و سراج القاری: ۳/ ۴۳۳).

وزاد الشیخ زکریا وقال: وجعل الحافظ (فتح الباری: ۲/ ۲۰۷) الترجمة من الأصل الحادی عشر إذ قال: لیس فی حدیثي الباب دلالة علی تقیید التسویة بما ذکر لکن أشار بذلک إلی ما في بعض الطرق کعادته ففي حدیث النعمان عند مسلم أنه صلی اللّٰه علیه

وسلم قال: ذلک عند ما كاد أن يكبر وفي حديث أنس ﷺ في الباب الذي بعد هذا أقيمت الصلاة فأقبل علينا ، فقال... (حاشية اللامع : ۱/۲۷۸،ط: سعيد، و الأبواب والتراجم،ص ۹۰،ط:سعيد).

تسویۃ الصفوف کو ہمارے دیوبندی علماء میں سے حضرت مولانا ظفراحمد عثمانی ؒ اور حضرت شیخ ؒ نے سنت لکھا ہے لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے وجوب کا قول تحریر فرمایا ہے، اور مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے، اور ہمارے دیگر اکابرؒ کے فتاویٰ میں بھی تسویۃ الصفوف کی تاکید مذکور ہے، حوالہ جات نمبر ۴ کے تحت ملاحظہ کیجیے۔

(۴) مذہبِ احناف کی کتبِ فقہ میں بھی تسویۃ الصفوف کے بارے میں تاکید منقول ہے:

ملاحظہ ہو حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں منقول ہے:

فيأمرهم الإمام بذلک، تفريع على حديث الدال على طلب الموالاة واسم الإشارة راجع إليها ويأمرهم أيضاً بأن يتراصوا ويسدوا الخلل ويستووا مناكبهم وصدورهم كما في الدر عن الشمني وفي الفتح: ومن سنن الصف التراص فيه والمقاربة بين الصف والصف والاستواء فيه . (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، ص ۳۰۶،ط:قديمى).

عمدۃ القاری میں ہے:

الأمر بتسوية الصفوف ، وهي من سنة الصلاة عند أبي حنيفةؒ والشافعيؒ ومالکؒ ... ولكنها ليست من واجبات الصلاة بحيث أنه إذا تركها فسدت صلاته أو نقصتها، غاية ما في الباب إذا تركها يأثم . (عمدة القارى : ۴/۳۵۴،ط: دار الحديث ، ملتان).

الأبواب والتراجم میں ہے: **ثم تسوية الصفوف من سنة الصلاة وليس بشرط عند الائمة الثلاثة وقال أحمد من صلى خلف الصف وحده بطلت صلاته.** (الابواب والتراجم، ص ۹۰)

إعلاء السنن میں مذکور ہے:

باب سنية تسوية الصف ورصها...قلت: دلالته على الجزء الأول من الباب ظاهرة والحديث وإن وقع فيه لفظ الأمر و أصله الوجوب ولكنه محمول على الندب لما جاء في

الباب أحاديث ...الخ. (اعلاء السنن: ۴/۳۵۳،ط: ادارة القرآن).

فیض الباری میں ہے: **وكان في زمن عمر رضي الله تعالىٰ عنه رجل موكل على التسوية كان يمشي بين الصفوف ويسويهم وهو واجب عندنا تكره الصلاة بتركه تحريماً وسنة عند الشافعية لانتفاء مرتبة الواجب عندهم وذهب ابن حزم إلى أنه فرض.** (فيض الباري: ۲/۲۳۴،ط:حجازی، القاهرة، وتحفة الالمعی: ۲/۵۸۰).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

احادیث میں صفوف کے ہموار کرنے کا حکم وارد ہوا ہے یعنی قیام کی جگہ ایک ہو، ایسا نہ ہو کہ کوئی بلندی پر کھڑا ہو، کوئی پستی پر اور اقدام برابر ہوں، یعنی ایسا نہ ہو کہ کوئی آگے کھڑا ہو کوئی پیچھے اور اتصال ہو، یعنی ایسا نہ ہو کہ دو شخصوں کے درمیان ایک آدمی کی جگہ خالی رہے اور پہلی صف پوری ہونے پر دوسری صف شروع کی جائے، یعنی ایسا نہ ہو کہ پہلی صف میں جگہ باقی ہو اور دوسری صف شروع کی جائے تسویۃ الصفوف ان چاروں امور کو مشتمل ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ٦/۴۸۰، جامعہ فاروقیہ)۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مذکور ہے:

اگر نمازی آگے پیچھے ہوں یا صف میں جگہ خالی ہو تو امام کو ہدایت کرنی چاہیے۔ (ج:۳/۴۵۷)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ حقانیہ: ۳/۱۲۲، وفتاویٰ فریدیہ: ۲/۳۰۱)۔

امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب "**باب تسوية الصفوف عند الإقامة وبعدها**، میں **عند الإقامة** سے **قبل الإقامة** کا معنی غالباً کسی شارح نے ذکر نہیں کیا، ہاں حضرت گنگوہیؒ نے اسطرح تشریح فرمائی ہے کہ کسی قید یا کسی مخصوص حالت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اپنے عموم پر ہے۔ **قال: فلا يتقيد بقيد ولا يختص بوقت.** (لامع الدراری: ۱/۲۷۸،ط:سعید). واللہ ﷻ اعلم۔

سگریٹ نوشی کرنے والے کی امامت کا حکم:

سوال: ایک عالم کو سگریٹ نوشی کی عادت ہے، کیا ایسا عالم امامت کرنے کا حقدار ہے؟ کیا اس کے

پیچھے نماز ہوجائے گی؟ نیز اس کو مستقل امام بنانے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: شریعت کی نگاہ میں سگریٹ نوشی ایک قبیح اور ناپسندیدہ چیز ہے اور اس کا پینا مکروہ ہے اس کا ضرر دین ودینا دونوں کو حاوی ہے، ملائکہ کو اس سے اذیت ہوتی ہے اور ایک عالم کی شان کے بالکل خلاف ہے، بایں وجہ عالم کو اس عادتِ قبیحہ سے سچی توبہ کر کے چھوڑ دینا چاہیے، باقی سگریٹ نوشی کرنے والے کی امامت مکروہ ہے ہاں اس کے پیچھے نماز ہوجائے گی، لیکن مستقل امام بنانا کراہت سے خالی نہیں۔

سگریٹ نوشی میں تضییع مال اور اسراف بھی پایا جاتا ہے، اور یہ ممنوع ہے۔ ملاحظہ ہو:

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ وکلوا واشربوا ولا تسرفوا ﴾ [الأعراف: ۳۱].

وقال تعالیٰ: ﴿ ولا تبذرتبذیراً ، إن المبذرین کانوا إخوان الشیاطین وکان الشیطان لربه کفوراً ﴾ [الإسراء: ۲۶،۲۷].

وقال تعالیٰ : ﴿ولاتلقوا بایدیکم الی التهلکة ﴾ [البقرة: ۱۹۵].

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: إن اللّٰه حرم علیکم عقوق الأمهات ومنعاً و هات و وأد البنات وکره لکم قیل وقال وکثرة السؤال وإضاعة المال . (رواہ البخاری: ۲/۵۹۷۵).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

جو امام تمبا کو کو پیتا ہے اس کے پیچھے بھی نماز درست ہے، لیکن بدبو دار منہ لے کر مسجد میں آنا مکروہِ تحریمی ہے، اس لیے وضو میں مسواک سے منہ خوب صاف کر کے مسجد میں آئے ورنہ فرشتوں کو بھی اذیت ہوگی۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۶/۸۳، جامعہ فاروقیہ)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/۱۳۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

استخارہ میں خواب کی حیثیت:

سوال: کیا استخارہ میں خواب دیکھنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب: استخارہ میں خواب کا آنا ضروری نہیں ہے، دل کا رجحان کافی ہے ہاں کبھی رجحان خواب کے ذریعہ سے بھی ہوجاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں، اگر کوئی خواب نہ آئے لیکن دل کا رجحان جس طرف ہوجائے اس پرعمل کرلے، ان شاءاللہ تعالیٰ اسی میں خیر وبرکت ہوگی۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

وفي شرح الشرعة: المسموع من المشايخ أنه ينبغي أن ينام على طهارة مستقبل القبلة بعد قراءة الدعاء المذكور فإن رأى في منامه بياضاً أو خضرة فذلك الأمر خير وإن رأى فيه سواداً أو حمرة فهو شر ينبغي أن يجتنب . (فتاوى الشامي: ۲/ ۲۷،سعيد).

شرح شرعۃ الاسلام میں مرقوم ہے: بعض مشائخ سے یہ بات سننے میں آئی ہے کہ نمازِ استخارہ کے بعد دعا پڑھ کر قبلہ رُخ ہوکر سوجائے پھر اگر خواب میں سفید یا سبز رنگ دیکھے تو یہ خیر ہونے کی علامت ہے، اور اگر سیاہ یا سرخ رنگ دیکھے تو یہ نامناسب ہونے کی علامت ہے، اس سے اجتناب مناسب ہے۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مذکور ہے:

استخارہ میں کسی چیز کا نظر آنا ضروری نہیں، فیصلے کے لیے ایک طرف رجحان کافی ہے، سو فیصد اطمینان ضروری نہیں۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل:۴/۲۲۳)۔

قاموس الفقہ میں مرقوم ہے:

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص خواب نہ دیکھے، لیکن طبیعت کو ایک جہت پر اطمینان ہوجائے، یہ بھی استخارہ کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے کافی ہے، خواب دیکھنا ہی ضروری نہیں ہے۔ (قاموس الفقہ :۲/ ۱۰۷)۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے استخارہ کے بارے میں آتا ہے: **إن عمر بن الخطاب ﷛ كتب في الجد والكلالة كتاباً، فمكث يستخير الله ، يقول: اللهم إن علمت فيه خيراً فأمضه''، حتى إذا طعن ، دعا بالكتاب فمحى فلم يدر أحد ما كان فيه، فقال: إني كتبت في الجد والكلالة كتاباً ، وكنت استخير الله فيه ، فرأيت أن أتركـكم على ما كنتم عليه** . (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/ ۳۰۱). (وكذا في المدخل الى السنن الكبرى للبيهقي). **واللہ ﷻ اعلم۔**

قریہ کبیرہ میں اقامتِ جمعہ کے لیے اذنِ حاکم کا حکم:

سوال: مشہور یہ ہے کہ قریہ کبیرہ میں جمعہ لازم ہے لیکن شامیؒ نے قہستانی کے حوالہ سے قریہ کبیرہ میں جمعہ کے لیے حاکم کی اجازت کی شرط نقل فرمائی ہے، تو کیا اذنِ حاکم شرط کے درجہ میں ہے یا نہیں؟ نیز دوسرے فقہاء نے اس کو ذکر کیا ہے یا نہیں؟ (۲) اگر قریہ صغیرہ میں حاکم جمعہ کے قائم کرنے کی اجازت دے تو اس کے حکم سے جمعہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ (۳) فنائے مصر یا فنائے قریہ کبیرہ میں جمعہ لازم ہے لیکن اگر کوئی آبادی قریہ کبیرہ یا مصر سے کچھ فاصلہ پر ہو اور فنا میں شامل نہ ہو تو اس کی کتنی مقدار ہونی چاہیے؟ احسن الفتاویٰ میں جو مقدار ذکر کی گئی ہے اگر اس مقدار سے کچھ زائد ہو، لیکن عرف میں وہ آبادی شہر کی تابع سمجھی جاتی ہو تو اس میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ (۴) اگر کسی بستی کی آبادی دو یا تین ہزار ہے تو اس میں جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: (۱) مسلمان ممالک میں قریہ کبیرہ میں اقامتِ جمعہ کے لیے اذنِ حاکم شرط کے درجہ میں ہے چاہے اذن صراحۃً ہو یا دلالۃً، ہاں غیر مسلم ممالک میں چونکہ مسلمان حاکم موجود نہیں ہے اس لیے اذنِ حاکم شرط نہیں۔ علامہ شامیؒ کے علاوہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے بھی اس شرط کو ذکر فرمایا ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں مذکور ہے:

وفی القهستاني: إذن الحاكم ببناء الجامع فی الرستاق إذن بالجمعة اتفاقاً علی ما قاله السرخسيؒ وإذا اتصل به الحكم صار مجمعاً عليه فليحفظ. وفی الشامية: قوله وفی القهستاني، تأييد للمتن، وعبارة القهستاني: تقع فرضاً فی القصبات والقری الكبيرة التي فيها أسواق قال أبوالقاسم: هذا بلا خلاف إذا أذن الوالي أو القاضي ببناء المسجد الجامع وأداء الجمعة لأن هذا مجتهد فيه فإذا اتصل به الحكم صار مجمعاً عليه، وفيما ذكرنا إشارة إلی أنه لا تجوز فی الصغيرة التي ليس فيها قاضٍ ومنبر وخطيب كما فی المضمرات والظاهر أنه أريد به الكراهة لكراهة النفل بالجماعة؛ ألا تری أن فی الجواهر لو صلوا فی القری لزمهم أداء الظهر، وهذا إذا لم يتصل به حكم، فإن في فتاوی الديناري: إذا بنی

مسجد في الرستاق بأمر الإمام فهو أمر بالجمعة اتفاقاً على ما قال السرخسي، فافهم والرستاق القرى كما في القاموس. (فتاوى الشامي: ۲/۱۳۸، سعید).

مزید ملاحظہ ہو: (حاشية الطحطاوي على الدرالمختار: ۱/۳۳۹، والبحر الرائق: ۲/۱۴۴، الماجدية).

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

جہاں کہیں اسلامی سلطنت قائم ہو تو وہاں پر اجازت صراحۃً یا دلالۃً ضروری ہے، لیکن اگر کہیں ایسا انتظام نہ ہو بعد از رعایت شرائط عام مسلمان خود اپنی ذمہ داری محسوس کر کے نمازِ جمعہ کا اہتمام کریں گے۔ کما ذكر في الهندية: ولو تعذر الاستيذان من الإمام فاجتمع الناس على رجل يصلي بهم الجمعة جاز. الفتاوى الهندية: ۱/۱۴۶، باب صلاة الجمعة. (فتاویٰ حقانیہ: ۳/۳۷۷)۔ مزید ملاحظہ ہو: (کتاب المسائل: ۱/۴۵۷)۔

(۲) قریہ صغیرہ میں حاکم کی اجازت سے اقامتِ جمعہ جائز ہے۔ ملاحظہ ہو شامی میں ہے:

وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لا تجوز الصغيرة التي ليس فيها قاضٍ ومنبر وخطيب كما في المضمرات ...ألا ترى أن في الجواهر: لو صلوا في القرى لزمهم أداء الظهر، وهذا إذا لم يتصل به حكم، فإن في فتاوى الديناري: إذا بني مسجد في الرستاق بأمر الإمام فهو أمر بالجمعة اتفاقاً على ما قال السرخسي، فافهم والرستاق القرى كما في القاموس. (فتاوى الشامي: ۲/۱۳۸، سعید).

فتاویٰ فریدیہ میں مذکور ہے: سوال کا ماحصل یہ ہے کہ ایک گاؤں میں صرف ۲۵ مکانات ہیں اور تقریباً سو یا ڈیڑھ سو آدمی ہیں، اس کے متعلق جواب میں فرماتے ہیں: جب بادشاہ کی طرف سے اجازت نامہ ملا ہو تو اس قریہ میں اقامتِ جمعہ درست ہے، کما في رد المحتار، عن الفتاوى الديناري ...قلت: والإذن الصريحي فوق الإذن دلالة، وهو الموفق. (فتاویٰ فریدیہ: ۳/۱۳۲)۔ (وکذا فی امداد الفتاویٰ: ۱/۴۹۵ و ۵۴۰)۔

(۳) اس مسئلہ کا اصل مدار عرف پر ہوگا، اگر عرفاً چھوٹی بستی، شہر یا قریہ کبیرہ کے تابع سمجھی جاتی ہو تو اس میں اقامتِ جمعہ جائز ہے ورنہ نہیں۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مذکور ہے:

أما المصر الجامع فشرط وجوب الجمعة وشرط صحة أدائها عند أصحابنا حتى

لاتجب الجمعة إلا على أهل المصر ومن كان ساكناً في توابعه، وكذا لا يصح أداء الجمعة إلا في المصر وتوابعه فلا تجب على أهل القرى التي ليست من توابع المصر ولا يصح أداء الجمعة فيها. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۵۹،سعید).

احسن الفتاویٰ میں فاصلہ کی مقدار درج ذیل منقول ہے؛ دو بستیوں کے درمیان وجودِ مزارع یا قدر غلوہ (۱۶ء۱۳۷ میٹر) علامت انقطاع ہے، معہٰذا اگر دو مواضع عرفِ عام میں ایک ہی شہر کے دو محلے سمجھے جاتے ہوں تو فصل مذکور کے باوجود دونوں کو ایک موضع قرار دیا جائے گا۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۷)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا:۲/۶۴۲، ط: بمبئی)۔

فتاویٰ حقانیہ میں مذکور ہے:

اگر اس چھوٹے گاؤں کی حیثیت ایک محلّہ کی طرح ہو تو پھر درمیان میں خالی زمین اس کے لیے مانع نہیں کہ اس کو اس بڑے گاؤں کے توابع میں شمار کیا جا سکے، توابع ہونے کی صورت میں جمعہ وعیدین یہاں واجب رہیں گے اگر چہ اس کی مستقل آبادی کم ہو۔ بحوالہ بدائع۔ (فتاویٰ حقانیہ:۳/ ۳۷۸و۳۷۹)۔

(۴) اگر کسی بستی کی آبادی دو ڈھائی ہزار یا تین ہزار ہے تو اس کی آبادی قریہ کبیرہ یا شہر کے درجہ میں ہے اور اشیائے ضرورت بھی بہ سہولت مل جاتی ہے تو اس میں جمعہ جائز ہے۔ ملاحظہ ہو عزیز الفتاویٰ میں مذکور ہے:

دو ہزار کی آبادی جس بستی میں ہو وہ قریہ کبیرہ ہے یا نہیں سو ظاہر یہ ہے کہ وہ قریہ کبیرہ ہے اگر اس میں بازار و دکانیں ہوں تو جمعہ وہاں ادا ہوگا ورنہ آدمیوں کی تعداد صحیح روایات سے ثابت نہیں ہے بلکہ عرفاً جس کو قریہ کبیرہ سمجھیں وہ قریہ کبیرہ ہے اور جس کو قریہ صغیرہ سمجھیں وہ قریہ صغیرہ ہے۔ (عزیز الفتاویٰ:۱/ ۲۸۹، ط: دار الاشاعت)۔

فتاویٰ فریدیہ میں مرقوم ہے:

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک گاؤں کی آبادی دو ہزار افراد پر مشتمل ہے اور اشیائے ضرورت بھی ملتی ہیں کیا اس میں جمعہ پڑھنا صحیح ہے؟

الجواب: یہ مقام مصر شرعی ہے اس میں نمازِ جمعہ پڑھنا صحیح بلکہ ضروری ہے، لأن المصر على الصحيح موضع بلدة كبيرة فيها سكك وأسواق ولها رساتيق ... (فتاویٰ فریدیہ:۳/ ۱۶۳)۔

و للمزيد راجع: (فتاویٰ دار العلوم زکریا:۲/۶۴۳، ط: بمبئی، وخیر الفتاویٰ:۳/۴۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

امام کے ساتھ فوری شرکت کی فضیلت:

سوال: میں اور میرا ساتھی نماز میں ایسے وقت پہنچ گئے کہ امام سجدہ میں تھا، میں فی الفور تکبیر کہہ کر سجدہ میں شریک ہو گیا، اور میرے ساتھی نے دوسری رکعت کا انتظار کیا اور اس میں شریک ہوا، کیا میرا فعل زیادہ صحیح ہے یا میرے ساتھی کا؟ اگر کوئی فی الفور سجدہ میں شریک ہو جائے تو کیا اس کے لیے کوئی خاص فضیلت ہے یا نہیں؟

الجواب: حدیث شریف میں ہے کہ امام کو جس حالت میں پاؤ شریک ہو جاؤ۔ کیونکہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کو نماز کا کونسا حصہ زیادہ پسند آ جائے جیسے پلیٹ صاف کرنے کا حکم ہے کہ معلوم نہیں کونسے لقمہ میں برکت ہے لہٰذا جو شخص فوراً سجدہ میں شریک ہوا اس کا عمل زیادہ صحیح ہے اگر چہ مدرکِ رکعت نہ ہوا لیکن محرزِ اجر وثواب ہوا۔

ملاحظہ فرمائیں ترمذی شریف میں ہے:

عن عليؓ ومعاذ بن جبلؓ قالا: قال النبي صلى الله عليه وسلم: إذا أتى أحدكم الصلاة والإمام على حال فليصنع كما يصنع الإمام. قال أبوعيسى: هذا حديث غريب لا نعلم أحداً أسنده إلا ما روي عن هذا الوجه، والعمل على هذا عند أهل العلم، قالوا: إذا جاء الرجل والإمام ساجد فليسجد ولا تجزئه تلك الركعة إذا فاته الركوع مع الإمام وذكر عن بعضهم فقال: لعله لايرفع رأسه في تلك السجدة حتى يغفر له. (سنن الترمذي: ۲/۱۳۷/۵۹۱).

ابوداود شریف میں روایت ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا جئتم إلى الصلاة ونحن سجود فاسجدوا، ولا تعدوها شيئاً ومن أدرك الركعة، فقد أدرك الصلاة. (سنن أبي داود: ۱/۲۸۸).

وفي سعيد بن منصور من رواية عبد العزيز بن رفيع عن أناس من أهل المدينة أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من وجدني قائماً أو راكعاً أو ساجداً فليكن معي على الحالة التي

أنا عليها . (عمدة القارى ،باب إذا ركع دون الصف: ۵۰۹/۴،دار الحديث ،ملتان). واللہ ﷻ اعلم۔

نمازِ عشاء صاحبینؒ کے مذہب کے مطابق ادا کرنے کا حکم:

سوال: یہاں نیوزیلنڈ میں عشا کی نماز شفق ابیض کے مطابق تقریباً ۱۰:۴۰ پر پڑھتے ہیں جو کافی دیر سے ہوتی ہے، کیا ہم ان ایام میں صاحبینؒ کا قول شفق حمرۃ والا لے سکتے ہیں اور عشا کچھ پہلے ادا کر سکتے ہیں؟

الجواب: بہت سارے فقہاء نے صاحبینؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے اس لیے شفق احمر کے غروب کے بعد عشا کی نماز پڑھنا درست ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ شرنبلالی امداد الفتاح میں فرماتے ہیں:

والمغرب: منه أى غروب الشمس إلى قبيل غروب الشفق الأحمر على المفتى به ، و هو رواية عن الإمام ، عليها الفتوىٰ ،كما فى الدراية ومجمع الروايات ، وبها قالا، لقوله صلى الله عليه وسلم: الشفق الحمرة ، والصحيح أنه موقوف على ابن عمر رضي الله عنه ...ونقل في جمع التفاريق وغيره رجوع الإمام إلى هذا القول لما ثبت عنده من حمل عامة الصحابة الشفق على الحمرة...وقال فى السراج الوهاج والمستصفى: قولهما أوسع ، وقول أبي حنيفةؒ أحوط ، وفى التجنيس والمزيد: قال بعض المشايخ : ينبغي أن يؤخذ فى الصيف بقولهما لقصر الليالي...الخ . (امدادالفتاح،ص ۱۸۰،ط:بیروت).

وقال فى الدرالمختار: ووقت المغرب منه إلى غروب الشفق وهوالحمرة عندهما، وبه قالت الثلاثة وإليه رجع الإمام كما فى شرح المجمع وغيرها ، فكان هو المذهب .وقال العلامة الشامي: قوله وإليه رجع الإمام أى إلى قولهما الذى هو رواية عنه أيضاً، وصرح فى المجمع بأن عليها الفتوىٰ ، ورده المحقق فى الفتح بأنه لا يساعده رواية ولا دراية الخ، ... لكن تعامل الناس اليوم في عامة البلاد على قولهما ، وقد أيده فى النهر تبعاً للنقاية والوقاية والدرر والإصلاح ودرر البحار والإمداد والمواهب وشرحه البرهان وغيرهم مصرحين بأن عليه الفتوىٰ ، وفى السراج : قولهما أوسع وقوله أحوط ، والله أعلم .

تـنبيـه : قـدمـنا قريباً أن التفاوت بين الشفقين بثلاث درج كما بين الفجرين (والدرجة أربع دقائق) **فليحفظ** . (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۱/ ۳۶۱،سعید).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (فتح باب العنايه : ۱/ ۱۶۶، وشرح الوقاية مع عمدة الرعاية: ۲/ ۱۵، والدر المنتقى بهامش مجمع الأنهر: ۱/ ۷۰، ورمز الحقائق: ۱/ ۴۳، والهدية العلائية ،ص ۶۸،والجوهرة النيرة: ۱/ ۴۲، والتجنيس والمزيد: ۱/ ۳۸۰ ، والقول الراجح: ۱/ ۲۰).

مسلم شریف کی ایک روایت سے بھی صاحبینؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

عن عبد الله بن عمرو عن النبي صلى الله عليه وسلم ، قال: وقت الظهر ما لم يحضر العصر، ووقت العصر ما لم تصفر الشمس، ووقت المغرب مالم يسقط ثور الشفق ، ووقت العشاء إلى نصف الليل، ووقت الفجر ما لم تطلع الشمس . (رواه مسلم ، رقم الحديث : ۶۱۲، باب أوقات الصلوات الخمس).

قال الجزرى فى النهاية : ثور الشفق...هو بقية حمرة الشمس فى الأفق الغربي. (النهاية: ۳/ ۹۴۰). **واللہ ﷻ اعلم۔**

نماز میں سورت کا نام پکارنے سے نماز کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص نماز میں سورت ملاتے وقت سورت کا نام بول اٹھے، مثلاً سورۃ النور تو اس کی وجہ سے نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نماز میں کوئی ایسا لفظ کہنا جو کلام الناس کے مشابہ نہ ہو تو اس سے نماز میں فساد نہیں آتا، چنانچہ سورت کا نام پکارنے سے نماز فاسد نہیں ہوئی، ہاں کراہت لازم آئے گی۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مذکور ہے:

ولـو لـدغته عقرب أو أصابه وجع فقال بسم الله ، قال الشيخ الإمام أبوبكر محمد بن الفضل تفسد صلاته ويكون بمنزلة الانين ، وهكذا روي عن أبي حنيفةؒ وقيل: لا تفسد لأنه

ليس من كلام الناس وفی النصاب وعليه الفتویٰ وجزم به فی الظهيرية وكذا لوقال يارب كما فی الذخيرة ، وفی الظهيرية ولو وسوسه الشيطان فقال: لاحول ولا قوة إلا باللّٰه إن كان ذلک لأمر الآخرة لا تفسد وإن كان لأمر الدنيا تفسد خلافاً لأبي يوسف . (البحرالرائق: ۲/ ۵، ط: بيروت).(وكذا فی ردالمحتار: ۱/ ۶۲۲،سعيد،والفتاوی الهندية: ۱/ ۹۹).

وقال فی المحيط البرهاني: وفی الفتاوی: إذا قال المريض عند القيام والانحطاط: بسم اللّٰه لما يلحقه من المشقة لا تفسد صلاته لأنه ليس من كلام الناس، ولم يخرج جواباً. (المحيط البرهانی: ۲/ ۲۸۴،ط: التراث العربی).

بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

ولو مر المصلي بآية فيها ذكر الجنة فوقف عندها وسأل اللّٰه الجنة أو بآية فيها ذكر النار فوقف عندها وتعوذ باللّٰه من النار فإن كان في صلاة التطوع فهو حسن إذا كان وحده ، لما روي عن حذيفة رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قرأ البقرة وآل عمران في صلاة الليل فما مر بآية فيها ذكر الجنة إلا وقف وسأل اللّٰه تعالیٰ وما مر بآية فيها ذكر النار إلا وقف وتعوذ وما مر بآية فيها مثل إلا وقف وتفكر، وأما الإمام فی الفرائض فيكره له ذلک لأن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم لم يفعله فی المكتوبات وكذا الائمة بعده إلی يومنا هذا فكان من المحدثات ولأنه يثقل على القوم وذلک مكروه ولكن لا تفسد صلاته . (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۳۵،سعيد).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

تکلم بولنا جس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اس کی بہت سی صورتیں ہیں ... دوم؛ یہ کہ وہ کلام ایسا ہو جیسے لوگ آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں یعنی نماز سے متعلق اذکار نہ ہوں۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/ ۲۴۴)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ابتدائے سفر کے بارے میں دوسرا قول:

سوال: فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلد دوم میں یہ مسئلہ مذکور ہے کہ شہر کے آخری مکان سے سفر کی ابتدا ہوتی

ہے، لیکن زمانہ حال کے مفتیوں میں سے کسی نے یہ لکھا ہے کہ سفر کی ابتدا اپنے گھر سے ہوتی ہے خصوصاً بڑے شہروں میں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: زمانہ حال کے بعض مفتی حضرات نے مسافتِ سفر کی ابتدا اپنے گھر سے تسلیم کی ہے۔ چنانچہ مولانا مرغوب احمد صاحب نے دارالعلوم کراچی کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل درج ہے؛

مبداء احکامِ سفر کے متعلق تو عباراتِ فقہاء بالکل صریح ہیں کہ جن کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے کہ یہ احکام جمیع بیوتِ بلد سے خروج کے بعد ہی شروع ہوں گے لیکن کیا مبداء ومنتہائے مسافت کو بھی حدود شہر کے آخری نقطہ سے ناپا جائے گا؟ یا ان کا تعلق کسی اور نقطہ سے ہوگا اس موضوع پر مراجعت کی مگر ہمیں کوئی ایسی صریح عبارت یا روایت کلامِ فقہاء میں نہیں ملی جس سے صراحۃً یہ معلوم ہو کہ جس طرح احکامِ سفر کی ابتداء خروجِ بلد کے بعد ہوگی اسی طرح مبداء مسافت سفر بھی ابنیہ بلد کی آخری عمارت سے شروع ہوگی مگر مراجعت وتلاش کے دوران بعض باتیں ایسی ملی ہیں جو اس بات کی مشعر ہیں کہ خود مسافتِ سفر کی تعیین کا مدار عرف پر ہے اس لیے اس کی ابتداء وانتہاء کا تعلق بھی عرف سے ہوگا اس لیے جس طرح مسافتِ سفر کی تعیین میں لوگوں کا عرف فیصل ہے اسی طرح اس کے مبداء ومنتہیٰ کی تعیین میں بھی عرف ہی فیصل ہوگا کہ سفر کے واسطے نکلنے والا شخص جب بنیت سفر اپنے گھر سے نکل جائے تو لوگوں کے عرف وعادت میں اس کے سفر کا آغاز جس مقام سے سمجھا جاتا ہو وہی مقام مبداء سفر ہوگا کیونکہ مبداء مسافت سفر اور منتہائے مسافتِ سفر مسافت ہی کا حصہ ہے نہ کہ احکامِ سفر کا مسافتِ سفر اور احکامِ سفر دونوں کا ایک ساتھ وجود میں آنا شرعاً لازم وملزوم ہونا بھی کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں چونکہ عام طور پر قاصدِ سفر جب مدتِ مسافتِ معتبرہ طے کرنے کی نیت سے اپنے گھر سے روانہ ہوتا ہے تو عرف میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ آدمی نے سفر کا آغاز کردیا اور سفر کرنے والا بھی یہی سمجھتا ہے کہ میرا سفر شروع ہوگیا ہے اسی لیے وہ سفر کی دعائیں وغیرہ بھی اسی وقت پڑھ لیتا ہے اسی بنیاد پر بعض دوسرے اکابر نے مکان اور گھر سے مسافتِ سفر کی ابتداء ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

جو لوگ کسی شہر یا بستی کی آخری حد پر رہتے ہیں اور بستی کی آخری عمارت ہی ان کی رہائش گاہ ہے وہ جب شہر یا بستی سے باہر مسافتِ سفر طے کرنے کی نیت سے اپنے گھر سے چلیں گے تو ان کا بھی مبداء ومنتہاء سفر ان کا

گھر ہی ہوگا اور عرفِ عام میں بھی ان کے سفر کا مبداء ومنتہاء اسی کو سمجھا جاتا ہے معلوم ہوا کہ تعیین کے سلسلے میں بھی ہر قسم کے مسافر کے واسطے یکساں عرف ہونا ضروری نہیں بلکہ جس مسافر کے واسطے جو عرف ہوگا اسی کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔ (علمی مکاتیب، ص۱۹۱۔۱۹۴، جمع وترتیب از مولانا مرغوب احمد صاحب لاجپوری)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

امام محمدؒ کے نزدیک سری نماز میں قراءت خلف الامام کا حکم:

سوال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ امام محمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ سری نماز میں قراءت کرنا چاہیے؟ اگر ہم اس پر عمل کریں گے تو منتشر خیالات سے محفوظ ہوں گے، اور اس کے ساتھ ساتھ تلاوت کا ثواب بھی ملے گا۔ کیا کسی حنفی کے لیے ایسا کرنا جائز ہے؟ اور کیا سری نماز میں قراءت کرنا امام محمدؒ کا مسلک ہے یا نہیں؟

الجواب: سری نماز میں قراءت خلف الامام کے متعلق بعض کتب میں امام محمدؒ کی طرف جواز کی نسبت کی گئی ہے لیکن بظاہر یہ نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی، دیگر علماء نے اس کی تردید فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو درجِ ذیل عبارات میں امام محمدؒ کی طرف قراءت کی نسبت موجود ہے:

مرقاۃ میں ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: **فقيل لأبي هريرة رضي الله عنه إنا نكون وراء الإمام ، أى فهل نقرأ أم لا ؟ قال: اقرأ بها أى بأم القرآن، في نفسك: سراً غير جهر، وبه أخذ الشافعي ، وهو مذهب صحابي لايقوم به حجة على أحد مع احتمال التقييد فى الصلاة السرية كما قال به الإمام مالكؒ ، والإمام محمد من أصحابنا .** (مرقاة المفاتيح: ۲/۲۸۳، باب القراء ة ، ط: امداديه ،ملتان).

وقال في فتح باب العناية: وفى الأصل: القراء ة خلف الإمام في صلاة لا يجهر فيها هل يكره ؟ اختلف فيه المشايخ ، فبعضهم قالوا: لا يكره أى عند الائمة الثلاثة ، وإليه مال الإمام أبوحفص وبعض مشايخنا قالوا: على قول محمد لايكره . (فتح باب العناية : ۱/۲۷۰،ط:بيروت).

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: **ويستحسن على سبيل الاحتياط فيما يروى عن محمد .** (الهداية : ۱/۱۲۱، ط:المصباح).

جامع الرموز میں امام صاحبؒ کی طرف بھی اس قول کو منسوب کیا گیا ہے؛ عبارت ملاحظہ ہو:

وينصت المؤتم ، سواء كان مدركاً أو لاحقاً أو مسبوقاً ، وفيه إشارة إلى أنه يكره القراء ة خلف الإمام ، وعن الطرفين لا بأس به في السرية والأول أصح ، فإنه يفسد الصلاة عند عدة من الصحابة كما في الزاهدى والظهيرية . (جامع الرموز: ۱/۱۶۹).

وفي البناية : وفي الذخيرة : لو قرأ المقتدى خلف الامام في صلاة لا يجب فيها ، اختلف المشايخ فيه ، فقال أبوحفص وهو من بعض مشايخنا : لا يكره في قول محمدؒ . (البناية في شرح الهداية: ۲/۳۷۵، مكتبه رشيديه كوئٹه).

اشرف الہدایہ میں مذکور ہے: امام محمد سے ایک روایت یہ ہے کہ احتیاطاً قراءت خلف الامام مستحسن ہے۔ (اشرف الہدایہ: ۲/۹۱، ط: مکتبہ دارالاشاعت)۔

لیکن دوسرے فقہاء نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار میں منقول ہے:

والمؤتم لا يقرأ مطلقاً، ولا الفاتحة في السرية اتفاقاً وما نسب لمحمد ضعيف كما بسطه الكمال . وقال في الشامية : قوله كما بسطه الكمال، حاصله أن محمداً قال في كتابه الآثار لا نرى القراء ة خلف الإمام في شيء من الصلوات يجهر فيه أو يسر ودعوى الاحتياط ممنوعة بل الاحتياط ترك القراء ة لأنه العمل بأقوى الدليلين ، وقد روى الفساد بالقراء ة عن عدة من الصحابة فأقواهما المنع . (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۱/۵۴۴، سعيد).

قال الإمام محمد في كتاب الآثار: أخبرنا أبوحنيفةؒ ، قال: حدثنا حماد ، عن إبراهيم قال: " ما قرأ علقمة بن قيس قط فيها يجهر فيه ، ولا فيما لا يجهر فيه، ولا في الركعتين الأخريين أم القرآن ، ولا غيرها خلف الإمام " قال محمد : وبه نأخذ ، لا نرى القراء ة خلف الإمام في شيء من الصلاة يجهر فيه أو لايجهر فيه . (كتاب الآثار: ۱/۱۱۲/۸۳، باب القراء ة خلف الامام وتلقينه).

وللمزيد راجع : (فتح القدير: ۱/۲۹۷، دارالفكر، والنهر الفائق: ۱/۲۳۵، وكتاب الحجة على اهل المدينة: ۱/۱۱۶، وعين الهداية: ۱/۵۵۰، ومجموعة رسائل اللكنوى: ۳/۴۵، ادارة القرآن).

علامہ لکھنویؒ نے مجموعہ رسائل میں لکھا ہے: **ومر أن هذه الرواية ليست ظاهر الرواية عن محمد، وأنها مخالفة لتصريحه فى المؤطا** (ص۹۶) **ولهذا استضعفها ابن الهمام وادعى أن الحق أن قوله كقولهما** . (مجموعه رسائل اللكنوى: ۴۷/۳،ط: ادارة القرآن[إمام الكلام مع غيث الغمام).

نیز مؤطا امام محمد کی تعلیقات میں کتاب الآثار کی عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

صريح في بطلان قول على القارى في شرح المشكاة: الإمام محمد من ائمتنا يوافق الشافعي فى القراءة خلف الإمام فى السرية...وقد ذكر صاحب الهداية وجامع المضمرات وغيرهما أيضاً أن على قول محمد يستحسن قراءة أم القرآن خلف الإمام على سبيل الاحتياط... والحق أنه وإن كان ضعيفاً رواية لكنه قوي دراية . (التعليق الممجد، ص۹۶، رقم الحاشية ۹، قديمى كتب خانه). اِس عبارت کے آخری جزو سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ لکھنویؒ کا رجحان بھی سری نماز میں قراءت کی طرف ہے۔

لیکن مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ نے احسن الکلام میں مولانا عبدالحیؒ کی تردید فرما کر اس بات کو ثابت کیا ہے کہ راجح اور قوی مسلک عندالاحناف یہ ہے کہ امام کے پیچھے قراءت نہ جہری نماز میں ہے اور نہ سری میں، لہٰذا حنفی کے لیے سری نماز میں قراءت کرنا جائز نہیں ہے۔ (احسن الکلام: ۷۰، ط: مکتبہ صفدریہ)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

وقت تنگ ہونے کی بنا پر ظہر سے قبل دو رکعت پڑھنے سے سنتِ ظہر کا حکم:

سوال: ایک شخص ایسے وقت مسجد میں پہنچا کہ فقط دو منٹ باقی تھے، جس میں چار رکعات پڑھنے کی گنجائش نہیں تھی، اس نے سنت کی نیت سے دو رکعات پڑھیں، اب یہ دو رکعتیں سنتِ ظہر کے قائم مقام بن گئیں یا نمازِ ظہر کے بعد چار رکعات سنت کی نیت سے پڑھنا پڑیگا؟ اگر عجلت کی وجہ سے چھوڑ دی تو گنہگار رہوگا یا نہیں؟

الجواب: قبل الظہر چار رکعات ایک سلام کے ساتھ سنتِ مؤکدہ ہیں، دو رکعات اس کے قائم مقام نہیں ہوں گی، ہاں اگر کسی ضروری کام کی وجہ سے کبھی ایسا اتفاق ہوگیا تو ترکِ سنت کا گناہ نہیں ہوگا لیکن اس کو معمول نہیں بنانا چاہیے۔ سنتِ مؤکدہ کو بلا عذر چھوڑنے کا معمول بنانا گناہ اور قابل ملامت ہے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وسن مؤكداً أربع قبل الظهر وأربع قبل الجمعة وأربع بعدها بتسليمة فلو بتسليمتين لم تنب عن السنة . وفي الشامية : قوله (وسن مؤكداً) أى استناناً مؤكداً بمعنى أنه طلب طلباً مؤكداً زيادة على بقية النوافل ولهذا كانت السنة مؤكدة قريبة من الواجب في لحوق الإثم كما في البحر ويستوجب تاركها التضليل واللوم كما في التحرير أى على سبيل الإصرار بلا عذر كما في شرحه . قوله لم تنب عن السنة ، ظاهره أن سنة الجمعة كذلک و ينبغي تقييده بعدم العذر للحديث المذكور آنفاً كذا بحثه في الشرنبلالية . (الدرالمختار مع رد المحتار : ۲/۲ ۱ ،سعيد).

وفي رد المحتار : قوله فله تركها، الظاهر أن معناه أنه يتركها وقت اشتغاله بالإفتاء لإجل حاجة الناس المجتمعين عليه وينبغي أنه يصليها إذا فرغ في الوقت...وينبغي أن يكون القاضي وطالب العلم كذلک . (فتاوى الشامي: ۲/ ۱۵ ،سعيد).

فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے: ظہر سے قبل جو چار رکعات سنتِ مؤکدہ ہیں ان کو ایک سلام کے ساتھ پڑھنا ہے، اگر دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو یہ سنت شمار نہ ہوگی ، بعد میں چار رکعت ایک سلام سے پڑھے۔ بحوالہ مراقی ، وشامی ۔ (فتاویٰ رحیمیہ :۳/ ۱۸۷، مکتبۃ الاحسان، دیوبند)۔

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

چار رکعت والی سنتِ مؤکدہ (یعنی ظہر و جمعہ سے قبل اور جمعہ کے بعد والی سنتوں) کو ایک سلام سے ادا کرنا سنتِ مؤکدہ ہے یعنی چاروں پڑھ کر چوتھی رکعت کے بعد سلام پھیرے اگر ان کو دو سلاموں سے ادا کیا یعنی دو دو رکعت پر سلام پھیرا تو وہ ان سنتوں کی جگہ ادا نہ ہوں گی اس لیے دوبارہ ایک سلام سے ادا کرے ۔ (عمدۃ الفقہ : ۲/ ۲۹۷)۔

سنتِ مؤکدہ کا ترک بلا عذر مکروہ تحریمی ہے ہاں بوقتِ عذر مکروہ اور گناہ نہیں ۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

وحاصله أن السنة إذا كانت مؤكدة قوية لا يبعد أن يكون تركها مكروهاً كراهة

تحریم کترک الواجب فإنه کذلک وإن کانت غیر مؤکدة فترکها مکروه تنزیهاً .
(البحر الرائق: ۲/۳۴،ط: دار المعرفة،بیروت). (وکذافی فتاوی الشامی : ۱/۶۵۳،سعید).

کتاب المسائل میں مرقوم ہے:

اصطلاحِ فقہ وحدیث میں فرض اورواجب کے علاوہ جتنی بھی نمازیں ہیں سب کوتطوع (نفل) کہا جاتا ہے، پھراس تطوع کی بنیادی طور پر بالترتیب تین قسمیں ہیں: (۱) سنن مؤکدہ؛ یہ کل بارہ رکعتیں ہیں۔۔۔ان میں سے کسی بھی سنت کو بلاعذر چھوڑنا گناہ ہے۔(کتاب المسائل:۱/۴۸۲،نعیمیہ دیوبند)۔واللہ ﷻ اعلم۔

جماعتِ معادہ میں نووارد کی شرکت سے متعلق مزید تحقیق:

سوال: فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلدِ دوم میں آپ نے لکھا ہے کہ صلاۃِ معادہ میں نووارد کی شرکت کے بارے میں فقہاء کے دواقوال ہیں؛۱۔اقتدا کرسکتا ہے، یہ آسان ہے،۲۔اقتدانہیں کرسکتا، یہ احوط ہے۔اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دلائل کے اعتبار سے کونسا قول قوی ہے اور جمہورفقہاء نے کونسے قول کوترجیح دی ہے نیز احادیث وآثار سے کس قول کی تائید ہوتی ہے؟ برائے مہربانی تحقیق فرمائیں،عین نوازش ہوگی۔

الجواب: جماعتِ اعادہ میں جب کہ اعادہ کسی ترکِ واجب کی وجہ سے ہو،نووارد کی شرکت کے بارے میں قوی اور جمہورفقہاء کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ اقتدا نہ کرے، کیونکہ پہلی سے سقوطِ فرض کاتحقق ہوگیا، اور جماعتِ ثانیہ من وجہ نفل ہے اورمن وجہ واجب ہے کہ اس میں تکمیل فرض ہے۔دلائل اورشواہد حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں: بطورِ استیناس واستشہاد پہلے حدیث شریف ملاحظہ ہو:

(۱) عن القاسم بن مخیمرة قال: أخذ علقمة بیدی فحدثني أن عبد الله بن مسعود ﷜ أخذ بیده وأن رسول الله صلی الله علیه وسلم أخذ بید عبد الله فعلمه التشهد فی الصلاة فذکر مثل دعاء حدیث الأعمش، إذا قلت هذا أو قضیت هذا فقد قضیت صلاتک إن شئت أن تقوم فقم وإن شئت أن تقعد فاقعد. (رواه ابوداود، رقم ۹۷۲).

حدیثِ بالا اورصحیح ابن حبان،سنن دارمی اورسنن دارقطنی وغیرہ کی احادیث کے الفاظ پرغور کرنے سے

معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تشہد کی تعلیم دینے کے بعد فرمایا؛ جب آپ یہاں تک پہنچ جاؤ یا اتنا کرلو تو آپ کی نماز ہوگئی۔ (بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابن مسعودؓ کا قول ہے) حالانکہ سلام واجب ہے۔معلوم ہوا کہ فرائض مکمل ہونے کے بعد فرضیت ذمہ سے ساقط ہوجاتی ہے، ہاں ترکِ واجب کی وجہ سے نماز میں جو نقص آیا اس کی تلافی کے لیے سجدۂ سہو یا اعادہ رکھا گیا ہے۔

(۲) مشہور حدیث مسیٔ الصلاۃ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **فإذا صنعت ذلک فقد قضيت صلاتک وما انتقصت من ذلک فإنما تنقصه من صلاتک.** (سنن النسائی، رقم: ۱۰۵۳) اس میں بھی سلام کا ذکر نہیں، اور حدیث کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ واجبات میں کوتاہی کرنے سے نماز میں نقص آتا ہے جس کی تلافی کے لیے سجدۂ سہو یا اعادہ رکھا گیا ہے، ہاں فرض ذمہ سے ساقط ہو چکا۔ ورنہ آپ یہ فرماتے کہ نماز میں کمی کرنے سے نماز نہیں ہوتی۔ بعض روایات میں قضیت کی جگہ: **فقد تمت صلاتک** کے الفاظ موجود ہیں۔ اور یہ فرمان: **ارجع فصل فإنک لم تصل**، تو اس کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ نفی کمال مراد ہے یعنی فرض ذمہ سے ساقط ہوگیا لیکن تکمیل فرض کے لیے اعادہ کا حکم دیا گیا۔

قال العلامة العيني: وقد سمى صلاته صلاة فدل على أن المراد من النفي نفي الكمال ... قلت: إنما أمره بالإعادة على الكيفية الكاملة ولايستلزم ذلک نفي ذات الصلاة فالنفي راجع إلى الصفة لا إلى الذات والدليل عليه أن صلاته لو كانت فاسدة لكان الاشتغال بذلک عبثاً والنبي لا يقرر أحداً على الاشتغال بالعبث، وهذا هو الذي ذكره المتأخرون من أصحابنا. (عمدة القاری: باب وجوب القراءة: ۴/۴۵۶، ط: دار الحدیث، ملتان).

اکثر فقہائے کرام کے یہاں بھی راجح یہ ہے کہ پہلی نماز سے فرض ساقط ہو چکا۔ چند عبارات ملاحظہ کیجیے:

(۳) **قال العلامة الطحطاوي: والمختار أن المعادة لترک واجب نفل جابر والفرض سقط بالأولى لأن الفرض لا يتكرر كما في الدر وغيره.** (حاشية الطحطاوي على مراقی الفلاح، ص: ۲۴۸، فصل في واجبات الصلاة، قديمی).

(۴) **وفي فتاوى الشامي: قال وأما المعادة لترک واجب فلا شک أنها جابرة لا**

فرض . (فتاوی الشامی: ۱/۴۱۸، سعید).

(۵) وفی الأشباه والنظائر: وأما الصلاة المعادة لارتكاب مكروه أو ترک واجب، فلا شک أنها جابرة لا فرض، لقولهم بسقوط الفرض بالأولى . (الأشباه والنظائر: ۱/۱۳٦،ط:ادارة القرآن).

(٦) و قال فی الدر المختار: كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب إعادتها و المختار أنه جابر للأول. وفی الشامية : قوله المختار أنه ، أی الفعل الثاني جابر للأول بمنزلة الجبر بسجود السهو و بالأول يخرج عن العهدة وإن كان على وجه الكراهة على الأصح كذا في شرح الأكمل على أصول البزدوی. . .واختار ابن الهمام الأول، قال: لأن الفرض لا يتكرر. (فتاوی الشامی: ۱/۴۵۷،سعید).

(۷) وفي فتح القدير: ولا إشكال في وجوب الإعادة إذ هو الحكم في كل صلاة أديت مع كراهة التحريم ويكون جابراً للأول لأن الفرض لا يتكرر. (فتح القدير: ۱/۳۰۱، دار الفكر).

(۸) وفي شرح المنية : والمختار أن الفرض هو الأول والثاني جبر للخلل الواقع فيه بترک الواجب . (غنية المتملی فی شرح منية المصلی،ص۲۹۴،ط:سهیل اکیڈمی). (وكذا فی مراقی الفلاح ، ص۲۴۷، قديمی) .

(۹) جو شخص قعدۂ اخیرہ کرنے کے بعد سہواً کھڑا ہوجائے اس کے بارے میں فقہاء نے فرمایا: تم فرضه یعنی فرائض مکمل ہوگئے، ہاں سلام واجب ہے تو تاخیر واجب کی بنا پر سجدۂ سہو واجب ہے۔

قال فی الاختيار لتعليل المختار: وإن قعد فی الرابعة قدر التشهد ثم قام عاد وسلم ، وإن سجد فی الخامسة تم فرضه فيضم إليها ركعة سادسة ويسجد للسهو. (الاختيار لتعليل المختار: ۱/۷۹، باب سجود السهو، ط: دار الكتب العلمية).

وفی الدر المختار: تم فرضه لأنه لم يبق عليه إلا السلام . (الدرالمختار:۲/۸۷،سعید).

وفي تبيين الحقائق: لأنه لم يترک إلا إصابة لفظ السلام وهي ليست بفرض عندنا. (۱/۱۹۷، امدادیه) معلوم ہوا کہ فرائض کی ادائیگی سے نماز کی فرضیت ذمہ سے ساقط ہوجاتی ہے، ہاں ترکِ

واجب کی وجہ سے نماز میں نقص آیا، اِس کی تلافی سجدۂ سہو سے ہوگی اور نہ کرنے پراعادہ سے ہوگی۔ تو نمازِ معادہ اصل نہ ہوئی بلکہ تکملہ ہوئی۔

(۱۰) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں:

الجواب: اس صورت میں اس کی نماز صحیح نہ ہوگی، کیونکہ اس صورت میں اس جماعت کے فرض اگرچہ ناقص ہی سہی مگر پہلی دفعہ ادا ہوگئے، لہٰذا اب یہ دوسری نفل نماز ہوگی اور اقتداءمفترض متنفل کے پیچھے صحیح نہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۳/۳۷۱، مدلل ومکمل، ط: دارالاشاعت)۔

(۱۱) کفایت المفتی میں مذکور ہے:

سوال: امام سے واجب ترک ہوا اس نے سجدۂ سہو نہیں کیا جب ان کو یاد دلایا گیا تو انہوں نے نماز کا اعادہ کیا، اِس لوٹانے والی نماز میں جو اور لوگ آکر شریک ہوئے ہیں ان کی نماز ہوگئی یا نہیں؟

جواب: اس نماز میں دوسرے لوگ جو پہلی جماعت میں شریک نہیں تھے شریک نہیں ہوسکتے، اگر شریک ہوں گے تو ان کے فرض ادا نہ ہوں گے۔ (کفایت المفتی:۳/۱۳۸، ط: دارالاشاعت)۔

(۱۲) فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

بعد کی نماز نفل ہے لہٰذا جو لوگ صرف بعد والی نماز میں شریک ہوئے ہیں ان کی نماز صحیح نہ ہوئی۔ (فتاویٰ محمودیہ:۶/۴۴۲، ط: جامعہ فاروقیہ)۔

دوسری جگہ مذکور ہے:

اگر فرض ترک ہونے کی بنا پر اعادہ ہوا ہے تو اس میں شریک ہونا نئے آدمی کا درست ہے، کیونکہ پہلی نماز باطل ہوگئی اور اگر ترکِ واجب کی وجہ سے اعادہ ہوا ہے تو نئے آدمی کی شرکت درست نہیں، کیونکہ فرض پہلی نماز سے ادا ہو چکا ہے اور یہ صرف تکمیل ہے: ”**المعادة لترک واجب نفل، والفرض سقط بالأولی**“ **طحطاوی**۔ (فتاویٰ محمودیہ:۶/۴۴۴، ط: جامعہ فاروقیہ)۔

(۱۳) فتاویٰ رحیمیہ میں مرقوم ہے:

الحمدللہ فتاویٰ رحمیہ کا جواب صحیح اور مختار قول کے مطابق ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو نماز پہلے پڑھی تھی وہ بیکار

نہیں گئی، وہ اس درجہ میں قائم رہی کہ فرض ساقط ہوگیا کیونکہ اس نماز کے سارے ارکان ادا ہوگئے، صرف ایک واجب رہ گیا تھا اس کے فوت ہونے سے نماز میں جو کمی رہی ہے اس کی تکمیل کے لیے اعادہ کا حکم ہے، یہ اعادہ کردہ نماز بمنزلہ سجدۂ سہو ہے جس طرح سجدۂ سہو سے کمی ونقص دور ہوتا ہے اسی طرح نماز کے اعادہ سے بھی نماز کی تکمیل ہوتی ہے، یہ (اعادہ کردہ) نماز اصل اور مستقل فرض نماز نہیں ہے، لہٰذا جو شخص پہلی نماز یعنی جماعتِ اول میں شامل نہ ہو وہ اگر اس دوسری میں شریک ہوگا تو اس کا فرض رہ جائیگا یعنی اس کی اصل نماز ادا نہ ہوگی، **والمختار أن المعادة لترک الواجب نفل جابر و الفرض سقط بالأولیٰ** . (طحطاوی علی مراقی الفلاح، ص ۱۴۴)، ہاں البتہ اگر نماز میں کوئی فرض چھوٹ جائے تو نماز فاسد اور باطل ہوتی ہے سجدۂ سہو سے اس کی اصلاح نہیں ہوتی اس کو از سر نو پڑھنا پڑتا ہے اور یہ دوسری نماز بھی فرض اور اصل ومستقل ہی ہوتی ہے، لہٰذا اس میں وہ بھی شامل ہوسکتا ہے جس نے پہلی نماز نہ پڑھی ہو اور اپنا اصل فرض پڑھ رہا ہو۔ (درمختار مع الشامی: ۱/ ۴۲۶، وفتح القدیر: ۱/ ۲۶۲، والدر المنتقی شرح الملتقی: ۱/ ۸۸) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱/ ۱۹۸، مکتبہ رحیمیہ)۔

ایک اشکال اور جواب:

بعض فقہاء نے فرمایا ہے کہ فرض دوسری نماز ہے تو اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ؛ پہلی نماز فرائض کی ادائیگی کے باوجود باطل ہوئی، اور یہ درست نہیں، یا فرائض کی تکمیل کے بعد بھی ذمہ ساقط نہیں ہوا، اور یہ اصولِ مسلمہ کے خلاف ہے، یا یہ کہ دوسری بھی فرض ہے پہلی کی طرح تو فرض مکرر ہوا، اور یہ بھی صحیح نہیں۔

قال فی الشامیة : ولا یلزم من کونها فرضاً عدم سقوط الفرض بالأولی . و فیه أیضاً: لأن القائل أیضاً بأن الفرض هو الثانیة أراد به بعد الوقوع وإلا لزم الحکم ببطلان الأولی بترک ما لیس برکن و لا شرط. (۶۵/۲، سعید)، **وقال فی الهدایة : وإذا أتمها یدخل مع القوم والذی یصلي معهم نافلة لأن الفرض لا یتکرر في وقت واحد .** (الهدایة: ۷۱)، **وقال فی الفتح: ویکون جابراً للأول لأن الفرض لا یتکرر و جعله الثاني یقتضي عدم سقوطه بالأول وهو لازم ترک الرکن لا الواجب.** (فتح القدیر: ۱/ ۳۰۱، دارالفکر).

خلاصہ یہ ہے کہ فرض پہلی نماز سے ساقط ہوا البتہ ترکِ واجب کی تلافی دوسری نماز سے ہوئی۔

اس مسئلہ کی اچھی تحقیق مفتی رشید احمد فریدی صاحب نے بھی فرمائی ہے، نیز اقتدا صحیح کہنے والوں کے دلائل کے جوابات بھی مرحمت فرمائے ہیں، لہٰذا اس کی طرف مراجعت بھی مفید ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

منقش ومصور جائے نماز پرنماز پڑھنے کا حکم:

سوال: آج کل جائے نماز پر خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی کی تصویریں بنی ہوئی ہوتی ہیں، تو کیا ایسے جائے نماز پر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ أفیدونا بارک اللّٰہ فیکم.

الجواب: بیت اللہ اور مسجدِ نبوی کی عظمت اور ان کا احترام ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے، اور جائے نماز پر جو نقش ہوتا ہے وہ اصل کے حکم میں نہیں ہے لہٰذا اس پر بلا کراہت نماز پڑھنا جائز اور درست ہے۔ نیز یہ غیر ذی روح کی تصویر ہے جو ممنوع تصویر میں داخل نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری شریف میں ہے:

عن أبي طلحة صاحب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: إن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: إن الملائكة لا تدخل بيتاً فيه الصورة قال بسر: ثم اشتكى زيد فعدناه فإذا على بابه ستر فيه صورة فقلت لعبيد اللّٰه ربيب ميمونة زوج النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ألم يخبرنا زيد عن الصور يوم الأول فقال عبيد اللّٰه ألم تسمعه حين قال: إلا رقماً في ثوب . (صحیح البخاری ،رقم: ۵۹۵۸، باب من کره القعود على الصورة).

قال العيني في شرح أبي داود: وأما تصوير صورة الشجر ونبات الأرض وغير ذلك مما ليس فيه صورة حيوان ، فليس بحرام . (شرح ابی داود: ۱/۵۰۵،ط: مكتبة الرشد).

وفى الفتاوى الهندية: ولا يكره تمثال غير ذى الروح كذا فى النهاية . (۱/۱۰۷).

شرح منية المصلي میں مذکور ہے: **وأما صورة غير ذى روح فلا خلاف فى عدم كراهية الصلاة عليها أو إليها.** (۳۵۹،ط: سهيل اكيڈمی). (وكذا في فتاوى الشامي: ۱/۶۴۹،سعيد،وحاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح،ص ۳۶۲،قديمى).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

ان مصلوں پر نماز پڑھنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں نہ ان پر کپڑا چڑھانے کی ضرورت ہے نہ ان کو فروخت کرنے کی ضرورت... اور اس تصویر سے خانہ کعبہ کی تعظیم میں بھی کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ تصویر کا حکم عین شئی نہیں ہوتا، دوسرے جب خانہ کعبہ میں نماز پڑھی جاتی ہے تو وہاں بھی زمین پیروں کے نیچے ہوتی ہے، جب وہ تعظیم کے منافی نہیں تو تصویر کا پیروں کے نیچے ہونا بطریق اولیٰ تعظیم کے منافی نہ ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹۲/۱۱، محمودیہ)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے:

کعبۃ اللہ وغیرہ کا مصلیٰ پر جو نقش ہوتا ہے چونکہ وہ اصل نہیں بلکہ اس جیسا ایک مصنوعی نقشہ ہے لہٰذا اس کا احترام ضروری نہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کی عظمت ہوتی ہے، اہانت کا خیال نہیں ہوتا اس لیے اگر نادانستہ اتفاقاً پیر پڑ جائے تو گناہ نہ ہوگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۴۸۲/۵، مکتبۃ الاحسان، دیوبند)۔

ایضاح المسائل میں مذکور ہے:

ان مصلوں پر پیر رکھنے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، اس لیے کہ تصویر اصلی شئی کے حکم میں نہیں ہوتی بلکہ اصلی شئی سے کم درجہ کی ہوتی ہے... ہاں البتہ جائے نماز سادہ ہونا زیادہ بہتر ہے اور جائز دونوں طرح ہیں۔ (ایضاح المسائل، ص ۱۳۳)۔

اشکال اور جواب:

اشکال: بعض مفتی حضرات نے اس کو شعائر اللہ کی توہین قرار دیا ہے اس کا کیا جواب ہے؟ ملاحظہ ہو نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے: اگر بیت اللہ اور مسجدِ نبوی اس پر صحیح اور صاف طور پر نظر آتا ہے تو اس پر پیر رکھنا اور نماز پڑھنا دونوں ناجائز ہے، اس لیے کہ بیت اللہ اور مسجدِ نبوی کا شعائر میں سے ہونا مسلَّم اور ظاہر ہے اور شعائر کا احترام واجب ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿ **ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب** ﴾ اور معظم چیز کو پیروں سے روندنا اس کی اہانت کو مستلزم ہے، اور یہ دونوں نقشہ اگرچہ عین کعبہ نہیں لیکن ان کا عکاس ضرور ہے اس لیے ان کی اہانت بھی ان دونوں کی اہانت کو مستلزم ہوگی... ان نقشوں پر سجدہ کرنا ناجائز اور حرام ہوگا، اگر یہ چیز شرک نہ ہو تو ابہامِ شرک ضرور ہے ابہامِ شرک بھی ممنوع ہو جائیگا۔ (نظام الفتاویٰ: ۴۸/۱ بتغیر یسیر)۔

الجواب: اصل اور فرع کا حکم جداگانہ ہوتا ہے اصل کا جو حکم ہوتا ہے وہ بعینہٖ فرع کا حکم نہیں ہوتا بلکہ دونوں میں فرق ہوتا ہے، کتبِ فقہ واصول میں اس کی نظائر کثیرہ موجود ہیں؛

قال في الهداية : وإن أبرأ الكفيل لم يبرأ الأصيل عنه، لأنه تبع ، ولأن عليه المطالبة وبقاء الدين على الأصيل بدونه جائز ، وكذا إذا أخر الطالب عن الأصيل فهو تأخير عن الكفيل ، ولو أخر عن الكفيل لم يكن تأخيراً عن الذي عليه الأصل . (الهداية : ۱۱۸/۳).

وينظر : (السراجي في الميراث ،ص۳۳،ط:بشریٰ).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اس تصویر سے خانہ کعبہ کی تعظیم میں بھی کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ تصویر کا حکم عین شئی کا نہیں ہوتا۔(۹۲/۱۱محمودیہ)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں مرقوم ہے: کعبۃ اللہ وغیرہ کا مصلیٰ پر جو نقشہ ہوتا ہے چونکہ وہ اصل نہیں بلکہ اس جیسا ایک مصنوعی نقشہ ہے لہٰذا اس کا احترام ضروری نہیں۔(فتاویٰ رحیمیہ:۴۸۲/۵،مکتبۃ الاحسان،دیوبند)۔

ایضاح المسائل میں ہے: تصویر اصل شئی کے حکم میں نہیں ہوتی بلکہ اصل شئی سے کم درجہ ہوتی ہے۔(۱۳۳)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصل اور عکس میں فرق ہے لہٰذا جو درجہ بیت اللہ اور مسجدِ نبوی کا ہے وہی درجہ اور حکم تصویر کا نہیں ہے، بنابریں تصویر کا احترام بھی لازم نہیں ہے۔ نیز خانہ کعبہ یا مسجدِ نبوی کی تصویر سجدہ کے مقام پر ہوتی ہے پاؤں کی جگہ نہیں ہوتی۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مسجد میں چندہ وغیرہ کے اعلانات کرنے کا حکم:

سوال: کیا مسجد میں کارِ خیر کے لیے بلا مبالغہ چندہ کا اعلان کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز دیگر اعلانات مثلاً انتقال کی خبر یا نمازِ جنازہ کے وقت کا اعلان، یا مسجد میں منعقد ہونے والے پروگرام کا اعلان کرنا وغیرہ، یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسجد میں کارِ خیر کے لیے چندہ کا اعلان بلا مبالغہ درست ہے، نیز انتقال یا نمازِ جنازہ کا اعلان یا مسجد میں منعقد ہونے والے دینی ،اصلاحی پروگرام کا اعلان حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے جائز اور درست

ہے، ہاں گمشدہ اشیاء کا اعلان درست نہیں، لیکن گمشدہ بچوں کے اعلان کے بارے میں مفتی خالد سیف اللہ صاحب نے جواز لکھا ہے انسانی جان کی اہمیت کی خاطر، ہاں ان سب میں مسبوق کی نماز میں خلل نہ ہونے کا لحاظ رکھا جائے، باقی بلاضرورت اعلانات سے پرہیز کرنا چاہیے، اور مسجد کے باہر اعلان بورڈ سے کام چلانا چاہیے۔

کارِ خیر اور چندہ کے اعلان سے متعلق حدیث شریف ملاحظہ کیجیے:

(۱) نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے وقت صحابہ کرام سے چندہ کا مسجد میں اعلان فرمایا۔

ترمذی شریف میں روایت ہے: **عـن عبـد الـرحمن بن خباب قال: شهدت النبي صلى الله عليه و سلـم وهو يحث على جيش العسرة فقام عثمان بن عفان ﷺ فـقال: يارسول الله ! على مائة بـعيـر بـأحـلاسها وأقتابها في سبيل الله ثم حض على الجيش فقام عثمان بن عفان ﷺ فقال: يـارسـول الـلّـه ! عـلـى مائتا بعير بأحلاسها وأقتابها في سبيل الله ثم حض على الجيش فقام عثـمان بن عفان ﷺ فـقـال: يـا رسـول الله ! على ثلاث مائة بعير بأحلاسها وأقتابها في سبيل الـلّه فأناْ رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل عن المنبر وهو يقول: ما على عثمان ما عـمل بعد هذه ما على عثمان ﷺ مـا عـمل بعد هذه. قال أبوعيسىٰ : هذا حديث غريب من هـذا الـوجـه لانعرفه إلا من حديث السكن بن المغيرة .** (سنن الترمذی، رقم: ۳۷۰۰، باب مناقب عثمان بن عفان رضی الله تعالیٰ عنه، ط: ۶۲۵/۵، ط: داراحیاء التراث العربی، بیروت).

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مرقوم ہے:

دینی مدارس کے لیے یا اور دینی ضروریات کے لیے مسجد میں اعلان کرنا جائز ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جیش العسرۃ'' کے لیے چندے کا اعلان فرمایا تھا۔ (۲۶۰/۳) مگر یہ یاد رہے کہ اس اعلان کی وجہ سے کسی نمازی کی نماز میں خلل نہ پڑے (اس لیے اعلان مختصر ہو اور پرجوش اعلان نہ ہو)۔ (آپ کے مسائل: ۲۶۱/۳)۔

(۲) ایک محتاج شخص کی فریادرسی اور حاجت برآوری کے لیے مسجد میں دورانِ خطبہ، خطبہ موقوف فرما کر آپ نے چندہ فرمایا؛ ملاحظہ ہو سنن نسائی میں حدیث ہے:

عـن عيـاض بن عبد الله قال: سمعت أبا سعيد الخدري يقول: جاء رجل يوم الجمعة

والنبي صلى الله عليه وسلم يخطب بهيئة بذة فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم أصليت قال: لا قال: صل ركعتين وحث الناس على الصدقة فألقوا ثياباً فأعطاه منها ثوبين فلما كانت الجمعة الثانية جاء ورسول الله صلى الله عليه وسلم يخطب فحث الناس على الصدقة قال: فألقى أحد ثوبيه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم جاء هذا يوم الجمعة بهيئة بذة فأمرت الناس بالصدقة فألقوا ثياباً فأمرت له منها بثوبين ثم جاء الآن فأمرت الناس بالصدقة فألقى أحدهما فانتهره وقال: خذ ثوبك. (رواه النسائی،رقم: ۱۴۰۸،باب حث الناس على الصدقة يوم الجمعة فی الخطبة،ط:مكتبة المطبوعات الاسلامية حلب).

قال في النهر: والمختار أن السائل إن كان لا يمر بين يدى المصلي ولا يتخطى الرقاب ولايسأل إلحافاً بل لأمر لا بد منه فلا بأس بالسوال والإعطاء، ومثله فى البزازية، و فيها: ولا يجوز الإعطاء إذا لم يكونوا على تلك الصفة المذكورة. (رد المحتار: ۲/۱۶۴، سعید).

آپ کے مسائل اوران کا حل میں ہے: کسی شخص کی ضرورت کے لیے امام مسجد کا یا معززین میں سے کسی کا سوال کرنا اور اعلان کرنا درست ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ایسے حضرات کے لیے جو مستحق تھے مسجد میں چندہ فرمایا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ان کی اعانت کی ترغیب دی۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل:۳/۲۶۰،ط: مکتبہ لدھیانوی)۔

(۴) غزوۂ موتہ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا اعلان مسجد میں فرمایا، اور آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ جاری ہوا۔

مستدرکِ حاکم میں روایت ہے: عن أنس بن مالك رضی اللہ عنہ قال: نعى رسول الله صلى الله عليه وسلم أهل موتة على المنبر. (المستدرک، رقم: ۵۲۹۶،ط:دارالكتب العلمية).

وفي رواية البيهقي عنه: قال: نعى رسول الله صلى الله عليه وسلم جعفراً، وزيدبن حارثة، وعبد الله بن رواحة وعيناه تذرفان. (السنن الصغرى للبيهقی،رقم: ۱۱۹۱، باب البكاء على الميت). ہاں مسجد میں گمشدہ چیز کے اعلان سے متعلق حدیث شریف میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔

صحیح مسلم میں روایت ہے: **عن أبي عبد الله ، مولى شداد بن الهاد أنه سمع أبا هريرة ﷺ، يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من سمع رجلاً ينشد ضالة في المسجد فليقل لاردها الله عليک فإن المساجد لم تبن لهذا .** (صحيح مسلم ۱: ۳۹۷/۵٦۸).

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

اگر مائیک کا کمرہ حدودِ مسجد سے باہر ہو تو گم شدہ چیز یا انسان کے بارے میں اعلان کرنا درست ہے، اور اگر مائیک کی جگہ حدودِ مسجد کے اندر ہو تو اس مائیک سے گم شدہ چیز کا اعلان مکروہ ہے، کیونکہ آپ نے مسجد میں گم شدہ چیز کے اعلان سے منع فرمایا ہے، البتہ گم شدہ لڑکے یا لڑکی کے اعلان سے چونکہ ایک انسان کی حفاظت کا مسئلہ متعلق ہے اور انسانی جان اور زندگی کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے اگر حدودِ مسجد سے باہر اعلان کی سہولت نہ ہو تو اندر بھی اعلان کیا جا سکتا ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۴/ ۲۵۷)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے عام فائدہ سے متعلق مختصر اعلان کی گنجائش ہے، البتہ مسجد میں خلفشار اور انتشار اور غیر ضروری اعلانات سے احتراز کیا جائے۔

بعض فتاویٰ سے مسجد میں اعلان کا عدمِ جواز مترشح ہوتا ہے اس کا جواب:

حضرت مفتی اسماعیل صاحب نے فتاویٰ دینیہ میں مسجد میں اعلان کرنے سے منع کیا ہے تو دراصل مفتی صاحب کے سوال و جواب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غیر ضروری اعلانات کے بارے میں فرمایا ہے۔ سوال اور جواب ملاحظہ کیجیے: فتاویٰ دینیہ میں مرقوم ہے:

سوال: مسجد میں جماعت ختم ہوتے ہی یہ اعلان کیا جاتا ہے....

(۱) دو روپئے ملے ہیں جس کے ہوں وہ آ کر لے لے (۲) گھڑی ملی ہے جس کی ہو وہ آ کر لے جائے (۳) قبرستان کے گھاس کی نیلامی ہے (۴) مسجد کے غیر ضروری سامان کی نیلامی ہے (۵) تھوڑی دیر تشریف رکھیں، کتابی تعلیم ہوگی۔ یہ اعلان کیے جاتے ہیں، کیا یہ اعلان مسجد میں کرنا جائز ہے؟ نیز اس وقت مسبوق اپنی چھوٹی ہوئی رکعت پڑھنے میں مشغول ہوتے ہیں، تو شریعت اس مسئلہ میں کیا کہتی ہے؟

الجواب: حامداً ومصلیاً ومسلماً: مسجد اللہ کی عبادت اور ذکر و تلاوت کی پاکیزہ جگہ ہے، لہٰذا وہاں یہی کام

ہونے چاہئے۔ وہاں لغو باتیں اور شور شرابہ کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز مسجد اشیاء کے اشتہار دینے یا اعلان کرنے کی جگہ نہیں ہے، اور جماعت خانہ کے باہر یہ مقصد بخوبی حاصل ہوسکتا ہے۔ گم شدہ اشیاء کے اعلان سے بھی حدیث شریف میں صاف طور پر منع فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا اس رواج کو بند کرنا چاہئے۔ اور اگر اعلان کرنا ضروری ہوتو جماعت خانہ سے باہر نماز سے قبل یا بعد میں بھی اعلان ہوسکتا ہے، اور اگر مسبوق کو اس کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہوتو ایسا کرنا ناجائز ہے اور ایسا کرنے سے گناہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ دینیہ: ۲/۲۰۹)۔

سوال وجواب سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ یہ غیر ضروری اعلانات کے بارے میں ہے، ہاں اگر ہر قسم کا اعلان مراد ہوتو تبلیغی جماعت کے پروگرام کے اعلان ہوتے رہتے ہیں اور کسی نے منع نہیں کیا، یا یہ کہ حضرت مفتی صاحب کے جواب کو مبنی بر احتیاط قرار دیں گے۔ باقی مذکورہ بالا حوالہ جات کی روشنی میں مختصر ضروری اعلانات کی گنجائش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

قعدۂ اولیٰ میں درود پڑھنے والے شافعی امام کے پیچھے حنفی مقتدی کی نماز کا حکم:

سوال: اگر کوئی حنفی شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھے اور امام قعدۂ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود شریف بھی پڑھتا ہے جبکہ حنفی کو تشہد کے بعد فوراً کھڑا ہونا چاہیے، تو کیا اس صورت میں حنفی مقتدی کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب: شافعیہ کے یہاں قعدۂ اولیٰ میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھنے کے بارے میں دو اقوال ہیں؛ ایک قول کے موافق درود شریف پڑھنا چاہیے اور اس کے ترک پر سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے، اِس قول کے پیش نظر اگر شافعی امام نے درود شریف پڑھا تو چونکہ مقتدی کے نزدیک مخالف مذہب امام کی نماز مفسدات سے خالی اور فرائض پر مشتمل ہے اس لیے اس کے پیچھے حنفی مقتدی کی نماز درست ہوجائیگی۔

قعدۂ اولیٰ میں درود شریف پڑھنا شافعیہ کی کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔ چند عبارات ملاحظہ کیجیے:

قال الإمام الشافعي في الأم: والتشهد والصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم في التشهد الأول في كل صلاة غير الصبح تشهدان تشهد أول وتشهد آخر، إن ترك التشهد الأول والصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم في التشهد الأول ساهياً لا إعادة عليه وعليه

سجدتا السهو . (كتاب الام : ۱/ ۱۴۰ ،باب التشهدو الصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم،ط:دار الفكر).

وفي التنبيه في الفقه الشافعي: وإن كان في صلاة هي ثلاث ركعات أو أربع جلس بعد الركعتين مفترشاً وتشهد وصلى على النبي صلى الله عليه وسلم وحده في أحد القولين ولا يصلي في الآخر . (التنبيه فى الفقه الشافعي: ۱/ ۳۲).

(وكذافي البيان في مذهب الامام الشافعي،واللباب في الفقه الشافعي : ۱/ ۱۵۲).

اقتداء بالمخالف کے بارے میں فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلد دوم میں،ص۳۵۸سے ۳۶۳تک (طبع، بمبئی) مفصل فتویٰ موجود ہے۔ مزید دلائل کے لیےاس کی مراجعت مفید ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

وتر پڑھنے والے کے پیچھے تراویح کی نیت سے اقتدا کرنے سے وتر کا حکم:

سوال: ایک شخص مسجد میں ایسے وقت پہنچا کہ وتر کی جماعت چل رہی تھی اس نے سوچا کہ تراویح کی نماز ہے،تو تراویح کی نیت سے شریک ہوگیا،جب امام تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوا تب معلوم ہوا کہ یہ وتر کی نماز ہے،تو اب اس شخص کی وتر کی نماز ہوئی یا نہیں؟ یاد رہے یہ شخص فرض پڑھ چکا تھا۔

الجواب: شخص مذکور کی وتر کی نماز نہیں ہوئی ،پس اس کو چاہیے کہ ایک اور رکعت ملا دے اور یہ چار رکعتیں نفل ہو جائیں گی ،اور وتر دوبارہ پڑھ لے۔ملاحظہ ہو شرح المنیہ میں مذکور ہے:

اقتدى به على ظن أن الإمام يصلي التراويح فإذا هو في الوتر يتمه معه ويضم رابعة ولو أفسدها لا شيء عليه . (غنية المتملى فى شرح منية المصلى ،ص: ۴۱۰،ط:سهيل اكيڈمى).

فتاویٰ رحیمیہ میں منقول ہے:

صورتِ مسئولہ میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد چوتھی رکعت شامل کر کے نماز کو تمام کرے اور یہ چار رکعت نفل ہو جائیں گی ،وتر ابھی ذمہ باقی رہیں گے ان کو ادا کرنا ہوگا۔(فتاویٰ رحیمیہ:۳/ ۳۰۹)۔واللہ ﷻ اعلم۔

نماز میں قراءت کے صحیح ہونے کی حد:

سوال: نماز میں قراءت فرض بھی ہے، اور واجب بھی، تو اگر منفرد یا کوئی عورت اپنی انفرادی نماز میں صرف ہونٹ ہلا کر قراءت کرے اور اس کی آواز کانوں تک نہ پہنچے تو یہ قراءت معتبر ہوگی یا نہیں؟

الجواب: مذہبِ احناف میں اکثر مشائخ کے نزدیک سری قراءت کی حد یہ ہے خود اپنی آواز اپنے کانوں تک پہنچ جائے، فقط ہونٹ کا ہلانا کافی نہیں، ہاں امام کرخیؒ کے نزدیک تصحیح الحروف سے قراءت متحقق ہوجاتی ہے، لیکن اکثر مشائخ کے قول پر فتویٰ ہے، لہٰذا تصحیح حروف کافی نہیں۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

ذهب الكرخيؒ إلى أن أدنى الجهر أن يسمع نفسه وأدنى المخافتة تصحيح الحروف وفى البدائع ما قاله الكرخى أقيس وأصح وفي كتاب الصلاة لمحمد إشارة إليه فإنه قال: إن شاء قرأ في نفسه وإن شاء جهر وأسمع نفسه، وأكثر المشايخ على أن الصحيح أن الجهر أن يسمع غيره والمخافتة أن يسمع نفسه وهو قول الهندواني. (البحر الرائق: ۱/۳۳۶، ط: کوئٹہ).

قال فى الفتاوى الهندية: وأما حد القراءة فنقول: تصحيح الحروف أمر لا بد منه فإن صحَّح الحروف بلسانه ولم يسمع نفسه لا يجوز وبه أخذ عامة المشايخ هكذا فى المحيط و هو المختار هكذا فى السراجية وهو الصحيح هكذا فى النقاية. (الفتاوى الهندية: ۱/۶۹).

درر الحکام میں منقول ہے: **والمخافتة إسماع نفسه هذا مختار الهندواني وقال الكرخيؒ: الجهر إسماع نفسه المخافتة تصحيح الحروف، لأن القراءة فعل اللسان لا الصماخ والأول أصح.** (درر الحکام: ۱/۸۲، ط: استنبول).

(وكذا فى تبيين الحقائق: ۱/۱۲۷، ط: امدادیہ، ملتان، ورد المحتار مع الدر المختار: ۱/۵۳۴، وحاشية الطحطاوى على الدر المختار: ۲۳۴، ومجمع الانهر: ۱/۱۰۴).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

اگرا تنا آہستہ پڑھا کہ حروف تو صحیح ادا ہو گئے لیکن آواز بالکل نہیں سنائی دی تو کرخیؒ اور ابو بکر بلخیؒ کے نزدیک نماز صحیح ادا ہو گئی، اور ہندوانیؒ اور فضلیؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہوئی، کیونکہ ان کے نزدیک تصحیح حروف کافی نہیں بلکہ آواز کا کان تک پہنچنا بھی ضروری ہے اور شیخ الاسلام وقاضی خان وصاحبِ محیط وحلوانی نے ہندوانی کے قول کو اختیار کیا ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۷/۴۶، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کھانا کھانے کے فوراً بعد نماز پڑھنے سے کچھ پانی منہ میں آجائے تو نماز کا حکم:

سوال: ایک شخص نے نمازِ مغرب سے قبل کھانا کھایا، نماز میں جب سجدہ میں گیا تو ڈکار آئی اور ڈکار کے ساتھ کچھ پانی بھی منہ میں آیا، اس نے پانی کو ایک طرف پھینک دیا اور نماز جاری رکھی، کیا نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب: منہ میں آنے والا پانی اگر معدہ سے آیا ہے اور منہ بھر کر ہے تو وضو بھی ٹوٹ گیا اور نماز بھی جاتی رہی، وضو کر کے از سر نو نماز پڑھی جائے، لیکن اگر منہ بھر کر نہیں تھا یا گلے سے نکلا تھا معدہ سے نہیں آیا تو وضو اور نماز دونوں باقی ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ملاحظہ ہو درمختار میں مرقوم ہے:

وينقضه قيء ملأ فاه، بأن يضبط بتكلف من مرة ...أو طعام أو ماء، إذا وصل إلى معدته وإن لم يستقر، وهو نجس مغلظ، ولو من صبي ساعة ارتضاعه، هو الصحيح لمخالطة النجاسة، ذكره الحلبي ولو هو في المرئى فلا نقض اتفاقاً كقيء حية أو دود كثير لطهارته في نفسه كماء فم النائم فإنه طاهر مطلقاً به يفتى.

وفي الشامية: قوله وهو نجس مغلظ هذا ما صرحوا به في باب الأنجاس وصحح في المجتبى أنه مخفف قال في الفتح ولا يعرى عن إشكال وتمامه في النهر، قوله هو الصحيح مقابلة ما في المجتبى عن الحسن أنه لا ينقض لأنه طاهر حيث لم يستحل وإنما اتصل به قليل القيء فلا يكون حدثاً، قال في الفتح قيل: وهو المختار، ونقل في البحر تصحيحه عن المعراج وغيره، قوله ذكره الحلبي، أى في شرح المنية الكبير حيث قال: والصحيح ظاهر الرواية أنه نجس لمخالطة النجاسة وتداخلها فيه بخلاف البلغم، أقول:

وحيث صحح القولان فلا يعدل عن ظاهر الرواية ولذا جزم به الشارح . (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۱۳۷، ۱۳۸، سعید).

وللمزيد راجع : (البحر الرائق: ۱/۳۴، وحاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح، ص۸۸). واللہ ﷻ اعلم۔

مصلی کے سامنے سے بلاسترہ گزرنے کی ایک ترکیب اوراس کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص نمازی کے سامنے سے گزرنا چاہے اور گزرنا ضروری ہو لیکن کوئی سترہ وغیرہ نہ ہو، تو کیا سامنے کھڑا ہوکر آگے بڑھ کر گزر سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نمازی کے سامنے سے بلاسترہ گزرنا گناہ اور منع ہے لیکن اگر کوئی سترہ نہ ہو اور گزرنا ضروری ہو تو نمازی کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو جائے پھر آگے بڑھ کر چلا جائے۔

فتح الملہم میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ رقمطراز ہیں:

قوله : من أن يمر بين يديه ، ظاهر الحديث أن الوعيد المذكور يختص بمن مر ، لا بمن وقف عامداً — مثلاً — بين يدى المصلي، أوقعد، أو رقد ، لكن إن كانت العلة فيه التشويش على المصلي فهو في معنى المار ، قاله الحافظؒ فى الفتح . (فتح الملهم : ۳/۲۸۵، ط:دارالعلوم کراچی). (وكذا فى فتح البارى : ۱/۵۸۶).

اعلاء السنن میں ہے: **وكلام فقهائنا فى الفتاوى يفيد جواز الوقوف بين يديه .** (اعلاء السنن : ۵/۸۲، ط:ادارة القرآن).

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ نمازی کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے۔ نیز دو آدمی گزرنا چاہیں تو ایک نمازی کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا اس کی آڑ میں گزر جائے پھر پہلا شخص اسی طرح کر لے، اور دونوں گزر جائیں۔ فتاویٰ شامی میں مذکور ہے:

ولو مر اثنان يقوم أحدهما أمامه ويمر الآخر ويفعل الآخر هكذا يمران. (فتاوى الشامي: ۱/۶۳۶، سعيد) . (وكذا فى الفتاوى الهندية: ۱/۱۰۴).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

اگر دو شخص گزرنا چاہیں تو ان میں سے ایک شخص نمازی کے سامنے پیٹھ کر کے کھڑا ہو جائے اور دوسرا شخص اس کی آڑ میں گزر جائے پھر پہلا شخص اسی طرح کرے اور دونوں اس طرح گزر جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نمازی کے آگے بیٹھا ہوا آدمی اُٹھ کر چلا جائے تو مضائقہ نہیں، امداد الفتاویٰ میں ایسا ہی ہے۔(عمدۃ الفقہ: ۲/۲۷۶)۔

احسن الفتاویٰ میں لکھا ہے کہ نمازی کے سامنے بیٹھا ہوا شخص اُٹھ کر جاسکتا ہے۔(احسن الفتاویٰ:۳/ ۴۰۸)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

نماز میں چھینک آنے پر کونسا ہاتھ منہ پر رکھے؟

سوال: اگر کسی کو نماز میں چھینک آجائے تو کونسا ہاتھ منہ پر رکھنا چاہیے؟ دایاں یا بایاں، یا رکھنا ہی نہ چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر بحالتِ قیام چھینک آجائے تو دایاں ہاتھ منہ اور ناک پر رکھے اور اگر کسی دوسرے رکن میں یہ ضرورت پیش آئے تو بایاں ہاتھ استعمال کرنا چاہیے۔ فقہاء کرام نے جمائی کے بارے میں لکھا ہے کہ نماز میں جمائی آئے تو حالتِ قیام میں داہنا ہاتھ منہ پر رکھے اور باقی ارکان میں بایاں ہاتھ استعمال کرے، اسی سے چھینک کا حکم معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حدیث میں دونوں کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے کہ جمائی اور چھینک نماز میں شیطانی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ملاحظہ ہو طبرانی معجم کبیر کی روایت میں ہے:

عن عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: التثاؤب والعطاس فی الصلاۃ من الشیطان . (المعجم الکبیر: ۷/ ۹۲۳۹). قال الھیثمی: رواہ الطبرانی فی الکبیر، ورجالہ موثقون .(مجمع الزوائد: ۲/ ۲۴۳، باب التثاؤب).

چھینک آنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول منہ مبارک پر ہاتھ یا کپڑا رکھنے کا تھا۔ ملاحظہ ہو:

عن أبي ھریرۃ رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال: کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، إذا عطس وضع یدہ أو ثوبہ علی فیہ وخفض أوغض من صوتہ. إسنادہ قوي . (سنن أبي داود: ۴/ ۳۰۷/ ۵۰۳۱). وکذا فی مسنداحمد: ۱۵/ ۲۱۲).

فقہاءِ کرام کی عبارات ملاحظہ کیجیے: قال فی حاشیة الطحطاوی: یکرہ التثاؤب ،لأنہ من التکاسل والامتلاء فإن غلبہ فلیکظم ما استطاع ولو بأخذ شفتہ بسنہ وبوضع ظھر یمینہ أو کمہ فی القیام ویسارہ في غیرہ لقولہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إن اللّٰہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب فإن تثاءب أحدکم فلیردہ ما استطاع ولا یقول ھاہ ھاہ فإنما ذلکم من الشیطان یضحک منہ، وفي روایة فلیمسک یدہ علی فمہ فإن الشیطان یدخل فیہ . (حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ،ص۳۵۳، ط: قدیمی کتب خانہ).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: (الدرالمختار: ۱/۶۴۵،سعید، والنھرالفائق: ۱/۲۸۲، وبدائع الصنائع: ۱/۲۱۵،سعید، والمحیط البرھانی: ۱/۳۵۲،والمبسوط: ۱/۳۹،والبنایة: ۲/۴۴۶). واللّٰہ ﷻ اعلم۔

نماز میں ” السلام علیک أیھا النبی “ خطاب کے صیغہ کا مطلب:

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ” السلام علیک أیھا النبي “ پڑھتے تھے تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟ کیونکہ خطاب تو بظاہر کسی اور مخاطب سے ہوتا ہے؟ نیز کیا کسی حدیث سے یہ معراج والا قصہ ثابت ہے؟ یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں قولی ،بدنی اور مالی عبادات پیش فرمائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ’’السلام علیک ایہا النبی‘‘ پیش کیا گیا، یہ قصہ ثابت ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ” السلام علیک أیھا النبي “ واقعہ معراج کی حکایت کے طور پر پڑھتے تھے اور ہم لوگ اس کو حکایت تسلیم کرکے بطورِ انشاء اپنی طرف سے سلام بھیجنے کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ ارشاد الساری میں مرقوم ہے:

السلام أی السلامة من المکارہ ، أوالسلام الذي وجہ إلی الرسل والأنبیاء أوالذی سلمہ اللّٰہ علیک لیلة المعراج . (إرشاد الساری: ۲/۱۲۹،ط:مصر).

وقال فی نخب الأفکار: وقال الشیخ حافظ الدین: یعنی السلام الذی سلمہ اللّٰہ علیک لیلة المعراج . (نخب الافکار:۳/۱۰۹،ط:الوقف المدنی دیوبند).

الجوهرة النيرة میں مرقوم ہے:

أی ذلک السلام الذي سلمه اللّٰه عليک ليلة المعراج فهذا حكاية عن ذلک السلام لا ابتداء السلام ومعنى السلام أى السلامة من الآفات. (الجوهرة النيرة: ۱/۶۵،امدادیہ،ملتان).

قال في العناية : وقوله : السلام عليک: حكاية السلام الذى رده اللّٰه تعالىٰ على نبيه عليه السلام ليلة المعراج لما أثنى على اللّٰه بثلاثة أشياء رد اللّٰه عليه في مقابلها ثلاثة أشياء السلام بمقابلة التحيات ، والرحمة بمقابلة الصلوات ، والبركة بمقابلة الطيبات . (العناية بهامش فتح القدير: ۱/۳۱۴، باب صفة الصلاة، ط: دارالفكر).

علامہ حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ حکایت کی نیت نہ کرے بلکہ انشاء کی نیت کرے۔

ملاحظہ ہو درمختار میں مرقوم ہے: **لا الإخبار عن ذلک ذكره فى المجتبى وظاهره أن ضمير علينا للحاضرين لا حكاية سلام اللّٰه تعالىٰ . وفى الشامية: قوله :لا الإخبار عن ذلک ، أى لايقصد الإخبار والحكاية عما وقع فى المعراج منه ومن ربه سبحانه ومن الملائكة عليهم السلام وتمام بيان القصة مع شرح ألفاظ التشهد فى الإمداد فراجعه .** (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۵۱۰،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

شامی کا قول اقرب معلوم ہوتا ہے، خطاب حاضر وناظر جان کر نہیں بلکہ اس اعتقاد کے ماتحت ہے کہ ملائکہ کے ذریعہ سے پیش کیا جائے، جیسا کہ خط میں کسی کو خطاب کیا جاتا ہے اور یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ مکتوب الیہ حاضر ہے بلکہ یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ ڈاک کے ذریعہ سے یہ خط مکتوب الیہ کے پاس پہونچ جائے گا، حدیث شریف میں موجود ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ملائکہ مقرر فرما رکھے ہیں جو درود وسلام پہونچاتے ہیں'' البتہ روضہ اقدس پر حاضر ہو کر جو درود وسلام پڑھا جائے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود سنتے ہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ:۵/۶۳۳، جامعہ فاروقیہ)۔

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے:

السلام علیک ایہا النبی بلکہ پورا تشہد انشاءً پڑھا جاتا ہے... دربارِ سلطانی سے واپس ہوتے وقت کچھ

نذرانہ پیش کرنے کا دستور ہے، اس لیے مصلی التحیات للہ والصلوات والطیبات کا نذرانہ پیش کرتا ہے پھر یکایک خیال آتا ہے کہ یہ قربِ الٰہی ومناجات بالرب صرف سیدالکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مسعود کی بدولت ہے، ہدایت کا ذریعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا وجود ہے تو بے ساختہ مصلی اپنے محسن اعظم ومنعم اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتا ہے، باقی یہ اعتراض بالکل لغو ہے کہ جب حضورِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاضر نہیں تو خطاب بے فائدہ ہوا، اس لیے کہ صلوٰۃ وسلام بذریعہ ملائکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچتا ہے جیسا کہ خط میں صیغ خطاب صرف اس لیے لکھے جاتے ہیں کہ خط مخاطب تک پہنچے گا، مخاطب روبرو موجود نہیں ہوتا۔ (احسن الفتاویٰ: ۳/ ۴۸)۔

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

اور ضروری ہے کہ تشہد کے لفظوں کے معنی کا اپنی طرف سے ارادہ کرے یعنی یوں ارادہ کرے کہ وہ اللہ پر تحیہ بھیجتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اپنے نفس پر اور اولیاء پر سلام بھیجتا ہے۔ واقعہ معراج کی حکایت مدِ نظر نہ ہو۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/ ۹۹)۔

جواب: (۲) شبِ معراج کا واقعہ کتبِ حدیث میں نہیں ملتا، ہاں فقہاء ذکر کرتے ہیں لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے، جبکہ واقعہ معراج صحیحین میں مفصل مذکور ہے، نیز اس میں اس معروف تشہد کا بھی ذکر نہیں پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تشہد سکھایا تب بھی اس کا ذکر نہیں فرمایا۔

ملاحظہ ہو بعض مفسرین نے بلا سند ذکر کیا ہے:

قوله تعالىٰ: سلام قولاً من رب رحيم، يٰس: ۵۸، فقالوا: يشير إلى السلام الذى سلمه اللّٰه على حبيبه عليه السلام ليلة المعراج إذ قال له: السلام عليک أيها النبي ورحمة اللّٰه و بركاته، فقال في قبول السلام: السلام علينا وعلى عباد اللّٰه الصالحين، انتهى، انظر: (روح البيان: ۳/ ۳۰، ط: داراحياء التراث العربى).

تفسیر قرطبی میں مرقوم ہے:

فإما من قال: إنها كانت فى ليلة المعراج، قال: لما صعد النبى صلى اللّٰه عليه وسلم، و بلغ فى السموات في مكان مرتفع، ومعه جبريل حتى جاوز سدرة المنتهى، فقال له

جبـريـل: أنـي لـم أجـاوز هـذا الـمـوضع ، ولم يؤمر بالمجاوزة أحد هذا الموضع غيرک ، فـجـاوز الـنبي صلى الله عليه وسلم حتى بلغ الموضع الذي شاء الله ، فأشار إليه جبريل بأن سلّم عـلـى ربک، فـقـال النبي صلى الله عليه وسلم: التحيات لله والصلوات والطيبات ، فـقـال الله تعالىٰ: السلام عليک أيها النبي ورحمة الله وبركاته ، فأراد النبي صلى الله عليه وسلم أن يكون لأمته حظ في السلام فقال: السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين ، فقال جبـريـل: وأهل السموات كلهم: أشهد أن لا إله إلا الله ، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله .
(تفسير القرطبی : ۳/۴۲۵، الرياض،السعودية،وتفسير السمرقندی : ۱/۱۸۹).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (شرح سنن ابی داود للعینی :۴/ ۲۳۸،ومرقاۃ المفاتیح:۲/۷۳۲،وانوار الباری:۱۶/ ۴۲۳،وتحفۃ القاری:۳/ ۱۵۹،وامداد الفتاح شرح نور الایضاح،ص۳۲۳-۳۲۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

عبادات بزبانِ عربی انجام دینے کی حکمت:

سوال: مسلمان جوعبادات؛ مثلاً: نماز،تلاوت،ذکراور ادعیہ وغیرہ پڑھتے ہیں وہ عربی زبان میں کیوں ہے؟ اپنی ملکی اور مقامی زبان میں کیوں نہیں کرتے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عربی زبان چند ایسی خصوصیات کی حامل ہے جو دیگر زبانوں سے حاصل نہیں ہوتیں،اور اگر دوسری مقامی زبان میں عبادات انجام دینے کی کوشش کریں گے تو اس میں بہت بڑا فرق واقع ہوگا جس کی وجہ سے الفاظ اور معانی میں تحریف اور تبدیلی کا قوی اندیشہ ہے،جیسے قلب کو اگر انگریزی میں منتقل کریں گے تو کلب بن جائیگا اور قلب کے معنی دل اور کلب کے معنی کتے کے ہیں۔

نیز عربی الفاظ معانی کا سمندر ہوتے ہیں ایک لفظ کے کئی معانی ہوتے ہیں دوسری زبان میں ترجمہ سے اس کا لحاظ باقی نہیں رہے گا۔جواہر الفقہ میں مذکور ہے:

جہاں تک تحقیق سے معلوم ہوا،ان سب عجمی زبانوں میں بہت سے وہ حروف بالکل نہیں ہیں،جو عربی زبان اور قرآن میں موجود ہیں،مثلاً: ذ،ز،ظ،ض،انگریزی،ہندی،ٹامل،گجراتی زبانوں میں ان حروف کے لیے

علیحدہ علیحدہ کوئی صورت تجویز نہیں کی گئی بلکہ سب کو ایک ہی نقش سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ ان حروف کے فرق سے معانی بہت بدل جاتے ہیں۔(جواہر الفقہ :۲/ ۸۹،رسالہ:تحذیر الانام عن تغییر رسم الخط من مصحف الامام)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

(۱)عربی میں ح اور ھ میں فرق ہے گجراتی میں نہیں ہے،(۲)عربی میں ق اور ک میں فرق ہے گجراتی میں نہیں ہے،(۳)عربی میں ہمزہ اور ع الگ الگ ہیں گجراتی میں نہیں (۴)عربی میں ت اور ط جدا جدا ہیں گجراتی میں نہیں۔(۵)عربی میں س اور ص اور ث میں فرق ہوتا ہے گجراتی میں نہیں۔مطلب یہ ہے کہ عربی میں جس طرح ھ اور ح ،ق اور ک ، ع اور ء،اور ت اور ط ،س اور ص، ث اور ذ ،ض ،ز ،ظ کے رسم الخط اور ادائیگی میں نمایاں فرق ہے۔یہ فرق اور امتیاز گجراتی میں نہیں ہے،اگر علامتیں مقرر کی جائیں پھر بھی ناقص ہیں،جس میں تحریر اور رسم الخط کی تحریف کے ساتھ ساتھ ادائیگی میں نمایاں فرق ظاہر ہوگا جس سے بیسیوں غلطیاں اور غلط تلفظ سے حروف میں تبدیلی آنے کی وجہ سے مطلب بھی بدل جائے گا،اور ثواب کی جگہ عقاب اور رحمت کی جگہ لعنت کا حقدار ہوگا،جیسا کہ مشہور فرمان ہے:رب تالٍ للقرآن، والقرآن يلعنه یعنی بہت سے قرآن کے تلاوت کرنے والے ایسے ہیں جن پر قرآن لعنت کرتا ہے۔(فتاویٰ رحیمیہ :۲/ ۱۵۹،ط:الاحسان،دیوبند)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان دس منٹ کے فصل کا حکم:

سوال: کیا عام دنوں میں یعنی رمضان المبارک کے علاوہ ایام میں مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان دس منٹ کا فاصلہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مغرب کی نماز میں تعجیل مسنون ہے،اذان واقامت کے درمیان تھوڑا سا فصل بقدر چھوٹی تین آیتیں ہونا چاہیے،ہاں رمضان المبارک میں افطاری کی وجہ سے کچھ فصل مضر نہیں۔البتہ عام دنوں میں جلدی پڑھنا بہتر ہے۔ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مرقوم ہے:

ويجلس المؤذن بين الأذان والإقامة على وجه السنية إلا في المغرب فلا يسن الجلوس بل السكوت مقدار ثلاث آيات قصار أو آية طويلة أو مقدار ثلاث خطوات وهذا

عند أبي حنيفةؒ وقالا: يفصل أيضاً في المغرب بجلسة خفيفة قدر جلوس الخطيب بين الخطبتين وهي مقدار أن تتمكن مقعدته من الأرض بحيث يستقر كل عضو منه في موضعه . (البحر الرائق: ١/٢٦١، ط: كوئٹه).

وفي فتح القدير: قوله ويستحب تعجيل المغرب بأن لا يفصل بين الأذان والإقامة إلا بجلسة خفيفة أو سكتة على الخلاف الذي سيأتي وتأخيرها لصلاة ركعتين مكروه وهي خلافية و سنذكر في باب النوافل إن شاء اللّٰه تعالىٰ قال في القنية إلا أن يكون قليلاً . (فتح القدير: ١/٢٢٧، دار الفكر).

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: ويستحب تعجيل صلاة المغرب صيفاً و شتاءً ولا يفصل بين الأذان والإقامة فيه إلا بقدر ثلاث آيات أو جلسة خفيفة لصلاة جبريل عليه السلام بالنبي صلى الله عليه وسلم بأول الوقت في اليومين وقال عليه الصلاة والسلام: إن أمتي لن يزالوا بخير ما لم يؤخروا المغرب إلى اشتباك النجوم ، مضاهاة لليهود فكان تأخيرها مكروهاً إلا في يوم غيم ، وإلا من عذر سفر أو مرض وحضور مائدة والتأخير قليلاً لا يكره . (مراقي الفلاح، ص١٨٣، ط: قديمي). وللمزيد راجع : الفتاوى الهندية : ١/٥٧ ، وكفايت المفتی:٣/٢٤٧، وآپ کے مسائل اوران کا حل:٣/٣٠٦)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نمازِ فجر گھر پر پڑھنے کا معمول بنانے کا حکم:

سوال: کیا میں فجر کی نماز مسجد میں نہ پڑھنے کی وجہ سے گنہگار رہوں۔ میں اپنا کام شروع کرتا ہوں دس بجے سے آٹھ بجے تک، میں بہت تھک جاتا ہوں اور فجر کی نماز کے لیے مسجد نہیں جاتا کیونکہ میں بہت سست ہوں اور اپنی نیند میں کمی نہیں کرنا چاہتا تاکہ کام میں کمی واقع نہ ہو، میرا سوال یہ ہے کہ میں گنہگار رہوں؟ کیا مجھے وہی مسجد والا ثواب ملے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بلا عذرِ شرعی مسجد کی جماعت کو ترک کرنا بہت بڑے ثواب سے محرومی کی بات ہے، سستی اور

تکان کوئی عذر نہیں جس کی وجہ سے مسجد کی جماعت ترک کی جائے، لہٰذا توبہ اور استغفار کرنے کے بعد اب سے روزانہ فجر کی نماز مسجد میں جماعت سے پڑھنے کا اہتمام کریں۔ نماز با جماعت کی فضیلت ملاحظہ ہو:

عن عبد الله بن عمر رضي الله عنه أن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم قال: صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة. (صحیح البخاری: ۱/۱۳۱، ۶۴۵).

باجماعت نماز تنہا نماز پر ستائیس درجہ فضیلت رکھتی ہے۔

اور مسجد میں جماعت سے نماز پڑھنے کے اور بھی فضائل احادیث میں مذکور ہے، مثلاً: سات آدمی عرش کے سایہ میں ہوں گے، ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہو، جب نکلتے ہیں تو واپس آنے کا سوچتے ہیں، اور ان دو صحابہ کا واقعہ تو مشہور ہے کہ مسجد میں نماز پڑھنے کے بعد سخت اندھیرے میں ان کی لاٹھیوں سے روشنی نکلتی تھی، اور جو صبح وشام مسجد میں جاتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مہمانی کا انتظام فرمائیں گے، اور جب صرف نماز کی نیت سے مسجد کی طرف نکلتا ہے تو اس کا درجہ بلند ہوتا ہے اور گناہ مٹا دیے جاتے ہیں، پھر جب نماز پڑھ کر فارغ ہو جاتا ہے تو فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا مانگتے ہیں، یہ سب فضائل کتبِ احادیث میں مذکور ہیں۔ مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا، جلد دوم، ص۲۹۷، ط: بمبئی)۔

جان بوجھ کر بلا عذر نماز با جماعت ترک کرنے کی وعید ملاحظہ ہو:

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: والذي نفسي بيده لقد هممت أن آمر بحطب فيحطب ثم آمر بالصلاة فيؤذن لها ثم آمر رجلاً فيؤم الناس ثم أخالف إلى رجال فأحرق عليهم بيوتهم والذي نفسي بيده لو يعلم أحدهم أنه يجد عرقاً سميناً أو مرماتين حسنتين لشهد العشاء. (صحیح البخاری: ۹/۸۲/۲۲۴).

اس حدیث میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا عذر گھروں میں نماز پڑھنے والوں کے گھروں کے جلانے کا ارادہ فرمایا، یہ بڑی خطرناک وعید ہے۔

درمختار میں ہے: **و الجماعة سنة مؤكدة للرجال، قال الزاهدي: أرادوا بالتأكيد الوجوب وقيل: واجبة وعليه العامة، فتسن أو تجب، ثمرته تظهر فى الإثم بتركها مرة،**

علی الرجال العقلاء البالغین الأحرار القادرین علی الصلاة بالجماعة من غیر حرج. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۵۵۲،سعید).

وفی البحر: و صرح فی المحیط: بأنه لا یرخص لأحد في ترکها بغیر عذر حتی لو ترکها أهل مصر یؤمرون بها فإن ائتمروا وإلا یحل مقاتلتهم . (البحرالرائق: ۱/۳۶۵،دارالمعرفة ، وکذا فی الفتاوی الهندیة: ۱/۸۲).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

بلاعذر شرعی مسجد کی نماز چھوڑ کر گھر پر ہی پڑھنا بہت بڑی محرومی ہے اور اسلام کے بڑے شعار کو ترک کرنا ہے حدیث شریف میں اس پر سخت وعید ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۶/۴۰۸،جامعہ فاروقیہ)۔

امدادالاحکام میں مذکور ہے: جماعت سے نماز پڑھنا سنتِ مؤکدہ قریب واجب ہے لہٰذا بلاعذر اس کا چھوڑنا گناہ ہے اور ترکِ جماعت کا عادی ہونا فسق ہے،ایسا شخص شرعاً فاسق ہے۔(امدادالاحکام:۱/۵۲۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ورزش کی نیت سے نماز پڑھنے کا حکم:

سوال: کیا میں نماز میں چھوٹی سورت پڑھ سکتا ہوں کہ رکوع سجدے زیادہ سے زیادہ ہوں اور اس سے میرا بدن ہلکا پھلکا ہوجائے کیونکہ امریکہ میں مجھے ڈاکٹر نے بتایا کہ نماز میں ہر قسم کی ایکسر سائز ہے؟

الجواب: نماز ایک عظیم ترین عبادت ہے اور تمام عبادات میں افضل ہے،اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے،اسی مقصد اور نیت سے پڑھنی چاہیے،اور ورزش نماز کے علاوہ کرلینی چاہیے،اگرچہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ چھوٹی سورت یا تین چھوٹی آیات سے بھی نماز ہوجاتی ہے لیکن نماز میں ورزش کی نیت کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو درمختار میں نماز کے واجبات کے تحت مذکور ہے:

وضم اقصر سورة کالکوثر، أو ما قام مقامها وهو ثلاثة آیات قصار نحو:ثم نظر، ثم عبس وبسر، ثم أدبر واستکبر، وکذا لو کانت الآیة أو الآیتان تعدل ثلاثاً قصاراً ذکره الحلبی. (الدرالمختار: ۱/۴۵۸،سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

و تجب قراءة الفاتحة وضم السورة أو ما يقوم مقامها من ثلاث آيات قصار أو آية طويلة في الأوليين بعد الفاتحة كذا في النهر الفائق وفي جميع ركعات النفل والوتر، هكذا في البحر الرائق . (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۱).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

نماز کے کچھ واجبات ہیں کہ جن کے ترک سے نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن اس کا لوٹانا واجب ہوتا ہے جبکہ واجب کو دانستہ ترک کیا ہو یا سہواً ترک ہو گیا ہو اور سجدۂ سہو نہ کیا ہو...(۵) فرض نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں اور واجب (وتر) وسنت ونفل کی تمام رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی بہت چھوٹی سورت مثل سورۂ کوثر یا اس کے قائم مقام تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت یا دو آیتیں پڑھنا جو چھوٹی تین آیتوں کے برابر ہوں۔(عمدۃ الفقہ: ۲/ ۹۸، زوار اکیڈمی)۔(وکذا فی کتاب المسائل: ۱/ ۳۱۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

رکوع، سجدے کی تسبیحات نہ پڑھنے پر نماز کا حکم:

سوال: مجھے گرمی کے موسم میں فیور (یعنی تپ کا مرض جس میں مسلسل چھینکیں آتی ہیں) ہو جاتا ہے، ایک دفعہ نمازِ تراویح میں مسلسل چھینکیں شروع ہو گئیں کہ رکوع، وسجدے کی تسبیحات کہنے کا موقع نہ ملا، کیا میری نماز ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نماز میں رکوع، سجدے کی تسبیحات، سنن نماز میں سے ہیں، کسی عذر کی وجہ سے ترک ہو جائے تو نماز ہو جاتی ہے، نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، ہاں ویسے ہی سستی کی وجہ سے نہ پڑھنے سے کراہت پیدا ہوتی ہے، تاہم سجدۂ سہو لازم نہیں آتا۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

وأما من حيث الرواية فالأرجح السنية لأنها المصرح بها في مشاهير الكتب، وصرحوا بأنه يكره أن ينقص عن الثلاث وأن الزيادة مستحبة بعد أن يختم على وتر خمس أو سبع أو تسع ما لم يكن إماماً...وأن حكم السنة أن يندب إلى تحصيلها ويلام على تركها

مـع حـصـول إثـم يسيـر وهـذا يفيد أن كراهة تركها فوق التنزيه وتحت المكروه تحريماً .
(فتاوى الشامي: ۱/۴۹۴،سعيد).

عمدۃ الفقہ میں ہے: نماز میں اگر کوئی سنت بھولے سے چھوٹ جائے تو نہ نماز ٹوٹتی ہے نہ سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے اور نہ گناہ ہوتا ہے اور قصداً چھوڑ دینے سے نماز تو نہیں ٹوٹتی اور نہ سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے لیکن چھوڑ نے والا برائی اور ملامت کا مستحق ہوتا ہے۔ (عمدۃ الفقہ :۲/۱۰۲، ط: زوار اکیڈمی)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

نمازِ نفل میں متعدد نیتیں کرنے کا حکم:

سوال: (۱) کیا نمازِ نفل میں متعدد نیتیں کرنا درست ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر: تہجد کی نماز میں نمازِ حاجت، نمازِ استخارہ اور نمازِ توبہ وغیرہ کی نیت درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح اشراق اور چاشت کی نماز میں نمازِ استخارہ، نمازِ حاجت، وتوبہ کی نیت کرنا۔ اسی طرح نماز اوابین میں صلاۃ الحاجہ والاستخارہ وصلاۃ التوبہ کی نیت کرنا۔ نیز سنتِ قبلیہ میں تحیۃ المسجد کی نیت کرنا، (۲) نمازِ اشراق اور نمازِ چاشت میں کیا فرق ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: (۱) فقہاء کی عبارات کی روشنی میں نفل نماز میں متعدد نیتیں کرنا جائز اور درست ہے۔ چنانچہ سوال میں مذکورہ تمام صورتیں جائز ہیں۔ علامہ سید احمد طحطاویؒ فرماتے ہیں:

ثـم إنـه إن جـمـع بيـن عبـادات الـوسائل فى النية صح كما لو اغتسل لجنابة وعيد و جـمـعة اجتمعت ونال ثواب الكل وكما لو توضأ لنوم وبعد غيبة وأكل لحم جزور وكذا لو نـوى نـافـلتيـن أو أكثر كـمـا لو نوى تحية مسجد وسنة وضوء وضحى وكسوف . (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح،ص:۲۱۶ ، باب شروط الصلاة ، قديمى).

وأيـضـاً قـال فـى حـاشيتـه عـلـى الدرالمختار : وقد يجتمع نية أربع نوافل كنية تحية الـمسـجـد، وسـنـة الـوضـوء ، والـضـحـى والكسوف فيثاب عليها إلحاقاً بما ذكر . (حاشية الطحطاوى على الدر: ۱/۲۰۰،ط: كوئٹه).

وللمزيد راجع : (الاشباه والنظائر: ۱/۱۴۷،والدرالمختار: ۱/۴۴۰،سعيد).

جواب: (۲) محدثین اور فقہاء کے یہاں اشراق اور چاشت دونوں ایک ہی ہے، البتہ صوفیہ حضرات کے نزدیک دونوں علیحدہ علیحدہ نمازیں ہیں۔ اس طور پر کہ طلوعِ شمس سے زوال تک پورے وقت کے دو حصے کردیں تو نصفِ اول اشراق کا وقت ہے اور نصفِ ثانی چاشت کا وقت ہے۔

العرف الشذی میں مرقوم ہے: قال الفقهاء والمحدثون: إن صلاة الضحى وصلاة الإشراق واحدة إن صلى بمجرد ذهاب الوقت المكروه بعد الطلوع فصلاة إشراق و لو تأخر عنه بزمان فصلاة الضحى والعدد من اثنتين إلى ثنتى عشر ركعة والأفضل الأربع ، وأما السيوطى و على المتقى فإلى أن صلاة الضحى غير صلاة الإشراق ويفيدهما ما روى علی رضی اللہ عنہ أن النبي صلى الله عليه وسلم صلى الإشراق حين كانت الشمس من هاهنا مقدار ما يكون هاهنا وقت العصر ، وصلى الضحى حين كانت الشمس من هاهنا مقدار ما يكون هاهنا في آخر وقت الظهر و إسناده يبلغ مرتبة الحسن ، وقال ابن تيميه: إنه عليه الصلاة والسلام ما صلى الضحى إلا عند قفوله من السفر أوعند فوت صلاة الليل من عذر ، وأما الأحاديث القولية فصحيحة وأما الأحاديث الفعلية ففعله عليه الصلاة والسلام نادر . (العرف الشذى بهامش سنن الترمذى: ۱/۱۰۷،باب ماجاء فى صلاة الضحى ،ط: فيصل پبليكيشنز ديوبند).

بعض احادیث میں لفظ اشراق وارد ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو: عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: كنت أمر بهذه الآية فما أدري ماهي : بالعشى والإبكار، حتى حدثتني أم هانئى بنت أبي طالب ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم دخل عليها فدعا بوضوء في جفنة كأني انظر إلى أثر العجين فيها فتوضأ ثم قام فصلى الضحى، ثم قال: يا أم هانئى هي صلاة الإشراق . (المعجم الأوسط : ۱۳۵/۵/ ۴۲۴۶، والمستدرک: ۶۸۷۳/۶۲/۴ ،والاستذكار: ۸۳۲۴/۱۴۷/۲،ومجمع الزوائد: ۲۳۸/۲).

وعبد الله بن الحارث ، قال: دخلت على أم هانئى فحدثتني، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى صلاة الضحى، فخرجت فلقيت ابن عباسؓ فقلت: انطلق إلى أم هانئى فدخلنا عليها ، فقلت: حدثني ابن عمک عن صلاة النبي صلى الله عليه وسلم الضحى ،

فحدثته فقال: نؤول هذه الآية صلاة الإشراق، و هي صلاة الضحى. (المعجم الكبير: ۲۴/ ۴۲۵/ ۱۰۳۴). واللہ ﷻ اعلم۔

جمعہ کی اذانِ اول کا حکم:

سوال: جمعہ کے دن اذانِ اول کا کیا حکم ہے؟ یعنی ائمہ اربعہ کے نزدیک سنت ہے یا نہیں؟

الجواب: خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے مدینہ منورہ کے بازار میں مقامِ زوراء پر اذان جاری فرمائی، پھر اس کے بعد لوگ جمع ہو جاتے تو خطیب کے سامنے والی اذان کہی جاتی، اس پر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہوا، کسی نے انکار نہیں فرمایا، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید وتصدیق " **عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ** " کے ذریعہ شامل ہوئی، بنابریں ائمہ اربعہ کے یہاں اذانِ اول سنت یا مستحب قرار پائی۔

دلائل وحوالہ جات حسبِ ذیل ملاحظہ فرمایئے: بخاری شریف میں روایت ہے:

حدثنا آدم قال: حدثنا ابن أبي ذئب عن الزهري عن السائب بن يزيد قال: كان النداء يوم الجمعة أوله إذا جلس الإمام على المنبر على عهد النبي صلى الله عليه وسلم وأبي بكر وعمر رضي الله تعالىٰ عنهما فلما كان عثمان رضي الله تعالىٰ عنه وكثر الناس زاد النداء الثالث على الزوراء. قال أبوعبد الله: الزوراء: موضع بالسوق بالمدينة. (صحيح البخارى: ۹۱۲، باب الأذان يوم الجمعة).

قال العينيؒ: نعم هو أول في الوجود، ولكنه ثالث باعتبار شرعيته باجتهاد عثمان و موافقة سائر الصحابة له بالسكوت وعدم الإنكار، فصار إجماعاً سكوتياً. (عمدة القارى: ۵/ ۷۳، ط: دار الحديث، ملتان).

ترمذی شریف میں ہے:

عن العرباض بن سارية قال: وعظنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يوماً بعد صلاة

الـغداة موعظة بليغة ذرفت منها العيون و وجلت منها القلوب فقال رجل : إن هذه موعظة مـود ع فـماذا تعهد إلينا يا رسول اللّٰه ؟ قال: أوصيكم بتقوى اللّٰه والسمع والطاعة وإن عبد حبشـي فـإنـه مـن يـعش منكم يرى اختلافاً كثيراً وإياكم ومحدثات الأمور فإنها ضلالة فمن أدرک ذلک مـنـكـم فـعـليـكـم بسـنـتي وسـنـة الـخـلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بـالنواجذ. قال أبوعيسىٰ: هذا حديث صحيح . (سنن الترمذی،رقم:٢٦٧٦،باب ماجاء فی الاخذ بالسنة اجتناب البدع).

قـال السيـد الشـريف عـلـى فـي حـاشيته على المشكاة : إنما المراد تفخيم أمرهم ، وتـصـويـب رأيهـم ، والسيادة لهم بالتفوق على غيرهم ، وإنما ذكرسنتهم في مقابلة سنته ، لأنـه عـلـم أنهـم لا يـخطئون فيما يستخرجونه من سنته بالاجتهاد ، ولأنه علم أن بعض سنته لاتشتهـر إلا فـي زمـانهـم ، فـأضاف إليهم دفعاً لتوهم من ذهب إلى رد تلک السنة ، فأطلق القول باتباع سنتهم سداً لهذا الباب . (حاشية المشكاة: ١/١٩١).

اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ کا مسلک: احناف کا مذہب:

فـى الاختيـار فـي تـعـليـل المختار: فإذا أذن الأذان الأول توجهوا إلى الجمعة ، وإذا صـعـد الإمـام الـمنبر جلس، وأذن المؤذنون بين يديه الأذان الثاني، فإذا أتم الخطبة أقاموا. (الاختيار لتعليل المختار: ١/٩٠، دارالكتب العلمية بيروت).

وقال فى البناية : وإذا أذن المؤذنون الأذان الأول، ذكر المؤذنين بلفظ الجمع ، وإن كـان لا يـحتـاج إليـه إخراجاً للكلام مخرج العادة ، فإن المتوارث اجتماع المؤذنين بسمع أصواتهم إلى أطراف المصر الجامع ، وأراد بالأذان الأول الأذان الذي يؤذن على المئذنة ، وهـو الأذان الـذي أحـدث عـلـى الزوراء في عهد عثمان بن عفانؓ ، ولـم يـنكره أحد من المسلمين . (البناية :٣/١٠٣، ط: مكتبه رشيديه، كوئٹه).

مالکیہ کا مذہب:

في حاشية الدسوقي على الشرح الكبير: قوله وشمل، أى كلام المصنف الأذان الأول والثاني أى فإن كلا منهما سنة كذا في عبق [العلامة الشيخ عبد الباقى الزرقانى]قال بن [العلامة محمد البنانى]: والحكم على الأول فى الفعل بالسنية غير ظاهر لأنه لم يكن في زمن النبي صلى الله عليه وسلم وإنما أحدثه بعده سيدنا عثمان رضي الله عنه فهو أول فى الفعل ثانٍ فى المشروعية والظاهر أنه مستحب فقط، قال شيخنا وقد يقال لما فعله عثمان رضي الله عنه بحضرة الصحابة وأقروه عليه كان مجمعاً عليه إجماعاً سكوتياً فالقول بسنيته له وجه . (حاشية الدسوقي: ۱/۳۰۶،ط:دارالفکر،بیروت).

وفي إرشاد السالک : ولها أذانان : الأول على المنارة، والآخر بين يدى الإمام إذا جلس على المنبر فإذا فرغ أخذ في الخطبة . (ارشادالسالک الى اشرف المسالک فی فقه الامام مالک : ۱/۴۶،ط:الشرکة الأفریقیة).

شافعیہ کا مذہب:

العزيز شرح الوجيز میں مرقوم ہے: قال الائمة : ولم يكن على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا على عهد أبي بكر وعمر رضي الله تعالىٰ عنهما، للجمعة أذان قبل هذا الأذان فلما كان في عهد عثمان رضي الله عنه،كثر الناس وعظمت البلدة أمر المؤذنين بالتأذين على مكانهم، ثم كان يؤذن بين يديه إذا استوى على المنبر فثبت الأمر على ذلک . (العزیزشرح الوجیز:۴/۵۹۹).

وقال في فتح العلام: وهذا الأذان هو الذى كان في زمنه صلى الله عليه وسلم وزمن أبي بكر وعمر رضي الله تعالىٰ عنهما، وأما الأذان الذي قبل ذلک على المنارة فأحدثه عثمان وقيل معاوية رضى الله تعالىٰ عنهما، لما كثر الناس وهو بدعة حسنة كما قاله في نهاية الأمل لتوقف حضورهم عليه . (فتح العلام:۳/۷۷).

مذہبِ حنابلہ:

قال الشيخ ابن قدامة : والنداء الأول مستحب في أول الوقت ، سنة عثمان رضي اللّٰه تعالىٰ عنه وعملت به الأمة بعده، وهو للإعلام بالوقت ، والثاني للإعلام بالخطبة ، والثالث للإعلام بقيام الصلاة . (الشرح الكبير: ۱۸۸/۲،ط:دارالكتب العربی).

وفي الإنصاف في معرفة الراجح من الخلاف: قوله ثم يجلس إلى فراغ الأذان ، الصحيح المذهب: أن الأذان الأول مستحب . (الانصاف : ۳۹٦/۲). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

میدانِ عرفات میں جمعہ قائم کرنے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر جمعہ کے دن عرفہ ہو تو کیا حجاج عرفات میں جمعہ کی نماز ادا کریں گے؟ متقدمین کی فقہی عبارتوں سے عدم وجوب ثابت ہوتا ہے اور جمہور کا یہی قول ہے، لیکن جو حضرات عرفات کو مکہ میں داخل سمجھتے ہیں ان کے نزدیک جمعہ واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: عرفات صحراء یا جنگل ہے اس لیے میدانِ عرفات میں بالاتفاق جمعہ جائز نہیں۔ نیز شریعتِ مطہرہ نے جن مواقع کو مستقل اور الگ قرار دیا ہے ان سے متعلق احکام بھی علیحدہ علیحدہ ہوں گے، اور مکہ مکرمہ اور عرفات دونوں الگ الگ مقامات ہیں، لہٰذا ان کے احکام بھی جداگانہ ہیں۔ ملاحظہ ہو امام محمدؒ فرماتے ہیں:

وقال محمد : لا جمعة بمنا ولا جمعة بعرفات في قولهم جميعاً . (الجامع الصغير، ص ۱۱۲،عالم الكتب، وكذا فی الهداية: ۸۲).

وفي المحيط البرهاني: وقال محمدؒ: لا جمعة بمنى أجمع العلماء على أنه لا جمعة بعرفات لأنه مفازة و ليست بمصر، و ليست من أفنية المصر لأن بينها وبين مكة أربع فراسخ ، وإنما تقام الجمعة أما في المصر أو في فناء المصر . (المحيط البرهانی :۱۵٦/۲، باب صلاة الجمعة ،ط:دار احياء التراث العربی).

وفي الفتاوىٰ الهندية: ولا جمعة بعرفات اتفاقاً كذا في الكافي . (الفتاوى الهندية: ۱۴۵/۱).

الفقه الاسلامی وادلته میں مذکور ہے:

ولا جمعة بمنى وعرفة نصاً لأنه لم ينقل فعلها هناك . (الفقه الاسلامی وادلته : ۲/ ۲۶۹، دار الفكر).

موطا امام مالک میں مرقوم ہے:

قال مالكؒ في إمام الحاج : إذا وافق يوم الجمعة يوم العرفة أويوم النحر أوبعض أيام التشريق أنه لا يجمع في شيء من تلك الأيام . (موطا الإمام مالک : ۴۲۶، ط: آرام باغ کراچی).

کتاب المسائل میں ہے:

اگر یومِ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہو تو ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ میدان عرفات میں جمعہ کی نماز ادا نہیں کی جائے گی، بلکہ حسبِ معمول ظہر وعصر کی نماز ہی پڑھیں گے۔ (کتاب المسائل:۳/۳۰۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عیدین کے خطبہ کے لیے عیدگاہ میں منبر لے جانے کا حکم:

سوال: بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ عیدگاہ میں منبر لے جانا بدعت ہے، بلا منبر کے خطبہ دینا چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ اور میدان میں منبر لے جانے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اس بارے میں مختلف رہا ہے، کبھی آپ عیدین کا خطبہ منبر پر دیتے اور کبھی بلا منبر اور احیاناً کسی اونچے مقام پر دیتے تھے، بنا بریں میدان میں منبر لے جانا تاکہ خطیب اس پر خطبہ دے اور لوگ بہ سہولت خطیب کو دیکھ کر خطبہ سن سکے، درست اور جائز ہے اس کو بدعت کہنا درست نہیں۔ عیدین کا خطبہ منبر پر دینے سے متعلق چند احادیث اور آثار ملاحظہ کیجیے:

(۱) عن ابن عباس ﷺ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم: كان يخطب يوم الجمعة، ويوم الفطر، والأضحى على المنبر، فإذا سكت المؤذن يوم الجمعة قام فخطب . (المعجم الكبير للطبرانی: ۱۱/ ۲۰۹/ ۱۱۵۱۸)، **قال الهيثمي: فيه حسين بن عبد الله بن عبيد الله بن عباس ضعفه أحمد وابن المديني والبخاري والنسائي، وبقية رجاله موثقون.** (مجمع الزوائد: ۲/ ۱۸۳/ ۳۱۱۰)، (وكذا رواه البيهقی فی السنن الكبری، رقم: ۲۲۱۲، باب جلوس الامام حين يطلع على المنبر).

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ جمعہ وعیدین منبر پر دیتے تھے۔

(۲) عن ابن جريج (ثقة ، فقيه) قال: أخبرني عطاء (أحد الأعلام) ، عن جابر بن عبدالله الأنصاري قال: سمعته يقول: إن النبي صلى الله عليه وسلم قام يوم الفطر فصلى فبدأ بالصلاة قبل الخطبة ، ثم خطب الناس فلما فرغ نبي الله صلى الله عليه وسلم، نزل فأتى النساء فذكرهن ... (مصنف عبدالرزاق : ۳/۲۷۸/ ۵۶۳۱،وهكذا رواه ابن خزيمة فى صحيحه: ۱/ ۷۰۰، وباب الخطبة على المنبرفى العيدين ، وابن المنذر فى الاوسط : ۴/۲۸۵، باب ذكر الخطبة على المنبر فى العيدين ، والبيهقى فى السنن الكبرى :۶۲۰۵ ،باب من اباح ان يخطب على المنبراوعلى راحلته).

مذکورہ بالا روایت سے محدثین نے خطبہ علی المنبر کو ثابت کیا ہے اور مستقل باب قائم کیا "**باب الخطبة على المنبر فى العيدين**" اوراس کے تحت یہ روایت نقل کی ہے۔

صحابہ اور تابعین کے چند آثار ملاحظہ کیجیے:

(۳) عن وهب بن كيسان قال: شهدت ابن الزبير بمكة وهو أمير فوافق يوم فطر أو أضحى يوم الجمعة فأخر الخروج حتى ارتفع النهار فخرج وصعد المنبر فخطب وأطال ثم صلى ركعتين...هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه. (المستدرك : ۱/۲۹۵/ ۱۰۹۷).

(۴) عن أبي سعيد الخدري، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج يوم الفطر و يوم الأضحى إلى المصلى، فأول شيء يبدأ به الصلاة ،ثم ينصرف فيقوم مقابل الناس، والناس جلوس على صفوفهم فيعظهم ، ويوصيهم ، ويأمرهم...قال أبوسعيد: فلم يزل الناس على ذلك حتى خرجت مع مروان ، وهو أمير المدينة ، في أضحى أو فطر، فلما أتينا المصلى إذا منبر بناه كثير بن الصلت، فإذا مروان يريد أن يرتقيه قبل أن يصلي ...الخ.
(رواه البخارى،رقم:۹۵۶، باب الخروج الى المصلى بغيرالمنبر).

(۵) عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة (تابعي) قال: من السنة أن يكبر الإمام على المنبر فى العيدين تسعاً قبل الخطبة ، وسبعاً بعدها. (مصنف ابن ابى شيبة :۴/۲۵۲/ ۵۹۱۶).

(٦) حدثنا محمد بن على، قال: ثنا سعيد، قال: هشيم، قال: ثنا أبومحمد ، مولى قريش قال: سمعت أبا كنانة الهجيمى، يحدث عن الأشعرى: أنه كان يكبر يوم العيد على المنبر ثنتين وأربعين تكبيرة ، وروينا عن الشعبى أنه قال: يكبر الإمام على المنبر يوم العيد سبعاً وعشرين تكبيرة وروينا عن الحسن أنه قال: يكبر الإمام على المنبر يوم العيد أربع عشرة تكبيرة ، وروى عن عمر بن عبد العزيز أنه كبر على المنبر في العيدين إذا رقى سبع تكبيرات بين كل تكبيرتين تسبيح وتحميد وتهليل ، ثم يفتتح الخطبة بعد سبع تكبيرات ... قال أبوبكر: ليس في عدد التكبير على المنبر سنة أن تستعمل فما كبر الإمام فهو يجزى. (الأوسط لابن المنذر: ٦/ ٢٨٤).

احیاناً نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر بلا منبر خطبہ دیا اور کبھی سواری پر۔ ملاحظہ ہو:

عن أبي سعيد الخدري، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخرج يوم العيد ، فيصلى بالناس ركعتين ، ثم يسلم فيقف على رجليه فيستقبل الناس وهم جلوس، فيقول: تصدقوا تصدقوا ، فأكثر من يتصدق النساء بالقرط والخاتم والشيء ، فإن كانت له حاجة يريد أن يبعث بعثاً يذكره لهم وإلا انصرف . (سنن ابن ماجه ، ١٢٨٨)، واوردهذا الحديث ابن ابى شيبة أيضاً في مصنفه (٥٩٠٤)، وقال الشيخ محمد عوامة فى تعليقه : واما نسبة هذا اللفظ (راحلته) إلى النسائى وابن ماجه وأحمد، كما في تلخيص الحبير (٨٦/٢)، فتنظر، نعم ، هو عند أحمد (٣١/٣) وابن ماجه (١٢٨٨) من طبعة محمد فواد عبد الباقي والدكتور بشار عواد بلفظ : على رجليه ، وفى طبعة الدكتور الأعظمي من سنن ابن ماجه : (١٢٨١): على راحلته. (التعليقات للشيخ محمد عوامة على المصنف لابن ابى شيبة: ٤/٢٤٧/ ٥٩٠٤).

علامہ انورشاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

واعلم أن السنة أن يخرج الإمام بدون منبر، فإن النبي صلى الله عليه وسلم هكذا كان يخرج ولم يكن منبر بالمصلى أيضاً ، نعم يعلم من الروايات أنه كان هناك موضع

مرتفع يخطب عليه ، لما في البخاري ثم نزل ،ثم بناه كثير بن الصلت في عهد الخلفاء من لبن وطين . (فيض الباري : ۲/۲۶۷، ط:بیروت).

عمدة القاری میں مرقوم ہے:

وفيه: إخراج المنبر إلى المصلى في الأعياد ، قياساً على البناء ، وعن بعضهم: لا بأس بإخراج المنبر ، وعن بعضهم :كره بنيانه في الجبانة ، ويخطب قائماً أو على دابته ، وعن أشهب: إخراج المنبر إلى العيدين واسع، وعن مالك: لايخرج فيهما من شأنه أن يخطب إلى جانبه ، وإنما يخطب على المنبر الخلفاء ، وفيه: أن المنبر لم يكن قبل بناء كثير بن الصلت . (عمدة القاری:۵/ ۱/۲۷۱ ۹۵۶،باب الخروج الى المصلى بغير منبر،ط:دارالحديث،ملتان).

وفي الموسوعة الكويتية : نص الحنفية على أنه لا يخرج المنبر إلى الجبانة (المصلى العام في الصحراء) ، لما ورد أن النبي صلى الله عليه وسلم لم يفعل ذلك ، وقد صح أنه صلى الله عليه وسلم خطب يوم النحر على ناقته وبه جرى التوارث من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى يومنا هذا: وقد عاب الناس على مروان بن الحكم إخراجه المنبر في العيدين ؛ ونسبوه إلى خلاف السنة ، وأما بناء المنبر في الجبانة فذهب الحنفية في الصحيح من المذهب والمالكية في قول إلى الجواز، قال الحنفية : ولهذا اتخذوا في المصلى منبراً على حدة من اللبن والطين ؛ واتباع ما اشتهربه العمل في الناس واجب .
(الموسوعة الفقهية: ۳۹/۸۷،ط:وزارة الاوقاف الكويت).

مذکورہ بالا احادیث ،آثار اور فقہاء کی عبارات کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ عیدگاہ میں منبر لے جانا بدعت نہیں ۔ واللہ ﷻ اعلم ۔

منبر چھوڑ کر دوسری طرف خطبہ دینے کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے جمعہ کے دن منبر چھوڑ کر دوسری طرف خطبہ دیا، بعض مصلیوں کو اس پر

اعتراض ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا منبر چھوڑ کر خطبہ دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے موافق ہے؟ نیز جمعہ کے دن منبر پر خطبہ دینا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: جمعہ کا خطبہ منبر پر دینا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عمل کے عین موافق ہے، اور امتِ مسلمہ کا متوارث عمل ہے، بنا بریں امام صاحب کو منبر پر خطبہ دینا چاہیے، بلا کسی عذر کے منبر چھوڑنا خلافِ سنت ہے، چنانچہ اکثر علماء کے نزدیک منبر پر خطبہ دینا سنت ہے، ہاں بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں سنت بمعنی مستحب ہے پھر عمل متوارث کی وجہ سے مستحب سے اوپر ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

باب الخطبة على المنبر؛ وقال أنس رضي الله تعالىٰ عنه، خطب النبي صلى الله عليه وسلم على المنبر... (صحيح البخاري: ۱/۱۲۵/۹۱۷، ط: فيصل).

وعن ابن عباس رضي الله عنه قال: كنت أقرئ رجالاً من المهاجرين، منهم عبد الرحمن بن عوف...فلما كان يوم الجمعة عجلت الرواح حين زاغت الشمس، حتى أجد سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل جالساً إلى ركن المنبر، فجلست حوله تمس ركبتي ركبته، فلم أنشب أن خرج عمر بن الخطاب، فلما رأيته مقبلاً قلت لسعيد بن زيد بن عمروبن نفيل: ليقولن العشية مقالة لم يقلها منذ استخلف، فأنكر علي وقال: ماعسيت أن يقول ما لم يقل قبله، فجلس عمر على المنبر... (صحيح البخاري: ۲/۱۰۰۹/۶۸۳۰).

شراحِ حدیث اور فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیں:

عمدة القاري میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: **وفيه: استحباب اتخاذ المنبر لكونه أبلغ في مشاهدة الخطيب والسماع منه ...فإن لم يكن منبر فموضع عالٍ، وإلا فإلى خشبة للاتباع فإنه صلى الله عليه وسلم كان يخطب إلى جذع قبل اتخاذ المنبر، فلما صنع تحول إليه.** (عمدة القاري: ۵/۸۰، دار الحديث، ملتان).

بذل المجهود میں مرقوم ہے: **فلما بنى المنبر يخطب قائماً عليه، وعليه العمل في جميع أمصار المسلمين.** (بذل المجهود: ۵/۱۱۶، ط: دار البشائر).

معارف السنن میں علامہ بنوریؒ فرماتے ہیں: **الخطبة على المنبر مسنونة ، ففى رد المحتار عن البحر : ومن السنة أن يخطب عليه ، أى على المنبر ، اقتداء به صلى الله عليه وسلم .** (معارف السنن : ۳۵۹/۴، ط:سعید).

فتاویٰ شامی میں مرقوم ہے: **ومن السنة أن يخطب عليه اقتداء به صلى الله عليه وسلم .** (فتاوى الشامي: ۱۶۱/۲، ط:سعيد).

وفى الفتاوى الهندية: ومن السنة أن يكون الخطيب على منبر اقتداء برسول الله صلى الله عليه وسلم . (الفتاوى الهندية: ۱۴۷/۱).

منبر پر خطبہ دینے کو علماء نے عمل متوارث قرار دیا ہے اور عمل متوارث کا ترک مکروہ ہے۔ چنانچہ فقہاء فرماتے ہیں اذان میں استقبالِ قبلہ سنت اور عمل متوارث ہے اور اس کا ترک مکروہ ہے۔ ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں مذکور ہے:

و لو ترک الاستقبال جاز لحصول المقصود وهو الإعلام ويكره لتركه المتوارث . (تبيين الحقائق: ۹۱/۱، امداديه).

عمامہ یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا سنت اور عمل متوارث ہے اور کھلے سر نماز مکروہ ہے۔ مقالاتِ کوثری میں ہے:

أما صلاة المصلي و هو حاسر الرأس من غير عذر فصحيحة إذا كان مستجمعة للشروط والأركان، لكنها خلاف السنة المتوارثة والعمل المتوارث في كل بقعة من بقاع المسلمين على توالى القرون...فتكره صلاته وهو حاسر الرأس . (مقالات الامام الكوثرى ، ص ۱۷۰، ۱۷۱، ط:دارشمسى ، كراتشى).

اکابرین کے فتاویٰ ملاحظہ کیجیے: فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مرقوم ہے:

خطبہ منبر پر پڑھنا سنت ہے فرض اور واجب نہیں ہے اگر بلا کسی عذر کے خطیب نے نیچے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا تو اس نے خلافِ سنت کیا اور ترکِ سنت کی وجہ سے مستحق ملامت ہوا۔ **كما فى الدر المختار : وحكمها أى السنة ما يوجر على فعله ويلام على تركه ،الخ...** (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۲۶/۵، مدلل مکمل، ط: دارالاشاعت)

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا سنت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ خلفاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم

کا یہی معمول تھا۔ بحوالہ شامی۔ (احسن الفتاویٰ:۴/۱۲۵، ط:سعید)۔

امداد المفتین میں مرقوم ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کی تین ہی سیڑھی تھیں اس لیے اب بھی ایسا بنانا مسنون ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیسری سیڑھی پر کھڑے ہوتے تھے۔ پھر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں بوجہ ادب کے اس سے نیچے دوسری پر کھڑے ہوتے تھے۔ پھر فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ادب کی وجہ سے سب سے نیچے کی سیڑھی اختیار کی لیکن حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد پھر یہی دستور ہو گیا کہ اوپر کی سیڑھی پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے اور یہی اولیٰ ہے اور کوئی نیچے ہی کی سیڑھی پر کھڑا ہو جائے تو بھی کسی قسم کی کراہت نہیں کیونکہ وہی خلفائے راشدین کا عمل ہے۔ (امداد المفتین، جلد دوم، ص۳۲۲، ط: دارالاشاعت)۔

فتاویٰ حقانیہ میں مذکور ہے:

منبر پر خطبہ دینا سنتِ نبوی ہے اس کے بغیر خطبہ دینا خلافِ سنت ہے... (فتاویٰ حقانیہ:۳/۳۸۶)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: (اشرف الاحکام، ص۱۶۹، وخیر الفتاویٰ:۳/۱۱۴، وفتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۵/۱۱۴، ط: دارالاشاعت، ومجموعۃ الفتاوی:۱/۴۱۱، ط: میر محمد کتب خانہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کیا مدینہ منورہ کی دوسری مساجد میں اذان نہیں ہوتی تھی؟

سوال: بعض شراح کی عبارات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ کی دوسری مساجد میں اذان نہیں ہوتی تھی؟ کیا یہ بات صحیح ہے؟ جبکہ اذان ہر مسجد میں ہونی چاہیے۔

شارحِ بخاری علامہ عینیؒ کی عبارت ملاحظہ ہو: **وأخرج أبوداود في كتاب المراسيل من حديث ابن لهيعة عن بكير بن عبد الله الأشج قال: كان بالمدينة تسعة مساجد مع مسجد النبي صلى الله عليه وسلم، يسمع أهله تأذين بلال رضى الله تعالىٰ عنه، فيصلون في مساجدهم أقربها مسجد بني عمرو بن مبذول.** (عمدة القارى:۳/۵٦۷، دارالحديث) **بینوا توجروا۔**

الجواب: امام ابوداودؒ نے کتاب المراسیل میں اِس روایت کو صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور امام

دار قطنیؒ نے بھی اِسی سند کے ساتھ نقل کیا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس کی سند میں بکیر بن عبداللہ کا سماع کسی صحابی سے ثابت نہیں، لہٰذا یہ روایت منقطع اور ضعیف ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کا مفہوم صرف یہ ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان سن کر دوسری مساجد والے نماز پڑھتے تھے لیکن اذان نہ دینے کی تصریح نہیں ہے۔ روایت کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (كتاب المراسيل لابي داود ،رقم؛ ٧٩)،

وقال الشيخ شعيب الأرنؤوط: رجاله ثقات، فإن ابن وهب وهوعبد الله أحد العبادلة الذين رووا عن ابن لهيعة قبل احتراق كتبه ، وسنن الدارقطنى (١٨٧١/٨٥/٢).

وذكر: كان بالمدينة تسعة مساجد ، وأعله بالإرسال، وهو لا يصح مرسلاً . (بيان الوهم والايهام فى كتاب الاحكام ، لابن قطان الفاسى :٥/ ٦٧٩).

تحفة التحصيل في ذكر رواة المراسيل: بكير بن عبد الله الأشج، روى عن عبد الله بن الحارث بن جزء الزبيدي، وأبي أمامة أسعد بن سهل بن حنيف ، وربيعة بن عباد ، والسائب بن يزيد ، ومحمود بن لبيد ، قال الحاكم في علوم الحديث: إنه عد فى التابعين و لم يصح سماعه من الصحابة ، وقال أيضاً لم يثبت سماعه من عبد الله بن الحارث ابن جزء إنما رواياته عن التابعين ، ذكره ابن حبان أيضاً في أتباع التابعين. (تحفة التحصيل،ص ٣٩،الرياض).

وقال في مقدمة ابن الصلاح : النوع الحادى عشر: معرفة المعضل، وهولقب لنوع خاص من المنقطع ، فكل معضل منقطع ، وليس كل منقطع معضل ، وقوم يسمونه مرسلاً كما سبق، وهوعبارة عما سقط من إسناده اثنان فصاعداً . (مقدمة ابن الصلاح ،ص ٥٩،دارالفكر).

وقال في قفو الأثر: ونقل السراج الهندي من أصحابنا، أن المرسل في اصطلاح المحدثين هو قول التابعي: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، وأن ما سقط من رواته قبل التابعي واحد: يسمى منقطعاً ، أو أكثر يسمى معضلاً . (قفوالاثر،ص ٧٠،ط:حلب).

مساجد کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے: (الروض الانف :٣٦٨/٧، وتخريج الدلالات السمعية على ما كان فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم من الحرف والصنائع والعمالات الشرعية لابى الحسن الخزاعى: ١/ ١٣٠، الفصل الثانى فى اقتداء المساجدفى صلاتهم بمؤذن المسجدالجامع،والتراتيب الادارية

لعبد الحي الكتاني : ۱/۱۲٦).

قال الشيخ الألباني في سلسلة الأحاديث الضعيفة : كان بالمدينة تسعة مساجد...ضعيف...قال في التعليق المغنى: هذا حديث مرسل ، ورواته كلهم ثقات، غير ابن لهيعة . قلت: هذا الاستثناء لا وجه له عندى، لأنه من رواية ابن وهب عن ابن لهيعة ، و هو صحيح الحديث ، فهو ثقة أيضاً ، وإنما علة الحديث الإرسال فقط، هذا، ولعل هذا الحديث هوحجة من ابتدع الأذان الموحد في عمان ، الأردن ، وغيرها من البلاد الإسلامية فإنهم يذيعون الأذان في مسجد أبي درويش في الأشرفية، فيعطلون الأذان في سائر المساجد ، ومع أن الحديث ضعيف كما بينا فإنه ليس صريحاً في ذلك. ولست أدري، والله ! كيف تجرأ على إحداث هذه البدعة من أحدثها بعد هذه القرون الطويلة ، ومع استمرار سائر عواصم البلاد الإسلامية على المحافظة على الأذان في كل مسجد وإعلانه بواسطة مكبر الصوت ! (سلسلة الاحاديث الضعيفة : ۱۲/ ۱/ ۳۲۱/ ۵٦۴۰،ط:دارالمعرفة بيروت).

بعض روایات اورآثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسجد میں اذان ہونی چاہیے، چنانچہ معرفۃ الصحابہ میں مرقوم ہے:

عمرة الأشهلية غير منسوبة ، ذكرها المتأخرمن حديث عبيس بن مرحوم عن يوسف بن نافع عن عبيدة الرايحى، عن عمرة الأشهلية ، قالت: أتانا رسول الله صلى الله عليه و سلم فصلى في مسجدنا الظهر والعصر وكان صائماً ، فلما غربت الشمس وأذن المؤذن أتوه بفطره شواء كتف وذراع ، فجعل ينهسها بأسنانه، ثم أقام المؤذن ، فمسح يده بخرقة ، ثم قام فصلى، ولم يمس الماء . (معرفة الصحابة لأبي نعيم : ۵/ ۲۷۷،بيروت)، وقال الحافظ ابن حجرؒ: و قد تقدم في ترك الوضوء مما مست النار حديث لعمرة بنت حزم فلعلها هى، والذى يظهر من سياق الحديثين التعدد . (الاصابة: ۸/ ۲۴۸،ط:بيروت).

قلت: ولعلها أم عامر بنت يزيد بن السكن الأشهلية وقد أشار الحافظ إلى تلك القصة ، والقصة فى مسند أحمد والطبقات الكبرى وغيره :

ففي مسند أحمد: عن عبد الرحمن بن عبد الرحمن الأشهلي، عن أم عامر بنت يزيد امرأة من المبايعات، أنها أتت النبي صلى اللّٰه عليه وسلم بعرق في مسجد بني فلان، فتعرقه ثم قام فصلى ولم يتوضأ. (مسنداحمد: ۴۵/۵۱،ط:الرسالة)، قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: إسناده ضعيف لضعف إبراهيم بن إسماعيل بن أبي حبيبة.

عن علقمة أنه كان يجيء المسجد، وقد صلوا فيه، وهو يسمع المؤذنين فيصلي في مسجده الذي دخله. (مصنف عبدالرزاق: ۱/۵۱۵، باب الرجل يدخل المسجد فيسمع الاقامة فی غيره).

مذہب احناف اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہر مسجد میں علیحدہ اذان دینی سنت ہے اگر چہ ایک مسجد کی اذان دوسری کے لیے کافی ہوگی، لیکن ایک مسجد کی اذان سے دوسری مسجد کی سنیت ادا نہ ہوگی۔ ملاحظہ ہو:

وإذا قسم أهل المحلة المسجد وضربوا فيه حائطاً ولكل منهم إمام على حدة ومؤذنهم واحد لا بأس به والأولى أن يكون لكل طائفة مؤذن. (البحرالرائق: ۲/۳۸،بیروت).

وفى الفتاوى الهندية: ويكره أداء المكتوبة بالجماعة فى المسجد بغير أذان واقامة، كذا في فتاوى قاضي خان ولا يكره تركهما لمن يصلي فى المصر إذا وجد فى المحلة ولا فرق بين الواحد والجماعة. (الفتاوى الهندية: ۱/۵۴).

امدادالاحکام میں مرقوم ہے:

اذان در ہر مسجد سنتِ مؤکدہ مثل واجب ہست، خواہ جماعت باشد یا شخصے تنہا نماز گزارد ولیکن اگر از محلّہ ثانیہ آواز رسیدہ باشد آں کفایت کند۔ (امدادالاحکام: ۱/۴۳۴)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے: جب دو مسجدیں مستقل ہیں اور دونوں میں جداگانہ جماعت ہوتی ہے، ہر مسجد میں اذان بھی جماعت کے لیے مستقل کہی جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۴۰۰، جامعہ فاروقیہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت منقطع ہے لہٰذا اس کا اعتبار نہیں اور اگر بالفرض صحیح مان لی جائے تب بھی عدمِ تعددِ اذان میں صریح نہیں، بنابریں اِس روایت کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتدا میں لوگ نماز باجماعت اپنی مساجد میں باقاعدہ اذان واقامت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بوقتِ اذان بات کرنے کی وعید میں واردشدہ حدیث کی تحقیق:

سوال: میں ایک ساتھی کے ساتھ باتیں کررہا تھا اور مسجد میں اذان ہورہی تھی، ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ اس میں زوالِ ایمان کا اندیشہ ہے اور بات چیت کی وجہ سے اعمال ضائع ہوجاتے ہیں، کیا مولوی صاحب کی بات صحیح ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی حدیث ہوتو اس کا کیا درجہ ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بوقتِ اذان بات چیت کرنے سے زوالِ ایمان اور حبط اعمال کی دونوں روایات موضوع ہیں، ہاں اذان کے وقت خاموش رہنا چاہیے اور بات چیت سے احتراز کرنا چاہیے، اور اذان کا جواب دینا صحیح احادیث سے ثابت اور مستحب ہے، فقہاء نے اذان کا جواب دینے کو مستحب لکھا ہے۔

چنانچہ ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: **ویستحب إجابة المؤذن باللسان فیمسک عن التلاوة وغیرها فی المسجد وغیره** . (فتح باب العناية: ۱/۱۹۶،باب الأذان،داراحیاء التراث العربی).

حدیث کی تحقیق ملاحظہ کیجیے: **(۱) من تکلم عند الأذان خیف علیه زوال الإیمان. موضوع.** (موضوعات الصغانی ، ص۸۰) **وفي تعليقاته : أقره العجلوني في كشف الخفاء ومزيل الإلباس فی الحکم علی الحدیث " من تکلم عند الأذان...قال الصغانی: موضوع .** (کشف الخفاء : ۲/۲۲۶/۲۳۷۰،و۲/۲۴۰/۲۴۳۹). (وکذا فی تذکرة الموضوعات للمقدسی ،رقم: ۱۴۵).

(۲) من تکلم بکلام الدنیا فی المسجد أحبط الله عمله. وفي رواية : أعماله أربعين سنة. قال الصغاني: موضوع. وقال القاري : وهو كذلک لأنه باطل مبنی ومعنی . (کشف الخفاء : ۲/۲۴۰/۲۴۴۰). واللہ ﷻ اعلم۔

آدابِ مسجد سے متعلق ایک حدیث کی تحقیق:

سوال: ہمارے یہاں مسجد میں آدابِ مسجد سے متعلق ایک بورڈ لگا ہوا ہے، دیگر آداب کے ساتھ ایک حدیث بھی لکھی ہے: **إذا دخل الرجل فی المسجد فتکلم قال له الملک: اسکت یا ولی الله،**

فإن تكلم ثانية ، قال له: اسكت يا حبيب اللّٰه ، فإن تكلم قال له: اسكت يا عدو اللّٰه. یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: یہ حدیث صحیح نہیں، بعض کتابوں میں مرقوم ہے کہ یہ حدیث موضوع اور مکذوب ہے۔

قال في السنن والمبتدعات المتعلقة بالأذكار والصلوات : وحديث: إذا دخل الرجل في المسجد فتكلم قال له الملك: اسكت يا ولي اللّٰه، فإن تكلم ثانية قال له: اسكت يا حبيب اللّٰه ، فإن تكلم قال له: اسكت يا عدو اللّٰه. وهو حديث مكذوب موضوع مفترى .(السنن والمبتدعات لمحمد بن احمد عبدالسلام خضر الشقيرى،المتوفى : ۱۳۵۲،ص ۴۴،ط: دار الفكر).

اعانة الطالبين میں شیخ ابوبکر دمیاطیؒ نے بلا سند نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وقد ورد أن الكلام في المسجد بغير ذكر اللّٰه تعالىٰ يأكل الحسنات كما تأكل النار الحطب، وورد أيضاً عنه عليه الصلاة والسلام أنه قال: إذا أتى الرجل المسجد فأكثر الكلام تقول الملائكة : اسكت يا ولي اللّٰه، فإن زاد فتقول: اسكت يا بغيض اللّٰه تعالىٰ، فإن زاد فتقول: اسكت عليك لعنة اللّٰه تعالىٰ. (اعانة الطالبين :۲/ ۲۶۴،دار الفكر،بيروت).

(وكذا ذكره ابوعبدالله ابن الحاج العبدري المالكي في المدخل :۲/۲۲۷،دار الفكر).

البتہ مسجد میں رفع صوت اور شور وغوغا سے متعلق صحیح احادیث میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے: باب رفع الصوت في المساجد: حدثنا علي بن عبد اللّٰه قال: حدثنا يحيى بن سعيد قال: حدثنا الجعيد بن عبد الرحمن قال حدثني يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد قال؛ كنت قائماً في المسجد فحصبني رجل فنظرت فإذا عمر بن الخطاب فقال: اذهب فأتني بهذين فجئته بهما قال؛ من أنتما أو من أين أنتما ، قالا : من أهل الطائف، قال: لو كنتما من أهل البلد لأوجعتكما ترفعان أصواتكما في مسجد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. (صحيح البخاري ، رقم : ۴۷۰). واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسجد کی خالی زمین میں کنکشن ٹاور لگانے کا حکم:

سوال: کیا مسجد کی وہ زمین جو خالی ہے اس میں موبائل کنکشن ٹاور لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کی وجہ سے مسجد کو اچھا خاصا کرایہ ملے گا۔ ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ اس ٹاور کی وجہ سے لوگ کنکشن کو حرام کاموں میں استعمال کریں گے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسجد کی خالی اور فارغ زمین جو مسجد کے احاطہ میں ہے اس میں دکانیں، مارکیٹ وغیرہ مسجد کے فائدہ کے لیے لگانے کی اجازت ہے، اسی بنیاد پر کنکشن ٹاور لگانے کی بھی اجازت ہوگی، اور اس کا کرایہ لینا بھی درست ہے، اور اگر کوئی اس کنکشن کو غلط استعمال کرے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ باقی فی نفسہٖ لگانے اور کرایہ لینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو فتح القدیر میں مرقوم ہے:

وأن يبني بيوتاً يستغلها إذا كانت الأرض متصلة ببيوت المصر ليست للزراعة ، فإن كان زراعتها أصلح من الاستغلال لايبنى، وفى النوازل في إقراض ما فضل من مال الوقف قال: إن كان أحرز للغلة أرجو أن يكون واسعاً . (فتح القدير: ۶/ ۲۴۱، دارالفکر).

وقال الشيخ أحمد الزرقا: الأصل فى الأحكام أن تضاف إلى عللها المؤثرة لا إلى أسبابها الموصلة ، لأن تلك أقوى وأقرب، إذ المتسبب هو الذي تخلل بين فعله والأثر المترتب عليه ، من تلف أو غيره ،فعل فاعل مختار والمباشر هو الذي يحصل الأثر بفعله من غير أن يتخلل بينهما فعل فاعل مختار، فكان أقرب لإضافة الحكم إليه من المتسبب .

(شرح القواعد الفقهية، ص۴۴۷، ط: دار القلم دمشق).

فتاوی شامی میں مذکور ہے: و عرف بهذا لا يكره بيع مالم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب الذي يتخذ منه العازف .

(فتاوى الشامي : ۴/ ۲۶۸، سعيد).

فتاویٰ دارالعلوم زکریا میں مرقوم ہے:

مسجد کا فارغ احاطہ جس میں لوگ نماز نہیں پڑھتے لیکن وہ جگہ مسجد کی ہے، اس جگہ میں دکانیں، مارکیٹ، پھل دار درخت، کھانے کے ہوٹل، مسجد کے کرایہ اور فائدہ کے لیے بنا سکتے ہیں۔ (فتاویٰ دار العلوم زکریا:۴/۶۷۹، ط: زمزم)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مسجد کا پانی گھر لا کر استعمال کرنے کا حکم:

سوال: ایک صاحبِ خیر شخص نے مسجد کے لیے کنواں کھدوا کر پانی کا انتظام کیا، مسجد سے ملحقہ مکان کے لیے بھی اس پانی کے پہنچانے کا انتظام کر دیا، نیز گھر کا مالک ماہانہ بجلی کا بل ادا کرتا ہے جو بجلی پانی کے پمپ میں استعمال ہوگی، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا یہ پڑوسی مسجد کا پانی استعمال کر سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اصل واقف نے اپنی رضامندی سے خود انتظام کر دیا ہے، اور پانی حاصل کرنے کا ماہانہ بجلی کا صرفہ بھی مالکِ مکان ادا کرتا ہے، بنابریں مسجد کا پانی استعمال کرنا جائز اور درست ہے۔

فقہاء کی عبارات سے پتا چلتا ہے کہ واقف کی اجازت سے مسجد کی اشیاء استعمال کرنا درست ہے۔

قال في الفتاوى الهندية : ولو وقف على دهن السراج للمسجد لا يجوز وضعه جميع الليل بل بقدر حاجة المصلين ويجوز إلى ثلث الليل أو نصفه إذا احتيج إليه للصلاة فيه، كذا في السراج الوهاج ولايجوز أن يترك فيه كل الليل إلا في موضع جرت العادة فيه بذلك كمسجد بيت المقدس ومسجد النبي صلى الله عليه وسلم والمسجد الحرام، أو شرط الواقف تركه فيه كل الليل كما جرت العادة به في زماننا، كذا في البحر الرائق.

(الفتاوى الهندية: ۲/۴۵۹).

وفي البحر الرائق : بعث شمعاً في شهر رمضان إلى مسجد فاحترق وبقي منه ثلثه أو دونه ليس للإمام ولا للمؤذن أن يأخذ بغير إذن الدافع ولو كان العرف في ذلك الموضع أن الإمام والمؤذن يأخذ من غير صريح الإذن في ذلك فله ذلك . (البحر الرائق: ۵/۲۵۰، ط: کوئٹہ، وکذا في فتاوى الشامي: ۴/۳۷۷، سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے: اگر تیل دینے والوں کی بھی اجازت ورضامندی ہے تو جائز ہے اور متولی کا اذن بھی معتبر ہے ورنہ نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ:۲۲/۲۰۳،مکتبہ محمودیہ)۔

فتاویٰ محمودیہ کے حاشیہ میں مرقوم ہے:

اہل محلّہ کے لیے مسجد کے نل سے پانی لینا اسی صورت میں درست ہے جبکہ ان لوگوں کی طرف سے اجازت ہو جن کے چندہ سے وہ لگایا گیا ہے، اور اگر وہ خاص مسجد ہی کے لیے لگایا گیا ہے تو پانی لینا درست نہیں ہے۔ (حاشیہ فتاویٰ محمودیہ:۲۲/۲۰۱،ط: مکتبہ محمودیہ)۔

فتاویٰ حقانیہ میں مذکور ہے: اگر واقف نے پانی وقف کرتے وقت اس کی اجازت دی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں لیکن مسجد کی ضروریات کو مقدم رکھا جائے گا، اب اگر واقف نے کنواں مسجد اور دیگر ضروریات کے لیے تو وقف کیا ہے مگر پانی بجلی کی موٹر یا ڈیزل انجن وغیرہ کے ذریعہ نکالا جاتا ہو تو اس میں چندہ دہندگان کی نیت ضروری ہوگی۔ (فتاویٰ حقانیہ:۵/۱۰۰)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایک مسجد کی رقم کو دوسری مسجد کے لیے قرض حسنہ میں دینے کا حکم:

سوال: بعض مساجد والے ہمارے پاس آئے اور مسجد کے لیے قرض طلب کیا، فی الحال ہمارے پاس للہ فنڈ میں کچھ رقم ہے جس کی مسجد کو فی الحال ضرورت نہیں، اور یہ جمعہ وعیدین میں چندہ کر کے جمع کی گئی تھی، کیا ہمارے لیے جائز ہے کہ دوسری مسجد کو بطورِ قرض دے کہ وقتِ مقررہ پر وہ ہمیں ادا کردیں گے۔

الجواب: منتظمہ کمیٹی کے مشورہ سے دوسری مسجد کو قرض دینے کی اجازت ہے جبکہ اس مسجد کے متولی صاحبان قابل اعتماد حضرات ہوں اور واپسی کا عہد کرلیں اور ضائع ہونے سے اطمینان ہو جائے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں مذکور ہے: **للمتولي إقراض مال المسجد بأمر القاضي.** (الدر المختار مع ردالمحتار: ۵/۴۱۷، سعيد).

وفيه أيضاً: لا يملك الاستدانة إلا بأمر القاضي. (الدرالمختار: مع ردالمحتار: ۴/۴۴۰،سعيد).

وقال في خلاصة الفتاوى: وأما إقراض ما فضل من الوقف، قال في وصايا النوازل: رجوت أن يكون ذلک واسعاً إذا كان ذلک أحرز للغلة من إمساكه، فإن فضل من غلته، فصرف الفضل إلى حوائجه على أن يرده إذا احتاج إلى العمارة، قال: لا يفعل وينزه غاية التنزه، فإن فعل مع ذلک، ثم أنفق فيه رجوت أن ذلک يبرأ عما وجب عليه. (خلاصة الفتاویٰ: ۴/۴۲۳، ط:مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اگر قرض وصول ہونے پر اعتماد ہو، ضائع ہونے کا احتمال نہ ہو تو منتظمہ کمیٹی کے مشورہ سے درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۵/ ۴۸، جامعہ فاروقیہ)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مقتدی کا تشہد کے لیے تیسری رکعت کے قیام سے واپس آنے کا حکم:

سوال: مقتدی قعدۂ اولیٰ میں امام کے ساتھ تشہد پڑھنا بھول گیا اور امام تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا اور مقتدی بھی ساتھ میں کھڑا ہو گیا تو اب تشہد کے لیے واپس آئیگا یا امام کا اتباع کرے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: تارکِ تشہد کے واپس آنے اور تشہد پڑھنے کے بارے میں بعض شراحِ متون اور اصحابِ فتاویٰ نے یہی لکھا ہے کہ مقتدی کو واپس آ کر تشہد پڑھنا چاہیے، اور اِس کی بنیاد امام کی متابعت کا فرض ہونا بیان کیا ہے، لیکن علامہ علاء الدین حصکفیؒ نے بحوالہ نہر فرمایا کہ امام کی متابعت واجبات میں واجب ہے اور فرائض میں فرض، اِس جزئیہ کی بنا پر علامہ شامیؒ نے مقتدی کے واپس آنے اور تشہد پڑھنے پر اشکال کیا ہے، کیونکہ تشہد واجب ہے تو امام کی متابعت فرض کیسے ہوئی؟ پھر قیام شروع ہو چکا ہے جو کہ فرض ہے تو فرض سے واجب کی طرف کیسے آئیگا؟ نیز مفتی مرغوب احمد لاجپوریؒ کبیر نے اِسی قول کو اختیار فرمایا کہ واپس نہیں آنا چاہیے اور یہ قول فقہی جزئیات کے موافق ہے اور یہ فرمانا کہ امام کی متابعت بہر حال فرض ہے محلِ نظر ہے۔

ملاحظہ ہو: النہر الفائق میں لکھا ہے کہ امام کی متابعت واجب میں واجب اور فرض میں فرض ہے۔

قال في النهر: والذي ينبغي أن يقال: إنها واجبة في الواجب فرض في الفرض.

(النهر الفائق: ۱/۳۲۷، ط: قديمی).

علامہ حصکفیؒ نے بھی بحوالہ نہر اسی طرح لکھا ہے: **قلت: وفيه كلام، والظاهر أنها واجبة فی الواجب فرض فی الفرض، نهر**. (فتاوی الشامی: ۲/۸۵، سعيد).

علامہ شامیؒ نے علامہ حصکفیؒ کی اِس عبارت کی وجہ سے تارکِ تشہد کے واپس آنے پر اشکال ظاہر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: **قوله والظاهر أنها واجبة...قلت: وعلى ما استظهره الشارح تبعاً للنهر يشكل العود إلى قراء ة التشهد بعد التلبس بالقيام الفرض مع إمامه، فتأمل**. (فتاوی الشامی: ۲/۸۵، سعيد).

لیکن علامہ رافعیؒ نے علامہ شامیؒ کے اشکال کا یہ جواب دیا ہے: **قوله يشكل العود إلى قراء ة التشهد، يدفع بأنه بعوده إلى قراء ة التشهد كان متابعاً لإمامه فيه ثم يتابع الإمام فی القيام فلم يكن فيه ترک المتابعة**. (تقريرات الرافعی: ۲/۱۰۱، سعيد). لیکن علامہ رافعیؒ کی بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ قیام تو فرض ہے اور تشہد واجب ہے تو فرض قیام چھوڑ کر واجب تشہد کی طرف کیسے آئے گا؟ پھر امام کی متابعت کا مطلقاً فرض ہونا بھی محلِ نظر ہے۔

نیز علامہ طحطاویؒ نے بھی صاحبِ نہر کی موافقت کی ہے۔ ملاحظہ ہو: **قوله لحكم المتابعة، هي واجبة فی الواجب فريضة فی الفرض كما استظهره صاحب النهر**. (حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح، ص ۴۶۶، ط: قديمی).

خلاصہ یہ ہے کہ علامہ حصکفیؒ، علامہ طحطاویؒ اور صاحبِ نہر سب کے نزدیک مطلقاً امام کی متابعت فرض نہیں، اور علامہ شامیؒ نے بھی واجباتِ صلوٰۃ میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

أقول: الذي يظهر أنهم أرادوا بالفرض الواجب، وكون المتابعة فرضاً فی الفرض لا يصح على إطلاقه لما صرحوا به من أن المسبوق لو قام قبل قعود إمامه قدر التشهد فی آخر الصلاة، تصح صلاته إن قرأ ما تجوز به الصلاة بعد قعود الإمام قدر التشهد وإلا لا، مع أنه لم يتابع فی القعدة الأخيرة، فلو كانت المتابعة فرضاً فی الفرض مطلقاً لبطلت صلاته مطلقاً، نعم تكون المتابعة فرضاً، بمعنى أن يأتی بالفرض مع إمامه أو بعده. (فتاوی الشامی: ۱/۴۷۱، سعيد).

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ علامہ شامیؒ کے نزدیک امام کی متابعت مطلقاً فرض نہیں ہے۔

مقتدی کے واپس نہ آنے پر جو مسائل دلالت کرتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص قعدۂ اولیٰ بھول کر تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے تو اب قیام چھوڑ کر قعدہ کی طرف واپس نہیں آئیگا، سجدۂ سہو کر کے نماز پوری کرے گا۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

ولو ترک القعدة الأولى من ذوات الأربع و قام إلى الثالثة فإن استتم قائماً لا يعود لما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قام من الثانية إلى الثالثة ولم يقعد فسبحوا به فلم يعد ... ولأن القيام فريضة والقعدة الأولى واجبة فلا يترک الفرض لمكان الواجب . (بدائع الصنائع: ۱/۱۷۱، سعيد).

(۲) فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص وتر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا بھول جائے اور رکوع میں چلا جائے تو رکوع چھوڑ کر قنوت کی طرف نہیں آئیگا کیونکہ محل فوت ہوگیا، اسی طرح یہاں بھی۔

قال في الدرالمختار: ولو نسيه أي القنوت ثم تذكره في الركوع لا يقنت فيه لفوات محله ، ولا يعود إلى القيام في الأصح لأن فيه رفض الفرض للواجب . (الدر المختار: ۲/۹، سعيد). (وكذا في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح).

(۳) اگر کوئی شخص عیدین کی نماز میں قیام کی حالت میں تکبیراتِ عیدین بھول جائیں اور رکوع میں چلا جائے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ امام کے رکوع کو چھوڑ کر تکبیرات کے لیے قیام کی طرف واپس نہیں آئیگا، اسی طرح اگر کوئی شخص تاخیر سے امام کے ساتھ شریک ہوا تو رکوع میں تکبیرات کہے گا اور اگر امام سر اُٹھالے تو تکبیرات چھوڑ کر امام کا اتباع کریگا تو یہاں بھی امام کے ساتھ قیام چھوڑ کر واجب یا سنت تشہد کے لیے نہیں آنا چاہیے۔

ملاحظہ ہو الجوہرۃ النیرۃ میں مذکور ہے:

و لو رفع الإمام رأسه بعد ما أدى بعض التكبيرات فإنه يرفع رأسه ويتابع الإمام و يسقط عنه باقي التكبيرات؛لأن متابعة الإمام واجبة. (الجوهرة النيرة: ۱/۱۷۳،باب صلاة العيدين).

وزاد في فتح القدير: لأنه إن أتى به في الركوع لزم ترک المتابعة المفروضة

للواجب . (فتح القدیر: ۲/۷۸،دارالفکر). (وھکذا فی الفتاوی الھندیۃ: ۱/۱۵۱،وفتاوی الشامی: ۲/۱۷۴، سعید، ومراقی الفلاح،ص ۲۱۶،ط:بیروت). جب یہاں متابعتِ امام کی وجہ سے واجب تکبیریں ساقط ہوگئیں تو فرض قیام کی وجہ سے واجب تشہد بدرجہ اولیٰ ساقط ہوگیا۔

حضرت مولانا مرغوب صاحب لاجپوریؒ کبیر جدِامجد نے بھی اسی طرح رقم فرمایا ہے کہ مقتدی واپس نہیں آئیگا بلکہ امام کا اتباع کریگا، مگر ان کے حفید رشید مولانا مرغوب صاحب لاجپوری مدظلہ نے علمی مکاتیب میں مرغوب الفتاویٰ سے اس مسئلہ کو ذکر کرنے کے بعد اپنے داداجان کی طرف تسامح کی نسبت کی ہے،لیکن مذکورہ بالاحوالہ جات کی بنا پر ہمارے نزدیک مرغوب الفتاویٰ کا مسئلہ صحیح اور درست ہے اورصاحبِ فتاویٰ کی طرف تسامح کی نسبت محلِ نظر ہے۔ چنانچہ علمی مکاتیب سے پوری تفصیل حسبِ ذیل درج کی جاتی ہے؛

رفیق محترم ومکرم مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب زیدمجدہ؛ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا تھا،اس میں آپ نے ''مرغوب الفتاویٰ'' ج ۲ کے بعض فتاویٰ پر اشکال فرمایا تھا،راقم نے ان مواضع پر دوبارہ غور کیا تو محسوس ہوا کہ آپ کے اشکالات بعض جگہ پر صحیح ہیں، چنانچہ ان مواضع پر اصلاح کردی گئی ہیں،مگر بعض جگہ پر ابھی تشفی نہیں ہوئی،ان پر مزید غور کررہا ہوں،بعض اہل علم وارباب افتاء کی طرف بھی رجوع کیا ہے، ان کے جواب کا منتظر ہوں، بعد میں کوئی فیصلہ کرسکوں گا،اورجس پر شرحِ صدر ہوگا اوراکابر کی تائید ہوگی ان کو باقی رکھوں گا...

۱۔......آپ نے حضرت کے اس فتویٰ پر: س:ایک مقتدی قعدۂ اولیٰ میں تشہد پڑھنا بھول گیا اورامام کے ساتھ تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوگیا، اب یہ کیا کرے؟ کیا امام کی متابعت چھوڑ کر پھر قعدہ کرکے تشہد پڑھے یا امام کی متابعت میں کھڑا رہے؟

ج: حامداًومصلیاً،الجواب وباللہ التوفیق:مقتدی قعدۂ اولیٰ میں تشہد پڑھنا بھول گیا اورتیسری رکعت میں یاد آیا تو اب اس کو امام کی متابعت نہ چھوڑنا چاہیے اورتشہد کی خاطر امام کو چھوڑ کر قعدہ کی طرف رجوع نہ کرے۔ ہاں قعدہ میں بیٹھا ہوا تھا اور یاد آیا کہ میں نے تشہد نہیں پڑھی ہے تو تشہد پڑھ لے،اگرامام کھڑا ہوجائے تب بھی مقتدی امام کے ساتھ کھڑا نہ ہو، بلکہ تشہد پڑھ کر کھڑا ہو،لیکن تیسری رکعت میں امام کے ساتھ کھڑا ہوجانے کے

بعداب تشہد پڑھنے کے لیے دوبارہ قعدہ نہ کرے اور امام کی متابعت نہ چھوڑے، ایسی حالت میں مقتدی کی نماز مع الکراہت ادا ہو جائے گی۔فقط، واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم۔

یہ اشکال کیا تھا کہ اس جزئیہ میں (لیکن تیسری رکعت میں امام کے ساتھ کھڑا ہو جانے کے بعد اب تشہد پڑھنے کے لیے دوبارہ قعدہ نہ کرے) اور کبیری کے جزئیہ میں تعارض ہے۔ چنانچہ راقم نے اس پر تحقیق کی اور اس طرح حاشیہ میں اصلاح کر دی ہے:

شاید اس مسئلہ میں حضرتؒ سے تسامح ہوا ہے۔ چنانچہ کبیری میں اس کے خلاف لکھا ہے: **المقتدی إذا نسي التشهد فی القعدة الأولی فذکر بعد ما قام، علیه أن یعود ویتشهد.** (کبیری، ص ۴۵۹، فصل فی سجود السهو). اس کے بعد عمدۃ الفقہ (۲/۲۱۷) کی عبارت نقل کی ہے۔ (علمی مکاتیب، ص ۳۳۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اوقاتِ نماز وثبوتِ ہلال کے لیے فلکی حساب کا حکم:

سوال: بعض لوگ ثبوتِ ہلال میں منجمین کے قول کا اعتبار کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ جب اوقاتِ نماز میں ان کی قائم کردہ تقویم کا اعتبار ہوتا ہے تو ثبوتِ ہلال میں کیوں معتبر نہیں؟ کیا ان کا یہ قیاس صحیح ہے یا نہیں؟ **بینوا بالبرهان توجروا عند الرحمن.**

الجواب: شریعتِ اسلامیہ نے اسلامی مہینوں کی تعیین کی بنیاد ثبوتِ ہلال پر رکھی ہے اور ہلال کے ثبوت کا تعلق رؤیتِ ہلال سے ہے نہ کہ وجودِ ہلال سے، شریعت نے وجودِ ہلال کو تسلیم کیا ہے لیکن ثبوتِ ہلال کا مدار رؤیت پر رکھا ہے اور دونوں میں بڑا فرق ہے جس کو حدیث شریف نے واضح کیا ہے۔ **فإن غم علیکم الهلال،** یعنی ہلال مستور ہو جائے اور نظر نہ آئے تو شعبان کے ۳۰ دن شمار کرو، معلوم ہوا کہ موجود چیز آنکھوں سے اوجھل ہو سکتی ہے معدوم چیز کے اوجھل ہونے کے کوئی معنی نہیں، برخلاف جنتریوں اور گھڑیوں کے استعمال سے اصولِ شریعت کی مخالفت نہیں ہوتی، بلکہ اصول پر عمل درآمد ہونے میں ایک قسم کی سہولت پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا بعض لوگوں کا رؤیتِ ہلال کو اوقاتِ نماز کی جنتریوں پر قیاس کرنا درست نہیں۔

ملاحظہ ہو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

اس میں لفظ ''غـــم'' خاص طور سے قابل نظر ہے، اس لفظ کے لغوی معنی عربی محاورہ کے اعتبار سے بحوالہ قاموس وشرح قاموس یہ ہیں: **غـم الهلال على الناس غماً إذا حال دون الهلال غيم رقيق أوغيره فلم ير، تاج العروس**، جس سے معلوم ہوا کہ چاند کا وجود خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کرکے یہ حکم دیا ہے کیونکہ مستور ہوجانے کے لیے موجود ہونا لازمی ہے، جو چیز موجود ہی نہیں اُس کو معدوم کہا جاتا ہے، محاورات میں اس کو مستور نہیں بولتے، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ چاند کے مستور ہوجانے کے مختلف اسباب ہوسکتے ہیں ان میں سے کوئی بھی سبب پیش آئے، بہرحال جب چاند نگاہوں سے مستور ہوگیا اور دیکھا نہ جاسکا تو حکم شرعی یہ ہے کہ روزہ وعید وغیرہ میں اس کا اعتبار نہ کیا جائیگا۔ (رؤیتِ ہلال، ص۲۹، ط: مکتبہ تفسیر القرآن)۔

ثبوتِ ہلال اور جنتریوں کے درمیان فرق؛ ملاحظہ فرمائیں:

لیکن ذرا غور کیا جائے تو ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا کیونکہ طلوع وغروب وغیرہ میں جنتریوں اور گھڑیوں پر اعتماد کرنے سے کوئی اصول نہیں بدلتا صرف ایک سہولت حاصل ہوتی ہے اور چاند کے معاملہ میں ایسا کرنے سے شرعی اصول بدل جاتا ہے... یعنی آلاتِ رصدیہ اور حساباتِ ریاضیہ سے حصولِ رؤیت میں کوئی سہولت پیدا ہونے کے بجائے سرے سے اصولِ رؤیت کو ترک کرنا اور چاند کے وجود فوق الافق کو اصول بنانا لازم آتا ہے جو نصوص شرعیہ کے خلاف ہے۔ (رؤیت ہلال، ص۳۶، ۳۷، ط: مکتبہ تفسیر القرآن)۔

شیخ سلیم علوان'' **تنوير الحلك فى بطلان دعوى إثبات الصوم بالحساب والفلك**''، میں لکھتے ہیں:

قـالوا: لماذا نأخذ بالحساب الفلكي في مواقيت الصلاة ولا نأخذ بالحساب الفلكي في تحديد أوائل الشهور.

الـرد: هـذا تـلبيس واضح وخلط محض وقياس فاسد، ويقال لهم: إن كنتم تدعون أنـكـم تريدون توحيد صيام الأمة في وقت واحد بالحساب (ولن تستطيعوا) فهل تستطيعون توحيد أوقات الصلوات بالحساب لكل الأمة؟

ويـقـال لهـم: قـد ثبـت عـن الـرسـول صـلـى الـلّٰه عليه وسلم أنه قال: صوموا لرؤيته وأفـطروا لرؤيته فإن غم عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين، ولم يقل الرسول صلى اللّٰه عليه

وسلم فإن غم عليكم فارجعوا إلى الحساب الفلكي، فلا يجوز لنا أن نخرج عن كلام رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فإن قالوا: الرؤية ليس لها ضبط ، يقال لهم : وهؤلاء الفلكيون يختلفون لا يتفقون، فإثبات رمضان بالرؤية إجماع ،كل الائمة اتفقوا على ذلک لا يعرف بينهم مخالف .

ويقال لهم أيضاً: أين في كلام الائمة أنه يؤخذ بالحساب لمعرفة أوقات الصلاة لعموم الناس من غير قيد ؟ وإنما الذي قاله بعض أهل العلم: إن الشخص الذي له معرفة بهذا الفن (الحساب) يعمل بحسابه للصلوات ولا يعمل به غيره... ففرض على المكلف معرفة المواقيت الأصلية التي علمها الرسول الصحابة ، ولا يجوز ترک تعلمها اعتماداً على ما عمله الناس من تعيين مواقيت للمدن كالقاهرة ودمشق وحلب ونحو ذلک ، لأن دخول الأوقات يختلف باختلاف البلدان، وهذه التقاويم التي عملت تفيد للبلد الذي عملت له ، فرز نامه دمشق لا تفيد لبيروت ولا لحلب ، ثم أكثر البلاد التي فيها مسلمون ما عمل لها تقويم أى رزنامات ، فكيف يعرف الشخص دخول الوقت إذا لم يتعلم المواقيت الأصلية التي علمها الرسولُ الصحابة .

وإذا عمل التقى الثقة العالم العارف تقويماً لأوقات الصلاة اعتماداً على مراقبته يجوز أن يعتمد عليه لكن الأفضل أن ينظر الشخص بنفسه إلى الظل لصلاة الظهر والعصر وإلى الأفق للصلوات الثلاث المغرب والعشاء والفجر .

...وقال الإمام أحمد بن إدريس القرافي في كتابه الفروق (١٧٩/٢): وأما الأهلة فلم ينصب صاحب الشرع خروجها من الشعاع سبباً للصوم بل نصب رؤية الهلال خارجاً من شعاع الشمس هو السبب فإذا لم يحصل الرؤية لم يحصل السبب الشرعى، ولا يثبت الحكم ويدل على أن صاحب الشرع لم ينصب نفس خروج الهلال عن شعاع الشمس سبباً للصوم، قوله صلى اللّٰه عليه وسلم : صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته ، ولم يقل لخروجه

عـن شعاع الشـمس كما قال تعالىٰ: أقم الصلاة لدلوك الشمس،[سورة الإسراء] ثم قال: فإن غـم عـليـكـم ، أى خـفيـت عليكم رؤيته "فاقدروا له" وفي رواية :" فأكملوا العدة ثلاثين " فنصب رؤية الهلال أو إكمال العدة ثلاثين ولم يتعرض لخروج الهلال عن الشعاع .

ثـم قال في (١٨١) واتـفـق الـجـميـع عـلـى أن لـكل قوم فجرهم وزوالهم وعصرهم ومـغـربهـم وعشـاء هـم فـإن الـفـجر إذا طلع على قوم يكون عند آخرين نصف الليل وعند آخـريـن نـصف الـنهـار وعـنـد آخرين غروب الشمس إلى غير ذلک من الأوقات، وما من درجة تـطلع من الفلک أو تتوسط أو تغرب إلا وفيها جميع الأوقات بحسب آفاق مختلفة وأقـطار متباينة فإذا طلعت الشمس في أقصى المشرق كان نصف الليل عند البلاد المغربية مـنهم أو أقل من ذلک أو أكثر على حسب البعد عن ذلک الأفق ، فإذا غربت الشمس في أقصـى الـمغرب كان نصف الليل عند البلاد المشرقية أو أقل أو أكثر بحسب قرب ذلک القطر من القطر الذي غربت فيه الشمس وكذلک بقية الأوقات تختلف هذا الاختلاف .

ثم قال في(ص١٨٢): إذا تـقـرر الاتـفـاق عـلى أن أوقات الصلوات تختلف باختلاف الآفـاق وأن لـكـل قـوم فـجـرهـم وزوالهـم وغيرذلک من الاوقات فيلزم ذلک فى الأهلة بسبـب أن البـلاد الـمشـرقية إذا كـان الهلال فيها فى الشعاع وبقيت الشمس تتحرک مع الـقـمـر إلـى الـجهة الـغـربية فـمـا تصل الشمس إلى أفق المغرب إلا وقد خرج الهلال من الشعاع فيراه أهل المغرب ولا يراه أهل المشرق هذا أحد أسباب اختلاف رؤية الهلال وله أسبـاب أخـر مـذكورة في علم الهيئة لا يليق ذكرها ههنا إنما ما يقرب فهمه ، و إذا كان الهلال يختلف باختلاف الآفاق وجب أن يكون لكل قوم رؤيتهم فى الأهلة كما أن لكل قوم فـجـرهـم وغيـر ذلک مـن أوقـات الـصـلـوات وهـذا حق ظـاهر وصواب متعين . انتهى .

(تنويرالحلک فى بطلان دعوى اثبات الصوم بالحساب والفلک،ص٦٥ . ٧٠، فصل فى ردشبهة اخرى).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

شہر کے اوپر ہوائی جہاز سے پرواز کرنے سے اقامت کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص کیپ ٹاؤن سے بذریعہ ہوائی جہاز جوہانسبرگ آیا اور یہ شخص جوہانسبرگ کا رہنے والا ہے اور جہاز جوہانسبرگ پر پرواز کر کے ایئرپورٹ اترا، تو یہ شخص اپنے شہر پر پرواز کرنے کی وجہ سے مقیم بن گیا یا تا ہنوز مسافر ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہائے کرام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شہر میں داخلہ سے سفر باطل ہوتا ہے اور شہر کے اوپر سے پرواز کرنے کو داخلہ نہیں کہتے، جیسے اگر کوئی شخص دربن شہر پر پرواز کرے تو یہ نہیں کہا جائیگا کہ فلاں دربن میں داخل ہوا، بلکہ فضا میں داخل ہونا کہتے ہیں، نیز فقہاء میقات پر سے گزرنے کو یا میقات کی برابری میں گزرنے کو محاذات کہتے ہیں دخولِ میقات نہیں کہتے اسی طرح ہوائی جہاز میں اوپر سے گزرنا کسی شہر کی محاذات ہے دخول نہیں اور اپنے شہر میں داخلہ سے سفر باطل ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو فقہاء لکھتے ہیں کہ دخولِ شہر مبطلِ سفر ہے:

قال في الخلاصة : وإنما يصير المسافر مقيماً إما بدخوله مصراً له فيه أهل أو بأن بدا له العود إليه بعد ما خرج... وسواء دخل مصره بنية الاختيار أو لقضاء حاجته والخروج بعد ذلك صار مقيماً حين دخلها . (خلاصة الفتاوى: ۱/۱۹۹). (وكذا في بدائع الصنائع: ۱/۱۰۳، سعيد، والفتاوى التاتارخانية: ۲/۵۱۳، والفتاوى السراجية، ص ۷۹).

میقات کی محاذات کے متعلق فقہائے کرام کی عبارات ملاحظہ کیجئے:

قال في الشامية : أنه لا يتصور عدم المحاذاة ، أي لأن المواقيت تعم جهات مكة كلها فلا بد من محاذاة أحدها . (فتاوى الشامي: ۲/۴۷۶، سعيد).

قال في لباب المناسك مع شرحه: وأعيان هذه ، أي المواقيت فقط (ليس بشرط) ولهذا يصح الإحرام قبلها ، بل الواجب عينها أو حذوها ، أي محاذاتها ومقابلتها . (لباب المناسك مع شرحه وارشاد الساري، ص ۹۰، ط: بيروت).

جدید فقہی مسائل میں مرقوم ہے:

اب رہا ہوائی جہاز سے سفر کی صورت میں احرام کہاں سے باندھا جائے تو اس کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے کہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ احرام کا لباس پہن کر ہی سفر کی ابتدا کرے لیکن یہ بات بھی جائز ہوگی کہ دورانِ سفر اس آخری مقام سے احرام ضرور باندھ لیا جائے جو کسی میقات کے مقابل میں آتا ہو اور اس کے بعد کوئی ایسی جگہ نہ ہو جو میقات کے مقابل آنے والی ہو۔۔۔اگر ٹھیک میقات ہی کے اوپر سے گزرتا ہو اور میقات کے بعد سفر حرم کی سمت ہو رہا ہو تو پھر وہیں سے احرام باندھنا ضروری ہوگا۔(جدید فقہی مسائل:۱/ ۱۳۸)۔واللہ ﷻ اعلم۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان دی تھی یا نہیں؟

سوال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان دی تھی یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اس اہم عبادت انجام نہ دینے کی کیا حکمت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے اس مسئلہ میں رسالہ لکھا ہے اس کا نام ہے" **خير الخبر في أذان سيد البشر**" اِس رسالہ میں علامہ نے قائلین اور مانعین دونوں کے دلائل ذکر فرما کر اس بات کو ترجیح دی ہے کہ نماز کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان نہیں دی تھی۔خلاصہ حسبِ ذیل درج ہے:

اِس بارے میں علمائے کرام کے دو گروہ ہیں: (۱) امام نوویؒ اور علامہ سیوطیؒ اور ان کے متبعین کا رجحان یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس خود اذان دی تھی۔

(۲) حافظ ابن حجرؒ اور ملا علی قاریؒ اور دیگر محققین حضرات کا خیال یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود اذان نہیں دی تھی۔ پہلی جماعت یعنی قائلین کے دلائل ملاحظہ فرمائیں: ترمذی شریف میں ہے:

عن كثير بن زياد عن عمرو بن عثمان بن يعلى بن مرة عن أبيه عن جده : أنهم كانوا مع النبي صلى الله عليه وسلم في مسير فانتهوا إلى مضيق وحضرت الصلاة فمطروا السماء من فوقهم والبلة من أسفل منهم فأذن رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو على راحلته وأقام فتقدم على راحلته فصلى بهم يومى إيماء يجعل السجود أخفض من الركوع ، قال أبوعيسى: هذا حديث غريب تفرد به عمر بن الرماح البلخي لايعرف إلا من حديثه . (سنن

الترمذی: ۱/۹۴، رقم: ۴۱۱، ط: فیصل).

قال في التلخيص الحبير: قال عبد الحق إسناده صحيح والنووي إسناده حسن وضعفه البيهقي وابن العربي وابن القطان لحال عمرو بن عثمان، وقد رواه الدارقطنى من هذا الوجه بلفظ: فأمر المؤذن فأذن وأقام أو أقام بغير أذان ثم تقدم فصلى بنا على راحلته ورجح السهيلي هذه الرواية لأنها بينت ما أجمل في رواية الترمذي وإن كان الراوي له عن عمر بن الرماح عنده شديد الضعف. (التلخيص الحبير: ۱/۵۲۲/۳۱۳، ط: دارالکتب العلمية). (وكذافى سنن الدارقطنى: ۱/۳۸۰).

دوسری جماعت کی جانب سے اس روایت کا جواب بھی آچکا کہ ترمذی کی روایت مجمل ہے اور دارقطنی کی روایت مفسر ہے، اور حافظ سہیلی نے اسی مفسر کو ترجیح دی ہے، پھر یہ "بنى الأمير المدينة" کے قبیل سے ہے، اذان یعنی "أمر المؤذن بالأذان" ان سب باتوں سے قطع نظر، یہ روایت خود ضعیف ہے عمر بن الرماح پر شدید کلام ہے۔

(۲) قائلین کی دوسری دلیل: علامہ سیوطیؒ نے اپنی کتاب "التوشيح بشرح صحيح البخاری" میں ذکر کیا ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اذان دی، اور امام نوویؒ نے ترمذی کی حدیث سے استدلال کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اس کا یہ جواب دیا کہ مسند احمد میں " أمر بلالاً "، کا لفظ ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ مجھے سنن سعید بن منصور میں ایک مرسل روایت ملی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان دی: ثنا أبو معاوية، ثنا عبد الرحمن بن أبي بكر القرشي، عن ابن أبي مليكة، قال: أذن رسول الله صلى الله عليه وسلم مرة، فقال: حي على الفلاح، اور اس روایت میں کوئی تاویل بھی نہیں ہوسکتی۔ اھ۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں: خلاصہ تحقیق یہ ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلق اذان دینا ثابت ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ترمذی اور ابوداود کی روایت میں ہے: عن أبي رافع ﷺ قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم أذن في أذن الحسن بن علي حين ولدته فاطمة رضى الله تعالىٰ عنها بالصلاة. (سنن الترمذی: ۱/۲۷۸/۱۵۱۴، وابوداود، ص۶۹۲/۵۱۰۷).

ہاں نماز کے لیے اذان دینے میں اختلاف ہے، ترمذی شریف کی روایت کی تفصیل گزر چکی، سنن سعید بن منصور کی روایت سے بھی بظاہر اذان فی اذن المولود مراد ہے، ورنہ **فقال: حي على الفلاح** کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ لہٰذا امام سیوطیؒ کا یہ کہنا کہ اس میں تاویل نہیں ہوسکتی، ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

بہرحال اب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز کے لیے اذان دینا صراحۃً ثابت نہیں، ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، ممکن ہے کہ بعد میں کوئی نئی تحقیق سامنے آجائے۔ **لعل الله يحدث بعد ذلك أمراً .**

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اذان نہ کہنے کی حکمت:

۱۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اذان دیتے تو جماعت واجب ہوجاتی اوراس میں حرج ہے۔لیکن یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے۔

۲۔ شیخ ابوالحسن شاذلیؒ فرماتے ہیں اپنی تعریف سے بچتے ہوئے اذان نہیں دی کہ اس میں " **أشهد أن محمداً رسول الله** " ہے۔لیکن یہ بھی قابل اطمینان نہیں۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے عظیم الشان کارناموں کے انجام دینے میں مشغول تھے اس وجہ سے اذان نہیں دی ورنہ ان میں خلل واقع ہوتا۔ملخص از" **خير الخبر في أذان سيد البشر** " مجموعہ رسائل اللکنوی (۴/۳۲۳۔۳۳۲،ط:ادارۃ القرآن، کراچی)۔

۴۔ اذان شہادتِ توحید کے ساتھ شہادتِ رسالت پر بھی مشتمل ہے اور رسالت کی گواہی دوسرے کی زبان سے اچھی لگتی ہے۔

۵۔ آپ جب کوئی عمل فرماتے تو مداومت فرماتے تھے اور اذان پر مداومت میں آپ کے لیے حرج تھا۔

۶۔ اذان پوری دنیا کو دین کا پیغام پہنچانے کا عہد ہے اور یہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے حوالے فرمایا۔

وللاستزادة راجع : (قوت المغتذى للسيوطى على سنن الترمذى: ۱/۹۴،والعرف الشذى للعلامة الكشميرى على سنن الترمذى: ۱/۹۵، وفتح البارى: ۲/۷۹، باب بدء الاذان، ومرقاة المفاتيح: ۲/۱۷۴، باب فضل الاذان ، وتحفة الاحوذى : ۲/۳۸۰، ونهاية المحتاج إلى شرح المنهاج :

۱/ ۴۱۶، وشرح الزرقاني على المواهب اللدنية : ۱/ ۳۸۰، ط: دار المعرفة ، بيروت). واللہ ﷻ اعلم۔

طلوعِ شمس اور غروبِ شمس کے وقت نماز نہ پڑھنے کی حکمت:

سوال: طلوعِ شمس وغروب کے وقت نماز ممنوع ہے کفار کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے تو اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ کفار اس وقت سورج کی عبادت کرتے ہیں تو مسلمانوں کو بیت اللہ کی طرف منہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے کفار کا مقابلہ کرنا چاہیے؟ پھر ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بظاہر ان اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ شیاطین سورج کو فضا میں اڑ کر اپنے سینگوں کے درمیان لے لیتے ہیں تو اس علاقے کی پوری فضا اور دھوپ پر شیطانی اثرات پڑتے ہیں اور اس وقت پورا علاقہ ان اثرات سے ملوث ہوجاتا ہے اور شیطان کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اس وقت عبادت اور نماز پڑھ کر شیطانی اثرات سے ملوث ہوں تو شریعت کا حکم ہے کہ شیطان کے مقصد کو پورا مت کرو، اگر سورج کی جہت کے خلاف دوسری طرف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہوں تو پھر بھی دھوپ اور فضا شیطانی اثرات سے ملوث ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ جب سورج کے سامنے بادل آتا ہے تو اس بادل کے نیچے پوری فضا میں بادل کا سایہ پڑتا ہے اسی طرح شیطان کے سینگوں کے درمیان اور اس کے نیچے جتنی جگہ آئی وہاں کراہت پائی گئی۔

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مکان کی تبدیلی سے مکان کی کراہت ختم ہوجاتی ہے، اسی طرح زمان کی کراہت زمان کے بدلنے سے ختم ہوتی ہے اور یہاں زمانہ کی کراہت ہے، اس لیے تبدیل زمان کا انتظار کرنا چاہیے۔

جیسا کہ ایک سفر میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی نمازِ فجر قضا ہوگئی تھی تو آپ نے وہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیا اور بعد میں نماز قضا فرمائی یعنی تبدیل مکان اور تبدیل زمان کی رعایت فرمائی۔

ملاحظہ فرمائیں حدیث شریف میں ہے:

عن عمران بن حصين قال: كنت مع نبي الله صلى الله عليه وسلم في مسير له فأدلجنا ليلتنا حتى إذا كان في وجه الصبح عرسنا فغلبتنا أعيننا حتى بزغت الشمس ...

فلما رفع راسه ورأى الشمس قد بزغت قال: ارتحلوا فسار بنا حتى إذا ابيضت الشمس نزل فصلى بنا الغداة ...الخ. (رواه مسلم ،رقم: ۲۸۲ ،باب قضاء الصلاة الفائتة).

ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہاں شیطانی اثرات ہیں آگے چلو۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے: **فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ليأخذ كل رجل برأس راحلته فإن هذا منزل حضرنا فيه الشيطان قال ففعلنا.** (رواه مسلم ،رقم: ۲۸۰).

ممانعت والی حدیث ملاحظہ کیجیے: **عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا طلع حاجب الشمس فأخروا الصلاة حتى ترتفع وإذا غاب حاجب الشمس فأخروا الصلاة حتى تغيب** . (صحيح البخاری ،رقم: ۵۸۳).

وفي رواية قال: فإنها تطلع بين قرني شيطان أو الشيطان. (صحيح البخاری،رقم: ۳۲۷۳).

وفي فتح البارى: فإنها تطلع بين قرني شيطان وفيه إشارة إلى علة النهي عن الصلاة فى الوقتين المذكورين وزاد مسلم من حديث عمروبن عبسة وحينئذٍ يسجد لها الكفار فالنهي حينئذٍ لترك مشابهة الكفار . (فتح البارى : ۲/۶۰).

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

ثم الصلاة خير مفروض ، فمن استطاع أن يستكثر منها فليفعل غير أنه نهى عن خمسة أوقات: ثلاثة منها أوكد نهياً عن الباقين ، وهى الساعات الثلاث إذا طلعت الشمس بازغة حتى ترتفع ، وحين يقوم قائم الظهيرة حتى تميل، وحين تتضيف للغروب حتى تغرب لأنها أوقات صلاة المجوس ، وهم قوم حرفوا الدين جعلوا يعبدون الشمس من دون الله ، واستحوذ عليهم الشيطان، وهذا معنى قوله صلى الله عليه وسلم: فإنها تطلع بين قرنى الشيطان، وحينئذٍ يسجد لها الكفار، فوجب أن يميز ملة الدين الإسلامى وملة الكفر فى أعظم الطاعات من جهة الوقت أيضاً . (حجة الله البالغة : ۲/۳۸، ۳۹،ط:قديمى كتب خانه).

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

والنهي في حديث عقبة من الأول فكان الثابت به كراهة التحريم ، فإن كانت الصلاة فرضاً أو واجبة فهي غير صحيحة لأنها لنقصان فى الوقت بسبب الأداء فيه تشبيهاً بعبادة الكفار . (البحرالرائق: ۱/۲۴۹، کوئٹہ). (وكذا فى حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح،ص،وفتح القدير: ۱/۲۳۲، دارالفکر، وبوادرالنوادر،ص ۱۰۳). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

فرض کی آخری دورکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم:

سوال: ایک امام فرض کی آخری دورکعتوں میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اور کہتا ہے کہ سکوت یا چند تسبیحات بھی کافی ہیں، کیا آخری دورکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنا سنتِ مؤکدہ ہے یا مندوب؟ اور ہمیشہ آخری دورکعتوں میں سورۂ فاتحہ چھوڑنے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اکثر فقہائے کرام نے فرض کی آخری دورکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کو مسنون قرار دیا ہے، ہاں بعض نے مستحب لکھا ہے، اور تسبیح یا سکوت پر اکتفا کو بھی جائز قرار دیا ہے لیکن سنت والا قول زیادہ مناسب ہے بنابریں حنفی امام کو ہمیشہ سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے خصوصاً جب مقتدی مخلوط ہوں تو شوافع کی رعایت بھی ہوجائے گی کہ ان کے یہاں سورۂ فاتحہ واجب ہے۔

سورۂ فاتحہ پڑھنے سے متعلق حدیث شریف ملاحظہ کیجیے: صحیح ابن خزیمہ میں ہے:

عن عبد اللّٰه بن أبى قتادة عن أبيه قال: كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يصلى بنا الظهر والعصر فيقرأ فى الأوليين بفاتحة الكتاب وسورة معها وفى الأخريين بفاتحة الكتاب وكان يطول فى الأولى ويسمعنا الآية أحياناً . (رواه ابن خزيمة فى صحيحه،رقم: ۵۰۴،۵۰۳). (وكذا فى سنن الدارمى ، رقم: ۱۲۹۳ ، واسناده صحيح).

نیز مصنف ابن ابی شیبہ، الاوسط لابن المنذر اور شرح معانی الآثار میں صحابہ اور تابعین کے بہت سارے آثار مروی ہیں، جن میں فرض کی آخری دورکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا ذکر ہے یا پڑھنے کا حکم ہے۔

قال محمد: السنة أن تقرأ فى الفريضة فى الركعتين الأوليين بفاتحة الكتاب وسورة

وفـي الأخـريين بفاتحة الكتاب ، وإن لم تقرأ فيها أجزأک وإن سبحت فيهما أجزأک وهو قول أبي حنيفة . (الموطاللامام محمد،رقم:۱۳۴).

امام محمدؒ نے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو سنت فرمایا ہے اور اس کی نسبت امام ابوحنیفہؒ کی طرف فرمائی ہے۔
تسبیح اور سکوت والاقول بھی بعض صحابہ اور بعض تابعین سے مروی ہے لیکن کوئی مرفوع حدیث دستیاب نہیں ہوئی۔

قـال الإمـام أبـويـوسف فی کتاب الآثار: عن أبی حنيفةؒ عن حماد ، عن إبراهيم ، عن أصـحـاب ابـن مسـعـود رضـي الـلّـه تعالیٰ عنهم: إنهم کانوا يقرء ون فی الرکعتين الأوليين بفاتحة الکتاب وشيء معها ، ولا يقرء ون فی الأخريين شيئاً . (کتاب الآثار:رقم: ۱۰۹).

نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں مزید آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔

قـال فـی الـدرالـمـختـار: (وهـو مـخيـر بين قراء ة) الفاتحة وصحح العينی وجوبها (وتسبيـح ثـلاثاً) وسکوت قدرها وفی النهاية قدر تسبيحة فلا يکون مسيئاً بالسکوت علی الـمـذهـب لثبوت التخيير عن عليؓ وابن مسعودؓ وهوالصارف للمواظبة عن الوجوب . وفی الشـامية : قـولـه وصـحـح الـعينی وجوبها ، هذا مقابل ظاهرالرواية ، وهورواية الحسن عن الإمـام وصـحـحها ابن الهمام أيضاً من حيث الدليل، ومشی عليه فی المنية ...لکن الأصح عـدمـه...قـوله فلا يکون مسيئاً بالسکوت علی المذهب، اعلم أنهم اتفقوا في ظاهرالرواية عـلـی أن قـراء ة الفاتحة أفضل، و علی أنه لو اقتصر علی التسبيح لا يکون مسيئاً ، و أما لو سـکـت فصرح فی المحيط بالإساء ة...وإن سکت عمداً أساء لترک السنة ، ولو ساهياً لا سهو عليه ، وصرح غيره بالتخيير بين الثلاثة في ظاهرالرواية وعدم الإساء ة بالسکوت قال فـی البـدائـع : والصحيح جواب ظاهر الرواية لما روينا عن عليؓ وابن مسعودؓ ...وهذا باب لايدرک بالقياس، فالمروی عنهما کالمروی عن النبي صلی اللّٰه عليه وسلم ...

ثـم اعـلـم أن اتفاقهم علی أفضلية الفاتحة لا ينافی التخيير إذ لا مانع من التخيير بين الفاضل والأفضل کالحلق مع التقصير . (فتاوی الشامی : ۱/۵۱۱،۵۱۲،سعید).

للاستزادة انظر: (البحر الرائق: ۱/۳۲۶،ط: كوئٹه، وفتح القدير: ۱/۴۵۳،دار الفكر، وفتح باب العناية: ۱/۲۶۱، وحاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح ،ص ۲۷۰،قديمی، والهداية: ۱/۱۱۱، والبناية شرح الهداية: ۲/۳۱۵، والجوهرة النيرة: ۱/۱۹۲،قديمی، وتحفة الفقهاء: ۱/۲۲۳).

خلاصہ یہ ہے کہ فرض کی آخری دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھنا سنتِ مؤکدہ اور افضل ہے اور تسبیحات پر اکتفا کرنا یا سکوت بھی جائز ہے، بلا کراہت نماز ہو جائے گی۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دعائے قنوت میں ملحق اسم فاعل ہے یا اسمِ مفعول؟

سوال: دعائے قنوت میں ”**إن عذابک بالکفار ملحق**“ اسمِ فاعل کا صیغہ ہے یا اسمِ مفعول بظاہر اسمِ مفعول کا صیغہ ہونا چاہیے، یعنی آپ کا عذاب کافروں کے ساتھ ملا دیا جائیگا، اسمِ فاعل ہوگا تو کیا معنی بنے گا؟ اور روایت کس طرح ہے اور کیسی ہے؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: یہ روایت بیہقی میں مرفوعاً وموقوفاً مروی ہے البتہ مرفوع روایت کو امام بیہقی نے مرسل قرار دیا ہے اور موقوفاً علی عمرؓ کو صحیح بتلایا ہے، نیز مراسیل ابوداود میں بھی یہ روایت مرفوعاً مذکور ہے لیکن اس میں ایک راوی عبدالقاہر مجہول ہے، نیز یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق میں حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔

علمائے کرام کی تصریحات سے پتا چلتا ہے کہ اس روایت میں مشہور وصحیح **ملحِق** بالکسر ہے اگرچہ بالفتح کا بھی ایک قول ہے، بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بالفتح لغۃً معنی صحیح ہے لیکن روایۃً ثابت نہیں ہے۔

ملحق بالکسر کے علماء نے دو معانی بیان فرمائے ہیں: (۱) ملحق بمعنی لاحق۔ (۲) **ملحق العصاة بالكفار في التعذيب**۔ یعنی **من نزل به العذاب ألحقه بالكفار**. (المجموع المغيث: ۳/۱۱۶،العربية).

القاموس الوحید میں ہے: **ألحق به**: کسی کو پالینا، کسی تک پہنچ جانا، دعاء قنوت میں ہے: **إن عذابک الجد بالکفار ملحق**، تیرا واقعی عذاب کفار کو لپیٹ میں لے کر رہے گا۔ (القاموس الوحید: ۲/۱۴۵۹)۔

لغات الحدیث میں ہے: الحاق؛ پالینا، پیچھے کر دینا، مل جانا، **إن عذابک بالکفار ملحق**۔ تیرا

عذاب کافروں کو لگنے والا ہے (مشہور روایت بکسر حا ہے، ایک روایت میں بہ فتحہ حا ہے، آخری قول کو لغت والوں نے اچھا کہا ہے)۔ (لغات الحدیث، کتاب ل: ۲۲/۴، ط: میر محمد کتب خانہ)۔

دعائے قنوت کا ثبوت: مراسیل ابی داود میں روایت ہے:

ثنا سليمان بن داود ، ثنا بن وهب ، أخبرني معاوية بن صالح عن عبد القاهر عن خالد بن أبي عمران قال: بينا رسول الله صلى الله عليه وسلم يدعو على مضر إذ جاء ه جبريل فأومأ إليه أن اسكت فسكت...ثم علمه هذا القنوت: اللّٰهم إنا نستعينک...الخ .

قال الشيخ شعيب: إسناده ضعيف لجهالة عبد القاهر وهو ابن عبد الله ويقال أبوعبدالله فإنه لم يوثقه غير ابن حبان ولم يرو عند غيرمعوية بن صالح . (مراسيل ابى داود ، مع التعليقات ،ص ۱۱۸ ، رقم الحديث : ۸۹).

قال ابن حجرؒ في التقريب: مجهول. (۴۱۴۳،ص ۳۲۲،ط:دارابن حزم بيروت).

السنن الکبریٰ للامام البیہقی میں مذکورہ بالا مرسل روایت کے بعد مرقوم ہے:

وقد روى عن عمر بن الخطاب رضي اللّٰه تعالىٰ عنه صحيحاً موصولاً أخبرنا أبوعبدالله الحافظ وأبوسعيد بن أبى عمرو قالا: حدثنا أبوالعباس: محمد بن يعقوب حدثنا أسيد بن عاصم حدثنا الحسين بن حفص عن سفيان قال: حدثنى ابن جريج عن عطاء عن عبيد بن عمير: أن عمر ﷺ قنت بعد الركوع، فقال: اللّٰهم اغفر لنا وللمؤمنين والمؤمنات ... بسم اللّٰه الرحمن الرحيم ، اللّٰهم إنا نستعينک ونستغفرک...الخ، و رواه سعيد بن عبدالرحمن بن ابزى عن أبيه عن عمر فخالف هذا في بعضه .

أخبرنا أبوعبد اللّٰه الحافظ حدثنا أبوالعباس: محمد بن يعقوب أخبرنا العباس بن الوليد أخبرني أبي حدثنا الأوزاعي حدثني عبدة بن أبي لبابة عن سعيد بن عبد الرحمن بن أبزى عن أبيه قال: صليت خلف عمر بن الخطاب ﷺ صلاة الصبح ، فسمعته يقول بعد القراء ة قبل الركوع : اللّٰهم إياک نعبد ، و لک نصلى و نسجد .... وروينا عن أبى عمرو

بـن الـعـلاء أنـه كـان يـقرأ في دعاء القنوت إن عذابک بالكفار ملحِق يعنی بخفض الحاء .
(السنن الكبری للامام البيهقی : ۲/ ۲۱۰، ۲۱۱،ط: دائرة المعارف ،حيدرآباد).

مزید آثار کے لیے ملاحظہ ہو: (البدرالمنير: ۱۰/ ۳۱۱،ط: دارالعاصمة ،ومصنف ابن ابی شيبه :۵/ ۴۵، المجلس العلمی ، ومصنف عبدالرزاق ،رقم؛ ۴۹۶۸،والدرالمنثور:۲۹۵/۸،وتهذيب الآثار للطبری: ۱/ ۳۵۱، مسندابن عباس ،ط:القاهرة).

غریب الحدیث میں ہے:

وأما قوله بالكفار ملحق فهكذا يروی الحديث فهو جائز فی الكلام أن يقول ملحق يريد لاحق لأنهما لغتان ، يقال لحقت القوم وألحقتهم بمعنی . (غريب الحديث للهروی: ۹٦/۲،كتب العلمية).

غريب الحديث لابن قتيبه میں ہے:

إن عذابک بالكفار ملحِق بكسرالحاء ولا تفتح هكذا يروی هذا الحرف ، يقال: لحقت القوم وألحقتهم بمعنی واحد وملحق في هذا الموضع بمعنی لاحق ومن قال: ملحَق بفتح الحاء أراد أن الله عزوجل يلحقه إياه وهو معنی صحيح غير أن الرواية هي الأولی و مثل لاحق وملحق تابع متبع يقال تبعت القوم واتبعتهم .(غريب الحديث لابن قتيبة: ۱/ ۱۷۱) .

وللمزيد راجع : (النهاية فی غريب الحديث :۲۳۸/۴،مكتبة علمية،والمجموع المغيث فی غريبی القرآن والحديث :۱۱٦/۳،والمرقاة المفاتيح : ۱۷۴/۳،ط:امداديه،والصحاح للجوهری:۱۲۷۴/۴،احياء التراث، والبحرالرائق:۴۲/۲،كوئٹه، والفتوحات الربانية علی الاذكار النووية:۳۰٦/۲،دارالفكر). **واللہ ﷻ اعلم۔**

خطبہ جمعہ میں عربی اشعار پڑھنے کا حکم:

سوال: ایک مولوی صاحب جمعہ کے خطبہ میں عربی اشعار پڑھتے ہیں ،کیا اشعار پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہو تو کراہت کے ساتھ یا بلا کراہت؟ بينوا توجروا۔

الجواب: خطبہ جمعہ میں عربی اشعار پڑھنا جائز ہے ،البتہ خلافِ سنت ہونے کی وجہ سے مکروہ اور

خلافِ اولیٰ ہے۔ ملاحظہ ہو؛ الشامل فی فقہ الخطیب والخطبہ میں مذکور ہے:

وقد اطلعت على رأى خاصة للشيخ بكر أبوزيد حول تضمين خطبة الجمعة أبياتاً من الشعر وها أنا ذا أورد كلامه من باب الفائدة ...فقد قال بما نصه: لا أعرف في خطبة النبي صلى الله عليه وسلم ولا في خطب الصحابة رضي الله تعالىٰ عنهم الاستشهاد بالشعر ببيت فصاعداً ، وعلى هذا جرى التابعون لهم بإحسان ، وقد استمرأ بعض الخطباء في القرن الرابع عشر تضمين خطبة الجمعة البيت من الشعر فأكثر ، بل ربما صار الاستشهاد بمقطوعات شعرية متعددة ، وربما كان إنشاد بيت لمبتدع ، أو زنديق أو ماجن .

والمقام في: خطبة الجمعة : مقام له خصوصيات متعددة يخالف غيره من المقامات في الدروس، والمحاضرات ، والوعظ ، والتذكير ، وهومقام عظيم، لتبليغ هذا الدين صافياً يجهر فيها الخطيب بنصوص الوحيين الشريفين ، وتعظيمهما في القلوب ، والبيان عنهما بما يليق بمكانتهما ، ومكانة فرائض الإسلام ، فلا أرى لك أيها الخطيب للجمعة إلا اجتناب الإنشاد في خطبة الجمعة ، تأسياً بالنبي صلى الله عليه وسلم وهو بك أجمل وبمقامك أكمل ، والله المستعان . (الشامل فی فقه الخطيب والخطبة للشيخ سعود بن ابراهيم بن محمد الشريم امام وخطيب المسجدالحرام).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے: خطبہ جمعہ میں عربی کے اشعار پڑھنا خلافِ اولیٰ ہے، نثر عربی میں خطبہ ہوتو بہتر ہے۔(کفایت المفتی:۵/ ۲۲۸، ط: جامعہ فاروقیہ)۔

فتاویٰ رشیدیہ میں مذکور ہے: خطبہ جمعہ وعیدین میں اشعار پڑھنا خلافِ سنت کے ہے، لہٰذا مکروہ ہوگا، قرونِ مشہود لہا بالخیر میں ثبوت اس کا نہیں۔(فتاویٰ رشیدیہ ص ۴۵۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

نماز ادا کرنے کے بعد اذان ہونے پر جواب دینے کا حکم:

سوال: ہم نے ظہر کی نماز وقت داخل ہونے کے بعد اذان سے پہلے کسی وجہ سے پڑھی جب ہم فرض

نماز سے فارغ ہوئے تو ہماری مسجد میں اذان شروع ہوئی، اب اِس صورت میں ہمارے لیے اذان کا جواب دینا مسنون ہے یا نہیں؟ نیز جو عورتیں گھر پر نماز پڑھتی ہیں ان کو اذان کا جواب دینا چاہیے یا نہیں؟

الجواب: فرض نماز سے فراغت کے بعد اذان شروع ہو تب بھی اذان کا جواب دینا مستحب ہے، اذان درحقیقت پورے دین کی طرف دعوت کی شکل ہے، جس نے نماز پڑھ لی وہ بھی اذان کا جواب دے، اور آنے والی نماز کی نیت کرے اور پورے دین جس میں فلاح اور کامیابی ہے اس کی دعوت کا عہد کرے کہ میں اس کو اپنا مشن بناؤں گا۔ نیز عورتیں جو گھروں پر نماز پڑھتی ہیں ان کے لیے بھی اذان کا جواب دینا مستحب ہے۔

احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: **فقولوا: مثل ما يقول المؤذن**'' یعنی مؤذن کے الفاظ دہراؤ، یہ مطلق ہے اور امر استحباب کے لیے ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن أبي سعيد الخدري ﷺ: أن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم قال: إذا سمعتم النداء فقولوا مثل مايقول المؤذن. (صحيح البخاري: ۱/۲۶/۱۲۱۱،باب مايقول اذا سمع المنادى).

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ فرض نماز میں مشغول اذان کا جواب نہ دے، ہاں سلام پھیرنے کے بعد اذان کا جواب دے۔ ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں مرقوم ہے:

باب ما يقول إذا سمع المنادى...فمن أسباب المنع: أن يكون فى الخلاء، أو جماع أهله أو نحوها، ومنها أن يكون في صلاة، فمن كان في صلاة فريضة أو نافلة وسمع المؤذن لم يوافقه فى الصلاة، فإذا سلم أتى بمثله. (عمدة القاري: ۴/۱۶۵،ط:دارالحديث ملتان، وكذا فى البنايةشرح الهداية: ۲/۱۰۹).

قال في رد المحتار: قوله من سمع الأذان يفهم منه أنه لولم يسمع لصمم أو لبعد أنه لايجيب وهو ظاهر الحديث الآتى إذا سمعتم الأذان، حيث علق على السماع وقد صرح بعض الشافعية بأنه الظاهر وبأنه يجيب في جميعه إذا لم يسمع إلا بعضه...تنبيه: هل يجيب بعد الفراغ من هذه المذكورات أم لا، ينبغي أنه إن لم يطل الفصل فنعم وإن طال فلا. (فتاوى الشامي: ۱/۳۹۷، سعيد).

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مرقوم ہے:

سوال: کیا عورتوں کو بھی اذان کا جواب دینا چاہیے؟

جواب: جی ہاں، مگر حیض ونفاس والی جواب نہ دیں۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/ ۳۱۷)۔

مزید ملاحظہ ہو: (الفتاوی الہندیۃ: ۱/ ۳۸، مراقی الفلاح ص ۱۱۰، وکتاب الفتاویٰ: ۲/ ۱۳۳)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دیوارِ محراب پر آیاتِ قرآنیہ کی کتابت کا حکم:

سوال: بعض مساجد میں دیوارِ محراب پر آیاتِ قرآنیہ لکھتے ہیں، میں نے بعض علماء سے سنا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اس کو مکروہ لکھا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو آپ فقہ کی کتاب کا حوالہ بتادیں؟

الجواب: مساجد میں دیوارِ محراب پر نقش ونگار یا قرآنی آیات کی کتابت وغیرہ مکروہ اور خلافِ اولیٰ ہے کیونکہ نمازی کا دل اس میں مشغول ہوکر خشوع ختم ہوجاتا ہے، خصوصاً اجنبی کے لیے زیادہ باعثِ تشویش بھی ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں منقول ہے:

وكره بعض مشايخنا النقوش على المحراب وحائط القبلة لأن ذلك يشغل قلب المصلي. (الفتاویٰ الهندية: ۵/ ۳۱۹).

وقال في الدرالمختار؛ ولا بأس بنقشه خلا محرابه فإنه يكره لأنه يلهي المصلي، ويكره التكلف بدقائق النقوش ونحوها خصوصاً في جدار القبلة قاله الحلبي، وفي حظر المجتبى: وقيل: يكره في المحراب دون السقف والمؤخر انتهى، وظاهره أن المراد بالمحراب جدار القبلة، فليحفظ. (الدرالمختار: ۱/ ۶۵۸، سعيد).

(وكذا في المحيط البرهاني: ۶/ ۴۶، مكتبه رشيديه).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے: دیواروں، دروازوں، محرابوں یا عمارت کے کسی حصہ پر آیات واحادیث یا ان کا ترجمہ لکھنا خلافِ ادب اور مکروہ ہے۔ (کفایت المفتی: ۱۰/ ۳۸۵، ط: جامعہ فاروقیہ)۔

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے: مسجد کی بیرونی دیواروں پر نقش ونگار جائز ہے، اندر کے حصہ میں محراب اور قبلہ کی

دیوار پر نقش ونگار مکروہ ہے اوردائیں بائیں کی دیواروں کے متعلق بھی ایک قول کراہت کا ہے۔(۶/۴۵۹)۔

لیکن اگر کسی تختی پر آیاتِ قرآنیہ لکھ کر دیوار پر معلق کیا جائے تو یہ بالکل مناسب نہیں کیونکہ اس میں تختی کے گر جانے کا اندیشہ ہے جس سے آیات کریمہ کی بے حرمتی ہوگی۔

قال في الدرالمختار: ولا ينبغي الكتابة على جدرانه أى خوفاً من أن تسقط . (الدر المختار مع ردالمحتار: ۱/۶۶۳،سعید).

قال في الفتاوى الهندية: وليس بمستحسن كتابة القرآن على المحاريب والجدران لما يخاف من سقوط الكتابة وأن توطأ. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۰۹،رشیدیہ).

وفي الفقه على المذاهب الأربعة : الحنفية ؛ قالوا: لاينبغي الكتابة على جدران المسجد خوفاً من أن تسقط وتهان بوطء الأقدام. (الفقه على المذاهب الاربعة: ۱/۲۳۵، قاهرة). **واللہ ﷻ اعلم۔**

نماز میں عورت کا گلا کھلا رہ جائے تو نماز کا حکم:

سوال: ایک عورت نے نماز پڑھی اور نماز کے دوران اس کا حلق کھلا ہوا تھا، اس پر دوپٹہ یا کپڑا نہیں تھا، باقی بدن مستور تھا تو اس عورت کی نماز ہوئی یا نہیں؟ یعنی حلق کا چھپانا لازم ہے یا نہیں؟

الجواب: عورت کا پورا بدن ستر میں داخل ہے لہٰذا نماز میں اس کا چھپانا فرض ہے فقط چہرہ، دونوں ہتھیلی اور دونوں قدم، ان اعضا کا چھپانا لازم نہیں، چنانچہ اگر گلا کھلا رکھ کر نماز پڑھی تو نماز نہیں ہوئی، اس کا اعادہ لازم ہوگا۔ ملاحظہ ہو امداد الفتاح میں مرقوم ہے:

ولا بد لصحة الصلاة من سبعة وعشرين شيئاً...وستر العورة ...وجميع بدن الحرة عورة إلا وجهها وكفيها وقدميها. (امداد الفتاح ،ص ۲۲۶).

علامہ شامیؒ نے اعضائے مستورہ میں عنق کا تذکرہ فرمایا ہے؛ ملاحظہ ہو:

أعضاء عورة الرجل ثمانية...وفي الأمة ثمانية أيضاً...وفي الحرة هذه الثمانية ويزاد فيها ستة عشر ...العنق. (فتاوى الشامي: ۱/۴۰۹،سعید).

عنق گلا اور گردن دونوں کو شامل ہے؛ علامہ شامیؒ نے ذبح اختیاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حلق کا لفظ کبھی کبھی عنق کے لیے استعمال ہوتا ہے اور دونوں میں علاقہ جزئیت ہے یعنی عنق کل ہے اور حلق اس کا ایک جزو ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

و ذكاة الاختيارية ذبح بين الحلق و اللبة ، الحلق فى الأصل الحلقوم كما فى القاموس: أى من العقدة إلى مبدء الصدر، وكلام التحفة والكافى وغيرهما يدل على أن الحلق يستعمل فى العنق بعلاقة الجزئية ، فالمعنى بين مبدء الحلق ؛ أى أصل العنق. (فتاوى الشامي: ۲۹۴/۶، سعيد).

علامہ زیلعیؒ نے نحر وذبح کی تعریف میں لکھا ہے کہ نحر اسفل العنق میں ہوتا ہے اور ذبح اعلی العنق میں ہوتا ہے اور یہ ایک بدیہی بات ہے کہ نحر وذبح دونوں حلق میں ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ عنق حلق کو شامل ہے۔

عبارت ملاحظہ ہو: **والنحر قطع العروق في أسفل العنق عند الصدر والذبح قطع العروق في أعلى العنق تحت اللحيين .** (تبيين الحقائق: ۲۹۳/۵، امداديه).

عمدة الفقہ میں ہے: آزاد عورتوں کے لیے پانچ عضو (منہ "چہرہ" دونوں ہتھیلیوں اور دونوں قدموں) کے علاوہ سارا بدن ستر ہے اور وہ تیس اعضاء ہیں:... (۵) گردن اس میں گلا بھی داخل ہے۔ (عمدة الفقہ: ۵۴/۲)۔

عام طور پر عورتیں جب برقع یا دوپٹہ پہنتی ہیں تو گلے کو بھی چھپاتی ہیں لہٰذا اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے۔

واللہ ﷻ اعلم۔

"من القانتين" کی جگہ "من القانطين" پڑھنے سے نماز کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے نماز میں" **وكانت من القانتين** " کی جگہ **من القانطين** پڑھا، کیا نماز ہوئی یا نہیں؟ بينوا توجروا۔

الجواب: پوری آیتِ کریمہ یوں ہے: ﴿ **ومريم ابنة عمران التي أحصنت فرجها فنفخنا فيه من روحنا وصدقت بكلمات ربها وكتبه وكانت من القانتين** ﴾ [التحريم: ۱۲]، اب اگر

قانطین پڑھا جائے تو اس کے معنی کی تصحیح یوں ہوسکتی ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا شوہر نہ ہونے کی وجہ سے بچے سے ناامید تھی لیکن خلافِ عادت اللہ تعالیٰ نے بچہ دیدیا، اور بعض فقہاء کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ اگر تاویل بعید کے ساتھ معنی صحیح ہوجاتے ہیں تو پھر بھی نماز صحیح ہے۔

ملاحظہ ہو شیخ ابراہیم حلبیؒ شرح منیۃ المصلی میں فرماتے ہیں:

فينبغي أن ينظر إلى تغيير المعنى بسبب ذلك الحرف فإن كان فاحشاً تفسد وإن صح معناه ولو بعيداً كثيراً من المعنى المراد لا تفسد . (شرح منية المصلى، ص۴۸۳، سهيل).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ومنها ذكر حرف مكان حرف...وإن غير المعنى فإن أمكن الفصل بين الحرفين من غير مشقة كالطاء مع الصاد فقرأ الطالحات مكان الصالحات تفسد صلاته عند الكل .

(الفتاوى الهندية: ۱/۷۹). مزید ملاحظہ ہو: (فتاوى الشامي: ۱/۶۳۱، سعيد).

البتہ بہتر یہ ہے کہ نماز کا اعادہ کرلیا جائے کیونکہ فقہاء کے ہاں قاعدہ مشہور ہے: **الصلاة إذا دارت بين الصحة والفساد تعاد احتياطاً**۔ یعنی ظاہری معنی سے خرابی پیدا ہوتی ہے اور نماز فاسد ہوجاتی ہے گو بہ تاویل معنی صحیح ہوکر نماز درست ہوسکتی ہے تب بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اعادہ کرلیا جائے تا کہ بالیقین ذمہ فارغ ہوجائے، نیز عام علماء تاویل بعید کو ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں تو وہ نماز کو فاسد ہی قرار دیں گے، اس لیے اس میں تہمت اور خلجان کا ازالہ بھی ہے۔ ملاحظہ ہو محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

قال في فتح القدير: دارت الصلاة بين الصحة والفساد فتفسد احتياطاً . (فتح القدير: ۱/۵۲۰، دار الفكر). وكذا في المحيط البرهاني: ۲/۲۴، دار احياء التراث العربي). **واللہ ﷻ اعلم۔**

وربك أعلم بالمفسدين کی جگہ بالمهتدين پڑھنے سے نماز کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے فجر کی نماز میں ایک آیتِ کریمہ: ﴿**ومنهم من يؤمن به ومنهم من لايؤمن به وربك أعلم بالمفسدين**﴾ کی جگہ **بالمهتدين**، پڑھا تو نماز ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: آیتِ کریمہ کے معنی صحیح ہے لہٰذا نماز صحیح اور درست ہوگئی۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

ومنها ذكر كلمة مكان كلمة على وجه البدل إن كانت الكلمة التي قرأها مكان كلمة يقرب معناها وهي فى القرآن لا تفسد صلاته نحو إن قرأ مكان العليم الحكيم وإن لم تكن تلك الكلمة فى القرآن لكن يقرب معناها عن أبى حنيفة ومحمد لا تفسد . (الفتاوى الهندية: ۱/۸۰).

حاشية الطحطاوى میں مرقوم ہے:

وضع حرف موضع حرف آخر فإن كانت الكلمة لا تخرج عن لفظ القرآن ولم يتغير به المعنى المراد لا تفسد كما لو قرأ إن الظالمون بواو الرفع أوقال: والأرض وما دحاها مكان طحاها. (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، ص ۳۴۰، قديمى).

فتاویٰ شامی میں مرقوم ہے: **قوله أو بدله بآخر، وأما أن يكون خطأ، وحينئذٍ فإذا لم يغير المعنى، فإن كان مثله فى القرآن نحو، إن المسلمون لا تفسد، وإلا نحو قيامين بالقسط، وكمثال الشارح لا تفسد عندهما.** (فتاوى الشامى: ۱/۶۳۳، سعيد). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

ایک امام کا نمازِ جمعہ میں دومرتبہ دومختلف جماعت کی امامت کا حکم:

سوال: ایک مسجد میں جمعہ کی نماز دومرتبہ جماعت سے پڑھی جاتی ہے اور ایک ہی امام دونوں مرتبہ امامت کرتا ہے، کیا اس صورت میں دوسری جماعت کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: احناف کے نزدیک امام کی پہلی نماز سے فرض ادا ہو چکا، اب دوسری نماز نفل ہے تو نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی اقتدا درست نہیں ہوگی، لہٰذا دوسری جماعت کی نماز نہیں ہوئی۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے: **و لا يصلى المفترض خلف المتنفل لأن الاقتداء بناء ووصف الفرضية معدوم فى حق الإمام فلا يتحقق البناء على المعدوم .** (الهداية: ۱/۵۸، ط: المكتبة الاسلامية). (وكذا فى الجوهرة النيرة: ۱/۷۳). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

جمعہ کی دوسری جماعت میں پہلا خطیب ہو اور دوسرا امام ہو تو نماز کا حکم:

سوال: اسپین میں ایک مصلے میں جگہ کی تنگی اور لوگوں کی کثرت کی وجہ سے دو دفعہ جمعہ کی نماز ہوتی ہے کیونکہ ایک ساتھ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ پہلی جماعت کو ایک امام نے خطبہ اور نماز پڑھائی اب وہی امام دوسری جماعت کو صرف خطبہ پڑھائے اور نماز دوسرا امام پڑھائے جس نے پہلی جماعت میں شرکت نہیں کی تھی تو کیا نماز صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صحتِ جمعہ کے لیے خطیب پر جمعہ کا فرض ہونا شرط نہیں، اگر نابالغ بچہ بھی خطبہ دیدے اور بالغ امامت کرائے تو نمازِ جمعہ صحیح ہوجائیگی، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں بھی نماز صحیح اور درست ہوگئی۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں کرنا چاہیے دوسری جماعت کے لیے جو امام ہو اسی کو خطبہ بھی دینا چاہیے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

خطب صبي بإذن السلطان وصلى بالغ جاز كذا في الخلاصة. (۱۴۱/۲، سعید).

وقال في الدرالمختار: وهو المختار، وقال الشامي: والأكثر على الجواز. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۱۶۲/۲، سعید).

وقال في مجمع الأنهر: ولا ينبغي أن يصلى غير الخطيب لأن الجمعة مع الخطبة كشيء واحد فإن فعل بأن خطب صبي بإذن السلطان وصلى بالغ جاز. (مجمع الانهر: ۱۷۲/۱، ط: کوئٹہ). **وكذا في حاشية الطحطاوي** (۵۰۸/۱) **وزاد فيه: لكن الأولى الاتحاد كما في شرح الآثار.** (وكذا في خلاصة الفتاوى: ۲۰۵/۱).

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے: اس بارے میں صریح جزئیہ نہیں ملا، البتہ چونکہ صحتِ خطبہ کے لیے شرط نہیں ہے کہ خطیب پر جمعہ فرض ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص خطبہ پڑھ سکتا ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۱۲۸/۴)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

صراحۃً کہیں یہ جزئیہ نہیں دیکھا اتنا ضرور لکھتے ہیں کہ خطیب وامام کا ایک ہی شخص ہونا ضروری نہیں، البتہ اولیٰ یہ ہے کہ جو شخص خطبہ پڑھے وہی جمعہ پڑھائے، ساتھ میں یہ بھی ہے کہ اگر نابالغ لڑکے نے خطبہ پڑھا اور

بالغ نے جمعہ پڑھایا تب بھی جمعہ ادا ہو جائیگا، کیونکہ جو شخص جمعہ ادا کر چکا ہے اب اس کے ذمہ جمعہ نہیں رہا، وہ اگر کسی دوسری مسجد میں جمعہ میں شریک ہو جائے گا تو اس کے حق میں یہ نماز نفل ہوگی جیسے کہ نابالغ کے حق میں اور نابالغ کا خطبہ پڑھنا بھی جوازِ جمعہ کے لیے کافی ہے تو اس طرح سے بظاہر اس کا جمعہ پڑھنا بھی کافی ہو جائے گا۔

(فتاویٰ محمودیہ: ۸/ ۲۶۸، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

جمعہ کی سنتِ بعدیہ میں حضرت علیؓ سے ۴ رکعات پہلے پڑھنے والی روایت کی تحقیق:

سوال: کیا روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جمعہ کے دن بعد والی سنتوں میں ۴ رکعات پہلے پڑھتے تھے اور ۲ بعد میں؟ اگر ثابت ہو تو کسی حدیث کی کتاب سے حوالہ پیش فرمادیں؟

الجواب: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب روایت، تتبع بسیار کے باوجود کسی حدیث کی کتاب میں نہیں ملی، ہاں کتبِ فقہ میں دونوں باتیں منقول ہیں، (پہلے دو پھر چار اور اس کے برعکس) علامہ سرخسیؒ نے مبسوط میں اور علامہ شامیؒ نے منحۃ الخالق حاشیۃ البحر الرائق میں ذکر فرمایا ہے لیکن کوئی سند ذکر نہیں فرمائی۔

نیز علامہ عینیؒ نے نخب الافکار میں حضرت علیؓ وحضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ دونوں حضرات پہلے چار پڑھتے تھے، اور امام طحاویؒ نے شرح مشکل الآثار میں بتاویل یہ بات فرمائی ہے۔

دلائل ملاحظہ فرمائیں: علامہ سرخسیؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

قال: والتطوع بعد الجمعة أربع لا فصل بينهن إلا بتشهد وقبل الجمعة أربع ... و اختلفوا بعدها، قال ابن مسعود رضي الله عنه أربعاً وبه أخذ أبوحنيفةؒ ومحمدؒ لحديث أبي هريرة رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من كان مصلياً بعد الجمعة فليصل أربع ركعات، وقال علي رضي الله عنه: يصلي بعدها ستاً أربعاً ثم ركعتين وبه أخذ أبويوسفؒ، وقال عمر رضي الله عنه: ركعتين ثم أربعاً، فمن الناس من رجح قول عمر رضي الله عنه بالقياس على التطوع بعد الظهر وأبويوسفؒ أخذ بقول علي رضي الله عنه، فقال: يبدأ بالأربع لكيلا يكون متطوعاً بعد الفرض مثلها. وهذا ليس بقوي فإن الجمعة بمنزلة أربع ركعات لأن الخطبة شطر الصلاة. (المبسوط: ۱/ ۲۸۷، ط: بيروت).

علامہ شامیؒ منحۃ الخالق میں فرماتے ہیں:

قوله وعن أبي يوسفؒ، الخ ، قال في الذخيرة : وعن عليؓ أنه يصلي ستاً ؛ ركعتين ثم أربعاً وعنه رواية أخرى أنه يصلي بعدها ستاً؛ أربعاً ثم ركعتين وبه أخذ أبويوسفؒ والطحاويؒ وكثير من المشايخ ، وعلى هذا قال شمس الائمة الحلواني، الأصل أن يصلى أربعاً ثم ركعتين فقد أشار إلى أنه مخير بين تقديم الأربع وبين تقديم المثنى ولكن الأفضل تقديم الأربع كي لايصير متطوعاً بعد الفرض مثلها . (منحة الخالق على هامش البحر الرائق: ۲/ ۵۲).

علامہ شامیؒ نے ۴ پہلے پڑھنے کے بارے میں امام طحاویؒ کا حوالہ دیا ہے؛ چنانچہ امام طحاویؒ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں: شرح معانی الآثار میں فرماتے ہیں:

باب التطوع بعد الجمعة كيف هو ؟ حدثنا يونس قال: ثنا سفيان عن سهيل بن أبى صالح عن أبيه ، عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان مصلياً منكم بعد الجمعة فليصل أربعاً قال أبوجعفر فذهب قوم إلى أن التطوع بعد الجمعة الذي لاينبغي تركه هو أربع ركعات لايفصل بينهن بسلام ، واحتجوا في ذلک بهذا الحديث، وخالفهم في ذلک آخرون فقالوا: بل التطوع بعد الجمعة الذي لاينبغي تركه ، ركعتان كالتطوع بعد الظهر ، واحتجوا في ذلک بما حدثنا أبوبشر الرقي، قال: حدثنا حجاج بن محمد عن ابن أبي ذئب عن نافع عن ابن عمر ؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان لايصلى الركعتين بعد الجمعة إلا في بيته...وخالفهم في ذلک آخرون فقالوا : التطوع بعد الجمعة الذى لا ينبغي تركه ست ركعات؛ أربع ثم ركعتان، وقالوا: قد يحتمل أن يكون رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ما رواه عنه أبوهريرة ؓ أولاً ثم فعل ما روى عنه ابن عمر ؓ فكان ذلک زيادة فيما تقدم من قوله ، و الدليل على ما ذهبوا إليه من ذلک أن سليمان بن شعيب حدثنا قال: حدثنا عبد الرحمن بن زياد ، قال حدثنا زهير بن معاوية عن

أبـي إسـحـاق، عـن عـطاء قال أبو إسحاق: حدثني غير مرة قال: صليت مع ابن عمر رضي الله عنه يوم الـجـمـعة فلما سلم قام فصلى ركعتين، ثم قال: فصلى أربع ركعات ، ثم انصرف ، فهذا ابن عمر رضي الله عنه قـد كـان يتـطوع بعد الجمعة بركعتين، ثم أربع ، فيحتمل أن يكون فعل ذلک لما قـد كان ثبت عنده من قول رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم في ذلک وفعله ، على ما ذكرنا وقد روى عن على بن أبي طالب رضي الله عنه مثل ذلک .

حـدثـنـا يـزيد بن سنان ، قال حدثنا عبد الرحمن بن مهدى ، قال: ثنا سفيان ، عن أبى حـصيـن ، عـن أبي عبد الرحمن، عن علي رضي اللّٰه تعالىٰ عنه ، أنه قال: من كان مصلياً بعد الجمعة فليصل ستاً .

حـدثنا يونس ، قال ثنا سفيان، عن عطاء بن السائب ، عن أبي عبد الرحمن، قال: علم ابن مسعود رضي الله عنه أن يصلوا بعد الجمعة أربعاً فلما جاء على بن أبي طالب رضي الله عنه علمهم أن يصلوا ستـاً . حـدثنا ابن أبى داود ، قال: حدثنا حماد بن يونس ، قال: ثنا إسرائيل، عن أبي إسحاق عـن أبى الرحمن السلمى، قال: قدم علينا عبد اللّٰه فكان يصلي بعد الجمعة أربعاً فقدم بعده علي رضي الله عنه فـكان إذا صلى الجمعة صلى بعدها ركعتين وأربعاً فأعجبنا فعل علي رضي الله عنه فاخترناه . فثبـت بما ذكرنا أن التطوع الذي لا ينبغي تركه بعد الجمعة ست ، وهو قول أبي يوسف رحمه الله إلا أنـه قـال: أحب إلي أن يبدأ بالأربع ثم يثنى بالركعتين لأنه هو أبعد من أن يكون قد صلى بعد الجمعة مثلها على ما قد نهى عنه .

فإنه حدثنا يزيد بن سنان قال: ثنا عبد الرحمن بن مهدى، قال: ثنا سفيان عن الأعمش عن إبراهيم ، عن سليمان بن مسهر عن خرشة بن الحر ، أن عمر رضي الله عنه كان يكره أن يصلى بعد صـلاـة الجمعة مثلها . قال أبوجعفر : فلذلک استحب أبويوسف رحمه الله أن يقدم الأربع قبل الركعتين لأنهن لسن مثل الركعتين فكره أن يقدم الركعتان لأنهما مثل الجمعة .

حضرت امام طحاویؒ کی اس تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں اقوال میں تطبیق یہ ہوگی کہ ۴ کو مقدم کرے تا کہ جمعہ کے

بعد اس کے مثل دو رکعات پڑھنا لازم نہ آئے جو کہ حدیث سے ممنوع ہے۔لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ان کے نزدیک ثابت نہیں ورنہ ضرور بیان فرماتے، پھر شرح مشکل الآثار میں دوسری تاویل بیان فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ولا يكون ذكر الركعتين مقدماً فى الحديث على ذكر الأربع مانعاً أن يكون راوى ذلک يريد أنه قد صلى الأربع قبلهما ، لأنهم عرب ، والعرب قد تستعمل هذا في كلامها ، فتذكر الشيئين، وتقدم ذكر أحدهما على ذكر الآخر، والمؤخر منهما فى الذكر قد كان مقدماً فى الفعل على المقدم منهما فى الذكر وذلک موجود في كتاب اللّٰه تعالىٰ ، قال اللّٰه عزوجل ﴿يا مريم اقنتى لربک واسجدى واركعى مع الراكعين﴾[آل عمران:۴۳]**، فذكر الركوع مؤخراً وهو فى الصلوات التي يصليها المسلمون، وفى الصلوات التي كان أهل الكتاب يصلونها قبلهم مقدم على السجود ، ومثل ذلک قول اللّٰه عزوجل في آى المواريث: ﴿من بعد وصية يوصين بها أو دين﴾**[النساء:۱۲]**، فكان ذكر الدين مؤخراً على ذكر الوصية ، وكان المراد فيها أن يكون مقدماً على الوصية فمثل ذلک قد رويناه عن علي رضي الله عنه في صلاته الركعتين والأربع بعد صلاة الجمعة لا يمنع ذكر الراوى لذلک عنه الركعتين قبل ذكره الأربع أن تكون الأربع مرادات أن تكون مقدمات على الاثنتين المذكورتين قبلها حتى تكون هذه الآثار يصدق بعضها بعضاً ولا يخالف بعضها بعضاً ...**

(شرح مشكل الآثار: ۱۰/۳۰۵،ط:بيروت).

مشکل الآثار کی تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ عرب دو چیزیں مقدم موخر ذکر کرتے ہیں،اور عمل میں موخر مقدم ہوتی ہے جیسے آیتِ کریمہ میں رکوع موخر ہےاور سجدہ مقدم ہے جبکہ عملاً رکوع سجدہ پر مقدم ہے،اور آیتِ میراث میں وصیت دین پر مقدم ہے جبکہ عمل میں دین وصیت پر مقدم ہے۔

علامہ عینی کی نخب الافکار کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

وخالفهم في ذلک آخرون فقالوا: التطوع بعد الجمعة الذي لا ينبغي تركه ست ،

أربع ثم ركعتان. ش: أي خالف الفريقين المذكورين جماعة آخرون ؛ وأراد بهم : عطاء ومجاهداً وحميد بن عبدالرحمن والثوری والشافعي وأبايوسف ، فإنهم قالوا: التطوع بعد الجمعة الذی لا ينبغي تركه ست ركعات ، أربع بتسليمة ، ثم ركعتان بعدها، ويحكى ذلک عن علی بن أبي طالب رضي الله عنه وأبي موسى الأشعري رضي الله عنه .(نخب الافكار: ۵/۳۸۷،وزارة الاوقاف).

کوکب الدری میں حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا ہے کہ چھ رکعات تو ثابت ہیں البتہ ۴ کومقدم کرنے کی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی۔ہاں دومقدم کرنے کی روایت موجود ہے۔عبارت ملاحظہ ہو:

وأما ما قال أبويوسفؒ من كونها ستاً فثابت أيضاً إلا أن قوله أن يقدم الأربع على الركعتين فلم نجد رواية تساعده إلى وقتنا هذا بل الذي يثبت بالروايات هو تقديم الركعتين على الأربع وما ورد في بعضها من كان مصلياً بعد الجمعة فليصل أربعاً ليس مخالفاً بإيجابه التخيير لما عينه الإمام من الأربع لما أن ذلک قد يستعمل فيما ليس بواجب فالمعنى من شاء منكم أداء ما يسن عليه فليصل أربعاً .

قال الشيخ زكريا تحته نقلاً عن منحة الخالق: وقيل: وجه ذلک ما روى من الكراهة أن يصلى بعد صلاة مثلها، وفى البدائع: قال أبويوسفؒ: يصلى أربعاً ثم ركعتين كذا روى عن علي رضي الله عنه كي لايصير متطوعاً بعد صلاة الفرض بمثلها وفى هامش البحر عن الذخيرة ...الخ. (الكوكب الدرى: ۱/۴۲۴). (وكذا فى اوجز المسالک).

علامہ عبدالحی لکھنویؒ عمدۃ الرعایہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضي الله عنه کے بارے میں فرماتے ہیں:

وروى أبوداود والترمذى عن ابن عمر رضي الله عنه أنه كان يصلي بعد الجمعة ستاً تارة ركعتين، ثم أربعاً وتارة أربعاً ثم ركعتين ، وفى الصحيح عن ابن عمر رضي الله عنه: أنه كان إذا كان بمكة فصلى الجمعة تقدم فصلى ركعتين ،ثم تقدم فصلى أربعاً ، وإذا كان بالمدينة فصلى الجمعة رجع إلى بيته ، فصلى ركعتين ، ولم يصل فى المسجد ، فقيل له فى ذلک ، فقال:

کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یفعل ذلک ، وبھذا ذھب أبویوسفؒ إلی أن المسنون بعد الجمعة ست رکعات . (عمدۃ الرعایۃ : ۲/۲۱۷).

لیکن ترمذی اورابوداود میں اس طرح نہیں ہے، بلکہ دورکعات پہلے پڑھنے کا ذکر ہے، غالبًا اسی وجہ سے حضرت شاہ صاحبؒ نے تقدیم الرکعتین کوترجیح دی ہے۔عبارت ملاحظہ ہو:

وأما بعد الجمعة فرکعتان عند الشافعي ، وأربع عند أبي حنیفةؒ ، وست رکعات عند صاحبیہ ، وفی الست طریقان ، والمختار عندي أن یأتي بالرکعتین قبل الأربع لعمل ابن عمر رضی اللہ عنہ في سنن أبي داود . (العرف الشذی ،باب ماجاء فی الصلاۃ قبل الجمعۃ وبعدھا ،وکذافی فیض الباری : ۲/۴۵۰). **واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

بوقتِ جماعت صفوف کے درمیان سے گزرنے کا حکم:

سوال: نماز باجماعت کے وقت امام کے سامنے سترہ موجود ہے، جوکہ مقتدیوں کی طرف سے کافی ہے،لیکن کیا مقتدیوں کی صفوف کے درمیان سے بلاکراہت گزرنا جائز ہوگا یانہیں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: نماز باجماعت میں امام کا سترہ مقتدیوں کی طرف سے کافی ہے،اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صفوں کے درمیان سے بلاکراہت گزرنا جائز ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مقتدیوں کی صفوں کے سامنے سے گزرجائے تو اس پرگناہ نہیں، کیونکہ امام کے سامنے سترہ موجود ہے، ہاں صفوں کے درمیان سے بلا عذرگزرنے والا گنہگار اور مستحق وعید ہوگا۔ملاحظہ ہو حدیث شریف میں سخت وعید آئی ہے:

عن بسر بن سعید أن زید بن خالد أرسلہ إلی أبي جھیم یسألہ ماذا سمع من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی المار بین یدی المصلی، فقال أبوجھیم : قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : لو یعلم المار بین یدی المصلی ماذا علیہ لکان أن یقف أربعین خیراً لہ من أن یمر بین یدیہ . (رواہ البخاری : ۱/۱۰۸/۵۱۰،باب اثم المار بین یدی المصلی).

قال العلامة العینيؒ: والمرور بین یدی المصلی مکروہ ، إذا کان إماماً أو منفرداً أو

مصلياً إلى سترة ، وأشد منه أن يدخل المار بين السترة وبينه ، وأما المأموم فلا يضره من مر بين يديه ، كما أن الإمام أوالمنفرد لايضر واحد منهما ما مر من وراء سترته ، لأن سترة الإمام سترة لمن خلفه . (عمدة القاری: ۲/ ۰ ۷ ،ط:دارالفکر).

وقال في الدر المختار: كفت سترة الإمام للكل، وفي رد المحتار: قوله للكل أي للمقتدين به كلهم ، وعليه فلو مر مار في قبلة الصف في المسجد الصغير لم يكره إذا كان للامام سترة . (فتاوی الشامی: ۴/ ۱ ۳ ۱ ،باب مایفسدالصلاة ومایکره فیها).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

امام کا سترہ تمام مقتدیوں کے لیے کافی ہے پس جب امام کے آگے سترہ ہوتو اگر کوئی مقتدیوں کی صف کے سامنے سے گزرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔ (عمدۃ الفقہ :۲/ ۲۷۶،سترہ کے مسائل)۔

مظاہر حق میں مذکور ہے:

باجماعت نماز کی صورت میں امام کا سترہ تمام مقتدیوں کی طرف سے کافی ہے،یعنی اگر امام کے آگے سترہ ہے تو مقتدیوں کے سامنے سے گزرنے میں کچھ گناہ نہیں خواہ ان کے آگے کوئی آڑ ہو یا نہ ہو لیکن سترہ کے ورے سے گزرنا جائز نہیں۔ (مظاہر حق :۱/ ۶۴۵، باب السترۃ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

فاسق کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کے اعادہ کا حکم:

سوال: کیا فاسق امام کے پیچھے پڑھی گئی نماز کا اعادہ لازم ہوگا یا نہیں؟ یعنی ایک شخص نے ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھی جس کی ڈاڑھی نہیں تھی ، یا ایک مشت سے بہت کم تھی۔ بینوا توجروا۔

الجواب: فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے لیکن نماز ہو جاتی ہے،اور اعادہ واجب نہیں ہوگا، ہاں اگر کوئی اپنے طور پر اعادہ کرنا چاہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔حدیث شریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن أبي هريرة ﷺ أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، قال: صلوا خلف كل بر

وفاجر وصلوا على كل بر وفاجر وجاهدوا مع كل بر وفاجر، مكحول لم يسمع من أبي هريرة رضي الله عنه ومن دونه ثقات. (سنن الدارقطني: ۲/۵۷، رقم: ۱۰، ط: دار المعرفة بيروت).

قال في البحر الرائق: قوله وكره إمامة العبد والأعرابي والفاسق والمبتدع والأعمى وولد الزنا، بيان للشيئين: الصحة والكراهة أما الصحة فمبنية على وجود الأهلية للصلاة مع أداء الأركان وهما موجودان من غير نقص في الشرائط والأركان ومن السنة حديث صلوا خلف كل بر و فاجر. (البحر الرائق: ۱/۳۶۹، ط: دار المعرفة).

فتاویٰ فریدیہ میں مذکور ہے:

ڈاڑھی منڈے کے پیچھے نماز مکروہِ تحریمی ہے لیکن واجب الاعادہ نہیں ہے، لأن السلف الصالحين قد صلوا خلف ائمة الجور ولم ترو عنهم الإعادة۔ (فتاویٰ فریدیہ: ۲/۳۱۴)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(echo) گونجتی ہوئی آواز والے اسپیکر پر نماز کا حکم:

سوال: آج کل مساجد میں لاؤڈ اسپیکر ہوتا ہے بعض مرتبہ آواز اس میں گونجتی ہے، کیا ایسی حالت میں نماز ہوجائے گی یا نہیں؟ اور کیا خشوعِ نماز کے منافی ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: گونجتی ہوئی آواز میں اگر قراءت صاف سنائی دیتی ہے، اور مصلیوں کے ذہنوں پر بوجھ محسوس نہیں ہوتا تو نماز صحیح ہے اور منافی خشوع نہیں اور اگر مصلی حضرات کو ذہنی تشویش ہوتی ہے یا بہت زیادہ آواز میں تکرار ہے تو پھر ایسا لاؤڈ اسپیکر نماز میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

لاؤڈ اسپیکر پر نماز صحیح ہونے کے دلائل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا، جلد دوم، از ص ۳۹۸ تا ص ۴۰۶، مجلس البحوث، ممبئی)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نماز کے آخری وقت میں حیض شروع ہونے پر قضا کا حکم:

سوال: ایک عورت نے نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد نماز نہیں پڑھی یہاں تک کہ وقت کے آخر

میں حیض شروع ہوگیا تو کیا پاک ہونے کے بعد اس نماز کی قضا واجب ہوگی یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: مذکورہ عورت پر پاک ہونے کے بعد نماز کی قضا واجب نہیں ہے، کیونکہ قضا کے سلسلہ میں آخری وقت کا اعتبار ہوتا ہے، آخری وقت میں نماز کی اہل ہو تو قضا واجب ہے اور اگر آخری وقت میں نماز کی اہل نہ ہو یعنی حیض شروع ہوگیا تو قضا واجب نہیں ہوگی۔ ملاحظہ ہو ملا علی قاریؒ شرحِ نقایہ میں لکھتے ہیں:

ولا من حاضت، أى لا تقضى فرضاً من حاضت وكذا من نفست فيه ، أى فى آخر الوقت مع تمكنها من الأداء في أول الوقت بقدر ما يسع الفرض ولم تصل حتى طرأ الحيض لما قدمنا. (فتح باب العناية : ١/١٨٦).

وقال في مجمع الأنهر: ثم المعتبر آخر الوقت عندنا فإذا حاضت فى آخر الوقت سقطت ، وإن طهرت فيه وجبت . (مجمع الانهر : ١/٧٩، ط: لبنان).

مزید ملاحظہ ہو: (بدائع الصنائع: ۱/۹۵، سعید، و درر الحکام: ۱/۵۴، والمبسوط للامام السرخسیؒ: ۲/۲۴، کراچی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اوقاتِ نماز وغیرہ کے لیے مسجد میں مانیٹر (اسکرین) رکھنے کا حکم:

سوال: مسجد کے اندر منبر کے پاس اوقاتِ نماز اور تاریخ، نیز چاند کی ہیئت وغیرہ بتانے کے لیے اسکرین رکھنا درست ہے یا نہیں؟ یاد رہے کہ اس میں ذی روح کی کوئی تصویر نہیں ہوتی۔

الجواب: نماز کے اوقات یا دیگر ضروریات کے لیے اس اسکرین کے استعمال کرنے کی اجازت ہے جس میں لوگوں کی تصویریں نہ ہوں، البتہ منبر کے قریب رکھنے کی وجہ سے مصلیوں کی نماز میں خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہے اس وجہ سے مسجد کے باہر مسجد کے احاطہ میں رکھ کر کام چلانا چاہیے، مسجد شرعی جس میں نماز باجماعت ہوتی ہے اس میں نہیں رکھنا چاہیے۔ اسلام اور جدید معاشی مسائل میں مرقوم ہے:

یہ ائیر پورٹ پر جو لگے ہوتے ہیں وہ ٹی وی ہی ہوتے ہیں لیکن وہ مانیٹر (Monitor) یا کلوز سرکٹ (Close Circuit) کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، تو یہ اس کا جائز استعمال ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴/۱۴)

فقہ المعاملات میں مذکور ہے:

تاہم موجودہ دور میں اس کا جائز استعمال بھی ممکن ہے، مثلاً: یہ کہ اس کو غیر جاندار اشیاء، جیسے عمارتوں، مقامات، پارکوں، سمندروں وغیرہ کی نقل وحرکت یا طلوع وغروب وغیرہ کے مناظر تصاویر دیکھنے کے لیے استعمال کیا جائے یا سامان وغیرہ کی چیکنگ اور ہوائی جہاز وغیرہ کے نظام الاوقات بتلانے اور اعلانات کے لیے استعمال کیا جائے یا دیگر سیکورٹی وغیرہ کے انتظامات میں استعمال کیا جائے... (فقہ المعاملات:۱/ ۷۶، دارالاشاعت، کراچی)۔

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مسائل:۱/ ۲۳۷، وفتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۱۲۹، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ترویحہ میں مشہور دعا پڑھنے کا حکم:

سوال: تراویح میں ہر چار رکعتوں کے بعد لوگ "**سبحان ذی الملک والملکوت... الخ۔** پڑھتے ہیں احادیث یا آثار میں اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟ آج کل اس کے پرچے تقسیم ہوتے ہیں اور مسجد میں جگہ جگہ آویزاں کیے جاتے ہیں، اور عوام وخواص اکثر سنت سمجھ کر پڑھتے ہیں، تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: تتبع کثیر کے باوجود کسی معتبر حدیث کی کتاب یا آثار میں یہ دعا دستیاب نہیں ہوئی، بنابریں بزرگوں سے منقول سمجھ کر کبھی کبھی پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، ہاں سنت سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہیے، لیکن آج کل عوام بلکہ اکثر علماء اس کو سنت سمجھتے ہیں، لہٰذا مسجد میں پرچے آویزاں کر کے اس کو زیادہ رواج نہیں دینا چاہیے، ویسے بھی دیوارِ محراب میں لمبی دعائیں لگانے سے مصلی کا ذہن اس میں مشغول ہو کر نماز میں خلل واقع ہوسکتا ہے۔

مشہور کتبِ فقہ میں یہ دعا فقط فتاویٰ شامی میں بحوالہ قہستانی منقول ہے اور قہستانی نے منہج العباد کا حوالہ دیا ہے اور یہ کوئی حدیث کی کتاب نہیں اور نہ ہی معتبر کتاب ہے، لہٰذا اس کا اعتبار نہیں ہے۔

قال في الدرالمختار: يجلس ندباً بين كل أربعة بقدرها وكذا بين الخامسة والوتر ويخيرون بين تسبيح وقراء ة وسكوت وصلاة فرادى . وفي رد المحتار: قوله بين تسبيح، قال القهستاني، فيقال ثلاث مرات: سبحان ذى الملك والملكوت سبحان ذى العزة والعظمة والقدرة والكبرياء والجبروت سبحان الملك الحى الذى لايموت سبوح قدوس

رب الملائکة والروح ، لا إله إلا الله نستغفر الله ، نسألک الجنة ونعوذ بک من النار کما فی منهج العباد . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۲/ ۴۶،سعید).

شامی کے مراجع میں لوی بن عبدالرؤوف الخلیلی الحنفی لکھتے ہیں:

منهج العباد: ذکره ابن عابدینؒ في کتاب الصلاة من باب الوتر، مبحث صلاة التراویح بقوله : قال القهستاني : فیقال ثلاث مرات : سبحان ذی الملک و الملکوت... کما فی منهج العباد . و لم أقف علیه . (لآلی المحارفی تخریج مصادر ابن عابدین فی حاشیته رد المحتار: ۲/ ۲۲۵، ط:دار الفتح). واللہ ﷻ اعلم۔

سعی الی الجمعہ سے ظہر کے باطل ہونے کا حکم:

سوال: ایک شخص جمعہ کے دن ہوائی جہاز سے سفر کرنے والا تھا،اس لیے اس نے نمازِ ظہر زوال کے فوراً بعد پڑھ لی، پھر معلوم ہوا کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے ہوائی جہاز تاخیر سے روانہ ہوگا،اس وقت وہ گھر پر ہی تھا تو جمعہ کے لیے روانہ ہوا،ٹرافک کی وجہ سے مسجد تک پہنچنے میں دیر ہوگئی، جب پہنچا تو نماز ختم ہوگئی،اب اس شخص کی ادا کی ہوئی ظہر کا کیا حکم ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سعی الی الجمعہ سے نمازِ ظہر باطل ہوگئی،اب اس کا اعادہ لازم ہے، ہاں صاحبینؒ کے نزدیک امام کی اقتدا نہیں کی اس لیے اعادہ لازم نہیں لیکن چونکہ عبادات میں امام صاحب کے قول پر فتویٰ ہے اس لیے شخص مذکور پر ظہر کا اعادہ لازم ہوگا۔ملاحظہ ہو اللباب میں مذکور ہے:

فإن بدا له، أی لمن صلی الظهر ولو بمعذرة علی المذهب، أن یحضر الجمعة فتوجه إلیها ، والإمام فیها ولم تقم بعد بطلت صلاة الظهر، أی وصف الفرضیة وصارت نفلاً ، عند أبي حنیفةؒ بالسعي، وإن لم یدرکها ، وقالا: لا تبطل حتی یدخل مع الإمام ، قال فی التصحیح ، ورجح دلیل الإمام فی الهدایة ، واختاره البرهاني والنسفي . (اللباب : ۱/ ۱۱۲).

وقال فی ملتقی الأبحر: لوصلی الظهر قبلها جاز مع الکراهة ثم إذا سعی إلیها والإمام

فیها تبطل ظهره وقالا: لاتبطل مالم یدرک الجمعة ویشرع فیها. (ملتقى الابحر،ص ۱۳۶).

مزید ملاحظہ ہو: (مراقی الفلاح مع حاشیة الطحطاوی،ص ۵۲۱، وفتح باب العنایة : ۱۵/۲، والهدایة: ۱/۱۷۰،و التصحیح والترجیح علی مختصر القدوری ،ص ۱۸۵،ط:بیروت). واللہ ﷻ اعلم۔

سہواً سلام پھیرنے کے بعد کلام کرلیا تو سجدۂ سہو کا حکم:

سوال: ایک آدمی پر نماز میں سجدۂ سہو لازم ہوا، سجدہ کرنا بھول گیا اور اختتامی سلام پھیر دیا، اس کے بعد بات چیت کرلی پھر یاد آیا کہ میرے ذمہ سجدۂ سہو لازم تھا، اب نماز کا اعادہ کرے گا یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: کلام کرنے کی وجہ سے سجدۂ سہو کا محل فوت ہوگیا، کیونکہ تکلم فی الصلاۃ مفسدِ صلاۃ ہے، اور جب محل فوت ہوگیا تو سجدۂ سہو بھی ساقط ہوگیا، اب اعادہ کی ضرورت نہیں نماز ہوگئی۔

ملاحظہ ہو الفقہ المیسر میں ہے:

الذي سلم عامداً للخروج من الصلاة ، وقد وجب علیه سجود السهو سجد للسهو ما لم یعمل عملاً ینافی الصلاة کالتحول عن القبلة ، والتکلم مثلاً ...ویسقط سجود السهو إذا حصل بعد السلام شيء ینافی الصلاة کالتکلم سهواً مثلاً ، وفی جمیع هذه الصور لاتجب إعادة الصلاة . (الفقه المیسر ص: ۱۶۱،۱۶۲، لکهنؤ).

فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله ولو نسی السهو الخ، أو في کلامه مانعة الخلو فیصدق بسبع صور ؛ وهي ما لو کان علیه سهویة فقط ، أوصلبیة فقط، أو تلاویة فقط ، أو کان علیه الثلاثة أو اثنتان منها : أی صلبیة مع تلاویة أو سهویة مع إحداهما ففي هذه کلها إذا سلم ناسیاً لما علیه کله أو لما سوی السهویة لا یعد سلامه قاطعاً...إن السجود لایسقط بالسلام ولوعمداً إلا إذا فعل فعلاً یمنعه من البناء بأن تکلم أوقهقه أو أحدث عمداً أوخرج من المسجد أوصرف وجهه عن القبلة وهو ذاکر له لأنه فات محله وهو تحریمة الصلاة فسقط ضرورة فوات محله . (الدر

المختار مع رد المحتار: ۹۱/۲، سعید).

لیکن علامہ سرخسیؒ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ سے چہرہ پھیر لیا ہو پھر بھی سجدۂ سہو کرنا درست ہے جب تک کوئی دوسری نماز کے منافی بات نہ پیش آئی ہو، کیونکہ مسجد مکانِ واحد کے حکم میں ہے:

قال وإذا سلم وانصرف ثم تذكر أن عليه سجدة صلاتية أو سجدة تلاوة ، فإن كان في المسجد ولم يتكلم عاد إلى صلاته استحساناً...وجه الاستحسان هو أن المسجد مكان الصلاة فبقاؤه كبقائه في مكان الصلاة . (المبسوط : ۲۲۶/۱، ط: ادارة القرآن، کراچی).

(وكذا في بدائع الصنائع : ۱۷۵/۱، سعید). **واللہ ﷻ اعلم۔**

موبائل پر دورانِ گفتگو آیتِ سجدہ سننے سے سجدہ کا حکم:

سوال: میں والدہ کے ساتھ موبائل پر گفتگو کر رہا تھا، والدہ کے پاس بھائی بیٹھا ہوا قرآن پڑھ رہا تھا، اس نے سجدہ کی آیت تلاوت کی جس کو میں نے موبائل سے سنا، اب کیا مجھ پر سجدۂ تلاوت واجب ہوا یا نہیں؟

الجواب: موبائل فون پر گفتگو براہِ راست متکلم کی آواز ہے یہ کیسٹ کی آواز کی طرح نہیں ہے لہٰذا سامع پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا۔ جیسے لاؤڈ اسپیکر کی آواز اصل آواز کے درجہ میں ہے۔

ملاحظہ ہو؛ **قال في الدر المختار: والسماع شرط في حق غير التالي .** (۱۰۵/۲، سعید).

(وكذا في البحر الرائق: ۱۲۰/۲، کوئٹہ، والمحیط البرهانی : ۱۰۳/۲، ومجمع الانهر: ۱۵۹/۱، احیاء التراث).

واللہ ﷻ اعلم۔

مسجدِ فتح کا جائے وقوع، خصوصیت اور اس میں اجابتِ دعا کا حکم:

سوال: مسجدِ فتح کونسی مسجد ہے؟ اور اس کی کیا خصوصیت ہے؟ نیز اس میں اجابتِ دعا کی کیا حقیقت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: یہ مسجد جبل سلع کے غربی کنارے کی بلندی پر، خندق سے جنوبِ مغرب کی جانب، قدرے

جنوب کی طرف واقع ہے۔اوراس مسجد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مسجدان مساجد میں سے ہے جورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تعمیر ہوئیں، اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں دعافرمائی، اور بدھ کے ظہراورعصر کے درمیان دعاقبول ہوئی۔

مسنداحمد میں حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ: جب کبھی مجھے کوئی اہم کام درپیش ہواتو میں نے بدھ کے روزظہرعصر کے درمیان دعا کی توضرورقبول ہوئی۔

شیخ شعیب الارنؤ وطؒ نے مسنداحمد کی تعلیقات میں اِس حدیث کوضعیف قراردیاہے،لیکن جمہورمحدثین کے ہاں فضائل اعمال میں ضعیف حدیث معتبر ہے۔لہٰذااِس مسجد میں قبولیت کی امید سے دعا کرنادرست ہے۔

ملاحظہ ہومسنداحمد میں ہے:

حدثنا أبوعامر(ثقة)،حدثنا كثير يعنى ابن زيد (ليس بذاک القوى)، حدثنى عبد الله بـن عبـد الـرحـمـن بن كعب بن مالک (مجهول الحال)، حدثنى جابر يعنى ابن عبد الله ، رضي الله تعالىٰ عنه ، أن النبي صلى الله عليه وسلم دعا في مسجد الفتح ثلاثاً: يوم الاثنين ، ويـوم الثـلاثـاء ، ويـوم الأربـعـاء ، فاستجيب له يوم الأربعاء بين الصلاتين، فعرف البشر في وجهـه ، قـال جـابـرؓ : فـلـم يـنـزل بي أمر مهم غليظ ، إلا توخيت تلک الساعة ، فأدعو فيها فأعرف الإجابة .

قـال الشيخ شعيب : إسناده ضعيف ، كثير بن زيد ليس بذاک القوى ، خاصة إذا لم يتـابـعـه أحـد ، وقد تفرد بهذا الحديث عن عبد الله بن عبد الرحمن بن كعب، وهذا الأخير في عداد المجاهيل، وله ترجمة فى التعجيل (١٦٣)، وأخرجه ابن سعد فى الطبقات (٢/٧٣)، والبخارى فى الأدب المفرد (٧٠۴)، والبيهقي فى الشعب (٣٨٧۴) من طرق عن كثير بن زيد بهذا الإسناد . (مسند أحمد مع التعليقات: ٢٢/۴٢٥/١۴٥٦٣).

وفـي رواية لـلبيهـقـي، عـنـه قـال: دعـا رسـول الـلّٰه صلى الله عليه وسلم في مسجد الأحـزاب يـوم الاثنين ويوم الثلاثاء ويوم الأربعاء ، فاستجيب له يوم الأربعاء بين الصلاتين:

الظهر والعصر، فعرفنا البشر في وجهه ... (شعب الايمان: ۵/۳۸۷/۱۵۹۱).

وفاء الوفا میں علامہ سمہودیؒ فرماتے ہیں:

ومنها: مسجد الفتح، والمساجد التي حوله في قبلته، وتعرف اليوم كلها بمساجد الفتح، والأول المرتفع على قطعة من جبل سلع فى المغرب غربية وادى بطحان، وهو المراد بمسجد الفتح حيث أطلقوه، ويقال له أيضاً، مسجد الأحزاب، والمسجد الأعلى.
(وفاء الوفاء باخبار دار المصطفىٰ: ۳/۳۹، دار الكتب العلمية).

مزید ملاحظہ ہو: (تاريخ المدينة، ص ۵۹، لابى زيد النميرى البصرى، م ۲۶۲ھ).

معلم الحجاج میں مرقوم ہے: مسجد احزاب یا مسجد فتح: ''جبل سلع'' کے غربی کنارہ پر ہے غزوۂ احزاب میں یعنی جب تمام کفار مدینہ منورہ پر مجتمع ہو کر چڑھ آئے تھے اور خندق کھودی گئی تھی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے اس جگہ تین روز پیر، منگل، بدھ کو دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور مسلمانوں کو فتح دی۔ (معلم الحجاج، ص ۳۹۵، ط: ادارۃ القرآن)۔

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے: یہ مسجد جبل سلع کے غربی کنارہ کی بلندی پر واقع ہے، خندق کے دوران اس مقام پر جہاں اس وقت مسجد الفتح ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور تین دن متواتر یعنی دوشنبہ (پیر) سہ شنبہ (منگل) اور چہارشنبہ (بدھ) کو فتح اور نصرت کی دعا فرمائی پس بدھ کے روز بین الصلاتین آپ کی دعا قبول ہوئی اور آپ کے چہرہ انور میں خوشی جھلکنے لگی، آخر تائید غیبی سے طوفان اور آندھی کے باعث حملہ آور لشکر میں افراتفری مچ گئی اور وہ بے نیل ومرام پسپا ہو گئے۔ اسی مقام پر مسجد بنادی گئی جو دعائے فتح ونصرت وقبولیت کے مناسبت سے مسجد الفتح کے نام سے مشہور ہے اور غزوۂ احزاب کی وجہ سے مسجد الاحزاب اور بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے مسجد الاعلیٰ بھی کہلاتی ہے... یہ مسجد اُن مساجد میں سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تعمیر ہوئیں۔ (عمدۃ الفقہ: ۴/۱۹/۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بیت اللہ کی طرف پیر پھیلانا مکروہ ہے:

سوال: شامی میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ قبلہ کی طرف پیر پھیلانا مکروہِ تحریمی ہے اور وہ شخص مردود الشہادۃ

ہوجاتا ہے، تو مکروہِ تحریمی کی کیا دلیل ہے؟ نیز مردودالشہادۃ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: احادیث کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عمداً قبلہ کی طرف پیر پھیلانا مکروہ ہے، پھر علامہ شامیؒ کے نزدیک مکروہِ تنزیہی ہے اور علامہ رحمتی کے نزدیک مردودالشہادۃ ہے جو کہ تحریمی کی طرف مشیر ہے اور یہ صرف علامہ رحمتی نے لکھا ہے دوسرے فقہاء اس کو خلافِ اولیٰ کہتے ہیں، ہاں علامہ رحمتی کے قول میں احتیاط کا پہلو غالب ہے۔ نیز بیت اللہ، شعائرِ اسلام میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے شعائرِ اسلام کی تعظیم اور ادب و احترام کا حکم دیا ہے۔ **قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ ومن يعظم شعائر اللّٰه فإنها من تقوى القلوب ﴾** [سورة الحج: ۳۲]. شافعیہ میں سے امام نوویؒ نے بھی روضۃ الطالبین میں مکروہ لکھا ہے۔

بیت اللہ کی تعظیم اور بے ادبی کی ممانعت میں چند احادیث بطورِ مشتے نمونہ از خروارے، ملاحظہ فرمائیں:

۱ــ عن أبي هريرة رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إن لكل شيء سيداً وإن سيد المجالس قبالة القبلة، رواه الطبراني في الأوسط، وإسناده حسن (مجمع الزوائد: ۸/۵۹، دارالفکر).

۲ـ وعن ابن عمر ﷛ قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: أكرم المجالس ما استقبل به القبلة، رواه الطبراني في الأوسط، وفيه حمزة بن أبي حمزة وهو متروك. (حوالہ سابقہ)۔

۳ــ وعن ابن عباس ﷛ قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إن لكل شيء شرفاً وإن أشرف المجالس ما استقبل به القبلة، رواه الطبراني، وفيه: هشام بن زياد أبو المقدام وهو متروك. (حوالہ سابقہ)۔

مذکورہ بالا روایات میں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے بیٹھنے کو سید اور اشرف نشست فرمایا گیا ہے۔

اب وہ روایات ملاحظہ فرمائیں جن میں بے ادبی کی ممانعت وارد ہوئی ہے:

۴ــ عن ابن عمر ﷛ قال: نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أن يصلي في سبع مواطن: في المزبلة، والمجزرة، والمقبرة، وقارعة الطريق، والحمام، ومعاطن الإبل،

وفوق الكعبة . (سنن ابن ماجه ،رقم: ۷۴۶).

وفي إسناده: زيد بن جبيرة وفيه كلام . رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوڑا خانہ اور جانوروں کے مذابح میں اور مقبرہ اور راستہ کے بیچ میں اور حمام میں اور خانہ کعبہ کے اوپر نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔

خانہ کعبہ کے اوپر نماز کی ممانعت کی وجہ بے ادبی ہے اور پاؤں پھیلانے میں بھی عرفاً بے ادبی ہے۔

۵ ــ عن أبي أيوب الأنصاري أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا أتيتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها ولكن شرقوا أو غربوا قال أبوأيوب فقدمنا الشام فوجدنا مراحيض بنيت قبل القبلة فننحرف ونستغفر الله تعالىٰ . (صحيح البخاری : ۸۸/۱).

یعنی قضائے حاجت میں قبلہ کی طرف منہ مت کرو اور نہ پشت کرو لیکن مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرو، کیونکہ قضائے حاجت میں قبلہ کی طرف رخ کرنے میں بے ادبی ہے۔

۶ ــ عن زربن حبيش عن حذيفة أظنه عن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:"من تفل تجاه القبلة جاء يوم القيامة تفله بين عينيه ، ومن أكل من هذه البقلة الخبيثة فلا يقربن مسجدنا . (السنن الكبرى للبيهقی:۹۷۵/۳،وسنن ابی داود،رقم: ۳۸۲۴،وصحيح ابن خزيمة: ۸۳/۳، بيروت).

اس حدیث میں جانبِ قبلہ تھوکنے کی ممانعت ہے کہ اس میں بے ادبی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن تھوک تھوکنے والے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ظاہر ہوگا۔

۷ ــ وعن عبد اللّٰه بن الحسن عن أبيه عن جده: رفعه: من جلس يبول قبالة القبلة فذكر فتحرف عنها إجلالاً لها لم يقم من مجلسه حتى يغفر له . أخرجه الطبرى في تهذيبه . وفيه : كذاب. (جامع الاحاديث للسيوطی : ۲۲۹/۲۰).

فقہائے کرام کی عبارات ملاحظہ فرمائیں: **قال في الهندية: ويكره مد الرجلين إلى الكعبة في النوم وغيره عمداً ، وكذلك إلى كتب الشريعة وكذلك في حال مواقعة الأهل، كذا في محيط السرخسي .** (الفتاوى الهندية: ۳۱۹/۵).

وفي المحيط البرهاني : ويكره مد الرجلين إلى القبلة في النوم وغيره عمداً ،

وكـذلک يكره مد الرجلين إلى المصحف ، وإلى كتب الفقه لما فيه من ترک تعظيم جهة القبلة ، وكلام اللّٰه تعالیٰ ، ومعانی كلام اللّٰه تعالیٰ . (المحيط البرهانی: ٦/ ٥١، رشيديه).

علامہ شامیؒ کی عبارت ملاحظہ کیجیے: **قال فی الدرالمختار: كره مد رجليه في نوم أو غيره إليها ، أي عمداً لأنه إساءة أدب قاله منلا ناكير...وفی الشامية: (قوله مد رجليه) أورجل واحدة ومثل البالغ الصبی فی الحكم المذكور، قوله أی عمداً ، أی من غير عذر إما بالعذر أو السهو فلا، قوله لأنه إساءة أدب ، أفاد أن الكراهة تنزيهية ، لكن قدمنا عن الرحمتي في باب الاستنجاء أنه سيأتي أنه بمد الرجل إليها ترد شهادته ، قال: وهذا يقتضی التحريم فليحرر.** (فتاوى الشامی: ١/ ٦٥٥،وكذا فی ١/ ٣٤٢،سعيد).

فتاویٰ دارالعلوم زکریا میں مرقوم ہے:

فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر بجانب قبلہ پیر پھیلا کر سونا مکروہِ تحریمی ہے، کعبہ شعائر اسلام میں سے ہے اوراس کی تعظیم کا حکم دیا گیا ہے...اور یہ مسئلہ اور حکم خلافِ قیاس نہیں کہ اس کو اپنے محل تک محدود رکھیں بلکہ یہ عرف پر مبنی ہے تو عرف میں جیسے بیت اللہ پر نماز بے ادبی ہے اسی طرح قبلہ کی طرف پیر پھیلانا بھی بے ادبی ہے، اگر کسی کے سامنے معزز آدمی بیٹھا ہو اور اس کی طرف پاؤں پھیلا دے تو اس کو حاضرین بے ادبی سمجھتے ہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۷/ ۸۱۹، ط: ممبئی)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں مکتوب ہے:

بجانبِ قبلہ پھیلا کر سونا مکروہِ تحریمی ،قریب حرام ہے، جو شخص جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے وہ فاسق اور مردود الشہادۃ ہے یعنی شرعاً اس کی گواہی مردود اور نامقبول ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۵۷۷)۔

معارف القرآن میں مرقوم ہے:

شعائر اللہ کی تعظیم دل کے تقویٰ کی علامت ہے ان کی تعظیم وہی کرتا ہے جس کے دل میں تقویٰ اور خوفِ خدا ہو۔ (معارف القرآن: ۶/ ۲۶۳، ط: ادارۃ المعارف کراچی)۔

مزید ملاحظہ ہو: (الاستخفاف بشعائر الله لعبد الكريم هجيع). **واللہ ﷻ اعلم۔**

وتر میں تکبیر قنوت چھوٹنے پر سجدۂ سہو کا حکم:

سوال: وتر میں دعائے قنوت سے پہلے تکبیر چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب: دعائے قنوت سے پہلے تکبیر کے بارے میں ائمہ مذہب سے کوئی روایت منقول نہیں ہے، اور فقہاء اور مشایخ سے اس بارے میں دو اقوال منقول ہیں، بنابریں احتیاطاً سجدۂ سہو کر لینا چاہیے۔

علامہ ابن نجیمؒ نے عدمِ وجوب کو ترجیح دی ہے۔ ملاحظہ ہو:

قال في البحر الرائق: وذكر في الظهيرية: أنه لو ترک تکبيرة القنوت فإنه لا رواية لهذا وقيل: يجب سجود السهو اعتباراً بتكبيرات العيد وقيل: لا يجب، وينبغي ترجيح عدم الوجوب لأنه الأصل ولا دليل عليه. (البحر الرائق: ۲/۹۶، کوئٹه).

علامہ شامیؒ نے بحر کی عبارت نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/۴۶۸، سعید)۔

علامہ زیلعی اور صاحبِ محیط برہانی نے وجوب والے قول کو ترجیح دی ہے۔ ملاحظہ ہو:

قال في التبيين: ولو ترک التكبيرة التي بعد القراءة قبل القنوت سجد للسهو لأنها بمنزلة تكبيرة العيد. (تبيين الحقائق: ۱/۱۹۴، امداديه).

وقال في المحيط: وكذلک يجب سجود السهو في ترک التكبيرة الأولى في القنوت، وعليه المحققون من أصحابنا وهو واضح. (المحيط البرهاني: ۲/۵۶، مكتبه رشيديه).

صاحبِ محیطِ برہانی نے وجوب والے قول کو محققین احناف کی طرف منسوب کیا ہے، لہٰذا احتیاط اسی میں ہے۔

مزید ملاحظہ کیجیے: (فتح القدير: ۱/۴۳۹، رشيديه، وحاشية الطحطاوي على الدر المختار: ۱/۳۱۰، واللباب في الجمع والسنة والكتاب: ۱/۱۷۶، والفقه الحنفي في ثوبه الجديد: ۱/۲۹۳).

نماز میں "صدق الله العظيم" پڑھنے سے نماز کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص نماز میں صدق اللہ العظیم پڑھ لے تو نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ نیز فرض اور نفل میں

کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صدق اللہ العظیم کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور ثنا کا پہلو غالب ہے، نیز کلام اللہ کی تصدیق ہے، پھر اس سے جواب دینا مقصود نہیں ہوتا اور نہ کلام الناس کے مشابہ ہے، بنابریں نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اور مفسداتِ نماز میں فرض ونفل کا کوئی فرق نہیں۔

اس مسئلہ کے چند نظائر حسبِ ذیل ہیں: جب امام قنوتِ نازلہ میں: **اللّٰهم اهدنا فيمن هديت وعافنا فيمن عافيت**، کسی مصیبت کے وقت جہراً پڑھتا ہو تو مقتدی آہستہ آواز سے آمین کہہ سکتا ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے: **والذي يظهر لي أن المقتدي يتابع إمامه إلا إذا جهر فيؤمن** . (فتاوی الشامی: ۲/ ۱۱ ،سعید). اس سے معلوم ہوا کہ صدق اللہ العظیم کہنے سے نماز فاسد نہیں ہوئی۔

نیز امام کی سورۂ فاتحہ ختم ہونے پر مقتدی آمین کہتا ہے، یعنی اے اللہ امام کی دعا قبول فرمالے، اور اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

نیز نماز میں سورۂ قیامہ کے اختتام پر **سبحانک بلی**، کہنا ثابت ہے، اس سے بھی نماز میں فساد نہیں آتا۔

عن موسى بن أبي عائشة قال: كان رجل يصلي فوق بيته ، وكان إذا قرأ: أليس ذلک بقادر على أن يحيي الموتى، قال: سبحانک فبلى، فسألوه عن ذلک ، فقال: سمعته من رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم، قال أبو داود: قال أحمد : يعجبني في الفريضة أن يدعو بما في القرآن . (سنن ابی داود: ۱/ ۱۲۸ ،فیصل).

چند سورتوں کے آخر میں استفہامی جملے مذکور ہیں، حدیث شریف میں ان کے بعد بطورِ جواب الفاظ وارد ہوئے ہیں، حضرت گنگوہیؒ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ نماز میں نہیں کہنا چاہیے، نماز میں فقط قرآن پڑھنے پر اکتفا کرنا چاہیے، لیکن اگر کسی نے نماز میں اس پر عمل کر کیا تب بھی نماز فاسد نہ ہوگی۔

پہلے حدیث شریف ملاحظہ کیجیے: **عن إسماعيل بن أمية سمعت أعرابياً يقول: سمعت أباهريرة** رضی اللہ عنہ **يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من قرأ منكم ﴿والتين والزيتون﴾ فانتهى إلى آخرها ﴿أليس الله بأحكم الحاكمين﴾ فليقل: بلى وإنا على ذلک من الشاهدين، ومن قرأ**

﴿والمرسلات﴾ فبلغ: فبأي حديث بعده يؤمنون﴾، فليقل: آمنا بالله، قال إسماعيل: ذهبت أعيد على الرجل الأعرابي، وانظر لعله، فقال: يا ابن أخي، أتظن أني لم أحفظه، لقدحججت ستين حجة، ما منها حجة إلا وأناْ أعرف البعير الذي حججت عليه . (سنن ابی داود : ۱/ ۱۲۹ ،فیصل).

حضرت گنگوہیؒ کی عبارت ملاحظہ فرمایئے: يعني هذه الأجوبة بعد السور محمولة عند الجمهور على النوافل أو على خارج الصلاة لا المكتوبة...قلت: وعلله في هامش "إعلاء السنن" بأن هذه الأحاديث ليست بنصة في الصلاة، بل محتملة لداخلها وخارجها، والاحتمال يبطل الاستدلال، والأصل تجريد القراءة عن غير القرآن، في الصلاة، فلا يتحول عنه إلا بدليل، ولوعمل أحد في الصلاة لا تفسد، انتهى. (الكوكب الدرى على جامع الترمذى: ۳۲۲/۴).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

نماز میں نبی کے نام کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھنے سے نماز کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے فجر کی نماز میں یوں قراءت پڑھی: " لقد كان لكم في رسول الله صلى الله عليه وسلم أسوة حسنة " کیا نماز ہوئی یا نہیں؟ اور اگر نماز صحیح ہو تو ایسا پڑھنا مکروہ ہوگا یا نامناسب؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نماز میں قراءت کے درمیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوگی، کیونکہ یہ نہ تو جوابی جملہ ہے اور نہ کلام الناس کے مشابہ ہے، ہاں چونکہ نماز کی حالتِ قیام میں قرآن کے علاوہ دوسری چیز نہیں ہونی چاہیے، اس اعتبار سے نماز میں نبی کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھنا مکروہ یعنی خلافِ اولیٰ ہوگا۔

اِس مسئلہ کے دلائل ماقبل ''صدق اللہ العظیم'' والے مسئلے کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔ فقط حضرت گنگوہیؒ کی ایک عبارت پر اکتفا کیا جاتا ہے:

والأصل تجريد القراءة عن غير القرآن، في الصلاة، فلا يتحول عنه إلا بدليل، ولو عمل أحد في الصلاة لا تفسد، انتهى. (الكوكب الدری علی جامع الترمذی: ۳۲۲/۴).

واللہ ﷻ اعلم۔

لاؤڈاسپیکر پراذان نہ ہوتو جماعت میں شرکت کا حکم:

سوال: بعض ملکوں میں لاؤڈاسپیکر پراذان نہیں دی جاتی تو جس کواذان سنائی نہ دے اس پر مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز سنتِ مؤکدہ ہوگی یا نہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کرام اذان کا انتظار کرتے تھے یا اس سے پہلے ہی گھر سے چل دیتے تھے؟ کیونکہ بعض صحابہ مسجد سے دور رہتے تھے۔

الجواب: اذان کا سنائی نہ دینا ترکِ جماعت کے لیے قابل قبول عذر نہیں ہے، بلکہ آج کل نمازوں کے اوقات متعین ہوتے ہیں اور وہ گھڑیوں کے ذریعہ بآسانی معلوم ہوجاتے ہیں، لہٰذا جو شخص مسجد جانے پر قادر ہو اس کے حق میں مسجد جا کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنتِ مؤکدہ قریب بہ واجب ہوگا۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں اذان کے چند مقاصد ہیں؛ **ويحصل من الأذان: الإعلام بدخول الوقت والدعاء إلى الجماعة، وإظهار شعائر الإسلام.** (عمدۃ القاری: ۱۴۳/۴، دارالحدیث، ملتان).

نیز پرانے زمانہ میں لاؤڈاسپیکر نہیں ہوتے تھے۔

(۲) بعض احادیث سے پتا چلتا ہے کہ اذان کے بعد کافی وقت دیا جاتا تھا جس میں آدمی آرام سے اپنی ضروریات سے فارغ ہوکر مسجد میں حاضر ہوسکتا تھا۔ حدیث ملاحظہ ہو:

عن جابر رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لبلال: يا بلال، إذا أذنت فترسل في أذانك، وإذا أقمت فاحدر واجعل بين أذانك وإقامتك قدر ما يفرغ الآكل من أكله، والشارب من شربه، والمعتصر إذا دخل لقضاء حاجته، ولا تقوموا حتى تروني. (سنن الترمذی: ۱/۲٦۸/۱۹۵).

مرقاۃ میں ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں:

والظاهر أنه عليه السلام أراد قضاء الحاجة الضرورية العامة التي قد باشرها مريد الصلاة حقيقة أو حكماً غير مختصة بصلاة دون صلاة والمعتصر أى ويفرغ الذي يحتاج إلى الغائط ويعصر بطنه وفرجه...وقيل: هو الحاقن أى الذي يؤذيه البول والغائط إذا دخل أى الخلاء لقضاء حاجته يعني فاصبر حتى يتوضأ المحتاج إلى التأهب للصلاة . (مرقاة المفاتيح: ۲/۱۵۴، باب الأذان،ط:امداديه ، ملتان). واللہ تعالیٰ اعلم۔

نماز کے سلام میں ’’وبرکاته‘‘ کے اضافہ کا حکم:

سوال: اگر کوئی نماز میں سلام کے وقت ’’ السلام عليكم ورحمة الله وبركاته ‘‘ کہے یعنی وبرکاته کا اضافہ کرے تو نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب: نماز کے سلام میں ’’ وبرکاته‘‘ کے اضافہ کی وجہ سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوگا، نماز صحیح اور درست ہوگی، لیکن عام عادت اور مشہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس طرح کرنا اچھا نہیں۔

مشہور احادیث میں ’’ وبرکاته‘‘ کا اضافہ نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو: (سنن ابی داود، رقم:۹۹۸، وسنن الترمذی، رقم: ۲۹۵، وسنن ابن ماجۃ، رقم:۹۱۴، وسنن النسائی، رقم:۱۱۴۲، وصحیح ابن حبان، رقم:۱۹۹۰، وصحیح ابن خزیمۃ، رقم:۶۷۵ وغیرہ کتب حدیث)۔

ہاں بعض روایات میں پہلے سلام میں ’’ وبركاته‘‘ کا اضافہ منقول ہے۔ ملاحظہ ہو: (سنن ابی داود، رقم: ۹۹۹) لیکن یہ زیادتی خلافِ مشہور ہے۔

فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیں: قال في البحر الرائق: و أنه لا يقول: وبركاته ، وصرح النوويؒ بأنه بدعة وليس فيه شيء ثابت لكن في الحاوى القدسي: أنه مروى وتعقب ابن أمير الحاج النووى بأنها جاء ت في سنن أبي داود من حديث وائل بن حجر بإسناد صحيح. (البحر الرائق: ۱/۳۳۲، کوئٹہ)۔

وفي اللباب: ولا يقول: وبركاته ، لعدم توارثه ، وصرح الحدادى بكراهته . (اللباب: ۱/۷۴، المكتبة العلمية).

وللاستزادة راجع: (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، ص۲۷۴، قديمى، والدر المختار مع رد المحتار: ۱/۵۲۶، سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

"سمع اللّٰه لمن حمده" کی جگہ "اللّٰه أكبر" کہنے سے نماز کا حکم:

سوال: اگر کسی امام نے سمع اللّٰه لمن حمده کی جگہ اللّٰه أكبر کہا تو نماز ہوئی یا نہیں؟ سجدۂ سہو واجب ہوا یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجروا بالا جر الجزیل۔

الجواب: نماز میں سمع اللّٰه لمن حمده اور دیگر تکبیراتِ انتقالات سنن نماز میں سے ہیں واجب یا فرض نہیں، لہٰذا سمع اللّٰه لمن حمده کی جگہ اللّٰه أكبر کہہ دیا تو خلافِ سنت ہوا لیکن نماز ہوگئی، اور سجدۂ سہو بھی واجب نہ ہوگا۔

ولكنا نقول: تكبيرة الانتقال سنة لا تضاف إلى جميع الصلاة فبتركها لايتمكن التغير فى الصلاة وكذلك لو سها عن تسبيحات الركوع والسجود لأنها سنة تضاف إلى ركن منها لا إلى جميعها فكان كالتعوذ وثناء الافتتاح. (المبسوط للسرخسى: ۱/۴۰۵، ط: دار الفكر، بيروت).

بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وأما سنن هذا الانتقال فمنها: أن يأتي بالذكر لأن الانتقال فرض فكان الذكر فيه مسنوناً واختلفوا في ماهية الذكر والجملة فيه أن المصلى لايخلو إما إن كان إماماً أو مقتدياً أو منفرداً فإن كان إماماً يقول سمع اللّٰه لمن حمده. (بدائع الصنائع: ۱/۲۰۹، سعيد).

(وكذا فى النتف فى الفتاوى، ص۴۴، دار الكتب العلمية، وحاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح: ۱۷۹، ومجمع الانهر: ۱/۱۴۹). واللہ ﷻ اعلم۔

نماز میں بہ نیتِ تکلم بسم اللہ پڑھنے سے نماز کا حکم:

سوال: اگر کسی نے نماز میں بہ نیت تکلم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا تو نماز ہوئی یا نہیں؟

الجواب: اس مسئلہ میں ائمہ کا اختلاف ہے طرفینؒ کے نزدیک بہ قصدِ جواب بسم اللہ پڑھی تو نماز فاسد ہوگئی، اوراسی پر فتویٰ ہے، البتہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بسم اللہ قرآنِ کریم کی آیت ہے اس لیے نماز فاسد نہیں ہوئی، عبادات میں امام ابوحنیفہؒ کا قول راجح ہے، اس لیے نماز فاسد ہوگئی۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله وجواب خبر سوء ، والاسترجاع قول ﴿ إنا لله وإنا إليه راجعون ﴾ ثم الفساد بذلک قولهما خلافاً لأبي يوسف كما صححه في الهداية والكافي لأن الأصل عنده أن ما كان ثناء أوقرآناً لايتغير بالنية وعندهما يتغير كما في النهاية ، وقيل: إنه بالاتفاق ونسبه في غاية البيان إلى عامة المشايخ وفي الخانية أنه الظاهر ...

قوله على المذهب رد على ما في الظهيرية من تصحيح عدم الفساد فإنه تصحيح مخالف للمشهور وعلى ما في المجتبى من انه لا فساد بشيء من الاذكار التي يقصد بها الجواب في قول ابي حنيفةؒ وصاحبيه فإنه مخالف للمتون والشروح والفتاویٰ كذا في الحلبة والبحر فافهم . (فتاوى الشامي: ١/ ٦٢١،سعيد).

فتاویٰ قاضیخان میں مذکور ہے:

ولو أخبر بخبر يسره فقال: الحمد لله أو أخبر بما يتعجب منه فقال: سبحان الله فإن لم يرد جواب المخبر لم تقطع صلاته ، وإن أراد به الجواب قال بعضهم تفسد صلاته عند الكل وهو ظاهر . (فتاویٰ قاضیخان بهامش الهندية: ١/ ١٣٧).

(وكذا في بدائع الصنائع : ١/ ٢٣٥، سعيد، وامدادالفتاح، ص ٣٦٢). **واللہ ﷻ اعلم۔**

جگہ کی تنگی کی وجہ سے گرجا میں جمعہ پڑھنے کا حکم:

سوال: ایک مسجد بہت تنگ ہے، جمعہ میں تمام نمازی نہیں سما سکتے ہیں تو کیا مسلمانوں کے لیے گرجا میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہوگا یا نہیں؟ **بینوا توجروا۔**

الجواب: مسلمانوں کو غیرت سے کام لینا چاہیے، اور نماز جیسی اہم عبادت کے لیے دوسری مناسب جگہ کا انتظام کرنا چاہیے، یا پھر گرجے کو مصلیٰ یا مسجد میں تبدیل کر دینا چاہیے، تاہم اگر مجبوری ہو اور گرجے میں مجسمے، بت اور تصویریں وغیرہ نہ ہوں تو جمعہ قائم کرنا جائز ہے۔

بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ بعض صحابہ کرام نے گرجے میں نماز پڑھی، جبکہ اس میں تصویریں نہیں تھیں۔

وكان ابن عباس ﷺ يصلي في البيعة إلا بيعة فيها تماثيل . (صحيح البخارى : ١/ ٦٢، باب الصلاة فى البيعة).

مصنف ابن ابی شیبہ میں چند آثار منقول ہیں:

حدثنا سهل بن يوسف ، عن حميد ، عن بكر ، قال: كتبت إلى عمر ﷺ من نجران: لم يجدوا مكاناً أنظف، ولا أجود من بيعة ؟ فكتب: انضحوها بماء وسدر وصلوا فيها.

حدثنا هشيم ، عن مغيرة ، عن إبراهيم، ح وعن يونس ، عن الحسن ، ح ،وعن حصين عن الشعبى أنهم قالوا: لا بأس بالصلاة فى البيع .

حدثنا حفص بن غياث ، عن حجاج ، قال: سألت عطاء عن الصلاة فى الكنائس والبيع ؟ فلم ير بها بأساً .

حدثنا وكيع ، عن سفيان، عن خصيف، عن مقسم، عن ابن عباس ﷺ؛ أنه كره الصلاة فى الكنيسة إذا كان فيها تصاوير.

حدثنا وكيع، عن عثمان بن أبي هند، قال: رأيت عمر بن عبد العزيز يؤم الناس فوق كنيسة ، والناس أسفل منه.

حدثنا وكيع ، عن إسماعيل بن رافع ، قال: رأيت عمر بن عبد العزيز يؤم الناس في كنيسة بالشام .

حدثنا ملازم بن عمرو، عن عبد الله بن بدر، عن قيس بن طلق، عن أبيه طلق بن على قال: خرجنا وفداً إلى النبي صلى الله عليه وسلم فأخبرناه إن بأرضنا بيعة لنا، فاستوهبناه

فضل طهوره، فدعا بماء فتوضأ ثم تمضمض، ثم جعله لنا في إداوة، فقال: أخرجوا به معكم، فإذا قدمتم بلدكم فاكسروا بيعتكم، وانضحوا مكانها بالماء، واتخذوا مسجداً .

حدثنا وكيع، قال: حدثنا أبوفضالة، قال: حدثنا أزهر الحرازى، أن أباموسى صلى في كنيسة بدمشق، يقال لها: كنيسة يحنا. (مصنف ابن ابی شیبة: ۲/ ۷۹،باب الصلاة فی الکنائس والبیع).

حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح میں مرقوم ہے:

قلت: و بهذا يعلم كراهة الصلاة فى البيع والكنائس لما فيها من التماثيل فتكون مأوى الشياطين كما أفاده العيني في شرح البخاري في بحث المساجد من كتاب الصلاة . (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح،ص۳۵۷).

تصویر ہی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرجوں میں داخل ہونے سے منع فرمایا تھا۔ملاحظہ ہو:

وقال عمر: إنا لا ندخل كنائسكم من أجل التماثيل التي فيها الصور . (صحیح البخاری: ۱/ ۶۲، باب الصلاة فی البیعة). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فوقانی حصہ میں نماز کے دوران بجلی چلی جانے سے اقتدا کا حکم:

سوال: ایک امام تہ خانہ میں امامت کرتا ہے اور کچھ لوگ اوپر والے حصے میں اقتدا کر رہے ہیں، نماز کے دوران بجلی جانے سے امام کے انتقالات سے بے خبر ہو گئے اب اس دوران کیا کریں؟ کیا اپنے اندازہ سے نماز جاری رکھیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اقتدا کے صحیح ہونے کے لیے امام کے انتقالات کا علم ضروری ہے، اگر امام کی حالت مشتبہ ہو جائے تو مقتدی کی نماز فاسد ہو جائے گی، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں فوقانی حصے میں مقتدیوں کی نماز فاسد ہو گئی اب ان کو چاہیے کہ نماز کا اعادہ کریں۔ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

قال قاضيخان: إذا قام على الجدار الذي يكون بين داره وبين المسجد ولايشتبه حال الإمام يصح الاقتداء وإن قام على سطح داره وداره متصلة وبين المسجد ولايشتبه حال

الإمـام يصح الاقتداء... إما في البيت مع المسجد لم يتخلل إلا الحائط ولم يختلف المكان وعند اتحاد المكان يصح الاقتداء إلا إذا اشتبه عليه حال الإمام. أقول: حاصل كلام الدرر أن اختلاف المكان مانع مطلقاً وأما إذا اتحد فإن حصل اشتباه منع وإلا فلا وما نقله عن قاضيخان صريح في ذلك. (فتاوى الشامي: ۱/۵۸۷، سعيد).

وفي حاشية الطحطاوي: و يشترط أن لا يفصل بينهما حائط كبير يشتبه معه العلم بانتقالات الإمام فإن لم يشتبه العلم بانتقالات الإمام لسماع أو رؤية ولم يكن الوصول إليه صح الاقتداء به في الصحيح... (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص۲۹۳، قديمي).

(وكذا في منحة الخالق على البحر الرائق: ۱/۳۴۴، كوئٹه، والفتاوى الهندية: ۱/۸۸، والجوهرة النيرة: ۱/۲۵۰، وبدائع الصنائع: ۱/۱۴۵، سعيد). مزید ملاحظہ ہو: (عمدۃ الفقہ: ۲/۱۹۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اسکول کے بچوں کے لیے جمعہ کی جماعتِ ثانیہ کا حکم:

سوال: بعض علاقوں میں مسلمان بچے غیر مسلم اسکولوں میں پڑھتے ہیں، اور اسکول والے جمعہ کی اجازت نہیں دیتے، تو ان بچوں کے والدین نے مسجد کی کمیٹی سے درخواست کی کہ ان کے لیے بعد میں مسجد کے صحن میں جماعتِ ثانیہ قائم کی جائے، اب سوال یہ ہے کہ مسجد کے صحن میں جماعتِ ثانیہ قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور امامِ راتب کو اس کے پڑھانے پر مجبور کرنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسجد کے صحن میں جمعہ کی جماعتِ ثانیہ قائم کرنا جائز اور درست ہے، البتہ امامِ راتب کو مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ اگر مسجد میں چند ائمہ ہوں تو باری باری جمعہ پڑھادے یا مسجد کے امام کے علاوہ کوئی نیک آدمی مختصر خطبہ اور نماز پڑھادے تب بھی صحیح اور درست ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار میں مرقوم ہے:

ولو أمكنه الذهاب إلى إمام آخر فعل لأنها تؤدى بمصر واحد بمواضع كثيرة اتفاقاً فإن عجز صلى أربعاً. (الدر المختار: ۲/۱۷۶، سعيد).

جماعتِ ثانیہ مسجد کے باہر صحن میں جائز ہے، ہاں مسجد کے اندر مکروہ ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

و يكره تكرار الجماعة بأذان وإقامة في مسجد محلة لا في مسجد طريق أو مسجد لا إمام له ولا مؤذن . وفي الشامي: قوله يكره ، أي تحريماً لقول الكافي لا يجوز والمجمع لايباح وشرح الجامع الصغير أنه بدعة كما في رسالة السندي. (فتاوى الشامي: ۱/ ۵۵۲، سعيد).

وللمزيد راجع : (الفتاوى الهندية: ۱/ ۸۳، وشرح منية المصلى ،ص ۶۱۴ ،سهيل).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

سوال: میں اردو گورنمنٹ اسکول ریاست مہاراشٹر میں مدرس ہوں، جمعہ کا وقت ساڑھے دس بجے سے دو بجے تک کے درمیان یعنی اسکول کی مصروفیت میں آتا ہے، اب ہم لوگ اسکول بند کر کے ویسے ہی جمعہ پڑھ لیا کرتے تھے، اب اس کے لیے آفیسر تنگ کرتے ہیں، ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ شام کو مدرسہ ڈھائی بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک ہے اور نوکری کے علاوہ کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے؟

جواب: کوشش کر کے کوئی ایسی جگہ تجویز کر لیں جہاں ڈھائی بجے جمعہ ہوجاتا ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۸/۳۴، جامعہ فاروقیہ)۔

نیز مجموعۃ الفتاویٰ: ۱/۲/۳۷، ط: میر محمد کتب خانہ، وامداد الاحکام: ۱/۸۳۷، وخیر الفتاویٰ: ۳/ ۹۵، میں بھی جمعہ کی دوسری جماعت کے جواز کا فتویٰ موجود ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دو شخص قاری عاری اور امی ملبوس میں امامت کا حکم:

سوال: صحتِ امامت کے لیے شرط یہ ہے کہ امام کا حال مقتدی کے برابر یا اس سے اعلیٰ ہو، لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ دو شخص با جماعت نماز پڑھنا چاہیں؛ ان میں سے ایک عاری الثوب وقاری ہے اور دوسرا امی ومکتسی ہے، عاری میں نماز کی شرط ستر مفقود ہے جبکہ امی میں رکن نماز قراءت مفقود ہے، تو اب امامت کا حقدار کون ہوگا، یعنی رکن اور شرط میں کس کو ترجیح ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: دونوں کو انفراداً نماز ادا کر لینا چاہیے، جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھنی چاہیے، کیونکہ کسی کا ستر دیکھنا مکروہِ تحریمی ہے، اور نماز با جماعت سنت ہے اور ارتکابِ مکروہ سے ترکِ سنت اولیٰ ہے۔

لیکن بالفرض اگر جماعت سے نماز پڑھنا چاہیں تو قاری عاری صف کے درمیان کھڑا ہو کر امامت کرائے اور امی ملبوس مقتدی بن جائے، یعنی رکن کو شرط پر ترجیح ہوگی، کیونکہ رکن یعنی قراءت کا کوئی بدل نہیں جبکہ شرط یعنی ستر عورت کے لیے بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھ سکتا ہے، ہاں مومی امام کے پیچھے رکوع، سجدہ کرنے والے کی اقتدا درست نہیں ہوتی، اس لیے امام رکوع، سجدے کے ساتھ امامت کرائے۔

صاحبِ ہدایہ نے جواز تحریر فرمایا ہے، ملاحظہ ہو: **و من لم يجد ثوباً صلى عرياناً قاعداً يومئ بالركوع والسجود، هكذا فعله أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، فإن صلى قائماً أجزأه، لأن في القعود ستر العورة الغليظة، و في القيام أداء هذه الأركان فيميل إلى أيهما شاء، إلا أن الأول أفضل**. (الهداية: ۹۵/۱، ط:المصباح). **و ينظر:** (البناية: ۱۵۵/۲، مكتبه رشيديه).

وفي مجمع الأنهر: وفي المبسوط: والعراة يصلون وحداناً متباعدين يومون إيماء وإن صلوا بجماعة يتوسطهم الإمام والأفضل أنهم يصلون فرادى، وقال بعض المشايخ: والعارى يصلي قائماً في ظلمة الليل؛ لأن ظلمتها تستر عورته. (مجمع الانهر: ۸۲/۱).

وفي الكفاية شرح الهداية: قوله كالعراة، ذكر شيخ الإسلامؒ العراة إذا كانوا جماعة يصلون وحداناً قعوداً يومئون إيماء ولا يصلون بجماعة لأنهم لا يتوصلون إلى إقامة الجماعة إلا بعد ارتكاب أمر مكروه لأن الإمام منهم يحتاج إلى أن يقوم وسطهم حين صلوا بجماعة كيلا يقع بصرهم على عورته وهذا أمر مكروه والجماعة سنة وترك ما هو سنة أولى من ارتكاب ما هو مكروه. (الكفاية شرح الهداية: ۳۰۶/۱، ط:مكتبه رشيديه).

وينظر: (البناية فى شرح الهداية: ۳۹۷/۲، ط:مكتبه رشيديه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

قاری کا امی کی اقتدا کرنے سے فسادِ نماز کا حکم:

سوال: امام صاحب کو ایک مرتبہ آنے میں تاخیر ہوگئی، مقتدیوں نے سوچا نہیں آئیں گے، ان میں سے ایک آگے بڑھ گیا لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی قرآن پڑھنا نہیں جانتا تھا، امام صاحب آگئے اور اس امی کی

اقتدا کرلی، تو اب نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ اگر فاسد ہوئی تو کس کی؟ فقط امام صاحب کی یا تمام مقتدیوں کی؟

الجواب: فقہ کی اصطلاح میں امی اس کو کہتے ہیں جس کو اتنا قرآن بھی یاد نہ ہو جس سے نماز صحیح ہوجاتی ہے، اور عوام اس کو امی کہتے ہیں جو عالم نہ ہو، تو بصورتِ مسئولہ اگر امی کو اتنا قرآن یاد تھا جس سے نماز صحیح ہوجاتی ہے تو قاری صاحب سمیت تمام کی نماز صحیح ہوگئی، اور غالب گمان یہی ہے کہ کچھ سورتیں ضرور یاد ہوں گی۔

لیکن اگر وہ شخص حقیقی معنی میں امی تھا، کچھ بھی یاد نہیں تھا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک امام صاحب سمیت سب کی نماز فاسد ہوجائے گی، یہی ظاہر الروایہ ہے اور اکثر مشائخ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے۔

ہاں صاحبینؒ کے نزدیک فقط امام صاحب کی نماز فاسد ہوگی باقی سب امیوں کی نماز صحیح ہوجائے گی۔ اور امام ابوالحسن الکرخیؒ فرماتے ہیں کسی کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں: امام محمدؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

باب صلاة الأمي: قلت: أرأيت رجلاً أمياً صلى بقوم أميين و فيهم من يقرأ وفيهم من لايقرأ قال: صلاتهم فاسدة وهوقول ابى حنيفةؒ وقال محمد صلاة من يقرأ فاسدة وصلاة من لايقرأ تامة وهو قول ابى يوسفؒ. (المبسوط: ۱/۱۸۵، ط: ادارة القرآن، كراتشى).

وللمزيد راجع: (الجامع الصغير، ص۹۵، والهداية: ۱/۸۸، والدرالمختار مع رد المحتار: ۱/۵۵۴، سعيد، والجوهرة النيرة: ۱/۷۲، ط: ملتان).

علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے کہ عبادات میں مطلقاً امام صاحبؒ کے قول پر فتویٰ ہوگا۔

قال: في كل العبادات رجح. قول الإمام مطلقاً مالم تصح عنه، رواية بها الغير أخذ. مثل تيمم لمن تمراً نبذ. (رسم المفتى، ص).

القول الراجح میں امام صاحبؒ کے قول کی ترجیح نقل کی گئی ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

القول الراجح؛ هو قول أبي حنيفةؒ، قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخارى، واختلف المشايخ على قول أبي حنيفةؒ والأصح أنه تفسد صلاتهم، وقال العلامة قاضى خان: ولايصح اقتداء أمي وقارئ بأمي ولا بأخرس، وقال العلامة الحصكفي: وإذا اقتدى أمي وقارئ بأمي، تفسد صلاة الكل للقدرة على القراء ة بالاقتداء بالقاري سواء علم به أو

لا، نـواه أو لا ، وقـال الـعـلامة ابـن عـابـدين، تحت قوله على المذهب: وجهه أن الفرائض لايـختـلف فيهـا الـحال بين العلم والجهل ، بحر، وإذا لم يشترط العلم فالنية أولى، زيلعي، وهكذا في البحر والتبيين والهندية . (القول الراجح : ۱/۹۴).

امام کرخیؒ کا قول ملاحظہ فرمائیں:

قـال الـعلامة العينيؒ في البناية : وفي المحيط: ذكر الكرخي في مختصره ، لو اقتدى الـقـارئ بـالأمي، ولم ينو إمامته لا تفسد صلاته ،لأنه يلحقه فساد صلاته من جهة القارئ فلا بد من التزامه كالمرأة ، وقيل: تفسد وإن لم ينو إمامته . (البناية : ۲/۴۴۲،ط:رشیدیه).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مذکور ہے:

سوال: ایک توتلا آدمی نماز پڑھارہا تھااس کے پیچھے کئی ایک آدمی مقتدی تھے، بعد ایک رکعت ایک عالم نماز پڑھنے کی غرض سے آیا وہ نماز مین شریک ہو یا نہ ہو؟ اگر شریک ہوگیا تو سب لوگوں کی نماز تو باطل نہ ہوجاوے گی اور عالم کی نماز توتلے کے پیچھے صحیح ہوگی یا نہیں؟

الجواب: وہ عالم جو بعد میں آیا اگر اپنی نماز علیحدہ پڑھے تو اس کی نماز بھی صحیح ہوگی، اور جو امی پہلے سے نماز پڑھ رہے تھے ان کی بھی نماز صحیح ہوگی، اور اگر وہ عالم امی مذکور کے پیچھے اقتدا کرے گا تو پھر کسی کی نماز بھی صحیح نہ ہوگی نہ اس عالم کی، نہ ان امیوں کی جو پہلے سے پڑھ رہے تھے، چنانچہ عبارتِ درمختار: **وإذا اقتـدى وقارئ بأمي تفسد صلاة الكل...** اس کو شامل ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۳/۱۱۱، دارالاشاعت)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نمازی کے سامنے سے گزرنے کی حد:

سوال: ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور اس کے سامنے سترہ نہیں ہے اور گزرنا ضروری ہو تو سامنے کتنی جگہ چھوڑ کر گزر سکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسجد کبیر ہو تو مشائخ احناف کے اس بارے میں دو اقوال ہیں؛ ۱۔ سجدہ کی جگہ سے آگے سے گزرنا جائز ہے۔ ۲۔ موضعِ نگاہ، یعنی نمازی سجدہ کی جگہ نگاہ رکھے تو گزرنے والے کو نہ دیکھ سکے۔ پہلی روایت یعنی

سجدے کی جگہ سے آگے سے گزرنا جائز ہے، اس پر حضرت گنگوہیؒ نے فتویٰ دیا ہے۔

ملاحظہ ہو باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ میں مرقوم ہے:

جنگل میں سجدہ کی جگہ کو بچا کر نکلنا درست ہے، اور جو مسجد چالیس ہاتھ لمبی اور چالیس ہاتھ چوڑی ہو اس میں بھی ایسا ہی ہے اور اس سے کم مسجد اور گھر میں مطلقاً آگے جانا منع ہے، فقط، واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ص:۱۵٦)۔

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

و هذا فصل لا ذكر له في الأصل واختلف المشايخ فيه ...وبعضهم قالوا: مقدار موضع صلاته وهو موضع قدمه إلى موضع سجوده ، وفي الكافي: إنما يأثم إذا مر في موضع سجوده في الأصح لأن هذا من المكان حقه وفي تحريم ما وراءه تضييق على المارة، قال الشيخ أبوجعفر: إذا مر في موضع يقع بصر المصلي عليه، وبصره إلى موضع سجوده ، فذلک مكروه ، وما زاد على ذلک فليس بمكروه ، وفي الظهيرية: والمختار ما قاله أبوجعفر. (الفتاوى التاتارخانية: ١/ ٦٣٠،ادارة القرآن، كراتشی).

بدائع الصنائع میں ہے:

واختلف المشايخ فيه ، قال بعضهم: قدر موضع السجود ، وقال بعضهم : مقدار الصفين ، وقال بعضهم : قدر ما يقع بصره على المار لو صلى بخشوع ، وفيما وراء ذلک لايكره وهو الأصح. (بدائع الصنائع: ١/ ٢١٧،سعيد).

فتاویٰ شامی میں منقول ہے: **قوله بموضع سجوده ، أي من موضع قدمه إلى موضع سجوده ،كما في الدرر، قوله في الأصح ، هو ما اختاره شمس الأئمة وقاضيخان ، و صاحب الهداية واستحسنه في المحيط وصححه الزيلعي ومقابله ماصححه التمرتاشي و صاحب البدائع واختاره فخر الإسلام ورجحه في النهاية والفتح ، أنه قدر ما يقع بصره على المار لو صلى بخشوع اي رامياً ببصره الى موضع سجوده .** (فتاوى الشامي: ١/ ٦٣٤،سعيد).

وللمزيد راجع : (الفتاویٰ الهندية: ١/ ١٠٤).

حاصل یہ ہے کہ دونوں اقوال کی تصحیح کی گئی ہے ہاں حضرت گنگوہیؒ نے پہلے قول پرفتویٰ دیا ہے۔واللہ ﷻ اعلم۔

جماعت کا مقررہ وقت ہونے کے بعد امام کے انتظار کا حکم:

سوال: اگر جماعت کا مقررہ وقت ہو چکا اور امام حاضر نہیں ہے تو کتنی دیر انتظار کرنا چاہیے؟

الجواب: اقامت شروع کرنے میں امام کی کچھ رعایت کرنی چاہیے،حضرت بلالؓ نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے تشریف لانے پر اقامت شروع فرماتے،ہاں امام کو کچھ تاخیر ہو جائے تو نماز شروع کی جاسکتی ہے،ایک مرتبہ حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امامت کے لیے آگے کیا اور ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو آگے کیا تھا۔البتہ مناسب یہ ہے کہ ایک دو منٹ انتظار کیا جائے۔

عن جابر بن سمرة قال: كان بلال يؤذن ثم يمهل فإذا رأى النبي صلى الله عليه وسلم قد خرج أقام الصلاة . (سنن ابی داود،رقم: ۵۳۷،باب فی المؤذن ینتظر الامام).

وعن سهل بن سعد الساعديؓ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ذهب إلى بني عمرو بن عوف ليصلح بينهم فحانت الصلاة فجاء المؤذن إلى أبي بكر فقال: أتصلي للناس فأقيم قال نعم ، فصلى أبوبكر... (صحیح البخاری: ۱/۹۴،رقم: ۶۷۴،ط:فیصل).

کتاب الفتاویٰ میں مذکور ہے:

سوال: جہری نمازوں میں نائب امام کو امام صاحب کا کتنی دیر تک انتظار کرنا چاہیے؟

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت دی ہے کہ اقامت میں امام کی رعایت ہونی چاہیے،یعنی امام کے آنے پر اقامت کہی جائے،لیکن اگر امام معمول کے وقت پر نہ آئے تو نماز شروع کی جاسکتی ہے،چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آنے میں تاخیر ہوئی تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آگے بڑھایا اور ایک بار حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو،موجودہ دور میں مسجدوں میں اوقات نماز متعین ہوتے ہیں،اگر مقررہ وقت پر امام صاحب نہ پہنچیں تو مناسب ہے کہ ایک دو تین منٹ انتظار کیا جائے ،اگر زیادہ تاخیر ہو تو نائب امام نماز پڑھادے تا کہ لوگوں کے

لیے باعث زحمت نہ ہو۔ (کتاب الفتاویٰ: ۲/۳۰۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اتحادِ مجلس کی وجہ سے سجدۂ تلاوت میں تکرار کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص پہلی رکعت میں سجدہ کی آیت تلاوت کرے پھر وہی آیت دوسری رکعت میں بھی پڑھے تو کتنے سجدے واجب ہوں گے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: قیاس کے اعتبار سے ایک ہی سجدہ واجب ہوگا، کیونکہ پوری نماز ایک مجلس ہے اور اتحادِ مجلس کی وجہ سے ایک ہی سجدہ واجب ہوگا، لیکن استحساناً دو سجدے واجب ہوں گے، اور فتویٰ قیاس پر ہے۔

ملاحظہ ہو تحفۃ الفقہاء میں مذکور ہے:

أما إذا كرر آية السجدة فى الصلاة فإن كانت في ركعة واحدة لا تجب إلا سجدة واحدة لاتحاد المجلس حقيقة و إن قرأها في كل ركعة فالقياس أن لا يجب إلا سجدة واحدة، هو قول أبي يوسفؒ لاتحاد المجلس حقيقة و فى الاستحسان يجب بكل تلاوة سجدة و هو قول محمد لأنه لا حرج فى الوجوب لأن تكرار آية سجدة في كل ركعة نادرة فى الصلاة لأنها ليست بموضع التعليم. (تحفة الفقهاء، ص۲۳۷، ط: بيروت).

کشف الاسرار میں مذکور ہے: **القسم الثاني من القياس و هو الذى ترجح على الاستحسان بقوة أثره الباطن، قسم عز وجوده ... و منها ما إذا قرأ السجدة في ركعة فسجدها ثم أعادها فى الركعة الأخرى ...الخ.** (كشف الاسرار: ۴/۱۰، ط: كراچی).

وفى الخانية قال: و بالقياس ناخذ. (فتاویٰ قاضیخان بهامش الهندية: ۱/۱۵۸).

پوری مجلس ایک حکم میں ہے، اس کے چند نظائر ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اگر تھوڑا تھوڑا خون نکلا اور دم سائل بن گیا، تو اگر مجلس ایک ہو تو وضو ٹوٹ گیا ورنہ نہیں۔

۲۔ اگر تھوڑی تھوڑی قئی ہوئی، جمع کرنے سے منہ بھر گیا، اگر مجلس ایک ہے تو وضو ٹوٹ گیا، ورنہ نہیں۔

۳۔ حدِ زنا کے ثبوت کے لیے مختلف چار مجلسوں میں اقرار کرنا ضروری ہے اگر ایک مجلس میں بار بار اقرار

کیا تو ایک ہی اقرار مانا جائیگا۔

۴۔ایک مجلس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک بار بار دہرایا جائے تو ایک مرتبہ درود واجب ہے۔

۵۔پہلی رکعت میں فحش غلطی کی اور دوسری رکعت میں تصحیح کر لی تو نماز درست ہوگئی۔

۶۔پہلی رکعت میں واجب چھوٹ جائے تو آخر میں سجدۂ سہو سے تلافی ہو جاتی ہے۔

۷۔مجلس بیع میں ایجاب وقبول معتبر مانا جاتا ہے اگر چہ وقت کے اعتبار سے دونوں میں لمبا فاصلہ ہو۔

۸۔مجلس طلاق میں مخیّرہ عورت کا اختیار اور شوہر کا اختیار دینا معتبر ہوتا ہے۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

صلاۃِ معکوس اور اس کا حکم:

سوال: بعض آدمی کہتے ہیں کہ تم صلاۃِ معکوس پڑھا کرو، تو صلاۃِ معکوس کسے کہتے ہیں؟ اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: تربیت الطالبین میں فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ لکھتے ہیں:

صلاۃِ معکوس کہتے ہیں کہ بعض آدمی چھت میں رسی باندھ کر اس میں پیر باندھ کر الٹے لٹک کر اپنا معمول ذکر پورا کرتے ہیں، یہ صلاۃِ معکوس ہے آپ اس کو اختیار نہ کریں، قوارع وہ آیات جن میں قیامت کا تذکرہ، دنیا کے ٹوٹنے، پھوٹنے، اور خدا کے سامنے پیش ہونے کا تذکرہ ہو اور نافرمانوں کے لیے تہدید ہے جیسے سورۃ القارعہ۔ (تربیت الطالبین، ص ۱۱۷)۔

القول الجمیل میں حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ فرماتے ہیں:

وللچشتية صلاة تسمى صلاة المعكوس ، لم نجد من السنة ولا أقوال الفقهاء ما نشدها به فلذلك حذفناها والعلم عند الله . (شفاء العليل ترجمه القول الجميل ،ص ۸۶، ط: رحمانيه). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

نماز میں سورۂ فاتحہ اور سورت کے درمیان تسمیہ پڑھنے کا حکم:

سوال: نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا سنت ہے یا نہیں؟ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ نہیں پڑھنا چاہیے، بعض میں لکھا ہے کہ پڑھنا چاہیے، اب صحیح اور معمول بہ قول کونسا ہے؟

الجواب: سورۂ فاتحہ کے بعد سورت سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں فقہائے احناف کے درمیان اختلاف ہے لیکن اصح اور معمول بہ یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔

ملاحظہ ہو درِمختار مع ردِ محتار میں منقول ہے:

لا تسن بين الفاتحة والسورة مطلقاً ، ولو سرية ولا تكره اتفاقاً وما صححه الزاهدي من وجوبها ضعفه في البحر . و في رد المحتار : وذكر في المحيط : المختار قول محمدؒ و هو أن يسمى قبل الفاتحة وقبل كل سورة في كل ركعة ... قوله ولا تكره اتفاقاً ، ولهذا صرح في الذخيرة والمجتبى بأنه سمى بين الفاتحة والسورة المقروء ة سراً وجهراً كان حسناً عند أبي حنيفةؒ ورجحه المحقق ابن الهمامؒ وتلميذه الحلبيؒ لشبهة الاختلاف في كونها آية من كل سورة ، بحر . (فتاوى الشامي: ۱/۴۹۱، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (البحر الرائق: ۱/۳۱۲، ط: کوئٹہ، والهداية مع فتح القدير: ۱/۲۹۳، دار الفكر).

فتاویٰ رحیمیہ میں مرقوم ہے:

سورۂ فاتحہ اور سورت کے درمیان بسم اللہ پڑھنا بہتر ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۵/۲۹، طبع قدیم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تراویح میں سورۂ ناس پر قرآن ختم کرنے کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے تراویح کی نماز میں سورۂ ناس پر قرآن ختم کر دیا اور آگے الم سے مفلحون تک نہیں پڑھا، اب اس کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: تراویح میں قرآن ختم کرتے وقت الم سے مفلحون تک پڑھنا مسنون ہے، واجب اور لازم نہیں ہے، لہٰذا اس کے چھوڑنے سے نماز بلا کراہت صحیح اور درست ہو جائے گی، البتہ حدیث شریف میں بہتر فرمایا

ہے اس لیے اس پر عمل کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رجل: یا رسول اللّٰہ ! أی العمل أحب إلی اللّٰہ ؟ قال: الحال المرتحل، قال: وما الحال المرتحل ؟ قال: الذي یضرب من أول القرآن إلی آخرہ کلما حل ارتحل . قال أبوعیسیٰ: ھذا حدیث غریب لا نعرفه من حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ إلا من ھذا الوجه وإسنادہ لیس بالقوي .

حدثنا محمد بن بشار حدثنا مسلم بن إبراھیم حدثنا صالح المری عن قتادۃ عن زرارۃ بن أوفی عن النبي صلی اللّٰہ علیه و سلم نحوہ ولم یذکر فیه عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ، قال أبوعیسیٰ : وھذا عندي أصح من حدیث نصر بن علی عن الھیثم بن الربیع . (سنن الترمذی ، رقم: ۲۹۴۸).

قال فی الدرالمختار: إذا ختم فیقرأ من البقرۃ . وفی الشامیة: قوله إلا إذا ختم ، قال في شرح المنیة وفی الولوالجیة من یختم القرآن فی الصلاۃ إذا فرغ من المعوذتین فی الرکعة الأولی یرکع ثم یقرأ فی الثانیة بالفاتحة وشي ء من سورۃ البقرۃ لأن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: خیر الناس الحال المرتحل أی الخاتم المفتتح . (فتاوی الشامی: ۱/۵۴۷، سعید). (وکذا فی الموسوعة الفقھیة الکویتیة : ۲۷/۱۰۴ ، ومراقی الفلاح،ص ۱۵۴ ، والفتاوی الولوالجیة : ۱/۷۵، ط:بیروت).

علامہ سیوطیؒ نے الاتقان فی علوم القرآن میں لکھا ہے:

مسألة : یسن إذا فرغ من الختمة أن یشرع في أخری عقب الختم لحدیث الترمذي وغیرہ ، أحب الأعمال إلی اللّٰہ الحال المرتحل...وأخرج الدارمي بسند حسن عن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن أبي بن کعب رضی اللہ عنہ أن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم کان إذا قرء : قل أعوذ برب الناس افتتح من الحمد ثم قرء من البقرۃ إلی واولئک ھم المفلحون ، ثم دعا بدعوۃ الختمة ثم قام . (الاتقان : ۱/۳۸۴،ط:الھیئة المصریة).

امام جزریؒ النشر فی القراءات العشر میں لکھتے ہیں:

قرء مجاهد على ابن عباس رضي الله عنه ، وقرء ابن عباس رضي الله عنه على أبي رضي الله عنه ، فلما ختم ابن عباس رضي الله عنه قال: استفتح بالحمد وخمس آيات من البقرة وهكذا قال لي النبي صلى الله عليه وسلم حين ختمت عنده . (النشر في القراءات العشر: ۴۱۴/۲،ط:دار الكتب العلمية).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ فریدیہ:۲۵۳/۱،وفتاویٰ محمودیہ:۳۱۴/۷،۳۱۷،جامعہ فاروقیہ)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

قعدہ میں سو جانے سے نماز کا حکم:

سوال: ایک شخص صبح کی نماز میں قعدہ میں سو گیا، جب آنکھ کھلی تو فوراً سلام پھیر دیا، اس کے بعد دیکھا کہ امام تو ابھی نماز میں ہے، تو وہ شخص بیٹھا رہا اور امام کے ساتھ دوبارہ سلام پھیر دیا، کیا اس شخص کی نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ یا اعادہ کی ضرورت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: شخص مذکور کی نماز صحیح ہوگئی، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

لو أتم المؤتم التشهد بأن أسرع فيه وفرغ منه قبل إتمام إمامه فأتى بما يخرجه من الصلاة كسلام أو كلام أو قيام جاز أي صحت صلاته لحصوله بعد تمام الأركان لأن الإمام وإن لم أتم التشهد لكنه قعد قدره لأن المفروض من القعدة قدر أسرع ما يكون من قراءة التشهد وقد حصل وإنما كره للمؤتم ذلك لتركه متابعة الإمام بلا عذر فلو به كخوف حدث أو خروج وقت جمعة أو مرور مار بين يديه فلا كراهة . (فتاوى الشامي: ۵۲۵/۱،سعيد).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

اگر سہواً امام سے پہلے سلام پھیر دیا پھر یاد آ گیا تو ٹھہرا رہے اور امام کی اتباع میں دوبارہ سلام پھیر دے بشرطیکہ کوئی اور قول یا فعل منافی صلاۃ نہ کیا ہو، ورنہ اس کے ذمہ نماز کا اعادہ لازم ہوگا، اگر عمداً امام سے پہلے سلام پھیر کر نماز سے خارج ہو گیا تو دوبارہ پڑھے۔ (فتاویٰ محمودیہ:۶۴۲/۶،جامعہ فاروقیہ)۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مرقوم ہے:

سوال: اگر مقتدی نماز ختم ہونے سے پہلے سلام پھیر دے اور فوراً یاد آنے پر بغیر کلام کیے نماز امام کے

ساتھ پوری کرے تو نماز ہو جاوے گی یا نہیں؟

جواب: **إلا السلام ساهياً للتحليل أى للخروج من الصلاة قبل إتمامها على ظن إكمالها فلا يفسد** . (الدرالمختار: ۱/ ۶۱۵،سعید). نماز ہو جائے گی۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، کبیر: ۴/ ۱۴۵، مدلل ومکمل، دارالاشاعت)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

رکوع میں شرکت کے لیے تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی آدمی نماز میں ایسے وقت پہنچے کہ امام رکوع میں ہے، تو کیا تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ لے پھر تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے یا بلا ہاتھ باندھے رکوع میں چلا جائے؟ افضل کیا ہے؟

الجواب: افضل یہ ہے کہ تحریمہ کے بعد تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھے بغیر رکوع میں چلا جائے، لیکن تکبیر تحریمہ حالتِ قیام میں اطمینان سے کہے، اگر تحریمہ جھکتے ہوئے کہی تو تحریمہ صحیح نہ ہوگی، غالبًا اسی وجہ سے عام معمول یہ ہے کہ تحریمہ کے بعد بقدرِ تسبیحہ ہاتھ باندھ لیتے ہیں پھر تکبیر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے ہیں تاکہ بالیقین تحریمہ ادا ہو جائے اور کوئی شک باقی نہ رہے، یہی احوط طریقہ ہے۔

قال فى الهداية : الأصل أن كل قيام فيه ذكر مسنون يعتمد فيه وما لا فلا هو الصحيح فيعتمد في حالة القنوت وصلاة الجنازة و يرسل فى القومة وبين تكبيرات الأعياد . (الهداية :۴۸،المكتبة الاسلامية).

وفي فتاوى الشامي: ومقتضاه أنه يعتمد أيضاً في صلاة التسابيح ثم رأيته ذكره ط ، والرحمتي والسائحاني بحثاً قوله ما لم يطل القيام فيضع ، أى فإن أطاله لكثرة القوم فإنه يضع وهذا مبني على أن الأصل أنه سنة قيام له قرار لا على أنه سنة قيام فيه ذكر مسنون . (فتاوى الشامي: ۱/ ۴۸۸،سعيد).

وللاستزادة راجع : (الدرالمختار مع رد المحتار: ۱/ ۴۸۸،سعيد،وفتح القدير: ۱/ ۲۸۸، دارالفكر والمحيط البرهانى: ۲/ ۲۱،ط: داراحياء التراث العربى).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

جس قیام میں ذکر مسنون یعنی مشروع ہے خواہ وہ ذکر فرض ہو یا واجب یا سنت اس میں ہاتھ باندھنا سنت ہے جیسے ثنا وقنوت ونمازِ جنازہ اور جس قیام میں ذکر مشروع نہیں جیسے عیدین کی تکبیریں وہاں ہاتھ چھوڑنا سنت ہے یہی صحیح ہے، رکوع کے بعد قومہ میں بالاتفاق ہاتھ چھوڑ دے اس لیے کہ اس میں ذکر مشروع تبدیل رکن کے لیے ہے نہ کہ قومہ کے لیے۔ (عمدۃ الفقہ :۲/۱۰۳)۔

جھکتے ہوئے تکبیر کہنے سے تحریمہ صحیح نہ ہوگی۔ **قال فی الدر المختار: أدرک الإمام راکعاً فقال: اللّٰہ قائماً وأکبر راکعاً لم یصح فی الأصح...ویشترط کونہ قائماً فلو وجد الإمام راکعاً فکبر منحنیاً إن إلی القیام أقرب صح. وفی الشامی: قولہ قائماً، أی حقیقۃ وھو الانتصاب أو حکماً وھو الانحناء القلیل بأن لا تنال یداہ رکبتیہ، قولہ فی الأصح، أی بناء علی ظاھر الروایۃ.** (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۱/۴۸۰، سعید).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

اگر تکبیر تحریمہ کھڑے ہو کر نہیں کہی بلکہ اس طرح جھکتے ہوئے کہی ہے کہ رکوع میں تکبیر پوری ہوئی تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوئی۔ (فتاویٰ محمودیہ:۵/۵۴۳، جامعہ فاروقیہ)۔ واللّٰہ ﷻ اعلم۔

تراویح میں تجوید کی غلطیاں بتانے کا حکم:

سوال: تراویح کی نماز میں حافظ صاحب کی تجوید کی غلطیاں بتانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: نماز میں لقمہ دینا بوقتِ ضرورت جائز ہے، بلاضرورت نہیں دینا چاہیے، نیز اس میں جلدی نہیں کرنی چاہیے، تلاوت کی غلطیاں دو قسم پر ہیں: (۱) لحن جلی۔ (۲) لحن خفی۔

لحن جلی وہ غلطی ہے جس سے قرآن کا معنی ومطلب بدل جاتا ہے، تو ایسے وقت لقمہ دینا چاہیے بلکہ کبھی ضروری ہوتا ہے جب نماز میں فساد لازم آتا ہو۔

البتہ ایسی غلطی جس سے معنی نہیں بدلتا لیکن لفظ غلط ہو، جیسے بعض علاقوں والے ک کو چ پڑھتے ہیں؛ اللہ

اکبر کو اللہ اچبر کہتے ہیں، یا جیسے کیپ ٹاؤن والے ح کو خ میں تبدیل کرتے ہیں، مثلاً: الحمد تو الخمد کہتے ہیں تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی، لہذا لقمہ دینے کی ضرورت نہیں۔ ملاحظہ ہو اشرف الاحکام میں ہے:

غلط پڑھتے پڑھتے عادت ہوجائے تو وہ اس کا تلفظ ہوجائے گا، امام فضلیؒ کا قول ہے کہ جس شخص کو غلط لفظ پڑھتے پڑھتے اس کی عادت ہوگئی تو وہ اس کی لغت ہوجائے گا لہٰذا ایسے شخص کے پیچھے صحیح قرآن پڑھنے والے کی نماز صحیح ہوجائیگی،، چنانچہ ایک مرتبہ مکہ معظّمہ میں ایک ترکی امام کے پیچھے حضرت مولانا قاسم صاحبؒ اور کئی علماء نے نماز پڑھی، ترکی ک کی جگہ چ پڑھتے ہیں، امام نے بھی ایاک نعبد کی جگہ ایاچ نعبد پڑھا، سب لوگوں نے نماز لوٹائی مگر مولانا قاسم صاحب نے نہیں لوٹائی اور یہی ارشاد فرمایا۔ (اشرف الاحکام، تتمہ امداد الفتاوی ص ۵۹، بحوالہ انفاس عیسیٰ: ۲/۴۳۴، ط: اسلامیات)۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

وإن كـان الـخـطأ بإبدال حرف بحرف فإن أمكن الفصل بينهما بلا كلفة كالصاد مع الـطـاء بـأن قـرأ الـطـالحات مكان الصالحات فاتفقوا على أنه مفسد وإن لم يكن إلا بمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين فأكثرهم على عدم الفساد لعموم البلوىٰ . (فتاوى الشامي: ۱/۶۳۱، سعيد).

(۲) لحن خفی: وہ غلطی ہے جس سے معنی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، جیسے ترکِ مد فرعی، اخفا، غنہ وغیرہ، تو ان میں لقمہ نہیں دینا چاہیے کیونکہ ان کی وجہ سے نماز میں کوئی فساد نہیں آتا۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

قـولـه وإلا لا، أي وإن لـم يـغيـر المعنى فلا فساد إلا في حرف مد ولين إن فحش فإنه يـفسد، وإن لم يغير المعنى، وحروف المد واللين هي حروف العلة الثلاثة : الألف ، والواو واليـاء ، إذا كانت ساكنة و قبلها حركة تجانسها ، فلو لم تـجانسها فهي حروف علة ولين لا مد . (فتاوىٰ الشامي: ۱/۶۳۰، سعيد).

قـال فـي الهـنـدية : ذكـر فـي الـفـوائـد: لو قرأ في الصلاة بخطأ فاحش ثم رجع وقرأ صـحيـحاً قال: عندي صلاته جائزة وكذالک الإعراب ولو قرأ النصب مكان الرفع والرفع

مکان النصب أو الخفض مکان الرفع أو النصب لا تفسد صلاته . (الفتاوی الهندیة: ۱/۸۲).

بوقتِ ضرورت نماز میں لقمہ دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ملاحظہ ہو: (الہدایۃ:۱/۱۳۶،المصباح،والمبسوط: ۱/۱۹۳،ادارۃ القرآن،والمحیط البرہانی:۱/۳۷۷)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ماہِ رمضان میں تراویح کے وقت طواف کا حکم:

سوال: ماہِ رمضان میں نمازِ تراویح بہتر ہے یا طواف؟ بینوا توجروا۔

الجواب: سنتِ متعینہ اپنے وقت میں طواف سے افضل ہے، بنابریں ماہِ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح اپنے وقت میں طواف سے افضل اور بہتر ہے۔ابن ماجہ شریف میں روایت ہے:

عن عائشة رضي الله تعالیٰ عنها قالت: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا فاتته الأربع قبل الظهر صلاها بعد الرکعتین بعد الظهر . (سنن ابن ماجه ،ص ۸۰،باب ما فاتته الاربع قبل الظهر، ط:قدیمی). اس حدیث کے تحت حاشیہ میں مرقوم ہے:

ورجح في فتح القدیر تقدیم الرکعتین لأن الأربع فاتت عن موضعها المسنون فلا یفوت الشنتان بلا ضرورة ، أقول : هذا هو الحق إن شاء الله تعالیٰ، للحدیث الوارد به . (حاشیة سنن ابن ماجه ،ص ۸۰).

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

قضا نمازیں پڑھنے کے لیے سنتِ مؤکدہ اور تراویح نہ چھوڑیں ... فقال في المضمرات: الاشتغال بقضاء الفوائت أولیٰ وأهم من النوافل إلا سنن المفروضة...الخ . (احسن الفتاویٰ:۴/۱۹،سعید)۔

ہاں آفاقی کے حق میں مطلق نوافل سے نفل طواف افضل ہے۔ملاحظہ ہو مرقاۃ میں ہے:

قال أئمتنا: إن الطواف للغرباء أفضل من الصلاة النافلة .(مرقاة المفاتیح : ۳/۱۸۶،باب قیام شهر رمضان،ط:مکتبه امدادیه ملتان). (و کذا في عمدة القاری : ۷/۲۰۵،ط:دارالحدیث ملتان، وفتاوی الشامی: ۲/۵۰۲،سعید، وعمدة الفقه: ۴/۱۹۷) . واللہ ﷻ اعلم۔

حنفی امام کا شافعی طریقے پر وتر کی امامت کرنے کا حکم:

سوال: عام طور پر رمضان المبارک میں ہمارے یہاں سے طلباء جنوبی امریکہ تراویح کے لیے جاتے ہیں، وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ وتر شافعی طریقہ پر پڑھادو، کیونکہ مقتدی شافعی المسلک ہوتے ہیں، یعنی دو رکعت اور اس کے بعد ایک رکعت۔ اب اس حنفی امام کو رمضان کے بعد وتر کی قضا کرنی ہوگی یا نہیں؟ نیز مقتدیوں کی نمازِ وتر ادا ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ حنفی امام کی نمازِ وتر ادا نہیں ہوئی، کیوں کہ احناف کے نزدیک ایک رکعت نماز نہیں، لہٰذا وتر کی قضا کرے، ہاں شافعی مقتدیوں کی نمازِ وتر ادا ہوجائے گی، کیونکہ شافعیہ کے یہاں راجح قول کے مطابق مقتدی کی نیت کا اعتبار ہے۔ البتہ آئندہ سے شافعی امام کو وتر پڑھانی چاہیے اور حنفی اس کے پیچھے وتر پڑھ لے اور جب امام دو رکعت پر سلام پھیر دے تو حنفی تیسری رکعت کے لیے کھڑا ہوجائے اور تین وتر پوری کر لے۔ احناف کے ہاں ایک رکعت ممنوع ہے، ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ایک رکعت پڑھنے سے منع کیا گیا ہے:

عن أبي سعيد، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن البتيراء أن يصلي الرجل ركعة واحدة يوتر بها . (التمهيد:۱۳/۲۵۴، ط:مؤسسة القرطبة). (وكذا في نصب الراية :۲/۱۲۰).

طبرانی میں روایت ہے: **عن حصين قال: بلغ ابن مسعود** رضی اللہ عنہ **، أن سعداً يوتر بركعة قال : ما أجزأت ركعة قط .** (المعجم الكبير :۹/۲۸۳/۹۴۲۲، ط:الموصل).

البحر الرائق میں مرقوم ہے: **وجوزه أبوبكر الرازي ويصلي معه بقية الوتر لأن إمامه لم يخرج بسلامه عنده وهو مجتهد فيه .** (البحر الرائق:۲/۴۲، دار المعرفة).

فتح القدير میں مرقوم ہے: **وقول أبي بكر الرازي إن اقتداء الحنفي بمن يسلم على رأس الركعتين في الوتر يجوز ويصلي معه بقيته لأن إمامه لم يخرجه بسلامه عنده لأنه مجتهد فيه ، كما لو اقتدى بإمام قد رعف يقتضي صحة الاقتداء وإن علم منه ما يزعم به فساد صلاته بعد كون الفصل مجتهداً فيه .** (فتح القدير: ۱/۴۳۷، ط: دار الفكر). (وكذا في البناية:

۱/ ۸۳۵، والعرف الشذی: ۱/ ۱۰۴، والفتاوی الہندیۃ: ۲/ ۷، وفتاویٰ دار العلوم زکریا: ۲/ ۴۳۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دو مؤذنوں کے اذان کہنے سے اذان کی سنت ادا ہونے کا حکم:

سوال: بعض یورپی ممالک میں دو مؤذن اذان دیتے ہیں، اس طرح کہ ایک مؤذن اللہ اکبر کہتا ہے اور دوسرا اشہد ان لا الہ الا اللہ کہتا ہے، اسی طرح باری باری دونوں مل کر اذان مکمل کرتے ہیں، کیا اس طرح اذان دینے سے اذان صحیح ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اذان دینے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ ایک ہی مؤذن اذان دے یعنی جو شروع کرے وہی پوری اذان دے کر ختم کرے، ہاں اگر کسی وجہ سے وہ اذان پوری نہ کر سکے تو دوسرا مؤذن ابتدا سے شروع کرے اور پوری اذان مکمل کرے، اگر دوسرا مؤذن پہلے کی باقی ماندہ اذان کو مکمل کرے گا تو اذان صحیح نہیں ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

أقول: يظهر لي أن المراد بالوجوب اللزوم في تحصيل سنة الأذان، وأن المراد أنه إذا عرض للمؤذن ما يمنعه عن الإتمام وأراد آخر أن يؤذن يلزمه استقبال الأذان من أوله إن أراد إقامة سنة الأذان، فلو بنى على ما مضى من أذان الأول لم يصح فلذا قال في الخانية: لو عجز عن الإتمام استقبل غيره، أي لئلا يكون آتياً ببعض الأذان. (فتاوى الشامي: ۱/ ۳۹۳، سعيد).

قال في البحر: وفي الخلاصة خمس خصال إذا وجدت في الأذان والإقامة وجب الاستقبال إذا غشي على المؤذن في أحدهما أو مات أو سبقه حدث فذهب وتوضأ أو حصر فيه ولا ملقن أو خرس يجب الاستقبال... والظاهر أن الوجوب ليس على حقيقته بل بمعنى الثبوت لما في المجتبى: وإذا غشي عليه في أذانه أو أحدث فتوضأ أو مات أو ارتد فالأحب استقبال الأذان وكذا صرح بالاستحباب في الظهيرية، وفي السراج الوهاج وفي القنية وقف في الأذان لتنحنح أو سعال لا يعيد وإن كانت الوقفة كثيرة يعيد. (البحر الرائق:

۱/۲۷۸، دارالمعرفة). (وكذا في فتح القدير: ۱/۲۵۳، دارالفكر).

بحر کی عبارت سے معلوم ہوا کہ عذر کی وجہ سے دومؤذنوں کی اذان صحیح نہیں تو بلا عذر دومؤذنوں کی اذان بدرجہ اولیٰ صحیح نہ ہوگی۔ علامہ شامیؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نماز میں قراءتِ سبعہ پڑھنے کا حکم:

سوال: کیا وقتاً فوقتاً فرض نماز میں قراءتِ سبعہ پڑھنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اگر مقتدیوں میں جہالت زیادہ ہو، مشکل سے قرآن پڑھ سکتے ہیں تو کیا مصلحتاً متولی امام صاحب کو قراءتِ سبعہ سے روک سکتا ہے، تاکہ فتنہ نہ ہو۔ **بينوا بالدليل توجروا بالأجر الجزيل.**

الجواب: فرض نماز میں کبھی کبھی قراءتِ سبعہ میں پڑھنا جائز اور درست ہے، ہاں لوگوں کی جہالت کی وجہ سے تکذیب کا خطرہ ہو تو بلا تعلیم و بیان نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ پہلے لوگوں کو مانوس کرنا چاہیے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن عروة بن الزبير أن المسور بن مخرمة وعبد الرحمن بن عبد القارى حدثناه أنهما سمعا عمر بن الخطاب يقول: سمعت هشام بن حكيم بن حزام يقرأ سورة الفرقان في حياة رسول الله صلى الله عليه وسلم فاستمعت لقراء ته فإذا هو يقرأ على حروف كثيرة لم يقرئنيها رسول الله صلى الله عليه وسلم فكدت أساوره فى الصلاة فتصبّرت حتى سلم فلببته بردائه فقلت من أقرأک هذه السورة التي سمعتک تقرأ قال: أقرأ نيها رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت كذبت فإن رسول الله صلى الله عليه وسلم قد أقرأنيها على غير ما قرأت فانطلقت به أقوده إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت: إني سمعت هذا يقرأ بسورة الفرقان على حروف لم تقرأنيها ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أرسله اقرأ يا هشام فقرأ عليه القراء ة التي سمعته يقرأ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كذلک أنزلت ثم قال: اقرأ يا عمر فقرأت القراء ة التي أقرأني فقال رسول الله صلى

اللّٰہ علیه وسلم کذلک أنزلت إن هذا القرآن أنزل علی سبعة أحرف فاقرء وا ما تیسر منه . (صحیح البخاری : ۲/۷۴۷/۴۹۹۲،باب انزل القرآن علی سبعة احرف،ط:فیصل).

لامع الدراری میں مرقوم ہے:

والأقرب أنه نزل علی لغة واحدة لغة قریش و لکنه استزاد فزید له و رخص فی القراء ة في أیتها أمکن ونسبة النزول إلی السبعة بأسرها مجاز باعتبار أنها صارت في حکم اللغة النازلة في جواز القراء ة فی الصلاة وحرمة القراء ة فی الجنابة والحیض إلی غیر ذلک . (لامع الدراری : ۳/۲۵۳).

مذکورہ بالا حدیث اوراس کی شرح سے پتا چلتا ہے کہ قراءتِ سبعہ کی تلاوت نماز میں جائز اوردرست ہے۔

فقہاء کے ہاں بھی اس کی اجازت ہے۔ملاحظہ ہوعلامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

تتمة : القرآن الذي تجوز به الصلاة بالاتفاق هو المضبوط في مصاحف الائمة التي بعث بها عثمان رضي اللّٰہ تعالیٰ عنهم إلی الأمصار و هو الذي أجمع علیه الائمة العشرة و هذا هو المتواتر جملة وتفصیلاً فما فوق السبعة إلی العشرة غیر شاذ و إنما الشاذ ما وراء العشرة و هو الصحیح و تمام تحقیق ذلک في فتاوی العلامة قاسم . (فتاوی الشامی: ۱/۴۸۶) .

وأیضاً ینظر : (فتح القدیر : ۱/۲۸۶،دارالفکر،وفتح باب العنایة : ۱/۲۳۳،بیروت).

علامہ عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں:

ابن صلاحؒ اورنوویؒ نے کہا ہے کہ قراءتِ سبعہ یاعشرہ میں سے جس قراءت میں پڑھناشروع کیا ہو تواولیٰ یہ ہے کہ اسی قراءت میں تمام کرے اوراگرایک پوراجملہ اس قراءت میں پڑھ کے دوسرے جملہ کودوسری قراءت میں شروع کیا تو بھی جائز ہےاوربعض علماء نے مطلقاً ایک قراءت کودوسری قراءت سے ملادینے کومنع کیا ہے،اورابن جزری کہتے ہیں اگردوقراءتوں کے ملادینے سے ایسا کلام پیدا ہوجائے جوعربیت اورلغت کے اعتبار سے مہمل ہوتو قراءتوں کا ملادینا جائزنہیں ہے،جیسے **فتلقی آدم من ربه کلمات** میں(آدم نے اپنے رب کے کلمات پائے)ابن کثیر کی قراءت کے لحاظ سے کلمات کا پیش اورغیرابن کثیر کی قراءت سے آدم کا پیش لینے

سے کلام مہمل ہو جائیگا لہٰذا یہ صورت درست نہیں۔ . . (مجموعۃ الفتاویٰ: جلداول، ص ۱۰۸، میر محمد کتب خانہ)۔

امدادالاحکام میں ہے: جو قراءت؛ دس قراءت میں سے پڑھے جائز ہوگا خواہ خارجِ صلاۃ یا داخل صلاۃ۔ (۲۳۱/۱)۔

محمودالفتاویٰ میں ہے: سوال: نماز میں قراءتِ سبعہ کا پڑھنا اس شخص کے لیے جو اس کا جاننے والا ہو کیسا ہے؟ الجواب: اس صورت میں بھی نماز صحیح اور درست ہے۔ (محمودالفتاویٰ: ۴۲۴/۱)۔

زبدۃ الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

اگر دوسری رکعت میں روایتِ ثانیہ کے مطابق جو قراءت پڑھی ہے وہ بھی قراءتِ سبعہ، قراءتِ عشرہ متواترہ میں سے ہے تو اس سے نماز میں کوئی نقصان نہیں ہوا، نماز جائز اور صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔ (۴۴۵/۱)۔

ہاں اگر جاہل عوام کی تکذیب کا خوف ہو یا تشویش ہو یا فتنہ برپا ہونے کا اندیشہ ہو تو بلا تعلیم و بیان نہ پڑھنا اولیٰ ہے۔ جیسا کہ جمعہ اور عیدین میں فتنہ کے اندیشہ سے سجدۂ سہو نہیں کیا جاتا۔ **قال: و لا يأتي الإمام بسجود السهو في الجمعة والعيدين، دفعاً للفتنة، أي افتتان الناس وكثرة الهرج** . (نور الإيضاح، مع مراقي وحاشية الطحطاوي، ص ۴۶۵، ط: قديمي).

قال في الفتاوى الهندية: في الحجة: قراءة القرآن بالقراءات السبعة والروايات كلها جائزة و لكني أرى الصواب أن لايقرأ القراءة العجيبة بالإمالات والروايات الغريبة كذا في التتارخانية . (الفتاوى الهندية: ۷۹/۱، بلوچستان).

امدادالاحکام میں مرقوم ہے:

رہا یہ کہ جس امر سے اتنے بڑے صحابی کو وسوسہ پیدا ہوا اس سے عام مسلمانوں کو بھی وسوسہ پیدا ہو سکتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ صحابی کو اس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ قرآن کو مختلف لغات میں پڑھنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہے، وہ یہ سمجھے تھے کہ قرآن کا ایک ہی لغت میں پڑھنا واجب ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ اس کو سات لغتوں میں پڑھنے کی بھی اجازت ہے، پھر کسی کو وسوسہ پیدا نہیں ہوا، پس اب بھی کسی مسلمان کو اس حقیقت کے معلوم کرنے کے بعد وسوسہ نہ ہونا چاہیے، مگر صحابہ کرام نے بعد والوں کے حال پر رحم کھا کر ان

سات لغات کو اسی لیے باقی نہ رکھا کہ اس سے بعد والوں کو فتنے پھیلیں گے، بلکہ قرآن کو صرف ایک لغت میں لکھا گیا جو قرآن کی اصل زبان تھی۔ (امداد الاحکام: ۱/ ۲۶۸، کراچی)۔ واللہ ﷾ اعلم۔

بوقتِ جماعتِ فجر سنتِ فجر پڑھنے کا حکم:

سوال: فجر کی جماعت شروع ہوجائے تو سنتیں کب تک پڑھنا صحیح ہے، یعنی تشہد ملنے تک یا دوسری رکعت ملنے تک، کونسا قول اصح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اس بارے میں فقہاء کے دو اقوال ملتے ہیں؛ ۱۔ فرض کی رکعت ملنے کی امید ہو تو پڑھنا چاہیے ورنہ نہیں۔ ۲۔ تشہد ملنے کی توقع ہو تب بھی پڑھ لینا بہتر ہے، یہ قول اصح ہے کیونکہ نمازِ فجر کے فوراً بعد سنتوں کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو؛ امام محمدؒ الجامع الصغیر میں فرماتے ہیں:

رجل انتهى إلى الإمام في الفجر ولم يصل ركعتي الفجر، فخشى أن يفوته ركعة ويدرك الأخرى، فإنه يصلي ركعتي الفجر عند باب المسجد، فإن خشي فوتهما دخل مع الإمام، ولم يصل ركعتي الفجر، ولم يقضهما، و هو قول أبي يوسفؒ، وقال محمدؒ: أحب إلي أن يقضيهما إذا ارتفعت الشمس. (الجامع الصغير، ص ۹۰، ط: عالم الكتب).

وفي الدر المختار: وإذا خاف فوت ركعتي الفجر لاشتغاله بسنتها تركها لكون الجماعة أكمل وإلا بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب، وقيل: التشهد واعتمده المصنف والشرنبلالي تبعاً للبحر لكن ضعفه في النهر لا يتركها بل يصليها عند باب المسجد إن وجد مكاناً وإلا تركها لأن ترك المكروه مقدم على فعل السنة.

وقال في رد المحتار: قوله تبعاً للبحر: فيه أن صاحب البحر ذكر أن كلام الكنز يشمل التشهد ثم ذكر أن ظاهر الجامع الصغير أنه لو رجا إدراك التشهد فقط يترك السنة، ونقل عن الخلاصة أنه ظاهر المذهب وأنه رجحه في البدائع، ونقل عن الكافي والمحيط أنه يأتي بها عندهما خلافاً لمحمد فليس فيه سوى حكاية القولين بل ذكر قبل

ذلک ما یدل علی اختیاره لظاهر الرواية حيث قال: وإن لم يمكن بأن خشي فوت الركعتين أحرز أحقهما وهو الجماعة قوله لكن ضعفه فى النهر، حيث قال: إنه تخريج على رأي ضعيف. قلت: لكن قواه في فتح القدير، إلى قوله: لأن المدار هنا على إدراک فضل الجماعة وقد اتفقوا على إدراكه بإدراک التشهد فيأتي بالسنة اتفاقاً كما أوضحه فى الشرنبلالية أيضاً وأقره في شرح المنية وشرح نظم الكنز وحاشية الدرر لنوح أفندي و شرحها للشيخ إسماعيل ونحوه فى القهستاني، و جزم به الشارح في مواقيت الصلاة . (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵٦، سعيد).

وفى العناية : وحكى عن الفقيه أبي جعفر أنه على قول أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ يصلي ركعتي الفجر، لأن إدراک التشهد عندهما كإدراک الركعة أصله مسئلة الجمعة . (شرح العناية على الهداية بهامش فتح القدير: ۱/ ۴۷۵،دارالفكر). (وكذا فى فتح باب العناية : ۱/ ۳۵۹، بيروت).

باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ میں مرقوم ہے:

سنتِ فجر بعد شروع ہونے جماعت کے، اگر کوئی جگہ علیحدہ مسجد کے ہو پڑھ لے، کیونکہ ان کی تاکید بہت وارد ہے، بشرطیکہ جماعت میں شرکت کی توقع ہو، اور اگر سنتِ فجر نہ پڑھ سکا تو بعد طلوع آفتاب کے پڑھے، فرض کے بعد متصل نہ پڑھے، بلکہ بعد طلوعِ آفتاب کے پڑھے، اور اپنے وقت سے ٹل کر سنتِ مؤکدہ مؤکدہ نہیں رہتی مگر بعد طلوع آفتاب کے پڑھ لینا بہتر ہے۔ ہکذا فی کتب الفقہ، فقط۔ (باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ، ص۱۸۱)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے: امام کے ساتھ تشہد ملنے کی امید ہو تو سنت پڑھ لے، جہاں تک ہو سکے مقامِ جماعت سے علیحدہ ہو کر پڑھے۔ (احسن الفتاویٰ: ۳/ ۴٦۰)۔ مزید دیکھو: (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۳/ ٦۰۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایک نماز چھوڑ کر دوسری نماز میں منتقل ہونے کے لیے تحریمہ لازم ہونے کا حکم:

سوال: ایک شخص ظہر کے وقت نفل پڑھ رہا تھا کہ، پہلی رکعت کے قیام میں نیت تبدیل کر کے ظہر کی سنتِ مؤکدہ قبلیہ کی نیت کر لی تو کیا سنتِ مؤکدہ ادا ہوئی یا نفل؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء کی عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ ایک نماز کو درمیان سے چھوڑ کر دوسری نماز کی طرف

منتقل ہونے کے لیے نئی تحریمہ لازم ہے، اس کے بغیر پہلی نماز منقطع نہیں ہوگی، جبکہ پہلی نماز دوسری کے مغایر ہو، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں اس کی پہلی نفل نماز بدستور باقی رہے گی، الا یہ کہ نفل ختم کر کے سنتِ مؤکدہ کی تحریمہ از سر نو شروع کرے تو سنت ادا ہوگی۔ اور اگر فرض نماز مکمل کر کے سلام پھیرے اور نئی تحریمہ کے بغیر نفل شروع کرے تو یہ صورت مکروہ ہونے کے باوجود صحیح ہے، جس کی تشریح آرہی ہے۔

ملاحظہ ہو صاحبِ ہدایہؒ فرماتے ہیں: **ومن صلى ركعة من الظهر ثم افتتح العصر أو التطوع فقد نقض الظهر لأنه صح شروعه في غيره فيخرج عنه** . (الهداية : ۱/۱۳۷، باب مايفسد الصلاة).

قال في البناية : وفي جامع التمرتاشي، وشمس الأئمة : وعلى هذا من كان في المكتوبة وكبر ينوي النافلة أوعلى العكس أوفي الظهرفكبر ينوي الجمعة أوعلى العكس أوكان منفرداً فكبر ينوي الاقتداء أومقتدياً فكبر للتفرد أوللإمامة يخرج عن صلاته . (البناية في شرح الهداية: ۲/۱۵۰، رشيدية). وكذافي فتح القدير : ۱/۲۰۴، ط: دارالفكر).

وفي حلبة المجلي: [م] وهذا كله إذا نوى بقلبه وكبر بلسانه ، [ش] سواء ذكر النية بلسانه أيضاً، أو لا، وأما مجرد النية بالقلب من غير تكبير باللسان، فغير مخرج من الأولى. (حلبة المجلي شرح منية المصلي، ص۶۷۳، ط: بيروت).

وفي الفتاوى الهندية : ولو افتتح الظهر ثم نوى التطوع أوالعصر أوالفائتة أوالجنازة وكبر يخرج عن الأول ويشرع في الثاني والنية بدون التكبير ليس مخرج ، كذا في التتارخانية ناقلاً عن العتابية . (الفتاوى الهندية: ۱/۶۲).

وفي الأشباه: وأما إذا نوى عبادة ثم نوى في أثنائها الانتقال عنها إلى غيرها ، فإن كبر ناوياً للانتقال عنها إلى غيرها صار خارجاً عن الأولى، وإن نوى ولم يكبر لا يكون خارجاً ... (الاشباه والنظائر: ۱/۱۴۸، ط: ادارة القرآن).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے: **رجل افتتح المكتوبة فظن أنها تطوع فصلى على نية التطوع حتى فرغ فالصلاة هي المكتوبة ، و لو كان الأمر بالعكس فالجواب بالعكس ، هكذا في فتاوى قاضيخان ... والنية بدون التكبير ليس بمخرج كذا في التتارخانية** . (الفتاوى الهندية: ۱/۶۲).

(وكذا في الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: ۱/۲۰۱، وفتاوى الشامي: ۱/۴۱۸، والبحرالرائق: ۱/۲۸۱).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے: کسی نے فرض نماز شروع کی پھر اس کو یہ گمان ہوا کہ نفل پڑھتا ہوں اور نفل کی نیت پر نماز پوری کر لی تو وہ نماز فرض ادا ہوئی اور اگر اس کے برعکس ہوا تو جواب بھی برعکس ہوگا، کیونکہ شروع کرتے وقت کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے بعد کا نہیں جب تک کہ پہلی نیت توڑ کر اور اللہ اکبر کہہ کر دوسری نیت نہ باندھے۔ (عمدۃ الفقہ :۲/۷۷)۔ مزید ملاحظہ ہو: (کتاب الفتاویٰ:۲/۱۶۵)۔

بعض کتبِ فقہ سے پتا چلتا ہے کہ بلا تکبیر فقط نیت کرنے سے دوسری نماز میں منتقل ہو جائے گا۔ ملاحظہ ہو:
علامہ ابن نجیم مصریؒ نے الاشباہ میں بحوالہ خزانۃ الاکمل ذکر کیا ہے، **قال: وفي خزانة الأكمل: لو افتتح الصلاة بنية الفرض ثم غير نيته في الصلاة، و جعلها تطوعاً صارت تطوعاً.** (الأشباه والنظائر : ۱/۱۷۱). بعض شراح نے اس کی یہ توجیہ بیان فرمائی ہے کہ ممکن ہے کہ اختلافِ روایت ہو: ایک روایت یہ ہے کہ محض نیت سے انتقال نہیں ہوگا، تا آں کہ تکبیر نہ کہہ لی جائے اور دوسری روایت یہ ہے کہ محض نیت سے بھی انتقال ہو جاتا ہے، راجح پہلی روایت ہے اور یہ دوسری روایت مرجوح ہے۔ (عقود الجواہر شرح الاشباہ والنظائر: ۱/۴۶۳)۔

معلوم ہوا کہ راجح یہ ہے کہ نئی تحریمہ ضروری ہے، جبکہ علامہ شامیؒ نے شرح الاشباہ میں نئی تحریمہ پر محمول کیا ہے یعنی اختلافِ روایت پر محمول نہیں کیا: **قال: ثم غير نيته، يعني مع التحريمة المبتدئة فلا يخالف ماقبله.** (نزهة النواظر، ص ۵۳، دارالفكر). نیز علامہ ابن نجیم کی ماقبل کی عبارت سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ بلا نئی تحریمہ دوسری نماز شروع کرنا صحیح نہیں ہوگا، نیز دوسری جگہ بھی مذکور ہے: چنانچہ فرماتے ہیں:

ولو نوى الانتقال عنها إلى غيرها، فإن كانت الثانية غير الأولى وشرع بالتكبير صار منتقلاً وإلا فلا. (الأشباه والنظائر ۱/۲۷، وكذا في : ۱/۱۷۲). واللہ ﷻ اعلم۔

تنبیہ: جلدِ دوم ص ۱۳۱ پر ایک مسئلہ کے تحت ہم نے یہ لکھا تھا کہ فرض نماز شروع کرنے کے بعد سنت کی نیت کر لی تو بلا نئی تحریمہ سنت شروع کرنا کراہت کے ساتھ جائز ہے، جیسا کہ بحوالہ ''الاشباہ'' خزانۃ الاکمل کی عبارت مذکور ہوئی لیکن یہ مرجوح ہے یا مؤول ہے۔ راجح اور صحیح قول یہ ہے کہ نئی تحریمہ کے بغیر دوسری نماز میں منتقل نہ ہوگا، پہلی نماز بدستور باقی رہے گی، جیسا کہ مذکورہ بالا کتبِ فقہ میں مصرح ہے، یا اس کی تاویل یہ ہے کہ شروع کر کے نماز مکمل کرے پھر نفل شروع کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بناء النفل علی الفرض کے جواز کا حکم:

مذکورہ بالا مسئلہ سے ملتا جلتا ایک مسئلہ ''بناء النفل علی الفرض'' کا ہے، وہ یہ ہے کہ فرض مکمل کر کے سلام

پھیرے بغیر اُٹھ کر نفل شروع کردے، شیخینؒ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، لیکن مکروہ ہے۔ ملاحظہ ہو صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں: **أن من يحرم للفرض كان له أن يؤدى بها التطوع .** (الهداية : ۱/۹۹، ط: شركة علمية).

علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں: **وجاز بناء النفل على تحريمة الفرض مع الكراهة عندهما(الشيخين) لأن النفل مطلقاً صلاة ، و الفرض صلاة مخصوصة ففي الفرض معنى النفل ، و زيادة لأن الخاص يتضمن العام ، فكان العقد على الفرض متضمناً للعقد على النفل .** (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، ص ۲۱۶، قديمى).

علامہ شرنبلالیؒ فرماتے ہیں: **و ثمرة الخلاف تظهر في جواز بناء النفل على تحريمة الفرض، فعندنا يجوز لأن شرط الفرض يصلح شرطاً للنفل ، كسائر الشروط.** (امدادالفتاح، ص ۲۳۴).

وقال في الدرالمختار: فيجوز بناء النفل على النفل وعلى الفرض وإن كره لا فرض على فرض أو نفل على الظاهر. وفي الشامي: قوله وعلى الفرض، لأن الفرض أقوى فيستتبع النفل لضعفه ، ط. (فتاوى الشامي: ۱/۴۴۲، سعيد). (وكذا في البناية : ۱/۱۸۸).

علامہ شامیؒ نے کراہت کی دو وجوہات لکھی ہیں: ۱۔ فرض کے سلام میں تاخیر، ۲۔ نفل نماز نئی تحریمہ سے شروع نہیں کی۔ **قوله وإن كره، يعني أنه مع صحته مكروه ، لأن فيه تأخير السلام وعدم كون النفل بتحريمة مبتدأة ، وهذا في العمد ، إذ لو سها بعد قعدة الفرض فزاد خامسة يضم سادسة بلا كراهة .** (فتاوى الشامي : ۱/۴۴۲، سعيد)، (وكذا في حلبة المجلى: ۲/۹).

محقق ابن ہمامؒ نے جواز کی وجہ یہ لکھی ہے کہ نفل فرض کے تابع ہو کر صحیح ہو جائیگی، قال: **وصحة النفل تبعاً .** (فتح القدير: ۱/۲۸۰، دارالفكر). واللہ ﷻ اعلم۔

سجدۂ تلاوت میں پڑھنے کی ماثور دعائیں:

سوال: سجدۂ تلاوت میں کوئی مخصوص دعا پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا پڑھنا چاہیے؟

الجواب: سجدۂ تلاوت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درجِ ذیل دعا کا پڑھنا ثابت ہے، لہٰذا ماثور دعا کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ دعا درجِ ذیل ملاحظہ کیجئے:

۱۔ عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ، يقول في سجود القرآن بالليل ، يقول في السجدة مراراً : سجد وجهي للذي خلقه وشق

سمعه وبصره بحوله وقوته . (سنن أبي داود، رقم:١٤١٦،ط:بيروت).

وأخرجه الترمذي فقال: هذا حديث حسن صحيح. (رقم:٥٨٠). وأخرجه الحاكم فى المستدرك، وزاد في آخره : فتبارك الله أحسن الخالقين ، هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه . (رقم:٨٠٢).

۲۔ عن قتادة ؛ أنه كان يقول إذا قرأ السجدة : سبحان ربنا إن كان وعد ربنا لمفعولاً سبحان الله وبحمده ، سبحان الله وبحمده ، ثلاثاً . (مصنف ابن ابی شيبة :٣/١٢٤/٤٤٠٨).

۳۔ فتاویٰ ہندیہ میں لکھا ہے کہ ’’ سبحان ربي الأعلىٰ ‘‘ تین مرتبہ پڑھے۔ قال: فإذا أراد السجود كبر و لا يرفع يديه وسجد ثم كبر و رفع رأسه ولا تشهد عليه ولا سلام كذا فى الهداية ، ويقول في سجوده :’’ سبحان ربي الأعلىٰ ‘‘ ثلاثاً . (١/١٣٥).

قال فى البدائع : ومنها أن يقول في هذه السجدة من التسبيح ما يقول في سجدة الصلاة فيقول: سبحان ربي الأعلى وذلک أدناه وبعض المتأخرين استحبوا أن يقول فيها: سبحان ربنا إن كان وعد ربنا لمفعولاً ، لقوله تعالىٰ: يخرون للأذقان سجداً . (بدائع الصنائع: ١/١٩٢، سعيد).

۴۔ ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اگر فرض نماز میں سجدۂ تلاوت کرے تو سجدہ کی تسبیح پڑھے اور اگر نفل ہو یا خارجِ صلاۃ سجدہ کرے تو ماثور دعا پڑھے۔ قال: فإن كانت السجدة فى الصلاة فيقول فيها ما يقال فيها فإن كانت فريضة قال : سبحان ربي الأعلى ، أو نفلاً قال ما شاء مما ورد كسجد وجهي . (مرقاة المفاتيح :٣/٣٨، امداديه ، ملتان). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

سجدۂ شکر کا حکم اور اس میں پڑھنے کی دعا:

سوال: سجدۂ شکر کا کیا حکم ہے؟ اور اس میں کیا پڑھنا چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مفتیٰ بہ قول کے اعتبار سے سجدۂ شکر جائز بلکہ مستحب ہے، اور اس میں وہی پڑھنا چاہیے جو نماز کے سجدے میں پڑھتے ہیں، یعنی سبحان ربی الاعلیٰ تین مرتبہ، پانچ مرتبہ یا سات مرتبہ۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أبي بكرة ﷺ أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا أتاه أمر يسره أو يسر به خر

ساجداً شكراً لله تبارک وتعالیٰ . (سنن ابن ماجه ،رقم: ۱۳۹۴).

وفي رواية الترمذي عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم أتاه أمر فسر به فخر لله ساجداً قال أبوعيسى: هذا حديث حسن غريب لا نعرفه إلا من هذا الوجه من حديث بكار بن عبد العزيز والعمل على هذا عند أكثر أهل العلم رأوا سجدة الشكر و بكار بن عبد العزيزبن أبي بكرة مقارب الحديث . (رقم:۱۵۷۸).

مصنف ابن ابی شیبہ میں چند آثار منقول ہیں:

حدثنا وكيع ، قال: حدثنا مسعر، عن أبي عون الثقفي محمد بن عبيد الله ، عن رجل لم يسمه ، أن أبا بكر رضي الله عنه لما فتح اليمامة سجد .

حدثنا وكيع قال: حدثنا مسعر، عن أبي عون الثقفي، عن يحيى بن الجزار: أن النبي صلى الله عليه وسلم مر به رجل به زمانة فسجد ، وأبوبكر رضي الله عنه وعمر رضي الله عنه .

حدثنا حفص بن غياث ، عن موسى بن عبيدة ، عن زيد بن أسلم ، عن أبيه : أن عمر رضي الله عنه أتاه فتح من قبل اليمامة فسجد .

حدثنا شريک ، عن محمد بن قيس، عن أبي موسى رضي الله عنه: أن علياً رضي الله عنه لما أتى بالمخدع سجد .

حدثنا جرير، عن منصور ، عن إبراهيم: إنه كره سجدة الشكر ، قال منصور : وبلغني أن أبابكر رضي الله عنه وعمر رضي الله عنه سجدا سجدة الشكر .

حدثنا هشيم ، قال: أخبرنا الكلبي، عن أبي صالح ، عن ابن عباس رضي الله عنه قال: لما نزل نكاح زينب انطلق زيد بن حارثة حتى استأذن على زينب ، قال؛ فقالت زينب : ما لي ولزيد ، قال: فأرسل إليها فقال: إني رسول رسول الله صلى الله عليه وسلم إليک، قال: فأذنت له ، فبشرها أن الله قد زوجها من نبيه صلى الله عليه وسلم ، قال: فخرت ساجدة لله شكراً .

وعن عبد الرحمن بن عوف ، قال: انتهيت إلى النبي صلى الله عليه وسلم وهو ساجد فلما انصرف قلت: أطلت السجود ، قال: إني سجدت شكراً لربي فيما أبلاني في أمتي. (مصنف ابن ابی شیبة: ۲/ ۴۸۲، ۴۸۴).

فقہاء نے بھی صاحبینؒ کے قول کے مطابق مستحب لکھا ہے؛ ملاحظہ فرمائیں درمختار میں ہے:

وسجدة الشكر مستحبة ، به يفتى . وفى الشامية : قوله و سجدة الشكر ، و هي لمن تجددت عنده نعمة ظاهرة أو رزقه الله مالاً أو ولداً أو اندفعت عنه نقمة و نحو ذلك يستحب له أن يسجد لله تعالىٰ شكراً مستقبل القبلة يحمد الله تعالىٰ فيها ويسبحه ثم يكبر فيرفع رأسه كما في سجدة التلاوة ، سراج ، قوله به يفتى ، هو قولهما ... وفي آخر شرح المنية و قد وردت روايات كثيرة عنه عليه الصلاة والسلام فلا يمنع عنه لما فيه من الخضوع وعليه الفتوىٰ . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۲/۱۱۹،سعيد).

(وكذا فى حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح ، ص،۵۰۰،ط قديمى،والمحيط البرهانى : ۵/۱۵٦، دار احياء التراث، والفتاوى الهندية: ۱/۱۳٦، والجوهرة النيرة: ۱/۲۱۴،قديمى، والفتاوى التتارخانية : ۱/۷۹۱، وبذل المجهود: ۹/۵۰۹). مزید ملاحظہ ہو: (کتاب الفتاویٰ:۲/۴۵۹،وقاموس الفقہ :۴/۱۳۷)۔

قاموس الفقہ میں سجدۂ تلاوت کے بارے میں مذکور ہے: عام سجدوں کی طرح اس میں بھی ''**سبحان ربی الأعلیٰ**'' پڑھنا مسنون ہے۔(قاموس الفقہ :۴/۱۳۱،ط:زمزم)۔واللہ ﷻ اعلم۔

عذر کی وجہ سے مسجد میں جمعہ کی جماعتِ ثانیہ کا حکم:

سوال: رشیا میں ایک جگہ بارش کی کثرت کی وجہ سے بہت سارے لوگوں کی نمازِ جمعہ فوت ہوگئی، کیونکہ مسجد کے باہر صحن وغیرہ کا انتظام نہیں تھا، عام طور پر لوگ راستوں اور سڑکوں پر پڑھتے تھے،لیکن زیادہ بارش کی وجہ سے لوگ کھڑے رہے، نماز نہیں پڑھ سکے، تو کیا کرنا چاہیے؟ ظہر کی نماز پڑھنی چاہیے یا مسجد میں دوسرا جمعہ قائم کر سکتے ہیں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: مذہبِ احناف میں عام حالات میں فقہاء نے مسجد میں جماعتِ ثانیہ کو مکروہ لکھا ہے لیکن بوقتِ عذر اجازت ہے، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں اس بستی کی دوسری مساجد میں بھی جمعہ ہو چکا ہو تو عذر کی وجہ سے اسی مسجد میں دوبارہ جمعہ قائم کرنا درست ہے، شہر میں مقیم حضرات کے لیے ظہر پڑھنا درست نہیں۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں مرقوم ہے:

قوله ولا على من حال بينه وبينها مطر وطين، أشار بالحيلولة إلى أن المراد المطر الكثير كما قيده به فى صلاة الجمعة وكذا الطين ، وفى الحلية وعن أبي يوسفؒ سألت

أبـاحـنيـفةؒ عـن الـجـمـاعة في طين وردغة فقال: لا أحب تركها ، وقال محمد فى المؤطا: الـحـديـث رخـصـة يـعـنـي قـولـه: إذ ابتلت النعال فالصلاة فى الرحال والنعال هنا الأراضى الـصـلاب ، وفـي شـرح الـزاهـدي عن شرح التمرتاشي واختلف في كون الأمطار والثلوج والأرحـال والبـرد الشـديد عذراً وعن أبي حنيفةؒ إن اشتد التأذى يعذر، قال الحسن: أفادت هـذه الـروايـة أن الـجمعة والجماعة في ذلک سواء ليس على ما ظنه البعض أن ذلک عذر فى الجماعة لأنها سنة لا فى الجمعة لأنها من آكد الفرائض . (فتاوى الشامي: ۱/۵۵۵،سعيد).

خیر الفتاویٰ میں مذکور ہے:

سوال: پندرہ بیس آدمی جمعہ کے روز اس وقت پہنچے جبکہ جمعہ ہو چکا تھا کیا یہ لوگ اس مسجد میں جمعہ مع خطبہ جماعت سے پڑھیں یا باجماعت ظہر ادا کریں؟

جواب: چونکہ تعددِ جمعہ بمذہب صحیح جائز ہے اور بروزِ جمعہ جس شخص پر جمعہ فرض ہے اس کو ظہر پڑھنا درست نہیں اس لیے ان لوگوں کو چاہیے کہ جمعہ یا جماعت مع خطبہ ادا کریں، اگر اسی مسجد میں ہو تو بھی کوئی حرج نہیں، اور اولیٰ یہ ہے کہ دوسری مسجد میں ہو۔ فتاویٰ عبدالحی ،ص ۳۱۰۔ (خیر الفتاویٰ:۳/۹۵،ط:امدادیہ، ملتان)۔

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

ہماری مسجد میں جمعہ کے لیے بہت سے لوگ آتے ہیں، جب مسجد بھر جاتی ہے تو کچھ لوگ جو تقریباً ۷۰ سے زائد ہوتے ہیں، مسجد کے اوپر چھت پر کھلے آسمان کے نیچے نمازِ جمعہ ادا کرتے ہیں، گذشتہ جمعہ بارش ہوتی رہی، کیا ایسی صورت میں اوپر کے لوگوں کو بارش میں بھیگتے ہوئے نماز ادا کرنا چاہیے یا دوسری جماعت بنا کر پڑھنا چاہیے؟ ایسی صورت میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کا واضح طریقہ بتائیں؟

جواب: جو صورت آپ نے ذکر کی ہے، اس میں اولاً تو کوشش کرنی چاہیے کہ مسجد کی چھت کی بجائے اگر دوسری مسجد ہو تو وہاں یا مسجد کے علاوہ کوئی اور چھت والی جگہ ہو تو وہاں جمعہ کی دوسری جماعت کر لی جائے، لیکن اگر یہ دشوار ہو تو عذر کی وجہ سے دوبارہ جماعت کی گنجائش ہے، کیونکہ خاص حالات میں فقہاء نے تکرار جماعت کی اجازت دی ہے۔ (کتاب الفتاویٰ:۳/۸۱، ط: زمزم)۔

کتاب المسائل میں مذکور ہے:

نمازی زیادہ ہوں اور جماعت کے لیے اگر کوئی اور جگہ دستیاب نہ ہو، تو بارش کی شدت کی وجہ سے ایک ہی

مسجد میں تکرارِ جماعت کی گنجائش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ (کتاب المسائل: ۱/۴۲۲، ط: نعیمیہ دیوبند)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دیہاتی بوقتِ زوال شہر میں موجود ہو تو جمعہ واجب ہونے کا حکم:

سوال: ایک شخص فارم میں قیام پذیر ہے جو شہر سے ۳۰ کیلومیٹر دور ہے، لیکن بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لینے کے لیے شہر آتا جاتا ہے، کبھی جمعہ کے دن بوقتِ زوال شہر میں ہوتا ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا شہر میں جمعہ پڑھنا لازم ہوگا یا بلا جمعہ پڑھے فارم میں آسکتا ہے؟

الجواب: فقہاءِ کرام کی عبارات سے پتا چلتا ہے کہ قروی (گاؤں کا رہنے والا) پر شہر میں جاکر جمعہ پڑھنا لازم نہیں ہے، البتہ اگر شہر میں جاکر جمعہ ادا کرے تو بہت ثواب کا کام ہے، پھر اگر جمعہ کے دن شہر میں داخل ہوا لیکن زوال سے پہلے واپس چلا آیا تو جمعہ واجب نہیں، ہاں زوال تک شہر ہی میں رہا تو اب جمعہ پڑھ کر نکلنا چاہیے، اس پر جمعہ کی ادائیگی لازم ہوگئی، البتہ بعض فقہاء مثلاً قاضی خانؒ اور فقیہ ابواللیثؒ کے نزدیک اب بھی جمعہ واجب نہیں، دونوں اقوال میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل علت مشقت ہے، زمانہ ماضی میں لوگ پیدل سفر کرتے تھے اور بمشکل رات کو گھر پہنچ پاتے تھے، لیکن فی زماننا سواریوں کی کثرت کی وجہ سے یہ مشقت نہیں رہی لہٰذا بہت سارے فقہائے متاخرین نے پہلے قول پر فتویٰ دیا ہے اور زوال کے بعد شہر میں موجود ہونے پر جمعہ پڑھنا لازم قرار دیا ہے۔ نیز یہ قول مبنی بر احتیاط بھی ہے۔

لیکن اگر کوئی مجبوری ہو مثلاً ہوائی جہاز نکل جانے کا اندیشہ ہو تو پھر وقت داخل ہونے کے بعد بھی شہر سے نکلنا جائز ہے اگر جمعہ نہ ملے تو ظہر ادا کرلے۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

قال في البدائع: وقال بعضهم: إن أمكنه أن يحضر الجمعة ويبيت بأهله من غير تكلف تجب عليه الجمعة وإلا فلا، وهذا حسن، ويتصل بهذا إقامة الجمعة في إيام الموسم بمنى. (بدائع الصنائع: ۱/ ۲۶۰، سعید).

قال في البحر الرائق: وفي الخلاصة: القروي إذا دخل المصر يوم الجمعة إن نوى أن يمكث فيه يوم الجمعة لزمته الجمعة وإن نوى الخروج من ذلك المصر من يومه قبل دخول وقت الصلاة لا تلزمه و بعد دخول وقت الجمعة تلزمه، قال الفقيه: إن نوى الخروج من يومه ذلك وإن كان بعد دخول وقت الجمعة لا تلزمه، المصري إذا أراد أن يسافر يوم الجمعة لا بأس به إذا خرج من العمران قبل خروج وقت الظهر لأن الجمعة إنما تجب في

آخر الوقت وهو مسافر في آخر الوقت . (البحر الرائق: ۱۴۰/۲،ط:الماجدية).

وقال في شرح المنية : وفي شرح الزاهدي: ثم لا تجب الجمعة إلا على سكان المصر والأرباض المتصلة به ثم ذكر فيه أنه الأصح ، وفى البدائع : قال بعضهم: إن أمكنه أن يحضر الجمعة ويبيت بأهله من غير تكلف يجب عليه الجمعة وإلا فلا ، وهذا أحسن ، انتهى، وفى الذخيرة عن أبي يوسف بلفظ: وعنه أيضاً: إذا كان بحيث لو عاد وشهد الجمعة أمكنه الرجوع إلى منزله قبل أن يأويه الليل لزمه أن يشهد الجمعة ، وكثير من المشايخ أخذوا بهذه الرواية . (حلبة المجلى : ۵۳۶/۴،ط:دارالكتب العلمية).

فتاوی الشامی میں مذکور ہے:

وفي شرح المنية: ونصه: وإن دخل القروی المصر يوم الجمعة فإن نوى المكث إلى وقتها لزمته وإن نوى الخروج قبل دخوله لا تلزمه وإن نواه بعد دخول وقتها تلزمه. وقال الفقيه أبو الليث لا تلزمه وهو مختار قاضيخان . (فتاوی الشامی: ۱۶۳/۲،سعيد).

وفي فتح القدير: ولو دخل القروي المصر يوم الجمعة ونوى أن يمكثه لزمته وإن نوى الخروج منه قبل وقتها لا تلزمه، قال الفقيه : إن نوى أن يخرج من يومه ولو بعده لا تلزمه . (فتح القدير: ۵۲/۲،دارالفكر).

وفي حاشية الطحطاوي: وإن دخل الوقت قبل خروجه من المصر لزمته الجمعة مطلقاً كذا في الخلاصة . (حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح ،ص ۵۲۰،قديمی كتب خانه).

وللاستزادة راجع : (الفتاوى الهندية: ۱۴۵/۱ ،والمحيط البرهانی : ۱۸۸/۲ ،ط:داراحياء التراث العربی،وحاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح ،ص ۳۳۷،ط؛مصر). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ويقول الذين كفروا لولا أنزل عليه آية من ربه کی جگہ يقول الذين آمنوا پڑھنے سے نماز کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے مغرب کی نماز میں آیتِ کریمہ ﴿ ويقول الذين كفروا لولا أنزل عليه آية من ربه﴾[الرعد:۲۷]، کی جگہ ويقول الذين آمنوا ، پڑھا،تو کیا نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟

بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ نماز فاسد ہوگئی، اس لیے کہ آیتِ کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عناداً واستہزاءً معجزہ کا سوال کرتے ہیں، اور یہ معنی مومنین کی طرف منسوب ہوئے، لہٰذا فاحش معنی کی وجہ سے نماز فاسد ہوجائے گی، اور فاحش غلطی کا مطلب یہ ہے کہ اس کا معنی قرآنِ کریم کے مقصد ومطلب کے خلاف ہوجائے۔ آیتِ کریمہ کا صحیح مطلب مفسرین کے کلام کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں:

قال ابن کثیرؒ: ویقول الذین کفروا لولا أنزل علیه آیة من ربه ، یقول تعالیٰ إخباراً عن المشرکین أنهم یقولون کفراً وعناداً: لولا یأتینا بآیة من ربه کما أرسل الأولون ، کما تعتنوا علیه أن یجعل لهم الصفا ذهباً، وأن یزیل عنهم الجبال، ویجعل مکانها مروجاً وأنهاراً .

(تفسیر ابن کثیر : ۴/۴۳۴،دار الطیبة).

(وکذا فی اللباب فی علوم الکتاب : ۱۱/۲۹۹،بیروت،وتفسیر ابی السعود : ۵/۱۹،ط:بیروت).

فتاویٰ قاضی خان میں مرقوم ہے:

وأن تغیر المعنی بأن قرأ إن الأبرار لفي جحیم وإن الفجار لفی نعیم أو قرأ إن الذین آمنوا وعملوا الصالحات أولئک هم شر البریة أو قرأ وجوه یومئذٍ علیها غبرة أولئک هم المومنون حقاً، تفسد صلاته لأنه أخبر بخلاف ما أخبر اللّٰه تعالیٰ به . (فتاویٰ قاضیخان بهامش الهندیة: ۱/۱۵۳).

حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں مذکور ہے: **الأصل فیها عند الإمام ومحمدؒ تغیر المعنی تغیراً فاحشاً وعدمه للفساد وعدمه مطلقاً سواء کان اللفظ موجوداً فی القرآن أو لم یکن .** (حاشیة الطحطاوی ،ص ۲۲۹،ط:مصر).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے: امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ اگر قراءت میں ایسی غلطی ہوئی جس سے معنی میں تغیر فاحش ہوجائے تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ (عمدۃ الفقہ :۲/۱۲۳،زوار اکیڈمی)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ:۱۱/۲۰۷،ط:محمودیہ،وفتاویٰ رحیمیہ:۳/۱۱۳،الاحسان،دیوبند)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

جمعہ اور عیدین میں تکثیر عبادت کا حکم:

سوال: جمعہ اور عیدین میں زیادہ عبادت کرنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل؟

الجواب: شریعتِ مقدسہ میں جمعہ اور عیدین کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور افضل الایام سمجھے جاتے ہیں اور متعدد احادیث میں ان کی فضیلت وارد ہوئی ہے، پھر ان ایام میں عبادت کی کثرت دو اعتبار سے ہوگی، ایک یہ ہے کہ وہ اعمال جن کی کثرت نصوص سے ثابت اور مطلوب ہے، ان کے بارے میں تو کوئی کلام نہیں جیسے جمعہ کے دن کثرت سے درود شریف کی فضیلت اور تاکید۔

۲۔ ان اعمال اور عبادات میں کثرت جن کے بارے میں نصوص ساکت ہیں۔

یہ کثرت تین وجوہات کی بنا پر ہوگی۔

۱۔ساعتِ جمعہ کی تلاش میں کثرتِ عبادت کی جائے۔

۲۔ اس دن میں زیادتی ثواب کی نیت سے عبادت کی جائے۔

۳۔حسن اتفاق سے عبادت کی کثرت، بایں طور کہ دوسرے ایام کی بہ نسبت ان میں زیادہ وقت ملتا ہے۔

ان صورتوں میں پہلی اور تیسری صورت بظاہر درست ہے، البتہ دوسری کا ثبوت درکار ہے، چنانچہ حسبِ ذیل چند روایات اس کے ثبوت کے لیے ملاحظہ فرمائیں؛

۱۔ عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: تضاعف الحسنات يوم الجمعة . (رواه الطبراني في الاوسط ،رقم: ۷۸۹۵،القاهرة). **قال الهيثمي** (۲/۱۶۴): **فيه : حامد بن آدم و هو كذاب.**

وفي الكبير (۱۱۴۳) **لم يرو هذا الحديث عن محمد بن عمرو إلا الفضل بن موسى .**
و للمزيد راجع: لسان الميزان (رقم:۲۰۸۷).

۲۔ ما من شيء أحب إلى الله تعالىٰ من شاب تائب وما من شيء أبغض إلى الله تعالىٰ من شيخ مقيم على معاصيه وما في الحسنات حسنة أحب إلى الله تعالىٰ من حسنة تعمل في ليلة جمعة أو يوم جمعة وما من الذنوب ذنب أبغض إلى الله تعالىٰ من ذنب يعمل في ليلة الجمعة أو يوم الجمعة . (أبو المظفر السمعاني في أماليه) **عن سلمان.** (الجامع الصغير ،رقم:۸۰۵۰).
حديث ضعيف . (الجامع الصغير: ۲/۵۱۶/۸۰۵۰).

۳۔ حدثنا ابن فضيل، عن حصين ، عن هلال بن يساف ، عن كعب ؛ أن يوم الجمعة ليفزع له الخلائق والجن والإنس، وأنه لتضاعف الحسنة والسيئة ، وأنه ليوم القيامة .

(مصنف ابن ابی شیبة: ۲/ ۱۵۰/ ۵۵۵۷).

۴- عن أنس ﷺ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إن اللّٰہ لیس بتارک أحداً من المسلمین یوم الجمعة إلا غفر له. (رواہ الطبرانی فی الاوسط: ۵/ ۱۰۹/ ۴۸۱۷).

قال المقدسی فی ذخیرة الحفاظ: رواہ زیاد بن میمون ابوعمار: عن انس وزیاد متروک الحدیث. (۱/ ۵۹۱/ ۹۷۴).

قال الإمام السیوطي في جامع الأحادیث (۱/ ۸۷۳۲/ ۲۵۱۸): قال المنذری (۱/ ۲۸۲): إسنادہ حسن، وقال الهیثمي (۲/ ۱۶۴): رجاله رجال الصحیح خلا شیخ الطبراني، وأخرجه أیضاً: ابن الجوزی فی العلل المتناهیة (۱/ ۴۶۲، رقم: ۷۹۲)، وقال: حدیث لا یصح کان زیاد کذاباً، وقال یحیی: لا یساوی قلیلاً ولا کثیراً.

ملا علی قاریؒ نے بھی شرحِ مشکوٰۃ میں زیادہ ثواب کو بیان کیا ہے؛ ملاحظہ ہو:

قال القاری: لعل هذا مخصوص بیوم الجمعة: إذ ورد أن الأعمال في یوم الجمعة بسبعین ضعفاً. (مرقاۃ المفاتیح: ۴/ ۲۲، باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم).

جمعہ کے مخصوص اعمال جو احادیث سے ثابت ہیں، ملاحظہ کیجیے:

عن أبي سعید أنه سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، یقول: من وافق صیامه یوم الجمعة وعاد مریضاً وشهد جنازة وتصدق وأعتق وجبت له الجنة. قال حسین سلیم أسد: إسنادہ ضعیف. (مسندابی یعلی: ۲/ ۳۱۲/ ۱۰۴۳، ط: دمشق).

وعن أبي سعید الخدري: حدثه أنه سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: خمس من عملهن في یوم کتبه اللّٰہ من أهل الجنة: من عاد مریضاً وشهد جنازة وصام یوماً وراح یوم الجمعة واعتق رقبة. قال الشیخ شعیب الأرنؤوط: إسنادہ قوي. (صحیح ابن حبان: ۷/ ۶/ ۲۷۷۱).

عن أبي عبیدة بن الجراح ﷺ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ما من الصلوات صلاة أفضل من صلاة الفجر یوم الجمعة في جماعة وما أحسب من شهدها منکم إلا مغفوراً له. رواہ البزار والطبراني فی الکبیر والأوسط کلهم من روایة عبید اللّٰہ بن زحر عن

علی بن زید وهما ضعیفان. (مجمع الزوائد: ۲/۳۸۰/۳۰۲۰،باب فی صلاة الصبح یوم الجمعة فی جماعة).

الاستذکار میں علامہ ابن عبدالبر مالکیؒ نے حضرت کعب سے درجِ ذیل اثر نقل کیا ہے؛

روى الأعمش عن مجاهد عن عبد الله بن ضمرة عن كعب الأحبار قال: الصدقة يوم الجمعة تضاعف . (الاستذکار: ۲/۴۲،دار الكتب العلمية بيروت).

مذکورہ بالا روایات سے پتا چلتا ہے کہ جمعہ کے دن عبادت کرنے میں زیادہ ثواب کی امید ہے اگر چہ ان میں سے بعض ضعیف ہیں۔

اشکال: لیکن ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن یا جمعہ کی شب کو عبادت کے لیے خاص مت کرو؛ **عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لاتختصوا ليلة الجمعة بقيام من بين الليالي ولا تخصوا يوم الجمعة بصيام من بين الأيام ...الخ.** (مسلم رقم: ۱۱۴۴). اس روایت کا کیا جواب ہوگا؟

جواب: جمعہ کے دن کو عبادت کے ساتھ خاص کرنے کی ممانعت کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ لوگ اپنی طرف سے نئی چیزیں ایجاد کر کے ان پر عمل کرنا شروع کردیں گے جیسے صلاۃ الرغائب اور جمعہ کے اجتماعی صلاۃ وسلام مخصوص الفاظ کے ساتھ اور شریک نہ ہونے والے پر لعن طعن اور ملامت کرنا وغیرہ۔ البتہ حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے فی نفسہ عبادت میں زیادتی مستحب ہے۔ احادیث میں جمعہ کو سید الایام اور بہترین دن کہا گیا ہے۔

شیخ عز الدین بن عبدالسلام الشافعیؒ نے اختلافِ زمان ومکان کے سبب تضعیفِ اجر میں فصل قائم کی ہے:

فصل في تفاوت أجور الأعمال مع تساويها باختلاف الأماكن والأزمان .
(القواعد الکبری: ۱/۲۲). واللہ ﷻ اعلم۔

نمازِ جمعہ کے لیے سویرے پیدل جانے کی فضیلت:

سوال: بعض مسائل کی کتابوں میں یہ حدیث مرقوم ہے کہ نماز جمعہ کے لئے پا پیادہ جانے میں ہر قدم پر ایک سال کے روزے رکھنے کا ثواب ملتا ہے، کیا یہ حدیث کسی معتبر حدیث کی کتاب میں ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو حوالہ کے ساتھ درجہ بھی لکھیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: یہ حدیث نسائی شریف، مسند احمد، اور شعب الایمان للبیہقی میں موجود ہے اور یہ حدیث صحیح ہے، نیز مسند احمد اور بیہقی کی روایت میں روزوں کے ثواب کے ساتھ رات کی عبادت کے ثواب کا بھی ذکر ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں: سنن نسائی میں ہے:

فضل المشي إلى الجمعة: أخبرنی عمرو بن عثمان بن سعید بن کثیر قال: نا الولید عن عبد الرحمن بن یزید بن جابر أنه سمع أبا الأشعث یحدث أنه سمع أوس بن أوس صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من اغتسل يوم الجمعة وغسل وغدا وابتكر ومشى ولم يركب ودنا من الإمام وأنصت ولم يلغ كان له بكل خطوة عمل سنة . (سنن النسائی، رقم :۱۷۰۳).

مسند احمد میں ہے:

قال حدثنا علی بن إسحاق قال أخبرنا علی بن المبارک قال أخبرنا عبد الرحمن بن یزید بن جابر قال حدثنی عبد الرحمن الدمشقي قال حدثني أبوالأشعث قال حدثني أوس بن أوس الثقفي قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وذكرالجمعة فقال: من غسّل واغتسل وابتكر وخرج يمشي ولم يركب ثم دنا من الإمام فأنصت ولم يلغ كان له كأجر سنة صيامها وقيامها. قال: وزعم يحيى بن الحارث أنه حفظ عن أبی الأشعث أنه قال له بكل خطوة كأجر سنة صيامها وقيامها. قال يحيى ولم أسمعه يقول مشى ولم يركب .

قال الشيخ الشعيب الأرناؤط رحمه الله تعالى: إسناده صحيح رجاله ثقات رجال الصحيح غير أن صاحبيه لم يخرج له إلا أصحاب السنن . (مسند أحمد: ۱۶۱۷۳/۹۴/۲۶،ط: الرسالة).

شعب الایمان میں ہے:

أخبرنا محمد بن عبدالله الحافظ ثنا الحسن بن حليم المروزی ثنا أبو الموجه ثنا عبدان أنا عبدالله أخبرنا الأوزاعي ثنا حسان بن عطية حدثني أبوالأشعث الصنعاني حدثني أوس الثقفي قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من غسّل واغتسل يوم الجمعة ثم بكر وابتكر فدنا فاستمع ولم يلغ كان له بكل خطوة يخطوها عمل سنة أجر صيامها وقيامها . (شعب الایمان للبیهقی رقم ۲۷۲۸).

حدیث شریف میں مندرجہ ذیل چند قیودات ہیں جن کا لحاظ رکھنا چاہئے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص جمعہ کے دن نہایا اور دھویا (غسّل :اغتسل کی تاکید کے لئے ہے یعنی خوب اچھی طرح نہایا) اور سویرے مسجد گیا اور خوب سویرے گیا، چل کر گیا، سوار نہ ہوا اور امام سے قریب بیٹھا اور توجہ سے خطبہ سنا اور خاموش رہا تو اس کے ہر قدم کے بدلے جس کو وہ اُٹھاتا ہے ایک سال کے روزوں کا اور رات کی نفلوں کا ثواب ہے۔ (تحفۃ الالمعی:۲/۳۵۹،ط:زمزم)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

روزانہ مغرب سے پہلے دعا کرنے کا حکم:

سوال: بعض لوگوں کی عادت ہے کہ روزانہ غروبِ آفتاب سے پہلے خشوع کے ساتھ دعا کرتے ہیں جمعہ کے بارے میں تو معلوم ہے کہ بعض روایات کے مطابق ساعتِ اجابت ہے، لیکن عام دنوں میں یہ قبولیت کا وقت ہے یا نہیں؟ کیا اس وقت دعا قبول ہونے کے بارے میں قرآن، حدیث سے کوئی دلیل ہے یا نہیں؟

الجواب: بعض کتابوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ: ہمیں مغرب کی اذان کے وقت دعا کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔اور مصنفِ ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ مغرب کی اذان کے وقت دعا کو مستحب سمجھا جاتا تھا، اور یہ وہ گھڑی ہے جس میں دعا قبول ہوتی ہے، لیکن دونوں روایتوں کی سند میں ضعیف راوی ہیں۔ نیز ملا علی قاریؒ نے مرقات میں اور علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ اس وقت دعا کرنی چاہیے۔

قرآنِ کریم کی آیتِ کریمہ ﴿ **واذكر ربک في نفسک تضرعاً وخيفة ودون الجهر من القول بالغدو والأصال ولا تكن من الغافلين** ﴾ [الأعراف:۲۰۵] میں ذکر کی ایک تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ ذکر سے عام ذکر مراد ہے، جس میں دعا، تلاوت وغیرہ سب شامل ہیں، اور آصال سے مراد عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ہے۔

تفسیر نسفی میں مذکور ہے: ﴿ **واذكر ربک في نفسک** ﴾ **هو عام في الأذكار من قراءة القرآن والدعاء والتسبيح والتهليل وغير ذلك** ﴾. (المجلد الأول،الجزء الثاني،ص ۹۲،دارالفكر).

اللباب في علوم الكتاب میں مذکور ہے: **قال مجاهد وابن جريج : أمروا أن يذكروه في الصدور بالتضرع في الدعاء والاستكانة دون رعف الصوت والصياح في الدعاء .** (اللباب: ۹/۴۴۱، بيروت).

روح المعانی میں ہے: **والآصال وهو كما قال الأزهري: جمع أصل، وأصل جمع أصيل ،**

أعني ما بين العصر إلى غروب الشمس . (روح المعانی: ۹/ ۱۵۴ ،ط:القاهرة).

دوسری آیتِ کریمہ: ﴿ فاصبر على ما يقولون وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ... ﴾ کے تحت تفسیر عثمانی میں ہے: یہ وقت اللہ کی یاد کے ہیں، ان میں دعا اور عبادت بہت قبول ہوتی ہے۔ (تفسیر عثمانی، ص:۶۹۱)۔

روایت ملاحظہ کیجیے: مصنف ابن ابی شیبہ میں مذکور ہے:

حدثنا محمد بن فضيل (ثقة)، عن عبد الرحمن بن إسحاق (ضعيف)، عن محارب (بن دثار، ثقة) ،عن ابن عمر رضي الله عنه ، قال: كان يستحب الدعاء عند أذان المغرب ، وقال: إنها ساعة يستجاب فيها الدعاء . (مصنف ابن ابی شیبة، رقم : ۸۵۵۴/ ۲/ ۴۸۹).

حافظ ابن حجرؒ نے محمد بن فضیل بن غزوان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان پر شیعیت کی تہمت تھی۔ لیکن دکتور بشار عواد نے ثقہ فرمایا ہے۔

قال في تحرير التقريب: بل ثقة ؛ فقد احتج به الشيخان في صحيحيهما ووثقه ابن معين، وابن سعد، والعجلي، ويعقوب بن سفيان، وقال ابن المديني: ثقة، ثبت، فى الحديث وقال الدارقطني: كان ثبتاً فى الحديث...الخ. (تحرير تقريب التهذيب:۳/۳۰۷).

وقال الحافظ أبوالوليد الباجى المالكي: قال أحمد بن على بن مسلم حدثنا أبوهشام قال: سمعت بن فضيل يقول: رحم الله عثمان بن عفان ولا رحم من لا يترحم عليه قال: وسمعته يحلف بالله أنه لصاحب سنة وجماعة ، قال أبوهشام: ورأيت على خفه أثر المسح وصليت خلفه مالا أحصى فلم أسمعه يجهر بالبسملة. (التعديل والتجريح لمن خرج عنه البخارى فى الجامع الصحيح :۲/۳۷۷). وينظر للمزيد: (تهذيب التهذيب: ۹/ ۳۴۹/ ۶۵۱۷،ط:بيروت).

الدعوات الكبير للإمام البيهقى میں روایت ہے، ملاحظہ ہو:

أخبرنا أبوعبد الله الحافظ وأبوسعيد بن أبي عمرو قالا: حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب (ثقة) حدثنا احمد بن عبدالجبار(ضعيف)حدثنا ابومعاوية (ثقة)عن عبدالرحمن بن إسحاق (ضعيف) عن محارب بن دثار(ثقة)عن ابن عمر رضي الله عنه قال: كنا نومر بالدعاء عند أذان المغرب . (الدعوات الكبير: ۲/ ۹۸/ ۳۳۵، ط:الكويت).

مرقاۃ میں ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں: وعن أم سلمةؓ قالت: علمني رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أن أقول عند أذان المغرب:" اللّٰهم إن هذا إقبال ليلك ، وإدبار نهارك ، وأصوات دعاتك ، فاغفر لي ". رواه ابوداود، والبيهقى فى الدعوات الكبير، وبه ظهر وجه تفريع المغفرة ومناسبة الحديث للباب ، فإنه يدل على أن وقت الأذان زمان استجابة الدعاء ... وقد أجمعوا على جواز الأدعية المصنوعة من أصلها ، فكيف إذا كان مأخوذاً من الألفاظ النبوية . (مرقاة المفاتيح: ۲/۱۷۰، باب فضل الاذان، ط:امدادیه ملتان).

عمدۃ القاری میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں: ذكر ما يستفاد منه فيه: الحض على الدعاء في أوقات الصلاة حين تفتح أبواب السماء للرحمة ، وقد جاء : ساعتان لا يرد فيهما الدعاء : حضرة النداء بالصلاة ، وحضرة الصف في سبيل اللّٰه ، فدلهم صلى اللّٰه عليه وسلم على أوقات الإجابة . (عمدة القارى: ۴/۱۷۳، ط:دارالحديث،باب الدعاء عندالنداء ،رقم:۶۱۴). واللہ ﷻ اعلم۔

دعا کی ابتدا اور انتہا میں حمد وصلاۃ کا حکم:

سوال: علماء کی عادت ہے کہ دعا کی ابتدا میں حمد وصلاۃ پڑھتے ہیں، پھر دعا کے آخر میں: وصلى اللّٰه على خير خلقه محمد وآله... پڑھتے ہیں، کیا آخر میں بھی حمد وصلاۃ وارد ہے یا فقط درود شریف ہے؟

الجواب: دعا کی ابتدا اور انتہا میں حمد وصلاۃ مستحب ہے، البتہ آخر میں حمد کی تصریح کسی روایت میں دستیاب نہیں ہوئی، ہاں آخر میں صلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح موجود ہے۔

ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں ہے:

عن عمر بن الخطاب ﷺ، قال: إن الدعاء موقوف بين السماء والأرض لا يصعد منه شيء ، حتى تصلي على نبيك صلى اللّٰه عليه وسلم . (سنن الترمذى ،۴۸۶، باب ماجاء في فضل الصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم).

مجمع الزوائد میں ہے: باب الصلاة على النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فى الدعاء و غيره . عن علي رضي اللّٰه تعالىٰ عنه قال: كل دعاء محجوب حتى يصلى على محمد صلى اللّٰه عليه وسلم وآل محمد . [رواه الطبراني فى الأوسط ورجاله ثقات]. (مجمع الزوائد: ۱/۱۶۰).

امام نوویؒ الاذکار میں فرماتے ہیں: أجمع العلماء على استحباب ابتداء الدعاء بالحمد للّٰه تعالىٰ

والثناء عليه ، ثم الصلاة على رسول الله صلى الله عليه وسلم وكذلك تختم الدعاء بهما، والآثار في هذا الباب كثيرة معروفة . (الأذكار،ص ۱۵۳/ ۳۴۰).

وفيه : فصل : يستحب أن يختم دعاءه بالحمد لله رب العلمين ، وكذلك يبتدئه بالحمد لله ، قال الله تعالىٰ : ﴿ وآخر دعوٰهم أن الحمد لله رب العلمين ﴾.(الأذكار،ص ۱۴۸).

وفيه: التاسع : أن يفتتح الدعاء بذكر الله تعالىٰ. قلت : و بالصلاة على رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد الحمد لله تعالىٰ والثناء عليه، ويختمه بذلك كله أيضاً . (الاذكار، ص ۴۵۴).

الدعاء المسنون میں حصن حصین کے حوالہ سے لکھا ہے:

شیخ ابوسلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ: جب تم اللہ سے کوئی دعا کرو تو درود شریف پڑھ کر شروع کرو، پھر جو چاہو مانگو، اس کے بعد رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھ کر ختم کرو، اور اللہ اس سے بالاتر ہے کہ دونوں طرف اول آخر درود کو سن لے اور ان دونوں کے درمیان کو چھوڑ دے۔(الدعاء المسنون،ص ۱۱۵، دار العلوم زکریا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کی ابتدا حمد وصلاۃ سے کی جائے اور اختتام صلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جائے، ہاں امام نوویؒ نے فرمایا کہ اختتام بھی حمد سے کیا جائے، تو اس کے لیے قرآنِ کریم کی درجِ ذیل آیتِ کریمہ سے استیناس لیا جا سکتا ہے: ﴿ سبحان ربك رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين ، والحمد لله رب العٰلمين﴾ . [الصافات: ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲].

کتاب الدعاء للامام الطبرانی میں ہے:

عن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالىٰ عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم كان إذا انصرف من الصلاة قال: ﴿ سبحان ربك رب العزة عما يصفون وسلام على المرسلين ، والحمد لله رب العٰلمين﴾. (كتاب الدعاء،ص ۲۰۷/ ۶۵۱،ط:بيروت). واللہ ﷻ اعلم۔

غیر ماثور الفاظ سے دعا مانگنے کا حکم:

سوال: طالبِ علم کے لیے علم کی زیادتی اور برکت کی یہ دعا میں نے بعض بزرگوں سے سنی ہے: اللّٰهم يا معلم آدم عليه السلام علِمني ، اللّٰهم يا مفهم سليمان عليه السلام فهِمني ، اللّٰهم يا ملهم الملائكة ألهِمني، یہ کہاں ہے؟ اور کس سے مروی ہے؟ اور اس کا کیا درجہ ہے؟

الجواب: طلبِ بسیار کے باوجود یہ دعا کسی حدیث کی معتبر کتاب میں نہیں ملی، ہاں علامہ ابن تیمیہؒ کی طرف منسوب ہے، لیکن الفاظ کا کچھ اختلاف ہے، مثلاً: **اللّٰهم يا ملهم الملائكة ألهمني**، کے الفاظ موجود نہیں ہیں، اور **يا معلم آدم وإبراهيم عليهما السلام** کی زیادتی ہے، اس طرح کی دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، دعا میں انسان کو اختیار ہے جن الفاظ سے کرے درست ہے، نیز عربی میں کرنا بھی ضروری نہیں، اپنی زبان میں دعا مانگنا بھی درست ہے، اور ماثور غیر ماثور سب صحیح ہیں، ہاں غیر ماثور کو ماثور کا درجہ نہ دیا جائے۔ تاہم قرآن، حدیث میں وارد مختلف ادعیہ سے دعا کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔

علامہ ابن قیمؒ اپنی شہرۂ آفاق کتاب اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں:

وكان شيخنا كثير الدعاء بذلك، وكان إذا أشكلت عليه المسائل يقول: يا معلم إبراهيم علمني، ويكثر الاستغاثة بذلك اقتداءً بمعاذ بن جبل رضي اللّٰه تعالىٰ عنه حيث قال لمالك بن يخامر السكسكي عند موته، وقد رآه يبكي فقال: واللّٰه ما أبكي على دنيا كنت أصيبها منك، ولكن أبكي على العلم والإيمان الذين كنت أتعلمهما منك، فقال معاذ بن جبل رضي اللّٰه تعالىٰ عنه: إن العلم والإيمان مكانهما من ابتغاهما وجدهما، اطلب العلم عند أربعة: عند عويمر أبي الدرداء ﷺ، وعند عبد اللّٰه بن مسعود ﷺ، وأبي موسى الأشعري ﷺ وذكر الرابع، فإن عجز عنه هؤلاء فسائر أهل الأرض عنه أعجز فعليك بمعلم إبراهيم. (اعلام الموقعين: ۶/۱۹۷، دار ابن الجوزی).

وفي فتح الرحمن في بيان هجر القرآن: وكان شيخ الإسلام ابن تيميةؒ يقول في دعائه دائماً: اللّٰهم يا معلم آدم و إبراهيم علمني، و يا مفهم سليمان فهمني، فيجد الفتح في ذلك. (فتح الرحمن، ص۲۱۸، ط: دار ابن خزيمة).

وللاستزاد انظر: (العقود الدرية في ذكر بعض مناقب شيخ الإسلام ابن تيمية، لابن عبد الهادى: ۱/۳۸، وشرح مختصر البعلى لكتاب الصارم المسلول على شاتم الرسول لابن تيمية: ۱/۵، وحلية طالب العلم، للشيخ أبي زيد بكر بن عبد اللّٰه، ص ۱۸۱، ط: دار العاصمة للنشر والتوزيع، الرياض، وصفوة المسائل فى التوحيد والفقه والفضائل: ۱/۴۹، لمحمد نصر الدين محمد عويضة، و سلسلة القصص لمحمد بن صالح: ۱۱/۲۱).

قرآن، حدیث میں وارد ادعیہ سے دعا کرنا افضل اور بہتر ہے اور اقرب الی الاجابہ ہے، ہاں غیر ماثور الفاظ سے دعا کرنا بھی جائز اور درست ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح ابن خزیمہ میں روایت ہے:

عن فضالة بن عبيد الأنصاري ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأى رجلاً يصلى لم يحمد الله ولم يمجده ، ولم يصل على النبي صلى الله عليه وسلم وانصرف، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: عجل هذا ، فدعاه ، وقال له ولغيره: إذا صلى أحدكم فليبدأ بتمجيد ربه والثناء عليه وليصل على النبي صلى الله عليه وسلم، ثم يدعو بما شاء . (صحيح ابن خزيمة : ١/٣٧٣/١٠٧٤، ط: المكتب الاسلامى).

وبهامشه قال: إسناده صحيح. وقد أخرجه أحمد (١٨/٧) **وأبوداود وغيرهما عن أبى عبدالرحمن المقرى به ، وصححه الحاكم** (١/٢٣٠).

فقہاء نے بھی لکھا ہے کہ نماز کے علاوہ غیر ماثور سے دعا کرنا جائز اور درست ہے:

قال في رد المحتار: ينبغي أن يدعو في صلاته بدعاء محفوظ، وأما في غيرها فينبغي أن يدعو بما يحضره ، ولا يستظهر الدعاء لأن حفظه يذهب برقة القلب، هندية عن المحيط ، واستظهاره حفظه عن ظهر قلبه . (فتاوى الشامى : ١/٥٢٣، سعيد).

وللمزيد راجع: (تحفة الفقهاء ، ص ٢٠٤، دارالكتب العلمية ، وبدائع الصنائع : ١/٢٧٣، بيروت، والبحرالرائق: ٢/١٨٣).

غیر منقول دعا کے جائز ہونے اور منقول کے ساتھ غیر منقول ملانے کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

١ـ عن رفاعة بن رافع الزرقي، قال: كنا يوماً نصلي وراء النبي صلى الله عليه وسلم ، فلما رفع رأسه من الركعة قال: سمع الله لمن حمده ، قال رجل ورائه : ربنا لك الحمد حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه ، فلما انصرف ، قال: من المتكلم ، قال: أنا، قال: رأيت بضعة وثلاثين ملكاً يبتدرونها أيهم يكتبها أول . (صحيح البخارى : ١/١٥٩/٧٩٩، باب فضل اللهم ربنا لك الحمد ، ط: دارطوق النجاة).

٢ـ عن عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہ **سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو يهل ملبداً**

یقول: لبیک اللّٰھم لبیک ، لبیک لا شریک لک لبیک ، إن الحمد والنعمة لک والملک ، لا شریک لک ، قال ابن عمر ﷺ : وسمعت ابن الخطاب ﷺ یھل بإھلالہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ویزید معہ : لبیک وسعدیک ، والخیر في یدیک ، والرغباء إلیک والعمل . (المستخرج لابن ابی عوانۃ : ۹/۹۹/۳۵۷۶).

صحیح مسلم میں ہے کہ عبداللہ بن عمر ﷺ اضافہ فرماتے تھے: **قالوا: وکان عبد اللّٰہ بن عمر ﷺ یقول: ھذہ تلبیة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم. قال نافع :کان عبد اللّٰہ ﷺ یزید مع ھذا : لبیک لبیک ، وسعدیک ، والخیر بیدیک ، لبیک، والرغباء الیک والعمل.** (صحیح مسلم : ۴/۷/۲۷۸۲،ط:دارالجیل).

۳۔عن أنس ﷺ أنہ کان مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جالساً ورجل یصلی، ثم دعا : اللّٰھم إني أسألک بأن لک الحمد ، لا إلہ إلا أنت المنان ، بدیع السموات والأرض، یا ذا الجلال والإکرام ، یا حي یا قیوم ، فقال النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم : لقد دعا اللّٰہ باسمہ العظیم ، الذي إذا دعي بہ أجاب ، وإذا سئل بہ أعطی . (سنن ابی داود : ۲/۷۹/۱۴۹۷).

مذکورہ بالا احادیث میں ماثور کے ساتھ اضافہ کا ذکر ہے،لیکن چونکہ اس کو سنت نہیں سمجھتے تھے اورنہ دوسروں کواس کی تلقین کرتے تھے، نیز بعض اضافے حضور کی حیاتِ طیبہ میں ہوئے اورآپ نے برقراررکھےاور خوشی اورمسرت کااظہارفرمایا۔ہاں اگرکوئی سنیت کااعتقادرکھتے ہوئے اضافہ کرے،یاغیرمنقول کومنقول سمجھ کر پڑھےتوبدعت کااندیشہ ہے۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: (ذکراجتماعی وجہری شریعت کے آئینہ میں،ص۳۶۳،ط:زمزم،وفتاویٰ دارالعلوم زکریا:۱/۲۴۵،ردِ بدعت کابیان)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ساعاتِ اجابت میں دعا کی قبولیت:

سوال: ہم نے یہ بات بڑوں سے سیکھی ہے کہ مسلمان کی ہردعاقبول ہوتی ہے،اورقبول ہونے کے

مختلف طرق ہیں، اور دوسری طرف احادیث میں اجابت کے مختلف اوقات بتلائے گئے ہیں تو جب ہر وقت ہر دعا قبول ہوتی ہے، تو پھر ساعاتِ اجابت کا کیا فائدہ ہے؟ برائے مہربانی حدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائے؟

الجواب: ہر مسلمان کی ہر دعا ضرور قبول ہوتی ہے جبکہ دعا کی شرائط وآداب کی رعایت کی جائے، نیز موانعِ قبولیت سے اجتناب کیا جائے، اور ساعاتِ اجابت جو احادیث میں وارد ہوئے ہیں ان کا فائدہ یہ ہے کہ یہ اوقات باری تعالیٰ کی خصوصی تجلی، انوارات اور فیوضِ ربانی کے نازل ہونے کے اوقات ہیں، تو ان میں قبولیت میں تیزی، سرعت اور عجلت آجاتی ہے اور بعض آداب وشرائط کی کوتاہی کے باوجود دعا قبول ہوتی ہے۔

علماء نے قبولیتِ دعا کے چھ طریقے لکھے ہیں:

۱۔ جس چیز کی دعا کی جاتی بعینہ وہی چیز فوراً اس کو عطا کر دی جاتی ہے۔

اس کی چند مثالیں احادیث میں موجود ہیں؛ الف: جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچنے سے پہلے دعا پہنچ چکی تھی۔ **أخرج الإمام مسلمؒ في صحيحه (۲۴۹۱) عن يزيد بن عبد الرحمن، حدثني أبوهريرة رضي الله عنه، قال: كنت أدعو أمي إلى الإسلام وهي مشركة، فدعوتها يوماً فأسمعتني في رسول الله صلى الله عليه وسلم ما أكره فأتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم وأنا أبكي...فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اللّٰهم اهد أم أبي هريرة رضي الله عنه، فخرجت مستبشراً بدعوة نبى الله صلى الله عليه وسلم ... قالت: يا أباهريرة: أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله .**

باء: ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش طلب فرمائی تو فوراً بارش شروع ہوئی۔ **أخرج الإمام البخاري في صحيحه(۹۳۳) عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: أصابت الناس سنة على عهد النبي صلى الله عليه وسلم، فبينا النبي صلى الله عليه وسلم يخطب في يوم جمعة قام أعرابي، فقال يارسول الله! هلك المال وجاع العيال، فادع الله لنا، فرفع يديه وما نرى في السماء قزعة، فوالذي نفسي بيده، ما وضعها حتى ثار السحاب أمثال الجبال، ثم لم ينزل عن منبره حتى رأيت المطر يتحادر على لحيته صلى الله عليه وسلم ...الخ .**

ج: غزوۂ بدر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور فوری مدد ونصرت نازل ہوئی اور فتح وکامیابی نے مسلمانوں کے قدم چومے۔

حدثني محمد بن عبيد المحاربي (مختلف فيه والعمل على توثيقه) **قال: حدثنا عبد اللّٰه بن المبارك** (ثقة)، **عن عكرمة بن عمار** (صدوق يغلط)**قال: حدثنى سماك الحنفى** (ليس به باس) **قال:سمعت ابن عباس رضي الله عنه يقول: حدثنى عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: لما كان يوم بدر، ونظر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إلى المشركين وعدتهم ، ونظر إلى أصحابه نيفاً على ثلاث مائة ، فاستقبل القبلة ، فجعل يدعو ، يقول: اللّٰهم أنجز لي ما وعدتني، اللّٰهم إن تهلك هذه العصابة من أهل الإسلام لا تعبد فى الأرض ! فلم يزل كذلك حتى سقط رداء ه ، وأخذ أبوبكر الصديق رضي الله عنه، فوضع رداء ه عليه ،ثم التزمه من وراء ه ،ثم قال: كفاك يانبي اللّٰه بأبي وأمي، مناشدتك ربك ، فإنه سينجز لك ما وعدك ! فأنزل اللّٰه: ﴿إذ تستغيثون ربكم فاستجاب لكم أني ممدكم بألف من الملائكة مردفين﴾.** (تفسير الطبرى :۱۳/۴۰۹/۱۵۷۳۴).

۲۔مطلوب چیز مل جائے لیکن وقتی مصلحت کی وجہ سے کچھ مدت کے بعد۔ جیسے حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے ہمارے نبی کی بعثت کی دعا فرمائی ،اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور طویل مدت کے بعد قبولیت ظاہر ہوئی۔ **قال اللّٰه تعالىٰ: ﴿ ربنا وابعث فيهم رسولاً منهم يتلو عليهم آياتك ﴾. قال أبوجعفر: وهذه دعوة إبراهيم وإسماعيل لنبينا محمد صلى اللّٰه عليه وسلم خاصة، وهي الدعوة التي كان نبينا صلى اللّٰه عليه و سلم يقول: أناْ دعوة إبراهيم و بشرى عيسى .**
(تفسير الطبرى : ۸۲/۳) . وكذا فى المستدرك للحاكم (۲/۶۰۰/۴۱۷۴).

۳۔بعینہٖ شئ مطلوب نہ دی جائے لیکن اس سے افضل چیز مل جائے۔جیسے حضرت عمران علیہ السلام کی زوجہ نے بیٹے کی درخواست کی تھی تاکہ بیت المقدس کی خدمت کرے لیکن ان کو بیٹی حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا عطا ہوئی جو عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ بنیں۔ **قال اللّٰه تعالىٰ : ﴿ إذ قالت امرأت عمران رب إني نذرت لك ما في بطني محرراً فتقبل مني ، إنك أنت السميع العليم ، فلما وضعتها قالت**

رب إني وضعتها أنثى، والله أعلم بما وضعت ...﴾ [آل عمران:۳۵،۳۶]،

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے تھے: یہ ایسا ہے جیسے کوئی بچہ اپنے والد سے بندوق یا پستول مانگ لے اور والد یہ چیزیں اس کے لیے مضر سمجھ کر اس کو علم کی کتاب دے جو بچہ کے لیے پستول سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

۴۔ مطلوب چیز پوری نہیں ملتی، بلکہ حکمت اور مصلحت کی وجہ سے بعض حصہ ملتا ہے۔ مثلاً: کوئی قوتِ ذاکرہ کی دعا کرے تو قوتِ ذاکرہ مل جائے لیکن بعض چیزیں بھولنے کے ساتھ، جیسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیعتِ رضوان والے درخت کو بھول گئے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ بھولنے میں حکمت پنہاں تھی۔

قال ابن عمر ﷺ: رجعنا من العام المقبل فما اجتمع منا اثنان على الشجرة التي بايعنا تحتها، كانت رحمة من الله. (صحيح البخاری، رقم: ۲۹۵۸).

قال الحافظ ابن حجرؒ في حكمة نسيان مكان الشجرة: وهو أن لا يحصل بها افتتان لما وقع تحتها من الخير فلو بقيت لما أمن تعظيم بعض الجهال لها حتى ربما أفضى بهم إلى اعتقاد أن لها قوة نفع أو ضر كما نراه الآن مشاهداً فيما هو دونها و إلى ذلك أشار ابن عمر ﷺ بقوله كانت رحمة من الله أى كان خفاؤها عليهم بعد ذلك رحمة من الله تعالىٰ.

(فتح الباری: ۱۱۸/۶، ط: دارالمعرفة بيروت).

۵۔ بعینہ وہ چیز نہیں دی جاتی بلکہ اس کے عوض میں آنے والی بڑی مصیبت دفع کر دی جاتی ہے۔

۶۔ دعا کا بدلہ آخرت میں دیا جاتا ہے۔ ۵، ۶، دونوں باتیں درجِ ذیل حدیث میں موجود ہیں:

عن أبي سعيد ﷺ أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ما من مسلم يدعو بدعوة ليس فيها إثم ولا قطيعة رحم إلا أعطاه الله بها إحدى ثلاث إما أن تعجل له دعوته وإما أن يدخرها له فى الآخرة وإما أن يصرف عنه من السوء مثلها قالوا إذاً نكثر، قال: الله أكثر.

(أخرجه الإمام أحمد في مسنده، رقم: ۱۱۱۳۳). **قال الشيخ شعيبؒ: إسناده جيد.**

قبولیتِ دعا کے بعض موانع ملاحظہ کیجیے:

۱۔ دعا بیدار مغزی سے کی جائے، بے پرواہی اور غفلت والی دعا قبول نہیں ہوتی۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: ادعو اللّٰه وأنتم موقنون بالإجابة واعلموا أن اللّٰه لا يستجيب دعاء من قلب غافل لاه . (رواه الترمذی ، رقم: ۳۴۷۹).

۲۔عجلت بازی کی وجہ سے دعا کر کے چھوڑ دینے سے دعا قبول نہیں ہوتی۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: يستجاب لأحدكم ما لم يعجل يقول: دعوت فلم يستجب لي . (رواه البخاری ، رقم ؛ ۶۳۴۰).

۳۔غذا حلال طیب اور پاکیزہ ہونی چاہیے، حرام غذا کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: ...ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر ، يمد يديه إلى السماء ، يارب يارب ، ومطعمه حرام ، مشربه حرام ، وملبسه حرام ، وغذى بالحرام فأنىٰ يستجاب لذلک ؟ (رواه مسلم ،رقم: ۱۰۱۵).

۴۔ ظالم کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ **ذكر عبد اللّٰه بن أحمد في كتاب الزهد: أنه أصاب بني إسرائيل بلاءً فخرجوا مخرجاً فأوحى اللّٰه عزوجل إلى نبيهم أن أخبرهم أتخرجون إلى الصعيد بأبدان نجسة وترفعون إلى أكفاً قد سفكتم بها الدماء وملأتم بيوتكم من الحرام الآن حين اشتد غضبي عليكم ولم تزدادوا مني إلا بعداً .** (كتاب الزهد).

وللمزيد راجع: (التنوير شرح الجامع الصغير: ۳/ ۴۴۹، للامام الصنعانی).

دعا کے چند آداب ملاحظہ کیجیے:

۱۔ساعاتِ اجابت میں دعا کی جائے۔

چند ساعاتِ اجابت درج ذیل ہیں: رات کے آخری حصہ میں۔ بوقتِ اذان، اذان واقامت کے درمیان، فرض نمازوں کے بعد۔ بروزِ جمعہ خطیب کے منبر پر جانے کے وقت سے لیکر نماز کا سلام پھیرنے تک۔ بروزِ جمعہ مغرب سے کچھ پہلے۔ بارش برسنے کے وقت۔ میدانِ کارزار میں بوقتِ جہاد۔ ختمِ قرآنِ کریم کے وقت۔ ان کے علاوہ دیگر مواقع۔

۲۔خشوع وخضوع، عاجزی وانکساری کے ساتھ دعا کی جائے۔

۳۔رو بہ قبلہ ہوکر دعا کی جائے۔
۴۔طہارت کے ساتھ باوضو دعا کی جائے۔
۵۔ہاتھ اٹھا کر دعا کی جائے۔
۶۔اللہ تعالیٰ کی تعریف اور حمد وثنا سے دعا کی ابتدا کی جائے۔
۷۔اول وآخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھا جائے۔
۸۔اپنے گناہوں پر ندامت اور توبہ واستغفار کے بعد دعا کی جائے۔
۹۔اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے توسل لے کر دعا کی جائے۔
۱۰۔حتی الامکان ماثور دعاؤں کا اہتمام کیا جائے۔منقول الفاظ کے اپنے اسرار اور خصائص ہوتے ہیں۔
۱۱۔کسی معصیت یا قطع رحمی کی دعا نہ کی جائے۔
۱۲۔پختہ ارادہ اور جزم کے ساتھ دعا کرے مشیت پر معلق نہ کرے کہ تو چاہے تو یہ کام کردے۔

عن أنس رضي الله تعالىٰ عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: إذا دعا أحدكم فليعزم المسألة ، ولا يقولن اللّهم إن شئت فأعطني، أنه لا مستكره له . (صحیح البخاری،رقم: ۲۳۳۸).

قال الشيخ الصنعاني: فإذا عرفت هذا فإن الدعاء : إذا وافق وقتاً من أوقات الإجابة وهي ثلث الليل الآخر وعند الأذان وبين الأذان والإقامة وفي إدبار الصلوات المكتوبات وعند صعود الإمام يوم الجمعة على المنبر حتى يقضى الصلاة وآخر ساعة بعد العصر من ذلك اليوم وثمة ساعات أخر ورد بها النص كعند نزول الغيث وعند ملاقاة الأعداء فى الجهاد وعند ختم القرآن، وغير ذلك. ووافق خشوعاً من القلب وانكساراً بين يدى الرب وذلاً وتضرعاً ورقة . واستقبال القبلة . وكون الداعي على طهارة . ورفع يديه. وبدأ بحمد الله والثناء عليه . ثم ثنى بالصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم. مقدماً للتوبة والاستغفار. متوسلاً إلى الله بأسماء ه الحسنى وصفاته وتوحيده. متحرياً الأدعية التي ورد بها الأثر ...

ولم يدع بإثم ولا قطيعة رحم فلا بد من إنجاح مسألته وقضاء حاجته وكشف كربته . انتهى كلام الأمير الصنعاني من التنوير شرح الجامع الصغير . (۳/۴۴۹،ط:مکتبہ دارالسلام ریاض).

قال في كتاب الآداب: وأجمع الدعاء ما كان في القرآن والسنة ، فالقرآن كلام الله وأشرف كلام ، وأعلاه ، والسنة وحي أوحى الله به إلى نبيه ، فهو صلى الله عليه وسلم قد أوتي جوامع الكلم ، ولا نشك أن من دعا بما ورد في القرآن والسنة يكون أقرب إلى الإجابة ممن دعابغير الكتاب والسنة . (كتاب الآداب للشيخ فؤاد بن عبدالعزيز، ص ۳٦۸،ط: دارالقاسم).

ساعاتِ اجابت کے فوائد کے بارے میں مختلف علماء نے مختلف باتیں لکھی ہیں؛ مثلاً: بعض آداب وشرائط میں کمی کوتاہی کے باوجود دعا کا قبول ہونا، یا جلدی دعا کا قبول ہونا، نیز یہ اوقات اللہ تعالیٰ کی مخصوص تجلیات اور فیوضِ ربانی کے نزول کے اوقات ہیں۔ وغیرہ۔ چند عبارات درجِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

قال الإمام ابن دقيق العيد في شرح الحديث...يارب يارب، ومطعمه حرام ، ومشربه حرام، وملبسه حرام ، وغذي بالحرام ، فأنى يستجاب لذلك ؟ وقوله فأنى يستجاب لذلك ، يعني من أين يستجاب لمن هذه صفته ، فإنه ليس أهلاً للإجابة ، لكن يجوز أن يستجيب الله تعالىٰ له تفضيلاً ولطفاً وكرماً والله أعلم . (شرح الاربعين النووية،ص ۲۰).

وقال الإمام ابن الفورك: وذكرنا أن ذلك يرجع تأويله إلى إظهار فعل وتدبير في عباده يسميه نزولاً وأنه يحتمل أن يقال: إن معناه أن يظهر رحمته لهم وإجابته لدعائهم وأنه من له أن لا يجيب ولا يرحم لأن الإجابة منه فضل وتركها منه عدل فإذا أجابهم فقد نزل عما له أن يفعل بهم من ترك الإجابة إلى أن يفعل بهم ما يكون من فعله متفضلاً . (مشكل الحديث، ص ۴۷۱).

وقال ابن قزقول: وقيل معنى (نزل ربنا) عبارة عن بسط رحمته وسرعة إجابته . (مطالع الأنوار على صحاح الآثار: ۴/۱۴۵).

قال الشيخ ابن علان الشافعيؒ: وعن أبي أمامةؓ قال: قيل: يا رسول الله أى الدعاء

أسمع ، أى أقرب للإجابة ، قال جوف الليل، أى وسطه...ولأنه وقت التجليات الإلهية و تنزل الفيوض الربانية . (دليل الفالحين:۷/۳۰۳).

حدیث: ”**ثلاثة لا ترد دعوتهم**“ کے تحت امیر صنعانی لکھتے ہیں:

واعلم أن الحكمة ظاهرة في إجابة الصائم لأنه في عبادة وإجابة المظلوم لأنه هضم جانبه وكسر قلبه ، والمسافر ، فإنه مجاب الدعوة إلا أن في حكمة ذلك خفاء وكانه بفراق أهله ووطنه صار منفرداً عن مألفه مكروباً بالفراق دياره منكسر النفس متعرض للأخطار فكانت رحمة الله إليه قربته وإجابته لدعوته سريعة . (التنوير شرح الجامع الصغير: ۱۶۸/۵/ ۳۴۳۷). واللہ ﷻ اعلم۔

بدھ کے دن زوال کے بعد قبولیتِ دعا کا ثبوت:

سوال: میں نے علماء سے سنا ہے کہ بدھ کے دن زوال کے بعد تا مغرب دعا کی قبولیت کا وقت ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر صحیح ہو تو اس کی کیا سند اور دلیل ہے؟

الجواب: حدیث شریف میں آتا ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ فتح میں پیر، منگل اور بدھ کے دن دعا فرمائی تو بدھ کے دن ظہر وعصر کے درمیان دعا قبول ہوئی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر بشاشت کے آثار ظاہر ہوئے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب بھی کوئی اہم کام درپیش ہوتا تو اس وقت (بدھ کے دن ظہر، عصر کے درمیان) میں دعا کرتا تھا اور قبول ہوتی تھی۔ روایت ملاحظہ ہو:

أخرج الإمام أحمد في مسنده (۱۴۵۶۳/۴۲۵/۲۲، ط:الرسالة)، **بسنده عن جابر بن عبد الله أن النبي صلى الله عليه وسلم دعا في مسجد الفتح ثلاثاً : يوم الاثنين ، ويوم الثلاثاء ويوم الأربعاء فاستجيب له يوم الأربعاء بين الصلاتين فعرف البشر في وجهه ، قال جابر : فلم ينزل بي أمر مهم غليظ إلا توخيت تلك الساعة فأدعوا فيها فأعرف الإجابة. قال الشيخ شعيب: إسناده ضعيف،كثير بن زيد ليس بذاك القوي، خاصة إذا لم يتابعه أحد**

وقـد تـفـرد بهـذا الـحـديـث عن عبد الله بن عبد الرحمن بن كعب ، وهذا الأخير في عداد المجاهيل، وله ترجمة فى التعجيل (۵٦۳)،

وأخرجه ابن سعد فى الطبقات (۲/۷۳)، والبخاري فى الأدب المفرد (۷۰۴) والبيهقي فى الشعب(۳۸۷۴) من طرق عن كثير بن زيد بهذا الإسناد .

شیخ شعیب الارنووطؒ نے کثیر بن زید کو صدوق حسن الحدیث کہا ہے، ملاحظہ ہو:

قـال فـي تـحـريـر التقريب : صدوق حسن الحديث ،كما قال البوصيري في مصباح الـزجـاجة : فـقـد وثقه ابن عمار، وقال أحمد: ما أرى به بأساً ، واختلف فيه قول ابن معين ، فـقـال مـرة : ثقة ، وقال في رواية : ليس به بأس، وقال في رواية : صالح ، و قال في رواية : ليــس بـذاک ، وقـال فـي رواية : ليــس بشيء ، وقال في رواية : ضعيف. وقال أبوزرعة : صـدوق فيـه ليـن ، وقـال أبـوحـاتـم : صـالح ، ليس بالقوي، يكتب حديثه ، وقال النسائي: ضـعيف ، وقـد سبر ابن عدى حديثه ، وفتشه ، وانتهى إلى القول: ولم أر به بأساً ، وأرجو أنه لا بأس به. وذكره ابن حبان فى الثقات . (تحریرتقریب التهذیب:۳/۱۹۲/۵۶۱۱).

اسی وجہ سے حافظ منذریؒ نے الترغیب والترہیب میں اسنادہ جید اور مجمع الفوائد میں رجال احمد ثقات فرمایا ہے۔اور فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد میں بحوالہ شیخ البانیؒ حسن لکھا ہے۔ویسے بھی فضائل کی روایات میں تساہل سے کام لیا جاتا ہے۔فیض القدیر میں قبولیتِ دعا کے اوقات میں بدھ کے دن ظہر اور عصر کے درمیانی وقت کو بھی شامل کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

الـدعـاء مستـجـاب مـا بيـن النداء ، يعنى ما بين النداء بالصلاة والأذان والإقامة كما بينته الرواية السابقة ويجيء فيه ما تقرر وقد ورد في أحاديث أخرى أن الدعاء يستجاب في مـواطـن أخرى منها في ليلتي العيد وليلة القدر وليلة النصف من شعبان وأول ليلة من رجب وعـنـد نـزول الـمـطـر والتقاء الصفين فى الجهاد وفى جوف الليل الآخر وعند فطر الصائم ورؤية الـكـعبة وأوقـات الاضطرار وحال السفر والمرض وعند المحتضر وصياح الديک

وختم القرآن وفي مجالس الذكر ومجامع المسلمين وفي السجود و دبر المكتوبة و عند الزوال إلى مقدار أربع ركعات وبين صلاة الظهر والعصر من يوم الأربعاء وعند القشعريرة (کپکپی، لرزہ) وفي الطواف وعند الملتزم وتحت الميزاب وفي الكعبة وعند زمزم وعلى الصفا و المروة و في عرفة و المسعى و خلف المقام والمزدلفة ومنى والجمرات وغير ذلك.

(فيض القدير: ۳/ ۱۵۴۱/ ۴۲۶۱). واللہ ﷻ اعلم۔

دورانِ نماز اگلی صف میں خالی جگہ پر کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص کو نماز میں یاد آیا کہ میرا وضو نہیں تھا، اور نماز شروع کی، یاد آنے پر وہ چلا گیا اور اس کی جگہ خالی ہوگئی تو پچھلی صف والا آگے بڑھے گا یا نہیں؟ اگر بڑھے گا تو قدم مسلسل لیتا رہے گا یا توقف کریگا؟ نیز پاؤں کو اٹھا کر چلے گا یا کوئی اور شکل ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ پچھلی صف والے سے مطلوب ہے کہ وہ آگے بڑھ کر خالی جگہ پر کرلے، اور ایک صف کے بقدر مسلسل چل سکتا ہے، لیکن اگر اس سے آگے چلنا ہو تو بقدرِ رکن ٹھہر جائے پھر ایک صف کے بقدر چل سکتا ہے اسی ترتیب سے آگے بڑھے، نیز چلنے کی کیفیت کے بارے میں فقہاء سے کچھ منقول نہیں لہٰذا پاؤں اٹھا کر چل سکتا ہے۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیں؛ فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

بقي ما إذا رأى الفرجة بعد ما أحرم هل يمشي إليها لم أره صريحاً، وظاهر الإطلاق، نعم ...ثم رأيت في مفسدات الصلاة من الحلبة عن الذخيرة: إن كان في الصف الثاني فرأى فرجة في الأول فمشى إليها لم تفسد صلاته لأنه مأمور بالمراصة، قال عليه الصلاة والسلام: تراصوا في الصفوف، ولو كان في الصف الثالث تفسد، أي لأنه عمل كثير، وظاهر التعليل بالأمر أنه يطلب منه المشي إليها، تأمل. (فتاوى الشامي: ۱/ ۵۷۰، سعيد).

تقریرات الرافعی میں مرقوم ہے:

قوله و لو كان في الصف الثالث تفسد، سيأتي في الشرح في مفسدات الصلاة مشى

مستقبل القبلة هل تفسد إن قدر صف ثم وقف قدر ركن ثم مشى ووقف كذلك وهكذا لاتفسد وإن كثر ما لم يختلف المكان، فعلى هذا محل الفساد لو كان فى الصف الثالث إذا لم يقف . (التحرير المختار بهامش رد المحتار: ۱/۷۳، سعيد).

(وكذا في شرح المنية ،ص ۴۵۰،ط: سهيل ، وحاشية الطحطاوي على مراقى الفلاح ، ص ۳۲۳، والدر المختار مع رد المحتار : ۱/۶۲۷،سعيد).

فتاویٰ قاضی خان میں مرقوم ہے: **ولو مشى في صلاته مقدار صف واحد لم تفسد صلاته و لو كان مقدار صفين إن مشى دفعة واحدة فسدت صلاته وإن مشى إلى صف ووقف ثم مشى إلى صف لا تفسد صلاته** . (فتاوى قاضيخان على هامش الهندية: ۱/۱۳۴).

مزید ملاحظہ ہو: (آپ کے مسائل اوران کا حل:۳/۴۲، مکتبہ لدھیانوی، واغلاط العوام،ص۵۴)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

مریض کا غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم:

سوال: مریض قبلہ کی طرف منہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اس کے پاس ایک آدمی موجود ہے جو اس کو رو بہ قبلہ کرا سکتا ہے، لیکن مریض نے اس کو حکم دئے بغیر، غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تو اس کی نماز ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مسئلہ بالا میں امام صاحبؒ کے نزدیک مریض کی نماز ہوگئی، البتہ صاحبینؒ کے نزدیک مریض کا دوسرے کو حکم کرنا ضروری تھا اور اس نے بلا کہے نماز پڑھی تو نماز نہیں ہوئی، اکثر حضرات نے صاحبینؒ کے قول کو ترجیح دی ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار مع ردالمحتار میں مرقوم ہے:

وقبلة العاجز عنها لمرض وإن وجد موجهاً عند الإمام أوخوف مال وكذا كل من سقط عنه الأركان ، جهة قدرته . وفي رد المحتار : قوله عند الإمام ؛ لأن القادر بقدرة الغير عاجز عنده لأن العبد يكلف بقدرة نفسه لا بقدرة غيره خلافاً لهما فيلزمه عندهما التوجه إن وجد موجهاً وبقولهما جزم فى المنية والمنح والدرر والفتح بلا حكاية خلاف . (الدر

المختار مع ردالمحتار: ۱/۴۳۲،سعید).

فتح القدیر میں مذکور ہے:

وعلى هذا الخلاف إذا كان مريضاً لا يقدر على الاستقبال أو كان في فراشه نجاسة و لا يقدر على التحول عنه و وجد من يحوله ويوجهه لايفترض عليه ذلک عنده... وعندهما تثبت القدرة بآلة الغير لأن آلته صارت كآلته بالإعانة وكان حسام الدين يختار قولهما .

(فتح القدیر: ۱/۱۲۴،دارالفکر).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے: اگر کوئی مریض کسی مرض کے سبب سے قبلہ کی طرف منہ نہیں کرسکتا اوراس کے پاس کوئی ایسا شخص بھی نہ ہو جواس کا منہ قبلہ کی طرف پھیر دے یا پھیرنے والا تو موجود ہے لیکن منہ پھیرنا بیمار کو نقصان دے گا تو وہ جدھر کو چاہے نماز پڑھ لے،اور اگر بیمار کا منہ قبلہ کی طرف کرنے کے لیے کوئی شخص موجود ہے اور منہ پھیرنا اس کو نقصان بھی نہیں کرتا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ بھی معذور ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک ہر شخص اپنی قدرت کے ساتھ مکلّف ہے نہ کہ دوسرے کی قدرت کے ساتھ، پس غیر کی قدرت کے ساتھ قادر ہونا بھی عذر وعجز ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک اگر دوسرے کی مدد سے قبلہ رخ ہوسکتا ہواور دوسرا اس کے پاس موجود ہوتو وہ معذور وعاجز نہیں ہے اور معذور کی طرح جس جہت پر قادر ہواس طرف نماز پڑھنے سے نماز درست نہ ہوگی بلکہ قبلہ رخ ہونا ضروری ہوگا، اسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/۶۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اللہ کے ہمزہ یا اکبر کے ہمزہ میں مد کرنے سے نماز کا حکم:

سوال: ایک صاحب نماز میں اللہ اکبر میں پہلی ہمزہ میں مد پیدا کرتا ہے اور آللہ اکبر کہتا ہے، کیا اس کی نماز فاسد ہوئی یا نہیں؟ اور اگر اکبر کی جگہ اکبار پڑھے تو کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اکثر علماء نے لکھا ہے کہ اللہ اکبر کے پہلے ہمزہ میں مد کرنے سے نماز فاسد ہوجائے گی، اور باء کے بعد مد کے مفسد ہونے میں اختلاف ہے، ہاں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ پہلے ہمزہ میں مد کرنے سے نماز فاسد نہ ہوگی۔ دونوں اقوال میں تطبیق کی یہ صورت ہوگی کہ اگر عوام الناس غلبہ جہل کی وجہ سے ایسا کریں تو مفسد

نہیں بشرطیکہ ان کوکسی نے تنبیہ نہ کی ہو، لیکن اگر تنبیہ کرنے کے بعد بھی اصلاح کی کوشش نہ کریں تو مفسد ہے، البتہ عالم فاضل ایسی غلطی کرے تو نماز نہیں ہوگی۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

اعلم أن المد إن كان فى الله ، فأما في أوله أو وسطه أو آخره ، فإن كان في أوله لم يصر به شارعاً وأفسد الصلاة لو في اثنائها، ولايكفر إن كان جاهلاً لأنه جازم والإكفار فى الشك في مضمون الجملة ، وإن كان في وسطه ، فإن بالغ حتى حدث ألف ثانية بين اللام والهاء كره، قيل: والمختار أنها لا تفسد ، وليس ببعيد وإن كان في آخره فهو خطأ ولا يفسد أيضاً وقياس عدم الفساد فيهما صحة الشروع بهما ، وإن كان المد في أكبر، فإن في أوله فهو خطأ مفسد وإن تعمده قيل: يكفر للشك ، وقيل: لا، ولا ينبغي أن يختلف في أنه لايصح الشروع به ، وإن في وسطه أفسد ، ولا يصح الشروع به ، وقال الصدر الشهيد : يصح ، وينبغي تقييده بما إذا لم يقصد به المخالفة كما نبه عليه محمد بن مقاتل ، وفى المبتغى: لا يفسد لأنه إشباع وهو لغة قوم ، وقيل يفسد لأن أكبار اسم ولد إبليس .

فإن ثبت أنه لغة فالوجه الصحة ؛ وإن فى آخره فقد قيل: يفسد الصلاة وقياسه أن لايصح الشروع به أيضاً كذا فى الحلية ملخصاً . (فتاوى الشامي: ۱/۴۸۰،سعيد).

البحر الرائق شرح کنز الدقائق میں مرقوم ہے:

لو مد ألف الله ، لا يصير شارعاً وخيف عليه الكفر إن كان قاصداً ، وكذا لو مد ألف أكبر ، أو باءه ، لا يصير شارعاً ؛ لأن أكبار جمع أكبر ، وهو الطبل ، وقيل: اسم للشيطان، ولو مد هاء ، الله ، فهو خطأ لغة ، وكذا لو مد راءه ومد لام ، الله ، صواب وجزم الهاء خطأ لأنه لم يجئ إلا فى ضرورة الشعر . (البحرالرائق: ۱/۳۱۴،کوئٹه).

نیز فتاویٰ محمودیہ (۶/۶۳۷)، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (۲/۱۷۶)، فتاویٰ رحیمیہ (۲/۴۱۸) اور بہشتی زیور (دوسرا حصہ، ص۱۴۳) میں بھی مفسد نماز قرار دیا ہے۔ ہاں غلبۂ جہل کی وجہ سے احسن الفتاویٰ میں غیر مفسد بتایا ہے۔

احسن الفتاویٰ کی عبارت ملاحظہ ہو:

علامہ شامیؒ نے حلیہ وغیرہ سے نقل فرمایا ہے کہ تکبیر میں اسمِ ذات اللہ اور اکبر کے الف کو کھینچ کر پڑھنا مفسدِ نماز ہے، اور لام کو اتنا کھینچنا کہ ایک الف مزید پیدا ہو جائے مکروہ ہے، مفسد نہیں، اسی طرح باء کو کھینچنا مکروہ ہے، باء کے مد کے مفسد ہونے میں اختلاف ہے، اور راء پر پیش کھینچ کر پڑھنا مفسد ہے۔ مگر غلبہ جہل کی وجہ سے متاخرین کا یہ فیصلہ ہے کہ اعراب اور مد کی غلطی مفسد نہیں، البتہ اگر کوئی تنبیہ کے باوجود اصلاح کی کوشش نہیں کرتا تو اس کی نماز نہیں ہوگی، اور غلط خواں کو امام بنانا بہر صورت ناجائز ہے، بجز اس مجبوری کے کہ کوئی صحیح پڑھنے والا موجود نہ ہو، اس کی تفصیل میرے رسالہ ''الارشاد الی مخرج الضاد'' میں ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۳/۴۲۴)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

تلاوت میں بعض حروف کی تبدیلی سے نماز کا حکم:

سوال: بعض ممالک میں بڑے بڑے مشائخ جب قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو بعض حروف کو تبدیل کرتے ہیں، مثلاً: اللہ اکبر، کی جگہ، اللہ اجبر پڑھتے ہیں، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ نماز میں بھی اسی طرح تلاوت کرتے ہیں، ان کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر کسی کو غلط پڑھنے کی عادت ہو جائے اور ایسی غلطی جس سے معنی میں تبدیلی نہیں آتی، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، اور اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز درست ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

وإن كـان الخطأ بإبدال حرف بحرف ، فإن أمكن الفصل بينهما بلا كلفة كالصاد مع الطـاء بـان قـرأ الطالحات مكان الصالحات فاتفقوا على أنه مفسد وإن لم يمكن إلا بمشقة كـالظاء مع الضاد والصاد مع السين فأكثرهم على عدم الفساد لعموم البلوىٰ. (فتاوى الشامي: ١/ ٦٣١، سعيد).

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اشرف الاحکام میں رقمطراز ہیں:

امام فضلیؒ کا قول ہے کہ جس شخص کو غلط لفظ پڑھتے پڑھتے اس کی عادت ہوگئی تو وہ اس کا لغت ہو جائے گا لہٰذا ایسے شخص کے پیچھے صحیح قرآن پڑھنے والے کی نماز صحیح ہو جائے گی چنانچہ ایک مرتبہ مکہ معظّمہ میں ایک ترکی امام

کے پیچھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور کئی علماء نے نماز پڑھی، تر کی ک کی جگہ چ پڑھتے ہیں، امام نے بھی ایاک کی جگہ ایاچ نعبد پڑھا سب لوگوں نے نماز لوٹائی مگر مولانا قاسم صاحبؒ نے نہیں لوٹائی اور یہی ارشاد فرمایا۔

(اشراف الاحکام، ص۵۹، بحوالہ: انفاسِ عیسیٰ ج۲ص۴۳۴، ط: ادارۂ اسلامیات کراچی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

غلط خواں امام کے پیچھے نماز کے جواز کے قول کی تحقیق:

سوال: امام فضلیؒ کا قول ہے کہ غلط پڑھنے کی عادت ہو تو نماز فاسد نہیں ہوگی، یہ قول کہاں ہے؟ اور کیا عام فقہاء نے اس پر فتویٰ دیا ہے یا نہیں؟ عام فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ غلطِ فاحش یا لحنِ جلی مفسدِ صلاۃ ہے، اس کا حوالہ بتلا دیں؟

الجواب: امام فضلیؒ کے قول کو حضرت تھانویؒ نے اپنی کتاب: انفاسِ عیسیٰ میں ج۲ص۳۹۴، ط: سعید، پر نقل فرمایا ہے۔ اور اسی کے حوالہ سے اشرف الاحکام (۵۹) میں مذکور ہے۔

ہاں عام فقہاء کے نزدیک اگر حرف بدلنے سے معنیٰ نہیں بدلتا تو نماز فاسد نہیں ہوگی اور اگر معنیٰ بدل جاتا ہے تو نماز فاسد ہو جائے گی، پھر فقہاء نے اس میں قدرتِ ادا کا بھی اعتبار کیا ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

(إلا ما يشق الخ) قال في الخانية والخلاصة : الأصل فيما إذا ذكر حرفاً مكان حرف وغير المعنى إن أمكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد وإلا يمكن إلا بمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال أكثرهم : لا تفسد . وفي خزانة الأكمل: قال القاضي أبوعاصم : إن تعمد ذلك تفسد وإن جرى على لسانه أو لا يعرف التمييز لا تفسد وهو المختار ،حلية . وفي البزازية : وهو أعدل الأقاويل وهو المختار .

وفي التاتارخانية عن الحاوي: حكى عن الصفار أنه كان يقول: الخطأ إذا دخل في الحروف لا يفسد لأن فيه بلوى عامة الناس لأنهم لايقيمون الحروف إلا بمشقة . وفيها إذا

لـم يكن بين الحرفين اتحاد المخرج ولا قربه إلا أن فيه بلوى العامة كالذال مكان الصاد أو الزاى المحض مكان الذال والظاء مكان الضاد لا تفسد عند بعض المشايخ .

قلت: فينبغي على هذا عدم الفساد في إبدال الثاء سيناً والقاف همزة كما هو لغة عوام زماننا فإنهم لا يميزون بينهما ويصعب عليهم جداً كالذال مع الزاى ولا سيما على قول القاضى أبى عاصم وقول الصفار وهذا كله قول المتاخرين وقد علمت أنه أوسع وأن قول المتقدمين أحوط .

قال في شرح المنية : و هو الذى صححه المحققون وفرعوا عليه، فاعمل بما تختار والاحتياط أولى سيما في أمر الصلاة التي هي أول ما يحاسب العبد عليها . (فتاوى الشامى : ۱/ ۶۳۳، سعيد).

وللمزيد ينظر: (الفتاوى الهندية: ۱/ ۷۹، الفصل الخامس فى زلة القارى ،وفقه العبادات ،الفصل السابع ، مفسدات الصلاة ،ص ۹۴ ،وحاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح،ص ۳۳۶،ط:قديمى). واللہ ﷻ اعلم۔

عیدگاہ پر چھت بنانے کا حکم:

سوال: عیدگاہ پر چھت بنانا درست ہے یا نہیں؟ اور کیا چھت کے نیچے عید کی نماز پڑھنا خلافِ سنت ہے؟ نیز اطراف میں دیوار نہیں بنائی جائے گی فقط چھت ہوگی ستونوں کے سہارے پر جیسا کہ اجتماع میں کیا جاتا ہے، کیا اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ دھوپ، بارش اور گرمی، سردی سے حفاظت کی خاطر عیدگاہ پر چھت بنانا جائز اور درست ہے، اور چھت کے نیچے عید کی نماز ادا کرنا کھلے میدان کی سنت کے خلاف نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مذکور ہے: عیدگاہ وقف ہے اس میں کوئی تصرف تعمیر مکان وغیرہ کا درست نہیں، البتہ اگر نمازیوں کے آرام کے لیے دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے کوئی درجہ مسقّف کردیا جائے مثل مسجد کے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۵/۲۱۴، ط: دارالاشاعت)۔

امدادالاحکام میں مرقوم ہے:

سوال: عیدگاہ پختہ بنانا شرع شریف میں درست ہے یا نہیں؟ علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفیؒ جذب القلوب الی دیارالمحبوب میں جوزیرین بیان مصطفیٰ تحریر فرماتے ہیں: مصلیٰ عید در زمانِ آں سرور بنا نداشت بلکہ از بنائے آں نہی فرمود، علامہ سمہودی وفاء الوفاء باخبار المصطفی ص۶ میں لکھتے ہیں: **ولم يكن المصلى في زمن النبي صلى الله عليه وسلم مسجداً، بأن كانت صحراء لا بناء بها ونهى صلى الله عليه وسلم عن البناء بها**، نیز صفحہ ۱۱ میں ہے: **روى ابن أبي شيبة عن أنس بن مالك رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج إلى المصلى يستسقى فبدأ بالخطبة ثم صلى وكبر واحدة افتتح بها الصلاة وقال: هذا مجمعنا ومستمطرنا ومدعانا لعيدنا ولفطرنا وأضحانا فلا يبنى فيه لبنة على لبنة ولا خيمة**، اسی طرح خلاصۃ الوفاء میں بھی ہے، ان کی کیا غرض ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: عیدگاہ پختہ تعمیر کرنا جائز ہے، **قال الشامي وفى الخلاصة عن خواهر زاده هذا أى بناءه حسن في زماننا، ص۸۶۸، ج۱، وفى البخارى عن أبي سعيد وفيه فلما أتينا المصلى إذا منبر بناه كثير بن الصلت، قلت: ولم ينكر عليه الصحابة واستمر ذلك بعده فكان إجماعاً على جوازه قال الحافظ فى الفتح: وقد وقع فى المدونة لمالكؒ رواه عمر بن شيبة عن أبي غسان عنه قال: أول من خطب الناس فى المصلى على المنبر عثمان بن عفان كلمهم على منبر من طين بناه كثير بن الصلت، وقال أيضاً وفي هذا الحديث من الفوائد بنيان المنبر قال الزين بن المنير وإنما اختار وأن يكون باللبن لا من الخشب لكونه يترك بالصحراء في غير حرز فيؤمن عليه النقل، قلت: فلو أحيط المنبر بالأسوار من الجدران لأجل صيانته وبقائه فلا بأس به لأنه أدخل فى الأمن من النقل**،

اور جو احادیث سائل نے جذب القلوب اور سمہودیؒ سے نقل کی ہیں جن میں مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلیٰ میں عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے، ان کا مطلب بتقدیر صحت یہ ہے کہ میدانِ مصلیٰ میں کوئی شخص اپنا گھر نہ بناوے، بلکہ اس کو نمازِ عید کے واسطے وقف کر دینا ضروری ہے، کسی کو خاص اپنا قبضہ اس پر جمانا جائز نہیں

میں کہتا ہوں کہ اس مصلحت کے لیے بھی عیدگاہ کا پختہ بنادینا اولیٰ ہے تاکہ خالی زمین دیکھ کر کوئی شخص اس پر قبضہ نہ کر بیٹھے، کیونکہ آج کل زراعت کرنے والے وقف کی زمین کو بھی تھوڑی بہت اپنی زراعت میں داخل کرلیں گے پھر ان سے مقدمہ لڑنا اور زمین عیدگاہ کو ان کے قبضہ سے نکالنا دشوار ہے، غالبًا انہی مصلحتوں پر نظر کرکے متقدمین نے بناءِ عیدگاہ کو پسند کیا ہے، واللہ اعلم۔ (امدادالاحکام: ۱/۳۳۷، ط: دارالعلوم کراچی)۔

وفاءالوفاء میں مذکور حدیث کی تحقیق ملاحظہ ہو:

قال : وأخبرني أبوضمرة الليثي، (ثقة)، عن حمزة بن عبد الواحد (ثقة)، عن داود بن بكر (ثقة) عن جابر بن عبد الله رضي الله عنه، عن أنس بن مالك رضي الله عنه؛ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم خرج إلى المصلى ليستسقى، فبدأ بالخطبة، ثم صلى وكبر واحدة افتتح بها الصلاة، فقال: هذا مجمعنا ...الخ. (تاريخ المدينة لابن شبه، ص ۱۳۵، ط: دار الفكر).

اس روایت کی سند صحیح ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جگہ ہم نے عیدگاہ اور استسقاء وغیرہ کے لیے مخصوص کردی ہے لہٰذا کوئی شخص اس کو مباح سمجھ کر اپنی ضرورت کے لیے تعمیر نہ کرنے لگے۔ یہ جگہ کارِ خیر کے لیے استعمال کی جائے گی۔ فقہاء نے بوقتِ ضرورت تعمیر کی اجازت دی ہے۔ ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں ہے:

واختلف المشائخ في بنائه في الجبانة ، قيل: يكره وقيل: لا، فدل كلامهما على أنه خلاف في كراهة إخراجه إليها وإنما الخلاف في بنائه فيها ، ويمكن حمل الكراهة على التنزيهة وهي مرجع خلاف الأولى المفاد من كلمة لا بأس غالباً فلا مخالفة فافهم وفي الخلاصة عن خواهر زاده هذا أي بناءه حسن في زماننا. (فتاوى الشامي: ۲/ ۱۶۹، سعيد).

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی سہولت کے لیے مسقّف عیدگاہ بنانا جائز اور درست ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

جنازہ گاہ میں عید کی نماز پڑھنے سے عیدگاہ کی سنت کا حکم:

سوال: اگر جنازہ گاہ میں عید کی نماز پڑھی جائے تو عیدگاہ کی سنت ادا ہوجائے گی یا نہیں؟

الجواب: مسجد کو چھوڑ کر میدان میں عید کی نماز پڑھنا سنت ہے، اور عام طور پر جنازہ گاہ اور قبرستان شہر سے باہر مستقل الگ جگہ پر ہوتے ہیں، بنابریں جنازہ گاہ میں عید کی نماز پڑھنے سے عیدگاہ کی سنت ادا ہوجائے گی۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں نماز جنازہ کے لیے اور عیدین کے لیے مصلیٰ کا لفظ آتا ہے؛

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، نعى النجاشي في اليوم الذي مات فيه وخرج بهم إلى المصلى فصف بهم وكبر عليه أربع تكبيرات . (رواه البخاري، رقم: ۱۳۳۳).

...فلما قدمت أم عطية سألتها أسمعت النبي صلى الله عليه وسلم قالت: بأبي نعم وكانت لا تذكره إلا قالت: بأبي سمعته يقول: يخرج العواتق وذوات الخدور والحيض وليشهدن الخير ودعوة المؤمنين ويعتزل الحيض المصلى قالت حفصة : فقلت: الحيض فقالت: أليس تشهد عرفة وكذا وكذا . (رواه البخاري، رقم: ۳۲۴، باب شهود الحائض العيدين).

قال ابن دقيق العيد: وفيه اشارة إلى أن البروز إلى المصلى هو سنة العيد. (احكام الاحكام، ص ۲۳۳، باب العيدين). **قال العيني رحمه الله: المصلى؛ هو موضع صلاة العيد في الجبانة .** (عمدة القارى: ۱۱۶/۳، باب ترک الحائض الصوم، دارالحديث، ملتان).

الفتاوى الهندية میں مرقوم ہے: **الخروج إلى الجبانة في صلاة العيد سنة وإن كان يسعهم المسجد الجامع على هذا عامة المشايخ وهو الصحيح ، هكذا في المضمرات .** (الفتاوى الهندية: ۱۵۰/۱). (وهكذا في البحر الرائق: ۱۷۱/۲، والدرالمختار: ۱۶۹، سعيد، والمحيط البرهاني: ۱۰۰/۲، ومرقاة المفاتيح: ۳).

خیر الفتاویٰ میں مرقوم ہے: جنازہ گاہ میں اگر عید کی نماز پڑھی جائے تو نماز ہوجائے گی، جنازہ گاہ میں عید کی نماز ناجائز نہیں۔ (خیر الفتاویٰ: ۱۲۲/۳، ط: امدادیہ، ملتان)۔

ہاں اگر جنازہ گاہ قبرستان میں ہو اور سامنے نئی پرانی سب قبریں موجود ہوں تو وہاں عید کی نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے: جب قبرستان میں مردے دفن ہوتے ہیں اور وہاں قبریں نئی پرانی ہر قسم کی موجود ہیں تو وہاں نمازِ عید ادا نہ کی جائے... قبرستان میں نماز پڑھنے کی ممانعت حدیث وفقہ سے ثابت ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۴۱۱/۸، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب......(۳)

جنائز سے متعلق متفرق مسائل:

عورت کو غسل دیتے وقت جسم چھپانے کا حکم:

سوال: اگر میت عورت ہو تو غسل دیتے وقت اس کے کتنے جسم کو چھپانا ضروری ہے؟

الجواب: عورت کو غسل دیتے وقت ناف سے گھٹنوں تک چھپانا ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار میں منقول ہے: **و تستر عورته الغليظة فقط على الظاهر من الرواية و قيل مطلقاً الغليظة والخفيفة وصحح ، صححه الزيلعي وغيره ، ويغسلها تحت خرقة السترة بعد لف خرقة مثلها على يديه لحرمة اللمس كالنظر .**

وفى الشامية : قال في شرح المنية : إن الثاني هو المأخوذ به لقوله عليه الصلاة والسلام لعلي رضي الله عنه : لا تنظر إلى فخذ حي ولا ميت، لأن ما كان عورة لا يسقط بالموت ...

وفى الشرنبلالية : وهذا شامل للمرأة والرجل لأن عورة المرأة كالرجل للرجل . (فتاوى الشامي: ۱۹۵/۲، سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

و تستر عورته بخرقة من السرة إلى الركبة كذا في محيط السرخسي وهو الصحيح كذا فى المحيط . (الفتاوى الهندية: ۱۵۸/۱).

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے: عورت کو عورت سے اس قدر پردہ ہے جتنا مرد کو مرد سے، اس لیے عورت کو نہلاتے وقت صرف ناف سے زانو تک کپڑا ڈالنا کافی ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۴/ ۲۳۷، سعید)۔

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے: میت کا ستر ناف سے گھٹنے تک کسی کپڑے سے ڈھانک لیں یہی صحیح ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/ ۴۸۷، زوار اکیڈمی)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

قبر میں میت کا پورا بدن قبلہ کی طرف متوجہ کرنے کا حکم:

سوال: میت کو قبر میں دفن کرتے وقت پورے جسم کو قبلہ کی طرف گھمایا جائیگا یا فقط چہرہ قبلہ کی طرف کیا جائیگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: میت کے پورے جسم کو قبلہ کی طرف کرنا سنت ہے، پشت کی طرف سے مٹی کا سہارا دیکر قبلہ کی طرف کردیا جائے، صرف چہرہ قبلہ کی طرف کرنا اور جسم کو چت لٹانا خلافِ سنت ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن عبيد بن عمير عن أبيه وكانت له صحبة، أن رجلاً سأله فقال: يا رسول الله ماالكبائر؟ فقال: هن تسع ...وعقوق الوالدين المسلمين واستحلال البيت الحرام قبلتكم أحياء وأمواتاً. (رواه أبوداود، رقم: ۲۸۷۷).

حاشية الطحطاوي میں ہے:

قوله ويوجه إلى القبلة، وجوباً كما فى الدر أو استناناً كما في ابن أمير حاج عن الإمام فلو وضع لغير القبلة أو على يساره ثم تذكروا قال الإمام إن كان بعد تسريج اللبن قبل أن ينهال التراب عليه أزالوا ذلك ووجه إليها على يمينه وإن أهالوا التراب لاينبش القبر لأن ذلك سنة والنبش حرام. قوله بذلك أمر النبي صلى الله عليه وسلم علياً لما مات رجل من بني عبد المطلب فقال: يا علي استقبل به القبلة استقبالاً. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص ۶۰۹، ط: قديمي).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

سنت یہ ہے کہ میت کو قبر میں داہنی کروٹ پر قبلہ رولٹایا جائے اور اس میت کی پیٹھ کی طرف مٹی یا اس کے ڈھیلے سے تکیہ لگادیں تا کہ میت داہنی کروٹ پر قائم رہے پشت کی جانب لوٹ نہ جائے، چت لٹانے اور صرف منہ قبلہ کی طرف کرنے کا جو عام رواج ہوگیا ہے وہ سنتِ متوارثہ کے خلاف ہے۔ (عمدۃ الفقہ:۲/۵۳۱)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے جسدِ اطہر کو منتقل کرنے والی روایت کی تحقیق:

سوال: بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے نکلتے وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے جسدِ اطہر کو اپنے ساتھ لیا تھا، اور اس کی نشاندہی ایک بڑھیا نے کی تھی، اس روایت کی کیا حیثیت ہے؟ صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حدیث کی مختلف کتابوں میں یہ روایت منقول ہے، مثلاً: مستدرکِ حاکم، صحیح ابن حبان، مسند ابی یعلی اور المطالب العالیہ وغیرہ۔ شیخ حسین سلیم اسد نے مسند ابی یعلی کی تعلیقات میں اس حدیث کو حسن کہا ہے، امام حاکمؒ نے صحیح کہا ہے اور حافظ ذہبیؒ نے موافقت کی ہے، لیکن حافظ ابن کثیرؒ نے غریب جداً اور موقوف کہا ہے، اور المطالب العالیہ کے محقق نے بھی ضعیف کہا ہے۔

اس حدیث کے مرفوع طرق میں یونس بن ابی اسحاق ہے جس کو بعض ناقدین نے لین اور لا یحتج بہ کہا ہے، خصوصاً اس روایت میں درجِ ذیل خارجی قرائن ایسے ہیں جو اس روایت کو منکر قرار دیتے ہیں:

۱۔ کیا وہ بڑھیا اتنی معمر تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کو پایا تھا، اور اگر ایسا نہ ہو تو صرف اس کو قبر معلوم تھی اور کسی کو معلوم نہیں تھی یہ بہت بعید ہے، پھر اتنے اہم کام کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کا نہ آنا بھی قابلِ تعجب ہے۔

۲۔ اس روایت میں عظام کا لفظ سمجھ میں نہیں آتا، کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کے اجسام محفوظ ہوتے ہیں، اگرچہ عظام کبھی جسد کے معنی میں آتا ہے۔

۳۔حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے خروج کے وقت بہت عجلت میں تھے پھر قبر کی کھدائی میں مشغول ہونا اور جسدِ یوسفی کو نکالنا اور اس کو ساتھ لیکر گھومنا پھرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

۴۔پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام ۴۰ سال تک میدانِ تیہ میں رہے اور جسدِ اطہر کو حبرون جو شام اور آج کل اسرائیل کا حصہ ہے وہاں دفن کرانا تھا تو اتنی مدت جسم مبارک کو کہاں رکھا؟

۵۔محققین اس کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیتے ہیں، اگر موقوف ہے تو اسرائیلی روایت ہوگی۔

جسدِ اطہر منتقل کرنے والی حدیث ملاحظہ فرمائیں:

أخرج الحاكم بسنده عن يونس بن أبي إسحاق أنه تلا قول الله عزوجل ﴿ وأوحينا إلى موسى أن أسر بعبادي إنكم متبعون ﴾ الآيات ، فقال أبوبردة بن أبي موسىٰ الأشعرى عن أبيه قال: نزل رسول الله صلى الله عليه وسلم بأعرابي فأكرمه فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: تعهدنا ائتنا فأتاه الأعرابي فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما حاجتک؟ فقال: ناقة برحلها وبحر لبنها أهلي، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم عجز هذا أن يكون كعجوز بني إسرائيل فقال له أصحابه ما عجوز بني إسرائيل يارسول الله فقال: إن موسى حين أراد أن يسير ببني إسرائيل ضل عنه الطريق فقال لبني إسرائيل ما هذا قال: فقال له علماء بني إسرائيل: إن يوسف عليه السلام حين حضره الموت أخذ علينا موثقاً من الله أن لا نخرج من مصر حتى تنقل عظامه معنا فقال موسىٰ: أيكم يدري أين قبر يوسف ؟ فقال علماء بني إسرائيل ما يعلم أحد مكان قبره إلا عجوز لبني إسرائيل فأرسل إليها موسىٰ فقال دلينا على قبر يوسف قالت: لا والله حتى تعطيني حكمي فقال لها : ما حكمک ؟ قالت: حكمي أن أكون معک في الجنة فأنه كره ذلک قال: فقيل له أعطها حكمها فأعطاها حكمها... هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه .

(المستدرک: ۲/۴۰۵/۳۵۲۳،ط:دارالكتب العلمية بيروت).

محدثین کی آراء اور ناقدین کے اقوال ملاحظہ کیجیے:

قـال ابـن كثيـر : هـذا حديث غريب جداً ، والأقرب موقوف ، والله أعلم . (تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۵۶۰،ط:دار الکتاب العربی).

تفسیر ابن کثیر کے محشی ومحقق عبدالرزاق المہدی نے لکھا ہے:

الـراجـح وقـفـه . أخرجه أبويعلى وابن حبان والحاكم وقال: صحيح على شرطهما ، ووافـقـه الـذهبـي، وفـي ذلک نظر، فإن مداره على يونس بن أبي إسحاق السبيعي وهو من رجال مسلم، ولم يرو عنه البخاري في صحيحه، وإنما روى له في جزء القراء ة خلف الإمام ومـع ذلک فـقـد ضعفه غير واحد، جاء في الميزان (۹۹۱۴): قـال ابـن المهدي: لم يكن به بـأس، وقـال أبـوحـاتـم : صـدوق، لا يـحـتـج بـه ، وقال ابن خراش: لين ، وقال ابن حزم في الـمـحـلى: ضعفه يحيى القطان وأحمد ، قال الذهبي: قلت: هو صدوق ، ما في قوة شعبة و مسـعـر، قال يحيى بن سعيد: كان فيه غفلة ، وقال أحمد: حديثه مضطرب ، ووثقه أحمد في رواية ، بـاخـتـصـار وأعـدل هذه الأقوال قول أبي حاتم: هو صدوق، ولا يحتج به، وقد تفرد بهذا الحديث الغريب جداً ، كما قال ابن كثير، والله أعلم. (حاشیة تفسیر ابن کثیر: ۴/ ۵۶۰،بیروت).

وأخـرج ابن حبانؒ عن أبي يعلى عن محمد بن يزيد الرفاعي الخ . وقال الشيخ شعيب فـي تـعليقاته على ابن حبان: محمد بن يزيد الرفاعي، وإن خرج له مسلم مختلف فيه ، وقال فـي التـقـريب: ليس بالقوي، وقد توبع، ومن فوقه من رجال الصحيح...الخ. (التعلیقات علی صحیح ابن حبان: ۲/ ۵۰۱،ط:الرسالة).

قـال حسين سليم أسد في تعليقاته على مسند أبي يعلى: إسناده حسن . (التعلیقات علی مسند أبي یعلیٰ: ۱۳/ ۲۳۷/ ۷۲۵۴،مكتبة الرشد).

قـال فـي حـاشية المطالب العالية: هذا حديث إسناده ضعيف لضعف الرفاعي، إلا أنه قـد توبع كما سترى . (التـعـلـيـقـات عـلـى الـمطالب العالية للشيخ احمد بن محمد بن عبدالله بن حميد: ۱۴/ ۲۵۰، رقم: ۳۴۵۲،ط:دار العاصمة سعودية).

پھر اس کے متابعات اور شواہد ذکر کرکے آخر میں لکھا ہے: إلا أنــه شـاهـد جيـد يرقبـه إلى درجة

الصحیح لغیرہ. (التعلیقات علی المطالب: ۲۵۱/۱۴). واللہ ﷻ اعلم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر حضرت فاطمہؓ کے بعض مسجع کلمات کا حکم:

سوال: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کچھ مسجع کلمات پڑھے تھے؛ ان میں سے ایک یہ بھی ہے: **یا أبتاہ إلی جبریل ننعاہ**۔ کیا یہ اشعار ممنوع نوحہ میں آتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس وجہ سے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہ کلمات ممنوع نوحہ میں شامل نہیں ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ نوحہ کہتے ہیں؛ میت کے ایسے محاسن اور اوصاف شمار کر کے رونا، پیٹنا جو اس میں نہ ہوں، یا چیخ چیخ کر رونا جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہو، یا خوش آوازی سے رونا، یا تقدیر پر اشکال کرنا، یا رونے کے ساتھ چہرے پر مارنا اور کپڑے پھاڑنا وغیرہ، زمانہ جاہلیت کے طریقہ پر، یہ سب چیزیں ممنوع ہیں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کلمات میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

ملاحظہ ہو علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

ولا یقال: إنہ نوع من النیاحة لأن ھذا ندبة مباحة لیس فیھا ما یشبہ نوح الجاھلیة من الکذب ونحوہ. (عمدۃالقاری: ۳۷۲/۲۶، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ).

قال ابن حجرؒ: وإنہ لیس من النیاحة ...أن تلک الألفاظ إذا کان المیت متصفاً بھا لایمنع ذکرہ لھا بعد موتہ بخلاف ما إذا کانت فیہ ظاھراً وھو فی الباطن بخلافہ أو لا یتحقق اتصافہ بھا فیدخل فی المنع. (فتح الباری: ۱۴۹/۸، ط: دارالمعرفة بیروت).

قال ابن کثیرؒ: وھذا لا یعد نیاحة بل ھو من ذکر فضائل الحق علیہ أفضل الصلاة والسلام قال: وإنما قلنا ذلک لأن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن النیاحة. (السیرة الحلبیة: ۴۷۴/۳، دارالمعرفة، بیروت).

علامہ ابن قیم جوزیؒ عدۃ الصابرین میں لکھتے ہیں:

وأما الكلمة اليسيرة إذا كانت صدقاً لا على وجه النوح والتسخط فلا تحرم و لا تنافي الصبر الواجب نص عليه أحمد في مسنده من حديث أنس رضي الله عنه أن أبابكر رضي الله تعالىٰ عنه دخل على النبي صلى الله عليه وسلم بعد وفاته فوضع فمه بين عينيه ووضع يده على صدغيه وقال: وا نبياه وا خليلاه وا صفياه ، وفي صحيح البخارى عن أنس رضي الله عنه أيضاً قال: لما ثقل على النبي صلى الله عليه وسلم جعل يتغشاه الكرب فقالت فاطمة : وا كرب أبتاه فقال: ليس على أبيک كرب بعد اليوم، فلما مات قالت: يا أبتاه أجاب رباً دعاه يا أبتاه جنة الفردوس مأواه يا أبتاه إلى جبريل أنعاه فلما دفن قالت فاطمة : يا أنس أطابت أنفسكم أن تحثوا على رسول الله صلى الله عليه وسلم التراب ، وقال النبي صلى الله عليه وسلم: و إنا بک يا إبراهيم لمحزونون، وهذا ونحوه من القول الذي ليس فيه تظلم للمقدور و لا تسخط على الرب ولا إسخاط له فهو كمجرد البكاء . (عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين، ص ٨٦، ط:بيروت). مزید ملاحظہ ہو: (عمدۃ الفقہ :۲/۵۴۶)۔واللہ ﷻ اعلم۔

قبروں کے درمیان جوتوں سمیت چلنے کے بارے میں حدیث میں ممانعت کا حکم:

سوال: قبروں کے درمیان جوتوں سمیت چلنا جائز ہے یا نہیں؟ ایک حدیث سے ممانعت معلوم ہوتی ہے؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے صاف چمڑے کا جوتا پہننے والے اس کو اتاردو۔ جبکہ عام لوگ مقبرہ میں جوتوں سمیت چلتے ہیں تو کیا یہ حدیث کی مخالفت نہیں؟

الجواب: قبروں کے درمیان جوتوں کے ساتھ چلنا جائز ہے، ہاں بعض روایات میں مثلاً حدیثِ بشیر بن خصاصیہ کی روایت میں ممانعت وارد ہوئی ہے، علماء نے اس کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں ان میں سے دو اسباب زیادہ قرین قیاس ہیں؛ ا۔ اُس زمانہ میں بال صاف کیے ہوئے جوتے کم تھے، اکثر لوگ بال والے جوتے استعمال کرتے تھے، بال صاف کیے ہوئے جوتے خوش عیش اور متمول لوگ استعمال کرتے تھے، اور یہ تواضع کے خلاف تھے، بلکہ اُس زمانہ میں فیشن میں داخل تھے، اِس لیے اس کے ساتھ قبرستان میں جانا بہتر نہیں

تھا۔۲۔ان جوتوں میں گندگی تھی جس سے قبروں کے ملوث ہوجانے کا خطرہ تھا۔

ممانعت والی حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن بشير بن نهيک عن بشير بن الخصاصية قال: بينما أناْ أمشي مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا ابن الخصاصية ما تنقم على الله ؟ أصبحت تماشى رسول الله فقلت يارسول الله ما أنقم على الله شيئاً ،كل خير قد أتانيه الله ، فمر على مقابر المسلمين فقال: أدرک هؤلاء خيراً كثيراً ، ثم مر على مقابرالمشركين ، فقال: سبق هؤلاء خيراً كثيراً ، قال: فالتفت فرأى رجلاً يمشي بين المقابر في نعليه ، فقال: يا صاحب السبتيتين ألقهما . (رواه ابن ماجه، رقم:۱۵٦۸ ،دارالفكر، بيروت).

شراحِ حدیث نے اس حدیث کی مختلف توجیہات بیان فرمائی ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

قال العلامة العيني في عمدة القاري: باب الميت يسمع خفق نعالهم ...وفيه جواز لبس النعال لزائر القبورالماشي بين ظهرانيها وذهب أهل الظاهر إلى كراهة ذلک...وقال ابن حزم : ولا يحل لأحد أن يمشي بين القبور بنعلين سبتيتين وهما اللذان لا شعر عليهما فإن كان فيهما شعر جاز ذلک وإن كان في أحدهما شعر والآخر بلا شعر جاز المشي فيهما... و يخلع النعال إذا دخل المقابر وهذا مستحب احتج هؤلاء بحديث بشير بن الخصاصية ...

وقال الجمهور من العلماء بجواز ذلک وهو قول الحسن وابن سيرين والنخعي والثورى وأبي حنيفة ومالک والشافعي وجماهير الفقهاء من التابعين ومن بعدهم وأجيب عن حديث ابن الخصاصية بأنه إنما اعترض عليه بالخلع احتراماً للمقابر و قيل: لاختياله في مشيه .

وقال الطحاوي : إن أمره بالخلع لا لكون المشي بين القبور بالنعال مكروهاً ولكن لما رأى قذراً فيهما يقذر القبور أمر بالخلع وقال الخطابي: يشبه أن يكون إنما كره ذلک

لأنـه فـعـل أهـل الـنـعـمة والسعة فأحب أن يكون دخول المقبرة على التواضع والخشوع.
(عمدة القارى شرح صحيح البخارى: ۶/۲۰۲،دارالحديث ،ملتان).

وللمزيد راجع : (مرقاة المفاتيح :۸/۲۸۳،باب النعال،وفتح البارى : ۱۰/۳۰۹،والتمهيد : ۲۱/ ۷۴ ، وشرح ابى داود للعينى: ۶/۱۸۷ ،ط:الرياض،وكشف المشكل من حديث الصحيحين للعلامة ابن الجوزى: ۱/۸۳۲،ط:الرياض). واللہ ﷻ اعلم۔

میت کے غسل میں سر کا مسح اور انگلیوں کا خلال کرنے کا حکم:

سوال: میت کو غسل دیتے وقت انگلیوں اور ڈاڑھی کا خلال اور سر کا مسح سنت ہے یا نہیں؟ جس طرح زندہ کے وضو میں سنت ہے۔

الجواب: فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت پورا وضو کرایا جائے جیسا کہ نماز کے لیے ہوتا ہے، البتہ کلی اور ناک میں پانی نہیں ڈالا جائے گا، پانی نکالنا مشکل ہونے کی وجہ سے، ہاں تر روئی کو منہ اور ناک میں گھما دیں تو بہتر ہے تا کہ مضمضہ اور استنشاق کی سنت ادا ہو جائے اور منہ سے پانی نکالنے کی ضرورت بھی نہ پڑے، نیز سر کا مسح کرنا بہتر ہے اور ڈاڑھی اور انگلیوں کا خلال بھی کرنا چاہیے۔
ملاحظہ ہو الحجۃ علی اہل المدینہ میں مرقوم ہے:

قال أبوحنيفةؒ في غسل الميت يجرد ثيابه و يطرح على عورته خرقة ويوضع على تخت ويوضأ وضوء ه للصلاة ولا يمضمض ولا يستنشق ويغسل رأسه ولحيته بالخطمي .
(الحجة على اهل المدينة : ۱/۳۴۸،ط:عالم الكتب).

قال في الهندية : ثم يوضأ وضوء ه للصلاة...واختلفوا في مسح رأسه والصحيح أنه يمسح رأسه . (الفتاوى الهندية: ۱/۱۵۸). وكذا فى بدائع الصنائع: ۱/۳۰۰،سعيد،وفتح القدير: ۲/۷۲،دارالفكر).

عمدۃ الفقہ میں ہے: پھر میت کو نماز کا سا وضو کرا دیں لیکن اس وضو میں کلی نہ کرائیں اور نہ ناک میں پانی ڈالیں، اس لیے کہ پھر منہ اور ناک سے پانی نکالنا ناممکن یا دشوار ہوگا... پھر سر کا مسح یہی صحیح ہے اور یہی ظاہر

الروایت ہے۔ (عمدۃ الفقہ :۲/۴۸۸)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قریب المرگ کے لیے شہادتین کی تلقین کا حکم:

سوال: قریب المرگ کو کونسی شہادت کی تلقین کی جائے، کیونکہ فقہ کی کتابوں میں دونوں شہادتوں کا ذکر ہے اور احادیث میں فقط ایک کا ذکر آیا ہے؟

الجواب: احادیث اور فقہی عبارات میں کوئی تناقض نہیں بلکہ فقہی عبارات قرآن اور احادیث کی تشریح ہوتی ہیں، جس کو فقہاء اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں، چنانچہ دونوں شہادتوں کی تلقین کی جائے یعنی أشهد أن لا إلٰه الا اللّٰه کے ساتھ کبھی کبھی وأشهد أن محمداً رسول اللّٰه بھی ملا دیا جائے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه يقول: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لقنوا موتاكم: لا إلٰه إلا اللّٰه. وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لقنوا موتاكم: لا إلٰه إلا اللّٰه. (رواهما مسلم، رقم: ٩١٦، ٩١٧، باب تلقين الموتى: لا اله الا الله).

قال في البحر الرائق: قوله ولقن الشهادة، بأن يقال عنده لا إلٰه إلا اللّٰه، محمد رسول اللّٰه، ولا يؤمر بها للحديث الصحيح من كان آخر كلامه لا إلٰه إلا اللّٰه، دخل الجنة وهو تحريض على التلقين بها عند الموت فيفيد الاستحباب. (البحر الرائق: ٢/١٨٤، كتاب الجنائز، دار المعرفة).

فتاویٰ شامی میں مذکور ہے:

قوله بذكر الشهادتين، قال في الإمداد: وإنما اقتصرت على ذكر الشهادة تبعاً للحديث الصحيح وإن قال في المستصفى وغيره ولقن الشهادتين: لا إله إلا اللّٰه، محمد رسول اللّٰه، وتعليله في الدرر بأن الأولى لا تقبل بدون الثانية ليس على إطلاقه لأن ذلك في غير المومن و لهذا قال ابن حجر من الشافعية وقول جمع يلقن محمد رسول اللّٰه أيضاً

لأن القصد موته على الإسلام ولا يسمىٰ مسلماً إلا بهما مردود بأنه مسلم وإنما المراد ختم كلامه بلا إلٰه إلا اللّٰه ليحصل له ذلك الثواب ، أما الكافر فيلقنهما قطعاً مع لفظ أشهد لوجوبه إذ لا يصير مسلماً إلا بهما، قلت: وقد يشير إليه تعبير الهداية والوقاية والنقاية والكنز بتلقين الشهادة . (فتاوى الشامي: ۱۹۰/۲،سعيد).

و للاستزادة ينظر : (الجوهرة النيرة : ۱۲۳/۱، والهداية: ۹۰/۱، وبدائع الصنائع: ۲۹۹/۱،سعيد، و تبيين الحقائق : ۲۳۴/۱،امداديه،وفتاوى الشامي : ۱۹۱/۲،سعيد،وفتح القدير: ۱۰۴/۲،ط:دارالفكر،ومرقاة المفاتيح: ۱۲/۴).

عمدۃ الفقہ میں ہے: مستحب ہے کہ اس کوکلمہ شہادتین یا کلمہ طیبہ تلقین کریں،اور تلقین کا طریقہ یہ ہے کہ نزع (جانکنی کی حالت میں غرغرہ سے پہلے یعنی جب تک روح گلے میں نہ آئی ہو)اس کے پاس بلندآواز سے اس طرح پر کہ وہ سنتا ہوکلمہ شہادتین: اشہدان لا الہ الا اللہ، واشہدان محمداًرسول اللہ، یا کلمہ طیبہ: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، پڑھنا شروع کریں تا کہ وہ مریض اس کو سن کرخود بھی پڑھے۔(عمدۃ الفقہ :۴۸۲/۲)۔واللہ ﷻ اعلم۔

نمازِ جنازہ کے لیے اعلان کرنے کا حکم:

سوال: جنازہ کی نماز کے لیے اذان نہیں ہے تو کیا اس کے لیے اعلان کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ عام مسلمانوں میں اعلان کا رواج ہے کیا یہ صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: احادیث اور عباراتِ فقہاء کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ جنازہ کے لیے اعلان کرنا اور لوگوں کو جمع کرنا درست ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ نمازِ جنازہ میں شرکت کرسکیں۔حدیث شریف ملاحظہ ہو:

عن أبي هريرة ﷺ أن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم نعى النجاشي فى اليوم الذي مات فيه خرج إلى المصلىٰ فصف بهم وكبر أربعاً .. (رواه البخاري ، رقم: ۱۲۴۵،باب الرجل ينعى الى اهل الميت بنفسه).

علامہ عینیؒ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

فيه إباحة النعي وهو أن ينادي فى الناس أن فلاناً مات ليشهدوا جنازته...وقال شيخنا

زين الدين: إعلام أهل الميت وقرابته وأصدقائه استحسنه المحققون والأكثرون من أصحابنا وغيرهم وذكر صاحب الحاوي من أصحابنا وجهين في استحباب الإنذار بالميت وإشاعة موته بالنداء والإعلام فاستحب ذلک بعضهم للغريب والقريب لما فيه من كثرة المصلين عليه والداعين له...و ربما ورد في الصحيح أن النبي صلى الله عليه وسلم نعى للناس زيداً وجعفراً ...فهذه الأحاديث دالة على جواز النعي، وقال النووي: إن النعي المنهي عنه إنما هو نعي الجاهلية... وحمل بعضهم النهي على نعي الجاهلية المشتمل على ذكر المفاخر وشبهها. (عمدة القارى:٦/٢٦، ٢٧، ط:دارالحديث ،ملتان).

قوله وبالإعلام بموته أى إعلام بعضهم بعضاً ليقضوا حقه هداية ، وكره بعضهم أن ينادى عليه فى الأزقة والأسواق لأنه يشبه نعي الجاهلية والأصح أنه لايكره إذا لم يكن معه تنويه بذكره وتفخيم بل يقول العبد الفقير إلى الله تعالىٰ فلان بن فلان الفلاني فإن نعى الجاهلية ما كان فيه قصد الدوران مع الضجيج والنياحة وهوالمراد بدعوى الجاهلية فى قوله ليس منا من ضرب الخدود وشق الجيوب ودعا بدعوى الجاهلية ، شرح المنية. (فتاوى الشامى: ٢/ ٢٣٩،سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

نمازِ جنازہ میں امامت کا اولین حقدار امامِ راتب ہے:

سوال: آپ نے فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلد دوم میں لکھا ہے کہ نمازِ جنازہ کا حقدار امام الحی ہے پھر امام ابو یوسفؒ کا مذہب ذکر کیا ہے کہ اولیائے میت زیادہ حقدار ہیں، اب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ فی زمانناکس قول کو اختیار کیا جائے گا، نیز اس بارے میں صحابہ کرام اور سلفِ صالحین کے زمانہ میں کیا تعامل تھا، برائے کرم اگر کتبِ حدیث میں منقول ہو تو ذکر فرمائیں۔ بینوابالبرہان توجرواعندالرحمٰن۔

الجواب: مذہبِ احناف میں ظاہر الروایہ کے مطابق نمازِ جنازہ کا اولین حقدار امام المسلمین یا قاضی کی عدمِ موجودگی میں امامِ راتب ہے، اور یہ بات صحابہ کرام اور تابعین کے تعامل سے ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو:

أخرج الحاكم في مستدركه (۹۲/۲،رقم: ۴۵۱۷)، بسنده عن هشام بن عروة عن أبيه قال: لما قتل عمر رضي الله عنه ابتدر علي رضي الله عنه وعثمان رضي الله عنه للصلاة عليه فقال لهما صهيب: إليكما عني فقد وليت من أمركما أكثر من الصلاة على عمر وأناْ أصلي بكم المكتوبة فصلى عليه صهيب. اِس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جنازہ حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پڑھایا، حالانکہ اکابر صحابہ جیسے حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما موجود تھے اور وہ پڑھانا بھی چاہتے تھے لیکن چونکہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ امام راتب تھے اس لیے انہوں نے پڑھایا۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس روایت کے تحت فرماتے ہیں:

فدل الأثر على أن إمام المسجد أحق بالصلاة على الميت إذا لم يحضر الوالى بدليل قوله:" قد وليت من أمركما ما هو أكثر من الصلاة على عمر رضي اللّٰه تعالىٰ عنه، وأناْ أصلي بكم المكتوبة " فإنه مشعر بأن سبب تقدمه إنما هو كونه يصلي بهم المكتوبة، وفيه دلالة على تقدم إمام الحي على الأولياء، لعدم ما يفيد استيذان صهيب رضي الله عنه إياهم.

قال في " البدائع " وأما بيان من له ولاية الصلاة على الميت، فذكر في الأصل أن إمام الحي أحق بالصلاة على الميت، وروى الحسن عن أبي حنيفةؒ أن الإمام الأعظم أحق بالصلاة إن حضر، فإن لم يحضر فأمير المصر، وإن لم يحضر فإمام الحي، فإن لم يحضر فالأقرب من ذوى قراباته، وهذا هو حاصل المذهب عندنا.

وأما تقدم إمام الحي على غير الوالي، فقد ثبت بأثر صهيب رضي الله عنه، وأقره عليه الخليفتان عليٌّ وعثمانؓ، ولم ينكرا عليه، ولا أحد من الصحابة الذين حضروا الصلاة على سيدنا عمر رضى اللّٰه تعالىٰ عنه وهم لا يحصى عددهم، فكان كإجماع منهم على أن إمام المكتوبة أولى بالصلاة على الميت من غيره من الأولياء وأولى الفضل إذا لم يحضر الوالى واللّٰه تعالىٰ أعلم، وبه قال النخعي. (اعلاء السنن: ۲۵۱/۸،۲۵۳،ادارۃ القرآن).

مصنف ابن ابی شیبہ میں چند آثار منقول ہیں:

عن الحكم ، عن علي قال: الإمام أحق من صلى على الجنازة .

وعن منصور، قال: ذهبت مع إبراهيم إلى جنازة هو وليها ، فأرسل إلى إمام الحي فصلى عليها .

حدثنا حفص، عن عمه غنام بن طلق قال: شهد أبوبردة مولاة له فأمر إمام الحي فتقدم عليها،

وعن محمد بن السائب قال: توفيت ابنة إبراهيم التيمي فشهد إبراهيم النخعي جنازتها ، فأمر إبراهيم النخعي إمام التيم أن يصلى عليها وقال: هو السنة .

وعن سفيان، عن مسلم قال: رأيت عبدالرحمن بن أبي ليلى قدم عبد اللّٰه بن حكيم على أمه ، وكان إمام الحي .

وعن إبراهيم بن عبد الأعلى ، عن سويد بن غفلة قال: الإمام أحق .

وعن جابر ، عن عامر ، عن جرير قال: يتقدم الإمام .

وعن منصور ، عن إبراهيم قال: كنت أقدم الأسود على الجنازة ، قال إبراهيم: وكان إمامهم .

وعن سفيان ، عن جابر ، عن سالم والقاسم وطاؤوس ومجاهد وعطاء: إنهم كانوا يقدمون الإمام على الجنازة .

وعن حفص بن غياث ، عن عمه ، قال: شهدت طلحة وزبيداً وقد ماتت امراة ذات قرابة لهم ، فقدموا إمام الحي .

عن منصور ، عن إبراهيم قال: كانوا يقدمون الائمة على جنائزهم .

وعن إسرائيل، عن جابر، عن عبد الرحمن بن الأسود وعلقمة قالا: يتقدم الإمام .

(مصنف ابن ابی شیبة: ۷/ ۲۳۰ . ۲۳۲،ط: المجلس العلمی).

مسند علی بن الجعد میں ہے:

حدثنا علی أنا شعبة قال: سألت الحكم عن امراة ماتت وتركت زوجها وأخاها قال:

الأخ أحق بالصلاة قال: وسألت حماداً فقال: كان إبراهيم يقول: إمام الحي أحق بالصلاة. (مسند علی بن الجعد، رقم؛ ۲۶۹).

قال الإمام محمدؒ فی المبسوط: قلت: أرأيت الصلاة على الميت من أحق بها قال: إمام الحي أحق بالصلاة عليه. (المبسوط للإمام محمد بن الحسن: ۱/۴۲۳،ط: ادارة القرآن).

امام طحاویؒ فرماتے ہیں: **قال أبوحنيفةؒ: إمام الحي أحق بالصلاة على الميت.** (مختصر اختلاف العلماء: ۱/۱۶۸). **واللہ ﷻ اعلم۔**

حرمین میں نمازِ جنازہ میں عورتوں کی شرکت کا حکم:

سوال: حرمین شریفین میں عورتیں طواف یا کسی اورغرض سے گئی تھیں، اورفرض نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، اس کے بعد متصلاً جنازہ کی نماز شروع ہوئی تو عورتیں شرکت کرسکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب: عام حالات میں نمازِ جنازہ میں عورتوں کی شرکت کوفقہاء نے مکروہ لکھا ہے، لیکن حرمین شریفین میں عورتیں جنازہ میں شرکت کے لیے نہیں گئی تھیں بلکہ پہلے سے موجود تھیں اس لیے حرمین میں ان کی شرکت کی گنجائش ہے۔ ہاں اگر کوئی شریک نہ ہو اور اپنی جگہ بیٹھی رہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔

نجم الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

عورتیں نمازِ جنازہ میں فتنے کی وجہ سے شرکت نہیں کرسکتیں البتہ اگر ساتھ کھڑی ہوگئیں تو نماز درست ہوجائے گی۔ **لما فی البحر الرائق** (۲/۱۸۰) **وأما ما يفسدها فما أفسدها إلا المحاذاة ...**

وفی الجوهرة (۱/۱۳۰): **وإن قامت امرأة إلى جانب رجل لم تفسد عليه صلاته.**

وفي حاشية الطحطاوي على مراقی الفلاح (ص۳۰۴) **: ولا يحضرن الجماعات لما فيه من الفتنة، لقوله صلى الله عليه وسلم: صلاة المرأة في بيتها أفضل من صلاتها في حجرتها وصلاتها في مخدعها أفضل من صلاتها في بيتها، فالأفضل ما كان أستر لها لا فرق بين الفرائض وغيرها كالتراويح ...**

و فـي الدرالمختار (۱/۵٦٦): **ويكره حضورهن الجماعة ، ولو لجمعة وعيد ووعظ مطلقاً ولو عجوزاً ليلاً على المذهب المفتى به لفساد الزمان ، استثنى الكمال بحثاً العجائز المتفانية .**

وفي الشامية (۱/۵٦٦) : **قوله على المذهب المفتى به ، أى مذهب المتأخرين، قال في البحر : وقد يقال هذه الفتوى التي اعتمدها المتأخرون...وفيه نظر، بل هو مأخوذ من قول الإمام وذلک أنه إنما منعها لقيام الحامل وهو فرط الشهوة بناء على أن الفسقة لاينتشرون في المغرب...** (ماخوذ من نجم الفتاویٰ، ازمفتی نجم الحسن امروہی: ۲/ ۷۰۴،دارالعلوم یاسین القرآن).

آپ کے مسائل اوران کا حل میں ہے:

اگر جماعت کے پیچھے کھڑی ہوجائیں تو نماز ان کی بھی ہوجائے گی ۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل:۴/ ۳۹۷)۔

حدیث میں ہے جب ابوطلحہؓ کے بیٹے کا انتقال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے لیے مدعو فرمایا،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی،اس نماز میں حضرت ام سلیمؓ نے بھی شرکت کی تھی۔حدیث ملاحظہ ہو:

أن أباطلحةؓ دعا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إلى عميربن أبي طلحة حين توفي فأتاهم رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فصلى عليه في منزلهم فتقدم رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وكان أبوطلحةؓ وراء ه وأم سليمؓ وراء ابى طلحةؓ ولم يكن معهم غيرهم ، هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه ،وسنة غريبة في إباحة صلاة النساء على الجنائز. (المستدرک للحاکم : ۱/ ۳٦۴/ ۱۳۵۰). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

حرمِ مکی میں جنازہ اورامام پر مقتدیوں کے آگے بڑھنے سے نماز کا حکم:

سوال: آج کل حرمِ مکی میں میت کو بالکل پیچھے رکھا جاتا ہے،یعنی امام صاحب فرض پڑھا کر پیچھے جنازوں کے پاس چلے جاتے ہیں اور وہاں سے نماز جنازہ پڑھاتے ہیں لیکن مقتدیوں کی کثیر تعداد میت کے آگے ہوتی ہے،تو کیا حنفیوں کی نمازِ جنازہ صحیح ہوگی یا نہیں؟ جبکہ احناف کے نزدیک میت کا مقدم ہونا شرط ہے،

اگر صحیح نہیں تو پھر حرمِ مکی میں اقتدا کا کیا فائدہ ہوگا؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: بعد تحقیق کے یہ بات واضح ہوئی کہ امام صاحب فرض پڑھا کر جنازہ کے قریب آجاتے ہیں اور وہاں سے نماز پڑھاتے ہیں، اور مقتدی اپنی جگہ سے نماز پڑھتے ہیں، لہٰذا جب جنازہ امام صاحب کے سامنے ہوتا ہے تو اب جو مقتدی حضرات جہتِ امام میں امام سے آگے ہوں گے ان کی نمازِ جنازہ درست نہ ہوگی، باقی مقتدی جو دوسری جہت میں ہوں گے ان کی نماز درست ہوجائے گی، جیسا فرض نماز کا مسئلہ ہے، اس لئے مقتدیوں کو چاہئے کہ جہتِ امام سے ہٹ جائیں، اب یا تو دوسری جہت میں چلے جائیں یا امام کے پیچھے جا کر اقتدا کرلیں، جہتِ امام میں امام سے آگے کھڑے مقتدیوں کی نماز درست نہ ہوگی۔ نیز حنابلہ کے یہاں بھی جہت امام میں امام سے مقدم مقتدی کی نماز درست نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو فتاوی شامی میں ہے:

قوله (إن لم يكن في جانبه) أما إذا كان أقرب إليها من الإمام بأن كان متقدماً على الإمام بحذاء ه فيكون ظهره إلى وجه الإمام أو كان على يمين الإمام أو يساره متقدماً عليه من تلك الجهة ويكون ظهره الذى مع الإمام ووجهه إلى الكعبة فلا يصح اقتداؤه لأنه إذا كان متقدماً عليه لا يكون تابعاً له. قوله (لتأخره حكماً) علة لصحة صلاة الأقرب إليها من إمامه إن لم يكن في جانب الإمام لأن التقدم إنما يظهر عند اتحاد الجهة فإذا لم تتحد لم يتحقق تقدمه على إمامه والمانع من صحة الإقتداء هو التقدم ولم يوجد وبما قررناه ظهر أن الأولى فى التعليل أن يقول لعدم تقدمه لأن صحة الإقتداء لاتتوقف على التأخر بل تكون مع المساواة كما مر. (فتاوى الشامى: ۲/۲۵۵، سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وإذا صلى الإمام فى المسجد الحرام وتحلق الناس حول الكعبة وصلوا صلاة الإمام فمن كان منهم أقرب إلى الكعبة من الإمام جازت صلاته إذا لم يكن فى جانب الإمام. (الفتاوى الهندية: ۱/۶۵).

نیز حنابلہ کے یہاں بھی جہتِ امام میں مقتدی امام سے آگے بڑھ جائے تو نماز درست نہ ہوگی۔ ملاحظہ فرمائیں:

(هـو في غير جهته) بأن كان المأموم أقرب إلى الكعبة من الإمام في الجهة التي عن يـمينه أو شماله أو مقابلة الجهة التي يصلى الإمام إليها بدليل قوله : (ولو لم يكن) المأموم متـقـدمـا (في الجهة المقابلة للإمام) أي الجهة التي بين يديه. أما إذا تقدم المأموم عليه فيها فلا تصح صلاته لتحقق التقدم بخلاف تقدمه في الجهة المقابلة ...

فتـصح صلاته في الجهات الثلاث ولو كان إلى الكعبة أقرب من الإمام لأنه لم يتحقق تـقدمه عليه. (مطالب اولي النهي: ج ١ ص ٣٨٦ ط المكتب الاسلامي دمشق، كذا في شرح زاد المستقنع للشنقيطي: ١٧/٦٢). واللہ ﷻ اعلم۔

میت کوایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم:

سوال: کیا میت کوایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں یانہیں؟

الجواب: افضل اور بہتر یہ ہے کہ جس جگہ انتقال ہوا سی جگہ دفن کر دیا جائے، ہاں ایک دو میل منتقل کرنا جائز ہے، البتہ اس سے زیادہ مسافت پر منتقل کرنے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے، کیونکہ اس میں مقصدِ شریعت فوت ہوجاتا ہے کہ میت کی تجہیز وتکفین میں حتی الوسع عجلت مطلوب ہے اور منتقل کرنے میں قانونی کاروائی کی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے اور میت کا ادب واحترام بھی برقرار نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قـولـه يـنـدب دفـنه في جهة موته أي في مقابر أهل المكان الذي مات فيه أو قتل وإن نـقـل قـدر ميـل أو ميـليـن فـلا بـأس شرح المنية ، قلت: ولذا صح أمره بدفن قتلى أحد في مـضـاجـعهم مع أن مقبرة المدينة قريبة ولذا دفنت الصحابة الذين فتحوا دمشق عند أبوابها ولم يدفنوا كلهم في محل واحد ...

وقيـده محمد بقدر ميل أو ميلين لأن مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد. (فتاوى الشامي: ٢/ ٢٣٩، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (مراقي الفلاح ، ص ٦١٣، والفتاوى الهندية: ١/ ١٦٧، وفتح القدير: ٢/ ١٠١، والفتاوى

التاتارخانية : ۲/۱۷۵، والبحر الرائق: ۲/۱۹۵).

فتاویٰ رحیمیہ میں مرقوم ہے:

مستحب اور افضل طریقہ یہی ہے کہ انسان کا جہاں انتقال ہوا ہو وہیں اس کو دفن کیا جائے چاہے اس کا انتقال وطن میں ہوا ہو یا وطن سے باہر کسی اور جگہ، دفن کرنے سے قبل منتقل کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے، میل دو میل منتقل کرنا تو بالاتفاق جائز ہے، دو میل سے زیادہ منتقل کرنے کو اکثر فقہاء نے مکروہ لکھا ہے، اور صاحبِ نہر نے اسے بحوالہ عقد الفرائد ہو الظاہر (ظاہری روایت) کہا ہے، شامی نے اسے نقل کیا ہے، بعض فقہاء مادون السفر اور بعض مطلقاً جواز کے قائل ہیں، مگر افضل منتقل نہ کرنا ہے، بہ چند وجوہ:

۱۔ منتقل کرنے کی وجہ سے تجہیز و تکفین میں تاخیر ہوتی ہے، حالانکہ اس میں عجلت مطلوب ہے۔

۲۔ گاہے میت کے بدن میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔۔۔ منتقل کرنا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا، قانونی رکاوٹیں سامنے آتی ہیں، اور تاخیر ہو جاتی ہے۔

۳۔ منتقل کرنے میں میت کی بے حرمتی کا بھی زیادہ امکان ہے، ضرورت سے زیادہ میت کو حرکت ہوتی ہے اور بسا اوقات لاش کو برف پر رکھا جاتا ہے جو بجائے خود میت کے لیے تکلیف کا سبب ہے اور میت کو تکلیف دینا ممنوع ہے۔۔۔

۴۔ چونکہ بلاضرورتِ شرعی منتقل کرنا غیر ضروری بلکہ مکروہ ہے اس لیے منتقل کرنے کے اخراجات اور مصارف تجہیز و تکفین میں محسوب نہ ہوں گے۔۔۔ الخ۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۳/۴۸۵، ط: دیوبند)۔

مزید ملاحظہ ہو: (احسن الفتاویٰ: ۴/۲۰۸، وآپ کے مسائل اور ان کا حل: ۴/۳۱۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قبر میں سوالات کے لیے آنے والے منکر نکیر، دو افراد کا نام ہے یا ایک جماعت کا؟

سوال: قبر میں مردہ کے پاس منکر نکیر آتے ہیں اور سوالات کرتے ہیں، کیا وہ دو افراد سب کے پاس جاتے ہیں یا ان کی ایک جماعت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: جس طرح ملک الموت کے ماتحت بہت سارے فرشتے ہوتے ہیں جو روح قبض کرتے ہیں

اسی طرح منکر نکیر کے ماتحت بھی بے شمار فرشتے ہیں، ان میں سے دو فرشتے ہر شخص کے پاس جاتے ہیں اور سوالات کرتے ہیں۔ البتہ بعض علماء کے نزدیک فقط دو ہی سوالات کے لیے جاتے ہیں۔

ملاحظہ ہو مرقات میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

ثـم ذكـر فـى الأزهار فإن قيل: كيف يكلم الملكان جميع المكلفين وكيف يسألانهم فـي وقـت واحـد مع كثرتهم فى الآفاق والأطراف وبعد المسافة شرقاً وغرباً وأى فائدة من سـؤال اثـنيـن مـن واحـد قيـل: يكون لهما أعوان كما لملك الموت وقيل: جميع الأرض مـكشـوف لهما وفي نظرهما كما لملك الموت...ويمكن أن يقال: حكمة الاثنين لأنهما بـمـنزلة الشاهدين أو عوض الملكين الكاتبين، والله أعلم. (مرقاة المفاتيح: ۱/۲۰۰، امداديه، ملتان).

الحبائك في أخبار الملائك میں علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں:

مسألة: قال القرطبي فى التذكره: قيل كيف يخاطب منكر ونكير جميع الموتى فى الأمـاكـن الـمتبـاعـدة فى الوقت الواحد؟ فالجواب: أن عظم جثتهما يقتضي ذلك، فيخاطبان الخلق الكثير فى الجهة الواحدة فى المرة الواحدة مخاطبة واحدة، بحيث يخيل لـكـل واحـد مـن المخاطبين أنه المخاطب دون من سواه ويمنعه الله من سماع جواب بقية الـموتى، انتهى، وقال الحليمى فى المنهاج: والذي يشبه أن يكون ملائكة السؤال جماعة كثيـرة يسمى بعضهم منكراً و بعضهم نكيراً، فيبعث إلى كل ميت اثنان منهم كما كان الموكل عليه لكتابة أعماله ملكين، انتهى. (الحبائك فى اخبار الملائک، ص ۱۳۷).

شیخ احمد بن محمد مالکی صاوی اپنی کتاب شرح الصاوی علی جوہرۃ التوحید میں لکھتے ہیں:

ويسـأل كـل إنسـان بـلـغتـه ويـجـمـع من تفرقت أجزاءه أو أكلته السباع، وأحوال الـمسلمين مختلفة، فمنهم من يسأله الملكان جميعاً، ومنهم من يسأله أحدهما، وإذا مات جـمـاعة فـي وقـت واحد بأقاليم مختلفة سئلوا جميعاً في ذلك الوقت ولا مانع من ذلك،

وقال السيوطی : يحتمل تعدد الملائكة المعدة لذلک كالحقيقة ونحوهم . (شرح الصاوی على جوهرة التوحيد، ص ۳۷۰).

عمدۃ الفقہ میں حضرت مولانا سید زوار حسین صاحب فرماتے ہیں:

منکر نکیر فرشتوں کی ایک جماعت ہے جن کی تعداد بے شمار ہے اور ان میں سے دو فرشتے ہر شخص کے پاس جاتے ہیں۔ (عمدۃ الفقہ: ۱/۳۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایصالِ ثواب کرنے والے کو ثواب ملنے کا حکم:

سوال: ایک صاحب کہتے ہیں کہ جو ہم ایصالِ ثواب کرتے ہیں، تو مرحومین کو باذن اللہ ثواب پہنچ جاتا ہے، کیا اس میں ہمارے لیے کوئی فائدہ ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجروا بالاجر الجزیل۔

الجواب: احادیث اور فقہی عبارات کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ ایصالِ ثواب کرنے والے کو بھی پورا پورا ثواب ملتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: جب آدمی کسی کے لیے غائبانہ دعا کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں آپ کو بھی اللہ تعالیٰ اپنی بخشش سے نوازے، نیز دوسری حدیث میں ہے: جو شخص اچھے عمل کی ترویج کرتا ہے تو اس کو اس کا پورا اجر ملتا ہے اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اجر ملتا ہے اور عاملین کے اجر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اسی طرح حضرت تھانویؒ نے لکھا کہ دنیوی اشیاء دوسری جگہ منتقل ہونے کے بعد پہلی جگہ نہیں رہتیں، لیکن ثواب کی چیزیں منتقل ہونے کے بعد بھی پہلی جگہ رہ جاتی ہیں، جیسے کمپیوٹر سے پروگرام منتقل کرنے کے بعد بھی کمپیوٹر میں پروگرام رہتا ہے۔ دلائل اور شواہد ملاحظہ کیجیے:

عن المنذر بن جرير عن أبيه قال: كنا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم في صدر النهار قال: فجاء ه قوم حفاة وعراة مجتابی النمار أو العباء متقلدی السيوف...إلى قوله: حتى رأيت وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتهلل كأنه مذهبة ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من سن فی الإسلام سنة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها بعده من غير أن ينقص من أجورهم شيء ... (رواه مسلم، رقم: ۱۰۱۷).

عن زيد بن خالد الجهني عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم،قال: من جهز غازياً في سبيل اللّٰه أو خلفه في أهله كتب له مثل أجره غير أنه لا ينقص من أجره شيء و من فطر صائماً كتب له مثل أجره لا ينقص من أجره شيء. (صحيح ابن حبان،رقم: ۴۶۳۳).

قال الشيخ شعيب: إسناده صحيح رجاله ثقات رجال الصحيح .

عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها قالت: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، إذا أنفقت وقال ابن نمير: إذا أطعمت المرأة من بيت زوجها وقال أبومعاوية : إذا أنفقت المرأة من بيت زوجها غير مفسدة كان لها أجرها وله مثل ذلک بما كسب ولها بما أنفقت و للخازن مثل ذلک قال أبومعاوية : من غير أن ينقص من أجورهم شيء . (مسند الإمام أحمد، رقم: ۲۴۱۷۱).

عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من مر على المقابر وقرأ : قل هو اللّٰه أحد، إحدى عشرة مرة ثم وهب أجره للأموات أعطى من الأجر بعدد الأموات. (من فضائل سورة الاخلاص ومالقارئها،ص۱۰۲،رقم:۵۴).

اس روایت پر علماء نے بہت کلام فرمایا ہے،خلاصہ یہ ہے کہ ضعیف ہے موضوع نہیں ہے۔
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:(فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۱/ ۵۳۹۔۵۴۲،ط:بمبئی)۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

صرح علماؤنا في باب الحج عن الغير بأن للإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره صلاة أو صوماً أو صدقة أو غيرها كذا فى الهداية بل في زكاة التاترخانية عن المحيط : الأفضل لمن يتصدق نفلاً أن ينوي لجميع المؤمنين والمؤمنات لأنها تصل إليهم ولا ينقص من أجره شيء هو مذهب أهل السنة والجماعة . (فتاوى الشامي: ۲/ ۲۴۳،سعيد).

امدادالفتاویٰ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ رقمطراز ہیں:

في شرحِ الصدور بتخريج الطبراني عن أبي عمروقال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه

علیہ وسلم : إذا تصدق أحدکم صدقة تطوعاً فلیجعلها عن أبویه فیکون لهما أجرها ولاینقص من أجره شیئاً ، یہ حدیث نص ہے اس میں کہ ثواب بخش دینے کے بعد بھی عامل کے پاس پورا ثواب رہتا ہے اور صحیح مسلم کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، **من سن سنة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها من غیر أن ینقص من أجره شیئاً أو کما قال** ، وجہ تائید ظاہر ہے کہ دوسرے شخص کی طرف تعدیہ ثواب سے بھی عامل کا ثواب کم نہیں ہوتا اتنا فرق ہے کہ حدیث طبرانی میں تعدیہ بالقصد اور حدیث مسلم میں بلاقصد سو یہ فرق حکم مقصود میں کچھ مؤثر نہیں اور فقہاء نے بھی ان روایات کے مدلول کو بلاتاویل متلقی بالقبول کیا ہے، **کما فی رد المحتار عن زکاة التاتر خانیة ...** اور راز اس میں احقر کے ذوق میں یہ ہے کہ معانی میں توسع اس قدر ہے کہ تعدیہ الی المحل الآخر سے بھی محل اول سے زوال نہیں ہوتا، چنانچہ تعدیہ علوم وفیوض میں مشاہد ہے بخلاف اعیان کے کہ وہاں ایسا نہیں بلکہ ہبہ کرنے کے بعد شئی موہوب واہب کے پاس نہیں رہتی۔

(امداد الفتاویٰ:۱/۵۹۳)۔　مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ رحیمیہ:۳/۵۸۵، ط: دیوبند)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اجتماعی قرآن خوانی سے متعلق مختصر اور جامع خلاصہ:

سوال: مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے لوگ جمع ہو کر تلاوت کرتے ہیں، اس کے بارے میں بہت کچھ سنا، پڑھا اور لکھا گیا ہے، آپ مختصر اور جامع خلاصہ بتلادیں، تاکہ سمجھ میں آجائے اور شرکت کرنے نہ کرنے میں آسانی ہو جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مرحوم کے حق میں ایصالِ ثواب کے بارے میں فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی آٹھویں جلد میں تفصیل سے دلائل لکھے گئے ہیں، بس مختصر اور خلاصہ یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی بہ چند شرائط جائز اور درست ہے:

۱۔ اس کو لازم اور ضروری نہ سمجھا جائے۔

۲۔ قرآن خوانی کرنے والوں کو رقم وغیرہ نہ دی جائے۔ نہ اس کے عوض کھانا کھلایا جائے۔

۳۔ فخر، ریا اور شہرت مطلوب نہ ہو۔

۴۔سوئم، چہلم اور برسی وغیرہ کے طور پر نہ ہو۔

۵۔مردوں اور عورتوں کا خلط و اختلاط نہ ہو۔

اگران شرائط کی پابندی کرتے ہوئے قرآن خوانی کا اجتماع ہو تو جائز ہے،لیکن بہتر یہ ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی میں آہستہ تلاوت کی جائے تا کہ دوسرے کی تلاوت میں حرج نہ ہو، نیز بعض علماء کے نزدیک جہری قراءت کا سننا واجب ہوجاتا ہے اگرچہ اکثر حضرات کے نزدیک واجب نہیں ہے۔ ایک حدیث سے بھی اجتماعی تلاوت کی اجازت کی طرف اشارہ ملتا ہے:

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:... ”وما اجتمع قوم في بيت من بيوت الله تعالىٰ يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم إلا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم الملائكة وذكرهم الله فيمن عنده... (رواه مسلم، رقم: ۲۶۹۹، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر).

خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں کچھ لوگ جمع ہوکر قرآن پڑھتے ہیں اور آپس میں تکرار کرتے ہیں،توان پر سکینہ نازل ہوتی ہے اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں،اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے مجمع میں ان کا تذکرہ فرماتے ہیں۔

ہاں بہتر اور مناسب یہ ہے کہ اجتماعی تلاوت میں آہستہ پڑھا جائے اور زور زور سے پڑھنے سے احتراز کیا جائے، پھر اگر قرآن پڑھنا دعا کے لیے ہو تو فقہاء کی عبارات سے جمع ہونے کا جواز نکلتا ہے، عالمگیری میں ہے: **قوم يجتمعون ويقرءون الفاتحة جهراً دعاء لا يمنعون عادة والأولى المخافتة .** (الفتاوى الهندية: ۵/۳۱۷).

اگر مذکورہ بالا شرائط ملحوظ ہوں تو آپ قرآن خوانی میں شرکت فرمائیں، ورنہ کوئی عذر کرلیا کریں۔

واللہ ﷻ اعلم۔

دار العلوم دیوبند اور سہارنپور میں کسی بزرگ کے انتقال پر قرآن خوانی کا انتظام:

سوال: کیا دار العلوم دیوبند اور دار العلوم سہارنپور میں زمانہ قدیم سے کسی بزرگ کے انتقال پر طلبہ کو

جمع کر کے ایصالِ ثواب کا انتظام واہتمام ہوتا تھا یا نہیں؟

الجواب: دارالعلوم دیوبنداوردارالعلوم سہارنپور میں عام طور پر بڑے علماء کے تعزیتی جلسے اورخراجِ تحسین کارواج جاری ہے، نیز تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں قرآن خوانی اورایصالِ ثواب کا اہتمام ہوا۔درجِ ذیل چندواقعات ملاحظہ کیجیے:

۱۔مولانامحمداحمد تھانویؒ جن کاتعلق قصبہ تھانہ بھون ظلع مظفرنگر سے تھا،ابھی ان کی عمرایک سال ہی کی تھی کہ ان کے والد کاانتقال ہوگیا،ہوش سنبھالنے کے بعدحکیم الامت مولانااشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں خانقاہ امدادیہ کے مدرسہ اشرفیہ میں آپ کاداخلہ کردیا گیا،ان کی سوانح میں مرقوم ہے کہ جب ان کاانتقال ہواتودینی مدارس ودینی انجمنوں نےقرآن خوانی اورایصالِ ثواب کااہتمام کیا۔(اکابر دیوبند،ص ۳۱۷)۔

۲۔حافظ محمد احمدؒ جوکہ مولانانانوتویؒ کے فرزندرشید تھے ۴۵ سال دارالعلوم میں خدمت انجام دی،جن میں سے ۳۵ سال اہتمام کے فرائض انجام دئے،ان کی سوانح میں مذکور ہے کہ ان کی وفات کودارالعلوم اور مسلمانوں کازبردست نقصان تصور کیا گیا،اور ہندوستان کے طول وعرض میں دیوبندی اورغیردیوبندی مکاتبِ فکر میں ایصالِ ثواب کے بےشماراجتماعات منعقد کیے گئے۔(مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند:۲/۲۳۲)۔

۳۔حضرت شیخ الحدیث علامہ محمدانورشاہ کشمیریؒ کی وفات کے بارے میں لکھاہے کہ جامعہ ڈابھیل تین روزتک بندرہااورصبح،شام تمام طلبہ ومدرسین حضرات نے دارالحدیث اوردوسری درسگاہوں میں جمع ہوکرقرآن خوانی،کلمہ طیبہ کاختم اورایصالِ ثواب کااہتمام کیا۔(مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند،ص ۳۷)۔

۴۔مریت حاجی محمداسماعیل صاحبؒ کے انتقال پردارالعلوم میں ایصالِ ثواب کے لیےقرآن شریف کا ختم پڑھا گیا،اورحضراتِ اساتذہ نےتعزیت فرمائی۔(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند،ص ۴۷،مارچ ۱۹۶۷ء)۔

۵۔حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال پردارالعلوم میں مرحومہ کے لیےکلمہ طیبہ اور قرآن شریف کاایصالِ ثواب کرایا گیااورمدرسہ کی تعطیل کردی گئی۔(ماہنامہ،دارالعلوم،ص ۴۸،اگست ۱۹۶۷ء)۔

۶۔ الحاج مولانامحمد بن موسی میاں صاحبؒ مرحوم نہ صرف دارالعلوم بلکہ ہندوپاک کے تمام دینی اور قومی اداروں سے خاص تعلق رکھتے تھے اوران کے جودوسخاسے بہت سے دینی کاموں کومددملتی تھی۔آج علی

الصباح احاطہ دارالعلوم میں مولانا مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن شریف کا ختم پڑھا گیا اور جملہ اساتذہ وطلبہ نے مولانا مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی۔ (ماہنامہ دارالعلوم، ص ۴۸، جون ۱۹۶۳ء)۔

۷۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ کی صاحبزادی جن کی عمر اسی سال کے قریب تھی، اخیر جولائی میں دعوتِ اجل کو لبیک کہہ گئیں، احاطہ دارالعلوم میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور حسرت وافسوس کے ساتھ انھیں سپردِ خاک کیا گیا، اگلے دن ختم اور ایصالِ ثواب کرایا گیا۔ (ماہنامہ دارالعلوم، ص ۴۷ ستمبر ۱۹۶۶ء)۔

۸۔ مولانا محمد نعیم صاحب مرحوم، دارالعلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے مہتمم اعلیٰ مولانا محمد سلیم صاحب کے برابر حقیقی نے ۲، شوال المکرّم کو بعارضہ قلب داعی اجل کو لبیک کہا، میری درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کے لیے علمی حلقوں اور مدارس میں ختمِ قرآنِ کریم وایصالِ ثواب کا بندوبست کیا جائے، اور تعزیت ناموں کے ذریعہ اس کی اطلاع پتہ ذیل پر حضرت مولانا محمد سلیم صاحب کو دیجائے۔ (ماہنامہ دارالعلوم، ص ۴۷، ۴۸، مئی ۱۹۶۳ء)۔

۹۔ جناب حضرت حافظ اللہ دیئے صاحبؒ مرحوم ومغفور، مرید عالمِ ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ بہ عمر تقریباً نوے سال، بعارضہ میعادی بخار تیرہ چودہ یوم کی علالت کے بعد رحلت فرما گئے، مرحوم کے لیے دارالعلوم میں ختم اور ایصالِ ثواب کرایا گیا۔ (ماہنامہ دارالعلوم، ۴۸، نومبر ۱۹۷۶ء)۔

۱۰۔ امیر جماعتِ تبلیغ حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ کے سانحہ وفات کی اطلاع ملتے ہی دارالعلوم میں غم واندوہ کی فضا چھا گئی، اور فوراً ہی ایصالِ ثواب کا انتظام کیا گیا، جس میں تمام طلبہ، اساتذہ اور کارکنان نے شرکت کی اور دعا کی گئی، اور دارالعلوم میں ایک یوم کی تعطیل کر کے طلبہ، اساتذہ اور کارکنان کو ایصالِ ثواب کے تسلسل کو باقی رکھنے کی ہدایت کردی گئی۔ (ماہنامہ دارالعلوم، ص ۵۶، جولائی ۱۹۹۵ء)۔

۱۱۔ قطب العالم حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی وفات پر دارالعلوم میں ختمِ قرآنِ پاک اور ختمِ کلمہ طیبہ کے ذریعہ ایصالِ ثواب کیا گیا، جس میں علماء، طلباء وارا کین دارالعلوم نے بڑی تعداد میں شرکت کی بالخصوص صدر المدرسین حضرت مولانا ابراہیم صاحب، مولانا مبارک علی صاحب نائب مہتمم، مولانا سید فخر الحسن صاحب وغیرہ، ختم کے بعد دارالحدیث کے تحتانی ہال میں اجتماع ہوا۔ (ماہنامہ دارالعلوم، ۴۸، اکتوبر ۱۹۶۲ء)۔

۱۲۔ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کے سانحہ وفات پر دارالعلوم میں قرآنِ کریم اور ختم کلمہ

طبیہ شروع کردیا، دارالعلوم کی درسگاہیں دفاتر بند کردئے گئے اور دارالعلوم کے تمام حضرات ختم میں آکر شریک ہوگئے، ختم سے فراغت کے فوراً بعد، تمام حضرات اساتذہ وطلبہ اور کارکنانِ دفاتر دارالحدیث کے زیریں ہال میں جمع ہوگئے، حضرت مہتمم صاحب مدظلہ، حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب مدظلہ، صدرالمدرسین، حضرت شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب مدظلہ کے اسٹیج پر آتے ہی مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا۔ (ماہنامہ دارالعلوم، ۴۸، ستمبر ۱۹۶۲ء)۔

۱۳۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی وفات پر دارالعلوم کی فضا اُداس اور غم زدہ ہوگئی، دارالعلوم میں عام تعطیل کا اعلان کیا گیا، دارالعلوم کے تمام اساتذہ، طلبہ اور ملازمین نے شام تک قرآن شریف کا ختم پڑھا اور مفتی صاحبؒ کے لیے ایصالِ ثواب کیا۔ پھر مفتی صاحب مرحوم کی تعزیت کے سلسلہ میں دارالعلوم میں جلسہ ہوا جس کے فرائض صدارت حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ادا فرمائے، اس جلسہ میں متعلقین دارالعلوم کے علاوہ شہر کے مسلمان بھی شریک تھے۔ (ماہنامہ دارالعلوم، ص ۴، جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ)۔

۱۴۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحبؒ کی شہادت پر تعزیتی نشست سے خطاب کرتے ہوئے رئیس الجامعہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہ فرماتے ہیں: آج ہم نے اپنے جامعہ دارالعلوم کراچی میں اسباق بند کرکے ان کے لیے دعائیں کی ہیں، ختم کروائے ہیں، ختمِ قرآن بھی ہوا، ختمِ خواجگان بھی ہوا، ختمِ آیتِ کریمہ بھی ہوا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بخاری شریف کے پانچ ختم ہوئے، کیونکہ ختمِ بخاری کے بعد بھی دعائیں بہت قبول ہوتی ہیں، بزرگوں کا بھی یہ معمول رہا ہے۔ الحمدللہ ان کے لیے خوب دعائیں ہوئی ہیں۔ (ماہنامہ البلاغ، ص ۱۶، ربیع الاول ۱۴۴۰ھ/ دسمبر ۲۰۱۸ء)۔

علاوہ ازیں درجِ ذیل چند بڑی شخصیات کے تعزیتی جلسے ہوئے، جن کا تذکرہ؛ مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند، نقش حیات، اسیرانِ مالٹا اور سیرتِ اشرف وغیرہ میں مذکور ہے؛

۱۔ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ۔

۲۔ مہتممِ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ۔

۳۔ مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ۔

۴۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ۔ وغیرہ شخصیات۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میت پر متعدد بار نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم:

سوال: کیا میت پر متعدد بار نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی بڑی عظیم شخصیت کی نمازِ جنازہ کئی مرتبہ پڑھی جاتی ہے۔کیا یہ صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک میت پر متعدد مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے، ہاں اگر پہلی مرتبہ ولی کی اجازت کے بغیر اجنبی نے پڑھ لی ہو تو ولی کے لیے دوبارہ پڑھنے کی اجازت ہے پھر ولی کے ساتھ دوسرے حضرات جنہوں نے نہیں پڑھی وہ بھی شرکت کرسکتے ہیں۔ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مذکور ہے:

ولا يصلى على ميت إلا مرة واحدة لا جماعة ولا وحداناً عندنا إلا أن يكون الذين صلوا عليها أجانب بغير أمر الأولياء ثم حضر الولي فحينئذٍ له أن يعيدها...ولنا ماروي أن النبي صلى الله عليه وسلم صلى على جنازة فلما فرغ جاء عمر رضي الله عنه ومعه قوم فأراد أن يصلي ثانياً فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: الصلاة على الجنازة لا تعاد ولكن ادع للميت واستغفر له وهذا نص في الباب وروي أن ابن عباس رضي الله عنه وابن عمر رضي الله عنه فاتتهما صلاة على جنازة فلما حضرا ما زادا على الاستغفار له، وروي عن عبد الله بن سلام رضي الله عنه أنه فاتته الصلاة على جنازة عمر رضي الله عنه فلما حضر قال: أسبقتموني بالصلاة عليه فلا تسبقوني بالدعاء له والدليل عليه أن الأمة توارثت ترک الصلاة على رسول الله صلى الله عليه وسلم وعلى الخلفاء الراشدين والصحابة رضوان الله عليهم أجمعين، ولو جاز لما ترک مسلم الصلاة عليهم خصوصاً على رسول الله صلى الله عليه وسلم لأنه في قبره كما وضع فإن لحوم الأنبياء حرام على الأرض به ورد الأثر وتركهم ذلک إجماعاً منهم دليل على عدم جواز التكرار. (بدائع الصنائع: ۱/۳۱۱،سعيد).

وينظر للمزيد: (مراقی الفلاح مع حاشية الطحطاوی،ص۵۹۰،ط:قديمی،والفتاوی الهندية: ۱/۱۶۳).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

میت پر صرف ایک بار نماز پڑھی جائے اس لیے کہ حق فرضیت اس سے ادا ہو جائے گا اور اس کے بعد جو نماز پڑھی جائیگی وہ نفل ہوگی اور جنازہ کی نماز بطورِ نفل مشروع نہیں ہے، لیکن اگر ولی میت کے سوا کسی ایسے شخص نے نمازِ جنازہ پڑھائی جس کو ولی پر مقدم ہونے کا حق نہیں تھا اور ولی نے اس کو اجازت بھی نہیں دی تھی اور ولی نے اس کی متابعت بھی نہیں کی تو ولی اگر چاہے تو دوبارہ نماز پڑھ سکتا ہے اس لیے کہ اس کا حق باقی ہے اگر چہ میت پر نماز پڑھنے کا فرض اجنبی کے پڑھنے سے ادا ہو چکا ہے پس ولی کو اس کے حق ولایت کی وجہ سے اعادہ کی اجازت ہے نہ کہ اسقاطِ فرض کے لیے کیونکہ وہ تو پہلے ادا ہو چکا ہے پس اگر کوئی اعادہ نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے... اور جب ولی اس میت پر نماز کا اعادہ کرے تو جو لوگ پہلی نماز میں شریک نہیں تھے وہ ولی کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں اور جو لوگ پہلی نماز میں شریک تھے وہ دوبارہ ولی کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی وہ نماز نفل ہوگی جو مشروع نہیں ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/ ۵۲۷)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ: ۸/ ۵۸۸، جامعہ فاروقیہ، وامدادالاحکام: ۱/ ۸۲۷، واحسن الفتاویٰ: ۴/ ۲۱۳، وآپ کے مسائل اوران کا حل: ۴/ ۳۹۵، وفتاویٰ رحیمیہ: ۳/ ۵۵۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

عورتوں کے لیے اہل میت کی تعزیت کے لیے جانے کا حکم:

سوال: اگر شہر میں کسی عورت کا انتقال ہو جائے، تو شہر کی دوسری عورتیں تعزیت کے لیے جاتی ہیں، کچھ تلاوت وغیرہ کرتی ہیں، کیا یہ میت کا حق ہے یا نہیں؟ جانا چاہیے یا نہیں؟ نیز قرآن وغیرہ پڑھ کر بخشنے میں ثواب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: تدفین سے پہلے یا اس کے بعد میت کے اہل خانہ کی تعزیت کے لیے جانا سنت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابیات بالخصوص جنتی عورتوں کی سردار پیکر شرم وحیا حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی ثابت ہے، پھر وہاں کچھ تلاوت وغیرہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دیا جائے تو میت کو اس کا ثواب پہنچ جاتا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میت کے گھر تعزیت کے لیے تشریف لے گئیں۔

ملاحظہ ہو ابوداود شریف میں ہے:

عـن عبد اللّٰہ بن عمرو بن العاص رضي الله عنه قـال: قبـرنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یعنـی میتـاً ، فلما فرغنا انصرف رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وانصرفنا معه فلما حاذی بابه وقف فإذا نحن بامرأة مقبلة قال: أظنه عرفها فلما ذهبت إذا هي فاطمةؓ، فقال لها رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : ما أخرجک یا فاطمة من بیتک؟ فقالت: أتیت یارسول اللّٰہ أهل هذا البیت فرحمت إلیهم میتهم أو عزیتهم به. (رواہ ابوداود،رقم: ۳۱۲۵).

حدیثِ مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا پردہ کے ساتھ تعزیت کے لیے جانا جائز اور درست ہے، اور اس کے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں۔

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

میت کی تعزیت کے لیے جانا جائز ہے تعزیت تین دن کے اندر ہو سوائے اس کے جو تین دن کے بعد سفر سے آئے مگر وہاں جا کر التزاماً فاتحہ پڑھنا بے ثبوت ہے۔ (کفایت المفتی:۴/۱۴۱،ط:دارالاشاعت)۔

فتاویٰ رشیدیہ میں مذکور ہے:

ایصالِ ثواب ہر روز درست ہے اور موجبِ ثواب ہے کوئی تاریخ ووقت شرع سے موقت نہیں پس اگر کسی دن کو ضروری نہ جانے بلکہ مثل دیگر ایام کے جانے ایصالِ ثواب میں اور عوام کو بھی اس طرح کے ایصالِ ثواب میں ضرر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں سب کے نزدیک درست ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ،ص ۱۱۸)۔

تعزیت کے فضائل اور ایصالِ ثواب کے متعلق مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا، جلد دوم، وہشتم)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

نمازِ جنازہ پڑھانے کی وصیت پر عمل کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص یہ وصیت کرے کہ میری نمازِ جنازہ فلاں عالم دین پڑھائے تو کیا اس وصیت پر عمل ضروری ہوگا، اور وہ عالمِ دین نمازِ جنازہ کے حقدار ہوں گے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نمازِ جنازہ پڑھانے کی وصیت پر عمل کرنا لازم نہیں ہے بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسی وصیت باطل ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله والفتویٰ علی بطلان الوصیة ... عزاه فی الهندیة إلی المضمرات أی لو أوصی بأن یصلی علیه غیر من له حق التقدم أو بأن یغسله فلان لایلزم تنفیذ وصیته ولایبطل حق الولي بذلک. (فتاوی الشامی: ۲/ ۲۲۱، سعید).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

اگر میت نے وصیت کی کہ فلاں شخص میری نماز پڑھادے یا فلاں شخص مجھے غسل دے تو وہ وصیت باطل ہے اس کا جاری کرنا لازمی نہیں ہے اور اس وصیت سے ولی کا حق جاتا نہیں رہے گا اسی پر فتویٰ ہے البتہ ولی کو اختیار ہے کہ خود نہ پڑھائے اور اس سے پڑھوائے، اسی طرح اگر وصیت کی کہ فلاں کپڑے کا کفن دیا جائے یا فلاں جگہ دفن کیا جائے تو یہ وصیت باطل ہے اس پر عمل لازمی نہیں ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۲/ ۵۲۷)۔

مزید ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی: ۴/ ۹۱، دار الاشاعت)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

قبر پر مٹی ڈالنے کے لیے مشین استعمال کرنے کا حکم:

سوال: ہمارے یہاں جب کسی کا انتقال ہوتا ہے کہ تو پتھریلی زمین ہونے کی وجہ سے قبر بھرنا اور مٹی سے پر کرنا مشکل ہوجاتا ہے، کیا آسانی کی خاطر مشین سے قبر بھر سکتے ہیں؟

الجواب: بوقتِ مشقت آسانی کی خاطر اور میت کے ادب واحترام کو باقی رکھتے ہوئے، مشین سے قبر بھرنے میں کوئی حرج نہیں، جب قبر کو ہاتھوں سے بھرتے ہیں تو اس میں بھی آلات مثل بیلچہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں، اسی طرح بوقتِ کھدائی بھی آلات استعمال ہوتے ہیں، نیز ہاتھوں سے بھرنے میں جسمانی مشقت ہے اور مشین سے بھرنے میں مالی مشقت ہے، پہلے زمانہ میں لوگ کنویں سے پانی ہاتھوں سے کھینچتے تھے اور اب وضو اور غسل وغیرہ کے لیے پانی نکالنے میں مشینیں استعمال ہوتی ہیں، جس طرح یہاں مشین استعمال کر سکتے ہیں تو قبر

بھرنے کے لیے بھی استعمال کرسکتے ہیں، آلات کو اللہ تعالیٰ نے ہماری آسانی کے لیے پیدا فرمایا ہے، ان کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بطورِ استیناس واستشہاد قرآنی آیات واحادیث اور قواعدِ کلیہ ملاحظہ فرمائیں:

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿یرید اللّٰہ بکم الیسر ولایریدبکم العسر﴾، وقال تعالیٰ: ﴿ماجعل علیکم فی الدین من حرج﴾. وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إن اللّٰہ إنما أراد بھذہ الأمۃ الیسر ولا یرید بھم العسر. وقال: إن خیر دینکم أیسرہ إن خیر دینکم أیسرہ. وقال أیھا الناس إن دین اللّٰہ یسر ثلاثاً. وقال: یسروا ولا تعسروا. (الدر المنثور).

وفی القواعد الفقھیۃ: الحرج مدفوع، والمشقۃ تجلب التیسیر. واللہ ﷻ اعلم۔

چھوٹی بچی کو مرد کے غسل دینے کا حکم:

سوال: اگر ایک سال یا دو سال کی بچی کا انتقال ہو جائے تو اس کو مرد غسل دے سکتا ہے یا عورت ہی غسل دے گی؟ اور مرد کا غسل دینا مکروہ ہوگا یا جائز؟

الجواب: چھوٹی بچی کو مرد کا غسل دینا جائز اور درست ہے۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مرقوم ہے:

والصبي الذي لایشتھي والصبیۃ کذلک غسلھما الرجال والنساء. (البحر الرائق: ۱۸۸/۲، دار المعرفۃ بیروت).

فتاوی ہندیہ میں مرقوم ہے:

فإن کانت المیت صغیراً لا یشتھي جاز أن یغسلہ النساء وکذا إذا کانت صغیرۃ لاتشتھي جاز للرجل غسلھا. (الفتاوی الھندیۃ: ۱۶۰/۱).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے: اگر لڑکا ایسا چھوٹا ہو کہ اس کو خواہش نہ ہوتی ہو تو جائز ہے کہ اس کو عورتیں نہلائیں اور اسی طرح اگر لڑکی چھوٹی ہو جو ابھی حدِ شہوت کو نہ پہنچی ہو تو جائز ہے کہ مرد اس کو نہلائیں، جو لڑکا یا لڑکی حدِ شہوت کو پہنچ گئے وہ بالغ کے حکم میں ہیں پس ایسے لڑکے کو اجنبی عورت نہیں نہلا سکتی اور ایسی لڑکی کو مرد نہیں نہلا سکتا۔ (عمدۃ الفقہ: ۵۰۱/۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم:

سوال: بعض غیر مقلدین اعتراض کرتے ہیں کہ حدیث میں ہے:" لا صلاة إلا بفاتحة الکتاب" اس میں لفظِ صلاۃ نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے، پھر بھی نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ، نہ احناف کا امام پڑھتا ہے اور نہ مقتدی۔ ایسا کیوں؟

الجواب: حدیث شریف میں جس نماز کا ذکر ہے وہ نماز، حقیقی نماز ہے اور نمازِ جنازہ، حقیقی نماز نہیں ہے، کیونکہ حقیقی نماز کے ارکان وشرائط ہیں، مثلاً: رکوع، سجدہ، قعدہ وغیرہ جو اس میں نہیں ہیں، اس لیے حدیث شریف نمازِ جنازہ کو شامل نہیں، نیز نمازِ جنازہ کے لفظ صلاۃ کے ساتھ علی کا لفظ آتا ہے۔ ملاحظہ ہو: ۱. **ولا تصل على أحد منهم مات أبداً**، ۲: **من صلى على الميت في المسجد فلاشيء له**، اور **لا صلاة إلا بفاتحة الكتاب** میں صلاۃ کے ساتھ لفظ علی نہیں ہے بنابریں نمازِ جنازہ کو شامل نہیں۔

اگر بالفرض فاتحہ جنازہ کو بھی شامل ہو تو حدیث میں فاتحہ کے ساتھ سورت کا ذکر بھی موجود ہے جبکہ جمہور کے نزدیک نمازِ جنازہ میں سورت نہیں ہے۔

ہاں بعض روایات میں نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی تصریح موجود ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ احناف تطبیق دیتے ہیں کہ پہلی تکبیر کے بعد حمد وثنا مسنون ہے چاہے فاتحہ کی شکل میں ہو یا فقط ثنا کی شکل میں ہو۔

دلائل ملاحظہ کیجیے: امام بخاریؒ نے اپنے دعویٰ (نمازِ جنازہ پر بھی صلاۃ کا اطلاق ہوتا ہے) کو ثابت کرنے کے لیے ایک مستقل باب قائم فرمایا: **باب سنة الصلاة على الجنازة وقال النبي صلى الله عليه وسلم: من صلى على الجنازة. وقال: صلوا على صاحبكم. وقال: صلوا على النجاشي. سماها صلاة، ليس فيها ركوع ولا سجود ولا يتكلم فيها وفيها تكبير وتسليم.**

۲. **الأبواب والتراجم لصحيح البخاری**، میں حضرت شیخ اس ترجمۃ الباب کی یوں تشریح فرماتے ہیں:

ما يظهر من الشرح أنهم اختلفوا في غرض الترجمة على قولين: الأول: ما قال

الحافظ ابن المنير: المراد بالسنة ما شرعه النبي صلى الله عليه وسلم فيها يعنى فهو أعم من الواجب والمندوب ومراده بما ذكره هنا من الآثار والأحاديث أن لها حكم غيرها من الصلوات والشرائط والأركان وليست مجرد دعاء فلا تجزئ بغير طهارة مثلاً . والثاني: مافي هامش الهندية عن الكرماني ما في غرض البخاري بيان جواز إطلاق الصلاة على صلاة الجنازة وكونها مشروعة و إن لم تكن ذات الركوع والسجود فاستدل عليه تارة بإطلاق اسم الصلاة والأمر بها وتارة بإثبات ما هو من خصائص الصلاة. (الابواب والتراجم، ص ۱۲۰) .

نمازِ جنازہ میں لفظ صلاۃ کے ساتھ علی کا لفظ آتا ہے:

۱ ﴿ ولا تصل على أحد منهم مات أبداً ولا تقم على قبره ﴾[التوبة]،

۲: عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم صلى على الجنازة ثم أتى قبر الميت فحثى عليه من قبل رأسه ثلاثاً . (رواه ابن ماجه، رقم: ۱۵۶۵).

۳: عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم على الجنازة فقال: اللّهم اغفر لحينا...الخ. (رواه ابوداود، رقم: ۳۲۰۳).

وہ روایت ملاحظہ ہو جس میں سورۂ فاتحہ کی قراءت جنازہ کے لیے ہونے کی تصریح ہے؛

حدثتني أم شريک الانصارية قالت: أمرنا النبي صلى الله عليه وسلم أن نقرأ على الجنازة بفاتحة الكتاب . (رواه ابن ماجه، رقم: ۱۴۹۶). وإسناده ضعيف .

دوسرے علماء اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ اس سے سنداً قوی ہے اور اس میں سنت ہونے کی تصریح ہے، لہٰذا یہ ضعیف روایت بھی سنت یا مستحب پر محمول کی جائے گی۔ اثر ابن عباس رضی اللہ عنہ ملاحظہ ہو:

عن طلحة بن عبد الله بن عوف قال: صليت خلف ابن عباس رضي الله عنه على جنازة فقرأ بفاتحة الكتاب وسورة وجهر حتى أسمعنا فلما فرغ أخذت بيده فسألته عنه فقال: سنة حق. (رواه النسائي، رقم: ۱۹۸۷).

لیکن اس روایت سے غیر مقلدین پر اعتراض ہوتا ہے کہ اس میں فاتحہ کے ساتھ سورت کا بھی ذکر ہے

حالانکہ جمہور کے نزدیک جنازہ میں سورت نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو اعلاء السنن میں مرقوم ہے:

فالحق فی الجواب عنه أن أثر ابن عباس ﷺ لا يفيد الخصم ، لما فيه من ذكر السورة مع الفاتحة في بعض الطرق الصحيحة ، ولم يقل بكون قراء ة السورة سنة مصطلحة .
(اعلاء السنن : ۸/ ۲۶۱، ط: ادارة القرآن).

اعلاء السنن میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ چند روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

فهذه الروايات تدل على أن السنة قراء ة الفاتحة وسورة معها فی صلاة الجنازة ولكن لا حجة فيه للخصم فإنه لا يقول بقراء ة السورة . (اعلاء السنن :۸/۲۵۸). واللہ ﷻ اعلم۔

پانچ تکبیریں کہنے سے نمازِ جنازہ کا حکم:

سوال: ایک امام صاحب نے کسی جنازہ پر پانچ تکبیریں کہہ دیں ،تو کیا نمازِ جنازہ ہوگئی یا اعادہ کی ضرورت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نمازِ جنازہ میں پانچ تکبیروں کی وجہ سے کوئی خرابی نہیں آتی نماز ہوگئی ،اعادہ کی بھی ضرورت نہیں ہے، ہاں پانچویں تکبیر میں مقتدی امام کا اتباع نہ کریں، پھر امام کے ساتھ سلام پھیر دیں۔

قال فی الدرالمختار: ولو كبر إمامه خمساً لم يتبع لأنه منسوخ فيمكث المؤتم حتى يسلم معه إذا سلم به يفتي. وفي رد المحتار: قوله لأنه منسوخ ، لأن الآثار اختلفت في فعل رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فروی الخمس والسبع والتسع وأكثر من ذلک إلا أن آخر فعله عليه الصلاة والسلام كان أربع تكبيرات فكان ناسخاً لما قبله...قوله به يفتی، رجحه في فتح القدير بأن البقاء في حرمة الصلاة بعد فراغها ليس بخطأ مطلقاً إنما الخطأ فی المتابعة فی الخامسة . (الدرالمختار: ۲/ ۲۱۴،سعید).

وفي حاشية الطحطاوي: ولكن ينتظر سلامه فی المختار ليسلم معه فی الأصح .
(حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح ،ص:۵۸۷،قدیمی).

فتاویٰ فریدیہ میں ہے: پانچ تکبیرات کرنے سے جنازہ میں نقصان نہیں آتا البتہ زائد تکبیر میں مقتدی امام کے ساتھ تکبیر نہ کریں گے اور سلام پھیرنے میں اس امام کے ساتھ شریک ہوں گے۔ (فتاویٰ فریدیہ:۳/۲۱۶)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے: سوال: نماز میں سہواً بجائے چار تکبیر کے پانچ تکبیر پر سلام پھیرا تو نماز جنازہ ادا ہوگی یا نہیں؟ جواب: نماز ہوگئی۔ (فتاویٰ محمودیہ:۸/۵۵۴، جامعہ فاروقیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

سیلاب زدہ کو دوبارہ مسنون کفن دینے کا حکم:

سوال: اگر سیلاب کی وجہ سے زمین سے کچھ مردے باہر آ گئے تو ان کو دوبارہ کفن دینا چاہیے یا صرف کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دینا کافی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر ان مردوں کا جسم صحیح سالم ہے تو مسنون کفن دیکر دفنایا جائے گا، لیکن اگر جسم خراب ہو چکا ہے تو کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کر دیا جائے گا سنت کفن نہیں دیا جائیگا۔ ملاحظہ ہو درمختار مع ردالمحتار میں ہے:

وآدمي منبوش طري لم يتفسخ يكفن كالذي لم يدفن مرة بعد أخرى وإن تفسخ كفن في ثوب واحد. وفى الشامية: قوله منبوش طرى أى بأن وجد منبوشاً بلا كفن، قوله لم يتفسخ قيد به لأنه لو تفسخ يكفن فى ثوب واحد كماصرح به بعده. قوله كالذى لم يدفن أى يكفن في ثلاثة أثواب، قوله مرة بعد أخرى، أى لو نبش ثانياً وثالثاً وأكثر كفن كذلك ما دام طرياً من أصل ماله عندنا. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۲/۲۰۵، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (فتح القدير: ۲/۱۱۳، دارالفكر، وبدائع الصنائع: ۱/۳۰۹، سعيد، والبحرالرائق: ۲/۱۷۷، والفتاوى السراجية، ص ۱۳۰).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

اگر کسی کو کفن دے کر دفن کیا اور اس کا کفن چوری ہو گیا تو اگر وہ تازہ دفن ہوا ہے یعنی اس کی لاش ابھی تازہ ہے اور پھٹی نہیں ہے تو اس کے مال سے اس کو دوبارہ کفنِ مسنون دیں اور اگر پھر چوری ہو جائے تو پھر کفن دیں اور جب تک وہ مردہ پھٹے نہیں جتنی دفعہ بھی کفن چوری ہو جائے دیتے رہیں، اگر اس کا مال وارثوں میں تقسیم ہو گیا

ہے تو کفن کی مقدار ان کے حصہ کے مطابق ان سے واپس لیا جائے کیونکہ میت اب بھی اس کی مالک ہے...اور اگر لاش پھٹ چکی ہے تو کفن مسنون کی ضرورت نہیں ایک کپڑے میں لپیٹ دینا کافی ہے۔(عمدۃ الفقہ :۲/۵۰۷)۔واللہ ﷻ اعلم۔

واٹساپ پر ایصالِ ثواب گروپ کا حکم:

سوال: کچھ عرصہ پہلے ایک شخص کے والدین اور بھائی بہن ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے،اس نے واٹساپ پر ایک گروپ بنایا جس میں خاندان اور قریبی رشتہ داروں نے اپنی خوشی سے شرکت کی،اس گروپ میں ماہانہ ایک ایک جزء ہر شریک کو تقسیم کیا جاتا ہے اس طرح ماہانہ دو قرآنِ کریم کا ختم اور رمضان میں تین کا ختم ہو جاتا ہے پھر ہم اپنے والدین اور تمام مرحومین کے لیے ایصالِ ثواب کی نیت کر لیتے ہیں،چند دن پہلے کسی نے بتایا کہ یہ کام بدعت ہے،ریا کاری ہے اور دین میں سے نہیں ہے،اب آپ سے درخواست ہے کہ حکمِ شرعی سے مطلع فرمائیں؟ بینوا بالبرہان تو جروا عندالرحمٰن۔

الجواب: اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان اپنی عباداتِ بدنیہ،مالیہ اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کا ثواب کسی مردہ کو یا زندہ کو دے سکتا ہے اور دیا ہوا ثواب اللہ تعالیٰ پہنچا دیتے ہیں،پھر ایصالِ ثواب کے لیے افضل اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہر انسان علیحدہ اپنے طور پر پڑھ کر یا صدقہ خیرات کر کے ایصالِ ثواب کر دیا کرے،ہاں گاہے گاہے اجتماعی قرآن خوانی کی بھی بہ چند شرائط علماء نے اجازت دی ہے:

۱۔اس کو لازم اور ضروری نہ سمجھا جائے۔

۲۔قرآن خوانی کرنے والوں کو رقم وغیرہ نہ دی جائے۔نہ اس کے عوض کھانا کھلایا جائے۔

۳۔فخر،ریا اور شہرت مطلوب نہ ہو۔

۴۔سوئم،چہلم اور برسی وغیرہ کے اہتمام کے لیے نہ ہو۔

۵۔مردوں اور عورتوں کا خلط واختلاط نہ ہو۔

بنابریں بہ شرائطِ مذکورہ واٹساپ گروپ پر پارہ کی تقسیم،ختمِ قرآنِ کریم اور اس کا ایصالِ ثواب جائز اور درست ہے

نیز واٹساپ پر اجتماعی تلاوت نہیں ہوتی، ہر شخص اپنی سہولت سے پڑھ سکتا ہے، آسانی کے لیے پارہ کی تقسیم ہوتی ہے اس میں کسی پر جبر نہیں ہوتا، نیز یہ تقسیم اس وجہ سے بھی ہے کہ پارہ مکرر نہ ہوجائے اور ترتیب سے قرآن ختم ہوجائے۔ بہر حال یہ تقسیم آسانی کے لیے ہے اس کو بدعت کہنا صحیح نہیں۔ چند دلائل حسبِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

حضرت عبداللہ بن مسعود ﷺ ہر جمعرات کو وعظ فرماتے تھے تو یہ تعیین بدعت نہیں بلکہ آسانی کی وجہ سے تھی۔

عن أبي وائل قال: كان عبد اللّٰه يذكر في كل خميس فقال له رجل: يا أبا عبدالرحمن لوددت أنک ذكرتنا كل يوم، قال: أما أنه يمنعني من أني أكره أن أملكم وأني أتخولكم بالموعظة كما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها مخافة السآمة علينا.

(رواه البخاري، رقم: ۷۰، باب من جعل لاهل العلم اياما معلومة).

حضرت شیخؒ فرماتے ہیں کہ درس وتدریس میں اوقات، اسباق اور گھنٹوں کی تعیین بدعت نہیں ہے کیونکہ یہ آسانی کے لیے ہے، ہاں اگر کوئی اس کی وجہ سے زیادہ اجر کی نیت کرے تو یہ بدعت ہوگا۔

ملاحظہ ہو حاشیہ لامع میں ہے:

فإن البدعة هو التعيين الذي يعد فيه ثواب وأجر خاص بهذا المعين وأما التعيين لساعات الدروس مثلاً فلا يعده أحد أجراً و ثواباً. (حاشية لامع الدراری: ۱/۴۷، ط: سعيد).

قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

ایصالِ ثواب ہر روز درست اور موجبِ ثواب ہے کوئی تاریخ ووقت شرع سے موقت نہیں روزِ ولادت وروزِ وفات بھی درست ہے پس اگر کسی دن کو ضروری نہ جانے بلکہ مثل دیگر ایام کے جانے ایصالِ ثواب میں اور عوام کو بھی اس طرح کے ایصالِ ثواب میں ضرر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں سب کے نزدیک درست ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۱۸، ط: اسلامی کتب، کراچی)۔

نیز مذکور ہے: اگر بلا تعیین یوم کے جمع ہو کر ختمِ قرآن کریں یا کلمہ طیبہ اور ایصالِ ثواب اس کا کریں تو جائز ہے اکثر علماء کے نزدیک۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۳۷)۔

دوسری جگہ ختمِ بخاری شریف کے بارے میں رقمطراز ہیں:

سوال؛ کسی مصیبت کے وقت بخاری شریف کا ختم کرانا قرونِ ثلاثہ سے ثابت ہے یا نہیں اور بدعت ہے یا نہیں؟ جواب: قرونِ ثلاثہ میں بخاری شریف تالیف نہیں ہوئی تھی مگر اس کا ختم درست ہے کہ ذکر خیر کے بعد دعا قبول ہوتی ہے اس کا اصل شرع سے ثابت ہے بدعت نہیں، فقط رشید احمد عفی عنہ۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۴۷)۔

یاد رہے کہ جو تعیین یوم ممنوع ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تعیین کو ثواب وسنت یا ضروری سمجھے ورنہ آسانی کے لیے تعیین یوم ممنوع نہیں۔ ملاحظہ ہو حضرت فرماتے ہیں:

مجلس مولود وایصالِ ثواب وغیرہ کے قیود دراصل مباح ہیں اگر ان کو سنت یا ضروری جانے تو بدعت وتعدی ہے اور اس کے بغیر اباحت کے درجے میں ہیں، ہاں ہم کو عوام کی عادت سے محقق ہو گیا ہے کہ وہ لوگ ضروری اور سنت جانتے ہیں اس لیے ہم منع کرتے ہیں۔ (مستفاد از فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۳۱)۔

(وکذا فی کفایت المفتی: ۴/ ۱۴۷، ط: دارالاشاعت، وفتاویٰ محمودیہ: ۳/ ۸۶، جامعہ فاروقیہ)۔

اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (ذکر اجتماعی وجہری شریعت کے آئینہ میں، ص ۲۴۹-۲۹۱)۔

سیر اعلام النبلاء میں امام ذہبیؒ نے سلفِ صالحین سے بہت سارے ایسے اعمال نقل کیے ہیں جو متروکات میں آتے ہیں، لیکن ممنوعات نہیں ہیں:

(۱) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ روزانہ ایک لاکھ تسبیح پڑھتے تھے۔ (۲/ ۳۴۸)۔

(۲) حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مہینے کے پہلے تین دن کے روزے رکھتے تھے۔ (۲/ ۶۰۹)۔

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روزانہ بارہ ہزار تسبیحات پڑھتے تھے۔ (۲/ ۶۱۰)۔

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک دھاگہ تھا جس میں ۱۲ ہزار گرھیں تھیں، سونے سے پہلے ان پر تسبیحات پڑھتے تھے۔ (۲/ ۶۲۳)۔

(۵) عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ صبح کے بعد سورج نکلنے تک قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ (۴/ ۲۶۵)۔

(۶) علی بن حسین زین العابدینؒ ۲۴ گھنٹے میں ایک ہزار رکعتیں پڑھتے تھے۔ (۴/ ۳۹۲)۔

(۷) طاؤس بن کیسانؒ اور ان کے تلامذہ اور متعلقین عصر کے بعد کا وقت تا مغرب دعا کے لیے مخصوص کرتے تھے۔ (۵/ ۴۸)۔

(۸) علی بن عبداللہ بن عباسؓ روزانہ ایک ہزار رکعتیں پڑھتے تھے۔ (۲۵۳/۵)۔

(۹) امام احمد بن حنبلؒ روزانہ دن رات میں تین سو رکعتیں پڑھتے تھے جب آزمائشوں نے ان کو کمزور کر دیا تو پھر ڈیڑھ سو رکعتیں پڑھتے تھے۔ (۲۱۲/۵)۔

(۱۰) بقی بن مخلدؒ ۱۳ رکعتوں میں قرآنِ کریم ختم کرتے تھے اور دن کے وقت سو رکعتیں پڑھتے تھے اور ہمیشہ روزے رکھتے تھے۔ (۲۹۲/۱۳)۔

(۱۱) جنید بن محمدؒ روزانہ تین سو رکعتیں پڑھتے تھے اور کئی ہزار تسبیحات پڑھتے تھے۔ (۶۷/۱۴)۔

(۱۲) علامہ ابن قیمؒ نے علامہ ابن تیمیہؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے تھے کہ جو شخص فجر کی سنت اور فرض کے درمیان یا حی یا قیوم، لا الہ الا انت، روزانہ پابندی سے ۴۰ مرتبہ پڑھے گا، تو ان کلمات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو شاداب اور تر و تازہ رکھے گا۔ (مدارج السالکین: ۲۶۴/۳)۔

یہ سب متروکات ہیں جن حضرات نے ان کو معمول بنایا وہ خود پابندی کرتے تھے لیکن نہ کرنے والے پر انکار نہیں کرتے تھے، لہٰذا کسی نے بدعت نہیں کہا۔

حضرت سہارنپوریؒ نے فرمایا: التزام بمعنی اصرار بدعت ہے اور دوام بلا التزام مستحب ہے۔ (براہین قاطعہ، ص ۶۷)۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل مولانا عبدالحی لکھنویؒ کے رسالہ "**إقامة الحجة على أن الإكثار في التعبد ليس ببدعة**" میں مذکور ہے وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ (ماخوذ از فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۸۰۷/۷)۔

پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ واٹس ایپ پر پاروں کی تقسیم و تعیین آسانی کے لیے ہو تو اس کو بدعت نہیں کہیں گے، ہاں لازم اور ضروری سمجھیں یا اس میں اجر و ثواب کو زیادہ تسلیم کرلیں تو بدعت ہوگا حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ اجتماعی قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب سے متعلق دلائل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۶۸۰/۸، ط: زمزم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قبرستان میں قرآنِ کریم میں دیکھ کر تلاوت کرنے کا حکم:

سوال: کیا قبرستان میں قرآنِ کریم میں دیکھ کر تلاوت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: قبرستان میں قرآن شریف میں دیکھ کر تلاوت کرنے کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ مکروہ فرماتے ہیں اورامام محمدؒ درست اور جائزفرماتے ہیں ،ہمارے مشائخ نے امام محمدؒ کے قول پرفتویٰ دیاہےلہٰذا مصحف میں دیکھ کر تلاوت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

قراء ة القرآن عند القبور عند محمدؒ لا تكره و مشايخناؒ أخذوا بقوله وهل ينتفع و المختار أنه ينتفع هكذا في المضمرات . (الفتاوى الهندية: ١/١٦٦).

تحفة الملوک میں مذکور ہے:

قراء ة القرآن عند القبور و كره أبوحنيفةؒ قراء ة القرآن عند القبور و قال محمدؒ: لايكره و ينتفع به الميت وهذا هو المختار. (تحفة الملوك،ص ٢٨٣،رقم المسئلة٤٨٨، دارالبشائر الاسلامية).

(وكذا في فتاوى الشامي: ٢/١٩٠،سعيد،و٢/٢٤٥،سعيد،والمحيط البرهاني:٢/٣٨،وحاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،ص ٦٢١،قديمي،وفتاوىٰ محموديه: ٩/٢٦٦،جامعه فاروقيه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

فرض یاواجب عمل کاایصالِ ثواب کرنے کاحکم:

سوال: فرض یاواجب عمل کا ثواب کسی کودے سکتے ہیں یانہیں؟ مثلاً فجر کی نماز کا ثواب مرحومین کوبخش دےتواس کی اجازت ہوگی یانہیں؟

الجواب: فرض یاواجب عمل کا ثواب دیناجائزاوردرست ہےاورمرحوم کواس سےنفع ہوگا۔

ملاحظہ علامہ ابن نجیم مصریؒ البحرالرائق میں لکھتے ہیں:

وظاهر إطلاقهم يقتضي أنه لا فرق بين الفرض والنفل فإذا صلى فريضة وجعل ثوابها لغيره فإنه يصح لكن لايعود الفرض في ذمته ، لأن عدم الثواب لايستلزم عدم السقوط عن ذمته ، ولم أر منقولاً . (البحرالرائق:٣/٦٤،ط:دارالمعرفة بيروت).

منحة الخالق میں علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

قوله المصنف: ومن أهل بحج عن أبويه فعين صح ، قال: في الشرنبلالية يفيد بطريق أولى أنه إذا أهل عن أحدهما على الإبهام له أن يجعلها عن أحدهما بعينه كما في الفتح و تعليل المسألة بأنه متبرع بجعل ثواب عمله لأحدهما يفيد وقوع الحج عن الفاعل فيسقط به الفرض عنه ، وان جعل ثوابه لغيره . (منحة الخالق حاشية البحر الرائق: ۶۸/۳،ط:کوئٹہ).

الدر المنتقی فی شرح الملتقی میں علامہ علاء الدین حصکفیؒ لکھتے ہیں:

وللإنسان أن يجعل ثواب عمله لغيره في جميع العبادات ، فرضاً أو نفلاً . (الدر المنتقى في شرح الملتقى: ۳۱۰/۱). **وللمزيد ينظر:** (فتاوى الشامي: ۲۴۳/۲، سعيد،و ۵۹۵،سعيد).

باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ میں مرقوم ہے:

سوال: نفل نماز اور روزہ کا ثواب زندہ آدمی کو ہبہ کرنا جائز ہے، یا نہیں؟ اور یہ تو ظاہر ہے کہ فرض نماز روزہ میں نیابت درست نہیں، لیکن ادائے فرض سے دو فائدے ہیں: سقوطِ عذاب اور حصول ثواب، سوا گر کوئی شخص فرائض کا فقط ثواب دوسرے شخص کو ہبہ کرے تو جائز ہے یا نہیں؟ اور نفل عبادت کا ثواب فاسق کو ہبہ کرنا درست ہے، یا نہیں؟

جواب: ثواب نوافل کا زندہ کو بھی دینا درست ہے جیسا کہ مردہ کو دینا درست ہے، نفل اور فقط فرض کا ثواب دے سکتے ہیں، اور فاسق کو ثواب دے سکتے ہیں۔ (باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ، ص۱۹۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایصالِ ثواب میں عمل کے بعد نیت کرنے کا حکم:

سوال: ایصالِ ثواب کے لیے عمل سے پہلے نیت کرنا ضروری ہے یا عمل کرنے کے بعد بھی نیت کر سکتے ہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: ایصالِ ثواب کے لیے بہ وقتِ عمل نیت کرنا ضروری نہیں بلکہ عمل کرنے کے بعد بھی ایصالِ ثواب کی نیت کر سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

والظاهر أنه لا فرق بين أن ينوي به عند الفعل للغير أو يفعله لنفسه بعد ذلک يجعل

ثوابه لغيره لإطلاق كلامهم ، وأنه لا فرق بين الفرض والنفل . (فتاوى الشامي: ۲/ ۲۴۳، سعيد).

البحر الرائق میں مرقوم ہے:

لا فرق بين أن ينوي به عند الفعل للغير أو يفعله لنفسه ثم بعد ذلك يجعل ثوابه لغيره لإطلاق كلامه . (البحر الرائق: ۳/ ۶۴، دار المعرفة).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

اگر نیک عمل، تلاوتِ قرآنِ پاک، نوافل، خیرات اس نیت سے کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب فلاں کو پہنچادے تب بھی کافی ہے، اگر بغیر اس نیت کے کیا جائے تو بعد میں یہ دعا کرے کہ یا اللہ اس کا ثواب فلاں کو پہنچادے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۹/ ۲۰۳، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

نابالغ بچے کو ایصالِ ثواب کرنے کا حکم:

سوال: کیا نابالغ بچوں کو ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: نابالغ بچے معصوم ہوتے ہیں اس لیے ان کو ایصالِ ثواب کی ضرورت نہیں، تاہم اگر ان کو بھی ایصالِ ثواب کیا جائے تو صحیح قول کے مطابق ان کو ثواب پہنچ جائیگا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں لیکن آپ کو ایصالِ ثواب ہوسکتا ہے اور کرنا چاہیے، لوگوں کا معمول چلا آ رہا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قربانی، عمرہ، طواف اور کارِ خیر وغیرہ کر کے ایصالِ ثواب کرتے رہتے ہیں۔ چند دلائل ملاحظہ کیجیے:

قال في الدرالمختار: دعاء له أيضاً بتقدمه في الخير، لاسيما وقد قالوا: حسنات الصبي له لا لأبويه . (الدرالمختار: ۲/ ۲۱۵، سعيد). (وكذا في البحر الرائق: ۲/ ۲۱۲، دار المعرفة، و حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص ۳۸۸، ط: مصر).

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے:

نابالغ کو اپنی حسنات کا ثواب ملتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اس کو غیر بھی اپنی حسنات کا ایصالِ ثواب کر سکتا ہے، نیز اس پر نمازِ جنازہ کی دعا بھی اس کے لیے مفید ہے اس سے بھی ایصالِ ثواب کا فائدہ ثابت ہوا۔

(احسن الفتاویٰ:۴/۲۰۵)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

بچے معصوم ہیں، گناہوں سے بخشوانے کے لیے ان کے حق میں ایصالِ ثواب کی ضرورت نہیں، ہاں تحصیل انعامات کے لیے دعا کی جائے تو ٹھیک ہے جیسے صلاۃ جنازہ میں کی جاتی ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۹/۲۳۹، جامعہ فاروقیہ)۔

صحیح مسلم شریف میں ہے کہ قربانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی تھی: "**اللّٰهم تقبل من محمد و آل محمد و من أمة محمد**". (صحیح مسلم:۲/۵٦/۱۹٦۷)۔

اورامت میں بچے یقیناً شامل ہیں، معلوم ہوا کہ بچوں کے لیے ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی فرمائی؛ **عن حنش قال: رأيت علياً يضحي بكبشين فقلت ما هذا ؟ فقال: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم أوصاني أن أضحي عنه فأنا أضحي عنه .** (رواه ابوداود،رقم: ۲۷۹۲).

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایصالِ ثواب کے مزید دلائل فتاویٰ دارالعلوم زکریا(۲/۸۴۳) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔واللہ ﷻ اعلم۔

سلفی حضرات تلاوتِ قرآن کے ایصالِ ثواب کے قائل نہیں:

سوال: کیا سلفی حضرات قرآنِ کریم کی تلاوت کے ایصالِ ثواب کے قائل ہیں یا نہیں؟ اگر قائل نہیں تو کیوں؟ ان کے علماء کے حوالہ سے بتلادے تو بہتر ہوگا؟

الجواب: بعض سلفی حضرات قرآنِ کریم کی تلاوت کے ایصالِ ثواب کے قائل نہیں ہیں، اور آج کل سعودیہ میں اسی پر عمل درآمد ہے، جنت البقیع میں تلاوت سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں فقط سلام کرو اور آگے بڑھو۔اور یہ بات ان کے علماء کے فتاویٰ میں موجود ہے۔ چند فتاویٰ حسبِ ذیل ہیں:

فتاوی الاسلام سوال وجواب میں شیخ محمد صالح المنجد لکھتے ہیں:

اختلف العلماء في جواز إهداء الثواب للموتى وهل يصلهم ذلک على قولين؛ القول الأول: أن كل عمل صالح يهدى للميت فإنه يصله ، ومن ذلک قراء ة القرآن والصوم والصلاة و غيرها من العبادات . القول الثانى : أنه لا يصل إلى الميت شيء من الأعمال الصالحة إلا ما دل الدليل على أنه يصل ، وهذا هو الراجح ، والدليل عليه قوله تعالىٰ: ﴿وأن ليس للإنسان إلا ما سعى﴾ [النجم : ۳۹]، وقوله عليه الصلاة والسلام: إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله ، إلا من ثلاثة : إلا من صدقة جارية ، أو علم ينتفع به ، أو ولد صالح يدعو له . (أخرجه مسلم، ۱۶۳۱ ،من حديث ابى هريرة رضى الله تعالىٰ عنه)، وقد مات عم النبي صلى الله عليه وسلم حمزة رضى الله تعالىٰ عنه ، وزوجته خديجة رضى الله تعالىٰ عنها ، وثلاث من بناته ، ولم يرد أنه قرأ عن واحد منهم القرآن ، أو ضحى أو صام أو صلى عنهم ، ولم ينقل شيء من ذلک عن أحد من الصحابة ، و لو كان مشروعاً لسبقونا إليه .

وقد سئل الشيخ ابن بازؒ عن إهداء ثواب قراء ة القرآن والصدقة للأم ، سواء كانت حية أم ميتة ، فأجاب : أما قراء ة القرآن فقد اختلف العلماء في وصول ثوابها إلى الميت على قولين لأهل العلم ، والأرجح أنها لا تصل لعدم الدليل ؛ لأن الرسول صلى الله عليه وسلم لم يفعلها لأمواته من المسلمين كبناته اللاتى متن فى حياته عليه الصلاة والسلام ، ولم يفعلها الصحابة رضى الله تعالىٰ عنهم وأرضاهم فيما علمنا ، فالأولىٰ للمؤمن أن يترک ذلک ولا يقرأ للموتى ولا للأحياء ولا يصلى لهم ، وهكذا التطوع بالصوم عنهم ؛ لأن ذلک كله لا دليل عليه ، والأصل فى العبادات التوقيف إلا ما ثبت عن الله سبحانه أو عن رسوله صلى الله عليه وسلم شرعيته ، أما الصدقة فتنفع الحي والميت بإجماع المسلمين ، وهكذا الدعاء ينفع الحي والميت بإجماع المسلمين ...(مجموع فتاوى ومقالات الشيخ ابن باز : ۴/۳۴۸ . ماخوذ من فتاوى الاسلام ،سوال وجواب : ۱/۱۲۶۲۱).

وهكذا فى الفتاوى المهمة لسماحة الشيخ عبدالعزيزبن عبد الله بن باز،

(ص ۴۶۰۔۴۶۳).

وفی فتاوی علماء البلد الحرام : س ۱ : هل يجوز إيصال الثواب للميت بالأعمال الحسنة عامة؟ س ۲ : هل يجوز عقد مجلس لختم القرآن ثم إيصال ثواب القراء ة للموتى حتى الأنبياء ؟

ج: أولاً : الصحيح من أقوال العلماء : أن فعل القرب من حي لميت مسلم لا يجوز إلا في حدود ما ورد الشرع بفعله ؛ مثل الدعاء له والاستغفار، والحج ،والعمرة ، والصدقة عنه، والضحية ، وصوم الواجب عمن مات وعليه وصوم واجب .

ثانياً : قراء ة القرآن بنية أن يكون ثوابها للميت لا تجوز ؛ لأنها لم ترد عن المصطفى صلوات اللّٰه وسلامه عليه ، والأمر كما قدمنا بالفقرة الأولى: أنه لايجوز فعل قربة من حي لميت مسلم، إلا في حدود ما وردالشرع به، وثبت عن النبى صلى الله عليه وسلم أنه كان يزور القبور، ويدعو للأموات بأدعية علمها أصحابه وتعلموها عنه، من ذلك : السلام عليكم أهل الديار...ولم يثبت عنه صلى اللّٰه عليه وسلم أنه قرأ سورة من القرآن ، أوآيات منه للأموات ، مع كثرة زيارته لقبورهم ، ولوكان ذلک مشروعاً لفعله ، وبينه لأصحابه ؛ رغبة فى الثواب ، ورحمة بالأمة ، وأداء لواجب البلاغ ، فإنه كما وصفه تعالىٰ بقوله : ﴿لقد جاء كم رسول من أنفسكم...﴾ فلما لم يفعل ذلک مع وجود أسبابه دل على أنه غير مشروع ، وقد عرف ذلک أصحابه رضى اللّٰه تعالىٰ عنهم ، فاقتفوا أثره ، واكتفوا بالعبرة والدعاء للأموات عند زيارتهم ، ولم يثبت عنهم أنهم قرأوا قرآناً للأموات ، فإن القراء ة لهم بدعة محدثة ، وقد ثبت عنه صلى اللّٰه عليه وسلم أنه قال: من أحدث فى أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد . فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العملية والافتاء : ۴۸/۹،۴۹. (ماخوذ من فتاوى علماء البلد الحرام،ص۸۰۳،الرياض).

بعض فتاویٰ میں جائز غیر مندوب لکھا ہے۔جیسا کہ: مجموع فتاوی ورسائل ابن عثیمین (۱۳۹/۱۷) میں اور

فتاویٰ نور علی الدرب میں مذکور ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حادثات میں ریزہ جسم پر نماز جنازہ کا حکم:

سوال: آج کل کے حادثات میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میت کا جسم ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے اور پہچانا نہیں جاتا، نیز اعضاء بھی بکھرے ہوتے ہیں، تو کیا ان سب کو جمع کر کے اجتماعی نماز جنازہ جائز ہے یا نہیں؟ تاکہ ورثاء کو تسلی ہو جائے؟

الجواب: حادثات میں میت کے جسم کا اکثر حصہ یا نصف حصہ سر کے ساتھ دستیاب ہوا ہو تو سب شہداء کو جمع کرے ان کی نیت سے نماز جنازہ پڑھنا درست ہے، تاکہ سب کو تسلی ہوجائے لیکن اگر ان شہداء میں سے کسی کے جسم کا اکثر حصہ صحیح سالم دستیاب نہیں ہوا تو نماز جنازہ ساقط ہو جائے گی، اگر کوئی پڑھے گا بھی تو یہ عرفی جنازہ ہوگا شرعی جنازہ نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وإن وجد نصفه من غير الرأس أو وجد نصفه مشقوقاً طولاً فإنه لايغسل ولايصلى عليه ويلف في خرقة ويدفن فيها. (الفتاوى الهندية: ١/ ١٥٩).

درمختار میں علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

وجد رأس آدمي، أو أحد شقيه لايغسل ولايصلى عليه بل يدفن إلا أن يوجد أكثر من نصفه ولو بلا رأس. (الدرالمختار: ٢/ ١٩٩، سعيد).

وينظر للمزيد: (البحر الرائق: ۲/ ۳۰۵، ط: رشیدیہ، والفتاوی التاتارخانیۃ: ۲/ ۱۷۸، وبدائع الصنائع: ۱/ ۳۰۲، سعید، وفتاویٰ محمودیہ: ۸/ ۶۶۵، جامعہ فاروقیہ، وکفایت المفتی: ۵/ ۳۶۹، وفتاویٰ حقانیہ: ۳/ ۴۴۰)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

غیر مسلم کے غسل دینے سے غسل کی ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک ہندو لڑکی نے اسلام قبول کیا، پھر اس کا انتقال ہو گیا، مسلمانوں نے اس کے اہل خانہ سے درخواست کی کہ اس کی تکفین وتدفین ہم اسلامی طریقہ پر کریں گے، لیکن اس کے گھر والوں نے فقط نمازِ جنازہ

کی اجازت دی، اب سوال یہ ہے کہ غیر مسلم کا غسل دینا معتبر ہوگا یا نہیں؟ اور نمازِ جنازہ درست ہوگی یا مسلمانوں کو دوبارہ غسل دینا چاہیے؟ بینوا بالدلیل تؤجروا بالاجر الجزیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ دو چیزیں علیحدہ ہیں: ۱۔نمازِ جنازہ کے لیے میت کو پہلے غسل دینا، بغیر غسل کے نمازِ جنازہ درست نہیں، اور غسل کے لیے احناف کے نزدیک نیت ضروری نہیں تو غیر مسلم کا غسل معتبر ہے، اور نماز درست ہے۔

۲۔مسلمانوں کو حکم ہے کہ مسلمان میت کو غسل وکفن کے بعد نمازِ جنازہ پڑھ کر دفن کریں، لہٰذا مسلمانوں کو نماز کی اجازت ملی غسل اور کفن، دفن کی اجازت نہیں ملی تو وہ حق ساقط ہوگیا۔ ہاں اگر غیر مسلم غسل کی اجازت دیتے اور پھر مسلمان غسل نہ دیتے تو سب گنہگار رہوتے کیوں کہ انہوں نے حق ادا نہیں کیا۔

ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر میں قاعدہ " لا ثواب إلا بالنية " کے تحت مرقوم ہے:

وأما غسل الميت ، فقالوا : لا تشترط (أى النية) لصحة الصلاة عليه و تحصيل طهارته ، وإنما هي شرط لإسقاط الفرض عن ذمة المكلفين. وفي حاشية الحموى: قوله : وأما غسل الميت ، قال فى الأكمل قيل: النية لا بد منها في غسل الميت حتى لو أخرج الغريق وجب غسله ، إلا إذا حرك عند الإخراج بنية الغسل لأن الخطاب بالغسل توجه على بني آدم ولم يوجد منهم شيء عند عدم التحريك ، وفيه نظر، لأن الماء مزيل بطبعه ، فكما لا تجب النية في غسل الحي فكذا لا تجب في غسل الميت ولذا قال قاضي خان في فتاواه : ميت غسله أهله من غير نية أجزأهم ذلك...وفى التاتارخانية : والنية في غسله أى الميت ليست بشرط ، انتهى .

أقول: لا صراحة فيما نقله عن قاضي خان وعن التتارخانية لاحتمال أن يكون معنى قول قاضي خان أجزأهم ذلك في حق طهارته ، بمعنى أن الطهارة وقعت صحيحة حتى يصح في أن يصلى عليه ، ومعنى قول التتارخانية (ليست بشرط) أى في صحة الغسل وهذا لاينافي بقاء الفرض في ذمتهم من حيث عدم النية ؛ ومن ثم قال المحقق فى الفتح : الظاهر

اشتراط النية فيه لإسقاط وجوبه عن المكلف لا لتحصيل طهارته ، وهي شرط صحة الصلاة عليه ، انتهى . (الأشباه والنظائر مع شرح العلامة الحموی : ۱/۷۰،ط:ادارة القرآن).

علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ کافرہ اپنے مسلمان شوہر کو غسل دے تو ادا ہوجائیگا۔عبارت ملاحظہ ہو:

فتلخص: أنه لابد في إسقاط الفرض من الفعل، وأما النية فشرط لتحصيل الثواب ولذا صح تغسيل الذمية زوجها المسلم مع أن النية شرطها الإسلام فيسقط الفرض عنا. (فتاوی الشامی: ۲/۲۰۰،سعيد).

عمدۃ الفقہ میں حضرت مولانا سید زوار حسین صاحبؒ فرماتے ہیں:

میت کو غسل دینا زندہ مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے، اسی طرح اس کی تجہیز وتکفین ونماز وتدفین بھی فرض کفایہ ہے،... غسل کا فرض ادا ہونے کے لیے بندوں کی طرف سے اس فعل کا ہونا ضروری ہے اور نیت اس کے لیے شرط نہیں مگر ثواب حاصل کرنے کے لیے کرے ... نیز غسل ادا ہوجانے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ نہلانے والا مکلّف ہو یا نیت کا اس وقت اہل ہو پس اگر نابالغ یا کافر نے نہلا دیا تو غسل ادا ہوگیا۔(عمدۃ الفقہ : ۲/۴۸۶و۴۹۰)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حکومت کے بلا غسل وکفن و بلا نماز دفن کرنے پر نماز کا حکم:

سوال: مغربی افریقہ میں ایک قسم کی بیماری ایبولا (EBOLA) کے نام سے پھیلی ،اطباء کے نزدیک یہ مرض متعدی قرار پایا اور بہت سارے لوگ اس کی بنا پر موت کا شکار ہوئے ،حکومت نے لوگوں کو ان کے قریب آنے سے منع کر دیا حتی کہ ان کے رشتہ داروں کو بھی اجازت نہیں ملی ،خود حکومت نے بلا غسل وکفن و بلا نماز کے دفن کر دیا ،بعض ان میں سے مسلمان بھی تھے ،اب مسلمانوں پر کیا حکم عائد ہوتا ہے ،ان کو کیا کرنا چاہیے؟

الجواب: مسلمانوں کو چاہیے کہ حتی الامکان کوشش کر کے مسلمان میت کو حکومت سے چھڑا کر غسل ، کفن اور نمازِ جنازہ کے ساتھ دفن کریں ،یعنی جو میت کے حقوق ہیں ان کو پورا کریں ،لیکن بصد کوشش ناکامی ہو تو جسم کے پھٹنے سے پہلے قبر پر ہی نمازِ جنازہ پڑھ لی جائے ۔ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه أن رجلاً أسود أو امرأة سوداء كان يقم المسجد فمات ، فسأل النبي صلى الله عليه وسلم عنه، فقالوا: مات قال: أفلا كنتم آذنتموني به دلوني على قبره ، أوقال : قبرها ، فأتى قبرها فصلى عليها . (رواه البخاري : ١/٦٥/٤٥٨،فيصل).

قال في الدرالمختار: وإن دفن وأهيل عليه التراب بغير صلاة ، أو بها بلا غسل أو ممن لا ولاية له صلى على قبره استحساناً مالم يغلب على الظن تفسخه من غير تقدير هو الأصح. وظاهره أنه لو شك في تفسخه صلى عليه .

قوله وأهيل عليه التراب فإن لم يهل أخرج وصلى عليه كما قدمناه ،بحر ، قوله أو بها بحر ، والصحيح أنه لايصلى على قبره في هذه الحالة لأنها بلا غسل غير مشروعة كذا في غاية البيان لكن في السراج وغيره قيل : لا يصلى على قبره وقال الكرخي: يصلى وهو الاستحسان لأن الأولى لم يعتد بها لترك الشرط مع الإمكان والآن زال الإمكان فسقطت فرضية الغسل وهذا يقتضي ترجيح الإطلاق وهو الأولى . (الدرالمختارمع رد المحتار: ٢/ ٢٢٤، سعيد). (وكذا في المحيط البرهاني : ٢/٣٢٨،والبحرالرائق:٢/ ١٨٢،والفتاوى الهندية: ١/ ١٦٥).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

اگراس کو ہاتھ لگا کرغسل دینا دشوار تھا تو لوٹے یا مشک سے پانی بہادیا جاتا، اگر یہ بھی نہ ہوسکتا تھا تو ہاتھ پر تھیلی باندھ کرصرف تیمّم کرادیا جاتا تو پھرنماز جنازہ پڑھ کردفن کیا جاتا اور... جس میت کو بلاغسل ونماز دفن کردیا جائے اس کی قبر پرنماز جنازہ پڑھنے کا حکم ہے جب تک اس کے پھٹ جانے اورٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کاظن غالب نہ ہو۔(فتاویٰ محمودیہ:۸/۵۰۱،جامعہ فاروقیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

میت کی طرف سے نماز پڑھنے اورروزہ رکھنے کاحکم:

سوال: کیامیت کے قضا شدہ صوم وصلاۃ کے بدلہ میں وارث روزہ رکھ سکتا ہے اورنماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ حدیث شریف میں اس کے بارے میں کیاوارد ہوا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ایک آدمی دوسرے آدمی کی طرف سے قضا نماز نہیں پڑھ سکتا اور نہ دوسرے کی طرف سے روزے کی قضا کر سکتا ہے، ہاں نماز، روزہ کا فدیہ ادا کر سکتا ہے۔حدیث شریف میں ممانعت وارد ہوئی ہے، حضرت عبداللہ بن عباس ﷛ فرماتے ہیں کوئی کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے ہاں فدیہ دینا جائز ہے۔

عن ابن عباس ﷛ قال: لا يصلى أحد عن أحد ولايصوم أحد عن أحد ولكن يطعم عنه مكان كل يوم مداً من حنطة . (أخرجه النسائى فى سننه الكبرى ،رقم: ۲۹۳۰).

مراقی الفلاح میں مرقوم ہے:

ولا يصح أن يصوم الولى ولا غيره عن الميت ولايصح أن يصلى أحد عنه لقوله صلى اللّٰه عليه وسلم: لا يصوم أحد عن أحد ولا يصلى أحد عن أحد ولكن يطعم عنه ، وما ورد من قوله صلى اللّٰه عليه وسلم فصومى عن أمك وقوله صلى اللّٰه عليه وسلم: من مات وعليه صيام صام عنه وليه ،فمنسوخ كذا فى البرهان وغيره فما يفعله جهلة الناس الآن من إعطاء دراهم للفقير على أن يصوم أو يصلى عن الميت أو يعطيه شيئاً من صلاته أو صومه ليس بشيء وإنما اللّٰه سبحانه وتعالىٰ يتجاوز عن الميت بواسطة الصدقة التى قدرها الشارع كما بيناه وإن قلنا بأن للعبد أن يجعل ثواب طاعته لغيره فهو غير هذا الحكم فليتنبه له . (مراقى الفلاح ،ص ۱/۱۹۱ ،فصل فى اسقاط الصلاة واصوم).

فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

فى الملتقط ولو أمر الأب ابنه أن يقضى عنه صلوات وصيام أيام لا يجوز عندنا كذا فى التتارخانية إذا مات الرجل وعليه صلوات فائتة فأوصى بأن تعطى كفارة صلواته يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر ...الخ. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۲۵).

حدیث شریف میں آتا ہے؛ ’’**صام عنه وليه**‘‘ اس کی تشریح ملاحظہ کیجیے:

الدرالمنضو د میں مرقوم ہے:

حدیث کی تاویل یہ ہے کہ صوم سے مراد بدلِ صوم یعنی فدیہ مراد ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ " **لا تصوموا عن موتاكم وأطعموا عنهم** " بیہقی سنن کبریٰ۔ (الدر المنضود علی سنن ابی داود: ۴/۲۲۳، ط: مکتبہ خلیلیہ سہارنپور)۔

تحفۃ الالمعی میں مذکور ہے:

اس کا مطلب یہ ہے جتنے روزے ولی پر باقی ہیں اتنے نفل روزے رکھ لو اور ایصالِ ثواب کرو اور اللہ تعالیٰ سے امید باندھو کہ وہ ان روزوں کو میت کے حساب میں لے لے جس طرح میت پر حج فرض ہوتا ہے اس نے وصیت نہیں کی تھی اور کوئی اس کی طرف سے حج کر لے تو امید باندھی جاتی ہے کہ وہ حج اس کے حساب میں لے لیا جائے گا۔ (تحفۃ الالمعی: ۲/۵۹۵، ط: زمزم)۔

ترمذی شریف میں روایت ہے: **من مات وعليه صيام شهر فليطعم عنه مكان كل يوم مسكيناً** . (رواه الترمذي، رقم: ۷۱۸، باب ماجاء من الكفارة).

شیخ ابن بطال اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

وذكر ابن وهب عن الليث أنه يصوم عنه وليه في النذر، وقال ابن عمر رضي الله عنه، وابن عباس رضي الله عنه، وعائشة رضي الله عنها: لا يصوم أحد عن أحد، وهو قول مالك رحمه الله، وأبي حنيفة رحمه الله، والشافعي، وحجة هؤلاء أن ابن عباس رضي الله عنه لم يخالف بفتواه مارواه إلا لنسخ علمه، وكذلك روى عبد العزيز بن رفيع، عن عمرة، عن عائشة رضي الله عنها أنها قالت: يطعم عنه في قضاء رمضان ولا يصام عنه ولهذا قال أحمد بن حنبل رحمه الله: إن معنى حديث ابن عباس في النذر دون قضاء رمضان من أجل فتيا ابن عباس رضي الله عنه، وقد ذكر ذلك البخاري في بعض طرق الحديث في هذا الباب. وقال أبوداود في حديث عائشة رضي الله عنها: معناه في النذر، قال ابن عباس رضي الله عنه قال ابن القصار: ومعنى الأحاديث التي احتجوا بها عندنا أن يفعل عنه وليه ما يقوم مقام الصيام، وهو الإطعام، و يستحب لهم فيصيرون كانهم صاموا عنه، قال المهلب: ولو جاز أن يقضى عمل البدن عن ميت قد فاته لجاز أن يصلي الناس عن الناس، ويؤمنون عنهم ولو كان سائغاً لكان رسول الله

صلى الله عليه وسلم أحرص الناس أن يؤمن عن عمه أبى طالب لحرصه على أدخاله فى الإسلام والإيمان من عمل القلب . (شرح صحيح البخارى لابن بطال : ۱۰۰/۴).

عمدة القارى میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

ثم اعلم أن في هذا الباب اختلافاً كثيراً وأقوالاً : والرابع: يطعم عنه عن كل يوم صاعاً من غير البر ونصف صاع من البر وهو قول أبي حنيفةؒ وهذا إذا أوصى به فإن لم يوص فلايطعم عنه . (عمدة القارى،باب من مات وعليه صوم: ۱۶/۴۹۱). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

دفن سے پہلے میت کا چہرہ دیکھنے کا حکم:

سوال: بعض عورتوں کی عادت ہے کہ میت کے چہرہ کو دیکھتی ہیں اور علماء اور بزرگوں کا چہرہ دیکھنے کو ثواب سمجھتی ہیں، کیا شرعاً اس بات کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب: علماء نے لکھا ہے کہ مرنے کے بعد دفن کرنے سے پہلے میت کا چہرہ دیکھنا جائز اور درست ہے ہاں زندگی میں جس کا چہرہ دیکھنا ناجائز ہو جیسے میت غیر محرم عورت ہو تو مرنے کے بعد بھی اس کا چہرہ دیکھنا ناجائز ہوگا، لیکن آج کل ایک رسم بن گئی ہے اور باقاعدہ اس کی زیارت کرائی جاتی ہے اور ثواب سمجھا جاتا ہے پھر اس کی وجہ سے تدفین میں بھی تاخیر ہوتی ہے، بنابریں یہ رسم قابل ترک ہے اور اس کو رواج نہیں دینا چاہیے۔

بلکہ آج کل تو معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ویڈیو کال کے ذریعہ میت کے چہرے کو دوسرے ملک میں مقیم رشتہ داروں اور اعزہ کو دکھا کر زیارت کرواتے ہیں؛ یہ سب باتیں میت کے ادب واحترام کے خلاف ہے اور قابل ترک ہیں۔

میت کا چہرہ دیکھنا کوئی گناہ نہیں، بلانیت ثواب ویسے زیارت درست ہے۔ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد کا انتقال ہوا تو وہ اپنے والد کا چہرہ دیکھتے اور روتے تھے، اسی طرح حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بوسہ دیا، نیز ایک روایت میں ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چہرۂ انور کی زیارت کی اور بوسہ دیا۔روایات ملاحظہ کیجیے:

بخاری شریف کی حدیث شریف میں ہے:

عن محمد بن المنكدر، قال: سمعت جابر بن عبد الله ﷺ، قال: لما قتل أبي جعلت أكشف الثوب عن وجهه أبكي، وينهوني عنه، والنبي صلى الله عليه وسلم لاينهاني، فجعلت عمتي فاطمة تبكي، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: تبكين أو لا تبكين ما زالت الملائكة تظله بأجنحتها حتى رفعتموه. (صحيح البخاري: ١٦٦/١/١٢٤٤، ط: فيصل).

سنن ابن ماجہ شریف کی روایت میں ہے:

عن عائشةؓ قالت: قبل رسول الله صلى الله عليه وسلم عثمان بن مظعون ﷺ وهو ميت، فكأني أنظر إلى دموعه تسيل على خديه. (رواه ابن ماجه، ص ١٠٥/١٤٥٦، ط: قديمى).

مسند احمد میں روایت ہے:

عن حميد بن عبد الرحمن قال: توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبوبكر في طائفة من المدينة قال: فجاء فكشف عن وجهه فقبله وقال: فداک أبي وأمي ما أطيبک حياً وميتاً، مات محمد صلى الله عليه وسلم ورب الكعبة. (أخرجه الإمام أحمد في مسنده: ١٩٨/١/١٨، ط: الرسالة).

مذکورہ بالا احادیث سے میت کا چہرہ دیکھنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ نیز فتاویٰ ہندیہ میں بھی جواز مرقوم ہے:

ولا بأس بأن يرفع ستر الميت ليرى وجهه وإنما يكره ذلک بعد الدفن كذا فى القنية. (الفتاوى الهندية: ٣٥١/٥).

کفایت المفتی میں ہے: دفن سے پہلے منہ کھول کر دکھانا مباح ہے۔

کفایت المفتی کی تعلیقات میں مذکور ہے: چونکہ اس میں کئی مفاسد پائے جاتے ہیں، اس لیے اس کا ترک کرنا ہی بہتر ہے مثلاً اس کو باعثِ ثواب سمجھنا، تصویر کشی کرنا، تدفین میں تاخیر کرنا وغیرہ۔ (کفایت المفتی مع التعلیقات: ۴۳۱/۵، ط: جامعہ فاروقیہ)۔

فتاویٰ فریدیہ میں مذکور ہے: مردہ کا چہرہ دیکھنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، **كما فى الهندية...** (فتاویٰ فریدیہ: ۲۹۰/۳)۔

خیر الفتاویٰ میں مرقوم ہے: جسے زندگی میں دیکھنا جائز ہے، اُسے موت کے بعد بھی دیکھ سکتے ہیں۔ (خیر الفتاویٰ: ۳/۲۱۷)۔

ہاں فی زماننا رسم کی شکل اختیار کرنے کی وجہ سے بعض مفتی حضرات نے سداً للذریعہ بچنے کی ترغیب دی ہے۔ اکابر کے چند فتاویٰ پیش خدمت ہیں: ملاحظہ ہو احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

سوال: میت کفنانے کے بعد اس کا منہ دکھانے کی رسم کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب: اس رسم میں مندرجہ ذیل مفاسد ہیں، اس لیے واجب الترک ہے:

(۱) بعض علاقوں میں میت کا منہ دیکھنے کو باعثِ اجر وثواب سمجھا جاتا ہے، حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں، لہٰذا اس میں ثواب سمجھنا بدعت ہے، اور اگر ثواب نہ بھی سمجھے تو اس سے بدعت کی ترویج وتائید ہوتی ہے۔

(۲) شرعی حکم یہ ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت اور کفناتے وقت کم از کم آدمی ہوں اور وہ میت کے اقارب واحباب میں سے ہوں، تاکہ میت میں خدانخواستہ کوئی عیب یا تغیر پیدا ہو جائے تو اس کا افشا نہ ہو، منہ دکھانے کی رسم شریعت کے اس حکم وحکمت کے خلاف ہے۔

(۳) اگر میت کوئی مشہور شخصیت ہے تو اس کی منہ دکھائی کی رسم میں کئی گھنٹے صرف کئے جاتے ہیں، حالانکہ میت کے دفن میں تاخیر جائز نہیں۔

(۴) رونمائی کی رسم کا نتیجہ یہ ہے کہ میت کی تصویریں لے کر اخبارات میں شائع کی جاتی ہیں، جس میں تصویر کی لعنت وعذاب کے علاوہ میت کے چہرے میں تغیر کی اشاعت ہے جو حرام ہے۔

آج کل یہ قبیح رسم خواص علماء ومشائخ میں بھی عام رائج ہوگئی ہے، اس لیے اس سے احتراز کی وصیت کرنا واجب ہے، ... (احسن الفتاویٰ: ۴/۲۱۹)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں مرقوم ہے:

سوال: ہمارے یہاں نمازِ جنازہ کے بعد حاضرین کو میت کا منہ دکھلایا جاتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب: یہ رسم غیر ضروری اور مکروہ ہے کہ موجبِ تاخیر ہے حالانکہ تعجیل مامور بہ ہے، اسی لیے جنازہ

لے جاتے وقت تیز چلنے کا حکم حدیث میں ہے: أسرعوا بالجنازة ، شامی میں ہے: قوله ويسرع بها بلا خبب ، وحد التعجيل المسنون أن يسرع به بحيث لا يضطرب الميت على الجنازة للحديث أسرعوا بالجنازة . (شامي، مراقي الفلاح مع طحطاوي) جب تاخیر کی وجہ سے میت کے لیے بعد نمازِ جنازہ اجتماعی دعا ممنوع ہے تو منہ دکھانے کے لیے اجتماع کیسے درست ہے؟ فتاویٰ سراجیہ میں ہے: إذا فرغ من الصلاة لايقوم بالدعاء (فتاویٰ سراجيه ،وخلاصة الفتاویٰ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱/ ۵۳۶، دیو بند)۔

اغلاط العوام میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

مسئلہ: بعض علاقہ میں میت کا منہ دیکھنا باعثِ ثواب سمجھا جاتا ہے شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں اس میں ثواب سمجھنا بدعت ہے۔ (اغلاط العوام، ص ۲۱۴، ط: زمزم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شہید کے دَین کی معافی کا حکم:

سوال: شہداء کی تقریباً ۶۲ اقسام ہیں؛ جو فتاویٰ دار العلوم زکریا جلدِ دوم میں مرقوم ہیں، شہید کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں، لیکن یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا شہید کا دین یعنی قرض بھی معاف ہوجائے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: شہید کے تمام گناہ جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں معاف ہوجاتے ہیں، ہاں جو حقوق العباد سے متعلق ہیں، مثلاً دین وغیرہ تو ان کی ادائیگی ضروری ہے، الا یہ کہ ادا نہ کرسکتا ہو تو اللہ تعالیٰ صاحبِ حق کو اس کی طرف سے راضی کردیں گے۔ ملاحظہ ہو مسلم شریف کی حدیث میں ہے:

عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: يغفر للشهيد كل ذنب إلا الدين . (صحيح مسلم : ۲/ ۱۳۵ ،باب من قتل في سبيل الله كفرت خطاياه الا الدين).

امام نوویؒ حدیثِ بالا کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وأما قوله صلى الله عليه وسلم: إلا الدين ، ففيه تنبيه على جميع حقوق الآدميين وإن الجهاد والشهادة وغيرهما من أعمال البر لا يكفر حقوق الآدميين وإنما يكفر حقوق الله

تعالیٰ . (شرح صحیح مسلم بهامش صحیح مسلم: ۲/۱۳۵،ط:قدیمی).

قال الملا علی القاریؒ: يغفر للشهيد كل ذنب ، أی صغير وكبير، إلا الدَين أراد حقوق الآدميين من الأموال والدماء والأعراض فإنها لا تعفى بالشهادة كذا ذكره بعض الشراح . (مرقاة المفاتيح: ۶/۱۰۳،ط:امدادیه).

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

شہادت کی وجہ سے امید ہے کہ حقوق اللہ سے متعلق گناہ معاف ہو جائیں گے،لیکن بندوں سے متعلق جو حقوق ہیں وہ شہادت یاکسی اور نیکی کی وجہ سے معاف نہیں ہوتے، دَین بھی ایسے ہی حقوق میں سے ہے، چنانچہ حدیث میں یہ بات صراحتاً معلوم ہوتی ہے کہ شہادت کے باوجود انسان دین کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہوتا۔ (کتاب الفتاویٰ:۳/۲۴۲)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

نیک صالح آدمی کے قریب دفن ہونے کا فائدہ:

سوال: اگر کسی نیک صالح آدمی کسی جگہ مدفون ہے تو وہاں کے قریبی مردوں کو اس سے کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: امام سیوطیؒ نے شرح الصدور میں مختلف روایات نقل فرمائی ہیں،جن سے پتا چلتا ہے کہ صالحین کے درمیان میں دفن کرنے سے فائدہ ہوتا ہے، نیز ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک مردہ کو خواب میں دیکھا بظاہر عذاب کی شکل تھی اس کو بہت افسوس ہوا، پھر چند دن کے بعد دوبارہ اُس کو خواب میں دیکھا تو اس کا حال بہت اچھا تھا، وجہ پوچھنے پر مردے نے بتایا: ہمارے درمیان میں ایک نیک مرد دفن ہوا اُس نے چالیس پڑوسیوں کے حق میں شفاعت کی، میں بھی اُن میں سے ہوں۔روایت ملاحظہ کیجیے:

قال الإمام السيوطي في جمع الجوامع : ادفنوا موتاكم وسط قوم صالحين، فإن الميت يتأذى بجار السوء كما يتأذى الحي بجار السوء . ابو نعيم فی الحلية ،والخليلی فی مشيخته ، وقال: غريب جداً عن أبی هريرةؓ ، وابن عساكر عن عليؓ وابن مسعودؓ

وابن عباس رضی اللہ عنہ ، حديث أبى هريرة رضی اللہ عنہ: أخرجه أبونعيم فى الحلية (۲/۳۵۴)، وأخرجه أيضاً: الديلمى (۱/۱۰۲،رقم:۳۳۷) والرافعى(۲/۱۷۷)، وابن حبان فى الضعفاء (۱/۲۹۰،ترجمة: ۳۲۵)، داود بن الحصين بن عقيل بن منصور، وقال حدث حديثين منكرين عن الثقات ، ثم ذكر الحديث ، وقال: هذا خبر باطل لا أصل له ، وابن الجوزى فى الموضوعات من طريقه أبى نعيم (۳/۵۵۲، رقم: ۱۷۸۱) وقال : حديث لايصح.

حديث على : أخرجه ابن عساكر (۳۷/۱۹۷) ، وأخرجه أيضاً: أبوموسى المدينى فى جزء من أدركه الخلال من أصحاب ابن مندة (ق ۱۵۱/۲).

حديث ابن مسعود رضی اللہ عنہ : أخرجه ابن عساكر (۵۸/۳۷۷)، ومن غريب الحديث: (يتأذى) : يتضررمن وجوده بجوار جارالسوء ، والمعنى: يستحب دفن الميت بالقرب من قبر رجل صالح ، ويكره الدفن بالقرب من قبر مبتدع أو فاسق. (الجامع الكبير للامام السيوطى: ۱/۱۲۸۲، رقم: ۹۵۵).

وأخرج ابن أبى الدنيا فى القبور عن عبد اللّٰه بن نافع المزني قال: مات رجل بالمدينة فدفن بها فرآه رجل كأنه من أهل النار فاغتم لذلک ثم أريه بعد سابعة أو ثامنة كأنه من أهل الجنة فسأله قال: دفن معنا رجل من الصالحين فشفع فى أربعين من جيرانه فكنت فيهم . (شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور،ص۱۰۷،ط:دارالمعرفة).

علامہ قرطبیؒ " التذكرة فى احوال الموتى وأمور الآخرة " میں روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال علماؤنا :و يستحب لک ـ رحمک اللّٰه ـ أن تقصد بميتک قبور الصالحين ، ومدافن أهل الخير ، فتدفنه معهم ، وتنزله بإزائهم ، وتسكنه فى جوارهم ، تبركاً بهم ، وتوسلاً إلى اللّٰه عزوجل بقربهم ، وأن تجتنب به قبورمن سواهم ، ممن يخاف التأذى بمجاورته ، والتألم بمشاهدة حاله حسب ماجاء فى الحديث .

يروى أن امرأة دفنت بقرطبة ــ أعادها اللّٰه ــ فأتت أهلها فى النوم فجعلت تعتهم و

تشکوهم وتقول ما وجدتم أن تدفنوني إلا إلى فُرن الجير (أی تنور الجص، چونے کا تنور)؟ فلما أصبحوا نظروا فلم يروا في ذلک الموضع كله ولا بقربه فُرن الجير. فبحثوا وسألوا عن من كان مدفوناً بإزائها؟ فوجدوه رجلاً سيافاً كان لابن عامر وقبره إلى قبرها، فأخرجوها من جواره ذكر هذا أبومحمد عبد الحق فی كتاب العاقبة له.

وعن أعرابي أنه قال لولده: ما فعل الله بک؟ قال: ما ضرنی إلا أني دفنت بأزاء فلان، وكان فاسقاً قد روعني ما يعذب به من أنواع العذاب. (التذكرة في أحوال الموتى وأمور الآخرة، ص۱۰۵، باب ما يختار للميت قوم صالحون يكون معهم، ط: القاهرة). واللہ ﷻ اعلم۔

کافر کی قبر کی زیارت کرنے کا حکم:

سوال: درجِ ذیل دو حدیثوں کی وجہ سے کافر کی قبر کی زیارت جائز ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

عن سليمان بن بريدة عن أبيه، قال: راز النبي صلى الله عليه وسلم قبر أمه، في ألف مقنع، فلم ير باكياً أكثر من يومئذٍ. هذا حديث صحيح على شرط الشيخين، ولم يخرجاه. (المستدرک على الصحيحين: ۱/۳۷۴/۱۳۸۹).

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: زار رسول الله صلى الله عليه وسلم قبر أمه، فبكى وأبكى من حوله، ثم قال: استأذنت ربي أن أزور قبرها فأذن لي، واستاذنته أن أستغفر لها فلم يؤذن لي فزوروا القبور فإنها تذكر الموت. وهذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه. (المستدرک للحاكم: ۱/۳۷۴/۱۳۹۰، واخرجه مسلم، رقم: ۹۷۶).

الجواب: کافر کے اعزاز واحترام کی خاطر زیارت کی جائے تو یہ ناجائز ہے، ہاں عبرت کی نیت سے زیارت جائز ہے، لیکن کوئی دینی مفسدہ پیدا ہوتا ہو تو نہیں جانا چاہیے۔ مفسدہ کا مطلب یہ ہے کافر کی زیارت سے ان کی عزت واحترام کا شبہ ہو تو ناجائز ہے۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے استدلال تام نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے ایمان

کے بارے میں بہت اختلاف ہے، علماء نے مختلف رسالے لکھے ہیں، اگر عدمِ ایمان ثابت بھی ہو جائے تب بھی روایت میں یہ الفاظ مذکور ہیں، فإنها تذكر الموت، قبروں کی زیارت موت کی یاد تازہ کرتی ہے، اور اس غرض سے زیارت جائز ہے، بیان القرآن میں حضرت تھانویؒ نے جائز لکھا ہے، الا یہ کہ کوئی دینی مفسدہ ہو۔ ہاں کافر کے اعزاز واکرام میں زیارت جائز نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر مظہری میں مذکور ہے:

ولا تصل: المراد بالصلاة الدعاء والاستغفار للميت فيشمل صلاة الجنازة أيضاً لأنها مشتملة على الدعاء والاستغفار... مات أبداً، ولا تقم على قبره للدفن أو للزيارة.

(التفسير المظهري: ۴/۲۷۶).

معارف القرآن میں مرقوم ہے:

اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی کافر کے اعزاز واکرام کے لیے اس کی قبر پر کھڑا ہونا یا اس کی زیارت کے لیے جانا حرام ہے، عبرت حاصل کرنے کے لیے ہو یا کسی مجبوری کی وجہ سے ہو تو وہ اس کے منافی نہیں۔ (معارف القرآن: ۴/۴۳۷، ادارۃ المعارف)۔

بیان القرآن میں حضرت تھانویؒ نے اسی آیتِ کریمہ کے تحت لکھا ہے:

کافر کے جنازہ پر نماز اور اس کے لیے استغفار جائز نہیں، قیام علی القبر سے وہ مراد ہے جو بطورِ اکرام کے ہو، خواہ بغرضِ زیارت ہو یا بغرضِ دفن، اور اگر عبرت اور تذکر موت کے لیے ہو یا ضرورت کے لیے ہو جیسے ہدایہ میں ہے کہ جس کا کوئی رشتہ دار مر جائے اور اس کا انتظام اس کے متعلق آ پڑے تو اس کو بدونِ رعایت طریقہ مسنونہ کے غسل وکفن دے کر دفن کر دے تو اس طرح قیام علی القبر درست ہے، لیکن اگر زیارت بغرضِ عبرت میں کوئی مفسدہ دینیہ ہو تو جائز نہیں، فقط۔ (بیان القرآن: ۴/۱۳۱، تاج پبلشرز، دہلی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

آبِ زمزم میں کپڑا دھو کر کفن کے لیے رکھنے کا حکم:

سوال: بعض لوگ حج اور عمرہ کے لیے جاتے ہیں تو وہاں سے کفن کے لیے کپڑا خرید تے ہیں پھر اس کو آبِ زمزم میں دھو کر کفن کے لیے رکھ لیتے ہیں، کیا ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ جبکہ کپڑا سوکھنے کے بعد زمزم کا

کوئی اثر باقی نہیں رہتا، تو پھر اس کا کیا فائدہ ہوگا؟

الجواب: پارچہ کفن کو آبِ زمزم میں تر کر کے حصولِ برکت کی خاطر کفن کے لیے رکھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر چہ پانی خشک ہوجائیگا لیکن اس کی برکات باقی رہ جائیں گی، اس کے بہت سے نظائر موجود ہیں: ا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص مبارک عبداللہ بن ابی بن سلول کو دی تھی۔ ۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہبند اپنی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مرحمت فرمایا تھا، اور فرمایا: " أشعرنها إياه " ۔۳۔ ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تہبند کفن کے لیے طلب کیا اور آپ نے عنایت فرمایا۔

نیز جب ایک کپڑا نجاست آلود ہو کر ناپاک ہوجاتا ہے تو خشک ہونے کے بعد بھی ناپاک ہی رہتا ہے، تو اسی طرح مبارک پانی والا کپڑا پانی کے خشک ہونے کے بعد بھی مبارک سمجھا جائیگا۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں روایت ہے:

عن ابن عمر رضي الله عنه أن عبد اللّٰه بن أبی لما توفي جاء ابنه إلى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم فقال: يا رسول اللّٰه أعطني قميصک أكفنه فيه وصل عليه واستغفر له فأعطاه النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قميصه ... (رواه البخاری: ۲/۷۶/۱۲۶۹، باب الکفن فی القمیص الذی یکف).

وعن عمرو سمع جابراً قال: أتى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم عبد اللّٰه بن أبي بعد ما دفن فأخرجه فنفث فيه من ريقه وألبسه. (رواه البخاری: ۲/۷۶/۱۲۷۰، باب الکفن فی القمیص...).

وعن أم عطية رضي اللّٰه تعالىٰ عنها قالت: دخل علينا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ونحن نغسل ابنته فقال: اغسلنها ثلاثاً ...فإذا فرغتن فآذنني فلما فرغنا آذناه فألقى إلينا حقوة فقال: أشعرنها إياه . (رواه البخاری: ۲/۷۴/۱۲۵۴، باب مایستحب ان یغسل وتراً).

وعن سهل رضي اللّٰه تعالىٰ عنه أن امرأة جاء ت النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ببردة منسوجة فيها حاشيتها أتدرون ما البردة قالوا: الشملة ، قال: نعم، قالت: نسجتها بيدى فجئت لأكسوكها فأخذها النبي صلى اللّٰه عليه وسلم محتاجاً إليها فخرج إلينا وأنها إزاره فحسنها فلان فقال: اكسنيها ما أحسنها ، قال القوم : ما أحسنت لبسها النبي صلى اللّٰه عليه

وسلم محتاجاً إليها ثم سألته وعلمت أنه لا يرد قال: إني والله ما سألته لألبسه إنما سألته لتكون كفني، قال سهل: فكانت كفنه . (رواه البخاری: ۱۲۷۷/۷۸/۲، باب من استعد الكفن فی زمن النبی صلی الله علیه وسلم فلم ینکر علیه).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

کفنِ مبلول بماءِ زمزم میں میرے نزدیک جواز کی جہت راجح ہے، اوراس کواستنجاء بمائے زمزم پر قیاس نہ کرنا چاہیے، کیونکہ استنجاء میں عین زمزم کی تعریض للنجاستہ ہے اور ثوبِ مبلول بماءِ زمزم میں مائے زمزم بصورتہ موجودنہیں ہے، خشک ہو چکا ہے، صرف کپڑے کااس کے ساتھ گزشتہ زمانہ میں تلبس ہوا ہے اوراس قسم کے تلبس کوعدمِ جوازِ تکفین میں دخل نہیں۔ (کفایت المفتی: ۳۳۲/۵، ط: جامعہ فاروقیہ)۔

امدادالفتاویٰ میں مذکور ہے:

آبِ زمزم از کفن مبلول مانند از بدن انسان خشک خواہد شد ذات او غیر موجود است وتبرک امر معنوی است۔ (امدادالفتاویٰ: ۵۶۴/۱، دارالعلوم کراچی)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے: سوال: کپڑے کوزمزم کے پانی میں تر کرکے خشک ہونے کے بعد کفن میں استعمال کرسکتے ہیں، بے ادبی تونہیں ہوگی؟ الجواب: ہاں! حصولِ برکت کی غرض سے آبِ زمزم میں تر کرکے خشک کیا ہوا کپڑا کفن میں استعمال کرسکتے ہیں۔اس میں سوءِ ادب جیسی کوئی چیز نہیں ہے، قمیص مبارک کوکفن میں استعمال کرنا حدیث سے ثابت ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۴۸۳/۳، ط: دیوبند)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ حقانیہ: ۴۶۳/۳، وکتاب الفتاویٰ: ۱۵۹/۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

برائے تعزیت آنے والے مہمان کے لیے کھانے کا انتظام والی روایت کی تحقیق:

سوال: فتاویٰ دارالعلوم زکریا جلد سوم ص ۶۵ پر یہ مسئلہ لکھا گیا ہے کہ میت کے گھر میت کے گھر والوں کے لیے اور تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے کھانے کا انتظام درست ہے اوراس کی دلیل میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا تھا وہ واقعہ

پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ بعض علماء یہ اشکال کرتے ہیں کہ یہ واقعہ تاریخ کی بہت ساری کتابوں ،مثلاً: دلائل النبوۃ للبیہقی (۵/۲۲۲)،وتاریخ مدینہ دمشق (۶۶/ ۲۱۸) والمستدرک للحاکم (۴/۱۱۳)،وحلیۃ الاولیاء(۱/ ۱۶۹)،وتاریخ طبری (۳/ ۱۳۸)،وغیرہ میں مذکور ہے لیکن ان میں سے جن روایات میں کھانا پکانے اور کھلانے کا ذکر ہے ان کی اسانید میں سیف بن عمر ہیں جو انتہائی ضعیف بلکہ متروک راوی ہے ، پھراس واقعہ سے استدلال کیسے ہوسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں کے کھانا پکانے اور کھلانے والی روایت کی اسانید میں سیف بن عمر انتہائی ضعیف اور متروک راوی ہے، لیکن طعامِ حاجت اور طعامِ صدقہ دوسری روایات سے ثابت ہے،اوران میں سے بعض روایات اسی واقعہ کے ساتھ مذکور ہیں،مثلاً: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تلبینہ والی روایت ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن عائشة رضى الله تعالىٰ عنها زوج النبي صلى الله عليه وسلم: أنها كانت إذا مات الميت من أهلها، فاجتمع لذلک النساء ، ثم تفرقن إلا أهلها وخاصتها ، أمرت ببرمة من تلبينة فطبخت، ثم صنع ثريد فصبت التلبينة عليها ، ثم قالت: كلن منها ، فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: التلبينة مجمة لفواد المريض، تذهب ببعض الحزن. (رواه البخاري: ۲/ ۸۱۵/ ۵۴۱۷).

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ جب ان کی برادری میں کسی کا انتقال ہوجاتا تھا تو عورتیں جمع ہوجاتی تھیں ، پھر جب عورتیں چلی جاتیں ،اورگھر کی اور بعض مخصوص عورتیں رہ جاتی تھیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تلبینہ پکواتی تھیں اور ثرید بنا کراس پر تلبینہ ڈال کر فرماتی کھاؤ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ مریض کے دل کو سکون اور راحت پہنچاتا ہے اور کچھ غم کو ہلکا کرتا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات پر کھانا پکانے اور کھلانے والی روایت کی تحقیق ملاحظہ ہو تاریخ مدینہ دمشق میں ہے:

أخبرنا أبو القاسم بن السمرقندى (ثقة) أنا أبو الحسين بن النقور (صدوق) أنا المخلص (ثقة) أنا أبوبكر بن سيف (ثقة) أنا السرى بن يحيى (صدوق) أنا شعيب بن

إبراهيم (مجهول) نا سيف بن عمر (ضعيف جداً) عن إسماعيل بن رافع(ضعيف) عن محمد بن كعب أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قيل له عام تبوك تخلف أبوذر وهو في الطريق فطلع فقال: يرحم اللّٰه أباذر يمشي وحده ويموت وحده ويبعث وحده قال: فلما حضرت أبا ذر الوفاة ... و أطبخي هذا اللحم فإنه سيشهدني قوم صالحون يلون دفني فأقريهم فلما دفناه دعينا إلى الطعام فأكلنا . (تاريخ مدينة دمشق : ٦٦/ ٢١٨).

رجال کی تحقیق ملاحظہ کیجیے:

❁ الحافظ أبو القاسم إسماعيل بن أحمد بن عمربن أبى الأشعث السمرقندى (م٥٣٦هـ)۔ انظر: (تاريخ الاسلام : ١١/ ٦٥٠)، تاريخ دمشق :٨/٣٥٧).

❁ أحمد بن محمد بن أحمد بن عبد اللّٰه بن النقور، أبوالحسين البغدادى البزار، (م ٤٧٠هـ)، انظر: تاريخ الاسلام (١٠/ ٢٨٨)،الثقات للقاسم بن قطلوبغا(١/ ٤٧٤)،تاريخ بغداد(٥/ ١٤٦).

❁ محمد بن عبدالرحمن بن العباس بن عبد الرحمن بن زكريا، محدث العراق ، أبوطاهر البغدادى الذهبى المخلص ، (م٣٩٣هـ)، انظر: تاريخ الاسلام (٨/ ٧٣٢،والثقات للقاسم بن قطلوبغا: ٨/١/ ٢١٧، وتاريخ بغداد:٣/ ١٢٣).

❁ أحمد بن عبد اللّٰه بن يوسف ، أبوبكر السجستانى الفارض (م ٣١٦هـ) ، انظر: (تاريخ الاسلام ٧/ ٣٠٢، وتاريخ بغداد: ٤/ ٣٤٨).

❁ السرى بن يحيى بن السرى بن مصعب ، أبوعبيدة ،ابن أخى هناد بن السرى ، الكوفى الدارمى ،انظر: تاريخ الاسلام : ٦/ ٥٤٧، والثقات للقاسم بن قطلوبغا: ٤/ ٤٢٧.

❁ شعيب بن إبراهيم الكوفي، قال الذهبى فى الميزان (٢/ ٢٧٥)راويه كتب سيف عنه ، فيه جهالة ،كذا فى ديوان الضعفاء (ص١٨٧)، وذكره ابن عدى فى الكامل : (٥/ ٦)، وقال ليس بالمعروف ، وله أحاديث وأخبار وفيه بعض النكرة وفيها ما فيه تحامل على السلف .

۞ سيف بن عمر التميمي الأسيدي ، ويقال الضبي الكوفي، قال يحيى بن معين : ضعيف الحديث . وقال أبوحاتم: متروك بابة الواقدي . وقال أبوداود: ليس بشيء . وقال ابن حبان: اتهم بالزندقة . وقال الحاكم : سيف بن عمر الضبي، اتهم بالزندقة ، وهو ساقط في رواية الحديث. وروى ابن حبان بإسناد أنه كان يضع الحديث . وقال ابن عدي: عامة حديثه منكر. انظر: تاريخ الاسلام :۴/ ۱۶۴، وميزان الاعتدال : ۲/۲۵۵، والكامل :۴/۵۰۷.

۞ إسماعيل بن رافع بن عويمر. قال سفيان بن عبد الملك ، عن ابن المبارك : ليس به بأس، ولكنه يحمل عن هذا وهذا ويقول: بلغني ، ونحو هذا ، وقال عمرو بن علي: منكر الحديث ، في حديثه ضعيف. وقال يحيى بن معين : ضعيف . وقال أبوحاتم: منكر الحديث . انظر: تهذيب الكمال :۳/۸۹، والتاريخ الكبير : ۱/۳۵۴،وتاريخ دمشق :۸/۳۹۶ .

۞ محمد بن كعب بن سليم القرظي أبوحمزة (م ۱۲۰هـ)، انظر: سيراعلام النبلاء : ۵/۶۵، وتهذيب التهذيب: ۲۶/۳۴۰ . واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عالمِ برزخ میں ارواح کی ملاقات کا حکم:

سوال: مرنے کے بعد وفات پانے والی روح کی ملاقات دوسری ارواح سے ہوتی ہے یانہیں؟ ایک دوسرے کے حالات کی خبر ہوتی ہے یانہیں؟ نیز عالمِ برزخ میں ارواحِ سعیدہ ارواحِ عاصیہ کی شفاعت کرتی ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مرنے کے بعد ارواح دوقسم کی ہوتی ہیں؛ ا۔سجین والی روحیں، یہ تو عذاب میں مبتلا ہوتی ہیں انہیں ملنے جلنے کی کہاں فرصت ۔۲۔علیین والی روحیں آپس میں ملاقات کرتی ہیں اور دنیا کے واقعات پر گفتگو کرتی ہیں، اور ایک دوسرے کو خوشخبری سناتی ہیں ۔ نیز ارواحِ سعیدہ ارواحِ عاصیہ کے لیے باذن اللہ شفاعت کرتی ہیں، یعنی جن کے حق میں اجازت ملے ان کے لیے شفاعت اور جن کو شفاعت کی اجازت ملے وہی شفاعت کرتی ہیں۔ ملاحظہ ہو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

۱۔ ﴿من ذا الذي يشفع عنده إلا بإذنه﴾ [البقرة:۲۵۵]، ترجمہ: کون ہے جو بلا اجازت کے اللہ سے سفارش کر سکے۔

۲۔ ﴿ما من شفيع إلا من بعد إذنه﴾ [یونس:۳]، ہر شفیع اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت کے بعد ہی کھڑا ہوگا۔

۳۔ ﴿ولا يشفعون إلا لمن ارتضى﴾ [الانبیاء:۲۸]، اسی کی سفارش کریں گے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے۔

۴۔ ﴿ ولا تنفع الشفاعة عنده إلا لمن أذن له﴾ [سبا:۲۳]، اللہ تعالیٰ کے نزدیک شفاعت اسی کو فائدہ پہنچائے گی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہوگی۔

درجِ ذیل حدیث سے پتا چلتا ہے کہ ارواح کی ملاقات ہوتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

عن عبد الرحمن بن كعب بن مالک عن أبيه ، قال: لما حضرت كعباً الوفاة ، أتته أم بشر بنت البراء بن معرور؛ فقالت: يا أباعبد الرحمن، إن لقيت فلاناً فاقرأ عليه منى السلام قال: غفر اللّٰه لک يا أم بشر نحن أشغل من ذلک قالت: يا أبا عبدالرحمن ! أما سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: إن أرواح المؤمنين في طير خضر، تعلق بشجر الجنة قال: بلى، قالت: فهو ذاک. (رواه ابن ماجه، رقم: ۱۴۴۹، باب ماجاء فيمايقال عندالمريض اذاحضر).

مذکورہ بالا روایت کی مزید تشریح وتفصیل آگے تناسخ والے مسئلہ کے تحت آ رہی ہے۔

امام سیوطیؒ نے الحاوی میں چند روایات نقل فرماتی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

وأسند أبونعيم فى الحلية عن وهب بن منبه قال: إن للّٰه فى السماء السابعة داراً يقال لها البيضاء تجتمع فيها أرواح المؤمنين فإذا مات الميت من أهل الدنيا تلقته الأرواح يسألونه عن أخبار الدنيا كما يسأل الغائب أهله إذا قدم عليهم ، وقال ابن أبى الدنيا: حدثنا خالد بن خداش سمعت مالک بن أنس ﷺ يقول: بلغني أن أرواح المؤمنين مرسلة تذهب حيث شاء ت .

وأخرج البزار بسند صحيح عن أبى هريرة ﷺ رفعه: إن المؤمن ينزل به الموت ويعاين ما يعاين يود لوخرجت نفسه والله يحب لقاء المؤمن وإن المؤمن تصعد روحه إلى السماء فتأتيه أرواح المؤمنين فيستخبرونه عن معارفه من أهل الأرض فإذا قال: تركت فلاناً فى الدنيا أعجبهم ذلك ، وإذا قال: إن فلاناً قد مات قالوا ما جيء به إلينا .

وأخرج ابن أبى الدنيا بأسانيد عن عبيد بن عميرقال: إذا مات تلقته الأرواح فيستخبرونه كما يستخبر الراكب ما فعل فلان فلان . وعن الحسن قال: إذا احتضر المؤمن حضره خمس مائة ملك يقبضون روحه فيعرجون به إلى السماء الدنيا فتتلقاه أرواح المؤمنين الماضين فيريدون أن يستخبروه فتقول لهم الملائكة ارفقوا به فإنه خرج من كرب عظيم فيسأله الرجل عن أخيه وعن صاحبه. عن سعيد بن جبير، قال: إذا مات الميت استقبله ولده كما يستقبل الغائب .

وعن ثابت البناني، قال: بلغنا أن الميت إذا مات احتوشه أهله وأقاربه الذين قد تقدموه من الموتى فهو أفرح بهم وهم أفرح به من المسافر إذا قدم على أهله . (الحاوى للفتاوى: ۲/ ۱۶۴،بيروت).

علامہ ابن قیمؒ نے کتاب الروح میں بیان کیا ہے:

إن الأرواح قسمان: أرواح معذبة وأرواح منعمة ، فالمعذبة في شغل بما هي فيه من العذاب عن التزاور والتلاقي والأرواح المنعمة المرسلة غير المحبوسة تتلاقى وتتزاور وتتذاكر ما كان منها فى الدنيا وما يكون من أهل الدنيا فتكون كل روح مع رفيقها الذى هو على مثل عملها وروح نبينا محمد صلى الله عليه وسلم فى الرفيق الأعلى، قال الله تعالىٰ: ومن يطع الله والرسول فأولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقاً وهذه المعية ثابتة فى الدنيا وفى الدار البرزخ وفى دار الجزاء والمرء مع من أحب فى هذه الدور الثلاثة . (كتاب الروح،ص ۲۲).

مزید ملاحظہ ہو: (کتاب الروح، ص ۲۴. و ص ۱۱۲).

لباب الفتاویٰ میں مذکور ہے:

اگر اعمال اچھے ہوں تو پہلے وفات پانے والوں کی روحیں بعد میں وفات پانے والے رشتہ دار کی روح سے ملاقات کرتی ہیں اور اس سے گفتگو کرتی ہیں اور اپنے زندہ اقارب ورشتہ داروں کی خیریت بھی پوچھتی رہتی ہیں، بشرطیکہ بعد میں وفات پانے والا بھی نیک مسلمان ہو۔ (لباب الفتاویٰ:۱/۳۹۳، ط: جمبوسر)۔

علامہ قرطبی نے التذکرۃ میں اور امام سیوطی نے شرح الصدور میں چند واقعات نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک صالح آدمی عالمِ برزخ میں عاصی اور گنہگار کے لیے شفاعت کرتا ہے اور اپنے چالیس پڑوسیوں کی شفاعت باذن اللہ کرتا ہے، عبارات پہلے گزر چکی ہیں، بسببِ طوالت چھوڑ دیا جاتا ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شہداء کی ارواح سبز پرندوں میں ہونے کا مطلب اور عقیدۂ تناسخ:

سوال: ایک حدیث کے مطابق شہید کی روح سبز پرندے میں عرش کے نیچے قندیل میں لالٹین کی شکل رہتی ہے، اور جنت میں جہاں جانا چاہے جاسکتی ہے، اس حدیث پر چند اشکالات ہیں؛۔

۱۔ انسانی روح کا پرندہ میں جانا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف انتقال ہے کیونکہ انسان سے پرندہ بن گیا؟

۲۔ جنت میں داخلہ قیامت میں ہوگا، تو شہید کی روح قیامت سے پہلے جنت میں کیسے داخل ہوئی؟

۳۔ انسانی روح کا پرندہ میں جانا تناسخ ہے جو ہندوؤں کا عقیدہ ہے؟

۴۔ بعض روایات میں عام مومنین کی ارواح کا پرندہ میں منتقل ہونے کا ذکر ہے دونوں میں کیا فرق ہے؟

الجواب: ۱۔ یہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف انتقال نہیں بلکہ پرندے بہ منزلہ چارٹر فلائٹ اور ہیلی کاپٹر ہوں گے، یعنی شہید کی روح ہوائی جہاز میں سیر کرتی ہوگی، جنت کے ہوائی جہاز کو دنیا کے ہوائی جہاز پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ یہ داخلہ روح کا ہے ہاں حقیقی داخلہ اجساد کے ساتھ قیامت میں بوقتِ بعثت ہوگا، تو یہ جزئی دخول، دخولِ کلی کے یا عارضی دخول، دخولِ حقیقی کے منافی نہیں۔

۳۔ یہ تناسخ نہیں ہے، تناسخ کا مطلب یہ ہے کہ اچھی روحیں اچھوں کی شکل میں اور ارواحِ خبیثہ برے جانوروں کی شکل میں حلول کر کے دوبارہ دنیا میں آتی ہیں، اور نیکوکار کو نیکی کا صلہ ملتا ہے اور بروں کو برائی کا بدلہ ملتا ہے، یہی معاد ہے اور آخرت کے منکر ہیں۔ یہ ہندوؤں کا باطل عقیدہ ہے۔

اور اس حدیث کا تعلق دنیا سے نہیں بلکہ عالمِ برزخ سے ہے، پھر وہاں پر شہداء کی ارواح ہوائی جہاز میں سیر کرتی ہیں، اس میں حلول نہیں کرتیں۔ یعنی طیر بمنزلہ ہوائی جہاز کے ہیں۔

۴۔ بعض احادیث میں عام مومنین کا ذکر ہے؛ اس کی مختلف توجیہات کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

الف؛ مومن سے مراد مومنِ کامل یعنی شہید ہے۔

ب؛ شہید کے علاوہ بعض مومنین کو بھی یہ فضیلت حاصل ہوگی۔

ج: شہید ہمیشہ جنت میں عرش کے نیچے ایئرپورٹ پر خوبصورت ہیلی کاپٹروں میں اڑتا رے گا، اور غیر شہید احیاناً اڑے گا، اور کبھی کبھی اس کی روح آسمان میں یا فنائے قبر میں ہوگی۔

شہداء کے بارے میں حدیث شریف ملاحظہ کیجیے:

عن عبد اللّٰه في قوله تعالىٰ ﴿ ولا تحسبن الذين قتلوا فى سبيل اللّٰه أمواتاً بل أحياء عند ربهم يرزقون﴾، قال: أما سألنا عن ذلک فقال: أرواحهم كطير خضر تسرح فى الجنة في أيها شاء ت ، ثم تأوى إلى قناديل معلقة بالعرش، فبيناهم كذلک، إذا طلع عليهم ربک إطلاعه ، فيقول: سلونى ماشئتم ، قالوا ربنا وماذا نسألک ونحن نسرح فى الجنة فى أيها شئنا فلما رأوا أنهم لايتركون من أن يسألون لايسألون إلا ذلک تركوا . (رواه ابن ماجه ، ص ۲۰۱، رقم ۲۸۰۱، باب فضل الشهادة فى سبيل الله).

مذکورہ بالا روایت کے مختلف الفاظ ملاحظہ فرمائیں: ۱۔ مسلم شریف میں ہے:

أرواحهم في جوف طير خضر لها قناديل معلقة بالعرش . (۱۸۸۷/۱۳۵/۲).

۲۔ ترمذی شریف میں یہ الفاظ ہیں: **أرواحهم فى طير خضر .** (رواه الترمذى ،رقم ۱۶۴۱، باب ماجاء فى ثواب الشهداء).

۳۔ابن ماجہ کی مذکورہ بالا روایت: **أرواحهم كطير خضر** . (رقم : ۲۸۰۱).

عام مومنین والی روایت ملاحظہ کیجیے:

عن عبد الرحمن بن كعب بن مالک عن أبيه قال: لما حضرت كعباً الوفاة أتته أم بشر بنت البراء بن معرور... إلى قوله : قالت: يا أبا عبد الرحمن ! أما سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن أرواح المؤمنين فى طير خضر تعلق بشجر الجنة ، قال: بلى قالت: فهو ذاک . (رواه ابن ماجه،رقم: ۱۴۴۹).

وفي رواية لأحمد عنه :كان يحدث أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ، قال: إنما نسمة المؤمن طير يعلق فى شجر الجنة حتى يرجعه الله تعالىٰ إلى جسده يوم يبعثه . (مسند احمد ،رقم: ۱۵۷۹۲).

تکملة فتح الملهم میں مذکور ہے:

وقد اختلف العلماء فيه قديماً وحديثاً ، وقد عد ابن القيم فى ذلک نحواً من سبعة عشر قولاً ، منها: أن أرواح المؤمنين عند الله فى الجنة ، شهداء كانوا أم غير شهداء إذا لم يحبسهم عن الجنة كبيرة ...

ومنها : أنهم بفناء الجنة على بابها ، يأتيهم من روحها ونعيمها ورزقها . ومنها: أن الأرواح مستقرها أفنية قبورها ، ومنها: أنها مرسلة تذهب حيث شاء ت. ومنها :أن أرواح الشهداء فى الجنة وأرواح عامة المؤمنين على أفنية قبورهم، وما إلى ذلک من الأقوال. وقد بسط ابن القيم فى كتاب الروح على هذه المسألة ، وتكلم على كل قول وما يؤيده أو يعارضه من الأحاديث الآثار، ثم لخص ما وصل إليه . (تكملة فتح الملهم :۴۱۴/۳،دارالعلوم کراچی).

دوسری جگہ مرقوم ہے:

أن الظاهر من حديث الباب أن أرواح الشهداء تكون فى أجواف الطير، وأن هذا مختص بالشهداء ، ولكن أخرج مالک فى موطاه عن كعب بن مالک أن رسول الله صلى

اللّٰہ علیه وسلم قال: إنما نسمة المومن طير يعلق فى شجرة الجنة...وهذا يدل على أن هذه الفضيلة حاصلة لكل مومن ، وتأول بعض العلماء فى حديث كعب بأن المراد من المومن في ذلک الحديث المومن الشهيد خاصة...ويدل على هذا أن اللّٰه سبحانه وتعالىٰ جعل أرواح الشهداء في أجواف طير خضر، فإنهم لما بذلوا أنفسهم للّٰه حتى أتلفها أعداء ه فيه ، أعاضهم منها فى البرزخ أبداناً خيراً منها تكون فيها إلى يوم القيامة ...

وقد استدل بعض الجهله بحديث الباب على ثبوت التناسخ فى الأرواح ، وهذا باطل لا أصل له . قال ابن القيم فى كتاب الروح ،ص ۱۴۲ : وإنما التناسخ الباطل ما تقوله أعداء الرسل من الملاحدة وغيرهم الذين ينكرون المعاد ، أن الأرواح تصير بعد مفارقة الأبدان إلى أجناس الحيوان والحشرات والطيور التى تناسبها وتشاكلها، فإذا فارقت هذه الأبدان انتقلت إلى أبدان تلک الحيوانات ، فتنعم فيها أو تعذب ، ثم تفارقها وتحل فى أبدان أخر تناسب أعمالها وأخلاقها ، وهكذا أبداً ، فهذا معادها عندهم ونعيمها وعذابها ، لا معاد لها عندهم غير ذلک ، فهذا هو التناسخ الباطل المخالف لما اتفقت عليه الرسل والأنبياء من أولهم إلى آخرهم ، وهو كفر باللّٰه واليوم الآخر . وإذا عرفت معنى التناسخ ظهر لک البون الشاسع ما بين حديث الباب وفكرة التناسخ ، فإن التناسخ مبنى على إنكار المعاد والآخرة ، وعلى أن حلول الأرواح فى الأبدان المختلفة يقع فى عالمنا هذا ، والحديث مبنى على إثبات الآخرة ، وعلى أن أرواح الشهداء تكون فى أجواف الطير فى البرزخ ، لا فى الدنيا ، فشتان بينهما. (تكملة فتح الملهم:۴۱۶/۳).

تحفۃ الالمعی میں مذکور ہے:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ﴿ولا تحسبن الذين قتلوا فى سبيل اللّٰه أمواتاً﴾ کی تفسیر پوچھی گئی یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس شہداء کو جو روزی دی جاتی ہے اس کی نوعیت کیا ہوسکتی ہے؟

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا سنو! ہم نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی ہے

پس ہمیں بتلایا گیا کہ شہداء کی روحیں ہرے پرندوں میں ہوتی ہیں جنت میں جہاں چاہیں چرتی ہیں یعنی سبز رنگ کے ہیلی کاپٹروں میں بیٹھ کر جنت میں جاتی ہیں۔ (تحفۃ الالمعی: ۷/۱۶۸)۔

مزید تفصیل کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ مفید ہے: (کتاب الروح لابن القیم، ص۱۲۳، ۱۴۳، ۱۴۵، ۱۴۲، ۱۴۱، ۱۲۲، واوجز المسالک للشیخ محمد زکریا: ۴/۶۰۱، وشرح الصدور للامام السیوطی، ص۲۴۰، وتکملۃ فتح الملہم: ج۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دفن کرنے کے بعد تین دن اہل میت کے گھر ٹھہرنے کا حکم:

سوال: میت کو دفن کرنے کے بعد میت کے گھر کچھ ایام ٹھہرنا تاکہ میت کے گھر والوں کو تسلی دے یا دیگر امور پر معاونت کرے، جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ تین دن ٹھہرتے ہیں، اس کی کیا دلیل ہے؟

الجواب: دفن کے بعد یا پہلے اہل میت کی تعزیت کرنا سنت ہے، لیکن تین دن ٹھہرنا مکروہ اور غیر مستحسن ہے، ہاں جو رشتہ دار دور دراز سے سفر کر کے آئے ہوں اور ایک دن میں واپس جانا مشکل ہو تو ان کے لیے گنجائش ہے، تاکہ میت کے گھر والوں کو تسلی دے سکیں اور دیگر کاموں پر مدد کر سکیں تو یہ درست ہے۔

فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

وفي الإمداد: وقال كثير من متأخري أئمتنا: يكره الاجتماع عند صاحب الميت، ويكره له الجلوس في بيته حتى يأتي إليه من يعزى، بل إذا فرغ ورجع الناس من الدفن، فليتفرقوا، ويشتغل الناس بأمورهم، وصاحب البيت بأمره. (فتاوى الشامي: ۲/ ۲۴۱، سعيد).

(وكذا في حاشية الطحطاوي، ص ۶۱۲، قديمي).

وفي موضع آخر: روى الإمام أحمد وابن ماجه بإسناد صحيح عن جرير بن عبد الله رضي الله عنه قال: كنا نعد الاجتماع إلى أهل الميت، وصنعهم الطعام من النياحة. (فتاوى الشامي: ۲/ ۲۴۰).

کفایت المفتی میں مذکور ہے:

اہل میت کے گھر ضیافت کھانے کی جو رسم پڑ گئی ہے، یہ یقیناً واجب الترک ہے، صرف اہل میت کے وہ عزیز واقارب جو دور دور سے آئے ہوں اور ان کی امروز واپسی نہ ہو سکے یا اہل میت کی تسلی کے لیے ان کا قیام

ضروری ہو، وہ میت کے گھر کھانا کھالیں تو خیر باقی تمام تعزیت کرنے والوں کو اپنے اپنے گھروں کو واپس جانا چاہیے نہ میت کے گھر قیام کریں، نہ ضیافت کھائیں۔ (کفایت المفتی: ۶/۵۵، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میت کی چارپائی پر کپڑا اڈالنے کا حکم:

سوال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ میت کی چارپائی پر کپڑا اڈالنا جائز نہیں ہے، بس کفن پر اکتفا کرنا چاہیے، جبکہ عام طور پر چارپائی پر کپڑا اڈالا جاتا ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: قبرستان لے جاتے وقت میت کی چارپائی پر یابدن پر کپڑا اڈالنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یہ میت کے احترام کے قبیل سے ہے، ہاں کپڑا سادہ ہونا چاہیے، اس پر کلمہ طیبہ یا آیاتِ قرآنیہ وغیرہ لکھا ہوا نہیں ہونا چاہیے ورنہ جائز نہیں۔ سادہ کپڑا اڈالنے کے جواز کے بارے میں ملاحظہ کیجیے:

عن نافع أبي غالب، قال: كنت في سكة المربد، فمرت جنازة معها ناس كثير قالوا: جنازة عبد الله بن عمير، فتبعتها فإذا أناْ برجل عليه كساء رقيق على بُرَيْذِينَتِه [تصغير برذونة، البرذون الفرس العجمي، (عيني)]، وعلى رأسه خرقة تقيه من الشمس، فقلت: من هذا الدهقان؟ قالوا: هذا أنس بن مالك رضي الله عنه، فلما وضعت الجنازة قام أنس رضي الله عنه فصلى عليها، وأناْ خلفه لا يحول بيني وبينه شيء، فقام عند رأسه فكبر أربع تكبيرات، لم يطل ولم يسرع، ثم ذهب يقعد، فقالوا: يا أبا حمزة: المرأة الأنصارية، فقربوها وعليها نعش أخضر... (سنن أبي داود، باب أين يقوم الإمام من الميت إذا صلى عليه، رقم: ۳۱۹۶).

قال العينيؒ: قوله نعش أخضر... والمراد من النعش هاهنا هو مثل المكبة توضع على السرير، وتغطى بثوب ليستر ها عن أعين الناس وهي كالقبة على السرير. (شرح سنن أبي داود: ۶/۱۳۵، ط: مكتبة الرشد، الرياض).

وقال في عون المعبود: والمعنى أنها كانت على جنازة الأنصارية قبة مغطاة بلون أخضر، وفيه دليل على جواز اتخاذ القبة على سرير الميت لأن ذلك أستر لها وكان ذلك

بمحضر من الصحابة ولم ينكر عليه أحد .

ويؤيده ما أخرجه الحافظ بن عبد البر ونقله القسطلاني فى المواهب: أن فاطمة قالت لأسماء بنت عميس: إني قد استقبحت ما يصنع بالنساء يطرح على المرأة الثوب فيصفها، فقالت أسماءؓ : يا بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا أريک شيئاً رأيته بأرض الحبشة، فدعت بجرائد رطبة فحنتها ثم طرحت عليها ثوباً فقالت فاطمةؓ: ما أحسن هذا تعرف به المرأة من الرجل. وفي سنده محمد بن موسى الفطرى ، وهوصدوق رمى بالتشيع.

قال الزرقاني في شرح المواهب : قوله يطرح على المرأة الثوب أى على نعشها فيصفها جسمها من غلظ وضده ، وحنتها بنون ثم فوقية ، أى أمالتها ، وتعرف به المرأة من الرجل أى ولا يعرف للمرأة تحته حجم ، وقول من قال: إن زينب أول من غطى نعشها فمراده أى من أمهات المؤمنين ، انتهى. (عون المعبود: ۳۳۷/۸).

مذکورہ بالاعبارات سے معلوم ہوا کہ قدیم زمانہ سے میت پر کپڑا ڈالنے کا دستور تھا، چاہے میت مرد ہو یا عورت، پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے چارپائی کے اوپر قبہ کی شکل کا کوہان نما جنگلا پسند کیا تا کہ اس پر کپڑا ڈالکر عورت کے جسم کو چھپایا جائے اور مردوں کے سامنے عورت کی ضخامت کا پتانہ چلے۔

ابوداودشریف کی روایت میں نعش اخضر کا ذکر ہے،اس کے بارے میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

قوله : نعش أخضر ، والنعش: الذي يحمل عليه الميت ، وإذا لم يكن عليه ميت فهو سرير، والمراد من النعش هاهنا هو مثل المكبة توضع على السرير، وتغطى بثوب ليسترها عن أعين الناس وهي كالقبة على السرير. (شرح سنن أبى داود: ۱۳۵/۶ ،ط: مكتبة الرشد رياض).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مرقوم ہے:

مسنون کفن کے علاوہ مردوعورت کے جنازہ پر سفید چادر ڈالدینے میں تو کچھ حرج نہیں ہے جیسا کہ عام رواج ہے . . . (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۲۶۰/۵، مدلل ومکمل، ط: دارالاشاعت)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

سوال: مسلمان مرد میت کا جنازہ لے جاتے وقت چادر وغیرہ سے پردہ کرکے یعنی میت کو چادر اُڑھا کر لے جانا چاہیے یا نہیں؟ اس کا ثبوت حدیث وفقہ میں ہوتو مطلع فرمادیں۔

الجواب: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما رأه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن، وفي الدر المختار: ولا بأس بالزيادة على الثلاثة، ويحسن الكفن، لحديث: حسنوا أكفان الموتى، الحديث ۔ لہٰذا چونکہ میت کے اوپر چادر ڈالنے میں تحسین میت واعزازِ میت ہے اور حسبِ روایتِ فقہ اس میں کچھ حرج نہیں اور یہ امر معروف بین المسلمین ہے، ان وجوہ سے اس میں کچھ حرج معلوم نہیں ہوتا۔ فقط۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۵/۲۷۰، ط: دارالاشاعت)۔

فتاویٰ مفتی محمود میں مرقوم ہے:

بے ادبی کے اندیشہ سے اور میت سے نجاست خارجہ سے ملوث ہونے کے اندیشہ کے سبب ایسے کپڑے کو جس پر کلمہ طیبہ یا قرآنی آیات تحریر ہوں میت پہ ڈالنا مکروہ ہے، ویسے سادہ کپڑے کا ڈالنا درست ہے۔ (فتاویٰ مفتی محمود ملتانی: ۳/۴۵، ط: جمعیۃ پبلیکیشنز)۔

فقہائے مالکیہ کے نزدیک بھی جائز ہے؛ چنانچہ مواہب الجلیل میں مذکور ہے:

ويسترها بقية . ش: ولا باس بستر النعش للرجل، نقله في التوضيح وابن عرفة . (مواهب الجليل: ۳/۳۴، ط: دار الكتب العلمية بيروت).

فقہائے شافعیہ کے یہاں بھی جائز ہے:

قال في حاشية الجمل على المنهج : قوله وستر القبر بثوب عند الدفن ...قوله عند الدفن، مفهومه أنه لا يندب ذلك عند وضعه على النعش ، وينبغي أن يكون مباحاً . (حاشية الجمل: ۲/۱۹۸، ط: دار الفكر).

فقہائے حنابلہ کے نزدیک بھی جائز ہے: ملاحظہ ہو کشاف میں مذکور ہے:

وتسن تغطية النعش لما فيه من المبالغة في ستر الميت وصيانته . (كشاف القناع: ۲/۱۰۸، ط: دار الفكر بيروت).

وفی الفروع : ویکرہ تغطیۃ النعش بغیر البیاض، ویسن بہ . (کتاب الفروع: ۳/۳۶۹، مؤسسۃ الرسالۃ).

کشاف القناع میں ہے:

ویستحب إن کان المیت امرأۃ أن یستر النعش بمکبۃ فوق السریر تعمل من خشب أو جرید أو قصب مثل القبۃ فوقھا ثوب قال بعضھم أول من اتخذ لہ ذلک زینب بنت جحش أم المؤمنین وقال ابن عبد البر : فاطمۃ بنت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أول من غطی نعشھا فی الإسلام ثم زینب بنت جحش . (کشاف القناع : ۲/۱۲۶، ط:دارالفکر،بیروت).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عذابِ قبر میں روح کا تعلق جسم کے ساتھ ہونے کا حکم:

سوال: اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک ثواب وعذابِ قبر روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے، لیکن بہت مرتبہ جسم کو شیر، چیتا وغیرہ درندے کھا لیتے ہیں، یا قبرستان ویران ہوجاتا ہے اور اس کی کھدائی کرکے لوگ مٹی ادھر اُدھر لے جاتے ہیں تو عذاب اور ثواب روح کے ساتھ جسم پر کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: قبر مدفن ہے اور برزخ سے مراد موت سے لیکر حشر تک کا زمانہ ہے جو عالم برزخ کہلاتا ہے، اور مرنے کے بعد ہر فردِ بشر عالم برزخ میں پہنچتا ہے خواہ وہ قبر میں دفن کیا جائے یا شیر، چیتے وغیرہ درندے کا شکار ہوجائے یا پانی میں ڈوب کر سمندری جانور کی خوراک بن جائے یا جل کر راکھ ہوجائے اور راکھ کو ہوا میں اڑا دیا جائے، غرض کسی بھی شکل میں ہو قادرِ مطلق کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ جسم کے بکھرے ہوئے اجزا کے ساتھ روح کا تعلق پیدا کردے اور ان تمام اجزا میں آرام یا تکلیف کا احساس پیدا ہوجائے، کیونکہ عالم برزخ ایک الگ عالم ہے جس کو دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اور احادیث میں قبر کا ذکر اس وجہ سے آتا ہے کہ لوگ عموماً مردوں کو قبر میں دفن کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: شرح عقائد النسفیہ میں مرقوم ہے:

وأنکر عذاب القبر بعض المعتزلۃ والروافض لأن المیت جماد لا حیاۃ لہ ولا

إدراک لـه فتعذيبه محال. الجواب: أنه يجوز أن يخلق اللّٰه تعالیٰ في جميع أجزائه أو بعض أجزائه نوعاً من الحياة قدر ما يدرک ألم العذاب أو لذة التنعيم ، و هذا لا يستلزم إعادة الروح إلى بدنه ، ولا أن يتحرک ويضطرب أو يرى أثر العذاب عليه حتى أن الغريق فى الماء والمأكول في بطون الحيوانات والمصلوب فى الهواء معذب وإن لم نطلع عليه. (شرح عقائد النسفيه، ۱۳۰).

قال فى الجواهرالبهية : وعذاب القبر حق يعنى العذاب قبل الحشر ولو فى قعر البحر وحواصل الطيور وبطون السباع وإضافة العذاب إلى القبر بناء على كثرة الوقوع ، لأن أكثرالناس يدفنون فى القبور. (الجواهرالبهية: ۴/۲).

قال الإمام الغزاليؒ فى الاقتصاد فى الاعتقاد : وأما الذى تأكله السباع فغاية ما فى الباب أن يكون بطن السبع قبراً و إعادة الحياة إلى جزء يدرک العذاب ممكن . وفي حاشيته:إنما سمى عذاب القبر بالتغليب، وإلا فالأصل أنه عذاب أو نعيم البرزخ. (۶۸/۱).

شیخ عبدالغنی میدانی حنفی شرح عقیدۃ الطحاویہ میں لکھتے ہیں:

قوله فى قبره ، جرى على الغالب ، وإلا فمن أكلته السباع وأحرقته النار ومن لم يدفن. (ص۱۱۷).

عبدالمحسن سنن ابی داود کی شرح میں لکھتے ہیں کہ عالمِ برزخ کو عالمِ دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا:

والمهم فى الأمر: إن المسلم ؛ لايتردد ولا يتوقف فى الإيمان والتصديق بما جاء به كتاب اللّٰه عز وجل وسنة رسوله صلى اللّٰه عليه وسلم، سواء أدركه أولم يدركه ، وسواء عقله أو لم يعقله ، مع العلم بأن أمور الآخرة ليست مثل أمور الدنيا ، وأمور البرزخ ليست مثل أمور الدنيا ،حتى يقيس الإنسان هذا على هذا، فإن هناک فرقاً ، ولا يستوى أمور الدنيا وأمور الآخرة ، فإذا وجد الإنسان الشيء الذي لا يعرفه فلا يتوقف ويتردد أو يشک فيما جاء به الحديث عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، بل الواجب التصديق والإيمان .

(شرح سنن ابی داود: ۱/ ۲).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

علماء نے فرمایا کہ عذابِ برزخ کو عذابِ قبر کہتے ہیں اور برزخ دنیا وآخرت کی درمیانی مدت کو کہتے ہیں جس میت کو اللہ تعالیٰ عذاب کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کو اسی عالمِ برزخ میں عذاب کرتا ہے چاہے میت کو دفن کریں یا جانور کو کھلا دیں یا سولی پر چڑھا دیں یا جلا کر خاک کر دیں یا باریک کر کے ہوا میں اڑا دیں یا دریا میں غرق کر دیں، اللہ تعالیٰ اس کے عذاب کرنے پر ہر طرح قادر ہے جس طرح چاہے عذاب کرے اور عذابِ برزخ کو اس واسطے عذابِ قبر کہتے ہیں کہ اکثر یہ عذاب قبر میں ہوتا ہے یا یوں کہیں گے کہ اصل قبر وہی ہے جہاں برزخ کا مقام ہے اور زمین کے گڑھے کو مجازاً قبر کہتے ہیں۔ (عمدۃ الفقہ :۲/ ۵۵۰، ط: زوار اکیڈمی)۔

مزید دیکھیں: (آپ کے مسائل اوران کا حل: ۲/ ۴۲۱، ط: طبع جدید)۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ ثوابِ قبر اور عذابِ قبر کا تعلق قبر والے آدمی کی روح کے ساتھ ساتھ اس کے جسدِ مثالی سے ہے، وہ جسد اگرچہ مثالی ہے لیکن روح کے تعلق کی وجہ سے وہ جسد مثالی اصلی کی طرح ہو جائے گا اور اس کو ثواب وعذاب ہوگا، شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر سے گزرے تو آپ نے عالمِ برزخ والے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جسدِ مثالی کا مشاہدہ فرمایا تھا، جسدِ مثالی کا مقام اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مومن کی روح نکالنے میں آسانی ہوتی ہے، اس پر اشکال وجواب:

سوال: احادیث کے موافق مسلمان کی روح آسانی سے نکالی جاتی ہے، جیسے آٹے سے بال نکالا جائے، یہ بات کونسی حدیث میں مذکور ہے؟ پھر جب مسلمان کی روح آسانی سے نکالی جاتی ہے تو آنخضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تکلیف کا ذکر حدیث میں آتا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ **بینوا بالدلیل توجروا بالأجر الجزیل.**

الجواب: بوقتِ وفات کبھی اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں پر کچھ تکلیف کی کیفیت معلوم ہوتی ہے وہ رفع

درجات اور درجاتِ عالیہ کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے، یا تکلیف روح نکالنے سے پہلے ہوتی ہے نزعِ روح کے وقت آسانی ہوتی ہے حتی کہ روح نکلنے کا پتہ ہی نہیں چلتا، لہٰذا دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

مومن کی روح آسانی سے نکالی جاتی ہے، ملاحظہ ہو حدیث میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسـول الله صلى الله عليه وسلم قال: إن المؤمن إذا حضر،أتته الـمـلائـكة بـحريرة فيها مسک، ومن ضبائر الريحان، وتسل روحه كما تسيل الشعرة من العجين، ويقال: يا أيتها النفس المطمئنة ، اخرجي راضية مرضية ، مرضياً عنک، وطويت عليه الحريرة،ثم يبعث بها إلى عليين، وإن الكافر إذا حضر أتت الملائكة بمسح فيه جمرة، فتـنـزع روحـه انتـزاعـاً شـديـداً ، ويـقـال: أيتها النفس الخبيثة ، اخرجي ساخطة مسخوطة عـليک إلـى هـوان وعـذاب ، وإذا خـرجت روحه ، ووضعت على تلک الجمرة ، فإن لها نشيشاً ، فيطوى عليها المسح ، ويذهب بها إلى سجين. لم يرو هذا الحديث عن القاسم بن الفضل إلا سليمان بن النعمان . (المعجم الاوسط للطبرانی : ۱/۲۱۶/۴/۷۴۲).

طبرانی کے دو رواۃ؛ قاسم بن الفضل اور سلیمان بن النعمان کے بارے میں تحقیق ملاحظہ ہو:

۱ـ القاسم بن الفضل بن معدان بن قريظ الحدانی الازدی ؛

قـال عـمرو بن علی : سمعت يحيى بن سعيد يحسن الثناء على القاسم بن الفضل الحدانی ، قال : وكان ثقة. وقال عبدالرحمن بن مهدى: كان من قدماء أشياخنا ومع ذلک من أثبتهم. وقـال أبـوطالب عن أحمد بن حنبل: ثقة . انظر: (تهـذيب الكمال :۲۳/۴۱۰، ط:مؤسسة الرسالة، وسير اعلام النبلاء:۷/۲۹۰،ط: مؤسسة الرسالة).

۲ـ سليمان بن النعمان الشيبانی البصری؛

قال الذهبی: قال أبوحاتم : شيخ (تاريخ الاسلام :۵/ ۳۲۹)، **وقال القاسم بن قطلوبغا فی الثقات** (۵ /۱۳۲) : **هـو شيـخ.** معلوم ہوا کہ دونوں راوی ثقہ ہیں، نیز تہذیب الکمال میں ذکر کیا ہے کہ سلیمان بن النعمان کا سماع قاسم بن الفضل سے ثابت ہے۔ (تهذيب الكمال:۲۳/۴۱۱).

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت سختی کا ذکر ہے، وہ روایت ملاحظہ فرمائیں:

إن عائشة رضی الله تعالىٰ عنها،كانت تقول: إن من نعم الله على أن رسول الله صلى

اللّٰہ علیہ وسلم توفي في بيتي وفي يومي وبين سحري ونحري...وبين يديه ركوة أوعلبة يشک عمر فيها ماء فجعل يدخل يديه فى الماء فيمسح بهما وجهه يقول: لا إله إلا اللّٰه إن للموت سكرات ثم نصب يده فجعل يقول فى الرفيق الأعلىٰ، حتى قبض ومالت يده.
(صحيح البخارى ،رقم: ۴۴۴۹).

وعن عائشة رضى اللّٰه تعالىٰ عنها قالت: ما رأيت أحداً أشد عليه الوجع من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم . (صحيح البخارى،رقم: ۵۶۴۶،باب شدة المرض).

ترمذی شریف کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: عن عائشة رضى اللّٰه تعالىٰ عنها، قالت: ما أغبط أحداً بهون موت بعد الذى رأيت من شدة موت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم . (سنن الترمذى، رقم: ۹۷۹).

اس حدیث کے تحت مفتی سعید احمد پالنپوری تحفۃ الالمعی میں لکھتے ہیں:

صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: میں کسی پر موت کی آسانی کی وجہ سے رشک نہیں کرتی، جب سے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کی سختی دیکھی ہے، یعنی اگر کسی کی موت آسانی سے چٹ پٹ ہوجاتی ہے، تو یہ کوئی قابل رشک بات نہیں، کیوں کہ موت کی آسانی محبوبیت کی دلیل اور سختی مغضوبیت کی دلیل نہیں ہے، پس موت خواہ آسانی سے آئے یا سختی سے کچھ فرق نہیں پڑتا، موت کی سختی کبھی کبھی رفع درجات کے لیے ہوتی ہے اور نرمی اس لیے ہوتی ہے کہ اس کی حسنات کا بدلہ اسی دنیا میں دیدیا جائے، کیوں کہ آگے اس کا کوئی حصہ نہیں۔ (تحفۃ الالمعی: ۳/۳۸۴، ط: زمزم)۔

ملاحظہ ہو امام قرطبی لکھتے ہیں کہ موت کی سختی رفعِ درجات کے لیے ہوتی ہے:

ربما خطر لبعض الناس أن هؤلاء: أحباب اللّٰه، وأنبياؤه ورسله، فكيف يقاسون هذه الشدائد العظيمة؟ وهو سبحانه قادر أن يخفف عنهم أجمعين، فالجواب: إن أشد الناس بلاء فى الدنيا: الأنبياء ثم الأمثل فالأمثل كما قال نبينا عليه السلام، خرَّجه البخاري وغيره فأحب اللّٰه أن يبتليهم تكميلاً لفضائلهم لديه ،ورفعة لدرجاتهم عنده، وليس ذلک في حقهم نقصاً، ولا عذاباً، بل هو كما قال،كمال رفعة، مع رضاهم بجميل ما يجرى اللّٰه عليهم، فأراد الحق، سبحانه أن يختم لهم بهذه الشدائد، مع إمكان التخفيف والتهوين

عليهم، ليرفع منازلهم، ويعظم أجورهم قبل موتهم. (التذكرة في احوال الموتى وامورالآخرة: ۱/ ۲۵).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ: ۱/ ۶۵۳، جامعہ فاروقیہ، وفتاویٰ فریدیہ: ۱/ ۲۶۲، وامداد الفتاویٰ: ۵/ ۸۴)۔

حضرت تھانویؒ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سختی کا تعلق مزاج میں قوت اور طاقت سے ہے آپ قوی المزاج، طاقتور تھے۔ ملفوظات میں لکھتے ہیں: نزع یہ قوتِ مزاج وطبیعت وشدتِ تعلق روح مع الجسد پرمبنی ہے، جوقوی لوگ ہیں ان کوشدت ہوتی ہے، ضعفاء کواس قدر نہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوسختی ہوئی، چونکہ آپ قوی المزاج بھی تھے اور بوجہ شفقت کے امت کے ساتھ تعلق بھی شدید تھا۔ (ملفوظاتِ حکیم الامت: ۱۲/ ۱۹۹)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تعزیت والی دعا کے الفاظ کی تحقیق:

سوال: تعزیت کے الفاظ میں: " **اللّٰهم آجِرني في مصيبتي** " یا " **اللّٰهم أجُرني في مصيبتي** " ہے دونوں میں کونسا جملہ صحیح ہے؟ یعنی بابِ افعال سے ہے یا مجرد سے؟ اوراحادیث میں کیا آیا ہے؟ اوردونوں کے معنی میں کیا فرق ہے؟

الجواب: دونوں طرح کے الفاظ حدیث شریف میں وارد ہوئے ہیں، اور دونوں کا معنی ایک ہے، ہاں شراحِ حدیث نے مجرد والے (او جُرنی) کوترجیح دی ہے۔ دونوں احادیث درجِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

عن أم سلمة رضي الله تعالىٰ عنها، أنها قالت: سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول: ما من مسلم تصيبه مصيبة فيقول: ما أمره الله ! إنا لله وإنا إليه راجعون ، اللّٰهم أجُرني في مصيبتي واخلف لي خيراً منها ... (صحيح مسلم ،رقم: ۹۱۸ ،باب مايقال عندالمصيبة).

وفي رواية للبيهقي في شعب الإيمان عنها، قالت: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ما من عبد تصيبه مصيبة فيقول: إنا لله وإنا إليه راجعون ، اللّٰهم آجِرني في مصيبتي ... (رقم: ۹۲۴۷).

لغات کے اعتبار سے معنی ملاحظہ کیجیے:

أَجَرَ، يَأجُرُ، أجراً ، وإجارة ، وآجر إيجاراً ، الرجل على كذا ، بدلہ دینا، مزدوری دینا۔ (المنجد ، مصباح اللغات، ص۲۸، ط: مكتبة القدوس لاهور). **القاموس الوحيد** میں ہے: **أَجَرَ يَأجُرُ، أجراً وأجوراً وإجاراً ... أجر الله عبده** ، اجردینا، بدلہ دینا، ثواب دینا۔ (۱/ ۱۱۱، حسینیہ دیوبند)۔

مزید دیکھئے: (لسان العرب: ۱۰/۴، والنهاية في غريب الحديث: ۲۵/۱).

لغات الحدیث میں مرقوم ہے:

آجِرني في مصيبتي يا أوجُرني في مصيبتي، آجر، يوجِر سے یا اجر، يأجر سے دونوں کے معنی ایک ہیں یعنی میری مصیبت میں مجھ کو اجر وثواب دے۔ أجره الله اور آجره الله، اللہ اس کو ثواب دے اور أجرك الله اور آجرك الله، اللہ تجھ کو ثواب دے، إلا أجرت بها، مگر تجھ کو اس کا ثواب ملے گا، اشفعوا فلتوجروا، شفارش کرو تو تم کو ثواب ملے گا۔ (لغات الحدیث: ۱/۱۶، میر محمد کتب خانہ، کراچی)۔

قال الإمام النووي: قال القاضي: أجرني بالقصر والمد حكاهما صاحب الافعال وقال الاصمعي وأكثر أهل اللغة هو مقصور لا يمد ومعنى أجره الله أعطاه أجره وجزاء صبره وهمه في مصيبته. (شرح صحيح مسلم: ۱/۳۰۰/۹۱۶).

وقال في عون المعبود نقلاً عن مجمع البحار: وهو بالقصر أكثر. (۲۸۸/۱۳، بيروت).

وللمزيد راجع: (الديباج على صحيح مسلم للإمام السيوطي: ۴۵۱/۱، وإكمال المعلم بفوائد مسلم: ۳۵۹/۳، والمفهم لما اشكل من تلخيص كتاب مسلم: ۵۷۰/۲). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

باب ...... ﴿۷﴾

زکوٰۃ سے متعلق متفرق مسائل:

حکومت کے ٹیکس کی رقم واپس کرنے پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک خیراتی ادارہ ہے جو لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرتا ہے اور فقراء میں تقسیم کرتا ہے، عام طور پر فقراء کی ضروریات کا سامان، اور کھانے پینے کی اشیاء خرید کر تقسیم کرتا ہے، اشیاء پر حکومت کی طرف سے ٹیکس ہوتا ہے، لیکن چونکہ یہ ادارہ غیر نفع بخش ہے اس وجہ سے حکومت ٹیکس کی رقم ادارہ کو واپس کر دیتی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم سے خریدی اشیاء کے ٹیکس کی رقم واپس ہونے پر وہ رقم زکوٰۃ کی مد میں شامل ہوگی یا اللہ اور نفلی صدقہ کے حکم میں ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: جو ٹیکس حکومت نے لیا، حکومت کے مسلط ہونے کی وجہ سے حکومت اس کی مالک بن گئی، پھر جب حکومت نے ادارہ کو واپس کیا تو اب یہ حکومت کی طرف سے ادارہ کو ہدیہ ہے جو نفلی صدقہ کی مد میں شامل ہوگا، نیز آج کل اکثر ٹیکس حد سے زیادہ ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی واپسی کی کوشش کر سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

فأما في زماننا إنما يوجد أكثر النوائب بطريق الظلم ومن تمكن من دفع الظلم عن نفسه فذلك خير له . (المبسوط للامام السرخسیؒ: ۱۰/۳۵، دارالفکر، بیروت).

حکومت کا استیلاء سببِ ملک ہے، جب حکومت نے بطورِ ٹیکس کچھ رقم پر قبضہ کر لیا تو اب حکومت اس رقم کی مالک بن گئی۔ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ مسلمان کے کافر سے میراث حاصل کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

يجوز للمسلم أن يرث من الكافر بسبب استيلاء الحكومة الكافرة على مال الكافر

أولاً ثم دفعها إلى المسلم بقانونها واستيلاء الكافر سبب للملک عندنا، والله أعلم، أو يقال: استولى المسلم على مال الكافرة بقوة سلطان أهل الحرب وصار تملكاً له بالاستيلاء ودليل التملک بقوة سلطان أهل الحرب ما ذكر في شرح السير. (امدادالاحکام:۴/۶۲۸)۔

وفي الفتاوى الهندية: الباب الخامس في استيلاء الكفار: إذا غلب كفار الترک على كفار الروم فسبوهم وأخذوا أموالهم ملكوها فإن غلبنا على الترک حل لنا ما نجده مما أخذوه...الخ. (الفتاوى الهندية: ۲/۲۲۴). (وكذا في الدرالمختار: ۴/۱۶۰، سعيد، والبحرالرائق: ۵/۱۰۲، دارالمعرفة، وتبيين الحقائق: ۳/۲۶۰، امداديه ملتان، وفتح القدير: ۶/۳، ط: دارالفكر).

قاموس الفقہ میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب لکھتے ہیں:

استلاء کے معنی غالب آجانے کے ہیں، فقہ کی اصطلاح میں دارالحرب کے کافروں کے مسلمانوں یا کسی دوسری مملکت کے کافروں ہی پر غالب آجانے کو کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اہل کفر اگر کسی کے مال پر غلبہ حاصل کرلیں تو وہی اس کے مالک قرار پاتے ہیں، اس طرح اگر غیر مسلموں کی ایک مملکت کسی دوسری مملکت کے مال پر غاصبانہ قبضہ کرلے تو وہ اس کی مالک ہوجائے گی اور مسلمانوں کے لیے ان سے ایسی اشیاء کا خریدنا درست ہوگا، اور خریدنے کے بعد وہ اس کے جائز مالک قرار پائیں گے۔ (قاموس الفقہ: ۲/۱۳۱، ۱۳۲)۔

اشرف الاحکام جو امداد الفتاویٰ کا تتمہ ہے اس میں مرقوم ہے:

فرمایا: استیلاء کافر موجبِ ملک ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک۔ بحوالہ ادب الاعلام، ص: ۲۲۰۔ (اشرف الاحکام، ص ۲۳۸، میراث کے احکام، ط: ادارہ اسلامیات، لاہور)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب حکومت ٹیکس کی رقم کی مالک بن گئی پھر ادارہ کو وہ رقم دے رہی ہے تو یہ حکومت کی طرف سے عطیہ سمجھا جائے گا جو نفلی صدقہ کے حکم میں ہوگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوۃ کی رقم سے خیراتی ادارہ کے نام زمین خریدنے کا حکم:

سوال: ایک فلاحی ادارہ ہے جو زکوۃ کی رقم وصول کرکے غرباء کی امداد کرتا ہے، اب اس کا ارادہ ہے کہ زکوۃ کی رقم سے زمینیں خریدیں اور ان پر مکانات تعمیر کرکے غرباء میں تقسیم کریں۔ اس کے لیے درجِ ذیل دو طریقے اختیار کرنا چاہتا ہے: ا۔ یہ زمین ایک ٹرسٹ کے نام پر خریدی جائے گی اور فقیر اس ٹرسٹ سے فائدہ

حاصل کرے گا، اور فقیر اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو اسی ٹرسٹ کے آدمی کو فروخت کریگا۔

۲۔ زمین کسی کمپنی کے نام سے خریدی جائے گی اور فقیر اس کمپنی میں شریک ہوگا، یعنی زمین کے حصے بنا پر فقراء کو ان حصوں کا مالک بنا دیا جائے گا اور پورا اختیار ہوگا جس کو بیچنا چاہے بیچ سکتا ہے، اس کو مکمل اختیار حاصل ہے، اب مذکورہ بالا طریقوں کے مطابق زکوٰۃ ادا ہوجائے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: پہلے طریقہ کے مطابق زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، وجہ اس کی یہ ہے کہ فقیر کی تملیک نہیں پائی گئی بلکہ زمین ٹرسٹ کی ملکیت ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے فقیر کو مالک بنانا ضروری ہے۔

۲۔ دوسرے طریقہ میں فقیر کو زمین کے حصے کا مالک بنایا اور مکمل اختیار دیدیا، اس لیے زکوٰۃ ادا ہوگئی۔

ملاحظہ ہو علامہ حصکفیؒ درمختار میں فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے اباحت کافی نہیں؛

ويشترط أن يكون الصرف تمليكاً لا إباحةً. (الدرالمختار: ۲/۳۴۴، سعید).

قال في البحر: هي تمليك المال من فقير مسلم...بشرط قطع المنفعة عن المملك كل وجه لله تعالىٰ، لقوله تعالىٰ: ﴿وآتوا الزكاة﴾[البقرة:۴۳]، والإيتاء هو التمليك. (البحرالرائق: ۲/۲۱۶، دارالمعرفة).

وفي التبيين: قال: وآتوا الزكاة، يقتضي التمليك ولا تتأدى بالإباحة حتى لو كفل يتيماً فأنفق عليه ناوياً للزكاة لا يجزيه. (تبيين الحقائق: ۱/۲۵۱، ملتان).

مزید تفصیل ملاحظہ ہو: (قاموس الفقہ: ۴/۸۸، وفتاویٰ رحیمیہ: ۴/۳۳، الاحسان، دیوبند، وفتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۳/۲۱۰، ط: المجلس العلمی)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

زکوٰۃ کی رقم سے قرآن خرید کر غریب طلبہ کو دینے کا حکم:

سوال: زکوٰۃ کی رقم سے قرآنِ کریم کے نسخے خرید کر غریب طلبہ کو ہدیہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: غریب طلبہ کو قرآنِ کریم کا مالک بنا دیا جائے تو درست ہے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

قال في الدرالمختار: هي تمليك خرج الإباحة، فلو أطعم يتيماً ناوياً الزكاة لايجزيه إلا إذا دفع إليه المطعوم، لأنه بالدفع إليه بنية الزكاة يملكه. (الدرالمختار: ۲/۲۵۷، سعید).

کتاب المسائل میں مرقوم ہے:

زکوٰۃ کی رقم سے طلبہ کو کتابیں تقسیم کرنا جائز ہے، بشرطیکہ باشعور و مستحق زکوٰۃ ہو۔ (کتاب المسائل: ۲/۲۶۲، ط: نعیمیہ دیوبند)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(white gold) سفید سونے پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: سفید سونے کی کیا حقیقت ہے؟ کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ خالص سونا زیورات بنانے کے قابل نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں کوئی اور دھات نہ ملائی جائے، عام طور پر زرد رنگ والے سونے میں تانبا اور چاندی ملاتے ہیں، لیکن سفید سونے میں پلاڈیم ملایا جاتا ہے جس کی وجہ سے بجائے زرد رنگ کے سفید رنگ حاصل ہوجاتا ہے ورنہ اصل سونا ہی ہے، لہٰذا سونے کے احکام جاری ہوں گے۔ چنانچہ وائٹ گولڈ میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

لیکن اگر دوسری دھات غالب ہو اور وہ بآسانی الگ بھی ہوسکتی ہو تو سونے میں زکوٰۃ واجب ہوگی، ہاں اگر دوسری دھات کا الگ کرنا دشوار ہو یا نہ ہوسکتی ہو تو پھر مشہور اور عام کتبِ فقہ کی روشنی میں زکوٰۃ واجب نہیں، پھر بھی احتیاطاً ادا کردینا بہتر ہے۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مرقوم ہے:

وإن غلب الغش كالفضة كالستوقة فينظر إن كانت رائجة أو نوى التجارة اعتبرت قيمتها فإن بلغت نصاباً من أدنى الدراهم التي تجب فيها الزكاة، وهي التي غلبت فضتها وجبت فيها الزكاة وإلا فلا، وإن لم تكن أثماناً رائجة، ولا منوية للتجارة فلا زكاة فيها إلا أن يكون ما فيها من الفضة يبلغ مائتي درهم بأن كانت كثيرة ويتخلص من الغش، لأن الصفر لا تجب الزكاة فيها إلا بنية التجارة، والفضة لايشترط فيها نية التجارة فإن كان ما فيها لا يتخلص فلا شيء عليه؛ لأن الفضة فيه قد هلكت كذا في كثير من الكتب، وفي غاية البيان الظاهر أن خلوص الفضة من الدراهم ليس بشرط بل المعتبر أن تكون فى الدراهم فضة بقدر النصاب. (البحر الرائق: ۲/۲۲۸).

وللمزيد راجع: (الجوهرة النيرة: ۱/۱۴۹، امداديه ملتان، والفتاوى الهندية: ۳/۲۱۹، وبدائع الصنائع: ۲/۱۷، سعيد، وتبيين الحقائق: ۱/۲۷۹، وفتح القدير: ۷/۱۵۲، دار الفكر).

بہشتی زیور میں لکھا ہے:

سونا چاندی اگر کھرا نہ ہو بلکہ اس میں کچھ میل ہو مثلاً چاندی میں رانگا ملا ہوا ہے تو دیکھو چاندی زیادہ ہے یا رانگا زیادہ ہے اگر چاندی زیادہ ہے تو اس کا وہی حکم ہے جو چاندی کا حکم ہے یعنی اگر اتنی مقدار ہو جو اوپر بیان ہوئی تو زکوٰۃ واجب ہے اور اگر رانگا زیادہ ہے تو اس کو چاندی نہ سمجھیں گے پس جو حکم پیتل، تانبے، لوہے، رانگے وغیرہ اسباب کا آگے آویگا وہی اس کا حکم ہے۔ (بہشتی زیور، زکوٰۃ کا بیان، تیسرا حصہ: ۲۳۹، مسئلہ نمبر ۷، دارالاشاعت)۔

عطر ہدایہ میں مرقوم ہے کہ سونا چاندی بآسانی الگ ہو سکتے ہیں۔ عبارت ملاحظہ کیجئے:

سناروں، سادہ کاروں، نیاریوں بلکہ غیر کاریگروں تک کے مشاہدات وتجارب سے یہ امر ثابت ومشہور ومعروف ہے کہ نئے روپیوں کو پگھلانے اور دوسری تدبیر عرفیہ وحیل اکسریہ کے عمل میں لانے سے ان کی چاندی میں جو میل گلٹ کا ہے اس سے یہ بالکل علیحدہ وجدا ہو جاتی ہے.... بہت سی کتبِ فقہیہ میں ان روپیوں کے مثل (دراہم غالبۃ الغش) سے ان کی چاندی کا علیحدہ ہوسکنا اور اس چاندی میں احکامِ زکوٰۃ وربوا وصرف کا اعتبار کیا جانا بضمن مسائل متعددہ مصرح ہے، ہاں حسبِ تصریح شیخ ابن ہمام واقتضاء قواعد جن دراہم غالبۃ الغش میں ملمع کی طرح چاندی نہایت ہی قلیل ہونے سے جدا نہ ہوتی ہو، مل جاتی ہو اس کا بیشک اعتبار نہیں کیا جائیگا اور کتبِ شافعیہ میں تو بھاری ملمع میں بھی جو چاندی ہوتی ہے اس کا بھی علیحدہ ہو سکنے کی وجہ سے اعتبار کیا جانا مذکور ہے اور اس پر قواعد حنفیہ کے شاہد ہونے سے بعض مشائخ حنفیہ نے بھی ہلکے اور بھاری ملمع میں فرق کر کے فرمایا ہے کہ چاندی یا سونے کا ملمع اتنا زیادہ ہو کہ علیحدہ ہو سکے تو اس کا بھی اعتبار کرنا واجب ہے، چنانچہ ردالمحتار (ص ۳۲۹) میں ہے:

ونقل الخير الرملي نحوه من المحيط ثم قال: وأقول: يجب تقليد المسئلة بما إذا لم تكثر الفضة أو الذهب المموه أما إذا كثر بحيث يحصل منه شيء يدخل في الميزان بالعرض على النار يجب حينئذٍ اعتباره ولم أره لأصحابنا لكن رأيته للشافعية وقواعدنا شاهدة به فتأمل .

بہرحال ہلکے اور بھاری ملمع اور ان کے مانند دراہمِ مغشوشہ میں فرق کیا جائے یا نہ اکثر دراہم غالبۃ الغش کہ جن میں مثل نئے روپیوں کے بھاری ملمع سے بھی زیادہ چاندی ہے ان سے خالص چاندی کا علیحدہ ہوسکنا اور ان میں جو چاندی ہے اس کا اعتبار کیا جانا منصوص ہے کوئی روایت بھی اس کے خلاف نہیں ہے اور منصوص ہوتا تب

بھی جبکہ مدار اعتبار علیحدہ ہوسکنے پر ہے (علیحدہ ہوسکنے سے گو حالاً اس چاندی سے منتفع نہ ہوسکیں لیکن آئندہ تو جب چاہیں پگھلا کے منتفع ہوسکتے ہیں جو کہ حسبِ تصریح فتح القدیر (۲/۲۱۴، دارالفکر)" **وإن لم يخلص فلا شيء عليه لأن الفضة هلكت فيه إذ لم ينتفع بها حالاً ولا مآلاً فبقى العبرة للغش**" اصل مناط عبرۃ نقدین ہے اور علیحدہ ہوسکنا مشاہدات اور تجارب سے ثابت اور مشہور ومعروف ہے۔ (عطر ہدایہ، جدید ص: ۳۵۴۔۳۵۶)۔ (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۳/۱۰۹، ط: بمبئی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوٰۃ کی وصولی اسلامی حکومت کے ساتھ خاص ہونے کا شبہ:

سوال: ایک عالم صاحب کا کہنا ہے کہ زکوٰۃ صرف اسلامی حکومت ہی وصول کرسکتی ہے، اسلامی ریاست کی عدمِ موجودگی میں زکوٰۃ ادا کرنے کا کوئی طریقہ باقی نہیں رہتا، لہٰذا آج کے زمانہ میں اگر کوئی زکوٰۃ ادا کرے تو اس کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اور زکوٰۃ وصول کرنے والی تنظیمیں سب فضول ہیں؛ کیونکہ یہ کام ان کا ہے ہی نہیں۔ اور عالم صاحب درجِ ذیل اثر دلیل میں پیش کرتے ہیں: **عن مسلم بن يسار قال: كان أبوعبدالله رجل من الصحابة يقول: الزكاة والحدود والفيء والجمعة إلى السلطان**. کیا یہ بات شریعت کی نگاہ میں صحیح ہے یا نہیں؟ بینوا بالبرہان توجروا عند الرحمٰن۔

الجواب: شریعت کی رو سے اسلامی حکومت صرف اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کی مکلّف ہے اموالِ باطنہ کی ادائیگی کے لیے حکومت شرط نہیں بلکہ خود اصحابِ اموال کے ذمہ ہے کہ وہ خود ادا کردے۔

اموالِ ظاہرہ سے مراد؛ گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، وغیرہ جانور ہیں۔ اور اموالِ باطنہ سے مراد؛ سونا، چاندی اور دیگر اموال ہیں۔ ملاحظہ ہو؛ بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

أما الأول فمال الزكاة نوعان؛ ظاهر: وهو المواشي والمال يمر به التاجر على العاشر، وباطن وهو الذهب والفضة وأموال التجارة في مواضعها...

وأما المال الباطن الذي يكون في المصر فقد قال عامة مشايخنا إن رسول الله صلى الله عليه وسلم طالب بزكاته وأبوبكر ﷺ وعمر ﷺ طالبا وعثمان ﷺ طالب زماناً ولما كثرت أموال الناس ورأى أن في تتبعها حرجاً على الأمة وفي تفتيشها ضرراً بأرباب الأموال فوض الأداء إلى أربابها. وذكر إمام الهدى الشيخ أبومنصور الماتريدى السمرقندىؒ وقال

لـم يبـلـغـنـا أن الـنبـي صلى الله عليه وسلم بعث في مطالبة المسلمين بزكاة الورق وأموال التـجـارة ولكن الناس كانوا يعطون ذلك . (بـدائـع الـصنائع : ۲/۳۵،كتاب الزكاة ، فصل فى من له المطالبة باداء الواجب ،ط:سعيد).

قرآنِ کریم میں و آتوا الزکاۃ کی تفسیر میں امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں:

ولـم يشتـرط فيهـا أخذ الإمام لها... فلما خص الزكاة بالأمر بالإيتاء دون أخذ الإمام وأمـر فـى الـصـدقة بـأن يـأخـذهـا الإمـام وجب أن يكون أداء الزكوات موكولاً إلى أرباب الأموال إلا ما يمر به على العاشر . (احكام القرآن:۳/۱۵٦،ط:سهيل).

دوسری آیتِ کریمہ: ﴿ **إن تبـدوا الـصـدقـات فـنعما هي وإن تخفوها وتؤتوها الفقراء فهو خير لكم**﴾ [البقرة: ۲۷۱] کے تحت ابوحیان الاندلسی لکھتے ہیں: **وقال ابن عباس** رضی اللہ عنہ**: إخفاء صدقة التطوع أفـضـل مـن إظهارها ، وروى عنه: صدقات السر في التطوع تفضل علانيتها بسبعين ضعفاً ، وصدقة الفريضة علانيتها أفضل من سرها بخمسة وعشرين ضعفاً ، قال القرطبي: ومثل هذا لايـقـال بالرأي ، وإنما هو توقيف ، وقال قتادة : كلاهما إخفاءه أفضل. وقال الزجاج :كان إخفاء الزكاة على عهد رسول الله صلى الله عليه و سلم أحسن ، فأما اليوم فالناس مسيئون الظن فإظهارها أفضل .** (البحرالمحيط : ۲/٦۸۹،ط:دارالفكر).

اس آیتِ کریمہ اوراس کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ خفیہ صدقہ سے فرض بھی ادا ہوجاتا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس آیتِ کریمہ کے تحت لکھتے ہیں:

اس مقام مین مختلف اقوال ہیں،مگر احقر کے ذوق میں حسبِ شہادت ظاہر قرآن وحدیث حضرت حسن بصریؒ کا قول جو کبیر میں منقول ہے، راجح معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ یہ آیت فرض ونفل سب صدقات کو شامل ہے اور سب میں اخفاہی افضل ہے۔(بیان القرآن:۱/۱٦۳،ط: تاج پبلشرز)۔

اعلاء السنن میں علامہ ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ اموالِ باطنہ میں سلطان کو لینے کا حق نہیں ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً اس بارے میں کچھ منقول نہیں ہے؛

قـال نـعـم فيهـا فـرق آخر و هو أن السلطان له ولاية الجبر فى الأموال الظاهرة لا فى

الأموال الباطنة لعدم نقله عنه عليه السلام صريحاً ، و روايات بعثه صلى الله عليه وسلم السعاة إما مفسرة صريحة فى الأموال الظاهرة وإما مبهمة تحمل على المفسرة أو على ما حملوا عليه حديث أبي هريرة رضي الله عنه الآتي ذكره قريباً .

وعدم النقل فيما يكثر وقوعه كل سنة بل كل شهر لاختلاف أوقات حولان الحول حجة ظاهرة احتج بها العلماء في مسائل كثيرة ، واحتج به صاحب البدائع كما نقله عنه صاحب الدر المختار في خصوص صدقة الفطر، حيث قال : ولا يبعث الإمام على صدقة الفطر ساعياً لأنه عليه السلام لم يفعله ...

فإن قلت: لا يلزم من عدم بعث السعاة عدم الولاية لاحتمال وجوب أداء أهل الأموال بأنفسهم إلى السلطان .

قلنا : ينفيه الحديث: لا جلب ولا جنب ، كما في سنن أبي داود ، وسكت عنه ، فما ورد من قوله عليه السلام : " هاتوا ربع العشر " على معنى أدوا ولو إلى المساكين . (اعلاء السنن : ۹/ ۵۲،للسلطان ولاية اخذالزكاة فى الاموال الظاهرة لا الباطنة،ادارة القرآن).

علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں کہ سلطان کو اموالِ باطنہ میں کوئی حق نہیں ہے: قال: وظاهر ما صححه السرخسيؒ أنه لا فرق بين الأموال الظاهرة والباطنة وصحح الولوالجى عدم الجواز فى الأموال الباطنة قال: وبه يفتى لأنه ليس للسلطان ولاية الزكاة فى الأموال الباطنة فلم يصح الأخذ ، وفى الظهيرية : الأفضل لصاحب المال الظاهر أن يودى الزكاة إلى الفقراء بنفسه لأن هؤلاء لا يضعون الزكاة مواضعها . (البحر الرائق: ۲/ ۲۲۳،ط: کوئٹہ).

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ جواہر الفقہ میں فرماتے ہیں:

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے کا انتظام صرف اُن اموال میں کیا جو فقہاء کی اصطلاح میں اموالِ ظاہرہ کہلاتے ہیں یعنی جن اموال کا معاملہ بالکل کھلا ہوا اور واضح ہے، جیسے معادن، زرعی زمینیں اور مویشی کہ ان کو کوئی چھپا کر گھروں اور صندوقوں میں محفوظ نہیں کرسکتا بلکہ اُس کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت ہی کی انتظامی مشینری کرتی ہے...

باقی اموالِ باطنہ نقد، سونا، چاندی، زیورات وغیرہ ان کے متعلق حکومت کو شرعی قانون سے اسکا مجاز نہیں کیا کہ وہ لوگوں کے گھروں میں گھس کر ان کے محفوظ سامانوں کی تلاشی لیں۔ اور اُن کی زکوٰۃ وصول کریں بلکہ ایسے اموال کی زکوٰۃ خود اصحابِ اموال ہی کے حوالہ کی گئی وہ بطورِ خود ادا کریں، خواہ بیت المال کو دے دیں یا براہِ راست فقراء میں تقسیم کردیں، اور جو بیت المال کو دیں اس میں بھی ان سے یہ محاسبہ نہ ہوتا تھا کہ کل کتنا مال تھا؟ اس کی کتنی زکوٰۃ ہوتی ہے یہ کس قدر دے رہے ہیں؟ صحابہ کرام کا عام معمول یہی رہا کہ وہ اپنے ایسے اموال کی زکوٰۃ بھی بیت المال ہی میں خود جمع کردیتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان پر کوئی پابندی نہ تھی۔ (جواہر الفقہ: ۳/۱۸۰، ۱۸۱، ط: مکتبہ دارالعلوم کراچی)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (خیر الفتاویٰ: ۳/ ازص ۵۳۳ تا ص ۵۵۵، وفتاویٰ محمودیہ: ۱۴/ ۵۷، مکتبہ محمودیہ، وفتاویٰ حقانیہ: ۴/ ۷۷)۔

سوال میں پیش کردہ موقوف اثر کا جواب:

محدثین نے مختلف قسم کے آثار نقل کیے ہیں ان سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ اصحابِ اموال خود بھی ادا کرسکتے ہیں اور اگر حکومت کو دینا چاہیں تو حکومت کو بھی دے سکتے ہیں۔

مختلف قسم کے آثار اور احادیث کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (السنن الکبری للامام البیہقی: ۴/۱۱۴، امام بیہقیؒ نے چار ابواب قائم کیے ہیں اور ان میں دونوں طرح کی احادیث نقل کی ہیں، ومصنف ابن ابی شیبۃ: ۶/۳/۴۷، المجلس العلمی، وکتاب الاموال لابن زنجویہ: ۲/۲۱۴۴/۹۶۰، وکتاب الاموال لابی عبید قاسم بن سلام: ۱/ ۱۸۱۸/۶۸۴)۔

نیز مسلم بن یسار نے کسی صحابی کا قول نقل کیا ہے، اس موقوف اثر کے مقابلہ میں بہت ساری مرفوع روایات موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ لوگ خود ادا کرتے تھے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قرض معاف کردینے سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم:

سوال: میرے دوست کو جب پیسے کی ضرورت پڑتی ہے تو میں اس کو دیتا ہوں، اب اس کا حال ایسا ہے کہ وہ پیسے واپس نہیں کرسکتا، جب میں نے پیسے دیے تھے تو کچھ نیت نہیں کی، کیا اب میں ان پیسوں میں زکوٰۃ کی نیت کرسکتا ہوں؟ اس سے میرے ذمہ سے زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی؟

الجواب: زکوٰۃ ادا کرتے وقت نیت کرنا شرط ہے، اور نیت ادا کرتے وقت یا اپنے دوسرے مال سے

جدا کرتے وقت ضروری ہے، بلانیت پیسے دینے سے زکوٰۃ ادانہیں ہوتی، چنانچہ آپ کی زکوٰۃ ادانہیں ہوئی، ہاں اس کو اپنی رقم کی مقدارزکوٰۃ دیکراس سے اپنا قرض وصول کرسکتے ہیں بشرطیکہ وہ زکوٰۃ کا مستحق ہو۔

فقہاء کی عبارات درجِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

ولا يجوز أداؤها إلا بنية مقارنة لعزل الواجب أو للأداء . (الاختيارلتعليل المختار: ۱/۱۰۸،بيروت).

وقال في الهداية: ولا يجوز أداء الزكاة إلا بنية مقارنة للأداء أو مقارنة لعزل مقدار الواجب لأن الزكاة عبادة فكان من شرطها النية و الأصل فيها الاقتران إلا أن الدفع يتفرق فاكتفى بوجودها حالة العزل تيسيراً . (الهداية: ۱/۱۸۸،ط: شركة علمية).

و للمزيد راجع: (بدائع الصنائع : ۲/۴۱،ط:سعيد،والجوهرة النيرة: ۱/۱۴۱). واللہ ﷻ اعلم۔

غیر مستحق کو مستحق سمجھ کرزکوٰۃ دینے سے ادائیگی کا حکم:

سوال: ایک زکاتی ادارے نے درخواست دہندہ سے فارم میں تفصیلات درج کروائی، پھراندازہ اور تحقیق سے مستحق زکوٰۃ ہونے کا فیصلہ کیااور چندسال تک زکوٰۃ لیتارہا، انتقال کے بعداس کے ورثاء نے ادارے کو اطلاع دی کہ مرحوم زکوٰۃ کا مستحق نہیں تھا، اس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ رینڈجمع تھے، اورورثاء زکوٰۃ کی رقم واپس کرنے کوتیار ہے۔اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ: کیا یہ رقم ادارے کوواپس کی جائے؟ کیااس آدمی کودی گئی زکوٰۃ اداہوگئی یانہیں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: عام طور پرزکوٰۃ وصول کرنے والی تنظیمیں اورادارے تحقیق، تفتیش وتحری کے بعدفقراء و مستحقین کی فہرست مرتب کرتے ہیں، نیز یہ ادارے معطین اورفقراء دونوں کے وکیل ہوتے ہیں، بنابریں زکوٰۃ کی رقم پر قبضہ کرتے ہی معطین کی زکوٰۃ اداہوجاتی ہے، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ اداہوگئی، ہاں ورثاء رقم واپس کردیں تو یہ میت کی طرف سے احسان اورفراغتِ ذمہ کا سبب وذریعہ ہوگا۔ملاحظہ ہودرمختار میں ہے:

دفع بتحر، لمن يظنه مصرفاً فبان أنه عبده أو مكاتبه أوحربي ولو مستاماناً أعادها ، وإن بان غناه أوكونه ذمياً أو أنه أبوه أو ابنه أو امرأته أو هاشمي لايعيد ، لأنه أتى بما في وسعه ، حتى لو دفع بلا تحر لم يجز إن أخطأ وفي الشامية : وفيه: واعلم أن المدفوع إليه لو كان جالساً في صف الفقراء يصنع صنعهم أو كان عليه زيهم أو سأله فأعطاه كانت هذه

الأسباب بمنزلة التحري كذا في المبسوط حتى لو ظهر غناه لم يعد...ولا يسترد في الولد والغني وهل يطيب له ؟ فيه خلاف ، وإذا لم يطب قيل يتصدق وقيل يرد على المعطي .
(الدرالمختارمع ردالمحتار: ۲/ ۳۵۲، سعید).

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

اگر دینے والے نے غور وفکر کے بعد مصرف سمجھ کر زکوٰۃ دی تھی تو اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، مگر زید (ہاشمی ہے) کو اس چیز کے زکوٰۃ ہونے کا علم ہو گیا تو اس پر لازم ہے کہ معطی کو واپس کرے۔ (احسن الفتاویٰ:۴/ ۲۸۰)۔

جواہر الفقہ میں مذکور ہے: اگر کسی کو غریب و مستحق سمجھ کر زکوٰۃ دیدی پھر معلوم ہوا کہ وہ تو ذمی کافر ہے یا مالدار ہے یا تاریک رات میں کسی کو دی پھر معلوم ہوا کہ وہ اس کی ماں، باپ یا کوئی اور ایسا رشتہ دار ہے جس کو دینا اس کے لیے درست نہیں تو ان تمام صورتوں میں زکوٰۃ ادا ہوگئی، دوبارہ دینا واجب نہیں، لیکن لینے والے کو اگر معلوم ہو جائے کہ زکوٰۃ کا روپیہ ہے اور میں زکوٰۃ لینے کا مستحق نہیں ہوں تو اسے نہ لینا چاہیے اور واپس کر دینا چاہیے۔
(جواہر الفقہ :۳/ ۲۴۷)۔

مزید ملاحظہ ہو: (بہشتی زیور، حصہ سوم، ص ۲۴۹، وفتاویٰ محمودیہ:۹/ ۵۱۵، جامعہ فاروقیہ، وامداد المفتین، جلد دوم، ص ۳۹۲، ط: دارالاشاعت)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اسکول کی فیس زکوٰۃ سے منہا کرنے کا حکم:

سوال: کیا تعلیم حاصل کرنے کی فیس کو زکوٰۃ سے منہا کیا جائے گا یا نہیں؟ ایک عورت یونیورسٹی کی فیس ادا کرنے کے لیے چند مہینوں سے کچھ پیسے جمع کرتی ہے، تو زکوٰۃ ادا کرتے وقت فیس کی رقم منہا کی جائے گی یا پورے پیسے میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: گزشتہ سال یا ماہ کی واجب الاداء فیس کی رقم منہا کر کے زکوٰۃ ادا کی جائے گی، لیکن آئندہ ماہ کی یا آئندہ سال کی فیس کی رقم منہا نہیں کی جائے گی۔ یعنی جو اس کے ذمہ قرض ہے وہ منہا کریں گے لیکن آئندہ جو اس کے ذمہ واجب ہونے والی ہے وہ رقم منہا نہیں ہوگی۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

إذا أمسكه لينفق منه كل ما يحتاجه فحال الحول وقد بقي معه نصاب فإنه يزكي ذلك الباقي وإن كان قصد الإنفاق أيضاً في المستقبل لعدم استحقاق صرفه إلى حوائجه

الأصلية وقت حولان الحول بخلاف ما إذا حال الحول و هو مستحق الصرف إليها لكن يحتاج إلى الفرق بين هذا وبين ما حال الحول عليه وهو محتاج منه إلى أداء دين . (فتاوى الشامي: ۲/۲۶۳،سعيد).

وفي البحر الرائق: في معراج الدراية في فصل زكاة العروض أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة، وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري . (البحر الرائق: ۲/۲۰۶، كوئٹه).

(وكذا في حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح ،ص ۷۱۵،ط: قديمي).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مرقوم ہے:

اگر اپنی بہت سی ضروریات کو بند کر کے کسی خاص ضرورت کے لیے روپیہ جمع کیا جائے تو سال بھر کے بعد اس پر زکوۃ ہے۔(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۶/۶۴،کبیر،ط:دارالاشاعت)۔واللہ ﷻ اعلم۔

خشخاش اور افیون کی کاشت میں وجوبِ عشر کا حکم:

سوال: خشخاش کی پیداوار میں عشر واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو دانہ پر یا اس کی ڈنڈی اور چھلکے پر بھی؟ نیز افیون جو مشہور نشہ آور چیز ہے اور دوائیوں بھی بکثرت استعمال ہوتی ہے، اس میں عشر واجب ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: خشخاش کے دانہ اور افیون مقصود ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان کی پیداوار میں عشر واجب ہے لیکن ڈنڈی اور چھلکے مقصود نہیں ہوتے بایں وجہ ان پر عشر واجب نہیں۔ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

من شرائط المحلية :...ومنها أن يكون الخارج من الأرض مما يقصد بزراعته نماء الأرض وتستغل به عادة فلا عشر في الحطب و الحشيش و القصب الفارسي لأن هذه الأشياء لا تستنمى بها الأرض ولا تستغل بها عادة لأن الأرض لا تنمو بها بل تفسد فلم تكن نماء الأرض...ويجب في قصب السكر وقصب الذريرة لأنه يطلب بهما نماء الأرض فوجد شرط الوجوب فيجب . (بدائع الصنائع : ۲/۵۸،سعيد).

قال في البحر الرائق: كل ما لا يقصد به استغلال الأرض لا يجب فيه العشر مثل

السعف والتبن، وكذا كل حب لا يصلح للزراعة كبزر البطيخ والقثاء لكونها غير مقصودة في نفسها، وكذا لا عشر فيما هو تابع للأرض كالنحل والأشجار . (البحر الرائق: ۲/۲۵۶، دارالكتاب الاسلامي) . **للمزيد راجع :** (فتاوى الشامي: ۲/۳۲۷،سعيد،والمحيط البرهاني: ۲/۴۸۶،ط:رشيديه،والفتاوى الهندية: ۱/۱۸۶، والجوهرة النيرة: ۱/۱۲۵).

فتاویٰ فریدیہ میں مرقوم ہے:

چونکہ خشخاش اور افیم دونوں مقصود ہوتے ہیں اس لیے ان دونوں میں عشر واجب ہوگا بخلاف اس کی ڈنڈی اور چھلکے کے۔ (فتاویٰ فریدیہ:۳/۴۶۳)۔

خیر الفتاویٰ میں مذکور ہے:

وجوبِ عشر اور عدمِ وجوبِ عشر کا مدار اس پر ہے کہ جو چیز زمین کی کاشت سے مقصود ہوتی ہے اس چیز پر عشر واجب ہوتا ہے اور جو چیز اس کے ساتھ تبعاً حاصل ہو جائے اس پر عشر واجب نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ گندم میں عشر واجب ہے اور بھوسہ میں عشر نہیں ہے کیونکہ زمین کی کاشت گندم ہی کے لیے کی جاتی ہے بھوسہ اس کے ساتھ تبعاً حاصل ہوتا ہے لیکن اگر کسی نے بھوسہ ہی کے لیے زمین کی کاشت کی ہے تو پھر اس میں عشر واجب ہوگا۔ (خیر الفتاویٰ:۳/۴۹۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

پیداوار کا عشر ادا کرنے کے بعد اس کی قیمت پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے ربیع الثانی میں اپنی فصل کا عشر شریعت کے مطابق ادا کیا پھر بعد میں فصل کو تین لاکھ روپے میں فروخت کر دیا، پھر رمضان المبارک میں زکوٰۃ ادا کرتے وقت اس تین لاکھ روپے کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ایک مرتبہ فصل کا عشر ادا کرنے کے بعد اب نہ اس پر دوسری مرتبہ عشر واجب ہے اور نہ زکوٰۃ واجب ہے، ہاں فروخت کرنے کے بعد اس کی رقم کو دوسرے نصاب کے ساتھ ملا کر سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، لہٰذا شخص مذکور رمضان المبارک میں دیگر اموال کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت تین لاکھ روپے کی بھی زکوٰۃ ادا کریگا۔ ملاحظہ ہو الجوہرۃ النیرۃ میں ہے:

قوله ومن كان له نصاب فاستفاد في أثناء الحول مالاً من جنسه ضمه إلى ماله وزكاه ،

سواء كان المستفاد من نمائه أو لا وبأي وجه استفاده ضمه سواء كان بميراث أو هبة أو غير ذلك وشرط كونه من جنسه . (الجوهرة النيرة : ۱/۱۲۰،ط:الخيرية). (وكذا في بدائع الصنائع: ۲/۱۴، والفتاوى الهندية: ۱/۱۷۵،وتبيين الحقائق: ۱/۲۷۲،امداديه،وفتح القدير: ۲/۱۹۵،دارالفكر).

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے:

پیداوار کا عشر الگ فرض ہے اور پیداوار فروخت کی تو اس سے حاصل ہونے والی رقم پر زکوٰۃ الگ فرض ہے لأن الحقين لم يتعلقا بمحل واحد فإن العشر حق الأرض النامية بالخارج حقيقة وزكاة النقود حق المال النامي تقديراً ... قال ابن نجيم ؒ في زكاة مال التجارة إذا دخل من أرضه حنطة تبلغ قيمتها قيمة نصاب ونوى أن يمسكها ويبيعها فأمسكها حولاً لا تجب فيها الزكاة . (البحرالرائق: ۲/۲۰۹)، عبارتِ مذکورہ میں عدمِ وجوبِ زکوٰۃ کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ حنطہ مالِ تجارت نہیں،اس سے ثابت ہوا کہ بیع حنطہ کی صورت میں نقود پر زکوٰۃ فرض ہوگی،لأنها متعينة للتجارة خلقة. (احسن الفتاویٰ:۴/۳۶۰)۔

آپ کے مسائل اوران کا حل میں ہے:

ایک بار عشر ادا کر دینے کے بعد جب تک اس کو فروخت نہیں کیا جاتا اس پر نہ عشر ہے، نہ زکوٰۃ اور جب عشر ادا کر دینے کے بعد فصل فروخت کر دی تو اس سے حاصل شدہ رقم پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب اس پر سال گزر جائے گا یا اگر یہ شخص پہلے سے صاحبِ نصاب ہے تو جب اس کے نصاب پر سال پورا ہوگا تو اس وقت اس رقم کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل:۵/۱۸۳)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عشر ادا کرتے وقت اخراجات منہا کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص اپنی زمین کی پیدوار کا نصفِ عشر ادا کرتا ہے کیونکہ زمین کی سیرابی ٹیوب ویل سے ہوتی ہے لیکن اس میں اخراجات منہا کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ بعض مرتبہ اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں، مثلاً ۲۰ ہزار کی پیداوار میں ایک ہزار نصفِ عشر ہے لیکن ۲۰ ہزار پورے سال کی بجلی کا بل ہو جاتا ہے، تو اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: جو زمینیں عشری ہیں ان میں کل پیداوار میں عشر یا نصفِ عشر واجب ہوگا، اخراجات منہا نہیں

کیے جائیں گے، اخراجات کو مدِنظر رکھتے ہوئے نصفِ عشر کا حکم لگایا ہے، لہٰذا دوبارہ منہا نہیں کیا جائیگا۔
ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

ویجب نصفه في مسقى غرب أى دلو كبير ودالية أى دولاب لكثرة المؤنة ... بلا رفع مؤن أى كلف الزرع وبلا إخراج البذر لتصريحهم بالعشر في كل الخارج . قوله بلا رفع مؤن أى يجب العشر فى الأول ونصفه فى الثاني بلا رفع أجرة العمال ونفقة البقر و كرى الأنهار وأجرة الحافظ و نحو ذلک درر ، قال فى الفتح يعنى لا يقال بعدم وجوب العشر في قدر الخارج الذي بمقابلة المؤنة بل يجب العشر فى الكل لأنه عليه الصلاة والسلام ، حكم بتفاوت الواجب لتفاوت المؤنة ولو رفعت المؤنة كان الواجب واحداً وهو العشر دائماً فى الباقي، لأنه لم ينزل إلى نصفه إلا للمؤنة والباقى بعد رفع المؤنة لا مؤنة فيه.

(فتاوى الشامي: ۳۲۸/۲،سعيد). (وكذا فى فتح القدير: ۲۵۰/۲،دارالفكر).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مذکور ہے: جن اراضی میں عشر واجب ہے ان میں کل پیداوار کا عشر نکالنا واجب ہے، بدون وضع کرنے اخراجات کے، **كما فى الدر المختار** . (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۱۷۳/۶، دارالاشاعت)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے: عشر میں مزدور کی مزدوری اور دیگر اخراجات کا حساب نہیں ہوتا یعنی مزدوروں کی مزدوری کی وجہ سے عشر میں کمی نہ ہوگی۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۱۸۵/۶، ط: دارالاشاعت)۔

مزید ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مباحث:۳۲۵/۸، وجدید فقہی مسائل:۲۳۳/۱)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

عید کی رات دروازے پر صدقہ کا بیگ پایا:

سوال: عید کی رات ایک صاحب کے دروازے پر کوئی غائبانہ فطرے کے چاول رکھ کر چلا گیا، اب وہ شخص خود مالدار ہے تو کیا اس کی قیمت صدقہ کر کے خود استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بظاہر مالک نے صاحبِ خانہ کو مستحق سمجھ کر چاول کا بیگ رکھ دیا، لیکن جب صاحبِ خانہ مستحق نہیں ہے تو مالک کو پہنچادے اور اگر مالک تک پہنچانا مشکل یا ناممکن ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کر دے لیکن مالدار کو خود استعمال کرنا درست نہیں، نیز یہ چاول بحکمِ امانت ہیں اس میں تبدیلی کی بھی اجازت نہیں۔
ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

قال في شرح الوهبانية و فى البزازية قال الإمام الحلواني إذا كان عنده وديعة فمات المودع بلا وارث له أن يصرف الوديعة إلى نفسه في زماننا هذا ، لأنه لو أعطاها لبيت المال لضاع ؛ لأنهم لا يصرفون مصارفه فإذا كان من أهله صرفه إلى نفسه وإن لم يكن من المصارف صرفه إلى المصرف . (فتاوى الشامي: ۳۳٦/۲،سعيد، وكذا ۱۵۹/۴،و ۷۳۴/٦،سعيد).

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

امین کو اگر امانت رکھنے والے کا اَتہ پتہ معلوم نہ ہو... تو خود اس مال کو امانت رکھنے والے کی طرف سے صدقہ کردے یا صدقہ کی وصیت کر جائے، البتہ اگر امین فقیر ہو تو خود بھی کھا سکتا ہے... الخ. **قال العلامة الحصكفي**ؒ: **فينتفع الرافع بها لو فقيراً وإلا تصدق بها على فقير ولو على أصله وفرعه وعرسه ...**(الدر المختار مع رد المحتار: ۲۷۹/۴،ط:سعيد)،(فتاویٰ حقانیہ:۴۰۳/٦)۔

فتاویٰ دار العلوم زکریا میں ہے:

سوال: ایک شخص کے پاس امانت ہے، کافی عرصہ گزرنے کے بعد بھی مالک کا کوئی پتہ نہیں ہے، اب اس امانت کا کیا حکم ہے؟ مزید کتنی مدت اس کو رکھا جائیگا؟ اور مالک کے نہ آنے پر اس کے ساتھ کیا کیا جائے گا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر غالب گمان یہ ہے کہ مالک مر گیا ہوگا یا نہیں آئیگا اور نہ کسی وارث کا علم ہے تو اس کا حکم لقطہ کی طرح ہے اگر غنی ہے تو صدقہ کردے اور اگر خود محتاج ہے تو استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم زکریا:۹۷/٦)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

شکاری جانوروں میں زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے شکاری جانور مثلاً: (Eland) یعنی بڑا ہرن اور (Gemsbok) یعنی افریقی بڑا ہرن، خریدے، اب سوال یہ ہے کہ ان جانوروں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ نیز شکار کا فارم بہت وسیع ہے اس میں جانوروں کی تعداد بھی معلوم نہیں ہوتی، جانور پورے جنگل میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، اور ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ جاتے ہیں، لہٰذا ان کو گننا اور تعداد معلوم کرنا بہت مشکل ہے، اسی طرح صرف بڑے جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے بچوں کا نہیں، تو زکوٰۃ کونسے جانور پر ہوگی؟ نیز بچوں کی قیمت کیسے متعین کی جائے گی؟ بینوا بالدليل توجروا بالأجر الجزيل ۔

الجواب: مالِ تجارت پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور مالِ تجارت کا مطلب یہ ہے کہ آگے فروخت کرنے کی نیت سے خریدا ہو، اور فارم کے جانور فروخت کے لیے نہیں ہوتے یا تو سیر وسیاحت اور نظارہ کے لیے ہوتے ہیں یا شکار کے لیے ہوتے ہیں اور شکار کے جانوروں کو مالِ تجارت نہیں کہتے بلکہ ان کو قصائی کے جانوروں کی طرح ذبح کرنے کے لیے خریدا گیا ہے ان پر زکوٰۃ نہیں، ہاں شکار کے بعد جو قیمت حاصل ہو اس کو دوسری رقوم کے ساتھ ملا کر سال گزرنے زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہوگی۔ ملاحظہ ہو صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

وإن اشترى شيئاً ونواه للتجارة كان للتجارة لاتصال النية بالعمل بخلاف ما إذا ورث و نوى التجارة ، لأنه لا عمل منه و لو ملكه بالهبة أو بالوصية أو النكاح أو الخلع أو الصلح عن القود و نواه للتجارة كان للتجارة عند أبي يوسف ؒ لاقترانها بالعمل وعند محمد لايصير للتجارة لأنها لم تقارن عمل التجارة وقيل الاختلاف على عكسه . (الهداية : ١/١٨٧، كتاب الزكاة، ط: المصباح).

بہشتی زیور میں مرقوم ہے:

جنگلی جانوروں پر جیسے ہرن وغیرہ زکوٰۃ فرض نہیں، ہاں اگر تجارت کی نیت سے خرید کر رکھے جائیں تو ان پر تجارت کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔ (بہشتی زیور، گیارہواں حصہ، ص ۱۱۱، ط: المکتبۃ المدینۃ)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

مرغی فارم اور انڈوں پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص کا (Broiler Chicken) مرغی فارم ہے، تجارت کے لیے مرغیاں پروان چڑھائی جاتی ہیں، کیا ان کا الگ سے کوئی نصاب ہے یا نہیں یا پھر ان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟ (۲) اگر کوئی شخص مرغیوں کی تجارت نہیں کرتا، انڈے حاصل کرنے کے لیے مرغی فارم میں مرغیاں رکھی ہیں، تو کیا مرغیوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا انڈوں پر؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مرغیوں کا کوئی الگ سے نصاب مقرر نہیں، سال ختم ہونے پر ان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یعنی مالیت کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں ادا کر دیا جائے۔ (۲) جب مرغیوں کی تجارت نہیں کرتا تو مرغیوں کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ انڈوں کی آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

قال في الهداية : الذكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها

نصاباً من الورق أو الذهب. (الهداية: ۱/۱۹۵،فصل في العروض،المصباح). (وكذافي الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۹،ومختصر القدوري: ۱/۵۷،ط:بيروت،والفتاوى التاتارخانية: ۲/۲۳۷).

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

مرغی خانہ اور مچھلی کے تالاب کی زمین، مکان اور متعلقہ سامان پر زکوٰۃ نہیں، مرغیاں اور چوزے خریدتے وقت اگر خود انہی کو بیچنے کی نیت ہو تو ان کی مالیت پر زکوٰۃ فرض ہے، اور اگر ان کی بجائے ان کے انڈے اور بچے بیچنے کی نیت ہے تو (مرغیوں پر) زکوٰۃ نہیں۔ (احسن الفتاویٰ: ۴/۳۰۰)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے:

اگر آپ مرغیوں کی تجارت نہیں کرتے بلکہ صرف ان کے انڈوں کی تجارت کرتے ہیں تو اصل سرمایہ پر زکوٰۃ نہیں، بلکہ انڈوں کی آمدنی پر ہے جبکہ صاحبِ نصاب ہوں۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۳/۶۰۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زمین جاگیر کے مالک کو زکوٰۃ کی رقم دینے کا حکم:

سوال: کسی کے پاس زمینیں ہیں، وہ تجارت کے لیے نہیں ہیں، لیکن ان کی قیمت نصاب سے زیادہ ہے، اس شخص کے پاس ان زمینوں کے علاوہ کوئی اور مال نہیں ہے، ان زمینوں کی دوصورتیں ہیں: ۱۔ ایک وہ زمینیں جن کی کوئی آمدنی نہیں مل سکتی یعنی کوئی اس کو کرایہ پر لینے کے لیے تیار نہیں ہے، ۲۔ وہ زمینیں جن کی آمدنی مل سکتی ہے لیکن مالک نے بے پرواہی کی وجہ سے کوئی توجہ نہیں دی۔ کیا یہ شخص زکوٰۃ لے سکتا ہے؟ یا وہ غنی شمار ہوگا؟ کیا اس پر صدقۃ الفطر اور قربانی واجب ہے یا نہیں؟ فتاویٰ کی کتابوں میں صاحبِ ضیعہ کے بارے میں مختلف باتیں ملتی ہیں، لہٰذا تشفی بخش، مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب: شخص مذکور پر واجب ہے کہ زمینوں کو آمدنی پر لگائے، اور اس آمدنی سے اپنا گزر بسر کرے، یا پھر فروخت کرکے اپنی حاجات پوری کرے لیکن دونوں میں سے کوئی صورت نہیں بنتی اور فی الحال گزارے کے لیے کچھ نہیں ہے تو زکوٰۃ لینے کی اجازت ہے، اور جب مستحق زکوٰۃ ٹھہرا تو صدقہ فطر اور قربانی اس پر واجب نہیں ہوگی۔ ہاں جب زمینیں فروخت کرکے نقدی حاصل کرلے گا تو پھر زکوٰۃ اور صدقہ فطر نہیں لے سکتا، بلکہ صاحبِ نصاب ہونے کی وجہ سے حولانِ حول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں مذکور ہے:

قوله فارغ عن حاجته ، قال في البدائع قدر الحاجة هوما ذكره الكرخي في مختصره لا بأس أن يعطى من الزكاة من له مسكن و ما يتأثث به في منزله وخادم و فرس و سلاح وثياب البدن وكتب العلم إن كان من أهله فإن كان له فضل عن ذلك تبلغ قيمته مائتى درهم حرم عليه أخذ الصدقة لما روى عن الحسن البصرى قال: كانوا يعنى الصحابة يعطون من الزكاة لمن يملك عشرة آلاف درهم من السلاح والفرس والدار والخدم و هذا لأن هذه الأشياء من الحوائج اللازمة التى لا بد للإنسان منها.

وذكر في الفتاوى فيمن له حوانيت ودور للغلة لكن غلتها لا تكفيه وعياله أنه فقير ويحل له أخذ الصدقة عند محمد وعند أبي يوسف لا يحل...وفي التاترخانية عن التهذيب أنه الصحيح وفيها عن الصغرى له دار يسكنها لكن تزيد على حاجته بأن لا يسكن الكل يحل له أخذ الصدقة في الصحيح وفيها سئل محمد عمن له أرض يزرعها أو حانوت يستغلها أو دار غلتها ثلاثة آلاف ولا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة يحل له أخذ الزكاة وإن كانت قيمتها تبلغ ألوفاً وعليه الفتوى وعندهما لا يحل . (فتاوى الشامي: ۲/۳۴۷، سعيد).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولو كان له ضيعة تساوى ثلاثة آلاف ولا تخرج ما يكفي له ولعياله اختلفوا فيه قال محمد بن مقاتل: يجوز له أخذ الزكاة . (الفتاوى الهندية: ۱/۱۸۹).

بدائع الصنائع میں مذکور ہے:

ومنها (أى شرائط وجوب صدقة الفطر) الغنا فلا يجب الأداء إلا على الغنى وهذا عندنا. (بدائع الصنائع : ۲/۶۹،سعيد).

ومنها (شرائط وجوب الأضحية) الغنى لما روي عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: من وجد سعة فليضح، شرط عليه الصلاة والسلام السعة وهي الغنى ولأنا أوجبناها بمطلق المال ، ومن الجائز أن يستغرق الواجب جميع ماله فيودى إلى الحرج فلا بد من اعتبار الغنى وهو أن يكون في ملكه مائتا درهم أو عشرون ديناراً أو شيء تبلغ قيمته ذلك

سوی مسکنه وما یتأثث به وکسوته وخادمه وفرسه وسلاحه وما لا یستغنی عنه وهو نصاب صدقة الفطر وقد ذکرناه وما یتصل به من المسائل فی صدقة الفطر. (بدائع الصنائع: ۶۴/۵).

امدادالاحکام میں مذکور ہے:

بکر مفلس خستہ حال عیال دار ہے مگر اس کے نام ایک موضع ویران شدہ میں اراضی زرعی ہزار بیگہ ہے جو کہ موضع ویران ہو جانے سے محض بیکار پڑی ہے کچھ آمدنی نہیں البتہ فروخت کرے تو کئی ہزار مل سکتے ہیں...؟

الجواب: صورتِ مسئولہ میں اس شخص کو زکوٰۃ دینا جائز ہے مگر جس کے پاس اُفتادہ زمین ہے اس کے لیے لازم ہے کہ اس کے فروخت کرنے کی کوشش کرے، اور جب تک خریدار نہ پیدا ہو زکوٰۃ کا مال لے سکتا ہے۔

(امدادالاحکام: ۴۵/۲، ط: دارالعلوم کراچی)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

سوال: ایک شخص کی بہت سی زمین ہے مگر وہ آباد نہیں تو اس شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: جبکہ ان زمینوں سے اس کی حوائج پوری نہیں ہوتیں اور وہ مالِ نامی بھی نہیں تو اس کو زکوٰۃ دینا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵۷۲/۹، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قیدی کی رہائی کے ضروری اخراجات میں زکوٰۃ کی رقم دینے کا حکم:

سوال: جو مسلمان بے گناہ اسلام کے نام پر عرصہ دراز سے مقید ہے، کوئی پرسانِ حال نہیں ہے، اور مقدمہ لڑنے میں خرچہ بہت زیادہ اٹھانا پڑتا ہے، کیا زکوٰۃ کی رقم سے اس کی رہائی کے لیے مقدمہ لڑا جاسکتا ہے؟ یاد رہے کہ یہ مقدمہ ان کی اجازت سے داخل کیا جاتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: قیدی اگر فقیر اور مستحق زکوٰۃ ہے یعنی صاحبِ نصاب نہیں ہے تو وہ زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے اپنی طرف سے کسی کو وکیل بنادے، وکیل اس کی طرف سے قبضہ کرنے کے بعد اس کے حکم کے موافق خرچ کرے گا۔ ملاحظہ ہو درمختار میں مرقوم ہے:

ویشترط أن یکون الصرف تملیکاً لا إباحة کما مر لا یصرف إلی بناء نحو مسجد ولا إلی کفن میت وقضاء دینه إلی وقدمنا أن الحیلة أن یتصدق علی الفقیر ثم یأمره بفعل هذه الأشیاء. (الدرالمختار: ۳۴۴/۲، سعید).

فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے:

وكذلك من عليه الزكاة لو أراد صرفها إلى بناء المسجد أو القنطرة لا يجوز، فإن أراد الحيلة، فالحيلة أن يتصدق به المتولي على الفقراء، ثم الفقراء يدفعونه إلى المتولي ثم المتولي يصرف إلى ذلك، كذا في الذخيرة. (الفتاوى الهندية: ۴۷۳/۲).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

زکوٰۃ کا روپیہ غریب شخص کو دیا جائے پھر وہ اپنی طرف سے مسجد یا مدرسہ کے مقدمہ میں یا اور کسی کام کے لیے دے دے تو درست ہے، براہِ راست وہ پیسہ مسجد یا مدرسہ یا کسی غریب کے مقدمہ وغیرہ میں صرف کرنا یا تعمیر میں لگانا، تنخواہ میں دینا درست نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۲۴۱/۱۴، ط: محمودیہ، میرٹھ)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حولان الحول کے بعد اپنی ضروریات میں مال خرچ کرنے سے زکوٰۃ کا حکم:

سوال: ایک شخص کو جنوری میں سال ختم ہونے پر ۸۰،۰۰۰ رینڈ کی زکوٰۃ دینا تھی، لیکن اس وقت اس نے ادا نہیں کی، اور کچھ رقم اپنی ضروریات میں خرچ کر لی، اب اس کے پاس فقط ۲۸۰۰۰ رینڈ ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ۸۰،۰۰۰ رینڈ کی زکوٰۃ دے یا ۲۸۰۰۰ رینڈ کی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: سال گزر جانے کے بعد مال کم ہونے کے بارے میں بنیادی بات یہ ہے اگر مال کا کچھ حصہ ہلاک ہو جائے تو اس کے بقدر زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے، لیکن اگر اپنی ضروریات میں خرچ کر دیا تو کل مال کی زکوٰۃ ادا کرنی لازم ہوگی، چنانچہ صورت مسئولہ میں ۸۰،۰۰۰ رینڈ کی زکوٰۃ ادا کرے۔

بطورِ تنبیہ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں قمری سال کا اعتبار ہوگا شمسی سال کا اعتبار نہیں ہوگا، لہٰذا قمری سال کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے ورنہ ہر تین سال میں ایک مہینہ کم ہوگا اور ۳۳ یا ۳۶ سال میں ایک سال کی زکوٰۃ ذمہ میں باقی رہ جائیگی۔

دلائل ملاحظہ فرمائیں؛ حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں مذکور ہے:

ولا يضمن الزكاة مفرط غير متلف فهلاك المال بعد الحول يسقط الواجب وهلاك البعض حصته ويصرف الهالك إلى العفو، قوله غير متلف: لو أتلفه فإنه يضمن لوجود التعدي، قوله يسقط الواجب: لتعلقه بالعين لا بالذمة. (حاشية الطحطاوى على مراقى

الفلاح ،ص۴۱۷،قدیمی).

وقال فی البحرالرائق: وقید بالهلاک ؛ لأنه لو استهلکه بعد الحول لا تسقط عنه لوجود التعدی . (البحرالرائق: ۲/۲۳۵،ط:دارالمعرفة).

وقال العلامة الشامي في منحة الخالق: قوله وقید بالهلاک؛ لأنه لو استهلکه، أقول: المراد بالاستهلاک إخراج النصاب عن ملکه قصداً بلا بدل یقوم مقامه فاستبدال مال التجارة بمال التجارة لیس باستهلاک لقیام الثاني مقام الأول؛ لأن الزکاة لم تتعلق بعینه .
(منحة الخالق حاشیة البحرالرائق: ۲/۲۳۵،ط:دارالمعرفة).

فتاویٰ حقانیہ میں مرقوم ہے:

جب نصاب پر سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوجائے گی لیکن اگر کسی شخص نے ابھی تک زکوٰۃ ادا نہ کی ہو اور سارا مال مکان کی تعمیر یا اور کسی ضرورت میں خرچ کیا تو اس کے ذمے زکوٰۃ دینا باقی ہے، مال کو اس طرح خرچ کرنے سے زکوٰۃ ساقط نہ ہوگی۔البتہ اگر مال ہلاک یا تباہ ہوجائے جس میں مزکی کا ہاتھ نہ ہو تو اس صورت میں زکوٰۃ ساقط ہے، **لما قال الشیخ عبد الحي اللکنوی**ؒ: زکوٰۃ ذمہ پر ہے،خزانۃ الروایات میں عتابیہ سے منقول ہے: **إذا هلک النصاب بعد الحول تسقط الزکاة عنه وإن استهلکه ضمن الزکاة في ذمته والاستهلاک إخراج النصاب عن ملکه .** (فتاویٰ حقانیہ:۳/۵۳۲)۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں حولان الحول کے لیے قمری سال کا اعتبار ہے۔

ملاحظہ البحرالرائق میں مذکور ہے:

وفی القنیة : العبرة فی الزکاة للحول القمری . (البحرالرائق:۲/۲۱۹، دارالمعرفة).

وفی الدرالمختار: وحولها ای الزکاة قمری بحر عن القنیة لا شمسی، وسیجیء الفرق فی العنین . وفي رد المحتار: وعبارته مع المتن : وأجل سنة قمریة بالأهلة علی المذهب وهي ثلاثمائة وأربع وخمسون وبعض یوم وقیل شمسیة بالأیام وهي أزید بأحد عشر یوماً . (الدرالمختار مع رد المحتار:۲/۲۹۵،سعید). (وکذا فی الفتاوی الهندیة: ۱/۱۷۵،وفتاوی الشامی :۲/۲۵۹،سعید،ونورالایضاح ،کتاب الزکاة).

وقال في السفر الطويل: وكل ثلاث وثلاثين سنة شمسية تساوى أربعاً وثلاثين سنة قمرية . (السفر الطويل إلى تحقيق يوم ولادة الرسول صلى الله عليه وسلم ، للشيخ محمد الأمين سليم الفرضي،ص۷). واللہ ﷻ اعلم۔

غیر مستحق زکوٰۃ کا زکوٰۃ کی رقم استعمال کرنے کے بعد اس کی تلافی کا حکم:

سوال: ایک شخص کو کسی نے زکوٰۃ کی رقم دی جبکہ وہ زکوٰۃ کا مستحق نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے وہ رقم استعمال کرلی، اب وہ شخص بہت شرمندہ ہے، تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مالدار کے لیے زکوٰۃ کا مال لینا جائز نہیں تھا پھر جب خود استعمال کیا تو گنہگار ہوا، اب اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ اپنے اِس فعل سے توبہ واستغفار کرے، اور اس کے بقدر رقم صدقہ کرے، یا معطی کو واپس کردے۔ لیکن چونکہ واپس کرنے میں چہ میگوئیاں ہونے اور دشمنی اور بدگمانی کا خطرہ ہے؛ اس لیے اتنی مقدار رقم فقیر پر صدقہ کردے۔ درمختار میں ہے:

باب المصرف، أى مصرف الزكاة والعشر: ... ويشترط أن يكون الصرف (تمليكاً) لا إباحة كما مر (لا) يصرف ...(و) لا إلى (غنى) يملك قدر نصاب فارغ عن حاجته الأصلية من أى مال، فكان كمن له نصاب سائمة لا تساوى مئة درهم...

وفي رد المحتار: ولا يسترد في الولد والغنى وهل يطيب له؟ فيه خلاف، وإذا لم يطب، قيل يتصدق، وقيل يرد على المعطى... (الدرالمختار مع رد المحتار: ۲/۳۵۳، سعيد).

فتاویٰ قاسمیہ میں ہے: اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو فقراء اور مساکین کی ضرورت پوری کرنے کے لیے فرض فرمایا ہے؛ اس لیے نہیں کہ زکوٰۃ کے ذریعہ سے کسی کی تجارت کو فروغ دیا جائے اور مستحقین کو اس سے محروم کردیا جائے... اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا کہ زکوٰۃ کے مستحق صرف فقیر ومسکین ہیں: ﴿**إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ...**﴾ (التوبة: ۶۰).

نیز حدیث شریف میں ایسے شخص کو مال زکوٰۃ حاصل کرنے سے سختی سے منع کیا گیا جو صحیح وتندرست اور کمانے کی قدرت رکھتا ہو: **لا يحل الصدقة لغنى ولا لذى مرة سوى.** (سنن الترمذي: ۶۵۸، ۱/۱۴۲، باب ما جاء في فضل الصدقة). (فتاوی قاسمیہ: ۱۰/۶۷۹)۔

اسلامی فقہ میں ہے: البتہ اگر لینے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ روپیہ یا غلہ عشر یا زکوٰۃ کا تھا تو اس کو واپس کر دینا چاہئے۔ (اسلامی فقہ: ۱/۴۷۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زکوٰۃ کے فارم پر قبضہ کرنے سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص Withdrawal form کے ذریعہ زکوٰۃ ادا کرے تو ادا ہوگی یا نہیں؟ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مزکی ایک فارم پر اپنا اکاؤنٹ نمبر وغیرہ کی تفصیل لکھتا ہے اور زکوٰۃ کی رقم کا مبلغ لکھتا ہے پھر وہ فارم مستحق زکوٰۃ کو دیتا ہے، پھر (۱) وہ فقیر اس فارم کو لے کر کسی دکان میں جاتا ہے اور سامان خریدتا ہے اور اس کے عوض بائع کو وہ فارم دیدیتا ہے پھر بائع اس سے اپنے اکاؤنٹ میں پیسے منتقل کر لیتا ہے، (۲) یا فقیر اس کے ذریعہ فیس ادا کرتا ہے۔ (۳) یا فقیر کسی کو ہدیہ کر دیتا ہے۔ (۴) یا فقیر سے وہ فارم گم جاتا ہے۔ تو کیا اِن تمام صورتوں میں مزکی کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ **بینوا بالدلیل توجروا بالأجر الجزیل.**

الجواب: بصورتِ مسئولہ فارم حاصل کرنا قبضہ حکمی کے مترادف ہے، لہٰذا مذکورہ ۱، ۲، ۳، میں زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، البتہ آخری صورت میں یعنی فارم کے گم ہو جانے کی صورت میں مزکی کا ذمہ فارغ نہیں ہوا، اس فارم کی پشت پر جتنی رقم مرقوم ہے اتنی اپنے اکاؤنٹ سے نکال کر مستحق زکوٰۃ کو دیدے یا دوسرا فارم لکھدے تب ذمہ فارغ ہوگا۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مذکور ہے:

والتمكن من القبض كالقبض...ولو وهب لرجل ثياباً في صندوق مقفل ودفع إليه الصندوق لم يكن قبضاً وإن كان الصندوق مفتوحاً كان قبضاً لأنه يمكنه القبض كذا في المحيط. (البحر الرائق: ۷/۲۸۵، كتاب الهبة، كوئٹه). (وكذا في الدر المختار: ۵/۶۹۰، سعيد).

وقال في المحيط البرهاني: والقبض نوعان: حقيقي وأنه ظاهر، وحكمي وذلك بالتخلية؛ لأنها إذا كانت بحضرتهما فقد تمكنت من قبضها حقيقة، وهو تفسير التخلية، وهذا قول محمدؒ خاصة. (المحيط البرهاني: ۶/۲۳۸، الفصل الثاني فيما يجوز في الهبة ومالايجوز، ط: بيروت). (وكذا في منحة الخالق على البحر الرائق: ۷/۲۸۵، ط: كوئٹه).

وفي الدرالمختار: ولا يخرج عن العهدة بالعزل بل بالأداء للفقراء ...وفي حاشية ابن عابدين: قوله ولا يخرج عن العهدة بالعزل، فلو ضاعت لا تسقط عنه الزكاة.

(الدر المختار مع ردالمحتار : ۲/ ۲۷۰، سعید). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مشترک تجارتی کھاتہ پرزکوۃ کا حکم:

سوال: مشترک بزنس اکاؤنٹ پرزکوۃ واجب ہوگی یانہیں؟ اگر بزنس اکاؤنٹ پرزکوۃ واجب ہے تو حکومت کاٹیکس اور دیگراخراجات وغیرہ منہا کرنے کے بعد زکوۃ کا حساب ہوگا یا اس سے پہلے؟ بزنس اکاؤنٹ کا حساب بھی شعبان کی آخری تاریخ میں لگا سکتے ہیں یا ٹیکس کی تاریخ کو لگانا ہوگا؟ ٹیکس کا حساب مئی کی آخری تاریخ میں ہوتا ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: ا۔مشترک بزنس اکاؤنٹ میں ہر شریک پراس کے حصہ کے حساب سے زکوۃ واجب ہوگی،

۲۔ٹیکس اور دیگراخراجات کی ادائیگی لازم ہواوراس کی مقدار بھی متعین ہوتواس کومنہا کرنے کے بعد زکوۃ کا حساب لگایا جائیگا۔

۳۔زکوۃ ادا کرنے کے لیےقمری تاریخ کو بنیاد بنایا جائے گا،یعنی جس تاریخ کو نصاب کی مقدار مال کا مالک بنا اسی قمری تاریخ کے حساب سے زکوۃ ادا کردی جائے،اگر بزنس اکاؤنٹ کا سال شعبان کی آخری تاریخ ہوتواس کو بنیاد بنا کر زکوۃ ادا کردی جائے گی،زکوۃ کی ادائیگی میں شمسی سال کا اعتبار نہیں۔

ترتیب وار دلائل ملاحظہ فرمائیں؛ا۔ **قال في بدائع الصنائع : قال أصحابنا: إنه يعتبر في حال الشركة ما يعتبر في حال الانفراد وهو كمال النصاب في حق كل واحد منهما فإن كان نصيب كل واحد منهما يبلغ نصاباً تجب الزكاة وإلا فلا .** (بدائع الصنائع : ۲/ ۲۹، سعید).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۳/۱۵۰)۔

۲۔کے دلائل: **قال في حاشية الطحطاوي: قوله فارغ عن الدين أى الذى له مطالب من جهة العباد سواء كان لله كزكاة وخراج أو للعبد ولو كفالة أو مؤجلاً ولو صداق زوجته المؤجل بخلاف دين نذر وكفالة لعدم المطالب .** (حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح ،ص ۷۱۴، قديمى).

وقال فى البدائع: ومنها أن لا يكون عليه دين مطالب من جهة العباد عندنا فإن كان فإنه يمنع وجوب الزكاة بقدره حالاً كان أو مؤجلاً . (بدائع الصنائع: ۲/ ۶، سعيد).

۳۔کے دلائل ملاحظہ فرمائیں: **قال فى الاختيار لتعليل المختار: قال: إذا ملك نصاباً...فى**

طرفي الحول، ثم لا بد من اعتبار كمال النصاب في أول الحول للانعقاد وفي آخره لوجوب الأداء، وما بينهما حالة البقاء فلا اعتبار بها. (الاختيار لتعليل المختار: ١/١٠١).

وقال في مراقي الفلاح: وشرط وجوب أدائها حولان الحول على النصاب الأصلي وأما المستفاد في أثناء الحول فيضم إلى مجانسه ويزكى بتمام الحول الأصلي. (مراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي، ص٧١٥).

وفي الدر المختار: وحولها أي الزكاة قمري بحر عن القنية لا شمسي، وسيجيء الفرق في العنين. وفي رد المحتار: وعبارته مع المتن: وأجل سنة قمرية بالأهلة على المذهب وهي ثلاثمائة وأربع وخمسون وبعض يوم وقيل شمسية بالأيام وهي أزيد بأحد عشر يوماً. (الدر المختار مع رد المحتار: ٢/٢٩٥، سعيد). (وكذا في الفتاوى الهندية: ١/١٧٥، وفتاوى الشامي: ٢/٢٥٩، سعيد، ونور الايضاح، كتاب الزكاة). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

باب......(۵)

روزہ سے متعلق متفرق مسائل:

مذہبِ احناف میں اختلافِ مطالع کے بارے میں ظاہر الروایہ کی تحقیق:

سوال: عام طور پر کتبِ فقہ میں اختلافِ مطالع کے بارے میں یہ منقول ہے کہ ظاہر الروایہ کے مطابق اختلافِ مطالع معتبر نہیں ہے یعنی مشرق کی رؤیت مغرب میں صحیح ذرائع اور اپنے قواعد سے پہنچ جائے تو اس پر عمل لازم ہوگا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذہبِ احناف میں اس کے ظاہر الروایہ ہونے کی کیا دلیل ہے؟ کیا امام محمدؒ کی کتبِ ستہ میں یہ روایت منقول ہے؟ اگر منقول ہو تو مدلل بیان کریں؟ بینوا بالبرہان تو جروا عند الرحمٰن،

الجواب: مراجعتِ کتبِ فقہ سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ امام محمدؒ کی کتبِ ستہ میں یہ مسئلہ مذکور نہیں ہے، نیز دیگر کتب جو ظاہر الروایہ کی ترجمان ہیں، ان میں بھی اِس مسئلہ کی نسبت ظاہر الروایہ کی طرف نہیں کی گئی، بلکہ ہمارے ناقص علم کے مطابق سب سے پہلے یہ بات امام قاضی خانؒ اور علامہ طاہر بن عبد الرشید بخاریؒ صاحبِ خلاصۃ الفتاویٰ، ان دونوں حضرات نے اپنے فتاویٰ میں فرمائی: ''**لا عبرة لاختلاف المطالع في ظاهر الرواية** ''یعنی ظاہر الروایہ کے اعتبار سے اختلافِ مطالع غیر معتبر ہے، جبکہ اِن حضرات سے پہلے فقہائے متقدمین میں سے کسی نے اس مسئلہ کو ظاہر الروایہ کہہ کر تحریر کیا ہو ہم نے نہیں دیکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر الروایہ کی طرف اس کی نسبت مشکوک ہے۔

مفتی محمد عبد المالک صاحب نے اِس مسئلہ میں ایک مقالہ لکھا ہے جس کی تلخیص درجِ ذیل ہے:

'' **لا عبرة لاختلاف المطالع** '' کی عبارت یا اس طرح ہم معنی کوئی جملہ کتب ظاہر الروایہ میں منقول

ہو ہم نے نہیں دیکھا، اور اس کے چند قرائن پیش خدمت ہیں:

ا۔ظاہر الروایہ کے مسائل بیان کرنے والی مشہور کتب میں اس قسم کا جملہ یا اس کے ہم معنی ہمیں نہیں ملا:
مشہور چند کتب یہ ہیں: ا۔مختصر الحاکم الشہید (الکافی) ۲۔المبسوط للامام السرخسیؒ ۳۔المحیط البرہانی ۴۔المحیط الرضوی۔۵۔خزانۃ الاکمل۔

۲۔متقدمین کے اہم متون اور اہم مختصرات اس کے تذکرہ سے خالی ہیں۔مثلاً: ا۔مختصر الطحاوی۔ ۲۔مختصر الکرخی ۳۔مختصر القدوری ۔۴۔تحفۃ الفقہاء۔۶۔بدایۃ المبتدی وغیرہ کتبِ فقہ۔اور امام قاضیخان کے بعد والے متونِ معتبرہ مثلاً: وقایہ، نقایہ؛ ان میں بھی نہیں ملا۔

۳۔ علامہ قوام الدین امیر کاتب الاتقانی (م۷۵۸ھ) کی ہدایہ کی شرح " **غاية البيان و نادرة الأقران** " کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ " **لا عبرة لاختلاف المطالع** " مذہبِ احناف کی ظاہر الروایہ نہیں ہے۔عبارت ملاحظہ ہو:

ثم المعتبر في كل قوم مطالع بلادهم، لا بلاد غيرهم، فإن البلاد تختلف أقاليمها في الارتفاع والانخفاض فربما يرى في بعضها ولم ير في بعض. وقيل: لا اعتبار لاختلاف المطالع ، حتى لو رأى أهل المغرب هلال رمضان يجب برؤيتهم على أهل المشرق ، وعليه فتوى الفقيه أبي الليثؒ ، ولا نأخذه ، لما روى الترمذي في جامعه ، وقال: حدثنا على بن حجر...[فذكر حديث كريب عن ابن عباس ﷺ كما هو في جامع الترمذي في كتاب الصوم (باب لأهل كل بلد رؤيتهم)، وفي آخره :] قال أبوعيسىٰ: حديث ابن عباس ﷺ حديث حسن صحيح غريب، قال: والعمل على هذا الحديث عند أهل العلم أن لكل أهل بلد رؤيتهم . (غاية البيان ونادرة الاقران شرح الهداية، مخطوطه مكتبه شيخ الاسلام فيض الله آفندى ،استمبول).

۴۔ علامہ ابوالعباس السروجی (م۷۱۰ھ) کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ " **لا عبرة لاختلاف المطالع**" مذہب کی ظاہر الروایہ نہیں۔عبارت ملاحظہ ہو:

هذا إذا كان بين البلدين تقارب بحيث لا تختلف المطالع ، فإن كان تختلف لا يلتزم

أحداً من أهل البلدين حكم الآخر ، هكذا ذكره فى المحيط والذخيرة عن القدوري، والواقعات ، ومنية المفتي والتجريد وشرحه للكردري ، والبدائع وعمدة القاري ...[ثم نقل كلام الحلواني وقاضيخان من الحنفية، وكلام ابن عبد البر المالكي، والنووى الشافعي والقرافى المالكي، ورجح القول باعتبار اختلاف المطالع ، وقال:] وتؤكدها أنه لم ينقل عن عمر رضي الله عنه ، ولا عن غيره من الخلفاء أنهم كانوا يبعثون البرد ، [ويكتبون] إلى الأقطار، بأنا قد رأيناه فصوموا ، بل كانوا يتركون [الناس] على مراقبهم ، فيصير هذا كالمجمع عليه ، [و ذكر أيضاً حديث كريب رضي الله عنه]. (الغاية فى شرح الهداية ،جس کاایک مخطوطہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مرکزی کتب خانہ میں موجود ہے)۔

یہ دونوں ہدایہ کی معتبر شروحات سمجھی جاتی ہیں ان میں بھی اختلافِ مطالع معتبر مانا گیا ہے۔اگر ظاہر الروایہ اس کے خلاف ہوتی تو ان حضرات پر کیسے مخفی رہتا؟ اس لیے بھی یہ نسبت مشکوک ہے۔

امام قاضی خانؒ (م۵۹۲ھ) کی عبارت کا جائزہ:

امام قاضی خانؒ کی عبارت کو اساس بنا کر بعد والے اصحابِ متون ،شروح اور فتاویٰ سب نے نقل کر کے اسی کو مذہب کی ظاہر الروایہ تسلیم کرلیا، چنانچہ مختار، کنز، ملتقی وغیرہ میں منقول ہے۔

امام قاضی خان کی عبارت ملاحظہ ہو: قال قاضي خانؒ في فتاواه: عن محمدؒ في النوادر: إذا صام أهل مصر شهر رمضان على غير رؤية ثمانية وعشرين ثم رأوا هلال شوال قالوا : إن كان عدوا شعبان لرؤية ثلاثين يوماً وغم عليهم هلال رمضان قضوا يوماً واحداً وإن صاموا تسعة وعشرين يوماً ثم رأوا هلال شوال فلا قضاء عليهم لأنهم قد أكملوا الشهر ولو صام أهل بلدة ثلاثين يوماً للرؤية و أهل بلدة أخرى تسعة و عشرين يوماً للرؤية فعلم من صام تسعة و عشرين يوماً فعليهم قضاء يوم و **لا عبرة لاختلاف المطالع في ظاهر الرواية** ، وكذا ذكر شمس الأئمة الحلوانيؒ وقال بعضهم يعتبر اختلاف المطالع . (فتاویٰ قاضيخان بهامش الفتاوى الهندية : ١/١٩٧، ١٩٨،الفصل الاول من كتاب الصوم).

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ امام محمدؒ کی روایتِ نوادر کا ہے۔امام محمدؒ سے بہ طریق ظاہرالروایہ مروی نہیں ہے۔نیز بعد والوں نے اسی روایت پراعتماد کیا ہے،لہٰذا **لا عبرة لاختلاف المطالع فی ظاهر الروایة** یہ مذہب احناف میں ظاہرالروایہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ حاکم شہید کی المنتقی کا ہے اور کشف الظنون میں حاجی خلیفہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ اس میں مذہب کے نوادرات کو جمع کیا ہے۔ **قال : وفيه نوادر من المذهب ولا يوجد المنتقي في هذه الأعصار كذا قال بعض العلماء ، وقال الحاكم: نظرت في ثلاث مائة جزء مؤلف مثل الأمالي والنوادر حتى انتقيت كتاب المنتقى** . (كشف الظنون :۲/۱۸۵۱).

صاحبِ بحر علامہ ابن نجیم مصریؒ نے ایک مسئلہ کے تحت منتقیٰ کی روایت کو ضعیف کہا ہے، **قال وهو ضعيف لأنه رواية المنتقى ولمخالفته الأصل** . (البحرالرائق:۳/۱۶۱، و۲/۶۱،دارالمعرفة).

اس کے علاوہ دیگر کتبِ فقہ مثلاً : عیون المسائل ،خزانۃ الاکمل ،المحیط الرضوی اوراحکام القرآن للجصاص سب میں یہ مسئلہ بہ روایتِ نوادر منقول ہوا ہے۔معلوم ہوا کہ امام قاضیخان کی بات مشکوک ہے۔یا مؤول ہے۔یا نقل ظاہرالروایہ میں ان کو تسامح ہوا ہے۔

مزید براں امام قاضی خانؒ نے ظاہرالروایہ کی تائید میں شمس الائمہ الحلوانیؒ کا قول پیش کیا اور صاحبِ خلاصہ علامہ طاہر بن عبدالرشید البخاریؒ (م۵۴۲ھ) نے فقیہ ابواللیث اور شمس الائمہ الحلوانی کا فتویٰ پیش کیا ، ملاحظہ ہو(۱/۲۴۹) جبکہ ظاہرالروایہ مشہور ومعروف ہوتی ہے کسی کے قول وفتوے سے تائید کی ضرورت نہیں ہوتی۔

امام قاضی خان رحمہ اللہ (م۵۹۲ھ) سے پہلے کے فقہاء کی عبارات اوران کے فتاویٰ:

امام قاضی خانؒ سے پہلے کے فقہاء نے اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا ہے،چنانچہ اکثر فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں مطالع مختلف ہوتے ہوں وہاں ایک شہر کی رویت دوسرے شہر پر لازم نہیں، بلکہ اپنی اپنی رویت کا اعتبار ہوگا۔ فقہاء کرام میں سے چند حضرات کے اسماء حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔امام ابوالحسن القدوری (م۴۲۸ھ) نے شرح مختصر الکرخی (مخطوطہ مکتبہ فیض اللہ ومصورہ ام القری) میں لکھا ہے نیز المحیط البرہانی (۳/۳۴۱) اورالفتاوی التاتارخانیہ (۳/۳۶۵) میں بھی منقول ہے۔

۲۔امام حسام الدین الصدر الشہید (۵۳۶ھ) کی عبارت ان کے فتاویٰ ''الفتاوی الحسامیہ'' سے ''الاختیار لتعلیل المختار'' (۱/۴۰۵) میں منقول ہے۔

۳۔امام نجم الدین یوسف بن احمد الخاصی (تلمیذ الصدر الشہید) نے ''الفتاوی الکبریٰ'' میں اپنے استاذ سے نقل کیا ہے۔

۴۔امام عبدالرشید الولوالجیؒ (۵۴۰ھ کے بعد) نے ''الفتاوی الولوالجیۃ'' (۱/۲۳۶، ط: بیروت) میں لکھا ہے۔

۵۔امام رضی الدین السرخسیؒ (م ۵۴۴ھ) نے اپنی کتاب محیط سرخسی (ص ۱۹۱) میں بحوالہ نوادرِ ہشام مسئلہ نقل کرکے بطورِ نوٹ اس پر یہ لکھا ہے: **وإن كان بينهما مسافة مزيدة بحيث يختلف فيها المطالع لم يلزم أحدهما حكم الآخر .**

۶۔امام جمال الدین الیزدی المطہر بن حسینؒ سے ان کے شاگرد خاص امام محمد بن عبدالرشید رکن الدین الکرمانی (۵۶۵ھ) نے اپنی کتاب ''جواہر الفتاوی'' میں نقل کیا ہے۔

۷۔امام علاء عالم ابوالفتح الاسمندیؒ (۵۵۲ھ) کی عبارت بحوالہ شرح عیون المسائل (۱/۵۲، باب الصوم)، التجنیس والمزید کے حاشیہ میں محشی نے نقل کی ہے، ملاحظہ ہو: (حاشیۃ التجنیس والمزید: ۲/۴۲۳، رقم الحاشیۃ ۶)۔

۸۔امام رکن الدین ابوالفضل عبدالرحمٰن بن محمد الکرمانیؒ (۵۴۳ھ) نے اپنی کتاب ''التجرید الرکنی فی الفروع'' میں لکھا ہے: **و لو صام أهل مصر ثلاثين يوماً للرؤية ، وصام أهل بلد تسعة وعشرين يوماً للرؤية فعلى هؤلاء قضاء يوم واحد ، وهذا إذا كان بين البلدين تقارب لا تختلف المطالع ، فإن كان يختلف لم يلزم أحد البلدين حكم الآخر .** (التجريد، ص ۳۴۰، محقق نسخه، جامعه ام القرى)، یاد رہے کہ ملا علی قاریؒ نے شرح اللباب میں علامہ کرمانیؒ کی طرف اختلافِ مطالع کے معتبر نہ ہونے کی نسبت کی ہے، جو قابل اعتراض ہے۔

۹۔علامہ ابوبکر الکاسانیؒ (۵۸۷ھ) نے بدائع الصنائع (۲/۸۳، سعید) میں اختلافِ مطالع کو معتبر تسلیم کیا ہے۔عبارت ملاحظہ ہو: **فأما إذا كانت بعيدة فلا يلزم أحد البلدين الآخر لأن مطالع البلاد عند المسافة الفاحشة تختلف فيعتبر في أهل كل بلد مطالع بلدهم دون الآخر .** (بدائع الصنائع :

۲/۸۳، سعید).

۱۰۔صاحبِ ہدایہ امام علی بن ابی بکر ابوالحسن المرغینانی (۵۹۳ھ) نے التجنیس والمزید میں دو مقامات پر یہ مسئلہ بیان کیا ہے۔ملاحظہ ہو: (۲/۴۲۳، ۴۳۲، و۴۳۲)، ومختارات النوازل:۱/۴۵۷)۔

علاوہ ازیں دیگر فقہاء کرامؒ نے بھی بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کو معتبر قرار دیا ہے۔
چند حضرات کے اسماء درجِ ذیل ہیں:

۱۱۔امام ابوعبداللہ الفقیہ الجرجانی (۳۹۸ھ) امام قدوریؒ کے استاذ اور امام ابوبکر جصاص رازیؒ کے شاگرد ہیں، ان کے بارے میں شاہ صاحبؒ نے العرف الشذی (۱/۱۴۹، بہامش الترمذی) میں لکھا ہے کہ جرجانی کا مذہب بھی وہی ہے جو زیلعی شارح کنز کا ہے۔ **وقال الزيلعي شارح الكنز: إن عدم عبرة اختلاف المطالع إنما هو فى البلاد المتقاربة لا البلاد النائية، وقال كذلك فى تجريد القدورى، وقال به الجرجاني.**

البتہ اس عبارت میں تجرید کی نسبت قدوری کی طرف کرنے میں تسامح ہے، یہ بات پہلے مذکور ہوئی کہ اختلافِ مطالع کے مسئلہ میں ''التجرید الرکنی'' مراد ہے کیونکہ تجرید القدوری میں یہ مسئلہ نہیں ہے۔واللہ اعلم۔

۱۲۔شمس الائمہ محمود الاوزجندیؒ (جد قاضیخانؒ)۔ان کے حوالہ سے یہ مسئلہ فقہ کی چند کتابوں میں مذکور ہیں؛ مثلاً: البحر الرائق (۴/۳۹۸، باب الیمین فی الضرب والقتل، دارالمعرفۃ)، وخلاصۃ الفتاوی (۲/۱۷۳)، والمحیط البرہانی (۶/۲۹۳)، والفتاوی التاتارخانیہ (۶/۲۳۸)، والفتاوی الہندیۃ (۲/۱۳۸)۔

۱۳۔شیخ مجد الشریعہ سلیمان بن حسن الکرمانی قاضی محمدؒ۔جواہر الفتاویٰ کی کتاب الصوم کے الباب الخامس میں عبارت موجود ہے، اس کا آخری حصہ یہ ہے: **وإن كان بين البلدتين مسافة يختلف المطالع في حقهم فلا يلزم واحداً حكم الآخر.** جواہر الفتاویٰ کے الباب الخامس میں صرف شیخ مجد الشریعہ کے فتاویٰ منقول ہیں۔

۱۴۔صاحبِ جواہر الفتاویٰ علامہ رکن الدین محمد بن عبدالرشید الکرمانیؒ۔ علامہ نے جواہر الفتاویٰ کی کتاب الصوم میں مختلف فقہاء کے فتاویٰ کے لیے مختلف ابواب قائم فرمائے ہیں؛ پانچواں باب، مجد الشریعہ کے

فتاویٰ کے لیے خاص ہے، بابِ ثالث شیخ عطاء بن حمزہ کے فتاویٰ کے لیے خاص ہے اور بابِ ثانی شیخ جمال الدین یزدیؒ کے فتاویٰ کے لیے خاص ہے۔ اس باب میں علامہ رقمطراز ہیں:

لو صام أهل بلدة تسعة وعشرين يوماً وأهل بلدة ثلاثين ، إن كان يختلف المطالع لايلزم إحديهما حكم الآخر ، وإن كان لا يختلف المطالع يلزم ، قال شيخنا وسيدنا جمال الدين: لم يذكروا في ذلك حداً ، بل أطلقوا ، وأنا أقول: يجوز أن يعتبر فيه ما يعتبر فی الغيبة المنقطعة في حق الولي، قلت له : تحديدک فی الغيبة المنقطعة لا يوجب الزيادة فی البيان فإنهم اختلفوا فيها. قال: ما لا يصل القوافل فی السنة غالباً إلا مرة ، وأقله مسيرة شهر ألايری إلی قصة سليمان بن داود عليهماالسلام :﴿ ولسليمان الريح غدوها شهر ورواحها شهر﴾، وكان انتقاله من أقليم إلی أقليم ، وقدره بشهر، فعرف أن بين الأقليمين لا يكون أقل من شهر، ولا يمكن الاعتماد علی ما يقول المنجمة من زيادة الدرجة فی العرض والطول فلا يعتبر .

۱۵۔علامہ سراج الدین علی بن عثمان الاوشی صاحبِ فتاویٰ سراجیہ (م ۵۶۹ھ) لکھتے ہیں:

أهل بلدة صاموا للرؤية ثلا ثين يوماً ، وأهل بلدة أخری تسعة وعشرين يوماً للرؤية فعلی هؤلاء قضاء يوم إلا إذا كان بين البلدتين تباين بحيث تختلف المطالع . (الفتاوی السراجية ، ۱۶۹،ط: زمزم).

مذکورہ بالا فقہاءِ کرام، امام قاضی خانؒ سے پہلے کے ہیں یا ان کے ہم عصر ہیں، سب کے نزدیک اختلافِ مطالع معتبر ہے، اِن میں سے کسی ایک بھی فقیہ نے **لا عبرة لاختلاف المطالع** کو ظاہر الروایہ نہیں کہا۔

نیز امام قاضی خانؒ کے بعد کے فقہاء نے بھی تیقظ اور بیدار مغزی سے کام لیا اور حقیقت کو واضح کیا۔

چنانچہ چند فقہاء کی عبارات حسبِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

۱۶۔علامہ برہان الدین محمود البخاری صاحبِ محیط برہانی (م ۶۱۶ھ) نے **اختلف المشايخ فيه** کہکر چند اقوال نقل فرمائے ہیں لیکن قاضی خانؒ کی عبارت سے متاثر نہیں ہوئے۔

۱۷۔ علامہ ظہیر الدین ابو بکر محمد بن احمد القاضی المحتسب بخاری (۶۱۹ھ)، الفوائد الظہیریہ کے حوالے سے بحر اور فتاویٰ تاتارخانیہ میں ان کا قول مرقوم ہے۔

۱۸۔ علامہ زین الدین محمد بن ابی بکر الرازی (۶۶۶ھ) تحفۃ الملوک میں لکھتے ہیں:

ولا يلزم أحد المصرين رؤية المصر الآخر إلا إذا اتحدت المطالع . (تحفة الملوك، ص ۱۳۸، ط: دار البشائر الاسلامية).

۱۹۔ علامہ فخر الدین زیلعیؒ نے تبیین الحقائق میں اختلافِ مطالع معتبر مانا ہے۔

۲۰۔ شیخ ابراہیم بن عبد الرحمٰن القاہری (م ۹۲۲ھ) نے فیض المولیٰ الکریم میں اختلافِ مطالع معتبر مانا ہے؛ چنانچہ ان کی عبارت ملاحظہ ہو: **والصحيح اعتبار اختلاف المطالع .**

علامہ شامیؒ بھی ان کی طرف نسبت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **واعتمده الزيلعي وصاحب الفيض .** (فتاویٰ الشامی: ۲/۳۹۳، سعید).

نیز انہوں نے راجح اقوال کا اہتمام کیا ہے، اور مقدمہ میں اس کی تصریح کی ہے؛ ملاحظہ ہو: **قال: ووضعت في كتابي هذا ما هو الراجح والمعتمد ، ليقطع بصحة ما يوجد فيه و منه يستمد .**

(كذا ذكر في لآلي المحار في تخريج مصادر ابن عابدين: ۲/۴۷۳، ط: دار الفتح للدراسات والنشر).

۲۱۔ شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ (۱۱۷۶ھ)، ملاحظہ ہو: (المصفی شرح موطا، فارسی: ۱/۲۳۷)۔

۲۲۔ علامہ شاہ صاحب کشمیریؒ (۱۳۵۲ھ)، ملاحظہ ہو: (العرف الشذی: ۲/۲۱۷)۔

۲۳۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ۔ ملاحظہ ہو: (جواہر الفقہ، وامداد المفتین)۔

۲۴۔ علامہ محمد یوسف بنوریؒ (۱۳۹۷ھ)، ملاحظہ ہو: (معارف السنن)۔

ان مذکورہ بالا فقہاء کرام اور اکابر نے اختلافِ مطالع کو معتبر مانا ہے اور **لا عبرة لاختلاف المطالع في ظاهر الرواية** سے کوئی تعرض نہیں کیا، معلوم ہوا کہ یہ ظاہر الروایہ نہیں ورنہ اِن تمام اساطینِ علوم پر کیسے مخفی رہتی۔

بعض اصحابِ متون، شراح وفتاویٰ نے امام قاضی خانؒ اور صاحبِ خلاصہ پر اعتماد کر کے اس کو ظاہر الروایہ فرمایا لیکن تحقیق نہیں فرمائی، چنانچہ ان حضرات کی نسبت ظاہر الروایہ کی طرف مشکوک ہو جاتی ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بحالتِ صوم آکسیجن (oxygen) لینے کا حکم:

سوال: روزہ کی حالت میں مریض کو آکسیجن دینے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ جبکہ آکسیجن میں صرف ہوا ہوتی ہے، بھاپ یا رطوبت وغیرہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بینوا توجروا۔

الجواب: آکسیجن انسانی زندگی کے بقا کے لیے جزء لاینفک ہے، انسان ہر سانس میں آکسیجن لیتا ہے لیکن بعض مرتبہ دمہ کی بیماری والوں کے لیے یہ ناکافی ہوجاتا ہے تو مصنوعی آکسیجن (جو صاف ستھری ہوا ہے) دی جاتی ہے تاکہ زندگی بحال رہے اور دمہ کی تکلیف سے نجات ملے، اور صاف ستھری ہوا کا جسم میں جانا مفسدِ صوم نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

والذي ذكره المحققون أن معنى الفطر وصول ما فيه صلاح البدن إلى الجوف أعم من كونه غذاء أو دواء. (فتاوى الشامي: ۲/۴۱۰، سعيد).

علامہ ابوبکر کاسانیؒ بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں:

وما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ عن المخارق الأصلية كالأنف والأذن والدبر بأن يستعط أو احتقن أو أقطر في أذنه فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومه، أما إذا وصل إلى الجوف فلا شك فيه لوجود الأكل من الصورة، وكذا إذا وصل إلى الدماغ لأنه له منفذ إلى الجوف فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف. (بدائع الصنائع: ۲/۹۳، سعيد).

جدید فقہی مسائل میں مرقوم ہے: اگر آکسیجن کے ساتھ کوئی دوا نہ ہو تو روزہ فاسد نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ سانس لینا ہے اور سانس کے ذریعہ ہوا لینا نہ مفسدِ صوم ہے اور نہ اس پر اکل وشرب کا اطلاق ہوتا ہے۔ (۱/۱۸۸)۔

کتاب المسائل میں مذکور ہے: روزہ میں اگر آکسیجن کے ذریعہ سانس لیا جائے تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، کیونکہ آکسیجن محض ایک صاف ستھری ہوا ہے، اس کا بدن میں جانا مفسدِ صوم نہیں۔ (کتاب المسائل: ۲/۱۵۴)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر آکسیجن ایسی ہے کہ اس میں ہوا کے ساتھ کچھ بھاپ اور رطونت خارج ہوتی ہے اور ناک میں داخل ہوتی ہے تو یہ مفسدِ صوم ہے، اس سے روزہ فاسد ہوجائے گا اور اگر بلا رطوبت فقط صاف ستھری

خالص ہوا خارج ہوتی ہے تو مفسدِ صوم نہیں ہے اس سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

مزید ملاحظہ ہو: (روزے کے مسائل کا انسائیکلو پیڈیا، ضمیمہ ص:۹، وعلم تشریح الابدان:۱۱۰، ۱۱۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بحالتِ صوم ناسل اسپرے (Nasal spray) کا حکم:

سوال: روزے کی حالت میں ناسل اسپرے (Nasal spray) کرنے کا کیا حکم ہے؟ کیا روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ناسل اسپرے سے ناک میں ایک قسم کی دوائی کی پھوار کی جاتی ہے جس سے سیال دوائی ناک میں داخل ہوتی ہے، اور فقہاء نے بحالتِ صوم ناک میں دوا ڈالنے کو مفسدِ صوم قرار دیا ہے بنابریں ناسل اسپرے سے روزہ فاسد ہوجائیگا۔ ملاحظہ ہو درمختار میں منقول ہے:

أو احتقن أو استعط ، في أنفه شيئاً...قضى في الصور كلها فقط. وفي رد المحتار: والسعوط الدواء الذي صب في الأنف واسعطه إياه ولا يقال: استعط مبنياً للمفعول، معراج وعدم وجوب الكفارة في ذلك هو الأصح ، لأنها موجب الإفطار صورة ومعنى والصورة الابتلاع كما في الكافي وهي منعدمة والنفع المجرد عنها يوجب القضاء فقط إمداد .

(الدرالمختار مع ردالمحتار: ۲/ ۴۰۲، سعید).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ ولوالجیہ :۱/ ۲۲۰، ط: بیروت، وفتاویٰ ہندیہ:۱/ ۲۰۴، وایضاح المسائل ،ص ۸۵، وجدید فقہی مسائل: ۱/ ۱۸۷، وفتاویٰ دارالعلوم زکریا:۳/ ۲۸۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بحالتِ صوم مقعد اور فرج میں حقنہ لگانے اور اِسکین کرنے کا حکم:

سوال: روزہ کی حالت میں مقعد اور فرج میں حقنہ لگانے سے روزہ فاسد ہوجائے گا یا نہیں؟ نیز اگر کسی کے جسم کا اسکین کیا یعنی بذریعہ مشین جسم کا اندرونی معائنہ کیا تو روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

الجواب: منافذِ اصلیہ یعنی منہ، ناک، کان، عورت کی پیشاب گاہ، اور مقعد کے ذریعہ کوئی چیز جوفِ

دماغ یا جوفِ بطن میں پہنچائی جائے تو روزہ فاسد ہوجائے گا۔ چنانچہ مقعد یا فرج کے راستہ سے جسم میں دوائی پہنچانے سے روزہ فاسد ہوجائیگا، ہاں اسکین یعنی آلاتِ برقیہ سے اندرونِ جسم کا معائنہ کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ من المخارق الأصلية كالأنف والأذن والدبر بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومه ، أما إذا وصل إلى الجوف فلا شك فيه لوجود الأكل من حيث الصورة ، وكذا إذا وصل إلى الدماغ لأن له منفذاً إلى الجوف فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف. (بدائع الصنائع: ۲/۹۳).

علامہ شامیؒ فتاویٰ شامی میں لکھتے ہیں:

والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ . (فتاوی الشامی: ۲/ ۳۹۵،سعید).

المقالات الفقهية میں مرقوم ہے:

اتفقت المذاهب الأربعة على أن الفطر إنما يحصل إذا وصل الشيء المفطر إلى الجوف المعتبر من المنفذ المعتبر، ولا فطر إذا لم يصل إليه . (المقالات الفقهية،ص ۱۱۰،الباب الثاني،ط:دارالعلوم كراتشي). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

روزہ دار کے منہ میں کھٹا پانی آنے سے روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص صبح اٹھا منہ میں تھوڑا سا کھٹا پانی آیا، وہ شخص روزہ کی حالت میں اس پانی کو نگل گیا، لیکن منہ بھر کر نہیں تھا بلکہ تھوڑا سا تھا، کیا روزہ فاسد ہوا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں منہ میں پانی آنا قے کے حکم میں ہے، پھر یہ منہ بھر کر بھی نہیں تھا، بنابریں روزہ میں کچھ خلل نہیں آیا۔ قے کا حکم یہ ہے کہ فقط دوصورتوں میں روزہ فاسد ہوتا ہے؛ ۱۔خود بخود منہ بھر کر قے آجائے اور قصداً روزہ یاد ہونے کی حالت میں نگل جائے۔ ۲۔ جان بوجھ کر منہ بھر کر قے کرے۔ ان دوصورتوں کے علاوہ میں روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أبي هريرة ﷺقال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ’’من ذرعه القيء وهو صائم فليس عليه قضاء ومن استقاء فليقض. قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: إسناده صحيح. (اخرجه ابن حبان في صحيحه:۸/۲۸۴/۳۵۱۸).

فتاویٰ شامی میں منقول ہے: **قوله وإن ذرعه القيء ، أي غلبه وسبقه ، والمسألة تتفرع إلى أربع وعشرين صورة ، لأنه إما أن يقئ أو يستقئ وفي كل إما أن يملأ الفم أو دونه ، وكل من الأربعة إما أن خرج أو عاد أو أعاده ، وكل إما ذاكر لصومه أو لا، ولا فطر فى الكل على الأصح إلا فى الإعادة والاستقاء بشرط الملء مع التذكر، شرح الملتقى. قوله وإن أعاده أى أعاد ما قاء ه الذي هو ملء الفم، قوله أو قدر الحمصة منه فأكثر أشار أنه لا فرق بين إعادة كله أو بعضه إذا كان أصله ملء الفم .** (فتاوى الشامي: ۲/ ۴۱۴، سعيد).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

اور اگر کسی روزہ دار کو قے ہوئی تو اس کا روزہ صرف دوصورتوں میں فاسد ہوتا ہے، ایک یہ ہے کہ اس کو بلا ارادہ خود بخود منہ بھر کر قے آئی ہو پھر روزہ یاد ہوتے ہوئے قصداً اس کو منہ کے اندر سے ہی واپس نگل گیا ہو، خواہ تمام کو نگلے یا اس میں سے بعض حصے کو نگلے جبکہ وہ چنے کی مقدار یا اس سے زیادہ نگلی ہو تو اس صورت میں بالا جماع اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ روزہ یاد ہوتے ہوئے خود اپنے ارادہ سے منہ بھر قے کی تو اس کا روزہ مطلقاً ہر حال میں فاسد ہو جائے گا بالا جماع۔ (عمدۃ الفقہ :۳/ ۲۹۹)۔

کتاب الفتاوی میں مذکور ہے:

سوال: اگر روزہ کی حالت میں قے یا منہ بھر کر پانی آجائے، تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

جواب: اگر بلا ارادہ ازخود منہ بھر کر قے آجائے، یا پانی آجائے جو قے ہی کی ایک صورت ہے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر انسان قصداً قے کو نگل جائے، یا جان بوجھ کر قے کرے اور وہ منہ بھر ہو، تو اس صورت میں روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (کتاب الفتاویٰ:۳/ ۳۸۹)۔

مزید ملاحظہ ہو: (البحر الرائق:۲/ ۲۷۴، ط: کوئٹہ، وحاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۶۶۲، ط؛ بیروت، والنہر الفائق:۲/ ۱۹،

وتبیین الحقائق، وفتح القدیر، عمدۃ الفقہ :۲۹۹/۳)۔واللہ ﷻ اعلم۔

زہریلی گیس سونگھنے سے روزہ کا حکم:

سوال: حشرات کو مارنے والی زہریلی گیس سونگھنے سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اگر بلا اختیار حلق میں چلی گئی تو روزہ فاسد نہیں ہوگا، ہاں اپنے اختیار سے حلق میں لینے سے روزہ فاسد ہوجائیگا۔ ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

أو دخل حلقه غبار أو ذباب أو دخان ، ولو ذاكراً استحساناً لعدم إمكان التحرز عنه، ومفاده : أنه لو أدخل حلقه الدخان أفطر أى دخان كان ولو عوداً أو عنبراً له ذاكراً لإمكان التحرز عنه فليتنبه له كما بسطه الشرنبلالي . (الدر المختار : ۳۹۵/۲،سعید).

مزید ملاحظہ ہو: (درر الحکام شرح غرر الاحکام : ۲۰۲/۱، والجوهرة النيرة : ۱۳۸/۱).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے: اور روزہ یاد ہوتے ہوئے اپنے فعل سے قصداً دھواں اپنے اندر داخل کیا (یعنی منہ یا ناک کے ذریعہ سے پیٹ یا دماغ میں داخل کیا) تو اس کا روزہ فاسد ہوجائیگا خواہ وہ دھواں کوئی سا بھی ہو، اگرچہ عود، عنبر ہی کا ہو اور دھویں کا اپنے اندر داخل کرنا خواہ کسی طرح سے بھی ہوحتی کہ بخور سلگایا اور اس کو اپنی طرف کیا اور روزہ یاد ہوتے ہوئے اس کو ناک سے اوپر کھینچا تو اس کا روزہ فاسد ہوجائے گا، کیونکہ اس سے بچنا ممکن ہے اور اس بات سے اکثر لوگ غافل ہیں۔۔۔ اور اگر خود بخود اندر چلا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ (عمدۃ الفقہ :۳۰۴/۳، کتاب الصوم)۔واللہ ﷻ اعلم۔

دائمی مریض کے لیے فدیہ دینے یا وصیت کرنے کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص دائمی مریض ہے اور روزہ نہیں رکھ سکتا، اگر اسی دائمی مرض میں انتقال ہوجائے تو کیا اس کے ذمہ فدیہ کی وصیت لازم ہے یا نہیں؟ جبکہ اس مرض سے اس کو افاقہ نہیں ملا، اور روزہ کی طاقت حاصل نہیں ہوئی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مریض حالتِ مرض میں اور مسافر حالتِ سفر میں انتقال کرجائے اور قضا کا موقع نہ ملے تو ان پر قضا لازم نہیں اور نہ فدیہ کی وصیت کرنا لازم ہے، اگر اولیاء ان کی طرف سے احساناً ادا کردے تو امید ہے کہ ثواب پہنچ جائے گا۔ ہاں دائمی مریض جو صحتیابی سے ناامید ہو، اسی طرح وہ بوڑھا اور بڑھیا جو انتہائی ضعف کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتے تو ان پر بھی فدیہ لازم ہے اور اگر زندگی میں ادا نہیں کیا تو موت سے پہلے فدیہ کی وصیت کرنا لازم ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار میں مرقوم ہے:

ويندب لمسافر الصوم لآية وأن تصوموا ...إن لم يضره فإن شق عليه أو على رفيقه فالفطر أفضل لموافقته الجماعة فإن ماتوا أى في ذلك العذر فلا تجب عليهم الوصية بالفدية لعدم إدراكهم عدة من أيام أخر ولو ماتوا بعد زوال العذر وجبت الوصية بقدر إدراكهم عدة من أيام أخر . (الدرالمختار: ۴۲۴/۲، سعيد).

وفي فتاوى الشامي: قوله وللشيخ الفاني، أى الذي فنيت قوته أو أشرف على الفناء ولذا عرفوه بأنه الذي كل يوم في نقص إلى أن يموت نهر، ومثله ما فى القهستاني عن الكرماني: المريض إذا تحقق اليأس من الصحة فعليه الفدية لكل يوم من المرض...قوله العاجز عن الصوم أى عجزاً مستمراً كما يأتي أما لم يقدر عليه لشدة الحر كان له أن يفطر ويقضيه فى الشتاء فتح، قوله يفدى وجوباً ، لأن عذره ليس بعرضى للزوال حتى يصير إلى القضاء فوجبت الفدية ثم عبارة الكنز وهو يفدى إشارة إلى أنه ليس على غيره الفداء لأن نحو المرض والسفر في عرضة الزوال فيجب القضاء وعند العجز بالموت تجب الوصية بالفدية قوله ولو في أول الشهر، أى يخير بين دفعها في أوله وآخره كما فى البحر . (فتاوى الشامي: ۴۲۷/۲، سعيد).

قال فى المجمع: وإن تبرع الولى به أى بالإطعام من غير وصية صح ويكون له ثواب ذلك . (مجمع الأنهر : ۳۶۸/۱، ط: دارالكتب العلمية). **وللمزيد راجع :** (الفتاوى الهندية: ۲۰۷/۱).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے:

جس شخص کا عذر مرتے دم تک زائل ہونے والا نہ ہو اگر وہ مالدار ہو تو اس پر اپنی زندگی میں فوت شدہ روزوں کا فدیہ دینا واجب ہے کیونکہ دائمی عجز کی وجہ سے ان روزوں کی قضا پر قادر نہیں ہے... اور جس کا عذر زائل ہونے والا ہو مثلاً: مسافر یا مریض تو اس پر ان روزوں کی قضا واجب ہے اور اس کو اپنی زندگی میں فدیہ دینا جائز نہیں ہے لیکن جب وہ موت آجانے کے ساتھ روزوں کی قضا سے عاجز ہو جائے تو ان دنوں کے روزوں کا فدیہ دینے کی وصیت کرنا اس پر واجب ہے جبکہ اس سفر سے واپسی یا مرض سے صحت پانے کے بعد وقت پایا اور روزوں کی قضا نہیں کی۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/۳۴۱، ط: زوار اکیڈمی)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

اگر کسی شخص کے رمضان کے روزے مرض یا سفر کے عذر کی وجہ سے فوت ہو گئے اور مرض یا سفر کا عذر ابھی باقی تھا کہ وہ مر گیا تو اس پر ان روزوں کی قضا واجب نہیں ہے، کیونکہ عذر کی حالت میں مر جانے کی وجہ سے اس نے وہ دن ہی نہیں پائے جن میں اس پر فوت شدہ روزوں کی قضا واجب ہوتی اور اس پر فدیہ کے لیے وصیت کرنا بھی واجب نہیں ہے کیونکہ فدیہ کی وصیت کا واجب ہونا قضا لازم آنے کی فرع ہے، یعنی اگر قضا لازم آتی تو فدیہ کی وصیت واجب ہوتی پس جب وہ اس عذر کی حالت میں مر گیا تو اس پر کچھ لازم نہیں ہے، لیکن اگر پھر بھی اس نے وصیت کی ہو کہ اس کے روزوں کے عوض میں فدیہ دیا جائے تو یہ وصیت صحیح ہو جائے گی، اگرچہ اس پر وصیت کا کرنا واجب نہیں تھا۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/۳۴۳)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

جہالت کی وجہ سے رمضان کا فرض روزہ توڑنے سے کفارہ کا حکم:

سوال: ایک شخص رمضان میں جان بوجھ کر روزے توڑتا تھا، لیکن اس کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے کفارہ لازم آتا ہے، اب جب علم ہوا تو کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب: عدمِ علم شرعاً معتبر عذر نہیں ہے، لہٰذا قضا کے ساتھ ساتھ کفارہ بھی ادا کرنا لازم ہوگا۔ کفارہ یہ ہے ساٹھ دن تک مسلسل روزے رکھے، اور جو شخص روزے پر قادر نہ ہو تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھائے۔

ملاحظہ ہو جوہرہ میں مرقوم ہے:

من جامع عامداً في أحد السبيلين أو أكل أو شرب ما يتغذى به أو يتداوى به فعليه القضاء والكفارة لأن الجناية متكاملة لقضاء الشهوة...قوله والكفارة مثل كفارة الظهارة . (الجوهرة النيرة : ۱/۱۷۲، ط:امدادیه ملتان).

وفي الاختيار لتعليل المختار: أكل أوشرب عامداً غذاء أو دواء وهو صائم في رمضان عليه القضاء والكفارة مثل المظاهر . (الاختيار: ۱/۱۳۹، كتاب الصوم،ط:بيروت).

مزید ملاحظہ ہو: (الفتاوى الهندية: ۱/۲۰۵،والبناية:۳/۲٦٥).

جہاں اسلام متعارف ہو اور مسلمانوں کی بستیاں موجود ہوں وہاں احکامِ شرعیہ سے جہل عذر نہیں۔ملاحظہ ہو:

قال في الأشباه : الجهل في دار الحرب من مسلم لم يهاجر، وأنه يكون عذراً...وفي حاشية الحموي: قال: بخلاف الذمي إذا أسلم في دار الإسلام لشيوع الأحكام ، والتمكن من السؤال . (الاشباه مع الحموي :۳/۱۳،الفن الثالث،ط:ادارة القرآن).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر کسی نے پچھنے لگوائے یا کسی کی غیبت کی پھر گمان کیا کہ اس سے روزہ ٹوٹ گیا ہے پھر اس نے عمداً کھالیا اگر اس نے کسی فقیہ سے فتویٰ نہیں لیا اور نہ اس کو حدیث پہنچی تو اس پر قضا اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے کیونکہ یہ محض جہالت ہے اس کے پاس اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے ...اور جہالت دارالاسلام میں عذر نہیں بنتی ۔ (عمدۃ الفقہ :۳/۳۲۱)۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

رمضان مبارک کا روزہ جان بوجھ کر توڑ دینے پر کفارہ لازم ہے،اور وہ ہے ساٹھ دن کے لگاتار روزے رکھنا،اور جو شخص روزے رکھنے پر قادر نہ ہو، وہ ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلائے ،اور کسی شخص کو مسئلہ کا علم نہ ہونا کوئی عذر نہیں۔(آپ کے مسائل اور ان کا حل:۴/۲۰۹،طبع جدید)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فضیلتِ صوم کے بارے میں ”وأناْ أَجزِي به“ کے معنی کی تحقیق:

سوال: روزہ کی فضیلت کے بارے میں ایک حدیث شریف میں ہے: ”**الصوم لي وأناْ أجزي**

بــہ ''بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ لفظ اجزی مجہول کے صیغہ کے ساتھ بھی صحیح ہے اور اس کا معنی یہ ہے: اللہ تعالیٰ کا دیدار اور رضامندی اس کو دی جائے گی۔ کیا عربی قواعد کے اعتبار سے یہ معنی صحیح ہے؟

الجواب: اکثر کتبِ احادیث میں اجزی معروف کے صیغہ کے ساتھ آیا ہے اور اکثر محدثین اور شراحِ حدیث کے نزدیک یہی مشہور ہے، اس لیے یہی صحیح ہے۔ چند علماء کی تشریح پیش خدمت ہے:

قال العلامة العيني: قوله أناْ أجزى به بيان لكثرة ثوابه لأن الكريم إذا أخبر بأنه يتولى بنفسه الجزاء اقتضى عظمته وسعته... الظاهر من السياق الأول أى أنا أجازيه لا غيري بخلاف سائر العبادات فإن جزاء ها قد يفوض إلى الملائكة. (عمدة القارى: ۸/۱۲، باب فضل الصوم، ط: دارالحديث ملتان).

وفي غريب الحديث، قال: إنما خص الصوم بأن يكون هوالذى يتولى جزاءه. (۱/۳۲۵، ط: بيروت).

وفي فتح الباري: وأناْ أجزي به أى أجازي عليه جزاء كثيراً من غير تعيين لمقداره. (فتح البارى: ۴/۱۰۸، ط: دارالمعرفة بيروت).

قال فى فيض القدير: وأناْ أجزي به، صاحبه جزاءاً كثيراً وأتولى الجزاء عليه بنفسي فلا أكله إلى ملك مقرب ولا غيره لأنه سر بيني وبين عبدي لأنه لما كف نفسه عن شهواتها جوزى بتولى اللّٰه سبحانه إحسانه. (فيض القدير: ۴/۳۲۹/۵۱۹۸).

قال فى المرقات: وأناْ أجزى به أى وأنا العالم بجزاءه. (مرقاة: ۴/۲۳۲، كتاب الصوم، امداديه).

وقال النووي: وقيل: معناه أناْ المنفرد بعلم مقدار ثوابه. (شرح صحيح مسلم: ۸/۲۹، فضل الصيام، ط: داراحياء التراث العربى).

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب اس حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: روزہ ڈھال ہے، اس لیے نہ تو بری بات کرے اور نہ جہالت کی بات کرے، اگر کوئی شخص اس سے جھگڑا کرے یا گالی

گلوچ کرے تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں، دوبار کہہ دے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے۔ وہ کھانا، پینا اور اپنی مرغوب چیزوں کو روزوں کی خاطر چھوڑ دیتا ہے، روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کا بدلہ دیتا ہوں، اور نیکی دس گنا ملتی ہے۔ (انعام الباری: ۴۸۶/۵، باب فضل الصیام، مکتبۃ الحراء، کراچی)۔

اہل لغت بھی اس کو فعل معروف کے ساتھ ہی ذکر کرتے ہیں:

قال في القاموس الفقهي: جزى الشيء جزاء ، كفى وأغنى، وقوله تعالىٰ: واتقوا يوماً لاتجزى نفس عن نفس شيئاً . (البقرة: ۴۸).(القاموس الفقهي : ۶۲/۱،دارالفكر دمشق).

وفي تاج العروس: جزاه كذا و به وعليه جزاء ، ومنه قوله تعالىٰ: ...وجزاهم بما صبروا جنة وحريراً . أولئک يجزون الغرفة بما صبروا . ولا تجزون إلا ما كنتم تعملون . (تاج العروس : ۳۵۱/۳۷،ط:دار الهداية).

لیکن بعض علماء نے حدیث کے معروف ومجہول دونوں صیغے ذکر کر کے معانی بیان کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

فیض الباری کے حاشیہ میں مرقوم ہے:

وقد قرأه بعضهم: وأناْ أُجزىٰ به ، مجهولاً ، وحينئذٍ يكون كناية عن رؤيته تعالىٰ ، وقد نظمه الشيخ يعقوب الكشميري تلميذ التلميذ للعارف الجامي، وتلميذ الحافظ ابن حجر رحمه الله المكي الشافعي ، في الحديث: (جودر روزه امساک از ماسوا است، جزائش اگر حق بود خود سزا است) انتهى تعريبه. (حاشیۃ فیض الباری: ۱۴۹/۳، کتاب الصوم)۔

سراج القاری میں بحوالہ اوجز المسالک مرقوم ہے:

وأناْ أجزى به، اس کو دو طرح پڑھا گیا ہے، ایک تو " أناْ أجزِي به" (فعل معروف) یعنی میں خود اس کا بدلہ دوں گا، جو میری شان کے موافق ہوگا اور ایک " أناْ أُجزىٰ به" (فعل مجہول) یعنی میں خود اس بدلے اور انعام میں دیا جاؤں گا، مطلب یہ ہے کہ اس کو رضا اور خوشنودی دوں گا۔ (سراج القاری: ۲۳۷/۶)۔

حضرت شیخ رحمہ اللہ کی عبارت ملاحظہ ہو: (اوجز المسالک، جامع الصیام: ۶۱۸/۳۳۶/۵)۔

مفتی سعید احمد پالنپوری صاحب نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے:

قولہ: اجزی، مجہول بھی پڑھا گیا ہے، اور معروف بھی، مشہور قراءت معروف کی ہے اور محدثین معروف ہی پڑھتے ہیں، مجہول صوفیا پڑھتے ہیں، مجہول کے معنی ہیں: میں روزے کے بدلے میں دیا جاتا ہوں، یعنی روزہ دار کو اللہ تعالیٰ کا وصال (قرب) نصیب ہوتا ہے، اور معروف کے معنی معروف ہیں، یعنی میں قیامت کے دن اس کا بدلہ دوں گا۔ (تحفۃ القاری:۴/۱۷۵، مکتبہ حجاز دیوبند)۔

لیکن مذکورہ بالا ترجمہ قرآن، حدیث اور لغت کی روشنی میں سمجھ میں نہیں آتا؛ کیونکہ مجہول کا ترجمہ عربی قواعد کے اعتبار سے یہ ہے: انا اجزیٰ بہ، مجھے بدلہ دیا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کو بدلہ دیا جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

نیز قرآنِ کریم کی آیاتِ کثیرہ سے پتا چلتا ہے کہ اُجزیٰ مجہول کا نائب فاعل معطی لہ ہوتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کو جزا اور بدلہ ملے گا، یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ صائم کو صوم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا؛ حدیث شریف میں ہے: "للصائم فرحتان؛ فرحة عند فطره وفرحة عند لقاء ربه". (رواه مسلم، رقم: ۱۱۵۱)، روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں؛ ۱۔ افطار کے وقت کی خوشی اور ۲۔ اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور رؤیت کی خوشی، لیکن اُجزیٰ مجہول سے اللہ تعالیٰ کی رویت کشید کرنا صحیح نہیں۔ مجہول کا ترجمہ قرآنِ کریم کی آیات کی روشنی میں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ ﴿ **فاليوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تستكبرون في الأرض بغير الحق وبما كنتم تفسقون** ﴾ [الأحقاف: ۲۰]، ترجمہ: سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے۔ (مکمل بیان القرآن: جلد ۱۱، ص ۷)۔

۲۔ ﴿ **لتجزى كل نفس بما تسعى** ﴾ [طه: ۱۵]، ترجمہ: تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ مل جاوے۔ (بیان القرآن: ۷/۲۰، تاج پبلشرز دہلی)۔

۳۔ ﴿ **اليوم تجزىٰ كل نفس بما كسبت لا ظلم اليوم** ﴾ [غافر: ۱۷]، آج ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جاوے گا۔ (بیان القرآن: ۱۰/۳۶، تاج)۔

۴۔ ﴿ **اليوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تقولون على الله غير الحق ...** ﴾

[الانعام:۹۳]، ترجمہ: آج تم کو ذلت کی سزا دی جاوے گی اس سبب سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹی باتیں بکتے تھے۔ (بیان القرآن:۳/۱۱۳، تاج)۔

۵۔﴿ **هل تجزون إلا بما كنتم تكسبون** ﴾[يونس:۵۲]، ترجمہ: تم کو تو تمہارے ہی کیے کا بدلہ ملا ہے۔ (بیان القرآن:۵/۱۷، تاج)۔

۶۔﴿ **اليوم تجزون بما كنتم تعملون** ﴾[الجاثية:۲۸]، ترجمہ: آج تم کو تمہارے کیے کا بدلہ ملے گا۔ (بیان القرآن:۱۰/۱۱۳، تاج)۔

۷۔﴿ **سيجزون بما كانوا يقترفون** ﴾[الأنعام:۱۲۰]، ترجمہ: ان کو ان کے کیے کی عنقریب سزا ملے گی۔ (بیان القرآن:۳/۱۲۴، تاج)۔

۸۔﴿ **أولئک يجزون الغرفة بما صبروا** ﴾[الفرقان:۷۵]، ترجمہ: ایسے لوگوں کو بالاخانے ملیں گے بوجہ ان کے ثابت قدم رہنے کے۔ (بیان القرآن:۸/۵۷، ط: تاج)۔

۹۔﴿ **من يعمل سوءاً يجز به** ﴾[النساء: ۱۲۳]، ترجمہ: جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جاوے گا۔ (بیان القرآن:۲/۱۵۹، تاج)۔

اگر وہ ترجمہ مقصود ہوتا جو ہمارے اکابرؒ نے فرمایا، تو پھر عبارت یوں ہوتی: [**الصوم لي وأنت تجزى بی، يا الصائم يجزیٰ بی أی برؤيتی)، أنا أجزی به** ، نہ ہوتا۔

نیز ہدایۃ المختار میں بھی مجہول والے ترجمہ کو رد کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

ملحوظة : قوله (وأنا أجزى به) يقرؤه بعض الناس مبنياً للمفعول، ويعنون به أن الله هو الجزاء للصائم ، وهو خطأ ؛ لأن نائب الفاعل يكون من ينال الجزاء ، وأن الجزاء يكون مجرور الباء هنا، ولو كان الأمر كما ظنوا لكان حق العبارة أن يقال: (الصوم لي والصائم يجزى بي). (هداية المحتار في دراية الآثار،لمولانا محمد هداية الله القاسمی،ص ۱۲۹،ط: ديوبند).

ہمارے اکابرؒ میں حضرت تھانویؒ نے بھی مجہول والے ترجمہ کی تردید فرمائی اور حضرت شیخ یونسؒ نے تصویب فرمائی۔ مولانا زید ندوی مظاہری نے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کی کتاب فضائل رمضان جو حضرت شیخ مولانا محمد یونس صاحبؒ کے یہاں رمضان المبارک میں بعد عصر اہتمام سے پڑھی جاتی تھی اس میں روزہ کے فضائل کے تعلق سے حدیث پاک ذکر کی گئی، حق تعالیٰ فرماتا ہے: " وأناْ أجزی به " یعنی روزہ دار کے روزہ کا بدلہ اور ثواب میں خود عطا کروں گا لیکن شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ "فضائل رمضان" میں اسی حدیث ۲ کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

"بعض مشائخ سے منقول ہے کہ یہ لفظ " وأناْ أجزی به" ہے یعنی یہ کہ اس کے بدلہ میں، میں خود اپنے کو دیتا ہوں اور محبوب کے ملنے سے زیادہ اونچا بدلہ اور کیا ہوسکتا ہے؟" (فضائل رمضان، فصل اول، حدیث ۲)۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحبؒ کی مجلس میں فضائل رمضان کا یہ مضمون پڑھا گیا، بعد میں احقر نے حضرت اقدسؒ سے عرض کیا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ نسخہ غلط ہے، حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا، حضرت تھانویؒ کی عبارت درجِ ذیل ہے، ارشاد فرمایا:

حدیث شریف میں ہے " وأناْ أجزِي به" یعنی میں اس کو بدلہ دوں گا، اور ایک نسخہ "وأناْ اُجزیٰ به " مجہول صیغہ سے بھی مشہور ہے یعنی اس کا بدلہ یہ ہے کہ میں اس کو ملوں گا، اگرچہ یہ مضمون فی نفسہٖ صحیح ہے حق تعالیٰ اس کے بدلہ میں مل جائیں گے مگر غلطی یہ ہے کہ اس مضمون کو اس حدیث سے نکالا جاتا ہے، جو شخص ذرا بھی عربیت سے تعلق رکھتا ہو وہ ہرگز اس سے یہ معنی نہ سمجھے گا اس لیے کہ عربیت کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا "میں بدلہ دیا جاؤں گا" یعنی نعوذ باللہ مجھ کو کوئی جزا دے گا، نہ یہ کہ میں جزا میں مل جاؤں گا، یہ اس کا ترجمہ نہیں ہے، پس یہ نسخہ غلط ہے صحیح وہی ہے، " وأناْ أجزِی به" یعنی میں اس کی جزا دوں گا اور روزہ کی فضیلت یہ کیا کچھ کم ہے کہ فرماتے ہیں کہ میں جزا دوں گا، باقی فی نفسہٖ یہ مضمون صحیح ہے کہ حق تعالیٰ اس کے بدلہ میں مل جائیں گے"

(وعظ الصوم، ص ۱۲۰ و احکام رمضان المبارک، ص ۳۷)

حضرت تھانویؒ کے حوالہ سے احقر نے حضرت شیخؒ سے یہ بات عرض کی اور دریافت کیا کہ حضرت دونوں باتوں میں کون سی بات زیادہ صحیح ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو کچھ فرمایا ہے روایت و درایت اور سند کے اعتبار سے یہی بالکل صحیح ہے اور فرمایا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کو اللہ نے ایسا

تحقیقی ملکہ عطا فرمایا تھا کہ وہ اپنی بصیرت و درایت اور قوتِ فہم سے جوبات پہلے فرما دیتے ہیں ہم لوگ سیکڑوں صفحات کی ورق گردانی کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں جس کو حضرت تھانویؒ اپنی درایت اور فہم سے پہلے ہی فرما چکے ہوتے ہیں، واقعی حدیثِ پاک میں ''وانا اجزی بہ'' والی روایت صحیح نہیں ہے حضرت تھانویؒ نے بالکل صحیح فرمایا۔
(علمی واصلاحی ارشادات مع مختصر سوانح شیخ محمد یونس صاحبؒ از مولانا زید مظاہری ندوی، ص ۱۵۷، ۱۵۸)۔

فائدہ: الصوم لی کے چھ معانی ہوسکتے ہیں: ۱۔ الصوم لي لا للأصنام، مشرکین روزہ غیر اللہ کے لیے نہیں رکھتے تھے۔ ۲۔ الصوم أحب إلي. ۳۔ الصوم صفة لي (فإن الله لا يأكل ولا يشرب). ۴۔ الصوم، لا رياء فيه لأنه ترك لا فعل. ۵۔ الصوم المفروض لا يعطى فی المظالم. ۶۔ لم يخبر الله بثوابه الملائكة بل أخفى ثوابه الكثير عنده. واللہ ﷻ اعلم۔

حالتِ صوم میں شوگر کا انجکشن (insulin) لینے کا حکم:

سوال: رمضان شریف میں روزہ کی حالت میں شوگر کے مریض کے لیے انسولین شوگر کا انجکشن لینا جائز ہے یا نہیں؟ یعنی اس سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: روزہ کی حالت میں شوگر کے مریض کے لیے انسولین لینا جائز اور درست ہے، اس کی وجہ سے روزہ میں کوئی خرابی نہیں آئے گی، کیونکہ انسولین میں گلوکوز ہوتا ہے جو رگوں میں جا کر خون کے ساتھ پیوست ہوتا ہے، اور مفسدِ صوم وہ چیز ہے جو منافذِ اصلیہ کے ذریعہ جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں پہنچ جائے۔
آیئے انسولین (insulin) کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرتے ہیں:

انسولین (insulin) ایک ہارمون (hormone) ہے جو لبلبہ (pancreas) سے بنایا جاتا ہے اور لبلبہ ایک غدود ہے جو پیٹ کے پیچھے کے حصہ میں ہوتا ہے۔ انسولین کی وجہ سے جسم گلوکوز (glucose) حاصل کرتا ہے جس سے طاقت ملتی ہے۔

(گلوکوز ایک قسم کی شکر ہے جو بہت سارے کاربوہائیڈریٹس (carbohydrates) [جو کھانے کی ایک قسم ہے] میں پائی جاتی ہے، کھانے کے بعد ہاضمہ کی راہ کاربوہائیڈریٹس کو توڑ کر گلوکوز میں تبدیل کر دیتا ہے،

پھر گلوکوز چھوٹی انتری کی راہ میں خون میں مدغم ہو جاتا ہے۔

گلوکوز کے مدغم ہو جانے کے بعد انسولین کی وجہ سے جسم کے سیل (cells) شکر کو جذب کر لیتے ہیں اور اس سے طاقت پیدا ہوتی ہے۔ انسولین کا ایک کام یہ بھی ہے کہ خون کے گلوکوز کا توازن برقرار رکھتا ہے، اگر خون میں گلوکوز بڑھ جائے تو انسولین خبر دیتا ہے کہ زائد گلوکوز کو جگر میں جمع کر لیا جائے۔

انسولین کا انجکشن شوگر (diabetes) کی دونوں قسموں میں مدد کرتا ہے، جو لوگ ذیابطس کی پہلی قسم کے مریض ہیں، ان کے جسم میں انسولین پیدا نہیں ہوتا لہٰذا وہ انجکشن کے ذریعہ انسولین حاصل کرتے ہیں، اور جو لوگ ذیابطس کی دوسری قسم کی بیماری میں مبتلا ہیں انہیں بھی خون میں گلوکوز کا توازن قائم رکھنے کے لیے، کبھی انجکشن کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر قسم کے انسولین انجکشن ایک ہی طرح کا کام کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ کتنا جلدی کام کرتا ہے اور کتنا دیرپا ہوتا ہے۔

انسولین منہ سے نہیں لیا جاتا بلکہ پچکاری کے ساتھ انجکشن دیا جاتا ہے یا انسولین پین یا انسولین پمپ کے ذریعہ داخل کیا جاتا ہے اور سیدھا خون میں مدغم ہو جاتا ہے، عام طور پر اس کا انجکشن ران، سرین، بازو یا شکم میں دیا جاتا ہے۔ (ماخوذ از MyDr.com.au/Healthline.com)۔

انگریزی عبارت ملاحظہ ہو:

Insulin is a hormone made in the pancreas, a gland located behind the stomach. It allows the body to use glucose for energy. (Glucose is a type of sugar found in many carbohydrates.)

After eating, the digestive tract breaks down carbohydrates and changes it to glucose. Glucose is then absorbed into the bloodstream through the lining of the small intestine.

Once glucose is in the bloodstream, insulin causes the cells

throughout the body to absorb the sugar and use it for energy. Insulin also helps balance the blood glucose levels. If there is too much glucose in the bloodstream, the insulin signals it to store the excess in the liver.

Insulin injections help treat both Type 1 and Type 2 Diabetes. People with type 1 cannot make insulin so they must inject it and people with type 2 may need it to control their blood glucose levels.

All types of insulin produce the same effect; however, the different types affect how fast and for how long they work.

Insulin is not taken by mouth. It is injected with a syringe, insulin pen or insulin pump and is secreted directly into the bloodstream. It is generally injected in the thighs, buttocks, upper arms, or abdomen (also known as belly).

قال فی الدر المختار: قوله وإن وجد طعمه في حلقه ، أی طعم الكحل أو الدهن كما فی السراج وكذا لو بزق فوجد لونه فی الأصح ، بحر، قال فی النهر: لأن الموجود في حلقه أثر داخل من المسام الذي هو خلل البدن والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ للاتفاق على أن من اغتسل في ماء فوجد برده في باطنه أنه لا يفطر وإنما كره الإمام الدخول فی الماء والتلفف بالثوب المبلول لما فيه من إظهار الضجر في إقامة العبادة لا لأنه مفطر . (فتاوی الشامی: ۲/۳۹۶،سعید).

وفی الفتاوی الهندية : ولو دخل حلقه غبار الطاحونة أو طعم الأدوية أو غبار الهرس،

وأشباهه أو الدخان أو ما سطع من غبار التراب بالريح أو بحوافر الدواب ، وأشباه ذلک لم يفطره كذا في السراج الوهاج . (الفتاوى الهندية: ۱/۲۰۳).

وقال في المبسوط : وان وصل عين الكحل الى باطنه فذلک من قبل المسام لا من قبل المسالک إذ ليس من العين إلى الحلق مسلک فهو نظير الصائم يشرع في الماء فيجد برودة الماء في كبده وذلک لايضره . (المبسوط للامام السرخسي: ۳/۱۲۱، ط: دار الفكر، بيروت).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ دار العلوم زکریا، جلد سوم، (ص ۲۹۹-۳۰۱، ط؛ زمزم)۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

بہ حالتِ روزہ اَلٹراساونڈ کرانے سے روزہ کا حکم:

سوال: کیا روزہ کی حالت میں وجائینل اَلٹراساونڈ کرانا درست ہے یا نہیں؟ کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ نیز اگر کفارہ کے روزوں میں کیا جائے تو تسلسل متأثر ہوگا یا نہیں؟ نیز کفارہ کے روزہ کے درمیان فسادِ روزہ کا عدمِ علم عذر ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: وجائینل اَلٹراساونڈ یعنی اس میں عورت کی شرمگاہ میں ایک قسم کا آلہ داخل کیا جاتا ہے اس آلہ پر غبارہ چڑھا ہوا ہوتا ہے اور غبارہ کے اوپر ایک قسم کا جیل لگایا جاتا ہے، اِس آلہ کے داخل کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ عورت کے رحم میں موجود بچہ کی حالت کو پورے طور پر جانا جائے کہ بچہ صحیح سلامت ہے یا اس میں کچھ نقص ہے، نیز بعض مرتبہ یہ عمل بچہ کی تذکیر و تانیث کو جاننے کی غرض سے بھی کیا جاتا ہے، یہ آلہ رحمِ مادر میں موجود بچہ کی حالت کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔

بصورتِ مسئولہ اگر روزہ کی حالت میں کسی نے سخت مجبوری کی وجہ سے یہ عمل کرالیا تو گناہ نہ ہوگا، البتہ روزہ فاسد ہو جائے گا، اس لئے کہ اس میں جس آلہ کا استعمال کیا جاتا ہے اس پر جیل لگایا جاتا ہے اور پھر اس کو عورت کی فرج داخل میں رکھا جاتا ہے اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ فرج داخل میں کوئی تر چیز داخل کی جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، لہذا اگر کفارہ کے روزوں کے درمیان یہ عمل کرایا جائے تو چونکہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اس لئے تسلسل بھی متأثر ہوگا، پھر سے ساٹھ روزے رکھنے ہوں گے، نیز فسادِ روزہ کا عدمِ علم عذر نہیں

ہے۔ ملاحظہ ہو مراقی الفلاح میں ہے:

(أو أدخل أصبعه مبلولة بماء أو دهن فی دبره) أو استنجی فوصل الماء إلی داخل دبره أو فرجها الداخل بالمبالغة فیه والحد الفاصل الذي یتعلق بالوصول إلیه الفساد قدر الحقنة وقلما یکون ذلک. (مراقی الفلاح، ص۲۵۲)۔

البحر الرائق میں ہے: وکذا لو أدخل أصبعه في أسته أو أدخلت المرأة في فرجها هو المختار إلا إذا کانت الأصبع مبتلة بالماء أو الدهن فحینئذ یفسد لوصول الماء أو الدهن. (البحر الرائق: ۲/ ۳۰۰، ط: دار المعرفة).

النتف فی الفتاوی میں ہے: قال وإن اختار الصوم فیصوم شهرین متتابعین فإن أفطر یوماً من غیر عذر استقبل الصوم وإن کان عذر فلا یستقبل في قول أبي عبد الله والعذر ما ذکرناه فوق ذلک وفي قول أبي حنیفة وأصحابه لا عذر لأحد في ترک الاستقبال إذا أفطر یوماً إلا المرأة تحیض فإنها تبنی علی إذا طهرت فحسب لأنها لا یمکنها أن تصوم شهرین متتابعین من غیر حیض. (النتف فی الفتاویٰ، ص ۱۰۴، دار الکتب العلمیة بیروت).

مفطراتِ صوم اور عصر حاضر کے بعض مسائل میں ہے:

ڈاکٹر لوگ تشخیص وتحقیق کے لئے جو آلات استعمال کرتے ہیں یہ چونکہ فرج میں داخل کر کے نکال لئے جاتے ہیں، وہیں چھوڑ نہیں دئے جاتے اس لئے ان سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، بشرطیکہ ان آلات پر کوئی دوا یا پانی وغیرہ لگا یا ہوا نہ ہو۔ (مفطراتِ صوم اور عصر حاضر کے بعض مسائل، ص۲۰، ط مسیح العلوم بینگلور)۔

فتاوی محمودیہ میں ہے:

اگر محل حقنہ تک تر انگلی پہنچ جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔ (۱۵/ ۱۸۶، ط: محمودیہ)۔

دوسری جگہ ہے: سوال: ایک شخص نے کفارہ کے اُنسٹھ روزے مسلسل رکھے ساٹھویں روزہ رکھنے کے دن وہ بیمار پڑ گیا تو کیا از سرنو ساٹھ روزے رکھے یا بعد صحت صرف ایک روزہ رکھے؟

جواب: پھر سے ساٹھ روزے مسلسل رکھے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۵/ ۲۰۴، مکتبہ محمودیہ)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بہ حالتِ صوم انجیو گرافی (Angiography) سے فسادِ روزہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے رمضان المبارک کے مہینہ میں دن میں روزہ کی حالت میں انجیو گرافی کرایا، کیا اس کا روزہ فاسد ہو گیا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بحالتِ صوم انجیو گرافی (Angiography) (اِس عمل میں انسان کی رگوں اور دل کی نالیوں میں نلکی ڈال کر خون کی رگوں اور اندرونی اعضاء کا معائنہ کیا جاتا ہے اور اسے ایکسرے کے طرز پر محفوظ کیا جاتا ہے۔ یہ یونانی لفظوں میں Angein بمعنی رگ اور Graphein بمعنی لکھنا، ریکارڈ میں لانا سے مرکب ہے، خونی شریانوں کی یہ محفوظ تصاویر Angiongraph کہلاتی ہے، یاد رہے اس عمل سے مقصود ایکسرے ہوتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ٹوپ نما آلہ کو رگوں میں داخل کیا جاتا ہے اور اس آلہ میں ایک قسم کا سیال مادہ ہوتا ہے اس سیال مادہ کی وجہ سے ایکسرے بالکل صاف ہوتا ہے۔)

ماخوذ از (www.verywellhealth.com)،(www.healthline.com)۔

چونکہ اس عمل میں جو نلکی داخل کی جاتی ہے اس میں سیال مادہ ہوتا ہے اس لئے اس عمل کے کرانے سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور قضا لازم ہوگی، کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

دلائل اور شواہد ملاحظہ فرمائیں: البحر الرائق میں ہے:

وكذا لو أدخل أصبعه في أسته أو أدخلت المرأة في فرجها هو المختار إلا إذا كانت الأصبع مبتلة بالماء أو الدهن فحينئذ يفسد لوصول الماء أو الدهن. (۳۰۰/۲،ط:دارالمعرفه).

فتاوی شامی میں ہے:

(أو أدخل أصبعه اليابسة فيه) أي في دبره أوفرجها (لم يفسد) ولو مبتلة فسد.
(فتاوى الشامي:۴۰۳/۷، باب مايفسد الصوم ومالايفسده).

محیط برہانی میں ہے:

وأكثر المشائخ اعتبروا الوصول إلى الجوف في الجائفة والآمة إن عرف أن اليابس

وصل إلى الجوف يفسد صومه بالإتفاق، وإن عرف أن الرطب لايصل إلى الجوف لا يفسد صومه. (المحيط البرهاني: ۲/ ۶۴۱، ط:دار إحياء التراث العربي).

قرار مجمع الفقه الإسلامى حول المفطرات فى مجال التداوى: قرار مجمع الفقه؛ ذكر مسألة (إدخال المنظار [میکروسکوپ] أو اللبوب ونحوهما إلى الرحم) وهذا السياق يشعر بأن المراد إدخال ذلک عن طريق المهبل وعلى كل حال فإن التصريح بصورة تنظير الجنين التى ذكرتها موجود في نص القرار ولم أقف عليه لغيره. هذا مخرّج على مسألة إدخال الإصبع فى الدبر... عند الحنفية إذا أدخل أصبع وبقي بعضه خارجاً فإنه لا يفطر. (رسالة فى المفطرات الطبية العلاجية: ۱/ ۵۹).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اگر تیر یا نیزہ یالکڑی یا ڈورہ بندھی ہوئی بوٹی یا کپڑا یا روئی وغیرہ کوئی چیز روزہ دار کے بدن کے منافذ میں سے کسی منفذ میں داخل ہوکر اندر بالکل غائب ہوجائے اور اس کا کچھ سرا باہر نکلا ہوا نہ رہے تو اس کا روزہ فاسد ہوجاتا ہے جبکہ روزہ دار نے اپنے فعل سے اس کو داخل کیا ہو یا اس کے بدن کے لئے نفع ہو اور اگر ایک سرا یا کوئی حصہ باہر نکلا رہ گیا تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا، اور یہ قاعدہ کلیہ اس وقت ہے جبکہ وہ چیز جو اندر داخل کی گئی ہے خشک ہو لیکن اگر وہ چیز پانی یا روغن وغیرہ سے تر کی تو خواہ اس کا ایک سرا باہر بھی رہے اس کا روزہ اس پانی یا روغن کے پہنچنے کی وجہ سے فاسد ہوجائیگا جبکہ اس کو داخل کرتے وقت روزہ یاد ہو۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/ ۳۰۹، ط: زوار اکیڈمی)۔

مفتی سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

اگر معدے وغیرہ کے ٹیسٹ کے لئے حلق یا ناک کے راستہ سے دوربین والی نلکی ڈالی گئی جس میں دوائی یا چکناہٹ شامل نہ تھی اور اس کا ایک سرا باہر تھا تو محض اس نلکی کے ڈالنے سے روزہ نہ ٹوٹے گا، لیکن اگر نلکی کے ساتھ کوئی اور مادہ بھی شامل ہو تو اس کے اندر داخل ہونے کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (کتاب المسائل: ۲/ ۱۵۵، ط: نعیمیہ دیوبند، وکذا فی المسائل المہمۃ فیما ابتلت بہ العامۃ: ۱/ ۱۰۷، ط: اکل کوا)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

انڈواسکوپی کے ذریعہ جسم کے اندرونی حصہ کا معائنہ کرنے سے روزہ کا حکم:

سوال: روزہ کی حالت میں انڈواسکوپی یعنی آلہ کے ذریعہ اندرونی جسم کا معائنہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس عمل سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ اگر روزہ فاسد ہوتو کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟ بحالتِ اختیار اور بحالت اضطرار کرنے میں کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟ بینواتوجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ انڈواسکوپی یہ ایک قسم کا آلہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ جسم کے کھوکھلے اعضاء یا جوفِ بدن مثلاً معدہ، کان، آنتیں وغیرہ کو جانچا جاتا ہے، یہ ایک ٹیوب نما آلہ ہوتا ہے جس کے ایک سرے پر عدسہ (Lens) لگا ہوا ہوتا ہے، اس ٹیوب کو جسم میں داخل کیا جاتا ہے اس میں روشنی پہنچانے کا بھی انتظام ہوتا ہے، دوسرے سرے پر دوسرے عدسہ (Eye Piece) کی مدد سے اندورنی اعضاء کا دیکھنا آسان ہوجاتا ہے، یاد رہے اس میں جو ٹیوب نما آلہ داخل کیا جاتا ہے، اس پر عدسہ (یعنی فوٹوگرافی کے کیمرے کا وہ چھوٹا سا آئینہ جس میں عکس نظر آتا ہے) لگا ہوا ہوتا ہے اور اس عمل سے مقصود فقط ایکسرے ہوتا ہے اس پر دوائی وغیرہ لگی ہوئی نہیں ہوتی۔ ماخوذ از (en.wikipedia.org/wiki/Endoscopy)۔

چونکہ اس عمل میں آلہ پر کوئی دوائی وغیرہ نہیں ہوتی اور یہ آلہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں ہوتا ہے یعنی ایک سرا باہر ہوتا ہے اور دوسرا سرا اندورنی معائنہ کے لئے داخل کیا جاتا ہے اور اس کو باہر نکالا جاتا ہے اندر نہیں رہتا لہٰذا روزہ فاسد نہ ہوگا۔ جیسا کہ فقہاء نے تحریر فرمایا ہے کہ گوشت کی بوٹی کو دھاگہ سے باندھ کر حلق میں لٹکا کر واپس نکالا جائے تو روزہ فاسد نہ ہوگا، جب تک کہ گوشت کا کچھ حصہ جدا ہوکر پیٹ میں نہ رہ جائے۔ دلائل وشواہد ملاحظہ ہو:

البحرالرائق میں ہے: **ولو شد الطعام بخيط وأرسله في حلقه وطرف الخيط في يده لايفسد الصوم إلا إذا انفصل.** (البحرالرائق: ۲/۲۹۵، دار المعرفه).

فتاوی ہندیہ میں ہے: **ولو طعن برمح...و بقي جوفه فسد وإن بقي طرفه خارجاً لا يفسد.** (الهندية: ۱/۲۰۲).

درمختار میں ہے: **ولو بقي النصل في جوفه فسد أو أدخل عوداً ونحوه في مقعدته وطرفه خارج**

وإن غيبه فسد وكذا لو ابتلع خشبة أو خيطا ولو فيه لقمة مربوطة إلا أن ينفصل منها شيء ومفاده أن استقرار الداخل في الجوف شرط للفساد . (الدرالمختار: ۳۹۷/۲، دارالفکر).

فتاوی شامی میں ہے:

وحاصله أن الإفساد منوط بما إذا كان بفعله أو فيه صلاح بدنه ويشترط أيضاً استقراره داخل الجوف فيفسد بالخشبة إذا غيبها لوجود الفعل مع الإستقرار وإن لم يغيبها فلا لعدم الاستقرار . (فتاوی شامی: ۳۹۷/۲، دارالفکر).

فتاوی ہندیہ میں ہے: ومن ابتلع لحماً مربوطاً على خيط ثم انتزعه من ساعة لا يفسد وإن تركه فسد . (الفتاوی الهندية: ۱/ ۲۰۲).

قرار مجمع الفقه الإسلامي حول المفطرات في مجال التداوي: قرار مجمع الفقه ذكر مسألة (إدخال المنظار أو اللبوب ونحوهما إلى الرحم) وهذا السياق يشعر بأن المراد إدخال ذلك عن طريق المهبل وعلى كل حال فإن التصريح بصورة تنظير الجنين التي ذكرتها موجود في نص القرار ولم أقف عليه لغيره. هذا مخرّج على مسألة إدخال الإصبع في الدبر...عند الحنفية إذا أدخل أصبع وبقي بعضه خارجاً فإنه لايفطر. (رسالة فی المفطرات الطبية العلاجية: ۵۹/۱).

مفتی انعام الحق صاحب قاسمی لکھتے ہیں: انڈواسکوپی (Endoscopy)

انڈواسکوپی کا معنی ہے ''اندر دیکھنا'' عام طور پر اس کا اطلاق طبّی وجوہات کی بنا پر انڈواسکوپ کے ذریعہ انسانی جسم کے اندر دیکھنے پر ہوتا ہے، انڈواسکوپ ایک آلہ ہے، جس کے ذریعہ جسم کے کھوکھلے اعضاء یا جوف بدن مثلاً معدہ، کان، آنتیں وغیرہ کو جانچا جاتا ہے۔ یہ ایک ٹیوب نما آلہ ہے جس کے ایک سرے پر عدسہ (Lens) لگا ہوا ہوتا ہے، اس ٹیوب کو جسم میں داخل کیا جاتا ہے اس میں روشنی پہنچانے کا بھی انتظام ہوتا ہے، دوسرے سرے پر دوسرے عدسہ (Eye Piece) کی مدد سے اندورنی اعضاء کا دیکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ (ضمیمہ روزے کے مسائل کا انسائیکلو پیڈیا ص ۱۴، طبیت العمار کراچی)۔

عمدۃ الفقہ میں ہے:

اگر کسی نے گوشت کی بوٹی کو ڈورے میں باندھ کر نگلا پھر اسی وقت نکال لیا تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا لیکن اگر اس میں کچھ حصہ جدا ہو کر پیٹ میں رہ جائے یا ڈورے کو چھوڑ دے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا، اور اسی طرح اگر کسی لکڑی کو نگل گیا اور اس لکڑی کا سرا اس کے ہاتھ میں ہے اور پھر اس کو باہر نکال لیا تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا اور اگر کل لکڑی نگل گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/۲۷۰، ط: زوار اکیڈمی)۔

دوسری جگہ ہے:

یہ قاعدہ کلیہ اس وقت ہے جبکہ وہ چیز جو اندر داخل کی گئی ہے خشک ہو لیکن اگر وہ چیز پانی یا روغن وغیرہ سے تر کی تو خواہ اس کا ایک سرا باہر بھی رہے اس کا روزہ اس پانی یا روغن کے پہنچنے کی وجہ سے فاسد ہو جائیگا جبکہ اس کو داخل کرتے وقت روزہ یاد ہو۔ (عمدۃ الفقہ: ۳/۳۰۹، ط: زوار اکیڈمی)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

آج کل معدہ کے بعض امراض کی شناخت کے لئے معدہ تک منہ کے ذریعہ نلکی پہنچائی جاتی ہے جو بعض دفعہ گوشت کا ٹکڑا اکثر کر اپنے ساتھ لاتی ہے اور اس پر تحقیق ہوتی ہے ایسی صورت میں اس شخص کا روزہ نہیں ٹوٹے گا اصل میں روزہ ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کا مدار اس بات پر ہے کہ معدہ میں داخل ہونے والی چیز اندر ٹھہر گئی ہے یا واپس آگئی ہے؟ اگر ٹھہر گئی ہے تو روزہ ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/۱۸۶، نعیمیہ دیوبند)۔

مفتی سلمان منصور پوری لکھتے ہیں: اگر معدے وغیرہ کے ٹیسٹ کے لئے حلق یا ناک کے راستہ سے دوربین والی نلکی ڈالی گئی جس میں کوئی دوائی یا چکناہٹ شامل نہ تھی اور اس کا ایک سرا باہر تھا تو محض اس نلکی کے ڈالنے سے روزہ نہ ٹوٹے گا، لیکن اگر نلکی کے ساتھ کوئی اور مادہ بھی شامل ہو تو اس کے اندر داخل ہونے کی وجہ سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (کتاب المسائل: ۲/۱۵۵، ط نعیمیہ دیوبند، وکذا فی المسائل المہمۃ فیما ابتلت بہ العامۃ: ۱/۱۰۷، ط اکل کوا)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

رمضان المبارک میں دن میں ہوٹل کھلے رکھنے کا حکم:

سوال: ماہ مبارک میں ہوٹل کھولنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ گاہکوں کی اکثریت غیر مسلموں کی ہو یا

مسلمان اور غیر مسلم دونوں مخلوط ہوں۔ بینوا توجروا۔

الجواب: رمضان المبارک میں مسلمان علاقوں میں تو رمضان کے احترام میں مطلقاً دن کے وقت ہوٹل بند رکھے جائیں تاکہ تعاون علی المعصیت لازم نہ آئے، اور جس مسلمان کا ہوٹل غیر مسلم علاقہ میں ہو تو اس کو بھی رمضان المبارک کے احترام میں بند رکھنا چاہئے، جیسے اگر کوئی آدمی سعودی عرب سے ہندوستان یا پاکستان آجائے اور اس کے ۳۰ روزے پورے ہو چکے ہوں تو وہ لوگوں کے ساتھ موافقت کرکے روزہ رکھے گا، اسی طرح مسافر مقیم ہوجائے یا نابالغ دن میں بالغ ہوجائے تو امساک کریگا نیز حائضہ دن کو پاک ہوجائے تو امساک کریگی، اسی طرح مسلمانوں کو بھی رمضان کا احترام کرنا چاہئے اور ہوٹل بند رکھنا چاہئے۔

ملاحظہ ہو قرآن مجید میں ہے:

﴿وتعاونوا على البرّ والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾. (المائدة: ۲).

حدیث شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم صومكم يوم تصومون وأضحاكم يوم تضحون. (السنن الكبرى للبيهقي، رقم: ۸۴۶۷، كذا في الدارقطني، رقم ۳۴، ومصنف عبد الرزاق، رقم ۷۳۰۴).

فتاویٰ شامی میں ہے:

لو صام رائي هلال رمضان وأكمل العدة لم يفطر إلا مع الإمام لقوله عليه السلام صومكم يوم تصومون وفطركم يوم تفطرون...والناس لم يفطروا في مثل هذا اليوم فوجب أن لا يفطر، نهر. (فتاوى الشامي: ۲/ ۳۸۴، سعيد).

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

الصبي إذا بلغ في بعض النهار وأسلم الكافر وأفاق المجنون وطهرت الحائض وقدم المسافر مع قيام الأهلية يجب عليه الإمساك بقية اليوم. (الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۴).

عمدۃ الفقہ میں ہے:

مفطرات سے رکنا واجب ہونے کے لئے چند اصول ہیں اور ہر ایک کے ماتحت کچھ فروعات ہیں، پہلا اصول یہ ہے کہ جس شخص پر رمضان کا روزہ اہلیت وجوب پائے جانے کی وجہ سے واجب ہوا لیکن اس کو رمضان کے روزہ میں شروع دن میں (طلوع فجر سے پہلے) کوئی ایسا عذر لاحق ہو جس کی وجہ سے روزہ رکھنا اس وقت اس پر فرض نہ ہو یا اس کی وجہ سے اس کو روزہ نہ رکھنا مباح ہو اور پھر دن میں وہ عذر زائل ہو جائے اور وہ اس حالت پر ہو جائے کہ اگر وہ اس حالت پر شروع دن میں یعنی طلوع فجر سے پہلے ہوتا تو اس کو روزہ رکھنا فرض ہو جاتا تو اس کو اس دن کا باقی حصہ روزہ داروں کی طرح کھانے پینے و جماع سے رکنا واجب ہے، مثلاً طلوع فجر ہوتے ہی یا طلوع فجر کے بعد دن کے کسی حصہ میں کوئی نابالغ بچہ بالغ ہوا یا کافر مسلمان ہوا یا مجنون کو افاقہ ہوا یا حیض یا نفاس والی عورت پاک ہوئی... یا مسافر اپنے سفر سے واپس آیا... تو ایسے شخص پر اس دن کا باقی حصہ مفطرات سے رکنا واجب ہے تا کہ ان سب صورتوں میں جس قدر ممکن ہو سکے وقت کی حرمت قائم رہے پس روزے داروں کی مشابہت کرتے ہوئے مفطرات سے رکنا وقت کا حق ادا کرنا ہے۔ (عمدۃ الفقہ ج۳ص۳۵۹)۔

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحبؒ فرماتے ہیں:

ماہِ مبارک کا احترام کرتے ہوئے دن کو کھانے پینے کا ہوٹل بند رکھنا ضروری ہے، کھانے پینے والے چاہے کوئی بھی ہوں، یہ مبارک مہینہ شعائر اللہ میں سے ہے اور اللہ کے شعائر کا احترام ضروری ہے، قرآن مجید میں ہے: ﴿**ومن يعظم شعائر الله فإنها من تقوى القلوب**﴾، لہٰذا اگر دن کو ہوٹل کھانا کھلانے یا چائے پلانے کے لئے کھولے گا تو ماہِ مبارک کی حرمت باقی نہیں رہے گی اور کھولنے والا گنہگار ہوگا۔ البتہ شام کو افطاری سے کچھ پہلے لوگ افطاری کی چیزیں حلیم، فیرنی، سموسے وغیرہ خرید کر اپنے گھر لے جاتے ہوں تو اس میں کوئی خرابی نہیں کہ افطاری کا سامان ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۸۱/۴، ط: الاحسان دیوبند)۔

حضرت مفتی سلمان صاحب منصور پوری لکھتے ہیں:

رمضان المبارک میں روزہ کے اوقات میں ہوٹل و پان کی دکان کھولے رکھنا احترام رمضان کے خلاف ہے، مسلم محلوں میں اس طرح کی دکانیں بند ہی رہنی چاہئیں تا کہ روزہ خوروں کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ (کتاب النوازل: ۳۹۲/۱۷، ط: المرکز العلمی مرادآباد)۔

رمضان المبارک کے احترام میں ۳۱واں روزہ رکھنا ضروری ہے: ملاحظہ ہو کتاب المسائل میں ہے:

کوئی شخص رمضان کے دوران سعودی عرب سے ہندوستان آکر مقیم ہوجائے اور یہاں اس کے ۳۰ روزے پورے ہوجائیں تو وہ اس وقت تک روزہ رکھنا نہ چھوڑے گا جب تک ہندوستان میں عید کا چاند نظر نہ آجائے چاہے ۳۱ یا ۳۲ روزے رکھنے پڑیں۔ (کتاب المسائل: ۲/ ۱۳۸ نعیمیہ دیوبند، کذا فی احسن الفتاوی: ۸/ ۲۲۵، سعید، فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۲/ ۴۴۷، ط: زمزم، وروزے کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا ص ۲۱۱، بیت العمار)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مریض کا روزہ کی حالت میں آکسیجن کا آلہ لگا کر سونے کا حکم:

سوال: بعض بیماری کی وجہ سے اطباء ایک آلہ تجویز کرتے ہیں جو سونے کی حالت میں ناک اور منہ میں لگایا جاتا ہے جس کی وجہ سے سانس لینے میں آسانی ہوتی ہے، اس آلہ سے صرف صاف ستھری ہوا نکلتی ہے، اس میں بھاپ یا تری وغیرہ کچھ نہیں ہوتی، کیا اس کی وجہ سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

الجواب: سوال میں مذکور آلہ کا نام ریسپرونکس مشین (RESPIRONICS MACHINE SLEEP APNEA) ہے یہ آلہ ڈاکٹر حضرات ان مریضوں کے لئے تجویز کرتے ہیں جن کو سونے کی حالت میں سانس بند ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، اس آلہ کو سوتے وقت لگایا جاتا ہے تاکہ اگر نیند میں سانس بند ہونے لگے تو یہ آلہ صاف ہوا کے ذریعہ مریض کو سانس لینے میں مددگار ثابت ہو، یہ آلہ آکسیجن کی طرح مریض کو صاف ہوا پہنچانے کا کام کرتا ہے اس میں تری، بھاپ وغیرہ نہیں ہوتی۔

ماخوذ از (www.cpapdirect.com/pap-machines/phillips-respironics-dreamstation-auto-bipap-machine)

چونکہ اس آلہ میں بھاپ، تری وغیرہ نہیں ہوتی، فقط ہوا ہوتی ہے اس لئے بحالت صوم اس کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا۔ جیسا کہ آکسیجن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

مراقی الفلاح میں ہے: **لایکرہ للصائم شم رائحة المسک والورد ونحوہ مما لا یکون جوھراً متصلاً** . (مراقی الفلاح، ص: ٢٤٦).

فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

لا يكره للصائم شم رائحة المسک والورد ونحوه مما لا يكون جوهراً متصلاً كالدخان فإنهم قالوا: لايكره الاكتحال بحال وهو شامل للمطيب وغيره ولم يخصوه بنوع منه . (فتاوى الشامي: ۲/۴۱۷،سعيد).

بطورِ تائید بعض عرب علماء کے عربی فتاویٰ ملاحظہ ہو: شیخ محمد بن صالح بن محمد العثیمین لکھتے ہیں:

ماحكم الأكسجين الذى يوضع على فم المريض اكثر اليوم، هل يفطر؟

الأكسجين الذى يعطى للمريض لايفطر، لأن هذا الأكسجين ليس له جرم يصل إلى المعدة حتى نقول: إنه أكل أو شرب لكنه بارد يفتح الشرايين حتى يتنفس الإنسان، وعلى هذا لا يكون أكلاً ولا شرباً وما ليس بأكل ولا شرب ولا بمعنى الأكل والشرب فإنه لا يفطر . (جلسات رمضانية للعثيمين:۱۹/۱۵)۔

دکتور احمد بن محمد خلیل لکھتے ہیں:

المسألة الثانية : غاز الأكسجين.

التعريف به : غاز الأكسجين هو هواء يعطى لبعض المرضى،ولايحتوى على مواد عالقة، أو مغذية، ويذهب معظمه إلى الجهاز التنفسى.

حكمه:لا يعتبر غاز الأكسجين مفطراً كما هو واضح ، فهوكما لو تنفس الهواء الطبيعى . (مفطرات الصيام المعاصرة ،للدكتور أحمد بن محمد خليل: ۱/۱۷).

دوسری جگہ ہے: **غاز الأكسجين لا يفطر فهو هواء لا يحتوى على أى مادة تسبب الفطر.** (مفطرات الصيام المعاصرة ،للدكتور أحمد بن محمد خليل: ۱/۳۳).

مفتی انعام الحق صاحب قاسمی لکھتے ہیں:

بیماری میں مریض سونے کی حالت میں منہ اور ناک میں RESPIRONICS MACHINE لگا کر سوتے ہیں تاکہ سانس لینے میں دشواری نہ ہو تو روزہ کی حالت میں ایسی مشین یا آلہ استعمال کرنے سے روزہ

فاسد نہیں ہوگا، کیوں کہ اس سے صرف تیز ہوا آتی ہے، بھاپ یا تری وغیرہ کچھ نہیں آتی، اور صرف ہوا آنے جانے سے روزہ پر اثر نہیں پڑتا۔ (ضمیمہ روزے کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا ص:۳۰، ط: بیت العمار کراچی)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

دمہ کے سخت مریض کو دورہ پڑنے کے وقت آکسیجن پہنچائی جاتی ہے۔روزہ کی حالت میں اس طرح آکسیجن لینے کا کیا حکم ہوگا؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے فقہی جزئیات کو سامنے رکھتے ہوئے تو خیال ہوتا ہے کہ اگر آکسیجن کے ساتھ کوئی دوائی نہ ہو تو روزہ فاسد نہیں ہونا چاہئے۔کیوں کہ یہ سانس لینا ہے اور سانس کے ذریعہ ہوا لینا نہ مفسد صوم ہے اور نہ اس پر اکل وشرب کا اطلاق ہوتا ہے۔اگر اس کے ساتھ دوا کے اجزا بھی ہوں تو پھر اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/۱۸۸، ط: نعیمیہ دیوبند)۔

حضرت مفتی محمد سلمان منصور پوری لکھتے ہیں:

روزہ میں آکسیجن کے ذریعہ سانس لیا جائے تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، کیوں کہ آکسیجن محض ایک صاف ستھری ہوا ہے، اس کا بدن میں جانا مفسد صوم نہیں۔ (کتاب المسائل: ۲/۱۵۴، ط: نعیمیہ دیوبند)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مظلوم کو ظالم کے روزہ کا ثواب دینے کا حکم:

سوال: کیا قیامت کے دن مظلوم کو ظالم کے روزہ کا ثواب دیا جائیگا یا نہیں؟ اور فرض ونفل روزہ میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مظلوم کو ظالم کے حسنات دیئے جانے سے متعلق دو قسم کی آحادیث ملتی ہیں؛ ۱۔تمام حسنات سے مظلوم کو بدلہ دیا جائیگا۔ ۲۔بعض احادیث میں صوم کا استثناء موجود ہے، بنابریں اہل علم کا اختلاف ہے، تطبیق کی آسان صورت یہ ہے کہ صوم نفل سے تو مواخذہ ہوگا لیکن صوم فرض سے مواخذہ نہ ہوگا۔

دلائل ملاحظہ فرمائیں؛ مسلم شریف میں روایت ہے:

عن أبي هريرة ﷺ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: أتدرون ما المفلس فينا، قالوا: المفلس فينا من لادرهم له ولا متاع فقال: إن المفلس من أمتي يأتي يوم القيامة

بصلاة وصيام وزكاة ويأتي قد شتم هذا وقذف هذا وأكل مال هذا وسفک دم هذا وضرب هـذا فيعطى هذا من حسناته وهذا من حسناته فإن فنيت حسناته قبل أن يقضي ما عليه أخذ من خطاياهم فطرحت عليه ثم طرح فى النار. (رواه مسلم، رقم: ۲۵۸۱).

بعض شراحِ حدیث نے درجِ ذیل احادیث کی بناپر صوم کو مستثنیٰ کیا ہے:

۱۔ عن أبي صالح الزيات، أنه سمع أباهريرة رضي الله عنه يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال الله: كل عمل ابن آدم له، إلا الصيام، فإنه لي وأنا أجزى به، والصيام جنة، وإذا كان يوم صوم أحدكم فلا يرفث ولا يصخب، فإن سابه أحد أو قاتله، فليقل إني امرو صائم. (رواه البخارى: ۱/۲۵۵/۱۹۰۴، باب هل يقول انى صائم اذا شتم).

۲۔ عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كل عمل ابن آدم يضاعف، الحسنة عشر أمثالها إلى سبع مائة ضعف، قال الله عزوجل: إلا الصوم، فإنه لي وأناْ أجزى به، يدع شهوته وطعامه من أجلي، للصائم فرحتان: فرحة عند فطره، فرحة عند لقاء ربه. (رواه مسلم: ۱/۳۶۳/۱۱۵۱، باب فضل الصيام).

شراحِ حدیث کی چند عبارات ملاحظہ فرمائیں:

قال ابن عيينة: هذا من أجود الأحاديث وأحكمها إذا كان يوم القيامة يحاسب الله عنده ويؤدى ما عليه من المظالم من سائر عمله حتى لا يبقى إلا الصوم فيتحمل الله ما بقي عليه من المظالم ويدخله بالصوم الجنة. (الدرالمنثور ۱/۴۳۶، ط:دارالفكر).

عمدة القارى میں مرقوم ہے:

أن جميع العبادات توفى منها مظالم العباد إلا الصيام، وروى ذلک البيهقى من طريق إسحاق بن أيوب عن حسان الواسطى عن أبيه عن ابن عيينة قال: إذا كان يوم القيامة يحاسب الله عبده ويودى ما عليه من المظالم من عمله حتى لا يبقى له إلا الصوم...وقال القرطبيؒ: هذا حسن غير أني وجدت في حديث المقاصة ذكر الصوم فى جملة الأعمال

لأن فيـه: الـمـفـلـس من يأتي يوم القيامة بصلاة وصدقة وصيام ويأتي وقد شتم هذا وضرب هـذا وأكل مال هذا ، وفيه فيواخذ لهذا من حسناته ولهذا من حسناته فإن فنيت حسناته قبل أن يـقـضـى مـا عـلـيـه أخـذ مـن سيـئـاتـه فطرحت عليه ثم طرح فى النار، فظاهره أن الصيام مشتـرک مـع بقية الأعمال في ذلک. قال بعضهم: إن ثبت قول ابن عيينة أمكن تخصيص الـصيـام مـن ذلـک ، قـلـت: يجرى الإمكان في كل عام ولا يثبت التخصيص إلا بدليل وإلا يلزم إلغاء حكم . (عمدة القارى:۱۳/۸ ،باب فضل الصوم، ط: دارالحديث، ملتان).

وفـي شـرح سنن ابن ماجه : قوله إلا الصوم ، قال الإمام أبوالخير الطالقاني في إضافة هـذه العبادة إليه تعالىٰ خمسة وخمسون قولاً : منها: إنما إضافة إليه لأنه إذا كان يوم القيامة تعلق خصماء ه فيأخذ زكاته وآخر حجه وآخر جهاده ، وآخر صلاته، وآخر تسبيحه ويبقى عـلـى الـعـبـد مـظـالم فيريدون أن يأخذوا صومه فيقول لهم الرب تعالىٰ: الصوم لي وليس له حتى تأخذوا ولا سبيل لكم على شيء هو لي . (شرح سنن ابن ماجه،ص ۱۲۷،قديمى).

ولـلمزيد ينظر : (فتـح البـارى:۱۰۹/۴ ، وشـرح الزرقانى على المواهب اللدنيه :۹۵/۸، دار المعرفة ، وفيض القدير:۴/ ۴۷۱،دارالفكر،وحاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، ص۶۳۷، قديمى، وحاشية الحلبى الكبير، أسنى المطالب:۳/ ۱۶). واللہ ﷻ اعلم۔

مسجد حرام میں اعتکاف کی فضیلت:

سوال: مکہ مکرمہ میں سنت اعتکاف کرنے میں کیا ثواب ہے؟

الجواب: مسجد حرام میں اعتکاف کرنے کے درجِ ذیل فضائل ہیں:۔

۱۔مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہے اور رمضان میں اس کی فضیلت بڑھ جاتی ہے، دنیا کی کسی اور مسجد کے بارے میں یہ فضیلت نہیں۔

۲۔حرم شریف میں ہر نیکی کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔

۳۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزانہ بیت اللہ پر ۱۲۰ رحمتیں نازل ہوتی ہیں؛ ۶۰ طواف کرنے والوں پر، ۴۰ نماز پڑھنے والوں پر (بعض روایات میں نماز کی جگہ اعتکاف کا ذکر ہے) اور ۲۰ بیت اللہ شریف کو دیکھنے والوں پر۔

۴۔فقہاء نے فرمایا: افضل الاعتکاف مسجد حرام میں ہے پھر مسجد بنوی شریف میں پھر مسجد اقصیٰ میں پھر جامع مسجد پھر محلّہ کی مسجد۔ حدیث شریف میں ہے:

عن جابر رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "صلاة في مسجدي أفضل من ألف صلاة فيما سواه ، إلا المسجد الحرام، وصلاة فى المسجد الحرام أفضل من مائة ألف صلاة فيما سواه . رواه ابن ماجه (رقم: ۱۴۰۶) **و فى الزوائد : إسناد حديث جابر صحيح ورجاله ثقات .** (ابن جامه ۱/۴۵۱/۱۴۰۶،دارالفکر).

وعنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصلاة في مسجدي هذا أفضل من ألف صلاة فيما سواه إلا المسجد الحرام ، والجمعة في مسجدي هذا أفضل من ألف جمعة فيما سواه إلا المسجد الحرام وشهر رمضان في مسجدي هذا أفضل من ألف شهر رمضان فيما سواه إلا المسجد الحرام . (أخرجه البيهقى فى شعب الايمان :۶/۴۳/۳۸۵۱،مكتبة الرشد).

وعن ابن عباس رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الله ينزل في كل يوم وليلة عشرين ومائة رحمة ينزل على هذا البيت ستون للطائفين وأربعون للمصلين وعشرون للناظرين . رواه الطبراني فى الكبير والأوسط إلا أنه قال: ينزل على هذا المسجد مسجد مكة ، وفيه يوسف بن السفر وهو متروک . وفي رواية : وأربعون للعاكفين بدل: المصلين . (مجمع الزوائد: ۳/۲۹۲/۵۷۳۹،دارالفکر).

وعن ابن عمر رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: رمضان بمكة أفضل من ألف رمضان بغير مكة . (رواه البزارفى مسنده ، رقم :۲۱۴۴). **قال الهيثمي: فيه : عاصم بن عمر ضعفه الأئمة : أحمد وغيره ووثقه ابن حبان وقال: يخطئى ويخالف .** (مجمع الزوائد: ۳/ ۳۴۸/ ۴۷۹۹، باب فى صوم رمضان بمكة،بيروت).

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: من أدرك رمضان بمكة فصام وقام منه ما تيسر له كتب اللّٰه له مائة ألف شهر رمضان فيما سواها وكتب اللّٰه له بكل يوم عتق رقبة وكل ليلة عتق رقبة وكل يوم حملان فرس في سبيل اللّٰه وفي كل يوم حسنة وفي ليلة حسنة. (رواه ابن ماجه، رقم: ۳۱۰۸). **وإسناده ضعيف.**

علامہ عینیؒ عمدۃ القاری میں لکھتے ہیں: **ورواه الحسن عن أبي حنيفةؒ: ثم أفضل الاعتكاف ما كان فى المسجد الحرام ثم في مسجد النبي ثم في بيت المقدس ثم فى المسجد الجامع ثم فى المساجد التي تكثر أهلها ويعظم.** (عمدة القارى: ،باب الاعتكاف فى العشرالاواخر).

غنیۃ الناسک میں مرقوم ہے کہ مساجدِ ثلاثہ کی فضیلت صرف نماز کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام قربات اور طاعات کو شامل ہے۔ملاحظہ ہو: **قال: وهي لخصوصية المساجد الثلاثة، لا لخصوصية الصلاة فتلتحق بها فيها بقية القربات كالصوم والاعتكاف والصدقة والذكر والقراءة.** (غنية الناسک، ص ۲۷۶، ط: إدارة القرآن).

وللاستزادة راجع: (تبيين الحقائق: ۱/۳۵۰، ط: امداديه، وفتاوى الشامى: ۲/۴۴۱، سعيد، وفتح القدير: ۲/۳۹۴، ط: دارالفكر، وحاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح، ص ۴۲۰، وبدائع الصنائع: ۲/۳۳۳، سعيد). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

حرمین میں اعتکاف کرنے والے کو کھانا وغیرہ کی ضرورت کے لیے نکلنے کا حکم:

سوال: حرمین میں کھانا کھانے یا لیجانے کی اجازت نہیں، نیز زیادہ سامان بھی نہیں لے جاسکتے ہیں تو کیا کھانا کھانے کے لیے کسی قریبی ریسٹورنٹ میں جانا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ضرورتِ طبعی کے لیے فقہاء نے باہر جانے کی اجازت دی ہے اور کھانا ضرورتِ طبعیہ میں شامل ہے، البتہ اگر کوئی کھانا لانے والا ہو تو منگا کر مسجد کے صحن میں کھالیا کرے اور اگر کوئی نہ ہو تو قریبی ریسٹورنٹ میں جلدی سے کھا کر بلا وقت ضائع کے لیے ہوئے مسجد میں پہنچ جائے، اس سے سنت اعتکاف میں

کوئی خلل نہیں آئیگا۔ باقی ویسے ہی بازاروں میں تفریح کے لیے نکلنا درست نہیں۔ ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں ہے:

وذكر أنه يخرج للأكل والشرب بعد الغروب . (عمدۃا لقاری: باب الحائض ترجل المعتكف).

قال في البحر الرائق: وفي الفتاوى الظهيرية : وقيل : يخرج بعد الغروب للأكل والشرب ، وينبغي حمله على ما إذا لم يجد من يأتي له به فحينئذٍ يكون من الحوائج الضرورية كالبول والغائط . (البحر الرائق: ۲/ ۳۰۳،ط: کوئٹہ).

(وكذا في الدر المختار مع رد المحتار : ۲/ ۴۴۹،سعيد ،باب الاعتكاف، والنهر الفائق ؛ ۲/ ۴۷، دار الكتب العلمية، وحاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح،ص،باب الاعتكاف).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

سحر وافطار کی مسجد میں اجازت ہے اس کے لیے باہر نہ جائے ،کوئی لانے والا نہ ہو تو مکان سے جا کر لے آئے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۵/ ۲۶۸،مکتبۂ محمودیہ)۔

کفایت المفتی میں مذکور ہے: اگر مسجد میں کھانا پہنچانے والا کوئی نہ ہو تو کھانا لینے کے لیے جانا اور کھانا لیکر فوراً واپس آ جانا چاہیے۔ (کفایت المفتی: ۴/ ۲۴۶،دارالاشاعت)۔

کتاب المسائل میں مرقوم ہے:

حرمین شریفین میں کھانے کا سامان اندر لانے کی اجازت نہیں ہوتی ؛ لہٰذا رمضان المبارک میں وہاں اعتکاف کی سعادت حاصل کرنے والے حضرات اگر مغرب کے بعد قریبی ہوٹل پر جا کر کھانا کھائیں یا باہر صحن میں نکل کر کھانا کھائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ یہ طبعی ضرورت میں داخل ہے؛ البتہ کھانے کے بعد وہاں بیٹھے نہ رہیں ؛ بلکہ فارغ ہو کر فوراً مسجد میں آ جائیں۔ (کتاب المسائل: ۲/ ۱۸۵،کتب خانہ نعیمیہ)۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم۔

بحالتِ اعتکاف عورت کا فقط مصلے پر بیٹھنے کا حکم:

سوال: ایک مولوی صاحب نے عورت کے اعتکاف کے بارے میں بتلایا کہ جس مصلے پر نماز پڑھتی ہے دن رات اسی مصلے پر بیٹھی رہے ،بغیر ضرورت کے کمرہ میں نہیں گھوم سکتی۔ اب آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ عورت کا محل اعتکاف پورا کمرہ ہے یا فقط مصلیٰ؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء کرام کی عبارات سے پتا چلتا ہے کہ عورت گھر کی مسجد میں اعتکاف کرے، اور گھر کی مسجد وہ پورا کمرہ ہے جو نماز کے لیے مخصوص ہے، تو جس طرح مرد حضرات پوری مسجد میں بلا ضرورت گھوم سکتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی مخصوص پورے کمرے میں بلا ضرورت گھوم سکتی ہیں، اگر عورت کا محل اعتکاف صرف وہ مصلیٰ ہو جس پر وہ نماز پڑھتی ہے تو اس میں حرج عظیم ہے۔ ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں ہے:

عند أبي حنيفةؒ إنما يصح اعتكاف المرأة في مسجد بيتها وهو الموضع المهيأ لها في بيتها لصلاتها . (عمدةالقارى:۱۷/۱۹۴،باب الاعتكاف فى العشرالاواخر).

درمختار مع ردالمحتار میں مرقوم ہے:

امـرأة في مسجد بيتها ... ولا تخرج من بيتها إذا اعتكفت فيه قوله في مسجد بيتها، وهو المعد لصلاتها الذى يندب لها ولكل أحد اتخاذه كما فى البزازية . (۲/۴۴۱،سعيد).

وفـى الفتاوى الهندية: والمرأة تعتكف في مسجد بيتها إذا اعتكفت في مسجد بيتها فتـلـك البـقعة في حقها كمسجد الجماعة في حق الرجل لا تخرج منه إلا لحاجة الإنسان، كذا في شرح المبسوط للإمام السرخسي. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۱).

وللاستزادة انظر: (بدائع الصنائع: ۲/۱۱۴،سعيد، وتبيين الحقائق: ۱/۳۵۰،ط: امداديه ،ملتان).

واللہ ﷻ اعلم۔

مسجد نہ ہونے کی صورت میں مصلے میں اعتکاف کرنے کا حکم:

سوال: کیا سنت اعتکاف کے لیے مسجدِ شرعی کا ہونا ضروری ہے اگر کوئی شخص کسی قریبی مصلے میں اعتکاف کرے جو شرعی مسجد نہیں تو سنت اعتکاف کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اعتکاف کے صحیح ہونے کے لیے مسجدِ شرعی کا ہونا ضروری ہے، عارضی عبادت خانہ یا مصلے میں مسنون اعتکاف ادا نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو درمختار میں مرقوم ہے:

هو لغة : اللبث وشرعاً لبث ، المكث ذكر ولو مميزاً في مسجد جماعة هو ما له إمام ومؤذن أديت فيه الخمس أو لا ، وعن الإمام اشتراط أداء الخمس فيه . (الدرالمختار: ۲/۴۴۰،ط:سعید، و كذا فی الهداية مع العناية : ۳۰۸/۲).

فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے:

وأما شروطه ومنها مسجد الجماعة فيصح في كل مسجد له أذان ، وإقامة هو الصحيح كذا فی الخلاصة ، وأفضل الاعتكاف ما كان فی المسجد الحرام ثم فی مسجد النبي عليه الصلاة والسلام ، ثم في بيت المقدس ثم فی الجامع ثم فيما كان أهله أكثر و أوفر كذا فی التبيين . (الفتاوى الهندية: ۲۱۱/۱).

بہشتی زیور میں مرقوم ہے:

اعتکاف کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں: (۱) مسجدِ جماعت میں ٹھہرنا۔ (۲) بہ نیتِ اعتکاف ٹھہرنا، پس بے قصد وارادہ ٹھہر جانے کو اعتکاف نہیں کہتے، چونکہ نیت کے صحیح ہونے کے لیے نیت کرنے والے کا مسلمان اور عاقل ہونا شرط ہے لہٰذا عقل واسلام کا شرط ہونا بھی نیت کے ضمن میں آ گیا۔ (۳) حیض ونفاس سے خالی اور پاک ہونا اور جنابت سے پاک ہونا۔ (بہشتی زیور،ص ۹۵۹،ط: دارالاشاعت)۔

کتاب الفتاویٰ میں مذکور ہے:

جب آپ نے اس جگہ کے بارے میں باضابطہ مسجدِ شرعی ہونے کی نیت نہیں کی ہے، بلکہ عارضی طور پر اسے عبادت گاہ کی حیثیت دی ہے، تو اس میں اعتکاف کرنا درست نہیں، اعتکاف مسجدِ شرعی میں ہے اور وہ بھی ایسی مسجد جس میں پنجوقتہ نماز باجماعت ادا ہوتی ہو۔ (کتاب الفتاویٰ: ۳۹۶/۸)۔

ہاں اگر کسی بستی میں مسجدِ شرعی نہیں ہے بلکہ مصلیٰ ہے اسی میں پنجوقتہ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، تو اگر اس میں اعتکاف کرلیا جائے تو امید ہے کہ اعتکاف کا ثواب حاصل ہو جائے۔ چنانچہ مفتی عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

جبکہ بستی میں مسجد ہی نہیں ہے تو جس مکان میں پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرنے کا انتظام ہو اس میں اعتکاف کیا جائے، امید ہے کہ سنتِ مؤکدہ کا ثواب ملے گا، نہ کیا تو کوتاہی کا بار رہے گا جتنا ہو سکے کر گزرنا چاہیے

قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ **قالوا لما سقط عن المرأة في صلاتها المسجد الجامع كذلك سقط في اعتكافها المسجد الجامع أيضاً** . (رسائل الارکان ،ص: ۲۲۹)، فقط واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب . نوٹ: جس مکان میں نماز باجماعت ادا کرتے ہیں وہاں جماعت کا ثواب مل جائے گا،لیکن مسجد کے ثواب سے محروی رہے گی ، اس لیے مسجد بنانے کی کوشش جاری رکھیں ۔(فتاویٰ رحیمیہ :۴/ ۱۳۷،ط: مکتبۃ الاحسان، دیوبند)۔واللہ ﷻ اعلم۔

مخصوص ایام اور مخصوص راتوں کی فضیلت میں رفع تعارض:

سوال: بعض مخصوص ایام کی فضیلت احادیث میں وارد ہوئی ہے؛ مثلاً: بعض احادیث میں عشرۂ ذی الحجہ،بعض میں رمضان المبارک کا آخری عشرہ،بعض میں یومِ جمعہ،بعض میں یومِ عرفہ،بعض میں یوم النحر ،بعض میں یوم العید، نیز راتوں کی فضیلت میں بھی مختلف احادیث وارد ہوئی ہیں ؛ مثلاً: بعض میں شبِ قدر،بعض میں شبِ براءت،بعض میں ذی الحجہ کی دس راتیں،بعض میں شبِ جمعہ،بعض میں شبِ عیدین وغیرہ توان میں کس کوکس پر فضیلت ہے؟اوررفع تعارض کی کیا شکل ہے؟ بینوا بالتفصیل توجروا بالا جرالجزیل۔

الجواب: علماء نے فرمایا ہے کہ سال کا افضل مہینہ رمضان المبارک ہے،اورعشرہ کی فضیلت، دن کے اعتبار سے ذی الحجہ کا پہلا عشرہ تمام عشروں سے بہتر ہے،اوررات کے اعتبار سے رمضان المبارک کا آخری عشرہ بہتر ہے، پھرسال کے ایام کی طرف نسبت کرتے ہوئے یومِ عرفہ افضل ہے اور ہفتہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے یومِ جمعہ افضل ہے،اسی طرح راتوں میں شبِ قدر سب سے افضل ہے۔اوربعض علماء نے فضیلت میں سب کو یکساں درجہ دیا ہے۔ علماء کرام کی عبارات ملاحظہ فرمائیں:

قال العلامة يوسف البنوري في معارف السنن: قال العلماء : الأفضل فى الليالى ليالي رمضان ، وفى الأيام عشرة ذى الحجة ، وفي أيام السنة يوم عرفة ، وفي أيام الأسبوع يوم جمعة ، كما لخص فيه القول ابن القيمؒ في أوائل "الهدى" بعد تفصيل . (معارف السنن : ۵/ ۴۲۱، ط:سعید).

قال المحقق ابن كثير: وبالجملة فهذا العشر قد قيل: إنه أفضل أيام السنة كما نطق به الحديث، وفضله كثير على عشر رمضان الأخير؛ لأن هذا يشرع فيه ما يشرع في ذلك من صيام و صلاة و صدقة و غيره، و يمتاز هذا باختصاصه بأداء فرض الحج فيه، وقيل: ذلك أفضل لاشتماله على ليلة القدر التي هي خير من ألف شهر و توسط آخرون فقالوا: أيام هذا أفضل وليالي ذاك أفضل، وبهذا يجتمع شمل الأدلة. (تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۲۴۰).

قال الإمام النوويؒ: فأما إن أراد أفضل أيام السنة فيتعين يوم عرفة وإن أراد أفضل أيام الأسبوع فيتعين الجمعة ولو قال: أفضل ليلة تعينت ليلة القدر وهي عند أصحابنا والجمهور منحصرة في العشر الأواخر من شهر رمضان. (شرح صحيح مسلم: ١/ ٣٨٢، ط: فيصل).

وقال الشيخ الملا على القارى: إذا قيل: أفضل أيام السنة فهو عرفة، وأفضل أيام الأسبوع فهو الجمعة. (مرقاة: ٣/ ٢٣٢، امداديه ملتان).

وقال أيضاً: واختلف في أفضل العشرين، فقيل: عشر رمضان أفضل من حيث لياليه لأن منها ليلة القدر، وهي أفضل الليالي وعشر ذى الحجة أفضل من حيث أيامه لأن فيها يوم عرفة وهو أفضل الأيام، وذهب ابن حبان إلى تساويهما في الفضل. (مرقاة: ٤/ ٣٠٥، امداديه).

وفي معارف السنن: قال في "الهدى": وقد ذهب بعض العلماء إلى تفضيل يوم الجمعة على يوم عرفة، وحكى القاضي أبويعلى رواية عن أحمد إن ليلة الجمعة أفضل من ليلة القدر. (معارف السنن: ٥/ ٤٢١، ط: سعيد).

وفي المسالك في شرح موطا مالك: فإن قيل: أى الأعوام أفضل؟ وأى الشهور أفضل؟ وأى الأيام أفضل؟ وأى الساعات أفضل؟ فالجواب أن يقال: أفضل الأعوام أن يقال عام تسع وهو حجة الوداع، وفيه استدار الزمان، وفيه قال الله تعالىٰ: اليوم أكملت لكم دينكم، الآية، وأما الشهور، فشهر رمضان؛ لأن فيه أنزل القرآن، وفيه الصوم، وفيه ليلة

القـدر ، وفيه تمهد الشرع وأما الأيام ، فيوم الجمعة لقوله صلى الله عليه وسلم: أفضل يوم طلعت عليه الشمس يوم الجمعة . (المسالک فی شرح موطا مالک:۴/ ۲۵۱).

عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت احادیث کی روشنی میں:

عن ابن عباس رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: ما العمل في أيام أفضل منها في هذه ، قالوا: ولا الجهاد قال: ولا الجهاد إلا رجل خرج يخاطر بنفسه وماله فلم يرجع بشيء . (صحيح البخاری : ۲/ ۲۰/ ۹۶۹).

وعن ابن عباس رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ما من أيام العمل الصالح فيهن أحب إلى الله من هذه الأيام العشر، فقالوا : يا رسول الله ولا الجهاد في سبيل الله ؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ولا الجهاد في سبيل الله إلا رجل خرج بنفسه وماله فلم يرجع من ذلک بشيء . (رواہ الترمذی :۳/ ۱۳۰/ ۷۵۷).

وعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ما من أيام أحب إلى الله أن يتعبد له فيها من عشر ذى الحجة يعدل صيام كل يوم منها بصيام سنة وقيام كل ليلة منها بقيام ليلة القدر . (رواہ الترمذی : ۳/ ۱۳۱/ ۷۵۸).

یومِ عرفہ کی فضیلت احادیث کی روشنی میں:

عن جابر رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:...وما من يوم أفضل عند الله من يوم عرفة ينزل الله إلى السماء الدنيا فيباهي بأهل الأرض أهل السماء فيقول: انظروا إلى عبادى شعثاً غبراً ضاحين جاؤوا من كل فج عميق يرجون رحمتى ولم يروعذابي فلم ير يوماً أكثر عتقاً من النار من يوم عرفة . إسناده صحيح . (صحيح ابن حبان : ۹/ ۱۶۴/ ۳۸۵۳).

وعن أبي قتادة الأنصارى رضي الله عنه ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، سئل عن صوم يوم عرفة فقال: يكفر السنة الماضية والباقية . (رواہ مسلم :۲/ ۸۱۹/ ۱۱۶۲).

عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ما من يوم أكثر من أن يعتق الله

فيه عبداً من النار، من يوم عرفة وأنه ليدنو، ثم يباهي بهم الملائكة . (رواه مسلم : ۹۸۲/۲).

رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی فضیلت احادیث کی روشنی میں:

عن عائشةؓ قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا دخل العشر، أحيا الليل وأيقظ أهله ، وجد وشد المئزر . (صحيح مسلم:۱۱۷۵/۸۲۹/۲).

وفيه : قالت عائشةؓ كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجتهد فى العشر الأواخر، ما لا يجتهد في غيره . (صحيح مسلم :۱۱۷۵/۸۲۹/۲).

وعن عائشةؓ قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجاور فى العشر الأواخر من رمضان ويقول: تحروا ليلة القدر في العشر الأواخر من رمضان . (صحيح مسلم:۴۷/۳).

لیلۃ القدر کی فضیلت احادیث کی روشنی میں:

عن أبي هريرة ﷺ، عن النبي صلى الله عليه وسلم ، قال: من صام رمضان إيماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه، ومن قام ليلة القدر إيماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه. (رواه البخارى : ۲۰۱۴/۴۵/۳).

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : أتاكم رمضان شهر مبارك فرض الله عزوجل عليكم صيامه ، تفتح فيه أبواب السماء ، وتغلق فيه أبواب الجحيم ، وتغل فيه مردة الشياطين ،لله فيه ليلة خير من ألف شهر، من حرم خيرها فقد حرم. (سنن النسائى : ۲۱۰٦/۱۲۹/۴، مطبوعات اسلاميه).

وعن سلمان قال: خطبنا رسول الله صلى الله عليه وسلم في آخر يوم من شعبان ، فقال: يا أيها الناس قد أظلكم شهر عظيم ، شهر مبارك ، شهر فيه ليلة خير من ألف شهر ...الخ. (صحيح ابن خزيمة : ۱۸۸۷/۹۱/۲).

یومِ جمعہ کی فضیلت احادیث کی روشنی میں:

عن أبي هريرة رضي الله عنه، أنـه سـمـع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: نحن الآخرون السـابـقـون يـوم الـقيامة، بيد أنهم أوتوا الكتاب من قبلنا ، ثم هذا يومهم الذي فرض عليهم فـاختـلـفـوا فيـه ، فهـدانـا الـلّـه، فالناس لنا فيه تبع اليهود غداً، والنصارى بعد غد . (صحيح البخاری: ۲/۲۲/۸۷۶).

وعـن أبـي هريرة رضي الله عنه، أن الـنبـي صـلـى الـلّـه عـليـه وسلم، قال: خير يوم طلعت عليه الشـمس يوم الجمعة ، فيه خلق آدم ، وفيه أدخل الجنة ، وفيه أخرج منها ، ولا تقوم الساعة إلا في يوم الجمعة . (صحيح مسلم : ۲/۵۸۵/۸۵۴).

وعـن عبد اللّٰه بن عمرو رضي الله عنه قـال: قـال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ما من مسلم يموت يوم الجمعة أو ليلة الجمعة إلا وقاه اللّٰه فتنة القبر . (سنن الترمذی: ۳/۳۷۸/۱۰۷۴).

وعـن أبي هريرة رضي الله عنه قـال: قـال رسـول الـلّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: اليوم الموعود يوم الـقيامة ، واليوم المشهود يوم عرفة ، والشاهد يوم الجمعة ، وما طلعت الشمس ولا غربت عـلـى يـوم أفـضـل مـنـه، فيه ساعة لا يوافقها عبد مؤمن يدعو اللّٰه بخير إلا استجاب اللّٰه له، ولايستعيذ من شيء إلا أعاذ اللّٰه منه . (سنن الترمذی: ۵/۴۳۶/۳۳۳۹). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

باب ...... ﴿۶﴾

ماہِ شعبان المعظم سے متعلق چند سوالات اور ان کے جوابات:

پہلے زمانہ میں ہمارے ہاں جنوبی افریقہ میں علمائے کرام اور حفاظ کی قلت تھی، اب الحمد للہ تعالیٰ علمائے کرام کی کثرت ہے، شعبان کے بارے میں مختلف علمائے کرام عوام کو الگ الگ باتیں بتلاتے ہیں۔ شعبان المعظم کا مہینہ شروع ہوتے ہی سوال وجواب اور بحث ومباحثہ کا بازار گرم ہوجاتا ہے، شعبان کے بارے میں جو سوالات وجوابات یا بحث ومباحثہ چلتا رہتا ہے، میں ان سوالات کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں امید ہے کہ تسلی بخش جوابات سے مطمئن فرمائیں گے:

ماہِ شعبان میں اعمال اُٹھائے جانے کا حکم:

سوال ۱: شعبان المعظم کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں لوگوں کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں؛ کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر صحیح ہو تو پیر وجمعرات کے بارے میں بھی سنا گیا ہے اور صبح اور عصر کے بارے میں بھی روایت سنی ہے۔ کیا یہ سب روایات صحیح ہیں یا بعض صحیح ہے اور بعض ضعیف ہے؟ اور ان میں کونسی بات صحیح ہے؟

الجواب: کتبِ حدیث کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ تینوں قسم کی روایات مروی ہیں، سب ثابت اور قابل استدلال ہیں؛ پہلی قسم کی وہ احادیث جن میں یہ بات موجود ہے کہ شعبان کے مہینہ میں اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے؛ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

عن أسامة بن زيد، قال: قلت: يا رسول الله! رأيتک تصوم في شعبان صوماً لا تصومه في شيء من الشهور، إلا في شهر رمضان؟ قال: ذلک شهر يغفل الناس عنه، بين رجب وشهر رمضان، ترفع فيه أعمال الناس، فأحب أن لا يرفع لي عمل إلا وأناْ صائم.

قال الشيخ محمد عوامة: رواه المصنف في مسنده (۱۶۶) بهذا الإسناد، ورواه أحمد(۵/۲۰۱)، مطولاً، والنسائي مختصراً (۲۶۶۶) من طريق ثابت بن قيس، عن أبي سعيد، عن أسامة بن زيد دون ذكر أبي هريرةؓ. وروى طرفاً آخر منه: النسائي (۲۶۶۸) من طريق زيد بن الحباب، به وفيه: عن أبى هريرة ؓ، عن أسامة، وإسناده حسن من أجل ثابت بن قيس. (مصنف ابن أبي شيبة مع التعليقات:۶/۳۳۷/۹۸۵۷،ط:المجلس العلمی).

قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: إسناده حسن. (التعليقات على مسند أحمد،رقم: ۲۱۸۰۱).

دوسری قسم؛ وہ روایت جس میں پیر وجمعرات کا تذکرہ موجود ہے: ملاحظہ ہو:

أخرج الإمام مسلم عن أبي هريرةؓ عن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم قال: تعرض أعمال الناس في كل جمعة مرتين يوم الاثنين ويوم الخميس فيغفر لكل عبد مؤمن إلا عبداً بينه وبين أخيه شحناء...الخ. (صحيح مسلم، رقم:۲۵۶۵،باب النهى عن الشحناء والتهاجر).

یہ روایت مختلف الفاظ کے ساتھ دیگر کتبِ احادیث میں بھی منقول ہے۔

تیسری قسم؛ وہ روایت جس میں روزانہ کی پیشی کا ذکر ہے: ملاحظہ ہو:

أخرج الإمام مسلم عن أبي موسىؓ قال: قام فينا رسول الله صلى الله عليه وسلم بأربع ان اللّٰه لا ينام ولا ينبغى له أن ينام يرفع القسط ويخفضه ويرفع إليه عمل النهار بالليل وعمل الليل بالنهار. (صحيح مسلم،رقم: ۱۷۹).

یہ روایت کئی کتبِ حدیث میں مذکور ہے۔

تینوں روایات کے مابین تطبیقات ملاحظہ کیجیے:

۱۔ بعض شراح فرماتے ہیں اعمال کی تفصیلی پیشی روزانہ ہوتی ہے، پھر اس کا خلاصہ ہفتہ واری پیر، جمعرات کو پیش ہوتا ہے، اور اجمالی پیشی ماہِ شعبان المعظم میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہفتہ میں دو دن: پیر، جمعرات میں ہفتہ کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے اور سال بھر کا خلاصہ شعبان میں پیش کیا جاتا ہے جیسے کوئی مالدار آدمی کسی ملازم

کوزکوٰۃ دینے کا وکیل بنادے تو جو روزانہ دیتا ہے وہ مخدوم کے سامنے روزانہ پیش کرتا ہے پھر ہفتہ میں دومرتبہ ہفتہ کا خلاصہ پیش کرتا ہے پھر سال بھر کی زکوٰۃ کا مجموعہ سال کے بعد پیش کرتا ہے۔

۲۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ انسانی اعمال کی مختلف قسمیں ہیں؛ تو ممکن ہے کہ بعض مخصوص اعمال کی پیشی سالانہ، ماہِ شعبان میں ہوتی ہو، اور کچھ خاص اعمال پیر و جمعرات میں پیش ہوتے ہوں، اور کچھ خاص نوعیت والے روزانہ پیش ہوتے ہوں۔مثلاً: ممکن ہے کہ نمازوں کی پیشی روزانہ ہو اور نفلی روزوں کی پیر، جمعرات کو ہو اور سال میں مہینوں کا خلاصہ ہو، کہ رمضان، شوال، ذی الحجہ، محرم، رجب وغیرہ کیسے گزرے۔

۳۔اعمال کی پیشی تین مرتبہ ہوتی ہے یومیہ، ہفتہ واری اور سالانہ اور ہر ایک پیشی میں خاص حکمت ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں۔مثلاً: یہ حکمت ہوسکتی ہے کہ اللہ والوں کی تعریف روزانہ اور ہفتہ وار اور سالانہ، بار بار ہوجائے اور شیطان کے پھندے میں گرفتار لوگوں کی مذمت بار بار ہوجائے جیسے کسی محسن کی تعریف روزانہ، ہفتہ وار اور سالانہ ہوتی ہے۔

۴۔ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یومیہ اعمال جمع کیے جاتے ہیں اور ہفتہ میں دودن: پیر و جمعرات کو پیش کیے جاتے ہیں۔

شراحِ حدیث کی عبارات ملاحظہ فرمائیں: ملاعلی قاریؒ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ شریف میں فرماتے ہیں:

تعرض الأعمال أى على الملك المتعال يوم الاثنين والخميس...فأحب أن يعرض عملي وأناْ صائم أى طلباً لزيادة رفعة الدرجة ، قال ابن الملك: وهذا لا ينافي قوله عليه الصلاة و السلام يرفع عمل الليل قبل عمل النهار و عمل النهار قبل عمل الليل للفرق بين الرفع والعرض لأن الأعمال تجمع فى الأسبوع وتعرض في هذين اليومين...قال ابن حجر: ولا ينافي هذا رفعها في شعبان فقال: إنه شهر ترفع فيه الأعمال وأحب أن يرفع عملي وأناْ صائم لجواز رفع أعمال الأسبوع مفصلة وأعمال العام مجملة ، قلت: وفيه إيماء إلى أن شعبان آخر السنة وإن أولها رمضان عند الله باعتبار الآخرة كما قدمناه في حديث تزخرف الجنة لرمضان من أول الحول والذي يلوح لي الآن أن ليلة النصف هي التي تعرض فيها

أعمال السنة الماضية (مرقاة المفاتيح :۴/۱۴۲ ،باب صيام التطوع).

قال السندي في حاشيته على المسند : قال الشيخ عزالدين : معنى العرض هنا: الظهور ، وذلک أن الملائكة تقرأ الصحف في هذين اليومين . وقال الشيخ ولي الدين: إن قلت: ما معنى هذا مع ماثبت فی الصحيحين ، إن اللّٰه تعالیٰ يرفع اليه عمل الليل قبل عمل النهار و بالعكس؟ قلت: يحتمل أن أعمال العباد تعرض على اللّٰه تعالیٰ كل يوم ، ثم تعرض عليه أعمال الجمعة في كل اثنين وخميس، ثم تعرض عليه أعمال السنة في شعبان ! فتعرض عرضاً بعد عرض، ولكل عرض حكمة يطلع عليها من يشاء من خلقه أو يستأثر بها عنده مع أنه تعالیٰ لا يخفى عليه من أعمالهم خافية ، ويحتمل أن الأعمال تعرض فی اليوم تفصيلاً ، ثم فی الجمعة أو بالعكس ، انتهى. (تعليقات الشيخ شعيب على سنن ابی داود: ۷/ ۲۷۶/ ۴۹۱۶).

و فی المرقاة للملا علي القارى : و لا ينافيه رفعها كل يوم أعمال الليل بعد صلاة الصبح وأعمال النهار عند صلاة العصر و كل يوم اثنين وخميس لأن الأول رفع عام لجميع ما يقع فی السنة والثاني: رفع خاص لكل يوم وليلة ، والثالث : رفع لجميع ما يقع فی الأسبوع وكان حكمة تكرير هذا الرفع مزيد تشريف الطائعين وتقبيح العاصين . (مرقاة المفاتيح :۳/۹۷۴ ، باب قيام شهر رمضان). واللّٰه سبحنه وتعالیٰ أعلم بالصواب .

پندرہویں شعبان کی رات میں موت وحیات کے فیصلے کے متعلق تحقیق:

سوال نمبر۲؛ شعبان کے بارے میں یہ سنا ہے کہ شعبان میں یا شعبان کی پندرہویں رات میں یہ لکھا جاتا ہے کہ کون اس سال کے آخر تک زندہ رہے گا اور کس کا انتقال ہوگا، کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: جمہور مفسرین کے نزدیک تقدیر کے فیصلے شبِ قدر میں انجام پاتے ہیں، اور صحیح احادیث بھی اسی کی طرف مشیر ہیں، اور شبِ قدر ماہِ رمضان المبارک میں ہوتی ہے، لیکن بعض احادیث میں شبِ براءت

میں ان امور کے انجام پانے کا ذکر آیا ہے تو علمائے کرام نے مختلف توجیہات اور تطبیقات بیان فرمائی ہیں؛ چند حسبِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

۱۔ تقدیر کے فیصلے کائنات کی تخلیق سے ۵۰ ہزار سال پہلے ہو چکے ہیں، لیکن ایک سال کے لیے فیصلے پندرہویں شعبان میں اجمالاً الگ کر کے اور لیلۃ القدر میں تفصیلاً الگ کر کے فرشتوں کے حوالے کیے جاتے ہیں۔

۲۔ پندرہویں شعبان میں اِن امور کے فیصلے ہوتے ہیں اور ان کے دستاویز شبِ قدر میں فرشتوں کے سپرد کیے جاتے ہیں۔

۳۔ شبِ براءت میں موت وحیات وارزاق کے فیصلے ہوتے ہیں اور شبِ قدر میں دیگر خیر وبرکت اور سلامتی والے امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔

۴۔ شبِ براءت میں موت وحیات کے فیصلے ہوتے ہیں اور شبِ قدر میں اظہارِ دین اور مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کے فیصلے ہوتے ہیں۔

۵۔ شبِ براءت میں دنیوی امور کے اور شبِ قدر میں اُخروی امور کے فیصلے ہوتے ہیں، یا اس کے برعکس۔

۶۔ شبِ براءت میں لوحِ محفوظ سے نقل کی ابتدا ہوتی ہے اور شبِ قدر میں اختتام ہوتا ہے۔

۷۔ شبِ قدر میں تقدیر کے فیصلے کے بارے میں آیات اور احادیث ظاہر اور مشہور ہونے کی بنا پر لیلۃ البراءت والی روایات پر راجح اور قرآنِ کریم کے موافق ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**إنا أنزلناه في ليلة مباركة إنا كنا منذرين، فيها يفرق كل أمر حكيم، أمراً من عندنا، إنا كنا مرسلين**﴾، اس آیت میں قرآنِ کریم کا نزول لیلۃ مبارکۃ میں بیان کیا گیا اور دوسری آیت میں ﴿**شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن**﴾ میں قرآنِ کریم کا نزول رمضان میں ہے اور اس میں ﴿**فيها يفرق كل أمر حكيم**﴾ آیا ہے، یعنی سالانہ فیصلے الگ کیے جاتے ہیں۔

شبِ براءت سے متعلق چند احادیث درجِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

مسند ابی یعلی الموصلی میں روایت ہے:

ا ــ عن أبي هريرة ﷺ : أن عـائشة رضـي الـلّـه تعالىٰ عنها حدثتهم أن النبي صلى اللّٰه عـليـه وسـلـم كـان يـصـوم شـعبان كله قالت: قلت: يارسول اللّٰه ! أحب الشهور إليک أن تـصـومـه شـعبـان قال: إن اللّٰه يكتب على كل نفس ميتة تلک السنة فأحب أن يأتيني أجلي وأناْ صائم . (مسـند ابی يعلی :۸/۱۱۱/۳۱۱/۴۹۱۱). وبهـا مشـه قال حسين سليم أسد : إسناده ضعيف؛ لـضـعف سـويـد بـن سعيد ، وطريف هو ابن دفاع ترجمه البخاری فی التاريخ: ۴/۳۵۶، ولم يورد فيه لا جـرحـاً ولا تـعـديلاً ، وتبـعـه عـلـى ذلک ابـن أبی حاتم فی الجرح التعديل: ۴/۴۹۴، ونقل الذهبی عن الـعـقيـلـی أنـه ليـنـه ، ووثـقـه ابـن حبـان. وذكره الهيثمی فی مجمع الزوائد:۳/۱۹۲ ، وقال : قلت: فی الـصـحيـح طـرف مـنـه ، رواه أبويعلى، وفيه مسلم بن خالد الزنجي، وفيه كلام وقد وثق ، والحديث فی الـمـقـصـد الـعـلـى بـرقم : (۵۴۰) وانظر: الأحاديث: ۴۶۳۳، ۴۷۵۱، ۴۸۶۰). ومع هذا كله حسن إسناده المنذی فقال: رواه أبويعلى، وهو غريب ، وإسناده حسن. (۲/۷۹).

۲ــ فـي ليـلـة الـنـصف مـن شعبان يوحی اللّٰه إلى ملک الموت بقبض كل نفس يريد قبضها فی تلک السنة . أخرجه الدينوري فی المجالسة عن راشد بن سعد مرسلاً . حديث ضعيف . (الجامع الصغير، رقم: ۵۹۶۴).

۳ــ أخـرج الـخـطيب في تاريخه (۴/۴۳۶/۲۳۳۹) قال اخبرنا محمد بن أحمد بن رزق (ثـقة)، حـدثـنا أبوالحسين عبد الصمد بن على بن محمد(ثقة) حدثنا أحمد بن محمد بـن حـمـيـد الـمقری(ليس بالقوی) حدثنا أبوبلال الأشعری (ضعيف) حدثنا عامر بن سياف اليـمـامـی(مـخـتـلف فيـه) عـن يـحيی بن أبی كثير(ثقة، يدلس) عن أبي سلمة عن عائشةؓ أم الـمؤمنين قالت: كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يصوم شعبان كله حتى يصله برمضان ولم يكن يصوم شهراً تاماً إلا شعبان فإنه كان يصومه كله، فقلت يارسول اللّٰه! إن شعبان لمن أحب الشهور إليک أن تصومه فقال: نعم ، يا عائشة إنه ليس نفس تموت في سنة إلا كتبت أجلها في شعبان وأحب أن يكتب أجلي وأنا في عبادة ربي وعمل صالح .

۴ ــ قـال عـطـاء بـن يسـار: إذا كـانت ليلة النصف من شعبان دفع إلى ملک الموت

صحيفة فيقال: اقبض في هذه السنة من في هذه الصحيفة قال: فإن العبد ليغرس الغراس وينكح الأزواج ويبني البنيان وأن اسمه في تلك الصحيفة وهو لا يدري . (إحياء علوم الدين:۲/۱۷۲، والدرالمنثور:۷/۴۰۲، وإسناده مرسل ضعيف، وحسن البيان،ص۲۳،وعبدالرزاق في مصنفه ۷۹۲۵، وفيه رجل مجهول).

۵ ـ عن عطاء بن يسار قال: لم يكن رسول الله صلى الله عليه وسلم في شهر أكثر صياماً منه في شعبان، وذلك أنه تنسخ فيه آجال من يموت في السنة . (مصنف ابن أبي شيبة ۹۸۵۷/۳۳۷/۶). قال الشيخ محمد عوامة: هذا حديث مرسل، وفيه يزيد بن هارون، وهو ممن روى عن المسعودى بعد اختلاطه...وقد روى عبد الرزاق (۷۹۲۵) عن ابن عيينة ، عن مسعر، عن رجل، عن عطاء بن يسار موقوفاً عليه ، قال: تنسخ فى النصف من شعبان الآجال ... وفيه : الرجل المبهم ، ومثله لا يقال بالرأى ، وفى الباب أحاديث وآثار أخرى تنظر أول تفسير سورة الدخان من الدر المنثور [۷/۳۹۹ ـ ۴۰۵،ط:دارالفكر]. (التعليقات على المصنف لابن أبي شيبة: ۶/۳۳۷، ط:المجلس العلمى).

روح المعانی میں علامہ آلوسیؒ نے تطبیق فرمائی ہے؛

قال بعض الأجلة كون التقدير في هذه الليلة يشكل عليه قول كثير إنه ليلة النصف من شعبان وهي المراد بالليلة المباركة التي قال الله تعالىٰ :﴿ فيها يفرق كل أمر حكيم ﴾ و أجاب بأن ههنا ثلاثة الأول: نفس تقدير الأمور أى تعيين مقاديرها وأوقاتها وذلك فى الأزل و الثاني إظهار تلك المقادير للملائكة عليهم السلام بأن تكتب فى اللوح المحفوظ وذلك في ليلة النصف من شعبان والثالث: إثبات المقادير في نسخ وتسليمها إلى أربابها من المدبرات فتدفع نسخة الأرزاق والنباتات والأمطار إلى ميكائيل عليه السلام ونسخة الحروب والرياح والجنود والزلازل والصواعق والخسف إلى جبريل عليه السلام ونسخة الأعمال إلى إسرافيل عليه السلام ونسخة المصائب إلى ملك الموت وذلك في ليلة القدر وقيل: يقدر في ليلة النصف الآجال والأرزاق وفي ليلة القدر الأمور التي فيها الخير

والبركة والسلامة وقيل: يقدر في هذه ما يتعلق به إعزاز الدين وما فيه النفع العظيم للمسلمين وفي ليلة النصف يكتب أسماء من يموت ويسلم إلى ملك الموت والله تعالىٰ أعلم بحقيقة الحال . (روح المعاني:۳۰/۱۹۲. وكذا في السراج المنير : ۴/۶۱۶،ط: دارالكتب العلمية بيروت).

وروى أبو الضحى عن ابن عباس ﷺ إن الله عزوجل يقضى الأقضية في ليلة النصف من شعبان ويسلمها إلى إربابها في ليلة القدر . (الكشف والبيان : ۱۰/۲۴۸). **وفى السراج المنير : وهذا يصلح أن يكون جمعاً بين القولين في قوله تعالىٰ: ﴿ فيها يفرق كل أمر حكيم﴾ فإنه قيل فيها : إنها ليلة النصف من شعبان، وقيل: ليلة القدر وحينئذٍ لا خلاف .** (وكذا في تفسير السراج المنير:۳/۴۱۴).

وفيه أيضاً : وروى: أن الله تعالىٰ أنزل القرآن من اللوح المحفوظ في ليلة البراء ة ووقع الفراغ في ليلة القدر. (السراج المنير:۳/۴۵۹).

شیخ عبداللہ بن محمد بن الصدیق الغماری۸،احادیث نقل کرنے کے بعد تطبیق فرماتے ہیں:

ولك أن تسلك طريقة الجمع بما رواه أبوالضحى عن ابن عباسؓ قال: إن الله يقضى الأقضية في ليلة النصف من شعبان ويسلمها إلى إربابها في ليلة القدر، وحاصل هذا يقضي ما يشاء فى اللوح المحفوظ ليلة النصف من شعبان فإذا كان ليلة القدر سلم إلى الملائكة صحائف بما قضاه فيسلم إلى ملك الموت صحيفة الموتى وإلى ملك الرزق صحيفة الأرزاق و هكذا كل ملك يتسلم ما نيط به، وفي قوله تعالىٰ :﴿ فيها يفرق كل أمر حكيم ﴾ أشار إلى هذا والله أعلم حيث قال: يفرق و لم يقل يقضي أو يكتب والفرق: التمييز بين الشيئين فالآية تشير إلى أن المقضيات تفرق ليلة القدر بتوزيعها على الملائكة الموكلين بها، أما كتابتها وتقديرها فهو حاصل في ليلة نصف شعبان كما فى الأحاديث المذكورة وبهذا يجمع شمل الأقوال المتضاربة في هذا الباب ويرأب صدعها والحمد لله

رب العلمین . (حسن البیان فی لیلۃ النصف من شعبان ص ۲۰. ۲۴، ط: عالم الکتب).

امام فخر الدین رازیؒ اپنی مشہور تفسیر میں لکھتے ہیں:

قیل: ألیس أنه قد روی أنه یقسم الآجال والأرزاق لیلة النصف من شعبان ، والآن تقولون : إن ذلک یکون لیلة القدر؟

قلنا: عن النبي صلى الله علیه وسلم أنه قال: إن الله یقدر المقادیر في لیلة البراء ة ، فإذا کان لیلة القدر یسلمها إلى أربابها، وقیل: یقدر لیلة البراء ة الآجال والأرزاق ولیلة القدر یقدر الأمور التي فیها الخیر والبرکة والسلامة ، ... (التفسیر الکبیر: ۱/ ۴۸۰۱، دار احیاء التراث العربی).

وللمزید راجع : (التفسیر المظهری ،وروح المعانی ،والتفسیر الکبیر ،والسراج المنیر). **واللہ ﷻ اعلم۔**

پندرہویں شعبان کے روزے کو بدعت کہنے کا حکم:

سوال نمبر۳: ہر مہینہ میں تین دن کے روزے کے بارے میں تو علمائے کرام سے سنا ہے کہ متعدد احادیث میں اس کا ذکر ہے لیکن اگر کوئی صرف ۱۵ شعبان کا روزہ رکھ لے تو یہ مستحب میں شمار ہوگا یا بدعت میں؟ **بینوا بالتفصیل توجروا بالأجر الجزیل .**

الجواب: اکثر اکابر علمائے کرام نے ابن ماجہ شریف کی روایت کی بنا پر ۱۵ شعبان کے روزے کو مستحب قرار دیا ہے، اگرچہ محدثین کے ہاں یہ روایت انتہائی ضعیف ہے، لیکن موضوع نہیں ہے، البتہ اس کو سنت کا درجہ دینا درست نہیں اور بدعت کہنا بھی صحیح نہیں۔

پندرہ شعبان کے روزے کے استحباب پر اکابر علما کی تصریحات:

ہمارے اکابر علماء نے بھی پندرہ شعبان کے روزے کو مستحبات میں شمار فرمایا ہے۔ چنانچہ چند حضرات کی عبارات ملاحظہ کیجئے:

(۱) حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ مفتی اعظم ہند نے بھی اس روزہ کو مستحبات میں شمار کیا ہے۔

ملاحظہ ہو تعلیم الاسلام میں فرماتے ہیں:

سوال: مستحب کون سے روزے ہیں؟

جواب: فرض اورواجب اورسنت روزوں کے بعد تمام روزے مستحب ہیں۔لیکن بعض روزے ایسے ہیں کہ اُن میں ثواب زیادہ ہے جیسے شوال میں چھ روزے، ماہِ شعبان کی پندرہویں تاریخ کا روزہ...الخ۔(تعلیم الاسلام، چوتھا حصہ، ص ۱۸۷، ط: مکتبۃ البشریٰ)۔

(۲) حضرت مفتی عزیز الرحمٰن سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے بھی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مستحب فرمایا ہے:

الجواب:...البتہ یہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ شعبان کی پندرہویں شب کو بیدار رہ کر عبادت میں مشغول رہو اور پندرہویں تاریخ کا روزہ رکھو، پس پندرہویں تاریخ شعبان کا روزہ مستحب ہے، اگر کوئی رکھے تو ثواب ہے اور نہ رکھے تو کچھ حرج نہیں فقط۔(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۶/۵۰۰، مدلل مکمل)۔

(۳) بہشتی زیور میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

شبِ برات کی اتنی اصل ہے کہ پندرہویں رات اور پندرھواں دن اس مہینے کا بہت بزرگی اور برکت کا ہے، ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کو جاگنے کی اور اس دن کو روزہ رکھنے کی رغبت دلائی ہے اور اس رات میں ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے قبرستان میں تشریف لے جا کر مردوں کے لیے بخشش کی دعا مانگی ہے۔(بہشتی زیور، چھٹا حصہ، ص ۶۰، ط: دارالاشاعت)۔

دوسری جگہ ’’دین کی باتیں‘‘ میں مرقوم ہے:

شبِ برات کی پندرہویں اور عید کے مہینہ میں چھ دن نفل روزے رکھنے کا بھی بہت زیادہ ثواب ملتا ہے۔(خلاصہ بہشتی زیور، ص ۲۱۲)۔

(۴) حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحبؒ نے عمدۃ الفقہ میں مستحب روزے کے تحت حدیث نقل فرمائی ہے۔ملاحظہ ہو:

(مستحب روزے) نمبر (۸) ماہِ شعبان کے روزے...حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ماہِ شعبان کا نصف ہو تو اس کی رات کو قیام کرو اور اس کے دن میں روزہ رکھو، الحدیث، اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ (عمدۃ الفقہ :۳/ ۱۸۷)۔

(۵) فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند وسہارنپور کا فتویٰ:

سوال: ہمارے یہاں گزشتہ سال پندرہویں شعبان کا روزہ نہیں رکھا گیا اور کہا گیا کہ یہ روزہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ کیا یہ صحیح ہے۔ علاوہ ازیں اس روزہ کو بدعت قرار دیتے ہیں، کیا فضائل میں ضعیف حدیثوں کا اعتبار ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً: **عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا نهارها، فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا ، فيقول : ألا من مستغفر لي فأغفرله ، ألا مسترزق فأرزقه، ألا مبتلى فأعافيه ألا كذا، ألا كذا حتى يطلع الفجر. رواه ابن ماجه . مشكاة شريف: ص ١١٥ .** ابن ماجہ میں یہ روایت صفحہ ۱۰۰ پر ہے۔

سند کے اعتبار سے یہ روایت ضعیف ہے، فضائل اعمال میں ضعیف حدیث سے استدلال درست ہے:

ويجوز عند أهل الحديث وغيرهم التساهل فى الأسانيد و رواية ما سوى من الضعيف والعمل به من غير بيان ضعفه في غير صفات الله تعالىٰ والأحكام كالحلال والحرام وغيرهما، ذلک كالقصص وفضائل الأعمال والمواعظ وغيرهما مما لا تعلق له بالعقائد والأحكام. (تدريب الراوى ، ص ٩٢).

پس اس روزہ کو بدعت کہنا درست نہیں جبکہ اس کے متعلق حدیث شریف موجود ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ محمودیہ:۳،۲۰۳-۲۰۴)۔

(۶) شیخ عبدالحق محدثِ دہلویؒ نے بھی اس روزہ کو ثابت مانا ہے اور ابن ماجہ کی روایت سے استدلال فرمایا ہے۔ چنانچہ ماثبت بالسنہ میں فرماتے ہیں: **المقالة الثالثة في قيام ليلة النصف من شعبان وصيام يومها أو ما ثبت فيها الأدعية والأذكار: عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى**

اللّٰــه علیــه وسـلـم: إذا کــان لیـلة الـنـصف مـن شعبـان فقوموا لیلهـا و صوموا یومهـا . الحدیث...(ماثبت بالسنة ، ص ۳۵۸ـ۳۶۳).

(۷)اسلامی فقہ میں ہے:

شعبان کی ۱۵/ تاریخ کواور شوال کے مہینہ میں چھ روزے رکھنا بھی سنت ہے،شعبان کی پندرھویں تاریخ کوروزہ رکھنے اور پندرھویں رات کوعبادت کرنے اورقبرستان جاکر مردوں کے لیے دعائے مغفرت کرنے کا بھی ذکرحدیث میں ہے۔(اسلامی فقہ:۱/ ۴۱۷).

(۸) مفتی تقی صاحب تحریرفرماتے ہیں: پندرھویں شعبان کے روزے کے استحباب پرعلمائے کرام کی تصریحات۔حکیم الامت مجددالملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں: پندرھویں تاریخ شعبان کوروزہ رکھنامستحب ہے۔(زوال السنۃ:ص۱۰).

(۹) حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بھی اس کو پندرھویں شعبان کے مسنون اعمال میں شمارفرمایا،یعنی اس کی صبح کوروزہ رکھنامستحب ہے۔

(۱۰)علامہ قطب الدین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مشکوٰۃ شریف کی شرح مظاہرحق :۲/ ۳۶۴، پرباب صیام التطوع میں پندرھویں شعبان کاروزہ بھی شمارفرمایا ہے۔(ملخص از رسالہ: شب براءت کی حقیقت :ص۷۴ـ۷۷، ازمفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ)۔

فقہائے مالکیہ کے نزدیک پندرہ شعبان کے روزے کاحکم:

وفي شـرح الصغیرعلی أقرب المسالک للشیخ الدردیر المالکي مع حاشیة الصاوی:

وندب صوم یوم النصف من شعبان. (شرح الصغیر: ۱/ ۲۹۲، باب الصوم).

یعنی شیخ دردیر مالکیؒ نے پندرھویں شعبان کاروزہ مستحب قراردیاہے۔

وفـي حـاشیة البـناني: وزاد ابن یونس یوم النصف من شعبان فتصیر الأیام المرغب فیها ثمانیة . (حاشیة البناني علی هامش شرح الزرقاني: ۲/ ۳۵۰).

وفی الخلاصة الفقهیة : کم هی مندوبات الصوم وماهی ...۲۲ وصوم یوم النصف

من شعبان لمن اراد الاقتصار على هذا اليوم ... (الخلاصة الفقهية على مذهب السادة المالكية: ١٩١).

وفی فقه العبادات :(من المندوبات) صوم يوم النصف من شهر شعبان. (فقه العبادات على المذهب المالكی،٣٢٣).

فقہائے شافعیہ کے نزدیک پندرہ شعبان کے روزے کا حکم:

فتاویٰ رملی میں اس دن کے روزے کو سنت کہا ہے اور حدیث کو قابل حجت بتایا ہے:

(سئل) عن صوم منتصف شعبان كما رواه ابن ماجه عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم أنه قال: إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا نهارها، هل هو مستحب أولا وهل الحديث صحيح أولا وإن كان ضعيفاً فمن ضعفه ؟ فأجاب: بأنه يسن صوم نصف شعبان بل يسن صوم ثالث عشره ، و رابع عشره وخامس عشره ، والحديث المذكور يحتج به . (فتاوى الرملی: ٢/٧٩).

شیخ ابن حجر الہیتمی الفتاوی الفقہیۃ الکبری میں سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

فأجاب: وأما صوم يومها فهو سنة من حيث كونه من جملة الأيام البيض لا من حيث خصوصه والحديث المذكور ضعيف . (الفتاوى الفقهية الكبرى: ٢/٨٠).

تحفۃ المحتاج کے حاشیہ میں شیخ احمد بن قاسم العبادی لکھتے ہیں:

وما ذكروه معها ما إذا طلب صومه في نفسه كيوم النصف من شعبان . (حاشية تحفة المحتاج: ٣/٤٥٠).

فقہائے حنابلہ کے نزدیک پندرہ شعبان کے روزے کا حکم:

قال في" الإنصاف" قال فی الفروع: لم يذكر أكثر الأصحاب استحباب صوم رجب وشعبان، واستحسنه ابن أبي موسى في الإرشاد، قال ابن الجوزی في كتاب أسباب الهداية : يستحب صوم الأشهر الحرم...وجزم به فی المستوعب، وقال: آكد شعبان يوم

النصف،... (الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف :۳/۳۴۷ . وكذا فی الفروع:۵/۹۸).

شیخ مرداوی حنبلی نے اپنی کتاب "الإنصاف" میں تحریر فرمایا ہے کہ شیخ ابن جوزی نے "المستوعب" میں لکھا ہے کہ شعبان کے روزوں میں پندرھویں شعبان کا روزہ زیادہ مؤکد ہے۔

وقال ابن رجب الحنبلي في لطائف المعارف: وأما صيام يوم النصف منه فغير منهى عنه فإنه من جملة أيام البيض الغر المندوب إلى صيامها من كل شهر وقد ورد الأمر بصيامه من شعبان بخصوصه ففي سنن ابن ماجه بإسناد ضعيف عن علي ... (لطائف المعارف، ص ۱۳۶).

حافظ ابن رجب حنبلیؒ نے فرمایا کہ پندرھویں شعبان کے روزے کا حکم خصوصیت سے آیا ہے۔ مذکورہ بالا نقولِ فقہاء سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے ہاں مستحب ہونے کی تصریح موجود ہے۔

فقہ حنفی میں متقدمین کی کتب میں کسی مسئلہ کی تصریح نہ ہو اور دیگر مذاہب میں ہو تو متأخرین فقہائے احناف کا اصول:

جب کوئی مسئلہ فقہ حنفی کی کتب میں مصرح نہیں ہوتا اور دیگر مذاہب میں مصرح ہوتا ہے اور وہ فقہ حنفی کے اصول کے عین موافق ہوتا ہے تو ہمارے فقہائے احناف دیگر مذاہب سے مسئلہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وقواعدنا لا تأباه، كما قال ابن نجيمؒ في البحر: ولم أر من صرح بهذا من ائمتنا لكني رأيته في كتب الشافعية وقواعدنا لا تأباه . (۱/۱۷۴، باب المسح على الخفين) اسی طرح علامہ شامیؒ اور علامہ طحطاویؒ وغیرہ فقہاء نے بھی کئی مقامات پر یہ جملہ فرمایا ہے۔ راجع: (فتاوی الشامی وحاشیۃ الطحطاوی ومجمع الانہر، واللباب وغیرہ من کتب الفقہ)۔

سنن ابن ماجہ کی حدیث اور اس پر کلام ملاحظہ ہو:

عن علي بن أبي طالب ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها و صوموا نهارها، فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا ، فيقول: ألا من مستغفر لي فأغفر له ، ألا مسترزق فأرزقه، ألا مبتلى فأعافيه

ألا كـذا، ألا كـذا حتى يطلع الفجر. (رواه ابـن مـاجة: ص ۹۹، بـاب مـاجـاء فى ليلة النصف من شعبان. والبيهقى فى شعب الايمان: ۳۸۲۲/۳/۳۷۸،ماجاء فى ليلة النصف من شعبان).

پورے ذخیرۂ احادیث میں صرف ایک حدیث موجود ہے جس سے ۱۵ شعبان کے روزہ کا پتہ چلتا ہے، لیکن اس حدیث پر محدثین نے بہت کچھ کلام فرمایا ہے، مستقل رسائل بھی تحریر فرمائے ہیں اس کے باوجود اس کو موضوع نہیں کہا جاسکتا۔

اس روایت کی سند میں ایک راوی ابوبکر بن ابی سبرہ پر کلام ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ملاحظہ کیجیے:

ابوبکر بن ابی سبرہ ضعیف ہیں اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ امام بخاریؒ نے فقط ضعیف فرمایا ہے، اور امام احمد بن حنبلؒ نے واضع الحدیث بتلایا لیکن امام احمد بن حنبلؒ کا زمانہ بہت بعد کا ہے، اس لیے شاید ان کے بارے میں صحیح حالات کا علم نہیں ہوسکا، ورنہ اکثر ائمہ نے فرمایا کہ وہ اسلامی سلطنت کے تین بڑے عظیم الشان شہر: مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور عراق کے مفتی وقاضی تھے، بنابریں واضع الحدیث کہنا بعید از عقل ہے کیونکہ تین بڑے شہروں کا قاضی اور مفتی کیا فاسق وفاجر ہوگا؟

ثقہ اس کو کہتے ہیں کہ احکامِ شریعت کو اپنے اوپر نافذ کرے اور قاضی وہ ہے جو احکامِ شریعت لوگوں پر نافذ کرے اور قاضی کی شرائط وصفات میں ہے کہ گناہِ کبیرہ سے بچنے والا ہو اور صغیرہ پر مصر نہ ہو، اور جو شخص واضع الحدیث ہوگا وہ تو مرتکبِ حرام ہوگا جس کا شمار فساق کے زمرہ میں ہوگا بھلا ایسا شخص بھی عہدۂ قضا کا اہل ہوسکتا ہے؟ بلکہ قاضی اور مفتی کے الفاظ خود توثیق پر دلالت کرتے ہیں۔

ہاں ضعف کی وجہ یہ ہے کہ حدیث بیان کرنا ان کا شغف نہیں تھا اکثر وبیشتر قضا وافتاء کے کاموں میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کو ضعیف کہا جیسا کہ امام حفص بن سلیمان کو بھی واضع الحدیث کہا گیا (دیکھئے: تہذیب الکمال: ۱۵/۷) لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ان کا شغف قراءت کے ساتھ زیادہ تھا اس وجہ سے ضعیف کہنا درست ہے۔ بہر حال ابن ابی سبرہ کو ضعیف کہنا درست ہے واضع الحدیث کہنا بہت بعید ہے۔

پھر بعض محدثین نے بعض راویوں کو واضع الحدیث کہا ہے لیکن دیگر بعض نے توثیق بھی کی ہے، ایسے راویوں کی روایت ہمارے اکابرؒ نے قبول کی ہے، یعنی بعض حضرات کے کسی راوی کو واضع الحدیث کہنے کا اعتبار

نہیں کیا جب کہ واضع الحدیث ہونے کی صحیح اور معقول وجہ بیان نہ کی گئی ہو جیسے محمد بن اسحاق کو امام مالکؒ نے **دجال من الدجاجلہ** کہا لیکن ان کی روایت کو قبول کیا ہے۔اسی طرح امام حفص بن سلیمان کی قراءت وروایت مقبول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابوبکر بن ابی سبرہ کی روایت مقبول ہوگی ہاں ضعیف کہہ سکتے ہیں موضوع کہنا درست نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو شمس الدین ذہبیؒ تاریخ الاسلام میں فرماتے ہیں:

أبوبكر بن عبد اللّٰه بن محمد بن أبي سبرة ، القرشي ، السبرى المدني، الفقيه ، قاضى العراق ، سمع : عبد الرحمن بن هرمز الأعرج ، وعطاء بن ابى رباح ،وزيدبن اسلم ، و شريک بن ابى نمر ، وطائفة ، وعنه : ابن جريج مع تقدمه ، وأبوعاصم ، والواقدى و عبد الرزاق ، وغيرهم ،ضعفه البخارى وغيره ...وقال أبوداود: كان مفتى أهل المدينة . و روى عباس عن ابن معين قال: ليس حديثه بشيء ، قدم ههنا فاجتمع عليه الناس فقال: عندى سبعون ألف حديث ، إن أخذتم عني كما أخذ ابن جريج ...وروى معن ، عن مالکؒ قال لي أبوجعفر المنصور: يا مالک ، من بقي بالمدينة من المشيخة (مشیخہ کا مطلب مقتدیٰ ہے تو کیا واضع الحدیث کو اہل مدینہ نے مقتدیٰ بنالیا تھا) **قلت: ابن أبي ذئب ، وابن أبي سلمة الماجشون ، وابن أبي سبرة ، و قال النسائى : متروک الحديث ... و قال : ابن سعد : أنا محمد بن عمر ، سمعت أبابكر بن أبي سبرة يقول : قال لي ابن جريج : اكتب لي أحاديث من أحاديث جياد، فكتبت له ألف حديث ثم دفعتها إليه ، ما قرأ ها علي، ولا قرأ تها عليه . وقال أحمد : قال لي حجاج قال لي ابن أبي سبرة : عندي سبعون ألف حديث فى الحلال و الحرام ... قال مصعب الزبيرى : كان من علماء قريش ولاه المنصور القضاء . وقال ابن سعد : مات سنة اثنتين وستين ومائة ببغداد ...وولى قضاء مكة لزياد بن عبيد اللّٰه ... الخ .** (تاريخ الاسلام : ۱۰/۵۳۵۔۵۳۷، دارالكتاب العربى).

وينظر للاستزادة : (تاريخ بغداد :۱۴/۳۶۷۔۳۷۱،ط: دارالكتب العلمية بيروت، و

مختصر تاریخ دمشق :۸/۲۹۴. ۲۹۶ ،وتاریخ الإسلام للذهبی و الوافی بالوفیات،والطبقات الكبری لابن سعد : ۱/۴۵۸،ط: مكتبة العلوم والحكم ،وتهذیب الكمال للامام المزی : ۳۳/ ۱۰۲. ۱۰۸).

وقال فی تاریخ بغداد وتاریخ دمشق : وكان كثیر العلم والسماع والروایة . (تاریخ دمشق:۸/۲۹۴،وتاریخ بغداد: ۱۴/ ۳۶۹،ط: مؤسسة الرسالة).

بعض ائمہ کو امام احمد بن حنبلؒ کے واضع الحدیث کہنے سے اتفاق نہیں ہے اسی وجہ سے انہوں اس کا تذکرہ نہیں کیا صرف توثیق کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو تکملۃ الاکمال میں ہے:

وأبوبكر عبد اللّٰه بن أبي سبرة بن أبي رهم بن عبد العزى مفتى أهل المدينة حدث عن إسحاق بن عبد الله بن أبى فروة و شریک بن عبد اللّٰه بن أبى نمر و محمد بن عبد الرحمن ابن أبي ذئب روى عنه وعبد الرزاق بن همام و قال عباس الدورى سمعت يحيى بن معين يقول : أبوبكر بن ابى سبرة الذى يقول له السبرى هومدنى ليس حديثه بشيء وقال أبوعبيد محمد بن على الآجرى سألت أباداود يعنى السجستانى عن أبى السبرى فقال هو أبوبكر بن أبي سبرة مفتى أهل المدينة . (تكملة الإكمال لأبي بكر محمد بن عبد الغنى البغدادى : ۳/۲۸۶).

حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے سیر اعلام النبلاء میں مفصل حالات ذکر کیے ہیں۔ ابتدا میں فرماتے ہیں:

الفقيه الكبير قاضى العراق ...ضعف من قبل حفظه . یعنی حدیث کے ساتھ زیادہ شغف نہ ہونے کی وجہ سے حدیث میں کمزور تھے اور اس کی تائید امام بزار کے قول سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے لین الحدیث فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (سیر أعلام النبلاء : ۷/۳۳۰. ۳۳۲،ط: مؤسسة الرسالة).

دیگر ائمہ حدیث نے بھی اس روایت کی تخریج فرمائی ہے اور موضوع نہیں فرمایا:

۱۔تہذیب الکمال میں امام مزیؒ نے بھی مفصل حالات تحریر کیے ہیں اور پندرہ شعبان کے روزے والی روایت بھی اپنی سند سے نقل فرمائی ہے اور کوئی کلام بھی نہیں فرمایا،معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی یہ روایت موضوع نہیں۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (تہذیب الکمال:۳۳/۱۰۲۔۱۰۸)۔

۲۔ نیز امام محمد بن اسحاق ابوعبداللہ الفاکہی (م ۵ ۲۷ ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب " أخبار مكة " (رقم: ۱۸۳۷) میں یہ روایت اپنی سند سے نقل فرمائی ہے اور موضوع نہیں کہا۔

۳۔ نیز امام یحییٰ بن الحسین الشجری نے " الأمالي الشجرية" (ص ۲۳۷) پر یہ روایت نقل فرمائی ہے اور کوئی کلام نہیں فرمایا۔

علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں فقط ضعیف کہا ہے، اسی طرح تخریج الاحیاء میں حافظ عراقیؒ نے بھی ضعیف کہا ہے، امام شوکانیؒ نے بھی الفوائد المجموعہ (ص ۵۱) پر ضعیف کہا ہے، شیخ محمد طاہر پٹنی نے بھی ضعیف کہا ہے، یعنی ان محدثین میں سے کسی نے اس روایت کو موضوع نہیں کہا۔ **وكفى بهم قدوة ۔**

ماہنامہ دار العلوم دیوبند میں اس حدیث کے موضوع نہ ہونے کی تین وجوہات بیان کی گئی ہیں:

پہلی وجہ: محض ایک راوی کے اوپر وضع کے اتہام سے حدیث کو موضوع نہیں کہا جا سکتا، اگر یہ حدیث موضوع ہوتی تو حافظ منذریؒ اس کو اپنی کتاب ''الترغیب والترہیب'' میں ذکر نہ کرتے، اس لیے کہ ان کے سلسلے میں علامہ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ کوئی حدیث منذریؒ صاحبِ ترغیب وترہیب کی تصانیف میں موجود ہے تو اس کو اطمینان سے بیان کر سکتے ہو (یعنی وہ موضوع نہیں ہوسکتی) (الرحمة المرسلة فی شأن حدیث البسملة: ص ۱۵)۔

دوسری وجہ: اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جن حضرات نے سنن ابن ماجہ کی موضوع احادیث کی نشاندہی کی ہے ان میں اس حدیث کا ذکر نہیں ملتا، ''ما تمس إليه الحاجة'' میں وہ ساری احادیث مذکور ہیں۔ (محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، بحوالہ شبِ براءت کی شرعی حیثیت، ص ۶)۔

تیسری وجہ: ابن ابی سبرہ پر جرح شدید ہے، ان کے ضعیف ہونے میں شبہ نہیں؛ تاہم بعض اہل علم ایسے بھی ہیں، جنھوں نے ان کے بارے میں بلند کلمات کہے ہیں؛ جیسا کہ تاریخ خطیب بغدادیؒ میں ان کے تفصیلی ترجمہ کے ضمن میں موجود ہیں، نیز شیخ محمد طاہر پٹنیؒ نے ان کو قاضی العراق لکھا ہے، جہاں بعض محدثین نے ان کی طرف وضع کی نسبت کی ہے، وہیں بعض نے محض ضعیف کہا ہے۔

لہٰذا قطعی طور پراس حدیث کوموضوع نہیں کہاجاسکتا، ہاں ضعیف ضرور کہا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ پندرہویں شعبان کے روزے کو نہ تو واجب وسنت کہا جاسکتا ہے، نہ ہی بدعت کہہ کر بالکل رد کیا جاسکتا ہے؛ بلکہ اس کومستحب کہا جائے گا۔(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند،ص۱۲،شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ مطابق جون ۲۰۱۳ء)۔

اورفضائل میں ضعیف حدیث پرعمل علماء کے یہاں مروج ہے۔

فضائل میں ضعیف حدیث سے استدلال کے متعلق محدثین کے اقوال ملاحظہ فرمایئے:

روى الخطيب البغدادى فى" الجامع لأخلاق الراوى وآداب السامع " (رقم: ۱۲۸۰): **قال: أنا محمد بن أحمد بن يعقوب أنا محمد بن نعيم، قال: سمعت يحيى بن محمد العنبرى، يقول: نا محمد بن إسحاق بن راهويه، قال: كان أبي يحكي عن عبد الرحمن بن مهدى ، أنه كان يقول: إذا روينا فى الثواب والعقاب وفضائل الأعمال ، تساهلنا فى الأسانيد والرجال، وإذا روينا فى الحلال والحرام والأحكام تشددنا فى الرجال ".**

قال الشيخ تقى الدين ابن الصلاح : نقاد أهل الحديث يتسامحون فى أسانيد الرغائب والفضائل . (البدرالمنير لابن الملقن: ۲/۲۸۰،ط: الرياض).

وقال الخطيب فى" الكفاية فى علم الرواية " (ص ۱۳۳ ،باب التشديد فى أحاديث الأحكام والتجوز فى فضائل الاعمال) **قد ورد عن غير واحد من السلف أنه لا يجوز حمل الأحاديث المتعلقة بالتحليل والتحريم إلا عمن كان بريئاً من التهمة بعيداً من الظنة ، وأما أحاديث الترغيب والمواعظ ونحو ذلك فإنه يجوز كتبها عن سائر المشايخ ثم أسند هذه الآثار التالية :**

۱ / عن سفيان الثورى قال: لا تأخذوا هذا العلم فى الحلال والحرام إلا من الرؤساء المشهورين بالعلم الذين يعرفون الزيادة والنقصان ، ولا بأس بما سوى ذلك من المشايخ.

۲ / عن سفيان بن عيينة قال: لا تسمعوا من بقية ما كان في سنة واسمعوا منه ما كان في ثواب وغيره .

۳ / عن أحمد بن حنبل قال : إذا روينا عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فى

الحلال والحرام والسنن والأحكام تشددنا في الأسانيد وإذا روينا عن النبي صلى الله عليه وسلم في فضائل الأعمال وما لا يضع حكماً ولا يرفعه تساهلنا في الأسانيد .

۴ / عن أبي زكريا العنبري قال: الخبر إذا ورد لم يحرم حلالاً ولم يحل حراماً ، ولم يوجب حكماً ، وكان في ترغيب أو ترهيب أو تشديد أو ترخيص : وجب الإغماض عنه والتساهل في رواته . انتهى النقل عن الخطيب .

ابن قدامہؒ المغنی میں فرماتے ہیں:

النوافل والفضائل لاتشترط صحة الحديث فيها . (المغنى : ۱/۷۶۹، فصل فى صلاة التسبيح، دار الكتب العلمية).

امام نوویؒ الاذکار میں فرماتے ہیں:

قال العلماء من المحدثين والفقهاء وغيرهم : يجوز ويستحب العمل في الفضائل والترغيب والترهيب بالحديث الضعيف ما لم يكن موضوعاً وأما الأحكام كالحلال والحرام والبيع والنكاح والطلاق وغير ذلک فلا يعمل فيها إلا بالحديث الصحيح أو الحسن إلا أن يكون في احتياط في شيء من ذلک ، كما إذا ورد حديث ضعيف بكراهة بعض البيوع أو الأنكحة فإن المستحب أن يتنزه عنه ولكن لا يجب. (كتاب الاذكار، ص۲۵،ط: مكتبة دار البيان).

محقق ابن ہمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

والاستحباب يثبت بالضعيف غير الموضوع . (فتح القدير: ۲/۱۳۳، فى اواخر من باب الصلاة على الميت ،دار الفكر).

ابن بدران الحنبلی المدخل إلى مذهب الإمام أحمد بن حنبل میں فرماتے ہیں: تتمة : ذهب الإمام أحمد وتبعه موفق الدين المقدسي والأكثر إلى أنه يعمل بالحديث الضعيف في الفضائل . (المدخل إلى مذهب الإمام أحمد بن حنبل : ۱/۱۰۴، الاصل الثانى : السنة ، ط: دار الكتب العلمية بيروت).

تتمة اضواء البيان میں ہے:

ولو فرض وقدر جدلاً أن فى السند مقالاً ، فإن أئمة الحديث لايمنعون إذا لم يكن فى الحديث حلال أوحرام أو عقيدة ، بل كان باب فضائل الأعمال لايمنعون العمل به ، لأن باب الفضائل لايشدد فيه هذا التشدد ونقل السيوطى مثل ذلک عن أحمد وابن المبارک. (تتمة اضواء البيان للشيخ عطية سالم تلميذ الشيخ الشنقيطى:۸/۵۷۲).

فتح المغیث میں امام سخاویؒ لکھتے ہیں

هذا مع أن مجرد تفرد الكذاب بل الوضاع ولو كان بعد الاستقصاء والتفتيش من حافظ متبحر تام الاستقراء غير مستلزم لذلک بل لا بد معه من انضمام شيء مماسيأتى . (فتح المغيث : ۱/۲۵۱).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (الجزء اللطیف فی الاستدلال بالحدیث الضعیف ط؛ زمزم)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

شبِ براءت میں مساجد میں فضائل سنانے کا حکم:

سوال نمبر ۴: پندرہویں شعبان کی رات کو تقریباً ہر مسجد میں اس رات کے فضائل کا بیان ہوتا ہے اور لوگ رات کو جاگتے ہیں اور نماز اور دعاؤں میں رات گزارتے ہیں، کیا یہ بات احادیث کی روشنی میں ثابت ہے یا نہیں؟ بعض لوگ ان روایات کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس رات میں کوئی خاص عبادت ثابت نہیں، آپ اس کو بھی احادیث کی روشنی میں واضح فرمائیں؟

الجواب: شعبان کی پندرہویں شب کے بارے میں علمائے کرام کی تین جماعتیں ہیں: ۱۔ پہلی جماعت یہ کہتی ہے کہ اس رات کی فضیلت میں کوئی حدیث ثابت نہیں بلکہ عام راتوں کی طرح ہے، جو احادیث منقول ہیں وہ یا تو ضعیف ہیں یا موضوع۔ دوسری جماعت پہلی کے برعکس اس کی فضیلت کو واجبات کا درجہ دیتی ہے اور اس کے ساتھ مساجد میں اجتماع اور قسم قسم کی بدعات وخرافات کی مرتکب ہوتی ہے، یہ دونوں افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ ۳۔ تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ اس رات کی فضیلت میں احادیث ثابت ہیں، ہاں بعض صحیح، بعض حسن اور بعض ضعیف ہیں اور مجموعی اعتبار سے اس رات میں عبادت مستحب ہے، لیکن بدعات، خرافات اور

غیر ثابت امور سے اجتناب لازم اور ضروری ہے۔

شبِ براءت کی فضیلت میں روایات ملاحظہ فرمائیں:

۱. أخرج ابن حبان فی صحیحه (۵۶۶۵) عن معاذ بن جبل عن النبي صلی اللّٰه علیه وسلم قال: یطلع اللّٰه إلی خلقه فی لیلة النصف من شعبان فیغفر لجمیع خلقه إلا لمشرک أو مشاحن . قال الشیخ شعیب الأرنؤوط: حدیث صحیح بشواهده.

قال الشیخ الألبانیؒ: حدیث صحیح ، روی جماعة من الصحابة من طرق مختلفة یشد بعضها بعضاً وهم : معاذبن جبلؓ، وأبوثعلبة الخشنیؓ وعبد اللّٰه بن عمروؓ وأبو موسی الأشعریؓ، و أبو هریرةؓ و أبو بکر الصدیقؓ و عوف بن مالکؓ و عائشةؓ . (السلسلة الصحیحة:۳/۲۱۸/۱۱۴۴).

۲. أخرج الإمام أحمد في مسنده (۶۶۴۲)، عن عبد اللّٰه بن عمرو أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، قال: یطلع اللّٰه عزوجل إلی خلقه لیلة النصف من شعبان فیغفر لعباده إلا لاثنین: مشاحن وقاتل نفس. قال الشیخ شعیب: صحیح بشواهده وهذا إسناد ضعیف لضعف ابن لهیعة .

۳. عن عائشة رضي اللّٰه تعالیٰ عنها ، قالت: فقدت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لیلة فخرجت فإذا هو بالبقیع ... فقال: إن اللّٰه عزوجل ینزل لیلة النصف من شعبان إلی السماء الدنیا فیغفر لأکثر من عدد شعرغنم کلب ، وفی الباب عن أبی بکر الصدیقؓ. (سنن الترمذی ، رقم: ۷۳۹،باب ماجاء فی لیلة النصف من شعبان). إسناده ضعیف لضعف الحجاج بن أرطاة .

قال الشیخ الألبانیؒ فی السلسلة الصحیحة : وجملة القول أن الحدیث بمجموع هذه الطرق صحیح بلا ریب والصحة تثبت بأقل منها عدداً ما دامت سالمة من الضعف الشدید کما هو الشأن فی هذا الحدیث ، فما نقله الشیخ القاسمیؒ فی "إصلاح

المسجد" (ص۱۰۷) عن أهل التعديل والتجريح أنه ليس في فضل ليلة النصف من شعبان حديث صحيح ، فليس مما ينبغي الاعتماد عليه، ولئن كان أحد منهم أطلق مثل هذا القول فإنما أوتى من قبل التسرع وعدم وسع الجهد لتتبع الطرق على هذا النحو الذى بين يديک، والله تعالىٰ هو الموفق. (۱۱۴۴/۲۱۸/۳).

۴. أخرج الإمام البيهقي في شعب الإيمان (۳۸۳۶)،عن عثمان بن أبي العاصؓ :عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا كان ليلة النصف من شعبان فإذا منادٍ هل من مستغفر، فاغفر له هل من سائل فأعطيه فلا يسأل أحد إلا أعطى إلا زانية بفرجها أو مشرک . إسناده ضعيف لضعف جامع بن صبيح الرملي .

لیکن خرائطی کی سند میں جامع بن صبیح کی جگہ محمد بن بکار ہیں، ملاحظہ ہو: (مساویٔ الاخلاق،ص۲۲۶،رقم:۴۹۶)۔

۵. أخرج الإمام ابن ماجه في سننه (۱۳۸۸)، عن علي بن أبي طالب ﷺ قال؛ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا نهارها ، فإن الله ينزل فيها لغروب الشمس إلى سماء الدنيا ، فيقول: ألا من مستغفر لي فأغفر له ألا من مسترزق فأرزقه ألا مبتلى فأعافيه ألا كذا ألا كذا حتى يطلع الفجر. إسناده ضعيف لضعف ابن أبي سبرة . صاحبِ تحفۃ الاحوذی متعدد احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

فهذه الأحاديث بمجموعها حجة على من زعم أنه لم يثبت في فضيلة ليلة النصف من شعبان شيء ، والله تعالىٰ أعلم . (تحفة الأحوذى:۳/۳۶۷).

مذکورہ بالا احادیث کے علاوہ اور بھی بہت ساری روایات موجود ہیں،تفصیل کے لیے درجِ ذیل رسائل کی مراجعت مفید ہوگی۔ (حسن البيان في ليلة النصف من شعبان ، للشيخ عبد الله بن محمد بن الصديق الغماري،ط: عالم الكتب، وفضائل ليلة النصف من شعبان، للشيخ المحدث عبد الحفيظ ملک عبد الحق المكى،ط:مكتبة الحرمين، وشعبان وشبِ براءت کے فضائل واحکام،ازص۶۷، تاص۸۸،ط:ادارۂ غفران).

شعبان وشبِ براءت کے فضائل واحکام میں احادیث کی تخریج کرنے بعد لکھتے ہیں:

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شعبان کی پندرہویں رات میں اللہ تعالیٰ کا مخلوق کی طرف خصوصی توجہ اور رحمت کی نظر ڈالنا اور چند افراد کے علاوہ سب کی مغفرت فرمانا اوران وجوہات کی بناپراس رات کی فضیلت واہمیت کا ہونا متعدداحادیث وروایات سے ثابت ہے، جن میں سے بعض روایات اگرچہ انفرادی طور پرضعیف ہیں، لیکن یہ مجموعی طور پرکم ازکم حسن اوراس سے بڑھ کرصحت کے درجہ کوپہنچ جاتی ہیں۔

جبکہ محدثین وفقہاء کے راجح قول کے مطابق فضائل اعمال کے سلسلہ میں ضعیف حدیث بھی بعض شرائط کے ساتھ قابل عمل ہوجاتی ہے۔ (ص ۸۸)۔

شبِ براءت کی فضیلت اکابر علماء اورسلفِ صالحین کی نظر میں:

۱۔ علامہ ابن الحاج مالکیؒ کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے جوشریعت میں خوردبیں لے کر بدعت تلاش کرتے ہیں؛ لیکن اللہ کی شان، شبِ براءت کی فضیلت کوتسلیم کرتے ہیں؛ چنانچہ ان کی عبارت موجودہ دور کے بعض حضرات کے لیے سرمہ بصیرت کا کام دیگی۔ ملاحظہ فرمائیں:

ولا شک إنها ليلة مباركة عظيمة القدر عند اللّٰه تعالىٰ . قال اللّٰه تعالىٰ: ﴿ فيها يفرق كل أمر حكيم ﴾ وقد اختلف العلماء هل هي هذه الليلة أو ليلة القدر على قولين المشهور منهما أنها ليلة القدر وبالجملة فهذه الليلة وإن لم تكن ليلة القدر فلها فضل عظيم وخير جسيم وكان السلف رضي اللّٰه عنهم يعظمونها ويشمرون لها قبل إتيانها فما تأتيهم إلا وهم متأهبون لِلِقَائِها والقيام بحرمتها على ما قد علم من احترامهم للشعائر على ما تقدم ذكره هذا هو التعظيم الشرعي لهذه الليلة . (المدخل : ۱/۲۹۹، ليلة نصف شعبان ،ط:دارالفكر).

دوسری جگہ لکھتے ہیں: **هذه الليلة زادت فضيلتها ومقتضى زيادة الفضيلة زيادة الشكر اللائق بها من فعل الطاعات وأنواعها.** (المدخل : ۱/۳۰۸،دارالفكر). ترجمہ: اس رات (شبِ براءت) کی فضیلت بہت زیادہ ہے، جس کا تقاضایہ ہے کہ اس رات میں ہرقسم کی طاعت وعبادت وغیرہ کرکے اس

کی شان کے مطابق زیادہ سے زیادہ شکر ادا کیا جائے۔

۲۔ علامہ ابن تیمیہؒ بھی پندرہویں شعبان کی فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ومن هذا الباب : ليلة النصف من شعبان ، فقد روى في فضلها من الأحاديث المرفوعة والآثار ما يقتضي أنها ليلة مفضلة وإن من السلف من كان يخصها بالصلاة فيها، وصوم شهر شعبان قد جاء ت فيه أحاديث صحيحة ، ومن العلماء : من السلف من أهل المدينة ، وغيرهم من الخلف من أنكر فضلها وطعن فى الأحاديث الواردة فيها...لكن الذي عليه كثير من أهل العلم أو أكثرهم من أصحابنا وغيرهم على تفضيلها و عليه يدل نص أحمد لتعدد الأحاديث الواردة فيها وما يصدق ذلک من الآثار السلفية وقد روى بعض فضائلها فى المسانيد والسنن وإن كان قد وضع فيها أشياء أخر . (اقتضاء الصراط المستقيم : ١/٣٠٢، ط: القاهرة) .

۳۔ شیخ عبداللہ بن محمد بن الصدیق الغماری شبِ براءت کی فضیلت کو احادیث اور آثار سے ثابت کرنے کے بعد مختلف نوعیت کی عبادات کے مستحب ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں:

فيستفاد من هذه الأحاديث والآثار استحباب قيام هذه الليلة والاجتهاد فيها بتلاوة القرآن والذكر والدعاء تعرضاً لنفحات رحمة الله كما جاء في حديث رواه الطبراني وغيره عن محمد بن مسلمة مرفوعاً : إن لله في أيام الدهر نفحات فتعرضوا لها فلعل أحدكم أن تصيبه نفحة فلا يشقى بعدها أبداً . (حسن البيان في ليلة النصف من شعبان ، ص ١٥، ١٦).

۴۔ علامہ علاء الدین حصکفیؒ، درمختار میں فرماتے ہیں:

ومن المندوبات...إحياء ليلة العيدين والنصف من شعبان والعشر الأخير من رمضان والأول من ذى الحجة . وفى الشامي: قوله والنصف ، أى وإحياء ليلة النصف من شعبان .
(الدر المختار مع رد المحتار: ٢/٢٤،سعيد).

۵۔ علامہ ابن نجیم مصریؒ، البحر الرائق میں فرماتے ہیں:

ومن المندوبات إحياء ليالي العشر من رمضان وليلتي العيدين وليالي عشر ذي الحجة وليلة النصف من شعبان كما وردت به الأحاديث وذكرها في الترغيب والترهيب مفضلة . والمراد بإحياء الليل قيامه وظاهره الاستيعاب ويجوز أن يراد غالبه . (البحرالرائق: ۵٦/۲، دارالمعرفة).

٦۔ علامہ شرنبلالیؒ، مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں:

ويندب إحياء ليلة النصف من شعبان لأنها تكفر ذنوب السنة والليلة الجمعة تكفر ذنوب الأسبوع وليلة القدر تكفر ذنوب العمر ولأنها تقدر فيها الأرزاق والآجال والإغناء والإفقار والإعزاز والإذلال والإحياء والإماتة وعدد الحاج وفيها يسح اللّٰه تعالىٰ الخير سحاً وخمس ليالي لا يرد فيهن الدعاء ليلة الجمعة وأول ليلة من رجب وليلة النصف من شعبان وليلتا العيدين... ومعنى القيام أن يكون مشتغلاً معظم الليل بطاعة وقيل: بساعة منه يقرأ أو يسمع القرآن أو الحديث أو يسبح أو يصلى على النبي صلى اللّٰه عليه وسلم . (مراقی الفلاح، ص۱۷۴).

۷۔ سید سابق نے فقہ العبادات میں لکھا ہے: الليالي التي يندب للمسلمين إحياؤها:... ۴. إحياء ليلة النصف من شعبان لأنها تكفر ذنوب السنة فعن علي بن أبي طالب رضي الله عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إذا كانت ليلة النصف من شعبان ...(ص۱۰۷).

۸۔ علامہ عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں:

لا كلام في استحباب إحياء ليلة البراءة بما شاء من العبادات وبأداء التطوعات فيها كيف شاء لحديث ابن ماجه والبيهقي في شعب الإيمان عن علي رضي الله عنه مرفوعاً، وفي الباب أحاديث أخر أخرجها البيهقي وغيره على ما بسطها ابن حجر المكيؒ في الإيضاح والبيان،

دالة على أن النبي صلى الله عليه وسلم أكثر في تلك الليلة من العبادة والدعاء وزار القبور ودعا للأموات. فيعلم بمجموع الأحاديث القولية والفعلية استحباب إكثار العبادة فيها، فالرجل مخير بين الصلاة و بين غيرها من العبادات ، فإن اختار الصلاة فكمية أعداد الركعات وكيفيتها مفوضة إليه مالم يأت بما منعه الشارع صراحة أو إشارة . (الآثار المرفوعة ۱/ ۸۱، دار الكتب العمية).

۹۔ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں:

وذكروا في فضل هذه الليلة أخباراً كثيرة . (روح المعانی : ۲۵/ ۱۱۱، سورة الدخان، القاهرة).

۱۰۔ شیخ عبدالحق محدثِ دہلویؒ فرماتے ہیں:

فإذا احياء ه الرجل لنفسه فالظاهر ندبه للأحاديث السابقة ومثلها يعمل به فی فضائل وقال به الأوزاعی . (ما ثبت بالسنة ، ص ۳۶۰).

۱۱۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

هذه الليلة ليلة البراء ة و صح الروايات في فضل ليلة البراء ة و أما ما ذكر أرباب الكتب من الضعاف والمنكرات فلا أصل لها . (العرف الشذی : ۲/ ۱۷۲، كتاب الصوم ، باب ماجاء في ليلة النصف من شعبان).

دیگر اکابر علمائے دیوبند کے ہاں بھی شبِ براءت کی فضیلت مسلم ہے۔ ہاں مساجد میں اجتماعی ہیئت کے ساتھ عبادت وغیرہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اکابر کی تصریحات درجِ ذیل کتب میں دیکھی جاسکتی ہیں:

(کفایت المفتی: ۲/ ۳۱۹، ومظاہر حق جدید: ۱/ ۸۴۹، ط: دارالاشاعت کراچی، وبہشتی زیور حصہ ششم ص ۶۰، ومکتوبات شیخ الاسلام: ۴/ ۷۸، ومعارف القرآن: ۷/ ۷۵۸، وآپ کے مسائل اوران کا حل: ۱/ ۱۲۳، وفتاویٰ محمودیہ: ۵/ ۴۷۲، جامعہ فاروقیہ، واحسن الفتاویٰ: ۱/ ۳۷۱، ودرس ترمذی: ۲/ ۵۷۹، وتبلیغی واصلاحی مضامین از مولانا مفتی عاشق الٰہی بلندشہری: ۶/ ۱۰۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شبِ براءت میں قبرستان جانے کا حکم:

سوال نمبر۵: اکثر لوگ بہت اہتمام سے پندرہویں شعبان کی رات قبرستان جاتے ہیں، اور اپنے رشتہ داروں اور بزرگوں کی قبروں کی زیارت کرتے ہیں، کیا یہ احادیث وروایات سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور فقہاء اس سلسلہ میں کیا کہتے ہیں؟

الجواب: شبِ براءت یعنی پندرہویں شعبان کی رات میں قبرستان جانا اور مرحومین کی زیارت کرنا، ایصالِ ثواب کرنا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کرنا مستحب ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اگر چہ روایت ضعیف ہے، تاہم محدثین کے نزدیک بابِ فضائل میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا درست ہے، لیکن چونکہ پوری حیاتِ طیبہ میں صرف ایک مرتبہ پندرہویں شعبان میں قبرستان جانا ثابت ہے، اس لیے سنت کا درجہ نہ دیا جائے اور نہ اس کا التزام کیا جائے، نیز خرافات وغیرہ سے بھی اجتناب کرنا ضروری ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں:

عن عائشة رضي الله تعالیٰ عنها، قالت: فقدت رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة فخرجت فإذا هو بالبقيع، فقال: أكنت تخافين أن يحيف الله عليک ورسوله ؟ قلت: يا رسول الله إني ظننت أنک أتيت بعض نساءک ، فقال: إن الله عزوجل ينزل ليلة النصف من شعبان إلى السماء الدنيا فيغفر لأكثر من عدد شعر غنم كلب. وفى الباب عن أبى بكر الصديق . قال أبوعيسىٰ: حديث عائشةؓ لا نعرفه إلا من هذا الوجه من حديث الحجاج وسمعت محمداً يضعف هذا الحديث وقال يحيى بن أبي كثير لم يسمع من عروة والحجاج بن أرطاة لم يسمع من يحيى بن أبي كثير. (سنن الترمذی، رقم؛ ۷۳۹، باب ماجاء في ليلة النصف من شعبان). وأخرجه أيضاً: ابن ماجه ، رقم؛ ۱۳۸۹ ،باب ما جاء في ليلة النصف من شعبان، وأحمد في مسنده ، رقم: ۲۶۰۱۸ ، وعبد بن حميد في مسنده ، رقم: ۱۵۰۹ ، والبيهقى فى شعب الإيمان : ۳/۳۸۰/۳۵۴۴، والدارقطنى فى النزول ، رقم: ۷۳.

قال الشيخ شعيب: إسناده ضعيف لضعف حجاج بن أرطاة و لانقطاعه . (التعليقات على مسنداحمد،رقم:۲۶۰۱۸).

الآثار المرفوعه فی الأخبار الموضوعه میں علامہ عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں:

لا كلام في استحباب إحياء ليلة البراء ة بما شاء من العبادات و بأداء التطوعات فيها كيف شاء لحديث ابن ماجه والبيهقي في شعب الإيمان عن علي رضي الله عنه مرفوعاً ، ...ومن أمثلها حديث عائشةؓ قالت: فقدت رسول الله صلى الله عليه وسلم فخرجت فإذا هو بالبقيع ... وفى الباب أحاديث أخر أخرجها البيهقي وغيره على ما بسطها ابن حجر المكيؒ فى الإيضاح والبيان ، دالة على أن النبي صلى الله عليه وسلم أكثر في تلك الليلة من العبادة والدعاء وزار القبور ودعا للأموات. (الآثار المرفوعة : ۱/ ۸۱، دارالكتب العمية).

فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

و أفضل أيام الزيارة أربعة يوم الاثنين والخميس والجمعة والسبت والزيارة يوم الجمعة بعد الصلاة حسن و يوم السبت إلى طلوع الشمس ويوم الخميس في أول النهار و قيل في آخر النهار وكذا فى الليالى المتبركة لا سيما ليلة براء ة . (الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۵۰).

بہشتی زیور میں مرقوم ہے:

شبِ براءت کی اصل اتنی ہے کہ پندرہویں رات اور پندرہواں دن اس مہینہ کا بہت بزرگی والا ہے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کو جاگنے اور دن کو روزہ رکھنے کی ترغیب دلائی ہے اور اس رات ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے قبرستان میں تشریف لے جا کر مردوں کے لیے بخشش کی دعا مانگی ہے۔(بہشتی زیور:۶/ ۶۰،ط: مکتبہ مدنیہ)۔

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے: شبِ براءت میں اور ذی الحجہ کے دس دنوں میں اور عیدین میں اور عشرہ محرم میں بھی قبروں کی زیارت کرنا افضل ہے۔(عمدۃ الفقہ :۲/ ۳۸،ط: زوار اکیڈمی)۔

شبِ براءت میں کھانے کی چیزیں بنا کر تقسیم کرنے کا حکم:

سوال نمبر۶: اکثر خواتین پندرہویں شعبان کے دن مختلف قسم کے کھانے اور حلوے، مٹھائیاں بناتی

ہیں اور بچوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کرتی ہیں، کیا یہ عمل ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب: پندرہویں شعبان کے دن مختلف کھانے بنا کر تقسیم کرنا کہیں ثابت نہیں، ہاں اگر ان خواتین کا عام معمول ہے کہ دوسرے دنوں میں بھی بنا کر تقسیم کرتی رہتی ہیں تو ۱۵ شعبان کے دن بھی جائز ہے ورنہ خاص اس دن کی وجہ سے تقسیم کرنا رسم ورواج میں داخل ہوگا، اس کا ترک کرنا ضروری ہے۔

مسلم شریف کی حدیث میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها ، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد . (رواه مسلم ، ۱۷۱۸، باب نقض الاحكام الباطلة).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

جو چیز شرعاً ضروری نہ ہو اس کو ضروری سمجھنا اور امر مباح کے ساتھ واجب یا سنت جیسا معاملہ کرنا درست نہیں، اس سے وہ چیز مکروہ ہو جاتی ہے۔ **كل مباح يؤدي إلى زعم الجهال سنية أمر أو وجوبه ، فهو مكروه كتعيين السورة للصلاة و تعيين القراء ة لوقت ، كذا فى تنقيح الفتاوى الحامدية** (۲/۳۳۳) بلکہ امر مستحب پر بھی اصرار کی اجازت نہیں، **الإصرار على المندوب يبلغه إلى حد الكراهة** ان تصریحات کی وجہ سے شبِ براءت کے حلوے کو منع کیا جاتا ہے، جو صاحب اس کے منع کو خواہ مخواہ کہتے ہیں غالباً ان کے ذہن میں مذکورہ تصریحات نہیں ورنہ خواہ مخواہ ایسی بات نہ کہتے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۴۸۰، جامعہ فاروقیہ)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: اس کو عید سمجھ کر ثواب کی نیت سے چاول کا حلوہ بنانا بے اصل اور غلط ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۵/۴۸۲، جامعہ فاروقیہ)۔

کفایت المفتی میں مذکور ہے:

سوال: کیا صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ، محدثین اور عہدِ اول کے مسلمانوں میں شبِ براءت کا حلوہ مقرر تھا؟ کیا فقہاء نے بھی کہیں شبِ براءت کے حلوے کا ذکر کیا ہے؟ الجواب: سلفِ صالحین اور ائمہ مجتہدین سے اس کا ثبوت نہیں۔ (کفایت المفتی: ۲/۳۲۰)۔

شبِ براءت میں آتش بازی اور مسجدوں کو روشن کرنے کا حکم:

سوال نمبر ۷: شبِ براءت میں آتش بازی اور چراغاں اور مسجدوں کو سجانا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: شبِ براءت کے موقع پر شریعت نے مختلف عبادات مثلاً: نوافل، تلاوت، ذکر و تسبیحات، دعا، استغفار وغیرہ کی ترغیب دی ہے، آتش بازی، چراغاں اور مسجدوں کو سجانے کی ترغیب نہیں دی، لہٰذا یہ سب چیزیں ممنوع اور قابلِ ترک ہیں، ہاں مسجدوں کی صفائی، ستھرائی اور خوشبو جلانا تاکہ نمازیوں کو راحت پہنچے، یہ درست ہے۔ مسلم شریف میں ہے:

عن عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها، قالت: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد. (رواه مسلم، ۱۷۱۸، باب نقض الاحكام الباطلة).

وعن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: رأى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم نخامة في قبلة المسجد، فغضب حتى احمر وجهه، فقامت امرأة من الأنصار فحكتها وجعلت مكانها خلوفاً، فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ما أحسن هذا. (سنن النسائی: ۵۲/۲).

وفي رواية لابن ماجه عن واثلة بن أسقع أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال: جنبوا مساجدكم صبيانكم... واتخذوا على أبوابها المطاهر، وجمروها في الجمع. (سنن ابن ماجه، رقم: ۷۵۰، اسناده ضعيف).

تنقيح الفتاوى الحامدية میں مرقوم ہے:

من البدع المكروه ما يفعل في كثير من البلدان من إيقاد القناديل الكثيرة العظيمة السرف في ليال معروفة من السنة كليلة النصف من شعبان فيحصل بذلك مفاسد كثيرة منها مضاهاة المجوس في الاعتناء بالنار في الإكثار منها ومنها إضاعة المال في غير وجهه ومنها ما يترتب على ذلك من الفاسد من اجتماع الصبيان وأهل البطالة ولعبهم ورفع أصواتهم وامتهانهم المساجد وانتهاك حرمتها وحصول أوساخ فيها وغير ذلك من

المفاسد التي يجب صيانة المسجد عنها شرح المهذب للإمام النوويؒ وصرح أئمتنا الأعلامؒ بأنه لا يجوز أن يزاد على سراج المسجد سواء كان في شهر رمضان أو غيره لأن فيه إسرافاً كما في الذخيرة وغيرها. (تنقيح الفتاوى الحامدية: ۲/۳۵۹).

فتاوی اللکنوی میں مرقوم ہے:

الاستفسار: إسراج السرج الكثيرة الزائد عن الحاجة ليلة البراءة أو ليلة القدر في الأسواق، والمساجد كما تعارف في أمصارنا هل يجوز؟ الاستبشار: هو بدعة كذا في خزانة الروايات عن القنية. (فتاوى اللكنوى، ص ۱۹۱).

مزید ملاحظہ ہو: (الفتاوى الهندية: ۲/۴۶۱، وقنية المنية، ص۱۰۷، وغمزعيون البصائر: ۳/۱۹۲).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

رات میں نفلی عبادت کرنا، پھر دن میں روزہ رکھنا، موقع مل جائے تو چپکے سے قبرستان جا کر مردوں کے لیے دعائے خیر کرنا، یہ کام تو کرنے کے ہیں، باقی آتش بازی چلانا، نفل کی جماعت کرنا، قبرستان میں جمع ہو کر تقریب کی صورت بنانا، حلوہ کا التزام کرنا وغیرہ اور جو غیر ثابت امور رائج ہوں وہ سب ترک کرنے کے ہیں... شبِ قدر، شب براءت کے لیے شریعت نے عبادت، نوافل، تلاوت، ذکر، تسبیح، دعا، استغفار کی ترغیب دی ہے، پھول وغیرہ سے (مسجد) سجانے کی ترغیب نہیں دی... البتہ مسجد میں خوشبو کی ترغیب آئی ہے تاکہ نمازیوں کو اذیت نہ پہونچے بلکہ راحت پہونچے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۳/۲۵۳-۲۶۳، جامعہ فاروقیہ)۔

شبِ براءت میں عبادت کی مقدار:

سوال نمبر ۸: شبِ براءت میں اگر پوری رات نہ جاگا جائے بلکہ دوسری راتوں سے کچھ زیادہ عبادت کی جائے تو یہ عبادت بھی قیام اللیل میں محسوب ہوگی یا نہیں؟

الجواب: مبارک راتوں میں جہاں عبادت کی فضیلت آئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پوری رات ہی عبادت کی جائے، بلکہ رات کے کچھ حصہ میں عبادت، تلاوت وغیرہ کرلیا جائے تو اس سے ثواب اور

فضیلت حاصل ہوجائے گی اور قیام اللیل کے زمرہ میں شامل ہوجائے گا، حدیث شریف میں ہے کہ جس نے عشا کی نماز جماعت سے ادا کی اس نے آدھی رات قیام کیا پھر فجر بھی جماعت سے ادا کرلی تو گویا پوری رات عبادت کی، یعنی پوری رات نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل ہوگئی۔حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں:

عن عبد الرحمن بن أبي عمرة ، قال: دخل عثمان بن عفان المسجد بعد صلاة المغرب فقعد وحده فقعدت إليه فقال يا ابن أخي سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من صلى العشاء في جماعة فكأنما قام نصف الليل ومن صلى الصبح في جماعة فكأنما صلى الليل كله . (رواه مسلم : ۱/۴۵۴).

وفي رواية لأبي داود عنه أنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى العشاء في جماعة كان كقيام نصف ليلة ومن صلى العشاء والفجر في جماعة كان كقيام الليلة . (سنن ابی داود : ۱/۲۱۷،بیروت).

شعبان وشبِ براءت کے فضائل واحکام میں مذکور ہے:

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ: اب قابل غور بات یہ ہے کہ کون سے حصہ شب میں جاگنا زیادہ بہتر ہے، اس کا فیصلہ قرآن سے بھی ہوتا ہے اور حدیث سے بھی، کیونکہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیری شب میں جاگنا اشد ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إن ناشئة الليل هي أشد وطأ وأقوم قيلاً** . اورحدیث سے اس کا افضل ہونا معلوم ہوتا ہے چنانچہ آخری شب کی فضیلت میں بکثرت احادیث وارد ہیں اورقواعدِ عقلیہ بھی اس پر شاہد ہیں کیونکہ وہ وقت سونے کا ہے اورسونے کا ترک کرنا مشکل ہے۔۔۔اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخیر حصہ رات کا افضل ہے۔لیکن اگر کسی کے لیے اس حصہ میں جاگنا دشوار ہو وہ اول ہی شب میں عبادت کرکے فضیلت حاصل کرلے، جس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ عشا تک عبادت میں مشغول رہیں، رات بھر جاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ اچھا بھی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے: **أحب الأعمال إلى الله أدومها**، سوشعبان کی شب میں اتنا جاگنا چاہیے جس پر نباہ ہوسکے۔(شعبان کے فضائل واحکام،ص۱۳۶،ط:ادارہ غفران پاکستان)۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں کہ: جناب باری عزاسمہٗ کی توجہ اس عالم اوراس کے رہنے

والوں کی طرف،شعبان کی پندرہویں رات میں بہ نسبت اورراتوں کے زیادہ مبذول ہوتی ہے،اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ بہ نسبت اورراتوں کے انسان بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں زیادہ حصہ لیں اوراس کی رحمت کو جس قدر بھی ممکن ہوا پنے اندر جذب کرنے کی کوشش کریں،اس لیے اس شب کونوافل،قراءتِ قرآن،ذکرودعا سے معمور کریں، چاہے تمام رات ہو یا اکثر حصہ یا کچھ حصہ،نہ کوئی خاص عبادت متعین ہے،اور نہ کوئی وقت معین ہے اس شب میں اپنے لیے،اپنے بڑوں کے لیے اورتمام مسلمانوں کے لیے دعا کرنی چاہیے۔(مکتوبات شیخ الاسلام: ۴/۷۸)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

یہ بتاؤ کہ کیا اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے گھنٹے شمار ہوتے ہیں کہ تم نے مسجد میں کتنے گھنٹے گزارے؟ وہاں گھنٹے شمار نہیں ہوتے وہاں تو اخلاص دیکھا جاتا ہے،اگر چند لمحات بھی اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ میں میسر آ گئے تو وہ چند لمحات ہی ان شاء اللہ بیڑا پار کرادیں گے۔(شبِ براءت کی حقیقت،ص۱۷)۔

شعبان وشبِ براءت کے فضائل واحکام میں لکھا ہے:

اس رات میں تمام رات جاگنا ضروری نہیں،اگر کوئی اس رات میں گناہوں سے بچتے ہوئے دوسرے دنوں کی بہ نسبت تھوڑی سی زیادہ عبادت کرلے اس کو بھی اس رات کی فضیلت کا حصہ حاصل ہو جائے گا،کیونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گھنٹے شمار نہیں ہوتے،بلکہ اخلاص دیکھا جاتا ہے،اگر اخلاص کے ساتھ چند لمحات بھی اللہ تعالیٰ کے خاص دربار میں میسر آ گئے تو وہ بہت بڑی نعمت اور دولت ہیں۔(شعبان وشبِ براءت کے فضائل،ص۱۳۴)۔

پندرہویں شعبان کو شبِ براءت سے موسوم کرنے کا حکم:

سوال نمبر۹: کیا اس رات کا نام لیلۃ البراءت روایات سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور لیلۃ البراءت کا کیا مطلب ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: کتبِ احادیث کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ لیلۃ البراءت کا لفظ کسی مرفوع حدیث میں موجود نہیں ہے البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف منسوب ایک اثر میں موجود ہے،عام

طور پر احادیث میں اس شب کو لیلۃ النصف من شعبان سے موسوم کیا گیا ہے۔

لیلۃ البراءت ؛ یہ عربی لفظ ہے جو لیلۃ اور براءۃ سے مرکب ہے لیلۃ کے معنی ہیں رات ،اور براءۃ، چھٹکارے کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہوگا کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بے شمار گنہگاروں اور مجرموں کو جہنم کی آگ سے خلاصی و چھٹکارا ملتا ہے اور ان کی بخشش کردی جاتی ہے۔

علماء نے اپنی تصنیفات وتالیفات میں اس رات کو مختلف اَلقاب سے یاد کیا ہیں:

۱۔ **لیلة مباركة** ، برکت والی رات۔(تفسیر الکشاف:۶/۲۵۶،سورۃ الدخان)۔

لیکن قرآنِ کریم میں لیلۃ مبارکۃ سے مراد لیلۃ القدر ہے اور جن حضرات نے سورۂ دخان میں لیلۃ مبارکۃ سے لیلۃ نصف شعبان مراد لیا، تو محققین مفسرین نے ان کی تردید فرمائی۔امام قرطبیؒ لکھتے ہیں: **وجمهور العلماء على أنها ليلة القدر وفيهم من قال: إنها ليلة النصف من شعبان، وهو باطل، لأن الله تعالىٰ يقول في كتابه الصادق القاطع : شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن، فنص على أن ميقات نزوله رمضان ثم عين من زمانه الليل ههنا بقوله في ليلة مباركة فمن زعم أنه في غيره فقد أعظم الفرية على الله** . (تفسیر القرطبی:۱۶/۱۱۰،الدخان:۳).

۲۔ **ليلة الرحمة** ، رحمتِ خاصہ کے نزول کی رات۔(التفسير الكبير :۲۷/۲۵۳،وفيض القدير للشيخ المناوى).

۳۔ **ليلة الصك** ،دستاویز والی رات۔(التفسير الكبير :۲۷/۲۵۳، وعمدة القارى:۲/۴۱۶).

۴۔ **ليلة البراءة** ، چھٹکارے کی رات۔(مرقاۃ المفاتیح:۳/۹۶۹،وتفسیر العز بن عبدالسلام:۳/۴۷۳،والتوضیح شرح مشکاۃ المصابیح:۱۳/۲/۵۷،وعمدۃ القاری:۲/۴۱۶)۔ **وكان ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما يسميها ليلة التعظيم وليلة النصف من شعبان ليلة البراءة وليلتى العيدين ليلة الجائزة** . (تفسير العز بن عبد السلام :۳/۴۷۳،وكذا النكت والعيون:۶/۳۱۳)۔

۵۔ **ليلة المغفرة** ، بخشش والی رات۔ **إن الله تعالىٰ يغفر لعباده فيها كما جاء في الأحاديث** .

۶۔ **ليلة العتق** ، جہنم سے آزادی کی رات۔(روح المعانى ،سورة الدخان، والتفسير الكبير:

۲۷/۲۵۳)۔ القاموس الوحید میں مرقوم ہے: البراءۃ: چھٹکارا، صفائی۔ (القاموس الوحید: ۱/۱۵۷)۔

ماہِ شعبان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بکثرت روزے رکھنے کی حکمت:

سوال نمبر۱۰: شعبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت روزے رکھتے تھے، اس کی کیا حکمت ہے؟ بینوا بالبرہان تو جروا عند الرحمٰن۔

الجواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماہِ شعبان المعظم میں بکثرت روزے رکھنے کی علمائے کرام نے متعدد حکمتیں اور اسباب ذکر فرمائے ہیں: درجِ ذیل چند ملاحظہ کیجیے:

۱۔ ماہِ شعبان المعظم کے خصوصی فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں، ان کے پیشِ نظر۔

۲۔ اس ماہ میں بندوں کے اعمال اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں، جیسا کہ ماقبل میں مذکور ہوا۔

۳۔ اس ماہ میں بکثرت روزے رکھ کر آپ رمضان المبارک کا بہتر طریقہ پر استقبال فرماتے ہیں، گویا یہ ماہ رمضان کی برکات وانوارات کا پیش خیمہ اور مقدمہ ہے۔

۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روزے رکھنا امت کی تعلیم کی بنا پر تھا تاکہ آپ کو دیکھ کر اور لوگ بھی روزے رکھیں اور رمضان المبارک کے لیے تیار ہو جائیں، ورنہ ایک دم سے رمضان المبارک کے روزے رکھنا مشکل ہوتا ہے جبکہ پہلے سے اس کی عادت نہ ہو۔

۵۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کی موافقت میں روزے رکھتے تھے کیونکہ ازواجِ مطہرات اس ماہ میں قضا روزے رکھتی تھیں۔

احادیثِ مبارکہ سے چند دلائل ملاحظہ فرمائیں: صحیح ابن خزیمہ میں ہے:

عن أنس ﷺ قال: سئل النبي صلى الله عليه وسلم: أى الصوم أفضل بعد رمضان؟ فقال: شعبان لتعظيم رمضان، قيل: فأى الصدقة أفضل؟ قال: صدقة في رمضان: هذا حديث غريب، وصدقة بن موسى ليس عندهم بذك القوى. (سنن الترمذی: ۴۲/۳)۔

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها تقول: كان أحب الشهور إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يصومه شعبان ثم يصله برمضان . (رقم:۲۰۷۷). إسناده صحيح.

وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن عائشة رضي الله عنها حدثتهم أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يصوم شعبان كله قالت: يارسول الله أحب الشهور إليك أن تصومه شعبان، قال: إن الله يكتب على كل نفس ميتة تلك السنة فأحب أن يأتيني أجلي وأناْ صائم . (مسند أبي يعلى ، رقم: ۴۹۱۱). قال حسين سليم أسد: إسناده ضعيف .

وعن أسامة بن زيد رضي الله عنه، قال: قلت: يارسول الله ، رأيتك تصوم في شعبان صوماً لا تصومه في شيء من الشهور ، إلا في شهر رمضان ؟ قال: ذلك شهر يغفل الناس عنه ، بين رجب وشهر رمضان ، ترفع فيه أعمال الناس ، فأحب أن لايرفع لي عملي إلا وأناْ صائم . (مصنف ابن ابی شیبة : ۳۳۸/۶). قال الشيخ محمد عوامة: إسناده حسن من أجل ثابت من قيس .

فتح الباری میں حافظ صاحبؒ فرماتے ہیں:

واختلف في الحكمة في إكثاره صلى الله عليه وسلم من صوم شعبان، فقيل: كان يشتغل عن صوم الثلاثة أيام من كل شهر لسفر أو غيره فتجتمع فيقضيها في شعبان...وقيل: كان يصنع ذلك لتعظيم رمضان وورد فيه حديث آخر...وقيل : الحكمة في إكثاره من الصيام في شعبان دون غيره أن نسائه كن يقضين ما عليهن من رمضان في شعبان ...الخ . (فتح الباری : ۲۱۴/۴، باب صوم شعبان).

خطباتِ حکیم الامت میں مرقوم ہے:

صومِ شعبان کی حکمت: رمضان سے پہلے نصف شعبان کا روزہ مشروع ہونے کی یہ بھی ایک حکمت ہے کہ روزہ سے گویا مناسبت ہوجائے اس کے بعد جب رمضان آئے گا تو روزہ کا اثر زیادہ نہ ہوگا بلکہ دل یوں کہے گا کہ جیسا شعبان کا روزہ تھا ویسا ہی رمضان کا ہوگا اس سے زیادہ کیا ہوگا چنانچہ بحمد اللہ اب رمضان کے روزہ کا اثر زیادہ نہیں ہوا گو کسی قدر ضرور ہوا۔ (خطبات حکیم الامت:۴۳۱/۱۶)۔

شبِ براءت میں قرآنِ کریم کے لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر نزول کی تحقیق:

سوال: نمبر ۱: میں نے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو اس رات (یعنی ۱۵ شعبان) میں لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اتارا، کیا یہ بات صحیح ہے؟ کیا قرآنِ کریم سے اس رات کی فضیلت ثابت ہے یا نہیں؟ **إنا أنزلناه فی لیلة مبارکة إنا کنا منذرین فیها یفرق کل أمر حکیم أمراً من عندنا إنا کنا مرسلین .** اس رات کے بارے میں نازل ہوئی یا لیلۃ القدر کے بارے میں؟

الجواب: جمہور علمائے کرام کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر شبِ قدر میں نازل فرمایا، نیز سورۂ دخان کی آیتِ کریمہ: ﴿ **إنا أنزلناه في ليلة مباركة** ﴾ میں لیلۃ مبارکۃ سے جمہور مفسرین کے نزدیک شبِ قدر مراد ہے، ہاں بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ لیلۃ مبارکۃ سے شبِ براءت مراد ہے، لیکن یہ قول مرجوح اور غیر مشہور ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ شبِ براءت کی کوئی فضیلت نہیں، متعدد احادیث سے شبِ براءت کی فضیلت ثابت ہے، اکثر روایات کا تذکرہ ماقبل میں گزر چکا ہے۔ ہاں قرآنِ کریم سے اس کی فضیلت کو ثابت کرنا مشکل ہے۔

دلائل ملاحظہ فرمائیں: امام فخر الدین رازیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

وسمی لیلة القدر مبارکة ، إنا أنزلناه في لیلة مبارکة ، فالقرآن ذکر ، أنزله ملک مبارک ، في لیلة مبارکة ، علی نبی مبارک ، لأمة مبارکة .

کیف الجمع بین هذه الآیة علی هذا القول ، وبین قوله تعالیٰ : ﴿ إنا أنزلناه فی لیلة القدر ﴾ [القدر: ۱] **وبین قوله : ﴿إنا أنزلناه في لیلة مبارکة ﴾**[الدخان:۳]،

والجواب: روی أن ابن عمر رضی اللہ عنہ **استدل بهذه الآیة وبقوله : ﴿إنا أنزلناه فی لیلة القدر﴾ إن لیلة القدر لا بد وأن تکون في رمضان ، وذلک لأن لیلة القدر إذا کانت في رمضان کان إنزاله في لیلة القدر إنزالاً له في رمضان ، وهذا کمن یقول: لقیت فلاناً في هذا الشهر فیقال له، في أی یوم منه فیقول: یوم کذا فیکون ذلک تفسیراً للکلام الأول فکذا**

ههنا. (التفسير الكبير: ۱/۷۷۰،ط:داراحياء التراث).

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں: قوله تعالىٰ: الذى أنزل فيه القرآن، نص في أن القرآن نزل في شهر رمضان، وهو يبين قوله عزوجل:حم والكتاب المبين إنا أنزلناه في ليلة مباركة ، يعنى ليلة القدر، ولقوله تعالىٰ: إنا أنزلناه فى ليلة القدر ، وفى هذا دليل على أن ليلة القدر إنما تكون في رمضان لا في غيره ، ولا خلاف أن القرآن أنزل من اللوح المحفوظ ليلة القدر... (الجامع لأحكام القرآن: ۲/۲۹۷).

تفسیر المظہری میں مذکور ہے:

إنا أنزلناه يعنى القرآن، في ليلة مباركة لما فيها نزول القرآن السبب للمنافع الدينية والدنيوية وفيها نزول الملائكة والرحمة وإجابة الدعاء وهي ليلة القدر كذا قال قتادة ، وابن زيد قالا: أنزل الله القرآن فى ليلة القدر من أم الكتاب إلى السماء الدنيا...وما قيل إنها ليلة النصف من شعبان فليس بشيء . (التفسير المظهرى ،سورة الدخان).

روح المعانی میں مذکور ہے:

في ليلة مباركة هي ليلة القدر على ماروى عن ابن عباسؓ وقتادة وابن جبير ومجاهد، وابن زيد والحسن وعليه أكثر المفسرين والظواهر معهم . (روح المعانى ، سورة الدخان).

المدخل میں ابن الحاج مالکیؒ نے لکھا ہے: المشهور منهما أنها ليلة القدر . (المدخل : ۱/۲۹۹).

التفسیر الکبیر میں مرقوم ہے:

أما الأولون فقد احتجوا على صحة قولهم بوجوه : أولها : أنه تعالىٰ قال: إنا أنزلناه في ليلة القدر ، وههنا قال: إنا أنزلناه في ليلة مباركة ، فوجب أن تكون هذه الليلة المباركة هي تلك المسماة بليلة القدر لئلا يلزم التناقض. وثانيها: إنه تعالىٰ قال: شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن، [البقرة:۸۵]، فبين أن إنزال القرآن إنما وقع في شهر رمضان، وقال ههنا: إنا أنزلناه في ليلة مباركة ، فوجب بأن تكون هذه الليلة واقعة في شهررمضان وكل من قال: إن

هـذه الليلة المباركة واقعة في شهر رمضان ، قال: إنها ليلة القدر ، فثبت أنها ليلة القدر ...
(التفسير الكبير: ۱۴/۲۳۸،سورة الدخان).

حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے بیان القرآن میں لکھا ہے:

بعض نے لیلۃ مبارکۃ کی تفسیر لیلۃ البراءۃ سے کی ہے،اس بنا پر کہ روایات میں اس کی نسبت بھی واقعاتِ سالانہ کا فیصلہ ہونا آیا ہے،لیکن چونکہ کسی روایت میں اس میں قرآن کا نزول وارد نہیں،اور شبِ قدر میں نزول خود قرآنِ کریم میں مذکور ہے،: **إنـا أنـزلـنـاه فـي ليلة القدر** ،اس لیے یہ تفسیر صحیح نہیں معلوم ہوتی۔(بیان القرآن: ۱۰/۹۹)۔ **ولـلاستـزادة راجع:** (الـدرالـمـنثـور: ۱/۴۵۴،وتـفـسيـرابـن كثيـر: ۱/۱۵۰، والجـامع لاحكـام القرآن: ۲/۲۹۷).

نیز احادیثِ کثیرہ میں بھی اس بات کی تصریح موجود ہے کہ لیلۃ مبارکۃ سے لیلۃ القدر مراد ہے۔درجِ ذیل کتبِ حدیث میں ملاحظہ فرمائیں: (الـمستـدرک لـلـحاكم: ۲/۴۸۷، رقم:۳۶۷۸، وإسناده صحيح على شرط مسلم، والمعجم الكبير: ۱۱/۳۹۱، وفضائل الأوقات للبيهقي،ص ۲۱۵،وشرح معاني الآثار:۳/۹۳).

واللہ ﷻ اعلم۔

شبِ براءت کے متعلق چند مفید رسائل کی نشاندہی:

سوال نمبر۱۲: شعبان کے بارے میں اردو میں جو رسالے لکھے گئے ہیں،برائے مطالعہ یا دوست احباب کو بتلانے کے لیے،ان میں چند کی نشاندہی فرمادیں؟

الجواب: شبِ براءت کے فضائل اور احکام سے متعلق درجِ ذیل چند مشہور رسائل کا مطالعہ مفید ہے: ۱۔سال بھر کے مسنون اعمال،ازحکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔(ص:۱۷،ط:ادارۂ اسلامیات لاہور)۔ ۲۔شبِ براءت،ازمفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی۔(ط:مرغوب بکڈ پو دیوبند)۔

۳۔شبِ براءت کی حقیقت،ازمفتی محمد تقی عثمانی صاحب۔(ط:میمن اسلامک پبلشرز)۔

۴۔شعبان المعظم،ازحافظ تنویر احمد شریفی۔(ط:مکتبہ رشیدیہ)۔

۵۔ بارہ مہینوں کے فضائل واحکام، از مفتی سید عبدالکریم گمتھلوی مجاز بیعت حکیم الامت۔(ص۳۰،ط:ادارہ اسلامیات لاہور)۔۶۔شعبان وشبِ براءت کے فضائل واحکام، از مفتی محمد رضوان۔(ادارہ غفران راولپنڈی پاکستان)۔

شبِ براءت میں منقول دعا کی حیثیت:

سوال۱۳: شبِ براءت میں کوئی خاص دعا حدیث شریف میں منقول ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتاب کے حوالہ سے دعا کی نشاندہی فرمادیں؟

الجواب: کتبِ حدیث میں بعض روایات میں یہ بات دستیاب ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ براءت میں مختلف دعائیں فرمائیں، اگرچہ اکثر روایات ضعیف ہیں، اور محدثین نے بعض رواۃ کو بہت ضعیف، منکر، اور متروک کہا ہے، تاہم اگر کوئی ان دعاؤں کو پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، ہاں ان دعاؤں کو اس رات کا مسنون عمل نہیں سمجھنا چاہیے۔ روایات کی تفصیل اور تحقیق حسبِ ذیل ملاحظہ کیجیے:

أخرج الإمام الطبراني في كتاب الدعاء (رقم:٦٠٢) **بسنده عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، قالت: كانت ليلة النصف من شعبان ليلتي، فبات رسول الله صلى الله عليه وسلم عندي، فلما كان في جوف الليل فقدته فأخذني ما يأخذ النساء من الغيرة فتلفعت بمرطي، أم والله ما كان مرطي خزاً ولا قزاً ولا حريراً ولا ديباجاً ولا قطناً ولا كتاناً، قيل: ومما كان يا أم المؤمنين؟ قالت: كان سداه شعراً ولحمته من أوبار الإبل، قالت: فطلبته في حجر نسائه فلم أجده فانصرفت إلى حجرتي فإذا به كالثوب الساقط على وجه الأرض ساجداً وهو يقول في سجوده:**

”سَجَدَ لَکَ سَوَادِیْ وَخَیَالِیْ وَآمَنَ بِکَ فُؤَادِیْ، هٰذِه يَدِیْ وَمَا جَنَيْتُ بِهَا عَلٰى نَفْسِيْ يَا عَظِيْمُ يُرْجَى لِكُلِّ عَظِيْمٍ، اغْفِرِ الذنب العظيم، سجد وجهى للذى خلقه وشق سمعه وبصره، ثم رفع رأسه فعاد ساجداً فقال: أعوذ برضاک من سخطک وأعوذ بمعافاتک من عقوبتک وأعوذ بک منک لا أحصى ثناء عليک أنت كما أثنيت على نفسک، أقول

كما قال أخي داود عليه السلام : اغفر وجهي في التراب لسيدى فحق له ان سجد ، ثم رفع رأسه فقال: اللّٰهم ارزقني قلباً من الشر نقياً لا كافراً ولا شقياً ، قالت: ثم انصرف فدخل معي في الخميلة ولي نفس عال...الخ. قال محشيه : إسناده ضعيف ، فيه سليمان بن أبي كريمة يحدث بمناكير . (التعليقات على كتاب الدعاء،ص ۱۰۷۱، دارالبشائر الاسلامية). وايضاً أخرجه البيهقي في شعب الايمان (۳۵۵۷).

حافظ ابن حجرؒ نے الامالی المطلقہ میں اس حدیث کوذکر کرنے بعدلکھا ہے:

هذا حديث غريب ، ورجاله موثقون إلا سليمان بن أبي كريمة ففيه مقال، وقد رواه بطوله النصر بن كثير عن يحيى بن سعيد الأنصاري عن عروة ،أخرجه البيهقي في فضائل الأوقات من طريقه والنصر بن كثير أيضاً فيه مقال لكنه أصلح حالاً من سليمان ، وقد أخرج مسلم من حديث أبي هريرةؓ عن عائشة رضى اللّٰه تعالىٰ عنهاطرفاً من هذا الحديث مختصراً جداً ، قالت : فقدت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ذات ليلة فالتمسته فوقعت يدى على قدميه وهما منصوبتان وهوساجد يقول: أعوذ برضاك من سخطك ، الذكر فقط .ورواه من وجه آخر كما سأذكره والمتعلق منه بنصف شعبان . (الأمالي المطلقة ، ۱۲۱،ط: المكتب الاسلامی).

ضعیف حدیث کے بارے میں تدریب الراوی میں لکھا ہے:

ويجوز عند أهل الحديث وغيرهم التساهل في الأسانيد ورواية ما سوى الموضوع من الضعيف، والعمل به من غير بيان ضعفه في غير صفات اللّٰه تعالىٰ والأحكام كالحلال والحرام ، ومما لا تعلق له بالعقائد والأحكام . (تدريب الراوی : ۱/۳۵۰).

شبِ براءت میں ۱۰ قسم کے لوگوں کی مغفرت نہیں کی جاتی:

سوال نمبر۱۴: پندرھویں شعبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا دریا بہتا ہے، اور بے شمار لوگوں کی مغفرت کردی جاتی ہے،لیکن کیا ایسے لوگ بھی ہیں جن کی اس مبارک رات میں بھی مغفرت نہیں ہوتی ؟

اگر ہیں تو ان کی نشاندہی فرمادیں، اور کن وجوہات کی بناپر مغفرت نہیں ہوتی وہ بھی ذکر کریں؛ تاکہ لوگ اس سے اجتناب کرنے کی کوشش کریں، اور اگر کوئی مبتلا ہو تو اس رات سے پہلے ہی توبہ کرلے؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب حامداً ومصلیاً: احادیث کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ دس قسم کے لوگ ہیں جن کی اس مبارک رات میں بھی مغفرت نہیں ہوتی، اور یہ اس وجہ سے ہے کہ جن معاصی اور گناہ میں وہ مبتلا ہیں وہ بہت زیادہ قبیح وشنیع ہیں، تو ان کی قباحت وشناعت کی نحوست کی وجہ سے وہ حضرات مغفرت سے محروم رہتے ہیں، ان دس افراد کو درج ذیل احادیث کی روشنی میں ملاحظہ کیجئے۔

(۱) مشرک: شرک کے معنی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی چیز کو شریک ٹھہرانا، شرک توحید کی ضد ہے، اور شرک کرنے والا اگر اسی حال میں فوت ہوگیا تو اس کی کسی حال میں مغفرت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰه لا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَآءُ﴾ (النساء: ۴۸).

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جاوے اور ان کے سوا جتنے گناہ ہیں جن کے لیے منظور ہوگا بخش دیں گے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔ (بیان القرآن)۔

صحیح ابن حبان میں ہے:

أخبرنا محمد بن المعافى العابد بصيدا وابن قتيبة وغيره قالوا: حدثنا هشام بن خالد الأزرق قال: حدثنا أبو خليد عتبة بن حماد عن الأوزاعي وابن ثوبان عن أبيه عن مكحول عن مالك بن يخامر عن معاذ بن جبل عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: يطلع اللّٰه تعالى إلى خلقه في ليلة النصف من شعبان فيغفر لجميع إلا لمشرك أو مشاحن. (صحيح ابن حبان: رقم ۵۶۶۵، بيروت) **قال شعيب الأرنؤوط: حديث صحيح بشواهده.**

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شعبان کی پندرہویں رات میں اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور تمام کی مغفرت فرماتے ہیں سوائے مشرک کے اور جس کے دل میں کینہ ہو۔

صحیح بخاری میں ہے:

حدثنا عبد العزيز بن عبد الله قال: حدثني سليمان بن بلال عن ثور بن زيد المدني عن أبي الغيث عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا: يا رسول الله، وما هن؟ قال: الشرك بالله والسحر وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق وأكل الربوا وأكل مال اليتيم والتولى يوم الزحف وقذف المحصنات المؤمنات الغافلات. (صحيح البخاري: رقم ٢٧٦٦).

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سات ہلاک کرنے والی باتوں سے دور رہو۔ لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ، وہ کون سی باتیں ہیں؟ فرمایا: خدا کے ساتھ شرک کرنا اور جادو کرنا اور اس جان کا ناحق مارنا جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور سود کھانا، اور یتیم کا مال کھانا اور جہاد سے فرار یعنی بھاگنا اور پاک دامن بھولی بھالی مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

(۲) مشاحن: وہ شخص جو کسی پر غصہ اور ناراض ہو لیکن اس سے بدلہ لینے کی قوت نہ ہو تو اس کے دل میں غصہ روکنے اور ضبط کرنے سے دل پر ایک قسم کی گرانی ہوتی ہے، دل میں کسی کے بارے میں یہ کیفیت ہونا یہ کینہ اور بغض ہے، اور ایسی کیفیت دل میں رکھنے والا مشاحن ہے۔

لغات الحدیث میں ہے: شحن بھر دینا، دور کرنا، ہانک دینا، حسد کرنا۔ مشاحنہ: بغض رکھنا۔ مشاحن: دشمنی رکھنے والا۔ (لغات: ۲/ ۲۹ ط کتب خانہ کراچی)

حسن البیان فی لیلۃ النصف من شعبان میں ہے:

المشاحن، وهو الذى فى قلبه على أخيه المسلم لهوى فى نفسه، وهذا الحقد والتشاحن يمنع المغفرة فى أغلب أوقاتها. (حسن البيان: ص ٢٥، ط بيروت)

صحیح ابن حبان میں ہے:

أخبرنا محمد بن المعافى العابد بصيدا وابن قتيبة وغيره قالوا: حدثنا هشام بن خالد الأزرق قال: حدثنا أبو خليد عتبة بن حماد عن الأوزاعى وابن ثوبان عن أبيه عن مكحول عن مالك بن يخامر عن معاذ بن جبل عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: يطلع

اللّٰہ تعالی إلی خلقه فی لیلة النصف من شعبان فیغفر لجمیع إلا لمشرک أو مشاحن. (ابن حبان: رقم ۵۶۶۵، بیروت) **قال شعیب الأرنؤوط: حدیث صحیح بشواهده.**

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شعبان کی پندرہویں رات میں اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور تمام کی مغفرت فرماتے ہیں سوائے مشرک کے اور جس کے دل میں کینہ ہو۔

صحیح مسلم میں ہے:

حدثنا قتیبة بن سعید عن مالک بن أنس فیما قرئ علیه عن سهل عن أبیه عن أبي هریرة رضي اللّٰه عنه أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: تفتح أبواب الجنة یوم الاثنین ویوم الخمیس فیغفر لکل عبد لا یشرک باللّٰه شیئاً إلا رجلاً کانت بینه وبین أخیه شحناء، فیقال: انظروا هٰذین حتی یصطلحا، انظروا هٰذین حتی یصطلحا، انظروا هٰذین حتی یصطلحا. (صحیح مسلم: رقم ۲۵۶۵).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور ہر اس بندے کی مغفرت کردی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، سوائے اس شخص کے جو اپنے (مسلمان) بھائی سے کینہ رکھتا ہو، تو کہا جائے گا: ان دونوں کو مہلت دو یہاں تک کہ وہ صلح کرلے۔

(۳) قاتل: کسی انسان کو ناحق قتل کرنے والا چاہے مقتول مسلمان ہو یا کافر، ایسے شخص کے بارے میں بہت سخت وعیدیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں۔ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ کسی کو ناحق قتل کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿**وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيماً**﴾ (النساء: ۹۳).

عن عبد اللّٰه بن عمرو رضی اللّٰه عنه أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: یطلع اللّٰه عز وجل إلی خلقه لیلة النصف من شعبان فیغفر لعباده إلا لاثنین: مشاحن وقاتل نفس. قال الشیخ شعیب الأرنؤوط: حدیث صحیح بشواهده، وهذا إسناد ضعیف لضعف ابن لهیعة . (مسند أحمد مع تعلیقات الشیخ شعیب الأرنؤوط، رقم: ۶۶۴۲).

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پندرہویں شعبان کی رات کو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور تمام بندوں کی مغفرت فرمادیتے ہیں سوائے دو کے: کینہ رکھنے والا، اور قاتل۔

صحیح بخاری میں ہے:

حدثنا عبد العزيز بن عبد الله قال: حدثني سليمان بن بلال عن ثور بن زيد المدني عن أبي الغيث عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا: يا رسول الله، وما هن؟ قال: الشرك بالله والسحر وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق وأكل الربوا وأكل مال اليتيم والتولي يوم الزحف وقذف المحصنات المؤمنات الغافلات. (صحيح البخاري: رقم ٢٧٦٦).

حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سات ہلاک کرنے والی باتوں سے دور رہو۔ لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ، وہ کون سی باتیں ہیں؟ فرمایا: خدا کے ساتھ شرک کرنا اور جادو کرنا اور اس جان کا ناحق مارنا جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اور سود کھانا، اور یتیم کا مال کھانا، اور جہاد سے فرار یعنی بھاگنا اور پاک دامن بھولی بھالی مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

(۴) قاطع رحم، رشتہ قطع کرنے والا: قطع رحمی کا مطلب یہ ہے کہ رشتہ داروں کو ایذا و تکلیف پہنچانا، اور ان سے سلام کرنا چھوڑ دینا، اور ان کی خبر نہ لینا، قطع رحمی کبیرہ گناہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ. أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمٰى أَبْصَارَهُمْ﴾ (محمد: ٢٢).

شعب الایمان للبیہقی میں ہے:

قالت عائشة: دخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم فوضع عنه ثوبيه ثم لم يستتم أن قام فلبسها فأخذتني غيرة شديدة فظننت أنه يأتي بعض صويحباتي فخرجت اتبعه بالبقيع بقيع الغرقد، يستغفر للمؤمنين والمؤمنات والشهداء، فقلت: بأبي وأمي، أنت في

حاجة ربک، وأنا في حاجة الدنيا فانصرفت فدخلت حجرتي ولي نفس عال ولحقني رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: ما هذا النفس يا عائشة؟ فقالت: بأبي وأمي أتيتني فوضعت عنک ثوبيک ثم لم تستتم أن قمت فلبستهما فأخذتني غيرة ظننت أنک تأتي بعض صويحباتي حتى رأيتک بالبقيع تصنع ما تصنع قال: يا عائشة، أكنت تخافين أن يحيف الله عليک ورسوله، بل أتاني جبريل عليه السلام فقال: هذه الليلة ليلة النصف من شعبان، ولله فيها عتقاء من النار بعدد شعور غنم كلب لا ينظر الله فيها إلى مشرک ولا إلى مشاحن ولا إلى قاطع رحم... (رقم ۳۸۳۷، ط بيروت).

حضرت عائشہؓ کی روایت کے اخیر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور کہا: یہ نصف شعبان کی رات ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ بنوکلب کے دنبوں کے بالوں کے برابر لوگوں کو جہنم سے آزاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِس رات میں شرک کرنے والوں، کینہ رکھنے والوں اور قطع رحمی کرنے والوں کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں فرماتے۔ صحیح البخاری میں ہے:

حدثنا يحيى بن بكير حدثنا الليث عن ابن شهاب أن محمد بن مطعم قال: إن جبير بن مطعم أخبره أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: لا يدخل الجنة قاطع. (رقم: ۵۹۸۴، ط دار طوق النجاة).

(۵) مسبل ازار: شلوار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا۔

شعب الایمان للبیہقی میں ہے:

قالت عائشة: دخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم فوضع عنه ثوبيه ثم لم يستتم أن قام فلبسهما ...إلى قوله: أتاني جبريل عليه السلام فقال: هذه الليلة ليلة النصف من شعبان، ولله فيها عتقاء من النار بعدد شعور غنم كلب لا ينظر الله فيها إلى مشرک ولا إلى مشاحن ولا إلى قاطع رحم ولا إلى مسبل... (رقم ۳۸۳۷، ط بيروت).

ابوداؤد شریف میں ہے:

حدثنا موسى بن إسماعيل حدثنا أبان حدثنا يحيى عن أبي جعفر عن عطاء بن يسار عن أبي هريرة رضى الله عنه قال: بينما رجل يصلي مسبلاً إزاره إذ قال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: اذهب فتوضأ ثم جاء ثم قال: اذهب فتوضأ فذهب فتوضأ ثم جاء ،فقال له رجل: يارسول الله ! مالك أمرته أن يتوضأ، فقال: إنه كان يصلي وهو مسبل إزاره وإن الله تعالىٰ لا يقبل صلاة رجل مسبل إزاره . (أبو داود: رقم ٦٣٨، ط بيروت)

ایک روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: اس دوران کہ ایک شخص ٹخنوں سے نیچے ازار لٹکائے ہوئے نماز پڑھ رہا تھا کہ اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ وضو کر کے آؤ، وہ وضو کر کے آئے، پھر دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ، کیا بات پیش آئی کہ آپ نے انہیں وضو کا حکم فرمایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے نماز پڑھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ مسبل ازار کی نماز قبول نہیں فرماتے۔

(۶) عاق الوالدین: والدین کا نافرمان؛

مسند احمد میں ہے:

حدثنا يعقوب أبي عن الوليد بن كثير عن قطن بن وهب بن عويمر بن الأجدع عمن حدثه عن سالم بن عبد الله بن عمر أنه سمعه يقول: حدثني عبد الله بن عمر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ثلاثة قد حرم الله تبارك وتعالى عليهم الجنة مدمن الخمر، والعاق، والديوث الذى يقر في أهله الخبث. (رقم ٦١١٣). **قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: صحيح وهذا إسناد ضعيف لجهالة راويه عن سالم .**

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین قسم کے لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام فرمادی ہے: شراب کا عادی، والدین کا نافرمان، اور وہ بے غیرت جو اپنے گھر والوں کی فحاشی پر خاموش رہتا ہے۔

شعب الایمان للبیہقی میں ہے:

... يا عائشة، أكنت تخافين أن يحيف الله عليك ورسوله، بل أتاني جبريل عليه

السلام فقال: هذه الليلة ليلة النصف من شعبان، ولله فيها عتقاء من النار بعدد شعور غنم كلب لا ينظر الله فيها إلى مشرك ولا إلى مشاحن ولا إلى قاطع رحم ولا إلى مسبل ولا إلى عاق والديه، ولا إلى مدمن خمر ... الخ. إسناده ضعيف. (رقم ٣٥٥٦).

وأيضاً أخرجه ابن عساكر في تاريخ مدينة دمشق.

سنن نسائی میں ہے:

أخبرنا محمد بن بشار عن محمد، قال حدثنا شعبة عن منصور عن سالم بن أبي الجعد عن نبيط عن جابان عن عبد الله بن عمرو عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا يدخل الجنة منان ولا عاق ولا مدمن خمر. (رقم: ٥٦٨٨، ط بيروت)

(۷) مدمن خمر: شراب کا عادی:

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ شبِ براءت میں شراب کے عادی کی طرف نظر رحمت نہیں فرماتے اور نہ اس کی مغفرت فرماتے ہیں؛ سنن کبریٰ للبیہقی میں ہے:... أتاني جبريل عليه السلام فقال: هذه الليلة ليلة النصف من شعبان، ولله فيها عتقاء من النار بعدد شعور غنم كلب لا ينظر الله فيها إلى مشرك ولا إلى مشاحن ولا إلى قاطع رحم ولا إلى مسبل ولا إلى عاق والديه، ولا إلى مدمن خمر ... الخ . إسناده ضعيف. (رقم ٣٥٥٦).

وعن أبي بن كعب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن جبريل أتاني ليلة النصف من شعبان قال: قم فصل وارفع رأسك ويديك إلى السماء قال: فقلت يا جبريل ما هذه الليلة ؟ قال: يا محمد، يفتح أبواب السماء وأبواب الرحمة ثلاثمئة باب فيغفر لجميع من لا يشرك بالله شيئاً غير مشاحن أو غاش أو مدمن خمر أو مصر على زنى، فإن هؤلاء لا يغفر لهم حتى يتوبوا. (أخرجه ابن عساكر في تاريخ مدينة دمشق، رقم ٥٩٢٣).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جبریل شعبان کی پندرہویں رات میرے پاس آئے اور کہا کہ اٹھیے اور نماز پڑھیے اور اپنا سر اور ہاتھ آسمان کی جانب بلند کیجیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے کہا جبریل،

یہ کون سی رات ہے، انہوں نے کہا: اے محمد، (اس رات) آسمان اور رحمت کے ۳۰۰ دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور تمام لوگوں کی مغفرت کردی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے سوائے کینہ رکھنے والا، دھوکہ باز، شراب کا عادی، اور زنا کا عادی۔ اِن لوگوں کی مغفرت نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے۔

(۸) زانی: زنا کرنے والے مرد وعورت، زنا بدترین گناہ ہے، احادیث میں اس کے مرتکب کے لیے سخت وعیدیں آئی ہیں۔ **أخرج ابن عساكر في تاريخ مدينة (تحت ترجمة محمد بن أحمد بن عبد الرحمن الملطي المقري رحمه الله) مسنده من أبي بن كعب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن جبريل أتاني ليلة النصف من شعبان قال: قم فصل وارفع رأسک ويديک إلى السماء قال: فقلت يا جبريل ما هذه الليلة؟ قال: يا محمد، يفتح أبواب السماء وأبواب الرحمة ثلاثمئة باب فيغفر لجميع من لا يشرک بالله شيئا غير مشاحن أو غاش أو مدمن خمر أو مصر على زني، فإن هؤلاء لا يغفر لهم حتى يتوبوا.** (رقم ۵۹۲۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جبریل شعبان کی پندرہویں رات میرے پاس آئے اور کہا کہ اٹھیے اور نماز پڑھیے اور اپنا سر اور ہاتھ آسمان کی جانب بلند کیجیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے کہا جبریل، یہ کون سی رات ہے، انہوں نے کہا: اے محمد، (اس رات) آسمان اور رحمت کے ۳۰۰ دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور تمام لوگوں کی مغفرت کردی جاتی ہے جو اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے سوائے کینہ رکھنے والا، دھوکہ باز، شراب کا عادی، اور زنا کا عادی۔

سنن کبری للبیہقی میں ہے:

وأخبرنا أبو عبد الله الحافظ حدثنا أبو العباس محمد بن يعقوب حدثنا أبو محمد الحسن بن علي بن عفان حدثنا ابن نمير عن الأعمش عن عبد الله مرة عن مسروق قال: قال عبد الله: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل دم رجل يشهد أن لا إله إلا الله وأني رسول الله إلا بأحدى ثلاثة نفر: النفس بالنفس، والثيب الزاني، والتارک لدينه المفارق للجماعة. رواه مسلم في الصحيح عن محمد بن عبد الله بن نمير عن أبيه.

وأخرجه البخاری من ووجه آخر عن الأعمش. (السنن الكبرى للبيهقى، رقم ١٦٢٦٢)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی ایسے شخص کا خون حلال نہیں جو گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ میں اللہ تعالی کا رسول ہوں سوائے تین لوگوں کے: قاتل، شادی شدہ زناکار، اور مرتد۔

(۹) غاش: دھوکے باز۔

أخرج ابن عساكر فی تاريخ مدينة (تحت ترجمة محمد بن أحمد بن عبد الرحمن الملطی المقری رحمه الله) مسنده من أبی بن كعب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن جبريل أتانی ليلة النصف من شعبان قال: قم فصل وارفع رأسک ويديک إلی السماء قال: فقلت يا جبريل ما هذه الليلة؟ قال: يا محمد، يفتح أبواب السماء وأبواب الرحمة ثلاثمئة باب فيغفر لجميع من لا يشرک بالله شيئا غير مشاحن أو غاش أو مدمن خمر أو مصر على زنی، فإن هؤلاء لا يغفر لهم حتى يتوبوا...الخ

قال أبو عمرو عثمان بن سعيد الدانی: سمعت إسماعيل بن رجاء يقول: كان أبو الحسين الملطی كثير التصنيف فی الفقه وكان يتفقه للشافعی وكان يقول الشعر ويسره ويعجب به. قال: وسمعت إسماعيل يقول: توفی أبو الحسين الملطی بعسقلان سنة سبع وسبعين وثلاثمئة. (تاريخ دمشق: حديث ٥٩٢٣).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جبریل شعبان کی پندرہویں رات میرے پاس آئے اور کہا کہ اٹھیے اور نماز پڑھیے اور اپنا سر اور ہاتھ آسمان کی جانب بلند کیجیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے کہا جبریل، یہ کون سی رات ہے، انہوں نے کہا: اے محمد، (اس رات) آسمان اور رحمت کے ۳۰۰ دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور تمام لوگوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے جو اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے سوائے کینہ رکھنے والا، دھوکہ باز، شراب کا عادی، اور زنا کا عادی۔

مسلم شریف میں ہے: **عن أبی هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من حمل علينا**

السلاح فلیس منا. (صحیح مسلم:رقم ،۱۶۴).

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھائے اور جو ہمیں دھوکا دے۔

(۱۰) مصور: تصویر کشی کرنے والا، احادیث مبارکہ میں مصور کے لیے سخت وعیدیں آئی ہیں۔

فضائل الاوقات میں ہے:

حدثنا أبو عبد اللّٰه قال: حدثنا أبو جعفر محمد بن صالح بنهائی قال: حدثنا إبراهيم بـن إسـحاق الغسيلی قال: حدثنا وهب بن بقية، قال: أخبرنا سعيد بن عبد الكريم الواسطی عـن أبـی الـنعمان السعدی عن أبی الرجاء العطاردی عن أنس بن مالک قال: بعثنی رسول اللّٰـه صـلـی اللّٰـه عليه وسلم إلی منزل عائشة رضی الله عنها فی حاجة، فقلت لها: أسرعی! فإنی تركت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يحدثهم عن ليلة النصف من شعبان، فقالت: يا أنيس، اجلس حتى أحدثک بحديث ليلة النصف من شعبان...

...قلت: يا رسول اللّٰه، وما بال شعر غنم كلب، قال: لم يكن فی العرب قبيلة قوم أكبر غنما مـنهـم، لا أقول ستة نفر: مدمن خمر، ولا عاق لوالديه، ولا مصر على زنی، ولا مصارم، ولا مصور... في إسناده سعيد بن عبد الكريم الواسطی، وهو متروک. (فضائل الأوقات: رقم ۲۷).

میزان الاعتدال میں ہے: **سـعيـد بـن عبـد الـكـريـم. روى عنه أبو بكر بن عياش. قال الأزدی: متروک.** (رقم: ۳۲۳۲).

مسلم شریف میں ہے: **عـن عبـد الـلّٰـه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إن أشد الناس عذاباً يوم القيامة المصورون. ولم يذكر الأشج إنَّ.** (صحیح مسلم: رقم ۲۱۰۹).

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے سخت عذاب قیامت کے دن تصویریں بنانے والوں کو ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شبِ براءت میں قبولیتِ دعا کا ثبوت:

سوال نمبر ۱۵: شبِ براءت میں دعا کی قبولیت سے متعلق کسی حدیث میں صراحت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ حدیث کس درجہ کی ہے؟ نیز علمائے کرام اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

الجواب: شبِ براءت میں دعا کی قبولیت سے متعلق کوئی مرفوع روایت بندہ کو نہیں ملی البتہ ابن رجب حنبلیؒ نے لطائف المعارف میں عمر بن عبدالعزیزؒ سے اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عمر اور امام شافعی کا اثر اور اسی طرح السنن الکبری میں صراحۃ شب براءت میں دعا کی قبولیت سے متعلق روایت نقل فرمائی ہے۔ اور جب صحابی یا تابعی ایسی بات بیان کرے جو غیر مدرک بالقیاس ہو تو وہ مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔

لطائف المعارف لابن رجب:

وقد روى عن عمر بن عبد العزيزؒ أنه كتب إلى عامله إلى البصرة: عليك بأربع ليال من السنة، فإن الله عز وجل يفرغ فيهن الرحمة إفراغاً أول ليلة من رجب وليلة النصف من شعبان وليلة الفطر وليلة الأضحى . وفى صحته عنه نظر. (ص: ۱۳۷).

وفي شعب الإيمان للبيهقي: ومما أنبأني أبو عبد الله الحافظ إجازة ورواية عنه الإمام أبو عثمان إسماعيل بن عبد الرحمن الصابوني (ثقة) أنا أبو عبد الله محمد بن على بن عبد الحميد نا إسحاق بن إبراهيم أنا عبد الرزاق أخبرني من سمع ابن البيلماني يحدث عن أبيه عن ابن عمر رضي الله عنه قال: خمس ليال لا يرد فيه الدعاء: ليلة الجمعة وأول ليلة من رجب وليلة النصف من شعبان وليلتا العيد. (رقم: ۳۷۱۳، ۳۴۲/۳).

وفى شعب الإيمان للبيهقى:

أخبرنا أبو سعيد محمد بن موسى (ثقة) حدثنا أبو العباس الأصم (ثقة) أخبرنا الربيع (ثقة) أخبرنا الشافعي (ثقة) أخبرنا إبراهيم بن محمد (صدوق) قال: قال ثور بن يزيد (ثقة، ثبت): عن خالد بن معدان (ثقة عابد يرسل كثيرا) عن أبي الدرداء رضي الله عنه قال: من قام

ليلتي العيدين لله محتسباً لم يمت قلبه حين تموت القلوب. قال الشافعي: وبلغنا أنه كان يقال: إن الدعاء يستجاب في خمس ليال، فى الجمعة وليلة الأضحى وليلة الفطر وأول ليلة من رجب وليلة النصف من شعبان. (رقم: ۳۴۳۸، ۵/۲۸۷).

وفى فضائل ليلة النصف من شعبان لعبد الحفيظ ملک عبد الحق المكى:

قال الشيخ دلاور كملائى في رسالته عن ليلة النصف من شعبان بعد نقل بلاغ الإمام الشافعى المذكور وقوله ما نصه: كذا فى كتاب الأم، ورواه أيضا البيهقى فى السنن الكبرى فى (باب عبادة ليلة العيدين) من كتاب الصلاة، و فى معرفة السنن والآثار، و المناوى فى إتحاف السادة المتقين فى مسائل العيدين ثم قال: قلت: و بلاغات الإمام الشافعى رضى الله عنه مقبولة كبلاغات الإمام محمد بن الحسن الشيبانى والإمام مالک و تعليقات البخارى رحمهم الله تعالى. انتهى. (ص: ۲۰).

وفى مقدمة إعلاء السنن قواعد فى علوم الحديث:

بلاغات الثقات من أهل القرون الثلاثة مقبولة عندنا مطلقا، كالإمام مالک وأبى حينفة والشافعى ومحمد بن الحسن وأبى يوسف وأمثالهم. وبلاغات من دون هؤلاء إن كان يرويها الثقات كما رووا مسنده، كالبخارى وأحمد وغيرهما فمقبول اتفاقاً إذا كان بصيغة الجزم، وإن كان يرسل عن الثقات وغيرهم فلا يقبل اتفاقاً . (۱۶۳/۱۹)

قال في قفو الأثر في صفوة علوم الأثر : و المختار فى التفصيل قبول مرسل الصحابي إجماعاً ومرسل أهل القرن الثاني والثالث وعندنا (الحنفية) وعند مالک مطلقاً. (قفو الأثر، ص: ٦٧). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

۞۞۞۞۞۞۞۞۞

باب ...... ﴿۷﴾

حج سے متعلق متفرق مسائل:

فرض نماز کا سنتِ احرام کے قائم مقام ہونے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے فرض نماز پڑھی اور اس کے بعد احرام کی نیت کی، نفل نماز الگ سے نہیں پڑھی تو کیا یہ فرض نماز احرام کی سنت نماز کی طرف سے کافی ہوگی یا نہیں؟ یعنی احرام کی سنت ادا ہوئی یا نہیں؟

الجواب: اکثر فقہاء فرماتے ہیں کہ فرض نماز کے بعد احرام کی نیت کرنے سے احرام کی سنت ادا ہو جائے گی، اور دونوں میں تداخل ہو جائے گا، لیکن بعض فقہاء کے نزدیک احرام کی سنت ادا نہیں ہوگی، بلکہ الگ سے نفل نماز پڑھ کر احرام باندھنا سنت ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

وصلى ندباً ، بعد ذلک شفعاً يعني ركعتين في غير وقت مكروه و تجزيه المكتوبة ، قوله و تجزيه المكتوبة ، كذا في الزيلعي والفتح والنهر واللباب وغيرها وشبهوها بتحية المسجد ، وفي شرح اللباب أنه قياس مع الفارق لأن صلاة الإحرام سنة مستقلة كصلاة الاستخارة وغيرها مما لا تنوب الفريضة منابها بخلاف تحية المسجد و شكر الوضوء فإنه ليس لهما صلاة على حدة كما حققه في فتاوى الحجة فتتأدى في ضمن غيرها أيضاً ، ونقل بعضهم أنه رد عليه الشيخ حنيف الدين المرشدي . (فتاوى الشامي: ۲/ ۴۸۲،سعيد).

وقال فى النتف فى الفتاوىٰ: والرابع : صلاة الإحرام ؛ فإن الرجل إذا أراد أن يحرم

یغتسل و یلبس ثوبین جدیدین أو غسیلین و یصلی رکعتین ثم یلبي وإن کان صلی الفریضة وأحرم علی أثرها أجزأتاه عن الرکعتین . (النتف فی الفتاویٰ،ص ۲۰۷،ط: بیروت، وکذا فی ص ۱۳۴).

علاوہ ازیں دیگر کتبِ فقہ میں بھی یہی بات مرقوم ہے کہ فرض نماز سنتِ احرام کی طرف سے کافی ہوجاتی ہے۔البتہ ملاعلی قاریؒ نے شرحِ لباب میں علامہ سندیؒ کی مخالفت کی ہے،اوراحرام کی نماز کو مستقل قرار دیا ہے، لیکن ارشاد الساری میں علامہ عبدالغنی مکیؒ نے وضاحت فرمادی کہ ملاعلی قاریؒ کی یہ بات اکثر کتبِ فقہ کے مخالف ہے۔ملاحظہ ہو: (لباب وشرح لباب مع ارشاد الساری،ص ۱۱۱،ط: بیروت)۔

وللاستزادة ینظر : (فتح القدیر: ۲/ ۴۳۲،ط: دار الفکر،والفتاوی الهندیة: ۱/ ۲۲۳،والبحر الرائق: ۲/ ۳۴۵، دار المعرفة، وتبیین الحقائق: ۲/ ۹،امدادیہ ،ملتان، ومنحة الخالق حاشیة البحر الرائق: ۲/ ۳۴۵،ط: کوئٹہ).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے: اگر ایسا وقت ہو جس میں نفل ادا کرنا مکروہ ہے تو یہ نماز نہ پڑھے اور اگر اس وقت متصل ہی فرض نماز پڑھ لی ہو تو سنتِ احرام کے لیے بھی وہی کافی ہے جیسا کہ تحیۃ المسجد کے لیے کافی ہوجاتی ہے۔(عمدۃ الفقہ :۴/ ۱۲۱)۔واللہ ﷻ اعلم۔

مشین سے بال کاٹنے پر حلق کی سنت ادا ہونے کا حکم:

سوال: کیا بال کاٹنے والی مشین اگر زیرو نمبر پر ہو تو استرے کے قائم مقام ہوگی یا نہیں؟ نیز اگر بال پوروے سے کم ہو تو مشین پھیرنے سے احرام سے نکل جائے گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: حلق کا مقصد بالوں کو جڑ سے صاف کرنا ہے اور زیرو مشین میں یہ مقصد پورا ہوجاتا ہے لہٰذا زیرو نمبر مشین سے بالوں کی صفائی حلق کے قائم مقام ہوجائے گی اور محرم اپنے احرام سے نکل جائیگا۔لیکن اگر بال بہت چھوٹے ہوں اور مشین میں نہ آتے ہوں تو پھر استرہ استعمال کرنا چاہیے۔ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

والوارد فی الصحیحین: أحفوا الشوارب وأعفوا اللحی وهو البالغة فی القطع فبأی شيء حصل المقصود غیر أنه بالحلق بالموسی أیسر منه بالقصة فلذا قال الطحاوي: الحلق أحسن من القص وقد یکون مثله بسبب بعض الآلات الخاصة بقص الشارب وأما ذکر القص في بعض الأحادیث فالمراد منه المبالغة فی الاستئصال . (۳/ ۱۱،ط: کوئٹہ).

(وكذا فى فتح القدير: ۳/۳۴،ط: دار الفكر).

قال في البدائع: فإن حلق رأسه بالنورة أجزأه والموسى أفضل أما الجواز فلحصول المقصود و هو إزالة الشعر. (بدائع الصنائع: ۲/۱۴۰، ط: سعيد).

قال العلامة السرخسيؒ: وإن حلق رأسه بالنورة أجزأه لأن قضاء التفث فيه يحصل والموسى أحب إلى لأنه أقرب إلى موافقة فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم. (المبسوط: ۴/۱۲۵،ط: دار الفكر،بيروت). وكذا فى المبسوط للامام محمد: ۲/۴۳۰،ط:ادارة القرآن،كراتشى).

شریعتِ مطہر میں آلات مقصود نہیں ہوتے بلکہ وہ عمل مقصود ہوتا ہے، آلات زمانہ کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں، ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت میں استرہ استعمال کرلے تو زیادہ بہتر ہوگا، جیسا کہ علامہ سرخسیؒ نے فرمایا ہے۔ لیکن اگر بال بہت چھوٹے ہوں اور مشین میں نہ آتے ہوں تو پھر استرہ استعمال کرنا چاہیے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

اگر مشین ایسی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا بال بھی کاٹ دیتی ہے تو اب کسی تدارک کی ضرورت نہیں، سب عمرے درست ہوگئے، البتہ ایسی حالت میں (جب کہ بال بہت چھوٹے ہوں اور مشین میں نہ آتے ہوں) احتیاط یہ ہے کہ استرہ پھیر دیا کریں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/۳۹۶، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

احرام باندھتے وقت زیر جامہ بھول جانے سے عمرہ کا حکم:

سوال: ایک شخص نے احرام باندھا سلے ہوئے کپڑے نکال کر چادریں پہن لیں، لیکن زیر جامہ (underwear) نکالنا بھول گیا، اب کیا عمرہ ادا ہوا یا نہیں؟ کوئی جزا واجب ہوئی یا نہیں؟

الجواب: زیر جامہ، نیکر سلے ہوئے کپڑوں میں داخل ہے لہٰذا اگر ایک دن رات یا اس سے زیادہ احرام کی حالت میں پہنا ہے تو دم واجب ہوگا اور اگر اس سے کم پہنا ہے تو صدقۂ فطر کی مقدار جزا واجب ہوگی۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے: **إذا لبس المحرم المخيط على الوجه المعتاد يوماً إلى الليل فعليه دم وإن كان أقل من ذلك فصدقة كذا في المحيط سواء لبسه ناسياً أو عامداً عالماً أو جاهلاً مختاراً أو مكرهاً هكذا في البحر الرائق.** (الفتاوىٰ الهندية: ۱/۲۴۲).

(وكذا فى المحيط: ۲/۷۳۲،ط: داراحياء التراث العربى،وتحفة الفقهاء،ص ۴۱۹،ط: بيروت).

احسن الفتاویٰ میں مرقوم ہے: نیکر پہننا بہرحال ناجائز ہے اور اس پر لبس مخیط کی جزاء واجب ہے۔ (احسن الفتاویٰ:۴/۵۲۱)۔

فتاویٰ حقانیہ میں مذکور ہے: دن یارات سے کم وقت میں سلے ہوئے کپڑے پہننا موجبِ صدقہ ہے اور دن یارات سے زائد وقت تک سلے ہوئے کپڑے پہننا موجبِ دم ہے، بحوالہ شامی۔ (فتاویٰ حقانیہ:۴/۲۴)۔

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

جنایات خواہ قصداً کرے یا خطا (غلطی سے) کرے پہلی دفعہ ہو یا مکرر دوبارہ سہ بارہ ہو، احرام یاد ہوتے ہوئے کرے یا بھول کر، خواہ مسئلہ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو... جزا کے واجب ہونے میں سب کا حکم برابر ہے۔ (عمدۃ الفقہ :۴/ ۴۲۸)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بحالتِ طواف احرام کا نجاستِ حقیقیہ سے پاک ہونے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے احرام کی حالت میں خواب دیکھا کہ اس کو احتلام ہوا، اس نے غسل کیا، لیکن احرام کی چادریں صاف تھیں کوئی منی کا دھبہ وغیرہ نظر نہیں آیا، اس کے پاس دوسرا احرام نہیں تھا اس لیے اسی کو پہن لیا، اور عمرہ کا طواف کیا، کیا عمرہ ادا ہوا یا نہیں؟ کوئی جزا واجب ہوئی یا نہیں؟

الجواب: طواف کے لیے کپڑے کا نجاستِ حقیقیہ سے پاک ہونا اصح قول کے مطابق واجباتِ طواف میں سے نہیں، لہٰذا کراہت کے ساتھ طواف ہو جاتا ہے اور کوئی جزا واجب نہیں ہوتی، پھر جبکہ نجاست کا یقین بھی نہیں ہے صرف شک ہے، بنابریں طواف میں کوئی خلل نہیں آیا اور عمرہ صحیح ادا ہو گیا۔

ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

و لو طاف طواف الزيارة و في ثوبه نجاسة اكثر من قدر الدرهم أجزأه ولكن مع الكراهة ولا يلزمه شيء كذا في المحيط . (الفتاوى الهندية: ١/ ٢٤٦، وكذا في اللباب مع شرحه: ١٦٥).

معلم الحجاج میں سنن طواف کے تحت مرقوم ہے: بدن اور کپڑوں کا نجاستِ حقیقیہ سے پاک ہونا۔ (معلم الحجاج، ص ۱۴۷)۔

اگر خواب دیکھا اور کوئی چیز نہیں نکلی تو نہ غسل کرنا واجب ہے اور نہ کپڑے دھونا واجب ہے۔ ملاحظہ ہو:

قال في منية المصلي: وإن احتلم ولم يخرج منه شيء أي تذكر الاحتلام ولم ير بللاً لا غسل عليه إجماعاً . (غنية المتملي في شرح منية المصلي، ص٤٣، ط:سهيل).

قال فی مجمع الأنهر: والطاهر لایزول طهارته بالشک . (مجمع الأنهر: ۱/۲۳).

آپ کے مسائل اوران کا حل میں مرقوم ہے:

جس چیز کا ناپاک ہونا یقینی یا غالب نہ ہواس کو پاک ہی سمجھا کیجیے،خواہ کتنے ہی وسوسے آئیں،ان کی پروانہ کیجیے،اورجس چیز کے بارے میں غالب گمان ہوکہ یہ ناپاک ہوگی،اس کو پاک کرلیا کیجیے،اس کے بعد وسوسہ نہ کیجیے۔(آپ کے مسائل اوران کا حل:۳/۱۷۷)۔مزید ملاحظہ ہو: (عمدۃ الفقہ:۴/۱۸۳)۔

ہاں شک کودور کرنے کے لیےتھوڑا سا پانی چھڑکنا درست ہےجیسا کہ آثار میں منقول ہے:

عن أبي هريرة ﷛ أنه ،كان يقول فی الجنابة فی الثوب: إن رأيت أثره فاغسله ، وإن علمت أن قد أصابه ثم خفي عليک فاغسل الثوب ، وإن شككت فلم تدر أصاب الثوب أم لا فانضحه . (مصنف ابن ابی شیبة : ۱/۵۰۸/۹۰۴). **واللہ ﷻ اعلم۔**

طواف کے دوران بات چیت کرنے کا حکم:

سوال: کیا طواف کے دوران دوستوں کے ساتھ بے تکلفی سے بات چیت کرنا جائز ہے یانہیں؟

الجواب: حدیث شریف میں آتا ہے کہ بیت اللہ کا طواف نماز کی طرح ہے،ہاں طواف میں بقدرِ ضرورت کلام مباح ہے،لہٰذا طواف میں دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور بےتکلف بات چیت کرنا مکروہ ہے۔

ملاحظہ ہو الجامع الصغیر اوراس کی شرح التیسیر میں ہے:

(الطواف بالبيت صلاة و لكن الله أحل فيه المنطق فمن نطق فلا ينطق إلا بخير)... (طب حل ک هق عن ابن عباس ؓ)، قال الحاكم صحيح ، وقال فی المجموع ضعيف و الصحيح وقفه على ابن عباس ﷛ ونوزع في جزمه بالضعف وبأن مثله لايقال من قبل الرأى فهو في حكم المرفوع . (الطواف صلاة فأقلوا فيه الكلام) ، ندباً لا وجوباً لقيام الإجماع على جوازه فيه لكن الأولى أن لا يتكلم إلا بنحو دعاء أو ذكر (طب عن ابن عباس ؓ) بإسناد حسن . (التيسير بشرح الجامع الصغير: ۲/۲۴۲،ط:الرياض).

بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

ويكره إنشاد الشعر والتحدث فی الطواف لما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم

أنه قال: الطواف بالبيت صلاة فأقلوا فيه الكلام وروي أنه قال صلى الله عليه وسلم فمن نطق فيه فلا ينطق إلا بخير ولأن ذلک يشغله عن الدعاء . (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۳۱، سعید).

عمدۃ الفقہ میں مباحاتِ طواف میں لکھا ہے:

مباح کلام کرنا، یعنی بقدرِ ضرورت مباح کلام کرنا اور غیر ضروری مباح کلام کو ترک کرنا مستحب ہے۔ پس جس کلام کے کرنے کی اس کو ضرورت ہے اس کو بقدرِ ضرورت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں یعنی یہ مباح ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۴/ ۱۸۶)۔

دوسری جگہ مکروہاتِ طواف کے تحت مذکور ہے: جو چیزیں طواف میں مکروہ ہیں وہ یہ ہیں: (۱) فضول اور بے فائدہ کلام کرنا اور بلاضرورت بات چیت کرنا یعنی کلامِ مباح بلاضرورت کرنا مکروہ ہے اور اس کا ترک کرنا مستحب ہے۔ (عمدۃ الفقہ: ۴/ ۱۸۹)۔ مزید ملاحظہ ہو: (کتاب المسائل: ۳/ ۲۴۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تکرارِ عمرہ کی وجہ سے تکرارِ حلق کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص روزانہ عمرہ کرے تو کیا ہر عمرہ کے بعد حلق کرنا ضروری ہوگا؟

الجواب: عمرہ کے احرام سے نکلنے کے لیے ہر عمرہ کے بعد بال کاٹنا لازم اور ضروری ہے، اگر بال نہ ہو تو فقط استرہ پھرا دیا جائے، اس کے بغیر حلال نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو الاختیار لتعلیل المختار میں مذکور ہے:

وإن لم يكن على رأسه شعر أجرى الموسى على رأسه تشبيهاً بالحلق كالتشبيه بالصوم عند العجز عن الصوم . (الاختيار لتعليل المختار: ۱/ ۱۵۶).

وقال في الدر: ويجب إجراء الموسى على الأقرع وذي قروح إن أمكن وإلا سقط .

(الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵۱۶، سعيد). مزید ملاحظہ ہو: (المبسوط للامام السرخسي: ۴/ ۷۰، والنهر الفائق: ۲/ ۸۸، قديمي). عمدۃ الفقہ میں ہے: جن کے سر پر بال نہ ہوں ان پر بھی واجب ہے کہ سارے سر پر استرہ پھرائے۔ (۴/ ۴۵۱)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

آخری شب میں پاپیادہ منیٰ سے عرفات جانے کا حکم:

سوال: منی سے نماز فجر کے بعد سورج نکلنے بعد عرفات جاتے ہیں، لیکن ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ

پیدل حج کرے اور ٹھنڈے وقت میں عرفات پہنچ جائے، اس لیے وہ آخری شب میں چل دیتا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ یہ خلافِ سنت ہے سورج نکلنے کے بعد جانا چاہیے اگر پیدل جانا مشکل ہو تو سواری پر جائے۔ اب دونوں میں سے کونسی صورت بہتر ہے؟

الجواب: نو ذی الحجہ کی نماز فجر منیٰ میں پڑھنا اور پھر سورج نکلنے کے بعد عرفات جانا سنت ہے، لیکن اگر کوئی شخص آخری شب میں روانہ ہو جائے تب بھی کوئی جزا واجب نہیں، ہاں افضل اور بہتر یہ ہے کہ سورج نکلنے کے بعد روانہ ہو، سواری سے جائے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ ملاحظہ ہو غنیۃ الناسک میں مرقوم ہے:

فإذا صلى الفجر بمنى مكث قليلاً حتى تطلع الشمس على ثبير، ثم توجه إلى عرفات مع السكينة والوقار ملبياً مهللاً مكبراً داعياً ذاكراً مصلياً على النبي صلى الله عليه وسلم و يلبي ساعة فساعة . (غنية الناسک : ۸۷).

لباب المناسک میں ہے:

فإذا أصبح أى بمنى صلى الفجر بها ثم يمكث إلى طلوع الشمس على ثبير توجه إلى عرفات أى ليكون على وفق السنة...وإن راح قبل طلوع الفجر أى بعد بيتوتة أكثر الليل أو قبل طلوع الشمس أو قبل أداء الفجر جاز أى حجه لا فعله لقوله وأساء . (لباب مع شرحه،ص ۲۰۹،فصل فی الرواح من منی الی عرفات،ط:بیروت).

عمدۃ الفقہ میں ہے: اگر طلوعِ فجر سے پہلے یا طلوعِ آفتاب یا نمازِ فجر ادا کرنے سے پہلے روانہ ہوا تب بھی جائز ہے لیکن ایسا کرنا برا ہے۔ (عمدۃ الفقہ :۴/۴۴۰)۔

مزید ملاحظہ ہو: (البحر الرائق :۲/۳۶۱، دار الکتاب الاسلامی، وکتاب المسائل:۳/۲۹۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

آفاقی اشہرِ حج میں عمرہ کے بعد حج بدل کرے تو دمِ تمتع کا حکم:

سوال: اگر کوئی آفاقی اشہرِ حج میں اپنا عمرہ کرے، پھر مکہ مکرمہ سے میت کی طرف سے حج بدل کرے جس نے وصیت نہیں کی تھی تو کیا دمِ تمتع واجب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اشہرِ حج میں عمرہ کرنے کے بعد اسی سال گھر واپس آئے بغیر حج کا احرام باندھ کر حج ادا کرے تو اس کو تمتع کہتے ہیں، یعنی ایک سفر میں دو عبادتوں سے فائدہ حاصل کرنا ہے، اور چونکہ شخص مذکور نے ایک

سفر میں دو عبادتوں سے فائدہ اٹھایا، بنابریں شکریہ کا دم واجب ہوگا۔ ملاحظہ ہو صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں:

ومعنى التمتع الترفق بأداء النسكين في سفر واحد من غير أن يلم بأهله بينهما إلماماً صحيحاً ويدخله اختلافا نبينها إن شاء الله تعالىٰ، وصفته أن يبتدئ من الميقات في أشهر الحج فيحرم بالعمرة ويدخل مكة فيطوف لها ويسعى ويحلق أو يقصر وقد حل من عمرته ... ويقيم بمكة حلالاً لأنه حل من العمرة ، فإذا كان يوم التروية أحرم بالحج... وعليه دم التمتع للنص الذي تلوناه . (الهداية: ۱/۱۵۶،ط: المكتبة الاسلامية).

وللاستزادة راجع: (البحر الرائق: ۲/۳۹۰،دارالمعرفة،والجوهرة النيرة : ۲/۱۲۸، والدر المختار: ۲/۵۴۱،سعيد،والفتاوى الهندية: ۱/۲۳۸،والمبسوط للامام السرخسیؒ: ۴/۴۴،ط:بيروت،وبدائع الصنائع: ۲/۱۶۸،ط؛سعيد،وعمدةالفقه: ۴/۲۶۸). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مالدار قیدی پر حج فرض ہونے کا حکم:

سوال: ایک آدمی قتل کے مقدمہ کی وجہ سے مدتِ دراز سے جیل میں تھا، اسی درمیان میں اس کی ایک زمین فروخت ہوئی اور صاحبِ نصاب بن گیا، اور اس پر حج فرض ہو گیا، اتفاقاً جیل ہی میں اس آدمی کا انتقال ہو گیا، اب اس کے مال میں سے اس کی طرف سے حج کرایا جائیگا یا نہیں؟ کیا جیل میں اس پر حج فرض ہوا تھا یا نہیں؟ نیز اس حج کی وصیت لازم تھی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: امام صاحبؒ کے نزدیک اس پر خود حج کرنا یا حج بدل کرانا یا حج کی وصیت کرنا لازم نہیں تھا، ہاں صاحبینؒ کے نزدیک اگر خود قادر نہیں تھا تو حج بدل کرانا یا مرنے سے پہلے اس پر حج کی وصیت کرنا لازم اور ضروری تھا۔ فقہائے احناف میں سے بہت سارے مشائخ نے صاحبینؒ کے قول کو اختیار فرمایا ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

قوله صحيح البدن، أى سالم عن الآفات المانعة عن القيام بما لا بد منه فى السفر فلا يجب على مقعد ومفلوج وشيخ كبير لا يثبت على الراحلة بنفسه وأعمى وإن وجد قائداً و محبوس وخائف من سلطان لا بأنفسهم ولا بالنيابة في ظاهر المذهب عن الإمام وهو رواية عنهما وظاهر الرواية عنهما وجوب الإحجاج عليهم ويجزيهم إن دام العجز وإن زال

أعادوا بأنفسهم ،

والحاصل أنه من شرائط الوجوب عنده ومن شرائط وجوب الأداء عندهما وثمرة الخلاف تظهر في وجوب الإحجاج والإيصاء كما ذكرنا وهو مقيد بما إذا لم يقدر على الحج وهو صحيح فإن قدر ثم عجز قبل الخروج إلى الحج تقرر ديناً في ذمته فيلزمه الإحجاج فلو خرج ومات فى الطريق لم يجب الإيصاء لأنه لم يوخر بعد الإيجاب ولو تكلفوا الحج بأنفسهم سقط عنهم وظاهر التحفة اختيار قولهما وكذا الاسبيجابي وقواه فى الفتح ومشى على أن الصحة من شرائط وجوب الأداء ، من البحر والنهر وحكى فى اللباب اختلاف التصحيح وفي شرحه أنه مشى على الأول فى النهاية وقال فى البحر العميق: إنه المذهب الصحيح وإن الثاني صححه قاضيخان في شرح الجامع واختاره كثير من المشايخ ومنهم ابن الهمام...قوله غير محبوس، هذا من شروط الأداء كما مر والظاهر أنه لو كان حبسه لمنعه حقاً قادراً على أداء ه لا يسقط عنه وجوب الأداء .

تنبيه:... ولا يخفى أن هذا إن دام عجزه إلى الموت وإلا فيجب عليه الحج بنفسه بعد زوال عذره وهو مقيد أيضاً بما إذا كان قادراً على الحج ثم عجز وإلا فلا يلزمه الإحجاج على الخلاف المذكور آنفاً . (فتاوى الشامى: ۲/ ۴۵۹،سعيد).

غنية الناسک میں مرقوم ہے:

إن كان العذر يرجى زواله عادة كالحبس والمرض ومنه الجنون ، ولو عجز فأحج عنه فرضاً كان أمره موقوفاً ، فإن دام عجزه حتى مات ظهر أنه وقع مجزءاً عن فرضه . (غنية الناسک ،ص ۲۷۱،ط: ادارة القرآن).

دوسری جگہ مرقوم ہے:وأما شرائط وجوب الأداء فخمسة على الأصح...الثاني: عدم الحبس والمنع ... فالمحبوس والخائف من السلطان كالمريض لا يجب عليهما أداء الحج بأنفسهما ولكن يجب عليهما الإحجاج أو الإيصاء به عند الموت عندهما...وكذا إن دام عجزه إلى الموت وإلا فيجب عليه الحج بنفسه بعد زوال عذره . (غنية الناسک،ص ۹).

عمدۃ الفقہ میں ہے: صحیح قول کی بنا پر یہ بھی وجوبِ ادا کی شرط ہے، ابن ہمامؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے پس محبوس اور بادشاہ سے خائف مریض کی مانند ہیں ان دونوں پر خود حج ادا کرنا فرض نہیں ہے، البتہ صاحبینؒ کے نزدیک ان دونوں پر فرض ہے کہ کسی دوسرے شخص سے حج کرائیں یا مرتے وقت حج کرانے کی وصیت کریں۔ (عمدۃ الفقہ :۴/ ۴۹، ط: زوار اکیڈمی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کثرتِ عمرہ کے لیے احرام کی صفائی کا حکم:

سوال: ایک شخص ایک سے زائد عمرے کرتا رہتا ہے، بہت سی مرتبہ احرام میلا ہوجاتا ہے یا کچھ مشروب وغیرہ اس پر گرنے کی وجہ سے گندا ہوجاتا ہے تو کیا ہر بار احرام دھونا اور صاف احرام پہننا ضروری ہے یا ایسے احرام میں عمرہ درست ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: احرام باندھنے کے لیے دو سفید چادریں؛ نئی یا پرانی صاف دھلی ہوئی استعمال کرنا مستحب ہے، ہاں اگر کوئی شخص بار بار عمرہ کرتا ہے اور دھونے کا موقعہ نہیں ملتا تو دھوئے بغیر استعمال کرنا بھی جائز خلافِ اولیٰ ہے، اور عمرہ بلا کراہت درست ہے، البتہ دھوکر استعمال کرنا افضل اور بہتر ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے: **ولبس إزار ورداء ... جديدين أو غسيلين طاهرين أبيضين ككفن الكفاية . قوله جديدين، أشار بتقديمه إلى أفضليته ، وكونه أبيض أفضل من غيره وفي عدم غسل العتيق ترك المستحب، بحر.** (فتاوى الشامي: ۲/ ۴۸۱،سعيد). (وكذا في اللباب في شرح الكتاب : ۱/ ۹۲،ط:دار الكتاب العربي).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے: دو سفید نئے یا دھلے ہوئے کپڑے یعنی چادر اور تہبند پہننا، دو کپڑے یعنی چادر اور تہبند کا پہننا سنت ہے، اور ان میں باقی اوصاف کا پایا جانا یعنی سفید اور نئے دھلے ہوئے ہونا مستحب ہے، اور ان دو کپڑوں کا نیا ہونا افضل ہے اور پرانے کپڑے کو دھوئے بغیر استعمال کرنے میں ترکِ مستحب ہے۔ (عمدۃ الفقہ :۴/ ۱۲۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مالِ حرام سے حج کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی نے چوری کے مال سے یا حرام مال سے حج کیا تو کیا اس کا حج ادا ہوا یا نہیں؟ یا اس کو دو

بارہ حج کرنا ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مالِ حرام کا حکم یہ ہے کہ مالک کو پہنچا دیا جائے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو اس کی طرف صدقہ کردیا جائے، آدمی ایسے مال کا مالک نہیں بنتا اور نہ حج فرض ہوتا ہے، لیکن اگر کسی نے مالِ حرام سے حج کرلیا تو اس کے ذمہ سے حج کی فرضیت ساقط ہوجائے گی باقی حج کا ثواب نہ ملے گا اور گنہگار بھی ہوگا۔

ملاحظہ ہو تکملۃ البحر الرائق میں مرقوم ہے:

قال في النهاية : قال بعض مشايخنا : كسب المغنية كالمغصوب لم يحل لأحد أخذه قالوا: وعلى هذا لو مات رجل وكسبه من ثمن الباذق والظلم أو أخذ الرشوة تعود الورثة ولا يأخذون منه شيئاً وهو الأولى لهم ويردونه على أربابه إن عرفوهم وإلا يتصدقوا به لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد . (تكملة البحر الرائق: ۸/ ۲۲۹،دارالمعرفة).

وكذا في تبيين الحقائق: ۶/ ۲۷،امداديه ،ملتان، وفتاوى الشامي : ۶/ ۳۸۵،سعيد).

فتاوى الشامي میں منقول ہے: **ويجتهد في تحصيل نفقة حلال فإنه لايقبل بالنفقة الحرام كما ورد في الحديث مع أنه يسقط عنه معها ولا تنافي بين سقوطه وعدم قبوله فلا يثاب لعدم القبول ولا يعاقب تارك الحج . أى لأن عدم الترك يبتني على الصحة وهي الإتيان بالشرائط والأركان والقبول المترتب عليه الثواب يبتني على أشياء كحل المال والإخلاص كما لو صلى مرائياً أو صام واغتاب فإن الفعل صحيح لكنه بلا ثواب والله تعالىٰ أعلم .** (فتاوى الشامي: ۲/ ۴۵۶، مطلب فيمن حج بمال حرام،سعيد). (وكذا في البحر الرائق: ۲/ ۳۳۲،دار المعرفة ،والفتاوى الهندية : ۱/ ۲۲۰، وفتح القدير: ۲/ ۴۰۷،دار الفكر).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے: سوال: مالِ حرام سے حج کرنا چاہیے کہ نہیں؟ الجواب: نہیں چاہیے، تاہم اگر کرلیا جائے گا تو فریضہ ادا ہوجائے گا، لیکن حج مقبول کا ثواب حاصل نہ ہوگا۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/ ۳۱۰، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

محرم نہ ہونے کی وجہ سے عورت پر فرضیتِ حج کا حکم:

سوال: فقہ کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ اگر کسی کے پاس زاد وراحلہ موجود ہے تو اس پر حج فرض ہے اور

عورتوں کے بارے میں یہ مرقوم ہے اگر اس کے پاس محرم موجود نہ ہو تو اس کے لیے حج میں جانا جائز نہیں، اب دونوں مسئلوں کی روشنی میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عورتوں کے پاس اگر حج میں جانے کے لیے زادوراحلہ موجود ہو تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے، لیکن اگر اس کے پاس محرم موجود نہ ہو تو باوجود یہ کہ اس پر فرض ہے، اس کے لیے حج میں جانا جائز نہیں ہے، اب دریافت طلب امور یہ ہیں:

۱۔ اگر حج فرض ہونے بعد محرم موجود نہ ہو تو کیا اس کے ذمہ سے حج کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے؟

۲۔ اگر محرم موجود نہ ہونے کی وجہ سے فرضیت ساقط نہیں ہوتی، تو اس کے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟

۳۔ حج فرض ہو جانے کے بعد اگر اس نے بغیر محرم کے حج کر لیا تو اس کا حج ادا ہو جائیگا یا اس کو دوبارہ حج کرنا پڑے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اصل مسئلہ یہ ہے کہ استطاعت کی وجہ سے عورت پر حج فرض ہو جائے گا پھر اگر اس کے پاس محرم یا شوہر موجود نہیں ہے تب بھی فرضیت ساقط نہیں ہوگی، بلکہ اس کے ذمہ وصیت کرنا لازم اور ضروری ہے۔ کیونکہ راجح قول کے مطابق محرم یا شوہر کا موجود ہونا حج کی ادائیگی کے لیے شرط ہے، نہ کہ حج کے فرض ہونے کے لیے۔ ہاں اگر بلا محرم حج کر لے تو حج ادا ہو جائیگا اور بلا محرم سفر کرنے کا گناہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں منقول ہے: **إن وجود الزوج أو المحرم شرط وجوب أم شرط وجوب أداء والذي اختاره في الفتح أنه مع الصحة وأمن الطريق شرط وجوب الأداء فيجب الإيصاء إن منع المرض و خوف الطريق أو لم يوجد زوج ولا محرم و يجب عليها التزوج عند فقد المحرم وعلى الأول لايجب شيء من ذلك كما في البحر، ح، وفي النهر وصحح الأول في البدائع و رجح الثاني في النهاية تبعاً لقاضيخان واختاره في الفتح.** (فتاوی الشامی: ۴۶۵/۲، سعید).

شرح لباب المناسک میں مرقوم ہے: **ثم اختلفوا أن المحرم أو الزوج شرط الوجوب أو الأداء ... فصحح قاضي خان و غيره أنه من شرائط الأداء وصحح صاحب البدائع والسروجي أنه من شرائط الوجوب... وصنيع المصنف يشعر بأنه من شرائط الأداء على الأرجح، وفي الحاشية: قوله: على الأرجح: وهو الذي رجحه في الفتح واختاره كثير من المشايخ.**

(شرح لباب المناسک مع ارشاد الساری، ص۶۳، ط: دارالکتب العلمية، بيروت).

وفي إرشاد الساري أيضاً : ولو حجت بغير محرم جاز حجها بالاتفاق كما لو تكلف رجل مسألة الناس وحج ، ولكنها تكون عاصية ، ومعنى قولهم : لا يجوز لها أن تحج بغير محرم لا يجوز لها الخروج إلى الحج ، وأما الحج فيجوز . (إرشاد الساری إلی مناسک الملا علی القاری ،ص ۶۱ ، دارالکتب العلمیة بیروت). واللہ ﷻ اعلم۔

بلاشرعی محرم عورت کا سفر شرعی طے کرنے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ اگر ایک عورت کو ہوائی جہاز کے ذریعہ ایک جگہ سے (جہاں وہ رہتی ہے) دوسری جگہ (والدین کی زیارت کے لیے) جانا ہو، اور راستہ تقریبا ۴۰ سے ۴۵ منٹ کا ہے، تو کیا وہ بغیر محرم کے ہوائی جہاز میں سفر کر سکتی ہے یا نہیں؟ جب کہ اس کا شوہر ایئرپورٹ سے اس کو روانہ کردے، اور دوسری طرف اس کے والدین ایئرپورٹ میں اس کا انتظار کریں؟ عورت حجاب میں ہے، راستہ پرامن ہے، فتنہ کا خوف نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں کسی مسلمان خاتون کے لیے بلاشرعی محرم کے مسافتِ شرعیہ طے کرنا جائز نہیں ہے، چاہے دونوں طرف محرم موجود ہو، پھر بھی ہوائی جہاز کا سفر بلامحرم طے ہوگا، اور یہ ناجائز ہے۔ حدیث شریف میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ مسلم شریف میں ہے:

عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايحل لامرأة تؤمن بالله و اليوم الآخر أن تسافر سفراً يكون ثلاثة أيام فصاعداً إلا ومعها أبوها، أو ابنها، أو زوجها، أو أخوها، أو ذو محرم منها. (صحيح مسلم: رقم ۱۳۴۰ و۱۳۳۸، والترمذی ۱۱۶۹، وأبو داود ۱۷۲۶).

اس حدیث میں مطلق ممانعت وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ بصورت مسئولہ اگر چہ ہوائی جہاز پرامن ہو، پھر بھی دورانِ سفر محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے، خاص طور پر اس دور میں جب کہ فتنہ کی آگ بھڑک رہی ہے، ایسی حالت میں تو ممانعت میں اور بھی سختی ہونی چاہیے۔ ہاں مسافتِ شرعی سے کم ہو، تو پھر فتنہ سے امن کی شرط کے ساتھ سفر کرنے کی گنجائش ہے۔

فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیں: **في شرح اللباب: والفتوى على أنه يكره في زماننا (قوله**

ولو عجوزاً) أى لإطلاق النصوص. بحر. وقال العلامة ابن عابدين: قوله (في سفر) هو ثلاثة أيام ولياليها فيباح لها الخروج إلى ما دونه لحاجة بغير محرم، بحر. وروى عن أبي حنيفة وأبي يوسف كراهة خروجها وحدها مسيرة يوم واحد، وينبغي أن يكون الفتوى عليه لفساد الزمان. (الدر المختار وحاشية ابن عابدين: ۲/۴۶۵).

ہدایہ میں مرقوم ہے: قال (ويعتبر فى المرأة أن يكون لها محرم تحج به أو زوج، ولا يجوز لها أن تحج بغيرهما إذا كان بينها وبين مكة مسيرة ثلاثة أيام)... ولنا قوله عليه الصلاة والسلام: لا تحجن امرأة إلا و معها محرم، و لأنها بدون المحرم يخاف عليها الفتنة وتزداد بانضمام غيرها إليها؛ ولهذا تحرم الخلوة بالأجنبية وإن كان معها غيرها، بخلاف ما إذا كان بينها وبين مكة أقل من ثلاثة أيام؛ لأنه يباح لها الخروج إلى ما دون السفر بغير محرم. (الهداية: ۱/۱۳۳، بيروت).

محقق ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں تفصیل فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو: (فتح القدير: ۲/۴۱۹، بيروت، لبنان).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حالتِ احرام میں ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کا حکم:

سوال: کیا حالتِ احرام میں ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ اس میں کچھ خوشبو ہوتی ہے، اگر کسی نے استعمال کرلی تو کوئی جزا واجب ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ٹوتھ پیسٹ میں دانتوں کی صفائی مقصود ہوتی ہے خوشبو مقصود نہیں ہوتی، نیز خوشبو قلیل اور مغلوب ہے اس وجہ سے دم یا صدقہ واجب اور لازم نہیں ہے ہاں کچھ صدقہ کر دینا بہتر ہے، لیکن اگر خوشبو غالب اور مقصود ہو تو اگر پورے منہ یا آدھے سے زائد منہ پر لگادی تو دم، اور آدھے سے کم میں صدقہ واجب ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ احرام کی حالت میں مسواک پر اکتفا کرلیا جائے۔ بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

ولو كان الطيب في طعام طبخ وتغير، فلا شيء على المحرم في أكله، سواء كان يوجد ريحه أولا لأن الطيب صار مستهلكاً فى الطعام بالطبخ وإن كان لم يطبخ يكره إذا كان ريحه يوجد منه لا شيء عليه لأن الطعام غالب عليه فكان الطيب مغموراً مستهلكاً فيه

وإن أكل عين الطيب غير مخلوط بالطعام فعليه الدم إذا كان كثيراً...وقد روى عن ابن عمر رضي الله عنه أنه كان يأكل الخشكنابخ الأصفر وهو محرم ويقول: لا بأس بالخبيص الأصفر للمحرم . (بدائع الصنائع : ۲/ ۱۹۱، سعید).

فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے:

اگر منجن یا ٹوتھ پیسٹ جس میں لونگ، کافور، الائچی یا خوشبودار چیزیں ڈالی گئی ہوں اور وہ پکی ہوئی نہ ہوں اور مقدار کے اعتبار سے خوشبودار چیز مغلوب ہو (یعنی کم ہو) تو ایسا منجن احرام کی حالت میں استعمال کرنا مکروہ ہوگا مگر صدقہ واجب نہ ہوگا، اور اگر منجن یا ٹوتھ پیسٹ میں خوشبودار چیز غالب ہو تو چونکہ منجن یا ٹوتھ پیسٹ پورے منہ یا اکثر حصہ میں لگ جائے گا لہٰذا دم واجب ہوگا، بہتر یہ ہے کہ احرام کی حالت میں مسواک ہی استعمال کرے ٹوتھ پیسٹ استعمال نہ کرے، اس سے سنت بھی ادا نہ ہوگی، اس لیے مسواک کو اختیار کرنا چاہیے۔

غنیۃ الناسک میں ہے: **فلو أكل طيباً كثيراً وهو أن يلتصق بأكثر فمه يجب الدم وإن كان قليلاً بأن لم يلتصق بأكثر فمه فعليه الصدقة هذا إذا أكله كما هو من غير خلط أو طبخ فلو جعله في الطعام وطبخه فلا بأس بأكله لأنه خرج من حكم الطيب وصار طعاماً وكذلك كل ما غيرته النار من الطيب فلا بأس بأكله ولو كان ريح الطيب يوجد منه...وفي الفتح : فإن جعله في طعام قد طبخ كالزعفران والأفاويه من الزنجبيل والدارصيني يجعل في الطعام فلا شيء عليه... وإن لم يطبخ بل خلطه بما يؤكل بلا طبخ كالملح وغيره فإن كانت رائحته موجودة كره ولا شيء عليه إذا كان مغلوباً فإنه كالمستهلك أما إذا كان غالباً فهو كالزعفران الخالص فيجب الجزاء وإن لم تظهر رائحته ، الخ .** (غنية الناسک ، ص ۱۳۲ ، باب الجنايات ، مطلب فی اكل الطيب وشربه).

معلم الحجاج میں ہے: مسئلہ: اگر بہت سی خوشبو کھائی یعنی اتنی کہ منہ کے اکثر حصہ میں لگ گئی تو دم واجب ہے، اور اگر تھوڑی کھائی یعنی منہ کے اکثر حصہ میں نہیں لگی تو صدقہ واجب ہے، یہ اس وقت ہے جبکہ خالص خوشبو کھائے اور اگر اس کو کسی کھانے میں ڈال کر پکایا تو کچھ واجب نہیں، اگرچہ خوشبو کی چیز غالب ہو، اور اگر پکا ہوا کھانا نہ ہو تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ خوشبو کی چیز غالب ہے تو دم واجب ہے اگرچہ خوشبو بھی نہ آتی ہو اور اگر

مغلوب ہے تو دم یا صدقہ نہیں اگر چہ خوشبو آتی ہو لیکن مکروہ ہے۔ (معلم الحجاج،۲۴۶، ۲۴۷،خوشبو اور تیل استعمال کرنا۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ (ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ:۴/ ۲۰۵،ط:مکتبۃ الاحسان، دیوبند)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حدودِ حرم سے باہر حلق کرانے پر دم واجب ہونے کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے عمرہ کیا اور حرم سے باہر اپنی قیام گاہ پر حلق کیا، کیا اس پر کوئی چیز واجب ہے یا نہیں؟ اب اس کو کیا کرنا چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مفتی بہ قول کے مطابق عمرہ میں حلق حدودِ حرم کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا حدودِ حرم سے باہر حلق کرنے پر دم واجب ہوگا۔ ملاحظہ ہو امام محمدؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

وأكره له أن يؤخره في حج أو عمرة حتى يخرج من الحرم فإن فعله وحلق في غير الحرم فعليه دم ويجزيه في قول أبي حنيفة ومحمد. (المبسوط:۲/ ۴۳۱، ط: ادارة القرآن، وكذا في الجامع الصغير ۱۶۵ ،ط: عالم الكتب).

فتاویٰ شامی میں مذکور ہے: **قال في الهداية : ومن اعتمر فخرج من الحرم وقصر فعليه دم عندهما .** (فتاوى الشامي: ۲/ ۵۵۴، سعيد).

وفي القول الراجح : هو قول الطرفين ، قال العلامة الحصكفي: أوحلق في حل بحج في أيام النحر فلو بعدها فدمان أو عمرة لاختصاص الحلق بالحرم. وقال العلامة ابن عابدين قوله لاختصاص الحلق أى لهما بالحرم وللحج في أيام النحر، وقال العلامة ابن نجيم: أو حلق في الحل أى تجب شاة بتأخير النسك عن مكانه ...الخ. (القول الراجح: ۱/ ۲۲۹).

قال في غنية الناسك: ويختص حلق الحاج بالزمان والمكان عند أبي حنيفةؒ وحلق المعتمر بالمكان، فالزمان أيام النحر الثلاثة والمكان الحرم ، والتخصيص للتضمين لا للتحلل، فلو حلق أو اقتصر في غير ما توقت به لزمه الدم ، ولكن يحصل به التحلل في أى مكان وزمان أتى به بعد دخول وقته . (غنية الناسك ،ص ۲۸۱ ،مطلب في زمان الحلق ومكانه ، ط: المصباح).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (شرح اللباب،ص ۲۵۳، والمبسوط للامام السرخسیؒ:۴/ ۷۱، دار المعرفة، والهداية: ۱/ ۱۶۴، وفتح القدير:۳/ ۶۴، والبناية:۴/ ۳۶۹، والعناية:۳/ ۶۹، وفتاوى الشامي:۲/ ۵۵۴، سعيد)۔

عمدۃ الفقہ میں حضرت مولانا سید زوار حسین صاحبؒ فرماتے ہیں:

عمرہ والے کے لیے امام ابوحنیفہؒ وامام محمدؒ کے نزدیک حلق کرانا مکان کے ساتھ مخصوص ہے، امام ابو یوسفؒ وامام زفرؒ کا اس میں اختلاف ہے۔ اور حج وعمرہ کے احرام میں حلق کرانے کے لیے مکان یعنی جگہ حدودِ حرم ہے۔ (عمدۃ الفقہ :۴/ ۲۴۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بلاحلق عمرہ پر عمرہ کرنے کا حکم:

سوال: اگر کسی آدمی نے عمرہ کے تمام افعال کیے لیکن سر منڈانے سے پہلے دوسرے عمرہ کا احرام باندھا اور اس کو مکمل کیا، کیا اس پر کوئی چیز واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور پر دو احرام جمع کرنے کی وجہ سے ایک دم لازم ہوگا، اور یہ دم حرم کے ساتھ خاص ہوگا۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

قال في رد المحتار: قوله من أتى بعمرة إلا الحلق الخ، قدمنا أن الحكم فى الجمع بين العمرتين كالجمع بين الحجتين أى فى اللزوم والرفض ووقته مما يتصور فى العمرة كما فى اللباب، ثم قال: فلو أحرم بعمرة فطاف لها شوطاً أو كله أو لم يطف شيئاً ثم أحرم بأخرى لزمه رفض الثانية وقضاؤها ودم الرفض، ولو طاف وسعى للأولى ولم يبق عليه إلا الحلق فأهل بأخرى لزمته ولا يرفضها وعليه دم الجمع . (فتاوى الشامي: ۲/ ۵۸۷،سعيد).

شرح لباب میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

ولو طاف وسعى للأولى ولم يبق عليه إلا الحلق، فأهل بأخرى لزمته ، أى العمرة الأخرى اتفاقاً، ولا يرفضها، أى الأخرى والأولى أن يقول: ولا يرفض شيئاً ، وعليه دم الجمع . (المسلك المتقسط فى المنسك المتوسط على لباب المناسك،ص ۳۲۴،ط:بيروت).

وللاستزادة انظر: (غنية الناسك ،ص ۳۷۲،والبناية شرح الهداية: ۴/ ۴۳۱،ومجمع الانهر : ۱/ ۳۰۵).

عمدۃ الفقہ میں مذکور ہے: پہلے عمرہ کی سعی سے فارغ ہو کر حلق سے پہلے دوسرے عمرہ کا احرام باندھنے سے ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک بالاتفاق دوسرا عمرہ لازم ہو جائے گا اور وہ دونوں میں سے کسی کو بھی ترک نہ کرے اور اس پر دم جمع واجب ہوگا۔ (عمدۃ الفقہ :۴/ ۳۲۳)۔

مزید ملاحظہ ہو: (معلم الحجاج، ص ۳۱۷)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

میقات تجاوز کرنے کے بعد واپس آنے پر قضا اور دم کا حکم:

سوال: ایک عورت نے عمرہ کیا، پھر زیارت کے لیے طائف گئی، جب واپس آئی تو عمرہ کی نیت نہیں کی اس لیے کہ طبیعت صحیح نہیں تھی، اب وہ گھر واپس آ گئی، اب اس عورت پر کیا لازم ہوگا؟ دم ہوگا یا نہیں؟

الجواب: واضح ہو کہ طائف میقات سے باہر ہے، لہٰذا طائف زیارت کے لیے جانے والے حجاج و معتمرین جب واپس مکہ مکرمہ کے ارادے سے داخل ہوں گے تو احرام باندھنا اور عمرہ کرنا لازم ہوگا، بلا احرام میقات سے تجاوز کرنا گناہ ہے اور واپس نہ آنے پر دم لازم ہوگا لیکن چونکہ مذکورہ خاتون بلا عمرہ ادا کیے واپس لوٹ گئی تو اب ایک عمرہ کی قضا واجب ہوگی اور جب احرام باندھ کر واپس آئے گی تو دم ساقط ہو جائے گا۔

دلائل ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

جاء رجل إلى ابن عباس رضي الله عنه فقال: إني جاوزت الميقات من غير إحرام ، فقال: ارجع إلى الميقات ولب ، وإلا فلا حج لک ، فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لايجاوز الميقات أحد إلا محرماً ولأن وجوب الإحرام على من يريد الحج والعمرة عند دخول مكة لإظهار شرف تلک البقعة وفي هذا المعنى من يريد النسک ومن لا يريد النسک سواء فليس لأحد ممن يريد دخول مكة أن يجاوز الميقات إلا محرماً . (المبسوط: ۳۰۲/۴، ط: دار الفكر بيروت).

البحر الرائق میں مذکور ہے: **من جاوز آخر المواقيت بغير إحرام ثم عاد إليه وهو محرم ولبى فيه فقد سقط عنه الدم الذي لزمه بالمجاوزة بغير إحرام لأنه قد تدارک ما فاته .** (البحر الرائق: ۵۱/۳، دار المعرفة).

وقال في غنية الناسک: من جاوز وقته غير محرم ثم أحرم أولا فعليه العود إلى وقت وإن لم يعد فعليه دم ، فإن لم يحرم وعاد بعد تحول السنة أوقبله فأحرم بما لزمه بالمجاوزة من الميقات سقط الإثم والدم بالاتفاق...ولو دخلها مراراً بلا إحرام فعليه لكل دخول حج أو عمرة . (غنية الناسک، ص ۳۰، ۳۱، ط: ادارة القرآن، كراتشي).

عمدۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

اگر کوئی آفاقی شخص مکہ یا سرزمین حرم میں بلا احرام داخل ہوگیا تو اس پر ایک حج یا عمرہ کرنا واجب ہوگا یا اس کو میقات پر واپس آکر احرام باندھنا واجب ہوگا، پس اگر اس نے اس سال یا اس سال کے بعد مکہ مکرمہ یا اس سے باہر لیکن میقات کے اندر کسی جگہ سے احرام باندھ لیا تو وہ احرام کافی ہے اور اس پر دمِ مجازات واجب ہوگا، اور اگر اس نے احرام باندھنے کے بعد کسی میقات پر لبیک کہہ لیا تو اس سے دمِ مجاوزت بھی ساقط ہوجائے گا، پس اگر وہ اسی سال کسی میقات پر لوٹ آیا اور حج فرض، قضا یا ادا عمرہ یا حج نذر یا عمرہ قضا یا عمرہ سنت یا عمرہ مستحب کا احرام باندھ لیا تو بلا احرام داخل ہونے کی وجہ سے جو غیر متعین حج یا عمرہ اس پر واجب ہوا تھا ساقط ہوجائے گا اور اسی طرح بلا احرام میقات سے گزر جانے کا جو دم اس پر واجب ہوا تھا وہ میقات پر احرام باندھ کر تلبیہ کہنے سے اس کے ذمے سے اتر جائے گا۔ (عمدۃ الفقہ: ۱۰۲/۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سر میں کافی زخم ہونے پر احرام سے نکلنے کا حکم:

سوال: اگر کسی شخص نے مصنوعی بالوں کی وگ لگوائی ہے اور سر میں بہت سارے زخم ہیں جن کی وجہ سے حج کے بعد حلق یا قصر انتہائی دشوار ہے یا کچھ ٹھیک ہو رہا ہے لیکن پھر بھی بعض وجوہات کی وجہ سے قصر یا حلق نہیں کرسکتا ہے تو اب یہ شخص احرام سے کیسے نکلے گا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہاء کی تحریرات سے پتا چلتا ہے کہ جس شخص کے سر پر بال نہ ہو یا ہو لیکن زخم یا بیماری کی وجہ سے قصر یا حلق کرنا ممکن نہ ہو تو سر پر اُسترہ پھیرنا چاہیے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو ویسے ہی حلال ہوجائیگا۔

نیز اگر کسی کے سر میں حقیقی بال نہیں بلکہ مصنوعی بالوں کی وگ لگائی ہے تو اگر بآسانی الگ کرسکتا ہے تو اتار کر سر پر اُسترہ پھیرنا ضروری ہے اور اگر اُتارنا ممکن نہیں ہے یا مشکل ہے تو اسی پر اُسترہ پھیرنا چاہیے اور اگر زخم یا بیماری کی وجہ سے یہ بھی ممکن نہ ہو ویسے ہی حلال ہوجائیگا۔

چنانچہ صورتِ مسئولہ میں شخص مذکور اگر مصنوعی بالوں کی وگ نکال کر سر پر اُسترہ پھیر سکتا ہے تو پھیرنا ضروری ہے ورنہ مصنوعی وگ پر اُسترہ پھیرلے لیکن اگر سر میں زخم کی وجہ سے یہ بھی مشکل ہو تو ویسے ہی حلال ہوجائیگا۔ ملاحظہ ہو درمختار مع ردالمحتار میں منقول ہے:

ویجب إجراء الموسى على الأقرع وذي قروح إن أمكن وإلا سقط . قوله: ويجب

إجـراء الـمـوسـى عـلى الأقرع ، هو المختار كما فى الزيلعي والبحر واللباب وغيرها وقيل استـحبـاباً قال فى شرح اللباب وقيل: استناناً وهو الأظهر. قوله وإلا سقط أى وإن لم يمكن إجـراء الـمـوسى عليه ولايصل إلى تقصيره سقط عنه وحل بمنزلة من حلق والأحسن له أن يـؤخر الإحلال إلى آخر الوقت من أيام النحر ولا شيء عليه إن لم يؤخر... وبعد أسطر قال: ومثـال تـعـذر الـحـلـق يمنع إمكان التقصير أن يفقد آلة الحلق أو من يحلقه أو يضره الحلق لـنـحـو صـداع أو قـروح بـرأسـه وتقدم مثال تعذرهما جميعاً فى الأقرع وذى قروح شعره قصير. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۵۱٦،سعيد).

وفـي تبييـن الـحقائق: ويجب إجراء الموسى على الأقرع على المختار ولو كان على رأسه قرح لا يمكن إمرار الموسى عليه ولا يصل إلى تقصيره فقد حل. (تبيين الحقائق: ۲/ ۳۳، ط: امداديه).

وفى اللباب مع شرحه: ولو تعذر الحلق لعارض أى لعلة في رأسه...تعين التقصير أو التقصير أى تعذر لكون الشعر قصيراً، تعين الحلق وإن تعذرا جميعاً لعلة في رأسه بأن يكون شعره قصيراً، أو برأسه قروح يضره الحلق سقطا عنه وحل بلا شيء أى بلا وجوب دم عليه لأنه ترک الواجب بعذر. (لباب المناسک مع شرحه،ص۲۵۳،دارالكتب العلمية بيروت).

معلم الحجاج میں مرقوم ہے: مسئلہ: اگر کوئی گنجا ہے اور اس کے سر پر بالکل بال نہیں ہیں یا سر میں زخم ہیں تو صرف سر پر استرہ پھیرنا واجب ہے، اگر زخموں کی وجہ سے استرہ بھی نہ چلا سکے تو یہ واجب ساقط ہوجاتا ہے اور بلا حجامت مثل منڈوانے والے کے حلال ہوجائے گا لیکن اولیٰ یہ ہے کہ ایسا شخص بارہویں تاریخ تک حلال نہ ہو۔ (معلم الحجاج،ص۲۰۴،ط:ادارۃ القرآن، کتاب المسائل:۳/ ۳۳۸،کتب خانہ نعیمیہ)۔

ولـلاستزادة راجع: (غـنية الـنـاسک ،ص۹۳،مطلب لو تعذر الحلق لعارض،ط:ادارة القرآن، وحاشية الطحطاوى على الدر المختار: ۱/ ۵۰۷،والعناية فى شرح الهداية: ۲/ ۴۹۰،ط:دارالفكر،والفتاوى الهندية: ۱/ ۲۳۱،والفتاوى الولوالجية: ۱/ ۲۷۸،ط:دارالكتب العلمية،والهداية:۳/ ۳۸،مكتبه شركة علمية). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

زمزم کے ساتھ سادہ پانی ملانے سے زمزم کا حکم:

سوال: میں نے سنا ہے کہ عرب علماء کے نزدیک اگر زمزم کے ساتھ عام پانی ملا دیا جائے تو زمزم کا پانی اپنی ہیئت پر باقی نہیں رہتا، وہ بھی عام پانی ہوجاتا ہے، جبکہ ہمارے علماء اس کو زمزم ہی کہتے ہیں، اب اس کا کیا حکم ہے؟ اگر ملانے سے زمزم ہوجاتا ہے تو عام پانی ملا کر بیچنے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: زمزم کے ساتھ کچھ تھوڑا بہت سادہ پانی ملانے سے زمزم کی برکت زائل نہیں ہوتی، اب بھی بابرکت ہی رہے گا، لیکن ملاوٹ مغلوب ہو اور زمزم غالب ہو کیونکہ فقہاء نے اس معاملہ میں غالب مغلوب کا اعتبار کیا ہے۔ البتہ ملاوٹ والے پانی کو بتلائے بغیر زمزم کہہ کر فروخت کرنا درست نہیں، اس میں دھوکا دہی ہے جیسے ایک آدمی دودھ میں کچھ تھوڑا سا پانی ملا کر پیئے تو اس کو دودھ پینا کہیں گے لیکن دودھ میں پانی ملا کر فروخت کرنا جائز نہیں، گناہ اور دھوکا دہی ہے کیونکہ خریدار اصلی بلا ملاوٹ سمجھ کر خرید رہا ہے۔

حدیث شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ متبرک چیز میں ملاوٹ سے برکت زائل نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ عن قيس بن طلق ، عن أبيه قال: خرجنا ستة وفدا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فبايعناه وصلينا معه وأخبرناه أن بـ أرضنا بيعة لنا واستوهبناه من فضل طهوره فدعا بماء فتوضأ منه وتمضمض وصب لنا في إداوة ثم قال: اذهبوا بهذا الماء فإذا قدمتم بلدكم فأكسروا بيعتكم ثم انضحوا مكانها من هذا الماء واتخذوا مكانها مسجداً ، فقلنا يا رسول الله ! البلد بعيد والماء ينشف قال: فأمدوه من الماء فإنه لا يزده إلا طيباً...الخ. (أخرجه ابن حبان في صحيحه: ۴۰۵/۳، رقم: ۱۱۲۳)، قال الشيخ شعيب في تعليقاته على صحيح ابن حبان: إسناده صحيح.

فقہاء کے ہاں ماءِ مطلق ومقید میں غالب مغلوب کا اعتبار ہے۔ ملاحظہ ہو امداد الفتاح میں مذکور ہے:

والغلبة في مخالطة المائع الذي لا وصف لـه مخالف للماء ، وذلک كالماء المستعمل، فإنه طاهر على الصحيح ، وماء الورد المنقطع الرائحة يكون بالوزن لعدم التمييز بالوصف لفقده ، فإن اختلط رطلان مثلاً من الماء المستعمل، أو ماء الورد المنقطع الرائحة برطل من الماء المطلق لا يجوز به الوضوء لغلبة المقيد، وبعكسه ، وهو لو كان الأكثر المطلق جاز به الوضوء ، وإن استويا لم يذكر حكمه في ظاهر الرواية ، وقالوا: حكمه

حكم المغلوب احتياطاً لما طال الفصل . (امداد الفتاح، ص ۱۴۱،ط:بيروت).

اسی طرح اگرعورت نے اپنے دودھ کے ساتھ پانی ملاکر بچے کو پلا دیا تو حرمتِ رضاعت کے ثبوت میں غالب کا اعتبار ہوگا۔ملاحظہ ہو: **وإذا اختلط اللبن بالماء واللبن هو الغالب تعلق به التحريم وإن غلب الماء لم يتعلق به التحريم** . (مختصر القدوری،ص ۲۲۲،ط:سعید، وبدائع الصنائع:۴/۱۰،سعید، وفتح القدیر:۳/۴۵۱،دار الفکر).

مفتی شبیر صاحب قاسمی نے بھی اسی کے موافق لکھا ہے۔ملاحظہ ہو:

بہت سے حجاجِ کرام گھر واپس آنے کے بعد عزیزوں اور دوستوں اور خاندان کے لوگوں کو آبِ زمزم بطور تبرک پیش کرتے ہیں، اور آبِ زمزم میں پانی ملاتے ہیں،ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر آبِ زمزم میں پانی غالب ہوجائے تو وہ آبِ زمزم ہی نہ رہے گا اور اس کو آبِ زمزم کہہ کر پلانا درست نہ ہوگا، بلکہ ایک جھوٹی بات ہوگی۔ ہاں البتہ اگر آبِ زمزم غالب ہوگا تو اس کو آبِ زمزم کہا جاسکتا ہے جیسا کہ دودھ میں اگر پانی ملا دیا جائے اور اگر پانی غالب ہوگا تو وہ شرعاً دودھ کے دائرہ سے خارج ہوجاتا ہے،حتی کہ اگر دودھ پیتے بچے کو کسی عورت کے دودھ میں دودھ سے زیادہ پانی ملاکر پلایا جائیگا تو اس سے شرعی طور پر رضاعت کا حکم ثابت نہ ہوگا،اس لیے کہ بچہ نے ایسی صورت میں پانی پیا ہے عورت کا دودھ نہیں پیا،اسی طرح آبِ زمزم میں پانی غالب ہوگا تو آبِ زمزم نہ ہوگا بلکہ دوسرا پانی ہوجائیگا۔(انوارِ مناسک، ص۴۰۰،مکتبہ صوت القرآن،دیوبند)۔

بیع میں دھوکا دہی ممنوع ہے،حدیث شریف میں ہے: **من غشنا فليس منا**. (رواه الترمذی: ۱/۲۴۵).

ایک حدیث میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی ملا ہوا دودھ نوش فرمایا۔**عن الزهري سمع أنس بن مالك ﷺ يقول: قدم النبي صلى اللّٰه عليه وسلم المدينة و أناْ ابن عشر سنين ومات وأناْ ابن عشرين سنة فكن أمهاتي يحثثني على خدمته فدخل علينا النبي صلى اللّٰه عليه وسلم دارنا فحلبنا له من شاة لنا داجن فشيب له من ماء بير في الدار... الخ**.(متفق عليه) اِس حدیث کے تحت حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں: **وفيه إجازة خلط اللبن بالماء لما أراد شربه ولم يرد البيع لأن قوله قد شيب بماء أى قد خلط ومعنى الشوب الخلط وجمعه أشواب وإنما قلنا إذا لم يرد به البيع لأن خلط الماء باللبن غش وقد قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من غشنا فليس منا ، وقد بلغني أن عمر بن الخطاب ﷺ اهراق لبنا قد شيب بماء على مريد بيعه والغش فيه** . (التمهيد:۶/۱۵۴،ط: مؤسسة القرطبة). واللہ ﷻ اعلم۔

باب ...... ﴿۸﴾

نکاح وطلاق سے متعلق متفرق مسائل

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ازواجِ مطہرات کے نکاح کی تفصیل:

سوال: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ازواجِ مطہرات کے ساتھ کونسے مہینے کی کونسی تاریخ کو ہوا تھا؟ سال کونسا تھا؟ اور دن میں ہوا تھا یا رات میں؟ بینوا بالتفصیل .

الجواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواجِ مطہرات کے ساتھ نکاح کی ترتیب کے بارے میں مورخین کا قدرے اختلاف ہے، ہاں اُمہات المومنین کی تعداد گیارہ ہونے میں سب کا اتفاق ہے، نیز ان گیارہ میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ہو چکا تھا، اور آپ کی وفات کے وقت نو امہات المومنین حیات تھیں۔

کتبِ سیرت وتاریخ کی ورق گردانی سے نکاح کے ماہ وسال کے بارے میں کچھ تفصیلات حاصل ہوئیں، البتہ دن یا رات میں نکاح کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔

نکاح کے ماہ اور سال کے بارے میں نقشہ درجِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

رقم شمار	امہات المؤمنین کے اسمائے گرامی	نکاح کا سال	نکاح کا مہینہ
۱	حضرت خدیجۃ الکبریٰ بنت خویلدؓ	بعثتِ نبوی سے ۱۵ سال قبل	---
۲	حضرت سودہ بنت زمعہؓ	بعثتِ نبوی کے دس سال بعد	شوال المکرّم

۳	حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا	بعثتِ نبوی کے دس سال بعد	شوال المکرّم
۴	حضرت حفصہ بنت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہا	۳ھ	شعبان المعظم
۵	حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا	۳ھ	رمضان المبارک
۶	حضرت ام سلمہ ہند بنت ابی امیہ رضی اللہ عنہا	۴ھ	شوال المکرّم
۷	حضرت جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا	۵ھ	شعبان المعظم
۸	حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا	۵ھ	ذوالقعدہ
۹	حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا	۷ھ	محرم الحرام
۱۰	حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا	۷ھ	جمادی الاخریٰ
۱۱	حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا	۷ھ	ذوالقعدہ

حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں: البدایہ والنہایہ میں علامہ ابن کثیرؒ رقمطراز ہیں:

قال یونس بن بکیر عن محمد بن إسحاق، قال: فماتت خدیجة بنت خویلد قبل أن یهاجر رسول الله صلی الله علیه وسلم بثلاث سنین لم یتزوج علیها امرأة حتی ماتت هي وأبوطالب في سنة ، فتزوج رسول الله صلی الله علیه وسلم بعد خدیجة سودة بنت زمعة ، ثم تزوج بعد سودة عائشة بنت أبي بکر لم یتزوج بکراً غیرها ولم یصب منها ولداً حتی مات، ثم تزوج بعد عائشة حفصة بنت عمر، ثم تزوج بعدحفصة زینب بنت خزیمة الهلالیة أم المساکین ، ثم تزوج بعدها أم حبیبة بنت أبي سفیان ، ثم تزوج بعدها أم سلمة هند بنت أبی أمیة ، ثم تزوج بعدها زینب بنت جحش، ثم تزوج بعدها جویریة بنت الحارث بن أبی ضرار، قال ثم تزوج بعد جویریة صفیة بنت حیی بن أخطب ، ثم تزوج بعدها میمونة بنت الحارث الهلالیة ، فهذا الترتیب أحسن وأقرب مما رتبه الزهری، والله أعلم. (البدایة والنهایة:۵/۳۰۰،ط:دارالفکر).

سیرۃ المصطفیٰ میں حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ فرماتے ہیں:

ازواجِ مطہرات کی تعداد اوران کے نکاحوں کی ترتیب کے بارے میں مؤرخین کا قدرے اختلاف ہے مگر گیارہ امہات المؤمنین کے بارے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں، اوران میں سے حضرت خدیجہؓ اورحضرت زینب بنت خزیمہ ؓ کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انتقال ہوگیا تھا،نو بیویاں حضور کی وفات اقدس کے وقت موجود تھیں۔(سیرۃ المصطفیٰ:۲/۲۵۱،مکتبہ مدنیہ)۔

﴿۱﴾ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

قال فی الإصابة: وكان تزويج النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم خديجة قبل البعثة بخمس عشرة سنة . (الاصابة:۸/۹۹،بيروت).

و للمزيد ينظر : (عـمـدة القاری شرح صحيح البخاری : ۱/۲۳، دار احياء التراث ، والكامل فی التاريخ: ۱/۵۶۹، ط:دارالكتب العلمية ،وجامع الآثارفی السير ومولد المختار:۳/۴۵۰).

﴿۲﴾ام المؤمنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

قال فی الرحيق المختوم : وفي شوال من هذه السنة . سنة ۱۰ من النبوة. تزوج رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم سودة بنت زمعة ،كانت ممن أسلم قديماً ، وهاجرت الهجرة الثانية إلى الحبشة ، وكان زوجها السكران بن عمرو، وكان قد أسلم وهاجر معها، فمات بأرض الحبشة ، أو بعد الرجوع إلى مكة ، فلما حلت خطبها رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وتزوجها ، وكانت أول امرأة تزوجها بعد وفاة خديجة ، وبعد أعوام وهبت نوبتها لعائشة . (الرحيق المختوم ،ص۱۱۴،ط:دارالقلم ،بيروت). (وكذا فی الاغصان الندية شرح الخلاصة البهية بترتيب احداث السيرة النبوية ،ص ۱۰۱،دارسبل السلام).

﴿۳﴾ام المؤمنین حضرت عائشہ بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما:

قال فی المواهب اللدنية : وأما أم المؤمنين عائشة رضي اللّٰه تعالىٰ عنها...فخطبها النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وأصدقها، فيما قاله ابن اسحاق ، أربع مائة درهم ، وتزوجها بمكة في شوال سنة عشر من النبوة قبل الهجرة بثلاث سنين . (المواهب اللدنية: ۲/۸۱، ط:

المكتب الاسلامى).

وكذا فى فتح البارى : ۲۲۵/۷ ،دارالمعرفة ،والاغصان الندية شرح الخلاصة البهية بترتيب احداث السيرة النبوية ،ص۹۹ ،وشرح الزرقانى على المواهب : ۳۸۱/۴ ،دارالكتب العلمية).

﴿۴﴾ ام المؤمنین حضرت حفصہ بنت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما:

قال العلامة القسطلاني فى المواهب: وأما أم المؤمنين حفصة بنت عمر بن الخطاب رضي الله عنهما...فلما تأيمت ذكرها عمر رضي الله عنه على أبي بكر رضي الله عنه وعثمان رضي الله عنه فلم يجبه واحد منهما إلى زواجها ، فخطبها رسول الله صلى الله عليه وسلم فأنكحه إياها في سنة ثلاث من الهجرة . (المواهب اللدنية: ۸۳/۲،ط:المكتب الاسلامى).

وقال في سبل الهدى والرشاد في سيرة خير العباد: فتزوجها رسول الله صلى الله عليه وسلم في شعبان على رأس ثلاثين شهراً من مهاجرة على القول الأول، وبعد أحد على القول الثاني . (سبل الهدى والرشاد: ۱۸۴/۱۱ ،دارالكتب العلمية).

وقال فى اللؤلؤ المكنون في سيرة النبى المامون: تزوج رسول الله صلى الله عليه وسلم حفصة بنت عمر بن الخطاب رضى الله عنهما في شعبان من السنة الثالثة للهجرة . (۵۵۸/۲،المكتبة العامرية).

﴿۵﴾ ام المؤمنین وام المساکین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

قال فى المواهب: وأما أم المؤمنين زينب بنت خزيمة بن الحارث الهلالية ، وكانت تدعى فى الجاهلية أم المساكين لإطعامها إياهم ، فكانت تحت عبد الله بن جحش في قول ابن شهاب، قتل عنها يوم أحد فتزوجها رسول الله صلى الله عليه وسلم سنة ثلاث ... (المواهب : ۸۹/۲،ط:المكتب الاسلامى).

وقال في جامع الآثار فى السير ومولد المختار: وكان تزويجه إياها في شهر رمضان على رأس إحدى وثلاثين شهراً من الهجرة . (۱۸۸/۷ ،دارالفلاح). (وكذا فى الاغصان الندية ، ص۲۲۲ ،ط:دارابن حزم ،واللؤلؤالمكنون : ۵۶۲/۲ ،المكتبة العامرية).

﴿۶﴾ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

قال فی اللؤلؤ المكنون في سيرة النبى المامون: وفي شوال من السنة الرابعة للهجرة تزوج رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أم سلمة رضى اللّٰه تعالىٰ عنها . (۵۵/۳،المكتبة العامرية). (وكذا في دلائل النبوة للامام البيهقى:۳۲۲/۳،ط:دارالكتب العلمية،والمواهب اللدنية : ۸۵/۲).

﴿۷﴾ ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

قال فى المواهب: وكان تزويجها له صلى اللّٰه عليه وسلم في سنة خمس من الهجرة. (المواهب : ۸۸/۲).

وفي جامع الآثار: وكانت زينب عند زيد بن حارثة فطلقها، فزوجه اللّٰه إياها من السماء ولم يعقد عليها، وذلک في سنة خمس من الهجرة لهلال ذى القعدة . (جامع الآثار: ۱۴۰/۷، دارالفلاح). (وكذا فى الرحيق المختوم ،ص۴۳۵،ط:دارالهلال، والأساس فى السنة وفقهها: ۱۲۶۱/۳،ط:دارالسلام).

﴿۸﴾ ام المؤمنین حضرت جویریہ بنت الحارث بن ابی ضرار رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

قال فى الخلاصة البهية : لسنة الخامسة للهجرة...وفي شعبان أيضاً من هذه السنة اعتق النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وتزوجها . (الخلاصة البهية ،ص۴۲،ط:دارالفوائد).

(وكذا فى مرويات غزوة بنى المصطلق وهى غزوة المريسيع ،ص۹۶، عمارة البحث العلمى وكذافى المواهب :۹۱/۲).

﴿۹﴾ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما:

وقال فى الرحيق المختوم : أم حبيبة رملة بنت أبي سفيان،كانت تحت عبيد اللّٰه بن جحش، هاجرت معه إلى الحبشة ، فارتد عبيد اللّٰه وتنصر، وتوفى هناک ، ثبتت أم حبيبة على دينها وهجرتها ، فلما بعث رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عمروبن أمية الضمرى بكتابه إلى النجاشي فى المحرم سنة ۷ هـ خطب عليه أم حبيبة فزوجها إياه وبعث بها مع

شرحبيل بن حسنة . (الرحيق المختوم ،ص ۴۳۵،ط:دار الهلال).

(وكذا في الاساس في السنة وفقهها:۳/ ۱۲۶۱).

﴿۱۰﴾ ام المؤمنین حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

وفي الرحيق المختوم : صفية بنت حيي بن أخطب من بني إسرائيل، كانت من سبي خيبر فاصطفاها رسول الله صلى الله عليه وسلم لنفسه فاعتقها وتزوجها بعد فتح خيبر سنة ۷هـ. (ص ۴۳۵،دار الهلال). (وكذا في رحمة للعلمين ،ص ۴۳۰،ط:دار السلام).

﴿۱۱﴾ ام المؤمنین حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

قال في المواهب: وأما أم المؤمنين ميمونة بنت الحارث الهلالية...فتزوجها صلى الله عليه وسلم لما كان بمكة معتمراً سنة سبع بعد غزوة خيبر . (المواهب :۲/ ۸۹).

وفي الرحيق المختوم: ميمونة بنت الحارث ، أخت أم الفضل لبابة بنت الحارث ، تزوجها في ذوالقعدة سنة ۷ هـ، في عمرة القضاء . (ص ۴۳۵،ط:دار الهلال). (وكذافي الخلاصة البهية : ۱۳۰،ط:دار الفوائد). واللہ ﷻ اعلم۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے خطبہ کی تحقیق:

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ کس نے پڑھایا۔ اس کا حوالہ درکار ہے؟ اور حوالہ مضبوط ہے یا اس پر کلام ہے؟ اگر کلام ہے تو کیا کلام ہے؟ نیز وہ خطبہ کیا تھا؟

الجواب: حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے بارے میں سیرت وتاریخ کی کتابوں میں چار اقوال ہیں:

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ ان کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے ان کا نکاح کرایا۔ یہ علامہ سیوطی کا رجحان ہے۔ اور خطبہ پڑھنے کی نسبت جناب ابوطالب کی طرف مذکور ہے، لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے بھائی عمرو بن خویلد نے نکاح کرایا، یہ اکثر کتب میں صیغہ تمریض کے ساتھ مذکور ہے۔

۳۔ تیسرا قول جو بہت مشہور ہے کہ ان کے والد خویلد نے نشہ کی حالت میں ان کا نکاح کرایا، لیکن ابن کثیرؒ اور امام ذہبیؒ وغیرہ نے واقدی کے قول کو ترجیح دی ہے کہ خویلد کا انتقال جنگ فجار میں ہو گیا تھا، تو یہ ممکن ہی نہیں۔

۴۔ چوتھا قول جو اہل سیر کے نزدیک زیادہ راجح ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے چچا عمرو بن اسد نے ان کا نکاح کرایا۔

اکثر کتب میں سب اقوال بلاسند نقل کیے گئے ہیں، ہاں تاریخ الطبری میں اسانید مذکور ہیں، لیکن سب پر کلام ہیں، اکثر نے واقدی کے قول کو ترجیح دی ہے جو کہ متروک ہے، البتہ تاریخ میں اس کا قول لے سکتے ہیں۔ **كما قاله الذهبيُّ رحمه الله** . روایات کی تفصیل حسبِ ذیل ملاحظہ کیجئے:

الکامل فی التاریخ میں ہے:

فلما أرسلت إلى النبي صلى الله عليه وسلم قال لأعمامه، وخرج ومعه حمزة بن عبد المطلب وأبو طالب وغيرهما من عمومته حتى دخل على خويلد بن أسد فخطبها إليه، فتزوجها... وقيل: إن الذي زوجها عمها عمرو بن أسد، وإن أباها مات قبل الفجار .

قال الواقدى: وهو الصحيح؛ لأن أباها توفى قبل الفجار . (الكامل فى التاريخ لابن الأثير: ۲۳۹/۱).

السیرۃ النبویہ میں ہے: **زواجه صلى الله عليه وسلم من خديجة : فلما قالت ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم ذكر ذلك لأعمامه فخرج معه عمه حمزة بن عبد المطلب حتى دخل على خويلد بن أسد فخطبها إليه فتزوجها .** (السيرة النبوية لابن هشام : ۱۵۴/۲).

الروض الانف میں ہے: **وذكر غير ابن إسحاق أن خويلداً كان إذ ذاك قد أهلك وأن الذى أنكح خديجة رضي الله عنها هو عمها عمرة بن أسد، قاله المبرد وطائفة معه وقال أيضا: إن أبا طالب هو الذى نهض مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو الذي خطب**

خطبة النكاح وكان مما قاله في تلك الخطبة: **" أما بعد، فإن محمداً ممن لا يوازن به فتى من قريش إلا رجح به شرفاً ونبلاً وفضلاً وعقلاً، فإن كان في المال قل، فإنما المال ظل زائل وعارية مسترجعة وله في خديجة بنت خويلد رغبة ولها فيه مثل ذلك"** . فقال عمرو: هو الفحل الذي لا يقدع أنفه فأنكحها منه يقال قاله ورقة بن نوفل، والذى قاله المبرد هو الصحيح لما رواه الطبرى عن جبير بن مطعم، وعن ابن عباس، وعن عائشة رضى الله عنهم كلهم، قال: إن عمرو ابن أسد هو الذى أنكح خديجة رسول الله صلى الله عليه وسلم وأن خويلداً كان قد هلك قبل الفجار وخويلد بن أسد هو الذى نازع تبعاً الآخر حين حج وأراد أن يحتمل الركن الأسود معه إلى اليمن، فقام فى ذلك خويلد وقام معه جماعة، ثم إن تبعاً روع فى منامه ترويعاً شديداً حتى ترك ذلك وانصرف عنه . والله أعلم .

وذكر الزهرى في سيره وهي أول سيرة ألفت فى الإسلام كذا روى عن [عبد العزيز بن محمّد بن عبيد] الدراوردى أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لشريكه الذى كان يتجر معه في مال خديجة : هلم فلنتحدث عند خديجة وكانت تكرمهما وتتحفهما، فلما قاما من عندها جاءت امرأة مستنشئة ـ وهى الكاهنة ـ كذا قال الخطابى فى شرح هذا الحديث، فقالت له: جئت خاطباً يا محمد ، فقال: كلا ، فقالت: ولم؟ فوالله ما في قريش امرأة و إن كانت خديجة إلا تراك كفئاً لها، فرجع رسول الله صلى الله عليه وسلم خاطباً لخديجة مستحيياً منها، وكان خويلد أبوها سكران من الخمر، فلما كلم في ذلك أنكحها، فألقت عليه خديجة حلة وضمخته بخلوق، فلما صح من سكره قال: ما هذه الحلة والطيب؟ فقيل: إنك أنكحت محمداً خديجة وقد ابتنى بها، فأنكر ذلك ثم رضيه وأمضاه . ففي هذا الحديث أن أباها كان حياً، وأنه الذي أنكحها، كما قال ابن إسحاق .

... وقيل: إن عمرو بن خويلد أخاها هو الذي أنكحها منه . ذكره ابن إسحاق في آخر الكتاب. (الروض الأنف للإمام المحدث عبد الرحمن السهيلى: ۲/۲۳۸ـ ۲۴۲،ط:مكتبة ابن تيمية).

الاصابہ فی تمییز الصحابہ میں ہے:

ثـم أسـنـد عن عائشة أن الذي زوجها عمها عمرو؛ لأن أباها كان مات في الجاهلية. قـال الـواقـدى: هذا المجمع عليه عندنا، وأسند من طرف أنها حين تزويجها به كانت بنت أربعين سنة . (الإصابة في تمييز الصحابة: ۸/۱۰۱).

تاریخ طبری میں ہے:

حـدثـنـى الحارث (ذكره ابن حبان فى الثقات. وقال الدارقطنى: صدوق) قال حدثنا مـحـمـد بـن سـعـد (صـدوق) قـال حدثنا محمد بن عمر (يعنى الواقدى۔ متروك مع سعة عـلمه) قال حدثنا معمر وغيره عن ابن شهاب الزهرى وقد قال ذلك غيره من أهل البلدان خـديـجة إنـمـا كانت استأجرت رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجلا آخر من قريش إلى سـوق حبـاشة بتهـامة، وكـان الـذي زوجها إياه خويلد، وكان الذي مشت فى ذلك مولاة مـولـدة من مولدات مكة، قال الحارث: قال محمد بن سعد: قال الواقدى: فكل هذا غلط. قـال الـواقـدي: ويقولون أيضاً إن خديجة أرسلت إلى النبي صلى الله عليه وسلم تدعوه إلى نـفسهـا تـعـنى التزويج وكانت امرأة ذات شرف وكان كل قريش حريصاً على نكاحها. قد بـذلـوا الأمـوال و طـمعوا لذلك فدعت أباها فسقته خمراً حتى ثمل ونحرت بقرة وخلقته بـخـلـوق وألبستـه حـلة حبـرة ثم أرسلت إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم في عمومته فـدخـلـوا عـليـه فزوجه فلما صح قال : ما هذا العقير وما هذا العبير وما هذا الحبير؟ قالت: زوجتـنـي مـحـمد بن عبد الله . قال: ما فعلت، إني أفعل هذا وقد خطبك أكابر قريش فلم أفعل .

قـال الـواقدي : وهذا غلط والثبت عندنا المحفوظ من حديث محمد بن عبد الله بن مسلم (من كبار أتباع التابعين۔ صدوق له أوهام) عن أبيه (يعنى عبد الله بن مسلم الزهرى۔ ثـقة) عـن محمد (ثقة) بن جبير بن مطعم ومن حديث ابن أبى الزناد (صدوق تغير حفظه لما

قـدم بغداد ، وكان فقيها) عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة، ومن حديث ابن أبى حبيبة (مـقبـول) عن داود ابن الحصين (ثقة إلا فى عكرمة؛ لأن ما روى عن عكرمة فمنكر، ورمى بـرأى الـخوارج) عن عكرمة عن ابن عباسؓ أن عمها عمرو بن أسد زوجها رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وأن أباها مات قبل الفجار. انتهى. (تاريخ الطبرى: ۲/۳۶).

البدایہ والنہایہ میں ہے:

وقـد ذكـر الزهرى فى سيره أن أباها زوجها منه وهو سكران. قال المؤملى المجتمع عـليـه: إن عـمها عمرو بن أسد هو الذى زوجها منه، وهذا هو الذى رجحه السهيلى وحكاه عـن ابـن عباس وعائشة قالت: وكان خويلد مات قبل الفجار... وذكر ابن إسحاق فى آخر السيـرة أن أخاها عمرو بن خويلد هو الذى زوجها رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم . فاللّٰه أعلم . انتهى . (البداية والنهاية: ۱/۱۰۷).

سیر اعلام النبلاء میں ہے:

[قـال] الـواقدى حدثنا ابن أبى حبيبة عن داود بن الحصين عن عكرمة عن ابن عباسؓ وابـن أبـى الـزنـاد عـن هشام وروى عن جبير بن مطعم أن عم خديجة عمرو بن أسد زوجها بـالنبى صلى اللّٰه عليه وسلم وأن أباها مات قبل الفجار، ثم قال الواقدى: هذا المجتمع عليه عند أصحابنا ليس بينهم اختلاف. انتهى. (سير أعلام النبلاء: ۲/۱۱۰).

صفۃ الصفوۃ میں ہے:

ذكـر تـزويج رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم خديجة : قالت نفيسة بنت منية: كانت خـديـجة بـنـت خويلد بن أسد بن العزى بن قصى، امرأة حازمة جلدة شريفة، أوسط قريش نسباً وأكثرهم مالاً، وكل قومها كان حريصاً على نكاحها لو قدر على ذلک، وقد طلبوها و بـذلـوا لها الأموال، فأرسلتنى دسيساً إلى محمّد بعد أن رجع من الشام، فقلت يا محمد: ما يـمـنـعک أن تـزوج ؟ فـقـال: مـا بيـدي ما أتزوج به، قلت: فإن كفيت ذلک ودعيت إلى

الجمال والمال والشرف والكفاءة ألا تجيب؟ قال: فمن هي؟ قلت: خديجة، قال: وكيف بذلك؟ قلت: على، قال: وأنا أفعل، فذهبت فأخبرتها، فأرسلت إليه أن ائت لساعة كذا كذا وأرسلت إلى عمها عمرو بن أسد ليزوجها فحضر، ودخل رسول الله صلى الله عليه وسلم في عمومته فتزوجها وهو ابن خمس وعشرين سنة، وخديجة يومئذ بنت أربعين سنة. (صفة الصفوة لابن الجوزى: ۱/۳۱).

إلا أن شمس الدين الأسيوطى ذكر فى جواهر العقود عند ذكر أقسام المناكح فى الجاهلية، فقال: والرابع النكاح الصحيح ـ وهو الذى قال النبى صلى الله عليه وسلم ولدت من نكاح لا من سفاح و تزوج النبى صلى الله عليه وسلم خديجة بنت خويلد قبل النبوة من ابن عمها ورقة بن نوفل و كان الذى خطبها له عمه أبو طالب فزوجها منه ابن عمها. انتهى كلامه. والصحيح ما تقدم وعليه جمهور أهل التاريخ والسير. (جواهر العقود: ۲/۳).

الكلام على محمد بن عمر الواقدى:

لا يختلف أحد على معرفة الواقدى الواسعة بالمغازى؛ فيقول الخطيب البغدادى: هو ممن طبق ذكره شرق الأرض وغربها، وسارت بكتبه الركبان في فنون العلم من المغازى والسير والطبقات. فأجمع العلماء على إمامته في فنون التاريخ وأجمعوا على ضعفه فى الحديث، فأعرضوا عن الرواية عنه.

قال العلامة الذهبى فى كتابه ''سير أعلام النبلاء'':وقد تقرر أن الواقدى ضعيف يحتاج إليه فى الغزوات والتاريخ، ونورد آثاره من غير احتجاج. أما فى الفرائض فلا ينبغى أن يذكر، فهذه الكتب الستة ومسند أحمد وعامّة من جمع فى الأحكام نراهم يترخصون فى إخراج أحاديث أناس ضعفاء بل متروكين، ومع هذا لا يخرجون لمحمد بن عمر شيئاً، مع أن وزنه عندى أنه مع ضعفه يكتب حديثه ويروى؛ لأني لا أتهمه بالوضع، وقول من أهدره فيه مجازفة من بعض الوجوه. (سير أعلام النبلاء: ۹/۴۶۹). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

جمعہ کی شام مجلس نکاح منعقد کرنے کا حکم:

سوال: " أمسوا بالإملاک فإنه أعظم برکة " یہ حدیث میں نے کسی جگہ پڑھی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شام کے وقت نکاح کرنا چاہیے، تو کیا شام کے وقت یا رات کے وقت نکاح کرنا مستحب ہے؟ اور جمعہ کی شام کو نکاح کی فضیلت کسی روایت میں ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجروا بالأجر الجزیل۔

الجواب: سوال میں مذکور حدیث، تفسیر ثعلبی میں سند کے ساتھ مذکور ہے لیکن ضعیف ہے، ہاں فضائل میں ضعیف حدیث کا اعتبار ہوتا ہے، اس بناپر شام کے وقت نکاح کرنا مستحب اور خیر و برکت کا سبب ہوگا، باقی فقہاء نے جمعہ کے دن نکاح کرنے کو مستحب بتایا ہے، اور ہمارے بعض اکابرؒ نے جمعہ کے دن شام کو مجلس نکاح منعقد کرنے کو مستحب فرمایا ہے تو چونکہ جمعہ کی شام میں ساعتِ اجابت ہوتی ہے، شاید اس وجہ سے فرمایا ہوگا۔

حدیث شریف ملاحظہ ہو: تفسیر ثعلبی میں سند کے ساتھ یہ حدیث مذکور ہے:

وأخبرني الحسين بن محمد (صدوق)، **قال: حدثنا عبد الله بن يوسف بن أحمد بن مالک** (لم اهتد إلى ترجمته)، **قال: حدثنا أبو العباس عبد الله بن أحمد بن حشيش البغدادي،** (إذا كان خشيش بالخاء، فالدارقطني وثقه) **قال: حدثنا عثمان بن معبد** (وكان ثقة، وأصابه طرش في آخر عمره)، **قال: حدثنا عبد الله بن إبراهيم** (إذا كان عبد الله بن إبراهيم بن أبي عمرو الغفاري أبومحمد المدني، فهو منكر الحديث) **عن سفيان بن عامر العامري** (إذا كان سفيان بن عامر الغفاري، فذكره ابن حبان في الثقات، ولكن قال أبوحاتم: ليس بالقوي)، **عن صافية مولاتهم** (لم أجد من ترجمها، يمكن أن تكون صافية التي روت عن صفية بنت حيي رضي الله تعالىٰ عنها ذكرها في الطبقات الكبرى ولم يذكرلها جرحاً ولا تعديلاً) **عن أبي هريرة ﷺ قال: قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم:" مسوا بالإملاک، فإنه أفضل في اليمن وأعظم في البركة ".** (الكشف والبيان :۷/۹۴، ط:بيروت).

درمختار میں ہے: **ويندب إعلانه وتقديم خطبة وكونه في مسجد يوم جمعة .** (الدر المختار مع رد المحتار :۳/۸،سعيد).

وفي مجمع الأنهر : ويستحب مباشرة عقد النكاح فى المسجد وكونه في يوم الجمعة .
(مجمع الانهر : ۱/ ۳۱۷،داراحياء التراث العربى). (وكذا فى حاشية الطحطاوى على الدرالمختار: ۲/ ۵).

فقہائے مالکیہ نے بھی بروزِ جمعہ بعد العصر مجلس نکاح منعقد کرنے کو مستحب فرمایا ہے۔ملاحظہ ہو:

قال في مواهب الجليل: قال فى الطراز : قال أبوعبيد: تستحب الخطبة يوم الجمعة بعد العصر و ذلک لقربه من الليل وسكون الناس فيه والهدو فيه . (مواهب الجليل: ۵/ ۲۶، ط: دار عالم الكتب) . (و كذا شرح ميارة الفاسى ، لأبى عبد الله المالكى : ۱/ ۲۴۴، دار الكتب العلمية ، والموسوعة الفقهية : ۴۱/ ۲۲۲).

فقہائے شافعیہ اور فقہائے حنابلہ نے جمعہ کے دن شام کی تصریح کی ہے۔ملاحظہ ہو:

قال ابن قدامة فى الشرح الكبير : ويستحب عقد النكاح مساء يوم الجمعة ، لأن جماعة من السلف استحبوا ذلک منهم ضمرة بن حبيب وراشد بن سعيد وحبيب بن عنية ولأنه يوم شريف ويوم عيد وفيه خلق آدم عليه السلام ، والمساء أولى فإن أبا حفص روى بإسناده عن أبي هريرة ﷺ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" مسوا بالإملاک ، فإنه أعظم للبركة " ولأنه أقرب إلى مقصوده وأقل لانتظاره . (الشرح الكبير: ۷/ ۳۶۷،ط: دارالكتاب العربى). (وكذ فى الكافى فى فقه ابن حنبل : ۳/ ۱۷ ،والمغنى لابن قدمة : ۷/ ۴۲۸،دارالفكر).

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں دکتور وہبہ زحیلی شافعیؒ فرماتے ہیں:

ويستحب أن ينعقد النكاح يوم الجمعة مساء، لحديث أبي هريرة ﷺ مرفوعاً : "أمسوا بالإملاک ، فإنه أعظم للبركة ولأن الجمعة يوم شريف ويوم عيد والبركة فى النكاح مطلوبة ، فاستحب له أشرف الأيام طلباً للبركة ، والإمساء به؛ لأن في آخر النهار من يوم الجمعة ساعة الإجابة . (الفقه الاسلامى وادلته : ۷/ ۱۲۴ ،مندوبات عقدالزواج).

جمعہ کے دن نکاح کی فضیلت سے متعلق حدیث اوراس کی تحقیق کے لیے فتاویٰ دارالعلوم زکریا (۳/ ۵۶۰) کی مراجعت مفید ہے۔

بعض اکابرؒ نے بھی بروزِ جمعہ بعد العصر مجلس نکاح کو مستحب فرمایا ہے۔ملاحظہ ہو شاہ صاحبؒ شرح ترمذی

میں فرماتے ہیں: **قوله (في المساجد) كتبنا أن النكاح يوم الجمعة بعد العصر في المسجد مستحب.** (العرف الشذي: ۳۵۸/۲، دار التراث العربي).

تفسیر عزیزی میں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدثِ دہلویؒ فرماتے ہیں:

حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک شخص نے پوچھا کہ عقدِ نکاح کی مجلس کو رات کو کرنا چاہیے یا دن کو آپ نے فرمایا: رات کو اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو لباس فرمایا ہے اور نکاح والی عورتوں کو بھی لباس فرمایا ہے: **هن لباس لكم**، اور ایک لباس کو دوسرے لباس کے ساتھ پوری مناسبت ہے۔ (تفسیر عزیزی: ۱۵/۴)۔ (وکذا فی تفسیر حقانی: ۲۰۱/۵، ط: میر محمد کتب خانہ، کراچی)۔

البتہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا اثر کسی کتاب میں دستیاب نہیں ہوا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حضرت فاطمہ اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نکاح کا خطبہ:

سوال: نکاح پڑھانے کے وقت کونسا خطبہ پڑھنا چاہیے؟ اور کہاں سے ثابت ہے؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسا خطبہ پڑھا تھا؟ میں نے سنا ہے کہ ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح نجاشی نے پڑھایا تھا تو انہوں نے خطبہ پڑھا تھا یا نہیں؟ اگر پڑھا تھا تو کونسا؟

الجواب: عقدِ نکاح سے پہلے ایسا خطبہ جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام ہو پڑھنا سنت ہے، ہاں جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے خطبۃ الحاجہ کے نام سے مشہور ہے اس کا پڑھنا بہتر ہے۔ وہ خطبہ ابوداود شریف کی روایت میں مذکور ہے ملاحظہ ہو:

عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه في خطبة الحاجة في النكاح وغيره..." إن الحمد لله نستعينه ونستغفره ونعوذ به من شرور أنفسنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادى له وأشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله، يا أيها الذين اتقوا الله الذي تساءلون به والأرحام، إن الله كان عليكم رقيباً، يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله حق تقاته ولاتموتن إلا وأنتم مسلمون، يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وقولوا قولاً سديداً يصلح لكم

أعمالكم ويغفر لكم ذنوبكم ومن يطع اللّٰه ورسوله فقد فاز فوزاً عظيماً . (سنن ابی داود: ۲/ ۲۰۳/ ۲۱۲۰، باب فی خطبة النكاح ،ط:دار الكتاب العربی).

قال في رد المحتار: وأطلق الخطبة فأفاد أنها لا تتعين بألفاظ مخصوصة وإن خطب بما ورد فهو أحسن . (فتاوی الشامی: ۳/۸،ط:سعید).

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درج ذیل خطبہ پڑھا تھا۔
ملاحظہ ہو شرحِ زرقانی علی مواہبِ اللدنیہ میں مرقوم ہے:

في حديث أنس رضي الله عنه...فقال صلى اللّٰه عليه وسلم: الحمد للّٰه المحمود بنعمته ، المعبود بقدرته ، المطاع المرهوب من عذابه وسطوته ، النافذ أمره في سمائه وأرضه ، الذي خلق الخلق بقدرته وميزهم بأحكامه ، وأعزهم بدينه ، وأكرمهم بنبيه محمد صلى اللّٰه عليه وسلم أن اللّٰه تبارك اسمه وتعالت عظمته جعل المصاهرة سبباً لاحقاً، أمراً مفترضاً ، أوشج به الأحكام ، وألزم به الأنام ، فقال عز من قائل: وهو الذي خلق من الماء بشراً فجعله نسباً وصهراً وكان ربك قديراً ، [الفرقان: ۵۴] **فأمر اللّٰه يجري إلى قضائه ، وقضائه يجري إلى قدره، ولكل قضاء قدر، ولكل قدر أجل، ولكل أجل كتاب، يمحو اللّٰه ما يشاء ويثبت وعنده أم الكتاب، ثم اللّٰه تعالىٰ أمرني أن أزوج فاطمة رضي الله عنها من علي بن أبي طالب رضي الله عنه، فاشهدوا أني قد زوجته على أربعمائة مثقال فضة إن رضي بذلك علي.** (شرح الزرقانی: ۲/ ۳۶۲).

ترجمہ: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو قابل تعریف ہے اپنی نعمت کی وجہ سے، اور معبود ہے اپنی قدرت کی بنیاد پر، اس کی اطاعت کی جاتی ہے، اور اس سے ڈرا جاتا ہے اس کے عذاب اور پکڑ کی وجہ سے، اپنے حکم کو زمین اور آسمان میں نافذ کرنے والا ہے، جس نے مخلوق کو اپنی قدرت سے پیدا کیا، اور اپنے احکام سے ان کو ممیّز کیا، اور اپنے دین کے ذریعہ ان کو اعزاز بخشا، اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کا اکرام کیا، اللہ تعالیٰ کا نام بابرکت ہے، اور اس کی ذات بڑی عظمت والی ہے، اور اس نے سسرالی رشتہ داری کو ملاپ کا ذریعہ بنایا، اس کے ذریعہ رشتہ داریوں کو جوڑا، اس کو مخلوق پر لازم کیا، اللہ

تعالیٰ فرماتے ہیں: اور وہ ایسی ذات ہے جس نے پانی سے آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان والا، سسرال والا بنا دیا اور تیرا رب بڑی قدرت والا ہے، پس اللہ تعالیٰ کا حکم اس کے فیصلہ کا نتیجہ ہے اور اس کا فیصلہ اس کی تقدیر کا ثمرہ ہے، اور ہر فیصلہ مقدر ہے اور ہر امر مقدر کے لیے ایک وقت ہے اور ہر زمانہ کے لیے خاص خاص احکام جاری ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ جس حکم کو چاہے منسوخ کر دیتے ہیں اور جس حکم کو چاہے قائم رکھتے ہیں، اور اصل کتاب اُسی کے پاس ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میں فاطمہ ؓ کا نکاح علی بن ابی طالب ؓ سے کر دوں، تو آپ لوگ گواہ رہیں، میں نے چار سو مثقال چاندی پر نکاح کرا دیا اگر علیؓ اس پر راضی ہو۔

مزید ملاحظہ ہو: (تاریخ الخمیس: ۱/۳۶۲، ومرقاۃ المفاتیح: ۱۷/۴۵۲، والسیرۃ الحلبیۃ: ۲/۴۷۲، ط: دار المعرفۃ)۔

وفي مختصر تاريخ مدينة دمشق: محمد بن دينا ر العرقي، روى عن هشيم، بسنده إلى أنس بن مالك ﷺ قال: بينا أناْ عند النبي صلى الله عليه وسلم إذ غشيه الوحي، فلما سرى عنه قال: هل تدري ماجاء به جبريل من عند صاحب العرش؟ قلت: لا، قال: إن ربي أمرني أن أزوج فاطمة من علي بن أبي طالب ﷺ، انطلق فادع لي أبابكر وعمر وعثمان وطلحة والزبير ﷺ، وبعددهم من الأنصار، فانطلقت، فدعوتهم، فلما أخذوا المقاعد، قال النبي صلى الله عليه وسلم... (مختصر تاريخ مدينة دمشق: ٦/ ١٩ ٣).

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کا خطبہ نجاشی نے پڑھایا تھا۔ ملاحظہ ہو دلائل النبوۃ میں ہے:

أن أم حبيبةؓ بنت أبي سفيان ﷺ قالت: ما شعرت وأناْ في أرض الحبشة إلا برسول النجاشي، جارية يقال لها أبرهة، كانت تقوم على ثيابه ودهنه، فاستأذنت علي، فأذنت لها، فقالت: إن الملك يقول لک: إن رسول الله صلى الله عليه وسلم كتب إلى أن أزوجكه، فقلت: بشرک الله بخير، وقالت: يقول لک الملک: وكلي من يزوجک، فأرسلت إلى خالد بن سعيد ﷺ فوكلته، وأعطيت أبرهة سوارين من فضة، وخدمتين من فضة كانتا علي، وخواتم من فضة كانت في كل أصبع رجلي، سروراً بما بشرتني به، فلما أن كان من العشي أمر النجاشي جعفر بن أبي طالب ﷺ ومن هنا من المسلمين يحضرون وخطب النجاشي،

فقال: الحمد للّٰہ الملک القدوس السلام المؤمن المهيمن العزيز الجبار، أشهد أن لا إله إلا اللّٰہ وأن محمداً عبده ورسوله، وأنه الذي بشر به عيسىٰ ابن مريم عليه السلام، أما بعد، فإن رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم كتب إلى أن أزوجه أم حبيبة بنت أبي سفيان، فأجبت إلى ما دعا إليه رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم، وقد أصدقتها أربعمائة دينار، ثم سكب الدنانير بين يدى القوم. (دلائل النبوة للإمام البيهقى: ۳/ ۴۶۱/ ۱۳۴۶).

روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ نجاشی نے جعفر بن ابی طالبؓ اور جو مسلمان وہاں تھے ان کو جمع کر کے خطبہ پڑھا اور خطبہ کے بعد فرمایا کہ: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ تحریر فرمایا کہ میں آپ کا نکاح ام حبیبہؓ سے کردوں، پس میں نے آپ کا نکاح آپ کے ارشاد کے مطابق کردیا اور چارسو دینار مہر مقرر کیا۔

مزید ملاحظہ ہو: (البدایۃ والنہایۃ: ۴/ ۱۶۴، ط: داراحیاء التراث العربی، ومختصر تاریخ مدینۃ دمشق: ۳/ ۱۷۶، وامہات المؤمنین فی مدرسۃ النبوۃ للشیخ مصطفیٰ طحان، ص ۶۹، وزوجات النبی، ص ۸۷، والسیرۃ الحلبیۃ: ۲/ ۷۵۸، ط: دارالمعرفۃ، بیروت)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وکیل کی گواہی سے نکاح منعقد ہونے کا حکم:

سوال: کیا وکیل گواہ بن سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی ایک مجلس میں دولہا موجود تھا اور ایک گواہ تھا اور لڑکی کی طرف سے ایک وکیل تھا جو گواہ بھی تھا، ان تین کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا، کیا نکاح ہوا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ نکاح منعقد نہیں ہوا، دلہن کی اجازت پر موقوف رہے گا، جب دلہن اجازت دیگی تو وہ عاقدہ بن جائیگی اور وکیل اور ایک گواہ مل کر دو گواہ بن جائیں گے، اور نکاح منعقد ہوجائیگا۔

ملاحظہ ہو درمختار میں مرقوم ہے:

ولو زوج بنته البالغة، العاقلة بمحضر شاهد واحد جاز إن كانت ابنته حاضرة لأنها تجعل عاقدة و إلا لا... وفي رد المحتار: قوله و لو زوج بنته البالغه العاقلة، كونها بنته غير قيد، فإنها لو وكلت رجلاً غيره فكذلک كما فى الهندية، وقيد بالبالغة؛ لأنها لو كانت

صغيرة لا يكون الولي شاهداً ، لأن العقد لا يمكن نقله إليها بحر ، وبالعاقلة ؛ لأن المجنونة كالصغيرة أفاده ط، قوله لأنها تجعل عاقدة ؛ لانتقال عبارة الوكيل إليها ، وهي في المجلس فكانت مباشرة ضرورة ؛ ولأنه لا يمكن جعلها شاهدة على نفسها، قوله وإلا،لا، أى إن لم تكن حاضرة لا يكون العقد نافذاً بل موقوفاً على إجازتها كما في الحموى ؛ لأنه لا يمكن أدنى حالاً من الفضولي وعقد الفضولي ليس بباطل ط. (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۲۵/۳،سعيد).

وللاستزادة راجع : (الجوهرة النيرة : ۲/۲۶، مكتبه امداديه ، والبناية :۵۰۳/۴، مكتبه رشيديه، و غمز عيون البصائر للعلامة الحموى: ۳۲۶/۱، ط:ادارة القرآن). **واللہ ﷻ اعلم۔**

منگنی وعدۂ نکاح ہے، نکاح نہیں:

سوال: ایک شخص کی ایک لڑکی سے منگنی ہوئی، منگنی کی مجلس میں ۸،۱۰ آدمی موجود تھے، لڑکی کے والد نے کہا: بس ہم نے لڑکے کو لڑکی دی ہے، لڑکے نے کہا: ہم نے قبول کی ہے، خطبہ، رجسٹر وغیرہ کچھ نہیں تھا، اب لڑکی والے منگنی کو توڑنا چاہتے ہیں، جبکہ لڑکے والے کہتے ہیں کہ منگنی میں ایجاب قبول ہوا، یہ نکاح ہے، اب اس کو توڑ نہیں سکتے، شرعاً کیا حکم ہے؟ نکاح ہوا یا نہیں؟ کیا لڑکی دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب: منگنی میں مقصود وعدۂ نکاح ہوتا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں نکاح منعقد نہیں ہوا، فقط نکاح کا وعدہ ہوا، ہاں بلا عذرِ شرعی وعدہ خلافی نہیں کرنی چاہیے، وعدہ نبھانا مستحب ہے۔ اگر تکلیف پہنچانے کا قصد ہے تو گناہ ہوگا، ورنہ نہیں۔ علامہ شامیؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

قال في شرح الطحاوي: لو قال: هل أعطيتنيها فقال: أعطيت، إن كان المجلس للوعد فوعد ، وإن كان للعقد فنكاح . (فتاوى الشامى:۱۱/۳،سعيد).

(وكذا في البحر الرائق: ۸۹/۳،دارالمعرفة ،بيروت،وفتح القدير: ۱۹۱/۳،دارالفكر،والموسوعة الفقهية الكويتية: ۲۳۹/۴۱).

قال الملا علي القاري في المرقاة: قال النووي : أجمعوا على أن من وعد إنساناً شيئاً

ليس بمنهي عنه فينبغي أن يفي بوعده وهل ذلک واجب أو مستحب؛ فيه خلاف: ذهب الشافعيؒ وأبوحنيفةؒ والجمهور إلى أنه مستحب...ولا يأثم يعني من حيث أنه خلف وإن كان يأثم إن قصد به الأذى. (المرقاة: ۹/۱۷۷،باب المزاح،ط:امدادیہ،ملتان).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

منگنی کے وقت لڑکی کے باپ کا یہ کہنا کہ میں نے اپنی فلان لڑکی تیرے فلان لڑکے کو دی، اورلڑکے کا باپ کہتا ہے کہ ہاں میں نے اپنے فلان لڑکے کے لیے قبول کی، اس کے بعد وہ لڑکی لڑکے کو ملنے نہیں دیتے اور اس کو نصف نکاح خیال کیا جاتا ہے، کیا اس لڑکی کا نکاح بغیر اجازت لڑکے یا اس کے ولی کے دوسری جگہ ہوسکتا ہے؟

جواب: منگنی کے وقت جوالفاظ کہے جاتے ہیں وہ وعدۂ نکاح کے ہوتے ہیں، نکاح منعقد کرنا مقصود نہیں ہوتا، اسی لیے نکاح دوبارہ مجلس منعقد کرکے کیا جاتا ہے، پس منگنی کے اوپر نکاح کے احکام جاری نہیں ہوسکتے۔ (کفایت المفتی:۵/۵۱،ط:دارالاشاعت)۔

آپ کے مسائل اوران کا حل میں مذکور ہے:

منگنی رشتہ لینے دینے کے وعدہ کا نام ہے مگر منگنی سے نکاح نہیں ہوتا، اس لیے منگنی توڑنا وعدہ خلافی ہے اور بغیر کسی معقول اور صحیح عذر کے وعدہ خلافی گناہ ہے، مگر چونکہ عقدِ نکاح نہیں ہوا اس لیے لڑکے سے طلاق لینے کی ضرورت نہیں۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل:۶/۸۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

منگنی میں لفظِ نکاح استعمال کرنے سے نکاح کا حکم:

سوال: اگر منگنی میں جانبین نکاح کا لفظ استعمال کریں، لیکن مہر، خطبہ اور گواہوں کی گواہی کا تذکرہ نہ ہو اور ایجاب وقبول ہوجائے تو نکاح منعقد ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: منگنی میں نکاح کا صریح لفظ استعمال کرنے سے نکاح منعقد ہوجائے گا، اگرچہ مہر کا تذکرہ نہ کیا ہو تب بھی مہر دینا ضروری ہے، اور نکاح کا خطبہ مسنون ہے اور گواہی کا تذکرہ کرنا ضروری نہیں ہے، دومرد یا

ایک مرد اور دو عورتوں کی موجودگی میں نکاح درست ہے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

لأن الصريح يفوق الدلالة . (فتاوى الشامي :۱۴۲/۳ ،سعيد). (وكذا فى البحرالرائق: ۱۸۸/۳ ، دارالمعرفة، وتبيين الحقائق: ۳۱۶/۴، امداديه،ملتان، وفتح القدير: ۴۳۸/۴،دارالفكر).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

البتہ اگر منگنی کی مجلس میں صریح لفظ نکاح استعمال کیا جائے، مثلاً: زوج، یا اس کا ولی یوں کہے کہ اپنی لڑکی کا نکاح میرے ساتھ کردو اور ولی زوجہ کہے کہ میں نے اپنی لڑکی کا نکاح تیرے ساتھ کردیا تو نکاح ہوجاوے گا۔ (کفایت المفتی: ۴۹/۵، ط: دارالاشاعت)۔

نیز نکاح صریح لفظ سے ہوتو منعقد ہوجاتا ہے چاہے نکاح کرنے کا ارادہ اور نیت نہ ہو، ملاحظہ ہو حدیث میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: ثلاث جدهن جد و هزلهن جد : النكاح ، والطلاق ، والرجعة . (رواه الترمذى،رقم: ۱۱۸۴ ،باب ماجاء فى الجد والهزل فى الطلاق).

كتاب الحجه على أهل المدينه میں امام محمدؒ فرماتے ہیں:

محمد قال: أخبرنا سالم الخياط قال: قال الحسن البصرى، قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من طلق لاعباً أو نكح لاعباً أو أعتق لاعباً فقد جاز ذلك عليه . (كتاب الحجة على اهل المدينة : ۲۰۱/۳ ،ط:عالم الكتب).

بدائع الصنائع میں مذکور ہے:

وكذلك الجد ليس من شرائط جواز النكاح حتى يجوز نكاح الهازل لأن الشرع جعل الجد والهزل في باب النكاح سواء، قال النبي صلى اللّٰه عليه وسلم...وكذلك العمد عندنا حتى يجوز نكاح الخاطي وهو الذي يسبق على لسانه كلمة النكاح من غير قصده ... لأن الثابت بالخطأ ليس إلا القصد وأنه ليس بشرط لجواز النكاح بدليل نكاح الهازل . (بدائع الصنائع: ۳۱۰/۲، سعيد).

بلا ذکر مہر نکاح منعقد ہوجاتا ہے اور نکاح کے بعد مہر مثل ادا کرنا ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ویصح النکاح وإن لم یسم فیه مهراً لأن النکاح عقد انضمام وازدواج لغة فیتم بالزوجین ثم المهر واجب شرعاً إبانة لشرف المحل فلا یحتاج إلی ذکره لصحة النکاح وکذا إذا تزوجها بشرط أن لا مهر لها لما بینا. (الهدایة ،باب المهر :۳۲۳/۲، باب المهر).

وفي فتح القدیر: الحاصل أن وجوب مهر المثل حکم کل نکاح لا مهر فیه . (فتح القدیر: ۲۱۰/۳، مکتبه رشیدیه). (وکذا فی الدر المختار ،ص ۱۸۹ ،ط:دار الکتب العلمیة،وملتقی الابحر ،ص ۲۳۱).

بہشتی زیور میں ہے: نکاح میں چاہے مہر کا کچھ ذکر کرے چاہے نہ کرے، ہر حال میں نکاح ہو جاوے گا، لیکن مہر دینا پڑے گا، بلکہ اگر کوئی شرط کرلے کہ ہم مہر نہ دیویں گے، بے مہر نکاح کرتے ہیں تب بھی مہر دینا پڑے گا۔(بہشتی زیور، چوتھا حصہ،ص۳۱۲،ط: دارالاشاعت)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فون پر بذریعہ میسیج ایجاب وقبول کرنے کا حکم:

سوال: ایک لڑکے نے ایک لڑکی کو میسیج کیا کہ کہو میں نے نکاح قبول کیا، اس لڑکی نے بلا قصد وارادہ یہ میسیج بھیج دیا کہ میں نے قبول کیا، نکاح ہوا یا نہیں؟ کیونکہ اب یہ لڑکی کسی اور سے نکاح کرنا چاہتی ہے تو کیا نکاح کرسکتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ نکاح منعقد نہیں ہوا، وجہ اس کی یہ ہے کہ نکاح منعقد ہونے کے لیے ایجاب وقبول کا ایک مجلس میں گواہوں کے سامنے زبانی ہونا ضروری ہے جس کو گواہ سن لیں، اور یہ بات یہاں مفقود ہے۔

بدائع الصنائع میں علامہ ابوبکر کاسانیؒ شرائطِ نکاح پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وأما الذي یرجع إلی مکان العقد فهو اتحاد المجلس إذا کان العاقدان حاضرین وهو أن یکون الإیجاب والقبول في مجلس واحد حتی لو اختلف المجلس لا ینعقد النکاح بأن کانا حاضرین فأوجب أحدهما فقام الآخر عن المجلس قبل القبول أو اشتغل بعمل یوجب اختلاف المجلس لا ینعقد ...

فأما إذا کان أحدهما غائباً لم ینعقد حتی لو قالت امرأة بحضرة شاهدین زوجت

نفسي من فلان وهو غائب فبلغه الخبر فقال: قبلت، أو قال رجل بحضرة شاهدين تزوجت فلانة وهي غائبة فبلغها الخبر فقالت: زوجت نفسي منه لم يجز وإن كان القبول بحضرة شاهدين ذينک الشاهدين وهذا قول أبي حنيفةؒ ومحمدؒ . (بدائع الصنائع: ۲/۲۳۲،سعيد).

(وكذا فى الهندية: ۱/۲۶۹).

وفي الشامي: قوله ولا بكتابة حاضر، فلو كتب تزوجتک فكتبت قبلت لم ينعقد ، بحر، والأظهر أن يقول: فقالت: قبلت ، الخ، إذ الكتابة من الطرفين بلا قول لا تكفى ولو فى الغيبة ، تأمل . (فتاوى الشامى:۳/۱۲،سعيد).

فتاویٰ حقانیہ میں ہے:

شریعتِ اسلامی میں نکاح دو گواہوں کے سامنے زبانی ایجاب وقبول کا نام ہے نفس تحریر سے نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ (فتاویٰ حقانیہ:۴/۳۱۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حدیث میں نکاح کو نصف الایمان بتایا ہے، اس حدیث کی تحقیق:

سوال: کسی حدیث میں یہ وارد ہوا ہے کہ نکاح نصف الایمان ہے، یا اس کے ہم معنی کوئی روایت موجود ہے؟ اگر ہے تو اس کا کیا درجہ ہے؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: امام طبرانیؒ نے اپنی کتاب "المعجم الأوسط" میں ایک روایت نقل فرمائی ہے جس کا مفہوم یہ ہے: جس نے نکاح کیا اس نے نصفِ ایمان کو مکمل کرلیا، اب نصفِ ثانی کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔ لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔ روایت کے الفاظ ملاحظہ ہو:

عن أنس بن مالكؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من تزوج فقد استكمل نصف الإيمان فليتق الله فى النصف الباقي". (رواه الطبرانى فى الأوسط: ۷/۳۳۲/۷۶۴۷، ط:القاهرة).

قال الهيثمى فى المجمع : رواه الطبرانى فى الاوسط باسنادين وفيهما يزيد الرقاشى

وجابر الجعفي وكلاهما ضعيف وقد وثقا. (مجمع الزوائد: ۲۶۳/۴، دارالفکر).

امام طبرانی نے دوسند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے لیکن دونوں سندیں ضعیف ہیں؛ ایک میں یزید رقاشی اور دوسری میں جابر جعفی ضعیف راوی ہیں۔

اس روایت کے ہم معنی دوسری روایت مسندِ ابی یعلی میں مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو:

عن أنس بن مالك رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: من تزوج فقد أعطى نصف العبادة. (رواه ابویعلی فی مسنده، رقم: ۴۳۴۹).

وقال الهيثمي في المجمع: رواه أبويعلى وفيه: عبد الرحيم بن زيد العمي وهو متروك. (مجمع الزوائد: ۲۶۳/۴، دارالفکر).

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں احادیث ضعیف ہیں، اور نصفِ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ شہوت کی دو قسمیں ہیں: ۱) شہوتِ بطن؛ کھانا پینا۔ ۲) شہوتِ فرج، اور نکاح شہوتِ فرج کو شریعت کے موافق پورا کرنا ہے، اس لیے یہ نصف الایمان بن گیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اسکائپ کال کے ذریعہ عقدِ نکاح کا حکم:

سوال: اگر کوئی شخص اسکائپ کال (جس میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہوئے بات چیت کرتے ہیں) کے ذریعہ نکاح کرے جس میں دوگواہ عاقدین کی بات چیت سنتے ہیں اور چہرہ بھی دیکھتے ہیں، تو ایسی صورت میں نکاح منعقد ہوجائیگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: نکاح منعقد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عاقدین دوگواہوں کے سامنے ایک ہی مجلس میں ایجاب وقبول کرلیں، اور دوگواہ سن لیں اگر مجلس بدل گئی تو نکاح منعقد نہیں ہوگا، اور اسکائپ کال میں یہ بات نہیں ہوتی، لہٰذا اسکائپ کال کے ذریعہ نکاح منعقد نہیں ہوگا، ہاں لڑکی لڑکے کے مقام پر کسی کو اپنی طرف سے وکیل بنادے پھر وکیل مجلس نکاح میں دوگواہوں کے سامنے نکاح کردے تو نکاح ہوجائیگا۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں ہے:

فأما إذا كان أحدهما غائباً لم ينعقد حتى لو قالت امرأة بحضرة شاهدين زوجت نفسي من فلان وهو غائب فبلغه الخبر فقال: قبلت، أو قال رجل بحضرة شاهدين تزوجت فلانة وهي غائبة فبلغها الخبر فقالت: زوجت نفسي منه لم يجز وإن كان القبول بحضرة شاهدين ذينک الشاهدين وهذا قول أبي حنيفةؒ ومحمدؒ . (بدائع الصنائع: ۲/۲۳۲،سعید).

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے: سوال: انٹرنیٹ، ویب سائٹ، فیکس، ای میل، ٹیلیفون کانفرس اور ٹیلی گرام پر نکاح کرنا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب: نکاح میں ضروری ہے کہ ایجاب وقبول ایک ہی مجلس میں ہو، سوال میں جن صورتوں کا ذکر ہے، اس میں ظاہر ہے کہ بات کرنے یا تحریری طور پر اپنی بات کو پیش کرنے والے کی مجلس الگ ہوتی ہے اور مخاطب کی مجلس الگ، اس لیے ان ذرائع ابلاغ کے ذریعہ نکاح کا ایجاب وقبول درست نہیں، البتہ کسی شخص کو ایجاب وقبول کا وکیل بنایا جاسکتا ہے اور وہ اپنے موکل کا نکاح کرسکتا ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۴/۳۰۶، ط: زمزم)۔

اہم مسائل جن میں ابتلا عام ہے، میں مذکور ہے:

مسئلہ: ایمو (Imo) یا اسکائپ (Skype) پر لائف ویڈیو کال (Live Video Call) کے ذریعہ لڑکا لڑکی ایجاب وقبول کریں، اور لڑکا لڑکی کی آواز دو گواہ بھی سن لیں، تو بھی نکاح صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ شرعاً نکاح کے صحیح ہونے کے لیے ایجاب وقبول کی مجلس ایک ہونے کے ساتھ ساتھ دو گواہوں کا اس مجلس میں موجود ہونا ضروری ہے، جو ایجاب وقبول کے الفاظ اپنے کانوں سے سنیں، ہاں! اگر باہر رہنے والا لڑکا یا لڑکی کسی کو اپنا وکیل بنا دے، پھر مجلس نکاح میں ایجاب کرنے والے کے ایجاب کو دوسرے کا وکیل قبول کرلے، اور اس مجلس میں دو مسلمان گواہ بھی موجود ہوں، جو ایجاب وقبول کو سن لیں، تو نکاح صحیح ہوجائے گا۔ (اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: ۹/۲۰۳، ط: اکل کوا)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

غیر مسلم کی گواہی سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک نومسلم لڑکی کا نکاح ایک مسلمان مرد سے ہوا اور نکاح کے گواہوں میں اس کا بھائی اور والد

تھا اور دونوں غیر مسلم تھے اور دونوں کا اصرار تھا کہ گواہ بن جائیں، اور نکاح پڑھانے والا مسلمان تھا، تو اس حالت میں نکاح ہوا یا نہیں؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: اگر رجسٹر میں گواہوں کے خانے میں غیر مسلم بھائی اور والد کے نام درج تھے، لیکن مجلس نکاح میں دوسرے مسلمان موجود تھے تو ان سب کی گواہی سے نکاح ہوگیا، البتہ اگر مجلس نکاح میں صرف دولہا، دلہن تھے اور غیر مسلم بھائی اور والد تھے، ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا تو نکاح نہیں ہوا، دو مسلمان گواہوں کی موجودگی میں دوبارہ نکاح کیا جائے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں مذکور ہے:

ولا ينعقد نكاح المسلمين إلا بحضور شاهدين حرين عاقلين بالغين مسلمين رجلين أو رجل وامرأتين عدولاً كانوا أو غير عدول أو محدودين فى القذف...ولا بد من اعتبار الإسلام في أنكحة المسلمين لأنه لا شهادة للكافر على المسلم . (الهداية: ۲/۳۰٦،ط: المصباح) .

بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وأما صفات الشاهد الذي ينعقد به النكاح...ومنها: الإسلام في نكاح المسلم المسلمة فلا ينعقد نكاح المسلم المسلمة بشهادة الكفار لأن الكافر ليس من أهل الولاية على المسلم قال الله تعالىٰ: ﴿ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلاً﴾ وكذا لا يملك الكافر قبول نكاح المسلم . (بدائع الصنائع: ۲/۲۵۳،سعيد).

حاضرین مجلس کی گواہی سے نکاح صحیح ہونے سے متعلق درمختار میں منقول ہے:

ولو بعث مريد النكاح أقواماً للخطبة فزوجها الأب أو الولي بحضرتهم صح ، فيجعل المتكلم فقط خاطباً والباقي شهوداً ، به يفتى فتح. وفي الشامي: قوله صح ، في الفتح عن الفتاوى: قيل: لا يصح...وقيل: يصح وهو الصحيح وعليه الفتوىٰ لأنه لا ضرورة في جعل الكل خاطباً فيجعل المتكلم فقط والباقي شهوداً . (الدرالمختار مع رد المحتار:۳/۲۷،سعيد).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

مسلمہ عورت کے نکاح کے انعقاد وجواز کے لیے مسلمان شاہدوں کی موجودگی اور ایجاب وقبول کو سننا شرط ہے، ایک گواہ مسلمان اور ایک غیر مسلم ہوتو نکاح جائز نہ ہوگا۔ (کفایت المفتی :۶/ ۵۰۸، جامعہ فاروقیہ)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

جب مجمع کے سامنے ایجاب وقبول کرایا گیا ہے تو وہی سب گواہ ہیں، مستقلاً مقرر کر کے گواہ بنانا ضروری نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۰/ ۶۲۱، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مجلس نکاح میں لڑکی کا نام نہ لینے سے نکاح کا حکم:

سوال: ایک صوفی صاحب نے ایک لڑکی کا نکاح ایک لڑکے سے پڑھایا، نکاح پڑھاتے وقت لڑکی کا نام نہیں لیا بلکہ یہ کہا کہ فلان کی لڑکی کا نکاح میں نے آپ سے کردیا اور یہ کہا کہ لڑکی کا نام چھپانے کی چیز ہے، نکاح کی مجلس میں لڑکی کا نام نہیں پکارنا چاہیے، اب آپ سے سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں لڑکی کا نام لیا جاتا تھا یا نہیں؟ اور فقہاء نے اس سلسلہ میں کیا لکھا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ میں بوقتِ نکاح لڑکی کا نام لیا جاتا تھا، نیز فقہائے کرام نے بھی فرمایا ہے کہ اگر گواہ لڑکی کو نہ جانتے ہوں تو لڑکی کا نام اور اس کے والد کا نام ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ تعارف ہوجائے کہ کس کا نکاح ہورہا ہے، اسی طرح اگر کسی کی چند لڑکیاں ہوں تو پتا نہیں چلے گا کونسی لڑکی کا نکاح ہورہا ہے لہٰذا نام لینا ضروری ہے۔ ہاں اگر کسی کی ایک ہی لڑکی ہے اور سب جانتے ہیں کہ اس کا نکاح ہورہا ہے تو والد کا نام لینا کافی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کے نکاح وقت آپؓ کا نام لیا تھا، اگرچہ اُس وقت پردے کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو حدیث میں ہے:

عن عبد اللّٰه بن مسعود رضي الله عنه عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: إن اللّٰه أمرني أن أزوج فاطمة من علي، رواه الطبراني ورجاله ثقات . (مجمع الزوائد: ۹/ ۳۲۹/ ۱۵۲۰۸، باب منه في فضلها وتزويجها بعليؓ، دار الفكر).

اسی طرح حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام ذکر فرمایا تھا۔

ملاحظہ ہو مستدرکِ حاکم میں روایت ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لقي عثمان بن عفان وهو مغموم فقال: ماشأنک يا عثمان قال: بأبي أنت يا رسول اللّٰه وأمي هل دخل على أحد من الناس ما دخل علي توفيت بنت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم رحمها اللّٰه وانقطع الصهر فيما بيني وبينک إلى آخر الأبد، فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: أتقول ذلک ياعثمان وهذا جبريل عليه السلام يأمرني عن أمر اللّٰه عزوجل أن أزوجک أختها أم كلثوم على مثل صداقها وعلى مثل عدتها فزوجه رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. (المستدرک للحاكم: ۵۷/۴/۶۸۶۰، ط: دارابن حزم).

قال في رد المحتار: قوله ولا المنكوحة مجهولة، فلو زوج بنته منه وله بنتان لايصح إلا إذا كانت إحداهما متزوجة فينصرف إلى الفارغة كما في البزازية، نهر، ... قلت: وظاهره أنها لو جرت المقدمات على معينة وتميزت عند الشهود أيضاً يصح العقد وهي واقعة الفتوى لأن المقصود نفي الجهالة وذلک حاصل بتعينها عند العاقدين والشهود وإن لم يصرح باسمها كما إذا كانت إحداهما متزوجة ويؤيده ما سيأتي من أنها لوكانت غائبة وزوجها وكيلها فإن عرفها الشهود وعلموا أنه أرادها كفى ذكر اسمها وإلا لا بد من ذكر الأب والجد أيضاً. (فتاوى الشامي: ۱۵/۳، سعيد). (الفتاوى الهندية: ۱/۲۷۰).

احیاء علوم الدین میں امام غزالی شافعیؒ فرماتے ہیں:

ومن آدابه: الخطبة قبل النكاح مزج التحميد بالإيجاب والقبول فيقول المزوج: الحمد للّٰه و الصلاة على رسول اللّٰه زوجتک ابنتي فلانة و يقول الزوج: الحمد للّٰه والصلاة على رسول اللّٰه قبلت نكاحها على هذا الصداق. (إحياء علوم الدين: ۳۷/۲، بيروت).

امدادالفتاویٰ میں مرقوم ہے:

شرطِ جوازِ نکاح یہ ہے کہ منکوحہ زوج اور شاہدین کے نزدیک مجہول نہ رہے بلکہ اپنے غیر سے متمیز ہو جائے

خواہ کسی طرح سے امتیاز ہو پس اگر منکوحہ حاضر ہے تو اس کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے اور اگر غائب ہے تو اگر بدون تصریح نام کے بعض قیود سے اس کی تعیین ممکن ہے تو نام لینے کی حاجت نہیں اور اگر اوصاف سے تمیز نہ ہو تو اس کا نام لینا ضروری ہے بلکہ اگر اس کے نام سے بھی تعین نہ ہو تو باپ دادے کا بھی ضروری ہے حاصل یہ ہے کہ رفعِ ابہام ہو جاوے۔(امدادالفتاویٰ:۲/۲۲۱)۔

مزید دیکھئے: (فتاویٰ حقانیہ:۳/۳۰۶، بہشتی زیور، چوتھا حصہ، ص۳۰۲، ط: دارالاشاعت)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

شادی کے دعوت نامہ پر لڑکی کا نام لکھنے کا حکم:

سوال: آج کل شادی کے دعوت نامہ پر بغرضِ تعارف دولہا دلہن کا نام لکھتے ہیں، بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ لڑکی کا نام لکھنا درست نہیں، کیا کہیں صحیح احادیث یا آثارِ صحابہ سے یہ ثابت ہے کہ دعوت نامہ پر لڑکی کا نام لکھنے سے منع کیا گیا ہو؟ بینوا توجروا۔

الجواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں کارڈ وغیرہ کچھ نہیں تھا، ہاں قرآنِ کریم کے اسلوب سے پتا چلتا ہے کہ عورتوں کا معاملہ تستر پر مبنی ہے، چنانچہ جہاں بھی عورتوں کے ذکر کی ضرورت پڑی نام سے پرہیز کیا گیا، مثلاً: **امرأة فرعون، امرأة نوح، امرأة لوط**، اور **فلما قضى زيد منها وطراً زوجناكها**، وغیرہ، ہاں فقط حضرت مریم بنت عمران کا نام مذکور ہے، لہٰذا اشتہارات وغیرہ پر عورتوں کے نام کی اشاعت اچھی چیز نہیں، البتہ شادی کے دعوت نامہ میں تعارف کی خاطر دولہا دلہن کا نام مع ولدیت لکھدیا جائے تو چنداں حرج نہیں، خصوصاً جب کہ یہ کارڈ اعزہ اقارب میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔

نیز صحابیات تعارف کے لیے اپنا نام بتاتی تھیں، ایک مرتبہ حضرت زینب زوجہ ابن مسعودؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھنے کے لیے آئیں تو اپنا نام بتایا زینب حضور نے فرمایا کونسی زینب تو بتایا امرأة ابن مسعود، یہ تعارف تھا۔ ملاحظہ ہو بخاری شریف میں حدیث ہے:

عن زينب امرأة عبد الله ﷺ، قالت: كنت في المسجد فرأيت النبي صلى الله عليه وسلم فقال: تصدقن ولو من حليكن وكانت زينب تنفق على عبد الله وأيتام في حجرها

قال: فقالت لعبد الله، سل رسول الله صلى الله عليه وسلم أيجزى عني أن أنفق عليك وعلى أيتام في حجري من الصدقة فقال: سلي أنت رسول الله صلى الله عليه وسلم، فانطلقت إلى النبي صلى الله عليه وسلم فوجدت امرأة من الأنصار على الباب...فقال: من هما قال: زينب قال: أى الزيانب، قال: امرأة عبد الله قال: نعم، لها أجران أجر القرابة وأجر الصدقة. (رواه البخاري، رقم: ۱۴۶۶).

ہاں تتبع کثیر کے باوجود کسی حدیث یا اثر میں شادی کارڈ پرلڑکی کا نام لکھنے کی ممانعت نہیں ملی، البتہ بے ضرورت اشتہارات پرلڑکی کے نام شائع کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

محرم الحرام میں شادی کرنے کو ناپسند کرنے کا حکم:

سوال: عام طور پر ہندوستان، پاکستان میں لوگ محرم میں خصوصاً پہلے دس دنوں میں شادی نہیں کرتے، اوراس کو عیب یا منحوس سمجھتے ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ کیا ازواجِ مطہرات اور بناتِ طاہرات میں سے کسی کا نکاح محرم ہوا تھا یا نہیں؟ بینوا بالدلیل توجروا بالاجر الجزیل۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں کوئی ایسا مہینہ نہیں جو منحوس ہو اور اس میں شادی سے منع کیا گیا ہو، بلکہ بد فالی لینا شریعت میں جائز نہیں ہے، یہ غیروں کا طریقہ ہے، اسلامی تہذیب نہیں ہے۔اس کے برخلاف روایات سے پتا چلتا ہے کہ بعض ازواجِ مطہرات اور بعض بناتِ طیبات کا نکاح محرم میں ہوا تھا۔ روایات ملاحظہ ہوں:

ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح محرم میں ہوا تھا۔ الرحیق المختوم میں منقول ہے:

أم حبيبة رملة بنت أبي سفيان رضي الله عنه، كانت تحت عبيد الله بن جحش، فولدت له حبيبة فكنيت بها، وهاجرت معه إلى الحبشة، فارتد عبيد الله وتنصر، وتوفي هناك، وثبتت أم حبيبة على دينها وهجرتها، فلما بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم عمرو بن أمية الضمري بكتابه إلى النجاشي في المحرم سنة ۷ هـ، خطب عليه أم حبيبة فزوجها إياه ...
(الرحيق المختوم، ص ۴۷۱).

وفي المختصر الكبير في سيرة الرسول: وبعث النبي صلى الله عليه وسلم عمرو بن أمية الضمري إلى النجاشي في المحرم على الأصح وقيل في ربيع الأول . (المختصر الكبير، ص ٦٥).

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ سے اوائل محرم میں ہوا تھا۔

قال في الإصابة : فاطمة الزهراء بنت إمام المتقين...وتزوجها على أوائل المحرم سنة اثنتين بعد عائشة بأربعة أشهر...الخ . (الإصابة في تمييز الصحابة: ۲۶۳/۸، ط: بيروت).

حضرت ریحانہ کا نکاح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محرم میں ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ میں ہے:

قال ابن كثيرؒ في البداية والنهاية: قال الواقدي: وحدثني ابن أبي ذئب، قال: سألت الزهري عن ريحانة فقال: كانت أمة رسول الله صلى الله عليه وسلم فأعتقها وتزوجها ، فكانت تحتجب في أهلها وتقول: لا يراني أحد بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم ... وكان تزويجه إياها في المحرم سنة ست من الهجرة . (البداية والنهاية: ۳۱۹/۵، ط: الرياض).

(وكذا في تاريخ مدينة دمشق : ۲۴۱/۳، والطبقات الكبرى لابن سعد: ۱۳۰/۸، ط: دار صادر).

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مرقوم ہے:

محرم، صفر، شعبان میں شادی نہ کرنا اس عقیدے پر مبنی ہے کہ یہ مہینہ منحوس ہے، اسلام اس نظریے کا قائل نہیں، محرم میں حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ اس مہینہ میں عقدِ نکاح ممنوع ہوگیا، ورنہ ہر مہینہ میں کسی نہ کسی شخصیت کا وصال ہوا جو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی بزرگ تر تھے، اس سے یہ لازم آئے گا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے کسی میں بھی نکاح نہ کیا جائے، پھر شہادت کے مہینہ کو سوگ اور نحوست کا مہینہ سمجھنا بھی غلط ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۵۳۱/۲)۔

بارہ مہینوں کے فضائل میں مرقوم ہے:

محرم کے ایام میں قصداً زینت ترک کرنا جس کو سوگ کہتے ہیں، مثلاً: مہندی لگانا اور سر پر تیل لگانا، اسی طرح بعض لوگ ان ایام میں شادی بیاہ کرنے اور خوشی کرنے سے سوگ کی وجہ سے رک جاتے ہیں، بعض میاں

بیوی کے خاص تعلقات کو اِن دنوں میں برا سمجھتے ہیں،۔۔۔شرع سے ثابت نہیں،اور نہ شریعت میں ان کاموں کی ایامِ محرم میں کوئی ممانعت آئی ہے۔ (بارہ مہینوں کے فضائل واحکام،ص۹۶،۹۷)۔واللہ ﷻ اعلم۔

سوتیلے ماموں سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال: ایک لڑکی کی والدہ کا انتقال ہوگیا،اس کے والد نے بڑی عمر میں ایک نوجوان عورت سے شادی کی،اس کا ایک بھائی ہے،کیا اس لڑکی کا نکاح اپنی سوتیلی والدہ کے بھائی یعنی سوتیلے ماموں سے جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ سوتیلی والدہ کا بھائی اس لڑکی کا حقیقی ماموں نہیں ہے اس وجہ سے نکاح جائز اور درست ہے۔بظاہر عدمِ جوازِ نکاح کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ:﴿ وأحل لكم ما وراء ذلكم ﴾ [النساء : ۲۴].

ملاحظہ ہو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

سوال: ایک شخص کی دو زوجہ ہیں اور زوجہ اول سے تین لڑکیاں ہیں،اور زوجہ ثانی لاولد ہے اب زوجہ ثانی کے ایک حقیقی بھائی سے زوجہ اول کی کسی لڑکی کا نکاح درست ہے یا نہیں؟

الجواب: زوجہ ثانیہ کے بھائی کا نکاح زوجہ اولیٰ کی کسی دختر سے درست ہے،اس میں کوئی وجہ حرمت نکاح کی نہیں ہے۔(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:۷/۱۹۶مکمل ومدلل،ط:دارالاشاعت)۔

کفایت المفتی میں مذکور ہے: پہلی بیوی کے بطن سے جو لڑکی ہو اس کا نکاح دوسری بیوی کے بھائی سے کرنا جائز ہے: **قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وأحل لكم ما وراء ذلكم ﴾ أى ما عدا من ذكرن من المحارم هن لكم حلال.** تفسیر ابن کثیر: ۲/۲۵۸. (کفایت المفتی:۶/۱۴۵،جامعہ فاروقیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بیوی کی سوتیلی نواسی سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال: کیا کوئی شخص اپنی بیوی کی سوتیلی نواسی (بیوی کی سوتیلی بیٹی کی بیٹی) کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے یا

نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فقہائے کرام کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرد اپنی بیوی کی سوتیلی بیٹی کے ساتھ نکاح کرسکتا ہے، ان کے درمیان کوئی رشتہ اور تعلق نہیں، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں بیوی کی سوتیلی نواسی کے ساتھ نکاح کرنا بھی جائز اور درست ہوگا۔ ملاحظہ علامہ سرخسیؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

قال: ولا بأس بأن يتزوج الرجل المرأة وبنت زوج قد كان لها من قبل يجمع بينهما لأنه لا قرابة بينهما وقال ابن أبي ليلىٰ: لا يجوز ذلک...ولكنا نستدل بحديث عبد اللّٰه بن جعفر ﷺ فإنه جمع بين امرأة علي ﷺ وابنته ثم المانع من الجمع قرابة بين المرأتين أو ما أشبه القرابة فى الحرمة كالرضاع وذلک غير موجود هنا. (المبسوط: ۴/ ۳۸۶، بیروت، لبنان).

قال العلامة أبوبكر الكاساني فى البدائع: ويجوز الجمع بين امرأة وبنت زوج كان لها من قبل، أو بين امرأة وزوجة كانت لأبيها وهما واحد؛ لأنه لا رحم بينهما فلم يوجد الجمع بين ذواتى رحم... (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۶۳، سعید).

(وكذا فى البناية شرح الهداية: ۵/ ۳۲، بيروت).

فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں ہے:

الجواب: **قال فى الدر المختار: فجاز الجمع بين امرأة وبنت زوجها أو امرأة ابنها، الخ، وكذا في غيره من كتب الفقه،** پس معلوم شد کہ جمع کردن درمیانِ زن وبنت زوج او کہ از زن دیگر است جائز وحلال است کہ علت حرمت جمع در آنہا یافتہ نمی شود کما حققہ فی رد المحتار۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۷/ ۴۴۸، دار الاشاعت)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

شادی کے بعد لڑکی کا رخصتی سے پہلے نفقہ طلب کرنے کا حکم:

سوال: ایک لڑکی کا نکاح ہوا اور خلوتِ صحیحہ بھی ہوئی، لیکن وہ با قاعدہ لڑکے کے ہاں دوسرے ملک نہیں گئی، شادی کو تین ماہ گزر چکے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا گزشتہ تین ماہ کا نفقہ طلب کرسکتی ہے یا نہیں؟ نیز آئندہ

کے نفقہ کا کیا حکم ہوگا؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: فقہائے کرام کی عبارات سے مترشح ہوتا ہے کہ نفقہ حق احتباس ہے یعنی اپنے آپ کو سپرد کرنے کا حق ہے، اگر لڑکی نے اپنے آپ کو سپرد نہیں کیا تو نفقہ واجب نہیں ہوگا۔ ہاں لڑکی جانے کے لیے تیار ہے اور شوہر اس کو نہ لے جائے یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے جانا نہیں ہوتا تو لڑکی نفقہ طلب کرسکتی ہے۔

البتہ گزشتہ زمانہ کا نفقہ طلب کرنے کے لیے دو شرطیں ہیں؛ ا۔ دونوں نے آپس میں طے کرلیا ہو کہ ماہانہ اتنی رقم ادا کریگا اور پھر نہ دے۔ ۲۔ قاضی نے نفقہ کی ایک متعین مقدار شوہر کے ذمہ لگادی ہو اور پھر ادا نہ کرے تو گزشتہ کا نفقہ طلب کرنا جائز ہے، اِن دو صورتوں کے علاوہ میں زمانہ گزشتہ کا نفقہ طلب کرنا درست نہیں ہے۔

اور آئندہ کے بارے میں دونوں آپس کی رضامندی سے طے کرلیں تو مطالبہ کا حق حاصل ہوگا۔

فقہائے کرام کی عبارات حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

قال في الهداية: النفقة واجبة للزوجة على زوجها مسلمة كانت أو كافرة إذا سلمت نفسها إلى منزله فعليه نفقتها وكسوتها وسكناها والأصل في ذلك قوله تعالىٰ: ﴿لينفق ذو سعة من سعته﴾ وقوله تعالىٰ: ﴿وعلى المولود له رزقهن وكسوتهن بالمعروف﴾ وقوله عليه الصلاة والسلام في حديث حجة الوداع: ولهن عليكم رزقهن وكسوتهن بالمعروف. ولأن النفقة جزاء الاحتباس وكل من كان محبوساً بحق مقصود لغيره كانت نفقته عليه.

(الهداية شرح البداية: ۲/۲۸۵).

قال المحقق العلامة ابن الهمام: وقوله إذا سلمت نفسها في منزله ليس شرطاً لازماً في ظاهر الرواية بل من حين العقد الصحيح وإن لم ينتقل إلى منزل الزوج إذا لم يطلب الزوج انتقالها، فإن طلبه فامتنعت لحق لها كمهرها لا تسقط النفقة أيضاً، وإن كان لغير حق حينئذٍ لا نفقة لها لنشوزها،...وقول الأقطع الشيخ أبي نصر في شرحه: إن تسليمها نفسها شرط بالإجماع منظور فيه، ثم قرره على وجه يرفع الخلاف وهو أنه إذا لم ينتقلها إلى بيته ولم يمتنع هي تجب النفقة لأنها سلمت نفسها ولكنه رضي ببطلان حقه حيث ترك النقلة

فلا يسقط حقها . (فتح القدير: ۴/۳۸۰،دارالفكر).

وللاستزادة راجع : (العناية شرح الهداية: ۴/۳۸۰،دارالفكر، وفتاوى الشامي: ۳/۵۷۳، سعيد،والمبسوط للامام السرخسيؒ: ۵/۱۸۶،دارالمعرفة).

وقال في المحيط البرهاني: وأصل المسألة : إن نفقة الزوجات تصير ديناً بقضاء القاضي أو بتراضيهما على شيء معلوم لكل شهر بالاتفاق أما قبل قضاء القاضي وقبل تراضيهما لا يصير ديناً عليه عندنا . (المحيط البرهاني: ۳/۵۳۸).

قال في بدائع الصنائع: إذا فرض القاضي لها نفقة كل شهر أو تراضيا على ذلك ثم منعها الزوج قبل ذلك أشهر غائباً كان أو حاضراً فلها أن تطالبه بنفقة مامضى لأنها صارت ديناً بالفرض أوالتراضي صارت في استحقاق المطالبة بها كسائر الديون. (بدائع الصنائع: ۴/۲۸،سعيد). (وكذا في الفتاوى الهندية: ۱/۵۵۱). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مطلقہ عیسائی عورت کے ساتھ نکاح کے لیے عدت کا حکم:

سوال: ایک عیسائی عورت نے اپنے شوہر سے طلاق لینے کے لیے مقدمہ درج کیا، عدالت نے طلاق کا فیصلہ کر دیا، اب وہ عیسائی عورت مسلمان مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے تو کیا تین حیض عدت گزارنی ضروری ہے یا نہیں؟ یعنی شریعتِ مطہرہ میں غیر مسلم عیسائی عورت کے لیے طلاق کی عدت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک غیر مسلم عیسائی عورت پر عدت واجب نہیں ہے، ہاں مسلمان کے ساتھ نکاح کے لیے ایک حیض سے پاک ہونے کا انتظار کرلے، اور اگر فی الفور نکاح کرلیا ہے تو جماع کے لیے ایک حیض سے پاک ہونے کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں ہے:

وظاهره أنه لا عدة من الكافر عند الإمام أصلاً وإليه ذهب بعض المشايخ فلا تثبت الرجعة للزوج بمجرد طلاقها...وقيل: تجب لكنها ضعيفة لاتمنع من صحة النكاح... والأصح الأول كما في القهستاني عن الكرماني ومثله في العناية . (فتاوى الشامي: ۳/۱۸۵،سعيد).

بدائع الصنائع میں علامہ ابوبکر کاسانیؒ فرماتے ہیں:

وإن كانت تحت ذمي، فلا عدة عليها فى الفرقة ولا فى الموت في قول أبي حنيفةؒ إذ كان ذلك كذلك في دينهم، حتى لو تزوجت فى الحال جاز، وعند أبي يوسفؒ، ومحمدؒ عليها العدة . (بدائع الصنائع :۳/ ۱۹۱،سعيد).

وفى الهداية: وإذا طلق الذمى الذمية فلا عدة عليها . (الهداية : ۲/ ۳۱،المكتبة الاسلامية).

قال في فتح القدير: فلا عدة عليها فلو تزوجها مسلم أو ذمي في فور طلاقها جاز . (فتح القدير: ۴/ ۳۳۳،دار الفكر).

نکاح کے بعد استبراء رحم ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن رويفع بن ثابت الأنصاري قال: قام فينا خطيباً قال: أما أني لا أقول لكم إلا ماسمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يوم حنين، قال: لا يحل امرئ يؤمن بالله واليوم الآخر أن يسقي ماء ه زرع غيره ، يعنى إتيان الحبالى، ولا يحل لامرئ يؤمن بالله واليوم الآخر أن يقع على امرأة من السبى حتى يستبرئها ولايحل لامرئ يؤمن بالله واليوم الآخر أن يبيع مغنما حتى يقسم . (رواه ابوداود،رقم الحديث : ۲۱۶۰،باب فى وطئ السبايا).

وقال في تبيين الحقائق: ولو طلق ذمي ذمية لم تعتد وكذا إذا مات عنها زوجها وهذا إذا كانت لا تجب في معتقدهم ، وهو قول أبي حنيفةؒ ، وروى عنه أنه لايطؤها حتى يستبرئها بحيضة ، وعنه أنه لايتزوجها إلا بعد الاستبراء . (تبيين الحقائق: ۳/ ۳۴،القاهرة).

وكذافى البحر الرائق: ۴/ ۱۴۹،كوئٹه وفتح القدير: ۴/ ۳۳۴،دار الفكر).

وفى الفتاوى الخانية : والذمي إذا أبان الذمية فتزوجها مسلم أو ذمي من ساعته ؛ ذكر بعض المشايخؒ أنه يجوز نكاحها ولايباح وطؤها حتى يستبرئها بحيضة في قول أبي حنيفةؒ وفي قول صاحبيه نكاحها باطل حتى تعتد بثلاث حيضن. (فتاوى قاضيخان بهامش الفتاوى الهندية: ۱/ ۳۶۶).

البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ فی زماننا عیسائی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ اورناپسندیدہ ہے، کیونکہ

مشاہدہ ہے کہ اس کی وجہ سے بچوں کے مذہب کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا اور ماں زبردستی عیسائیت کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی ہے۔

تفصیلی دلائل کے لیے فتاویٰ دار العلوم زکریا کی تیسری جلد کا مطالعہ مفید ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شوہر کے ناقابل جماع ہونے پر تفریق کا حکم:

سوال: ایک عورت کا شوہر کسی حادثہ میں زخمی ہوا، جس کی وجہ سے اس کا عضو مخصوص کٹ گیا یا ناقابل جماع ہو گیا، ان دونوں کے بچے بھی ہیں، عورت جوان ہے، اس نے شوہر سے طلاق یا خلع کا مطالبہ کیا، شوہر نے انکار کیا، کیا اِس صورت میں عورت کے لیے اس مرد سے چھٹکارے کا شرعاً کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ کیا یہ عورت اپنا معاملہ جماعت مسلمین کے سامنے پیش کر کے نکاح فسخ کرانے کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟ نیز جماعتِ مسلمین کو شرعاً اس معاملہ میں کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ احناف کا اصل مذہب یہ ہے کہ شادی کے بعد جب ایک بار شوہر ہمبستری کرلے پھر اس کے بعد کسی وجہ سے قادر نہ ہو سکے تو عورت کو فسخ کا مطالبہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ عام فقہاء نے فقہ کی کتابوں میں اسی طرح تحریر فرمایا ہے نیز مصنف ابن ابی شیبہ میں چند تابعین کے آثار بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ صورتِ مسئولہ میں جب بار بار ہم بستری ہو چکی ہے اور دونوں کے بچے بھی ہیں تو عورت کو صبر سے کام لینا چاہیے اور بچوں کی پرورش کی طرف توجہ صرف کرنی چاہیے کہ اس میں بچوں کے ضائع ہونے سے حفاظت بھی ہے، نیز عورت کو چاہیے کہ اپنے خیالات کا قبلہ درست کرے اور اگر شہوت کا غلبہ ہو تو کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرے اور ان کے مشورہ سے نفسانی خواہش کو دبانے والی دوائیاں استعمال کرے اور اپنے بچوں کو اپنے مستقبل کا سرمایہ اور پونجی سمجھ لے، اللہ تعالیٰ بے حساب اجر دیں گے اور فسخ وتفریق کا مطالبہ نہ کرے۔

علماء اور فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیں:

قال فی البحر الرائق: وجدت زوجها مجبوباً فرق فی الحال، وهو من استؤصل ذكره وخصيتاه...وأشار إلى أنه لو جب بعد الوصول إليها مرة لا خيار لها كما صار عنيناً

بعده . (البحر الرائق: ۴/۱۳۳، ط: دارالمعرفة). (وكذا فى الدر المختار مع فتاوى الشامى: ۳/۴۹۵، سعيد، والفتاوى الهندية: ۱/۵۲۵، وتبيين الحقائق: ۳/۲۲، امداديه).

مصنف ابن ابی شیبہ میں چند آثار منقول ہیں:

عن الحسن قال: إذا وصل إليها مرة لم يفرق بينهما. وعن الزهرى: إذا قدر عليها مرة فهي امرأته أبداً . و عن عطاء قال: إذا أصابها مرة فلا كلام لها ولا خصومة. وعن عمرو بن دينار، قال: ما زلنا نسمع أنه إذا أصابها مرة فلا كلام لها ولا خصومة، وعن طاووس، قال: إذا أصابها مرة فلا كلام لها ولا خصومة . وعن قتادة وأبي هاشم قالا: إن تزوجها ثم وطئها مرة ثم لم يستطع أن يغشاها، فإنه لا خيار لها بعد تلك المرة. وعن إبراهيم قال: إذا وطئها مرة فليس لها خيار . (مصنف ابن ابى شيبة: ۴/۲۰۹، باب: إذا وصل مرة ثم حبس عنها).

وقال في " الفوائد العلية على الأحكام الشرعية فى الأحوال الشخصية على مذهب الإمام أبي حنيفة النعمان": مادة: ۱۵۱: يجب قضاءً على الزوج أن يواقع مرة واحدة في مدة الزوجية . أى يجب عليه فى القضاء مرة واحدة، ويؤمر بها ديانةً، أى فيما بينه وبين اللّٰه تعالىٰ، وقال بعضهم: بل يجب عليه الزيادة قضاءً أيضاً، لدفع الضرر عنها ولتأتي بالأولاد التي هي أهم مقاصد الزواج، واللّٰه أعلم . (ص:۸۷).

احوالِ شخصیہ کی عبارت سے بھی پتا چلتا ہے کہ مدتِ زوجیت میں ایک مرتبہ ہم بستری سے قضاءً عورت کا واجب حق ساقط ہوجاتا ہے، ہاں دیانۃً حق باقی ہے لہٰذا صحت اور تندرستی کی حالت میں احیاناً شوہر کو اس کی رعایت کرنی چاہیے، البتہ بحالتِ مجبوری حق دیانت بھی ساقط ہوجاتا ہے، جیسا کہ فتاویٰ دارالافتاء المصریہ میں مرقوم ہے، (عبارت آگے آرہی ہے) اور جو بعض فقہاء نے قضاءً بھی تکرار کو واجب قرار دیا ہے تو یہ دفع ضرر کے لیے۔

جدید فقہی مسائل میں مذکور ہے:

اس مسئلہ میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اکثر فقہاء کے نزدیک اگر مرد نے ایک بار بھی عورت سے مباشرت کرلی تو عورت کا حق جنسی ختم ہوجاتا ہے اور آئندہ اگر مرد نامرد بھی ہوجائے تو عورت فسخ نکاح کا مطالبہ نہیں کرسکتی

علامہ صنعانیؒ نے لکھا ہے کہ اوزاعیؒ ،سفیان ثوریؒ، امام ابوحنیفہؒ،امام مالکؒ ، امام شافعیؒ اوراسحاق بن راہویہؒ کا یہی مسلک ہےفقہاء نے یہ بات بہت واضح اورصریح انداز میں تحریرفرمائی ہے:

ولو وطيها مرة ثم عجز عن الوطي في هذا النكاح لا يكون لها حق الخصومة . (شرح النقاية للبرجندى: ۵۶/۲). (جدید فقہی مسائل:۱۸۸/۳)۔

فتاوی دارالافتاءالمصر یہ میں ۱۰۳۱ھ کاایک فتویٰ منقول ہے،اس میں بحوالہ شامی اور بحر، یہ بات مکتوب ہے کہ قضاءً عورت کاحق ایک مرتبہ کا ہے،اگرشادی کے بعدایک مرتبہ ہمبستری ہوگئی تو قضاءً حق ساقط ہوگیا یعنی عورت کو فسخ کے مطالبہ کاحق حاصل نہیں،ہاں دیانۃً حق باقی ہےشوہرقدرت کے باوجودستانے کی غرض سے ہم بستری نہ کرےتو گنہگار ہوگا،اوراگرمعقول عذرہوتو گنہگارنہیں ہوگا۔عربی فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

ولو تزوج و وصل إليها ثم عجز عن الوطء بعد ذلك، و صار عنيناً ، لم يكن لها حق الخصومة ، و على أنه(الدرالمختار شرح تنوير الابصار للعلائى وحاشية رد المحتار لابن عابدين : ۱۹۸،۹۱۷/۲ . والبحر الرائق لابن نجيم المصرى الحنفى: ۱۳۵/۴) **فلو جُن بعد وصوله إليها مرة أو صار عنيناً بعد الوصول إليها لا يفرق بينهما لحصول حقها بالوطء مرة ، وما زاد عليها فهو مستحق ديانةً لا قضاء ، ويأثم إذا ترک الديانة متعنتاً مع القدرة على الوطء .** (فتاوى دارالإفتاء المصرية: ۳۲۷/۱،ط:وزارة الاوقاف المصرية).

البتہ زمانہ حال کےعلماء میں سےحضرت مولانا خالدسیف اللہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ بعدمیں پیداہونے والی نامردی کوبھی فسخ کا موجب قراردیاجائے،چنانچہ پہلےمشہور مذہب کی وضاحت کرنے کے بعدلکھتے ہیں:

ہمیں چاہیے کہ اس مسئلہ پرقرآن وحدیث اورقیاس کی روشنی میں غورکریں،اس مسئلہ کااصل مداراس پر ہے کہ ایک دفعہ جماع کے بعدعورت کاحق ہے یانہیں؟اگر یہ ثابت ہوجائے کہ عورت کاحق اس کے بعدبھی باقی رہتاہےتو ظاہر ہےایک دفعہ مباشرت کے بعدبھی نامردی فسخ نکاح کاباعث ہوگی اوراگرایک دفعہ جماع سے عورت کاحق صحبت ساقط ہوجاتا ہےتو ظاہر ہےاب اس کے لیےفسخ نکاح کا مطالبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ ابن حزم کی رائے ہے کہ ہرطہرمیں کم ازکم ایک دفعہ مرد پرعورت سےصحبت کرناواجب ہےاس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے: **فإذا تطهرن فأتوهن من حيث أمركم الله**. [البقرة: ۲۲۲]، اور شیخ سابق نے لکھا ہے کہ جمہور علماء کی یہی رائے ہے، **وذهب جمهور العلماء إلى ما ذهب إليه ابن حزم من الوجوب على الرجل إذا لم يكن له عذر**.

امام احمدؒ کی رائے ہے کہ کم از کم چار ماہ میں ایک دفعہ مباشرت واجب ہے، اس لیے کہ ایلاء کی مدت چار ماہ ہے اور اگر شوہر سفر پر ہو تب بھی چھ ماہ میں ایک بار ضرور آئے اور صحبت کرے، یہاں تک کہ اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کردے اور عورت علیحدگی کی طالب ہو تو قاضی دونوں میں تفریق کردے گا، امام احمد کی دلیل وہ واقعہ ہے جو زید بن اسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک بار آنجنابؓ مدینہ کا جائزہ لینے نکلے، ایک خاتون کے مکان سے گزر ہوا جو یہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

تطاول هذا الليل وأسود جانبه　۞　وطال على أن لا خليل ألاعبه
والله لولا خشية الله وحده　۞　لحرك من هذا السرير جوانبه
ولكن ربي والحياء يكفيني　۞　وأكرم بعلي أن توطأ راكبه

ترجمہ: رات طویل ہوگئی اور رات کا کنارہ سیاہ ہوگیا اور مجھ پر یہ بات گراں ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں جس کے ساتھ میں کھیلوں، خدا کی قسم اگر خدائے واحد کا خوف نہ ہوتا تو اس چارپائی کے کنارے ہل رہے ہوتے، لیکن میرا پروردگار اور میری غیرت میرے لیے کافی ہے اور میں اپنے شوہر کی تعظیم کروں گی اس بات سے کہ اس کی سواری روندی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے شوہر جہاد میں گئے ہیں، آپؓ نے حضرت حفصہؓ سے دریافت کیا کہ ایک عورت شوہر کے بغیر کتنے دن صبر کرسکتی ہے؟ حضرت حفصہؓ پہلے شرمائیں پھر آپؓ کے اصرار پر بتایا پانچ چھ ماہ، چنانچہ آپؓ نے مجاہدین کے لیے اصول متعین کردیا کہ وہ چھ ماہ جہاد میں رہیں، چار ماہ گھر پر، ایک ماہ میں آمد کا سفر اور ایک ماہ میں واپسی کا سفر طے کریں...

یہ تمام شواہد اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ جماع جس طرح مرد کا حق ہے اسی طرح عورت کا بھی مستقل حق ہے اور ایک دفعہ کی ہمبستری سے ساقط نہیں ہوتا، اس کی سب سے واضح دلیل ایلاء ہے، اگر ایک

دفعہ کی مباشرت کے بعد عورت کا حق جماع ساقط ہوجاتا تو ضرور تھا کہ قرآنِ مجید ایلاء کی صورت میں صحبت یا تفریق کو اس وقت واجب قرار دیتا جب پہلے کبھی مباشرت کی نوبت ہی نہ آئی ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

چنانچہ ابوثور کا خیال ہے کہ اگر شوہر ایک بار جماع کرنے کے بعد نامرد ہوجائے تو بھی اس کا نکاح فسخ کیا جائے گا، ہمارے زمانہ میں جو فتنہ کا زمانہ ہے اور جب بے حیائی، فحاشی اور زنا کی (کہا جاسکتا ہے کہ) تبلیغ ہو رہی ہے اور حکومت وقانون کی نظر میں جب تک جبر نہ ہو زنا جرم ہی نہیں ہے، ضروری ہے کہ اس رائے پر عمل کیا جائے اور بعد میں پیدا ہونے والی نامردی کو بھی فسخ کا موجب قرار دیا جائے۔ (جدید فقہی مسائل:۳/۱۸۸-۱۹۴)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

والد کا اپنی لڑکی کی رضامندی کے بغیر نکاح کرنے کا حکم:

سوال: چند سال پہلے ایک لڑکی کی اپنے چچازاد بھائی سے منگنی ہوئی، پھر دونوں خاندان کے تعلقات خراب ہوئے، بعد میں لڑکی کو پتا چلا کہ دوسال پہلے اس کے والد نے لڑکی کا نکاح کردیا تھا اور دستخط بھی کردیے تھے، اس لڑکی نے نہ اُس وقت نکاح منظور کیا تھا اور نہ اب منظور کررہی ہے، کیا ایسا نکاح ہوا یا نہیں؟

الجواب: عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح اُس کی رضامندی کے بغیر جائز اور درست نہیں۔ چنانچہ صورتِ مسئولہ میں لڑکی کی اجازت کے بغیر کیا ہوا نکاح منعقد نہیں ہوا، لڑکی کو اپنی مرضی سے دوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار حاصل ہے، ہاں اگر لڑکی غیر کفو میں نکاح کرلے تو ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

قال الإمام البخاريؒ: باب لا ينكح الأب وغيره البكر والثيب إلا برضاها؛ حدثنا معاذ بن فضالة حدثنا هشام عن يحيى عن أبي سلمة أن أباهريرة رضي الله عنه حدثهم أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: لا تنكح الأيم حتى تستأمر ولا تنكح البكر حتى تستأذن قالوا: يا رسول الله! وكيف إذنها قال: أن تسكت. (صحيح البخارى، رقم: ۵۱۳۶).

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہیں کیا جائیگا۔ نیز ابوداود شریف کی روایت میں

ہے کہ ایک لڑکی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کے والد نے اس کی رضا مندی کے بغیر نکاح کر دیا اور اس کو پسند نہیں ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار دیا۔ ملاحظہ ہو:

عن ابن عباس ﷺ، أن جارية بكراً أتت النبي صلى الله عليه وسلم فذكرت أن أباها زوجها وهي كارهة فخيرها النبي صلى الله عليه وسلم . (رواہ ابوداود: ۱/۲۸۵/۲۰۹۸، باب فی البكر يزوجها أبوها ولا يستأمرها).

علامہ عینیؒ نے کافی ساری احادیث نقل کرنے کے بعد فرمایا: **وقد احتج أصحابنا بحديث الباب وبهذه الأحاديث على أنه ليس للولي إجبار البكر البالغة على النكاح .** (عمدة القاری: ۲۰/۱۳۰).

شرح نقایہ میں ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں:

ولا يجبر ولي بالغة ولو كانت بكراً ، ومعنى الإجبار: أن ينفذ عقد وليها عليها وإن أبت أو ردت . و لنا ما روي من قوله صلى الله عليه وسلم : والبكر تستأذن في نفسها ... وما روى أحمد ، وأبوداود ، وابن ماجة ، والنسائي من حديث ابن عباس ﷺ : أن جارية بكراً ، أتت... وهذا حديث صحيح ، فإنه مخرج لرجاله فی الصحيحين .

وما فی النسائی عن عبد الله بن يزيد ، عن خنساء ، قالت: أنكحني أبي وأنا كارهة ، وأنا بكر ، فشكوت ذلک إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال؛ لا تنكحها وهي كارهة. ولكن ذكر البخاري أنها كانت ثيباً...وفي سنن الدارقطني عن جابر: أن رجلاً زوج ابنته وهي بكر من غير أمرها فأتت النبي صلى الله عليه وسلم ففرق بينهما ، وعن ابن عمر ﷺ أن رجلاً زوج ابنته بكراً ، فكرهت ذلک فرد النبي صلى الله عليه وسلم نكاحها ، وفي رواية قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم ينتزع النساء من أزواجهن ثيباً وأبكاراً بعد أن يزوجهن الآباء إذا كرهن ذلک ...

وعن ابن عباس ﷺ : أن النبي صلى الله عليه وسلم رد نكاح بكر وثيب أنكحهما أبوهما ، وهما كارهتان ، إلا أن الدارقطني جعله مرسل عكرمة ، وفي سنن النسائي ومسند

أحمد ، عن عائشةؓ قالت: جاء ت فتاة إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: يا رسول الله ! إن أبي زوجني ابن أخيه ليرفع بي خسيسته ! قال: فجعل الأمر إليها، فقالت: أجزت ما صنع أبي، ولكن أردت أن تعلم النساء أن ليس إلى الآباء من الأمر شيء .

وهذا يفيد بعمومه أن ليس له المباشرة حقاً ثابتاً ، بل الاستحباب ، وفيه دليل من جهة تقريره صلى الله عليه وسلم قولها ذلک أيضاً ، وهو حديث حجة . (فتح باب العناية : ۲/ ۳۶۴، فصل في الأولياء والأكفاء). (وكذا في فتح القدير :۳/ ۲۶۳،ط:دارالفكر). واللہ ﷻ اعلم۔

متبنیٰ کی بیوی کے ساتھ نکاح پر اشکال وجواب:

سوال: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کے ساتھ کیوں نکاح کیا؟ کچھ غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں، غیر مسلم کو سمجھانے کے لیے اچھا جواب کیا ہے؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: غیر مسلم کو سمجھانے کے لیے آسان جواب یہ ہے کہ کیا دنیا میں کسی شخص کے دو حقیقی باپ ہو سکتے ہیں؟ یہ بالکل محال ہے، تو پھر حضرت زید کے والد حارثہ بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی، دونوں کیسے ممکن ہے؟ نیز قابل اشکال بات تو یہ ہے کہ غیر کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنایا جائے، غیر کے بیٹے کو غیر کا بیٹا کہنے میں کیا اشکال ہے؟

باقی اصل جواب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کی ایک رسم یہ تھی کہ اگر کسی نے کسی کو بیٹا کہہ لیا تو وہ اس کا حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تھا، اس کو وہی سب حقوق دئے جاتے جو حقیقی بیٹے کو دئے جاتے تھے، اسے میراث وغیرہ میں بھی شریک کیا جاتا تھا، لہٰذا اگر منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا ہو جائے تو نسب درہم برہم ہو جائے اور وراثت میں شریک ہو جائے نیز اس کے واسطے سے دیگر اقارب بھی شریکِ میراث ہو جائے، اور اس کی وجہ سے اس کے حقیقی ورثاء پر ظلم وستم ہوگا۔ بنابریں اللہ تعالیٰ نے زمانہ جاہلیت کی اس رسم بد کو اپنے نبی کے عمل کے ذریعہ ختم فرما دیا تا کہ کسی کو اعتراض کا حق باقی نہ رہے۔

نیز اس بات کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی کہ نکاح کے جواز وحرمت کا تعلق متبنیٰ سے نہیں بلکہ نسبی، خونی

رشتہ اور رضاعت ومصاہرت کے ساتھ ہے۔کسی یتیم کی کفالت کرنا تو محض تبرع واحسان کے قبیل سے ہے۔

ملاحظہ ہو تفسیر حقانی میں مکتوب ہے:

لوگوں کی ہدایت کا دارومدار نبی علیہ السلام کی عظمت پر ہے اس لیے مخالفوں کے بعض مطاعن کو جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کرتے تھے دفع کرتا ہے، من جملہ ان مطاعن کے ایک طعن حضرت زید کی بیوی حضرت زینب سے نکاح کر لینے کے بارے میں تھا جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کے طلاق دینے اور عدت گزر جانے کے بعد ایک حکم آسمانی اور مصلحتِ الٰہیہ کی وجہ سے کیا تھا۔

...اور اے نبی تجھ سے اس کا نکاح ہم نے کیوں کر دیا؟ **لكي لا يكون على المؤمنين حرج في أزواج ادعيائهم إذا قضوا منهن وطراً وكان أمر الله مفعولاً** ۔کہ مسلمانوں کے لیے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں جب کہ وہ ان کو طلاق دے چکیں کوئی ممانعت نہ رہے،یعنی یہ عورت اسلام میں محرمات میں سے نہیں ہے اور ایک رسم کی وجہ سے اس کو حرام جانتے ہیں، یہ رسم اور الحاقِ جاہلیت مٹ جاوے، درحقیقت ایسی رسوم کے توڑنے میں لوگوں پر بڑے حملے ہوا کرتے ہیں، ہمارے ملک میں چچی اور ممانی سے نکاح کرنا بڑا معیوب سمجھا جاتا ہے،اگر کوئی اس رسم کے توڑنے کے لیے کر لیتا ہے تو پھر دیکھیے اس پر کیسے کیسے بہتان باندھتے ہیں اور کیسے حملے ہوتے ہیں،فرماتا ہے یہ بات ہو کر رہنے والی تھی خدا کو اس کا مٹانا منظور تھا۔

ما كان على النبي من حرج فيما فرض الله له ۔کوئی اگر شبہ کرے کہ اس رسم کو نبی سے کیوں مٹوایا کسی اور کا نکاح کر کے اس کو توڑ دینا تھا،اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ نبی پر کیا عیب ہے اور کیا تنگی اور ممانعت ہے اس کام کے کر لینے میں جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا، یا اس کو اس پر مامور کر دیا۔

سنة الله في الذين خلوا من قبل ۔اگلے انبیاء اور صلحاء میں بھی اللہ کا یہی دستور چلا آیا ہے کہ وہ ان کے ہاتھ سے رسومِ جاہلیت کو تڑوایا کرتا ہے، انہیں کو اس کے توڑنے پر مامور کیا کرتا ہے، کیونکہ نشانہ ملامت بننا انہیں مردانِ خدا کا کام ہے...اور یہ دستورِ رسم شکنی کن لوگوں کا ہے؟ **الذين يبلغون رسٰلٰت الله ويخشونه ولا يخشون أحداً إلا الله** ۔ ان کا جو اللہ کے احکام پہنچایا کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں، کسی کے طعن وتشنیع اور برا بھلا کہنے کی ان کو کچھ پروا نہیں ہوتی ہے۔ **وكفىٰ بالله حسيباً**،

اور اللہ کافی ہے حساب لینے کو جوان پاک بازوں پر طعن کرتے ہیں ان سے وہ ضرور حساب لے گا باز پرس کرے گا۔ (تفسیر حقانی: ۱۲/۴، ۱۳، میر محمد کتب خانہ، کراچی)۔

تفسیر جواہر القرآن میں ہے:

اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اس رسم جاہلیت کو خود آپ کے اپنے عمل سے ختم کرے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی کہ آپ لوگوں کے اعتراض سے ڈرتے ہیں حالانکہ آپ کو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا چاہیے۔

جب زید نے زینب کو طلاق دے دی تو ہم نے آپ کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا اور اس رسم جاہلیت کو توڑ دیا تا کہ متبناؤں کی مطلقہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی حرج اور تنگی باقی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے متبنیٰ کی مطلقہ سے نکاح کو جائز کر دیا ہے اس لیے زید کی مطلقہ سے نکاح کر لینے میں آپ پر کوئی الزام نہیں۔ (تفسیر جواہر القرآن: ۳/۹۴۰، از افادات: حضرت مولانا حسین علیؒ، ط: کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی)۔

معارف القرآن میں مذکور ہے:

انسان کا اصلی بیٹا وہ ہے جو اس کے نطفہ سے پیدا ہوا ہو، یہ کیونکر ممکن ہے کہ منہ بولا بیٹا حقیقۃً بیٹا ہو جائے عقلاً یہ بات محال ہے کہ حقیقۃً اس کے دو باپ ہو جائیں... منہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے حقیقۃً بیٹا نہیں بن جاتا ورنہ اگر منہ بولا بیٹا حقیقۃً بیٹا ہو جائے تو نسب درہم برہم ہو جائے اور حقیقی بیٹے کا وراثت میں مزاحم ہو جائے اور دیگر اقارب کا بھی شریکِ وراثت ہو جائے اور اس طرح کسی کو بیٹا بنا لینا حقیقی اقارب پر صریح ظلم وستم ہے۔ (معارف القرآن: ۶/۲۲۵ از مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، مکتبہ عثمانیہ)۔

تفسیر عثمانی میں مذکور ہے:

لكي لا يكون على المؤمنين حرج في أزواج أدعيائهم ... یعنی آپ کے نکاح میں دینے کی غرض یہی تھی کہ دلوں سے جاہلیت کے اس خیالِ باطل کا بالکل قلع قمع کر دیا جائے اور کوئی تنگی اور رکاوٹ آئندہ اس معاملہ میں باقی نہ رہنے پائے۔ (تفسیر عثمانی، ص ۵۶۳، ط: مجمع الملک فہد)۔

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے: ماں باپ اور اولاد کا رشتہ محض سمجھنے اور بولنے سے قائم نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک قدرتی اور فطری رشتہ ہے اس لیے محض اس وجہ سے کہ ایک شخص نے کسی لڑکی کی پرورش کی ہو اور وہ لڑکی اسے

ماں باپ سمجھتی ہو، وہ لڑکی اس پرورش کرنے والے کے بچوں پر حرام نہیں ہوگی اوران دونوں کا نکاح درست ہوگا۔ (کتاب الفتاویٰ:۴/۳۴۰)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

لڑکی سے عقدِ نکاح کے بعد طلاق دیکر اس کی ماں سے نکاح کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ایک لڑکی سے نکاح کیا پھر رخصتی سے پہلے ہی اس کو طلاق دیدی، اب وہ اس کی ماں کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: یہ نکاح جائز نہیں ہے، کیونکہ بیوی کی ماں محض عقدِ نکاح سے حرام ہوجاتی ہے، چاہے رخصتی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿حرمت عليكم أمهاتكم...وأمهات نسائكم﴾ .

قال في روح المعاني: والمراد بالنساء المنكوحات على الإطلاق سواء كن مدخولاً بهن أولا، وهو مجمع عليه عند الأئمة لكن يشترط أن يكون النكاح صحيحاً أما إذا كان فاسداً فلا تحرم الأم إلا إذا وطئ بنتها ، أخرج البيهقي في سننه وغيره من طريق عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا نكح الرجل المرأة فلا يحل له أن يتزوج أمها دخل بالابنة أو لم يدخل...وإلى ذلک ذهب جماعة من الصحابة والتابعين . (روح المعاني: ۴/۲۵۷، مكتبة دار التراث القاهرة). (أحكام القرآن: ۲/۱۲۸).

سنن الترمذی میں مذکور ہے:

عن عمروبن شعيب عن أبيه عن جده : أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أيما رجل نكح امرأة فدخل بها فلا يحل له نكاح ابنتها وإن لم يكن دخل بها فلينكح ابنتها وأيما رجل نكح امرأة فدخل بها أو لم يدخل بها فلا يحل له نكاح أمها، قال أبوعيسىٰ:...والعمل على هذا عند أكثر أهل العلم قالوا: إذا تزوج الرجل امرأة ثم طلقها قبل أن يدخل بها حل له أن ينكح ابنتها وإذا تزوج الرجل الابنة فطلقها قبل أن يدخل بها لم يحل له نكاح أمها لقول الله تعالىٰ:﴿ وأمهات نسائكم ﴾، وهو قول الشافعيؒ وأحمدؒ وإسحاقؒ . وقال الشيخ شعيب

الأرنؤوطؒ: إسناده حسن . (سنن الترمذی : ۱۱۴۵/۵۸۸/۲).

ہدایہ میں مرقوم ہے: **ولا بـأم امرأته التي دخل بها أولم يدخل، لقوله تعالىٰ:﴿وأمهات نسائكم﴾** [النساء:۲۳]، **مـن غيـر قيـد الـدخـول، ولا ببـنـت امرأته التي دخل بها ، لثبوت قيد الدخول بالنص** . (الهداية : ۳۰۷/۲،لاهور). (وكذا فى الجوهرة النيرة على مختصر القدورى:۶۷/۲،والبحر الرائق: ۹۳/۳، والدر المختار مع رد المحتار : ۳۰/۳،سعيد). **واللہ ﷻ اعلم۔**

رضاعی بہن کے بھائی کے ساتھ نکاح کرنے کا حکم:

سوال: ایک لڑکی کو اس کے خالہ زاد بھائی نے نکاح کا پیغام دیا جبکہ لڑکے کی بہن اور یہ لڑکی دونوں رضاعی بہنیں ہیں، تو کیا یہ نکاح جائز ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصوتِ مسئولہ اپنی حقیقی بہن کی رضاعی بہن جو خالہ زاد بہن بھی ہے، اس کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے، عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ساجدہ اور عابدہ دونوں بہنیں ہیں؛ ساجدہ کی ایک لڑکی مومنہ ہے اور عابدہ کی ایک لڑکی شاکرہ اور ایک لڑکا شاکر ہے، اب ساجدہ نے اپنی بیٹی مومنہ اور اپنی بھانجی شاکرہ کو دودھ پلایا تو یہ دونوں رضاعی بہنیں ہوئیں، تو اب شاکر کا نکاح اپنی حقیقی بہن شاکرہ کی رضاعی بہن مومنہ جو شاکر کی خالہ زاد بھی ہے اس کے ساتھ جائز اور درست ہے۔ ملاحظہ ہو البنایہ شرح الہدایہ میں مذکور ہے:

ويـجـوز أن يتزوج الرجل بأخت أخيه من الرضاع ، لأنه يجوز أن يتزوج بأخت أخيه مـن الـنسـب، وذلک مثـل الأخ مـن الأب إن كـانـت له أخت من أمه جاز لأخيه من أبيه أن يتـزوجهـا. ش: أوضح الاترازى كلام المصنف بقوله: هذا مثل أن يرضع زيد من أم عمرو، فيـجـوز لـعمرو أن يتزوج أخت زيد نسباً، وإن كان زيد أخاه من الرضاع ،كما فى النسب، ذلک مثـل الأخـويـن لأب، ولأحدهما أخت من أمه من غير أمها جاز للأخ الآخر أن يتزوج أختـه ، لأن هـذه أجـنبية فـي حـق الأخ لأب ، وعلى هذا أخت الأخت من الرضاع ، وأخت

الأخت من النسب ، وكان ينبغي أن يقول: أخت أخيه ، أو أخته من الرضاع ، ويقول: أخت أخيه ، وأخته من النسب، لكن اكتفى بذكر الأخ لظهور ذلک . (البناية شرح الهداية: ۸۱۸/۴، ط: رشيديه كوئٹه). (وكذا في اللباب في شرح الكتاب: ۲۶۲/۱،ط: دار الكتاب العربی ،و تبيين الحقائق: ۱۸۴/۲، امداديه). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

''میں تم سے محبت کرتا ہوں'' اِن الفاظ سے ثبوتِ رجعت کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دی، پھر نو یا دس دن کے بعد شوہر نے فون پر بیوی سے کہا (I Love you) میں تم سے محبت کرتا ہوں، کیا اِن الفاظ سے فون پر رجوع صحیح ہوا یا نہیں؟

الجواب: رجعت کا ثبوت جس طرح الفاظِ صریحہ سے ہوتا ہے اسی طرح الفاظِ کنایہ سے نیت کے ساتھ ہوتا ہے، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں، میں تم سے محبت کرتا ہوں، یہ کنایہ کے الفاظ ہیں، اگر شوہر نے مذکورہ الفاظ کہتے وقت رجعت کی نیت کی تھی تو رجعت ثابت ہوگئی، اب دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں ہے:

ألفاظ الرجعة صريح وكناية: فالصريح راجعتک في حال خطابها و راجعت امرأتي في حال غيبتها وحضورها أيضاً... والكنايات: أنت عندي كما كنت وأنت امرأتي فلا يصير مراجعاً إلا بالنية . (فتح القدير: ۱۵۹/۴ ،دار الفكر). (وكذا في فتاوى الشامي: ۳۹۸/۳،سعيد، وفتاوى الهندية : ۴۶۸/۱، وكتاب الفقه على المذاهب الاربعة :۳۳۰/۴).

قاموس الفقہ میں مذکور ہے:

رجعت ایسے الفاظ سے بھی ہوسکتی ہے جو صراحۃً رجعت کے مفہوم کو بتلاتے ہوں اور ایسے الفاظ سے بھی جن میں کسی قدر ابہام ہو اور ان میں رجعت کے سوا دوسرے معنی کی بھی گنجائش ہو فقہ کی اصطلاح میں ایسے الفاظ کنایہ کہلاتے ہیں، جیسے تو میرے نزدیک ویسے ہی ہے جیسے پہلے تھی، ایسے الفاظ سے نیت کی ضرورت ہوگی، اگر رجعت کی نیت کی تو رجعت ہوگی ورنہ نہیں۔ (قاموس الفقہ :۴۷۳/۳، ط: زمزم)۔

(وکذا فی فتاویٰ محمودیہ:۱۳/۳۶۴، جامعہ فاروقیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

ایامِ ماہواری میں انتفاع جائز ہونے کا حکم:

سوال: حیض کے دنوں میں شوہر اپنی بیوی کے ہاتھوں یارانوں کے درمیان اپنی شہوت پوری کرسکتا ہے یانہیں؟ اسی طرح اگر بیوی حالتِ حیض میں ہوتو شوہر کومس کر کے اپنی شہوت پوری کرسکتی ہے یانہیں؟

الجواب: ایامِ ماہواری میں شوہر اپنی بیوی کے ناف اور گھٹنوں کے درمیانی حصہ کے علاوہ جسم سے بلا حائل مس کر کے فائدہ اٹھاسکتا ہے، ہاں ناف اور گھٹنوں کے درمیانی حصہ سے بلا حائل متمتع ہونا جائز نہیں۔تاہم افضل اور بہتر یہ ہے کہ بوقتِ غلبہ شہوت بھی حالتِ حیض میں شوہر اپنی بیوی سے الگ رہے اسی میں عافیت ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ویسئلونک عن المحیض، قل ھو أذی، فاعتزلوا النساء فی المحیض، ولا تقربوھن حتی یطھرن، فإذا تطھرن فأتوھن من حیث أمرکم اللّٰہ، إن اللّٰہ یحب التوابین ویحب المتطھرین﴾ [البقرة:۲۲۲]۔

اِس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کومیانہ روی اوراعتدال کی تعلیم دی گئی ہے جوافراط وتفریط سے پاک ہے:
یہودی حالتِ حیض میں عورتوں کو بالکل الگ کمرہ میں رکھتے تھے،اورخلط واختلاط سے بچتے تھے، نیز ان کے ہاتھ کا پکایاہوا کھانا تک نہیں کھاتے تھے،اورعیسائی حالتِ حیض میں مجامعت سے بھی چنداں حذر نہیں کرتے تھے، اسلام نے دونوں کے بین بین طہارت، پاکی اورصاف، ستھرائی کی تعلیم دی کہ نہ تو مجامعت کرواورنہ بالکل الگ کمرہ میں ڈال دو، بلکہ مل جل کررہو،جسم سے منتفع ہوسکتے ہولیکن مخصوص حدود سے تجاوز نہ کرو۔ چنانچہ حدیث شریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے امت کواعتدال کی تعلیم دی۔ بخاری شریف میں ہے:

عن میمونة رضي اللّٰہ تعالیٰ عنھا کان النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم، إذا أراد أن یباشر امرأة من نسائه أمرھا فاتزرت وھي حائض. (رواہ البخاری رقم: ۳۰۳، باب مباشرة الحائض).

ترجمہ: حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ازواجِ مطہرات سے حیض کی حالت میں مس کاارادہ فرماتے توان کوحکم دیتے کہ ازارپہن لے۔

دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو

عن حرام بن حكيم عن عمه أنه سأل رسول الله صلى الله عليه وسلم ما يحل لي من امرأتي وهي حائض قال: لک ما فوق الإزار. وذكر مؤاكلة الحائض أيضاً. (سنن أبي داود: ٢١٢، باب في مباشرة الحائض ومؤاكلتها).

ترجمہ: حضرت حرام بن حکیم سے مروی ہے کہ ان کے چچا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، حیض کی حالت میں میری بیوی کے جسم کے کتنے حصہ سے میرے لیے فائدہ اٹھانا جائز ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**ما فوق الإزار**'' تمہارے لیے حلال ہے۔

درمختار مع ردالمحتار میں مرقوم ہے:

ويمنع قربان ما تحت الإزار يعني ما بين سرة و ركبة ولو بلا شهوة، وحل ما عداه مطلقاً، وفي الشامية: فيجوز الاستمتاع بالسرة وما فوقها والركبة وما تحتها ولو بلا حائل وكذا بما بينهما بحائل بغير الوطء ولو تلطخ دماً. (الدرالمختارمع ردالمحتار: ١/٢٩٢، سعيد).

وفي الفتاوى الهندية: وله أن يقبلها ويضاجعها ويستمتع بجميع بدنها ما خلا ما بين السرة والركبة عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ كذا في السراج الوهاج. (الفتاوى الهندية: ١/٣٩).

وللاستزادة راجع: (فتاوى الشامي: ١/٢٩٢، سعيد، وأحكام القرآن للعلامة العثماني: ١/٤٠٩، ط: إدارة القرآن، كراچي، وآپ کے مسائل ان کا حل: ٣/١٣٧، مكتبه لدهيانوى، وإمداد المفتيين، ص ٤٨٨، دار الاشاعت). **واللہ ﷻ اعلم۔**

شوہر کے بھائی کے ساتھ ایک مکان میں رہنے کا حکم:

سوال: ایک شخص اپنے مکان میں اپنے بھائی کو بھی رکھتا ہے، اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ مکان چھوٹا ہے اور میرے لیے پریشانی کی بات ہے، جبکہ وہ کچھ کام نہیں کرتا پورا دن گھر میں رہتا ہے، پورا دن پردہ بھی مشکل ہے تو اب کیا کیا جائے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بیوی کے ساتھ ایک مکان میں بھائی کو رکھنا جبکہ مکان بہت چھوٹا ہو اور فتنہ کا اندیشہ بھی ہو، درست نہیں، بلکہ اس کو حکمت کے ساتھ سمجھانا چاہیے۔ حدیث شریف میں ممانعت وارد ہوئی ہے:

عن عقبة بن عامر ﷺ أن رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: إياكم والدخول على النساء فقال رجل من الأنصار يا رسول الله! أفرأيت الحمو، قال: الحمو، الموت. (رواه البخاری: ۲/۷۸۷، باب لا يخلون رجل بامرأة، ومسلم: ۲/۲۱۶).

حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو اجنبی عورتوں کے پاس جانے سے منع فرمایا، تو ایک انصاری صحابی نے پوچھا اللہ کے رسول، دیور کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ فرمایا: دیور تو موت ہے۔ یعنی اس سے اور زیادہ بچنا چاہیے۔

وفي فتح الباری: الحمو أخو الزوج، وما أشبهه من أقارب الزوج ابن العم ونحوه، قال الترمذي: يقال هو أخو الزوج، كره له أن يخلوبها... وجرت العادة بالتساهل فيه فيخلو الأخ بامرأة أخيه فشبهه بالموت وهو أولى بالمنع من الأجنبى ... و قال عياض: معناه أن الخلوة بالأحماء مؤدية إلى الفتنة والهلاك فى الدين فجعله كهلاک الموت وأورد الكلام مورد التغليظ. (فتح الباری: ۹/۳۳۱). **وللمزيد راجع:** (عمدة القارى: ۱۴/۲۰۷، و تكملة فتح الملهم: ۴/۲۷۲، ومرقاة المفاتيح: ۶/۱۹۶). **واللہ ﷻ اعلم۔**

طلاق کے بعد بچی کو باپ سے دور رکھنے کا حکم:

سوال: میاں بیوی کے درمیان کسی وجہ سے طلاق ہوگئی، ان کی ایک چار سالہ بچی ہے، اب عورت نے دوسری شادی کر لی اور اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ دوسرے ملک کا سفر کر لیا جہاں بچی کے باپ کی رسائی نہیں ہے، کیا بچی کی ماں کے لیے اس طرح کرنا جائز ہے؟ برائے کرم اس کا حکم واضح فرمائیے۔

الجواب: بچی ۹ سال تک ماں کی پرورش میں رہے گی، اور اس درمیان باپ جب چاہے بچی سے ملاقات کر سکتا ہے، بچی کو اس کے باپ کی رضامندی کے بغیر دوسرے ملک لے جانا جائز نہیں ہے، بچی کو باپ

سے جدا کردینا ظلم ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وإذا أرادت المطلقة أن تخرج بولدها من المصر فليس لها ذلك لما فيه من الإضرار بالأب إلا أن تخرج به إلى وطنها وقد كان الزوج تزوجها فيه لأنه التزم المقام فيه عرفاً وشرعاً. قال عليه الصلاة والسلام: من تأهل ببلدة فهو منهم ولهذا يصير الحربي به ذمياً ، وإن أرادت الخروج إلى مصر غير وطنها وقد كان التزوج فيه أشار فى الكتاب إلى أنه ليس لها ذلك . (الهداية ۳۸/۲، المكتبة الاسلامية).

وفي مبسوط الإمام السرخسيؒ: فإن وقعت الفرقة بينهما وانقضت عدتها فإن كان أصل النكاح فى المصر الذي هي فيه فليس لها أن تخرج بولدها إلى مصر آخر لما فيه من الإضرار بالزوج بقطع ولده عنه إلا أن يكون بين المصرين قرب بحيث لو خرج الزوج لمطالعة الولد أمكنه الرجوع إلى منزله قبل الليل فحينئذٍ هذا بمنزلة محال مختلفة في مصر ولها أن تتحول من محلة إلى محلة . (المبسوط : ۳۰۵/۶،ط:بيروت). (وكذا فى لسان الحكام ،ص ۳۳۴، ط:القاهرة ،وتبيين الحقائق: ۵۰/۳،ط: امداديه ،ملتان).

وفي خزانة الفقه : والمطلقة البائنة خرجت بولدها إلى موضع يقدر الزوج أن يزور ولده في يومه لها ذلك، وإن خرجت إلى موضع لم يقدر الزوج أن يزور في يومه لم يجز . (خزانة الفقه ،ص ۳۲۴).

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

پرورش کے زمانہ میں باپ اگر اپنی اولاد سے ملنا چاہے تو ملنے کا موقع دینا چاہیے، اسی کی اولاد ہے، ملاقات کا موقع نہ دینا ظلم ہے۔(فتاویٰ رحیمیہ: ۴۵۸/۸، ط: دارالاشاعت)۔واللہ ﷻ اعلم۔

باپ کو بچے نہ دینے کی شرط لگانے کا حکم:

سوال: زیداوراس کی بیوی کے درمیان کچھ نااتفاقی ہوگئی، بیوی میکے آگئی ہزار کوشش کے بعد بھی آنے کے لیے تیار نہیں ہوئی، بیوی نے ایک شرط لگائی کہ اگر کسی وجہ سے ان دونوں کے درمیان طلاق ہوجائے تو زید

یعنی باپ کو بچے لینے کا حق نہیں ہوگا، زید نے مجبور ہوکر شرط منظور کر لی اور وہ آگئی، چند دن ساتھ رہنے کے بعد پھر کسی وجہ سے اپنے بچوں کو لے کر میکے چلی گئی، اب سوال یہ ہے اگر طلاق ہو جائے تو باپ اپنے بچوں کو شرعاً لینے کا حقدار ہوگا یا نہیں؟ مہربانی فرما کر قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ نے بیٹے کی پرورش کا حق سات سال کے بعد اور بیٹی کی پرورش کا حق نو سال کے بعد باپ کو دیا ہے، چنانچہ اس قسم کی شرط قبول کرنے سے اس کا ایفا واجب نہیں ہوتا، اور والد کے لیے بدستور اپنا حق پرورش باقی رہے گا۔

ملاحظہ ہو قبولِ شرط کے بارے میں امام بخاریؒ نے باب قائم فرما کر حدیث ذکر فرمائی ہے:

باب المكاتب وما لا يحل من الشروط التي تخالف كتاب الله ، وقال جابر بن عبد الله فى المكاتب شروطهم بينهم وقال ابن عمر رضي الله عنه أو عمر رضي الله عنه كل شرط خالف كتاب الله فهو باطل وإن اشترط مائة شرط قال أبوعبد الله: ويقال عن كليهما عن عمر وابن عمر. حدثنا علي بن عبد الله حدثنا سفيان عن يحيى عن عمرة عن عائشةؓ قالت: أتتها بريرة تسألها في كتابتها فقالت: إن شئت أعطيت أهلك ويكون الولاء لي، فلما جاء رسول الله صلى الله عليه وسلم ذكرته ذلک قال النبي صلى الله عليه وسلم: ابتاعيها فأعتقيها فإنما الولاء لمن أعتق ثم قام رسول الله صلى الله عليه وسلم على المنبر فقال:ما بال أقوام يشترطون شروطاً ليست في كتاب الله من اشترط شرطاً ليس في كتاب الله فليس له وإن اشترط مائة شرط . (صحيح البخارى : ۱/۱۸۳/ ۲۷۳۵).

بخاری شریف کی دوسری حدیث میں ہے:

عن عقبة بن عامر رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج. (رقم : ۲۷۲۱، باب الشروط فى المهر).

عمدۃ القاری میں مرقوم ہے:

والمراد بالشروط التي هي أحق بالوفاء هل هو عام فى الشروط كلها أو الشروط

المباحة أو ما يتعلق بالنكاح من المهر والنحلة والعدة أو المراد وجوب المهر فقط ، ولا شك في أن الشروط التي لا تجوز خارجة عن هذا وأنها لا يوفى بها وكذلك الشروط التي تنافي موجب العقد كاشتراط أن يطلقها أو أن لا ينفق عليها أو نحو ذلك . (عمدة القاری : ۹/ ۲۲۰، دارالحدیث،ملتان).

البحر الرائق میں مذکور ہے:

لو اختلعت على أن تترك ولدها عند الزوج فالخلع جائز والشرط باطل لأن هذا حق الولد أن يكون عند أمه ما كان إليها محتاجاً، زاد في المبسوط: فليس لها أن تبطله بالشرط . (البحرالرائق: ۴/ ۱۸۰،دارالمعرفة). (وکذا فی الدرالمختار: ۳/ ۵۶۲،سعید، وفتح القدیر: ۴/ ۲۶۸، دار الفکر، وتبیین الحقائق:۳/ ۴۸،ط:امدادیه، والفتاوی التاتارخانیة:۴/ ۹۰، وفتح باب العنایة: ۳/ ۹۹، وجدید فقهی مسائل :۳/ ۳۳). **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

شوہر کا بیوی کو صحبت پر مجبور کرنے کا حکم:

سوال: کیا شوہر بیوی کو جماع پر مجبور کرسکتا ہے؟ مثلاً: بیوی غمزدہ ہے یا کوئی چیز پیش آئی جس کی وجہ سے ابھی تیار نہیں ہے۔ نیز ان احادیث کا کیا مطلب ہے جن میں بلانے پر نہ جائے تو لعنت آئی ہے، کیا یہ احادیث صحیح ہیں یا ضعیف؟ بینوابالدلیل۔

الجواب: عام حالات میں بیوی اپنے شوہر کے تقاضے کو پورا کرنے سے نہیں روک سکتی، الا یہ کہ کوئی طبعی یا شرعی عذر ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، احادیث کا یہی مطلب ہے کہ بلا عذر انکار کردے تو موجبِ لعنت ہے ورنہ نہیں۔ اور احادیث اس بارے میں صحیح اور قابل احتجاج ہیں۔ ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا دعا الرجل امرأته إلى فراشه فأبت فبات غضبان عليها لعنتها الملائكة حتى تصبح، تابعه شعبة وأبوحمزة وابن داود وأبومعاوية عن أعمش . (رقم ۳۲۳۷، باب ذکرالملائکة).

وفي رواية له عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إذا دعا الرجل امرأته إلى فراشه فأبت أن تجئ لعنتها الملائكة حتى تصبح . (رقم:۵۱۹۳،باب اذا باتت المرأة مهاجرة فراش زوجها).

مرقاۃ میں ہے:فأبت أي امتنعت من غير عذر شرعي. (مرقاة المفاتيح: ۱۸۵/۱۰،باب عشرة النساء)

اگر بیوی کو تکلیف اور ضرر ہو تو شوہر کو اس کا خیال کرنا چاہیے۔ملاحظہ ہو فتاوی الشامی میں ہے:

ولو تضررت من كثرة جماعه لم تجز الزيادة على قدر طاقتها. وقال في رد المحتار: فعلم من هذا كله أنه لا يحل له وطؤها بما يؤدى إلى إضرارها فيقتصر على ما تطيق منه عدداً بنظر القاضي أو إخبار النساء وإن لم يعلم بذلک فبقولها . (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۰۳/۴/۳،سعيد). وكذا فى النهر الفائق: ۲۹۴/۲،وحاشية الطحطاوى على الدرالمختار: ۸۹/۲،وفتح القدير: ۲۹۲/۷،دار الفكر).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

اگرچہ خاوند کے لیے بھی مناسب ہے کہ زوجہ کی صحت اور موسم کی شدت اور غسل کے وقت کا لحاظ رکھے، تاہم زوجہ کا انکار بغیر کسی سخت مجبوری کے جائز نہیں۔۔۔حدیث شریف میں آیا ہے جو عورت خاوند کی ناراضگی میں رات گزارے فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔(کفایت المفتی :۱۲/ ۴۰۷،ط: جامعہ فاروقیہ)۔

قاموس الفقہ میں مذکور ہے:

عورت مجبور نہ ہو اور مرد مباشرت کا مطالبہ کرے، تو اس کے لیے تعمیل حکم ضروری ہے ،اس میں بھی اختلاف نہیں کہ تصحیح نیت کے ساتھ مرد عورت سے ہمبستر ہو تو باعث ثواب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صدقہ قرار دیا ہے: وفی مباضعتک أهلک صدقة ۔(قاموس الفقہ :۱۱۵/۳)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

اپنی بہو سے معانقہ کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کی عمر ۶۰ سال کی ہے اس کے بیٹے کی شادی ہوگئی، بہو کی عمر ۲۵ سال کی ہے، کیا خسر کے لیے جائز ہے کہ اپنی بہو کے ساتھ عیدین وغیرہ خوشی کے مواقع میں معانقہ کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اپنے بیٹے کی بیوی یعنی بہو محرم ہے، ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے، اس لیے مصافحہ، معانقہ وغیرہ جائز ہے، لیکن بہ سببِ خوفِ فتنہ معانقہ نہیں کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو قرآنِ کریم میں ہے:

﴿ وحلائل أبنائكم الذين من أصلابكم ﴾ سواء كان دخل بها الابن أو لم يدخل بها، لأن النص مطلق عن شرط الدخول، والمعنى لا يوجب الفصل أيضاً على ما ذكرنا؛ ولأن العقد سبب إلى الدخول والسبب يقام مقام المسبب في موضع الاحتياط . (بدائع الصنائع: ۲/۲۶۰، سعید).

درمختار میں ہے: وما حل نظره، من ذكر أو أنثى حل مسه إذا أمن الشهوة على نفسه وعليها لأنه عليه الصلاة والسلام، كان يقبل رأس فاطمة وقال عليه الصلاة والسلام: من قبل رجل أمه فكأنما قبل عتبة الجنة وإن لم يأمن ذلك أو شك فلا يحل له النظر والمس . (الدر المختار: ۶/۳۶۷، سعید).

وفي الفتاوى الهندية : وما حل النظر إليه حل مسه ونظره وغمزه من غير حائل ولكن إنما يباح النظر إذا كان يأمن على نفسه الشهوة فأما إذا كان يخاف على نفسه الشهوة فلا يحل له النظر وكذلك المس إنما يباح له إذا أمن على نفسه وعليها الشهوة وأما إذا خاف على نفسه أو عليها الشهوة فلا يحل المس له . (الفتاوى الهندية: ۵/۳۲۸).

(المبسوط للامام السرخسي : ۱۰/۲۶۰، ط: بیروت، والمحيط البرهاني : ۵/۱۷۵، ط: داراحياء التراث).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اپنے بیٹے، بیٹی، بہن وغیرہ سے معانقہ کرنا درست ہے جن سے معانقہ کرنے میں شہوت نہ ہو، اور جہاں اس کا خطرہ ہو وہاں پرہیز کیا جائے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۹/۱۱۷، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ہوائی جہاز کے سفر میں میاں بیوی کا مختلف سیٹ پر بیٹھنے کا حکم:

سوال: ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ سفر کرتی ہے لیکن ہوائی جہاز میں دونوں کی سیٹیں الگ الگ

ہیں، اور یہ ہوتا رہتا ہے، تو کیا ایسی حالت میں سفر جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اس طرح سفر جائز ہے اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ بلامحرم سفر کیا ہے، کیونکہ زمانہ نبوی میں صحابیات اور ازواجِ مطہرات کی سواری کبھی الگ ہوتی تھی۔ ہاں ٹکٹ لیتے وقت ان کو بتادیا جائے تو ساتھ میں کردیں گے، یا اجنبی سے درخواست کردے وہ شوہر کی جگہ بیٹھ جائے اور شوہر اس اجنبی کی جگہ بیوی ساتھ بیٹھ جائے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو عورت پردہ کے ساتھ بیٹھے اور بے تکلفی کی بات چیت نہ کرے۔

مسلم شریف میں ہے:

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا خرج أقرع بين نسائه فطارت القرعة على عائشةؓ وحفصةؓ فخرجتا معه جميعاً وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا كان بالليل سار مع عائشة رضي الله تعالىٰ عنها يتحدث معها فقالت حفصةؓ لعائشةؓ: ألا تركبين الليلة بعيري وأركب بعيرك فتنظرين وأنظر قالت: بلى فركبت عائشةؓ على بعير حفصةؓ وركبت حفصةؓ على بعير عائشةؓ فجاء رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى جمل عائشة وعليه حفصة فسلم ثم سار معها حتى نزلوا فافتقدته عائشة ... الخ. (رواه مسلم، رقم: ۲۴۴۵). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

''اگر تم بھائی کے گھر گئی تو فارغ'' کہنے سے طلاق کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا ''اگر تم بھائی کے گھر گئی تو فارغ''، اگر وہ بھائی کے گھر چلی گئی تو اِن الفاظ سے طلاق ہوگی یا نہیں؟ اور اس میں نیت کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر عورت بھائی کے گھر چلی جائے گی تو بلانیت طلاق واقع ہوجائے گی، کیونکہ عموماً فارغ کا لفظ طلاق کے لیے استعمال ہوتا ہے، لہٰذا طلاق واقع ہوجائے گی، یہ لفظ محتاجِ نیت نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

سرحتک کناية لكنه في عرف الفرس غلب استعماله فی الصريح فإذا قال: رها كردم ای سرحتک يقع به الرجعي مع أن أصله كناية أيضاً وما ذاک إلا لأنه غلب في عرف الناس استعماله فی الطلاق وقد مر أن الصريح ما لم يستعمل إلا فی الطلاق من أی لغة كانت لكن لما غلب استعمال حلال الله فی البائن عند العرب والفرس وقع به البائن لو لا ذلک لوقع به الرجعي. (فتاوی الشامی: ۲۹۹/۳، سعید). وفی الهندية: وإذا أضافه إلى الشرط وقع عقب الشرط اتفاقاً. (الفتاوی الهندية: ۳۰۲/۳).

آپ کے مسائل اوران کا حل میں مذکور ہے:

میں نے تمہیں فارغ کر دیا، طلاق ہی کے الفاظ ہیں، ان الفاظ سے ایک طلاق بائن واقع ہوگئی، دوبارہ نکاح کرلیا جائے۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل: ۴۵۸/۶)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے: لفظ فارغ خطی عرف میں طلاق کے لیے مستعمل ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۱۵۵/۵)۔

امدادالفتاویٰ میں ہے:

یہ لفظ فارغ خطی کنایہ ہے اور چونکہ اس سے ایقاع بائن متعارف ہے اس لیے بلانیت اس سے طلاق بائن واقع ہوجائیگی۔ (امدادالفتاویٰ: ۴۴۸/۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

تعلیق بالمحال سے تعلیق طلاق کا حکم:

سوال: لڑکی کے نکاح کے بارے میں والد اور بیٹے کا اختلاف ہوا، باپ نے کہا: میں زید کو اپنی بیٹی نہیں دوں گا، بیٹے نے کہا: اگر میں نے اِس سال اپنی بہن کا نکاح زید سے نہیں کر دیا تو میری بیوی پر تین طلاق، اب سال گزر گیا اور بیٹا اپنی بہن کا نکاح زید سے نہیں کر سکا تو بیٹے کی بیوی پر تین طلاق پڑی یا نہیں؟ اس مسئلہ میں یہ پہلو بھی سامنے رکھا جائے کہ لڑکی کے والد کی موجودگی میں بھائی کو اپنی بہن کا نکاح کرانے کا اختیار یا قدرت ہے یا نہیں؟ یا پھر لڑکی کو بھی اختیار ہے۔

الجواب: والد کی موجودگی میں بھائی کو بہن کا نکاح کرانے کا کوئی اختیار نہیں، تو یہ تعلیق بالمحال کے

قبیل سے ہے، یعنی طلاق کو ایسی بات پر معلق کیا جو اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ پھر لڑکی عاقلہ بالغہ ہو تو اپنے نکاح کی خود مختار ہے جب کفو میں نکاح کرلے تو اجازت سنت ہے ضروری نہیں ہے، ہاں غیر کفو میں نکاح کرلے تو پھر ولی کی اجازت ضروری ہے اور ولی والد ہے بھائی نہیں۔ ملاحظہ ہو الدرالمختار میں ہے

والولي في النكاح العصبة بنفسه بلا توسطة أنثى على ترتيب الإرث. قال الشامي: يقدم الأب ثم أبوه ثم الأخ الشقيق. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۳/۷۶، سعيد).

وفيه أيضاً: فلو زوج الأبعد حال قيام الأقرب توقف على إجازته. (الدرالمختار: ۳/۸۱، سعيد). **وللمزيد راجع:** (تبيين الحقائق: ۵/۲۹۷، وفتاوى الشامي: ۳/۲۱، سعيد).

تعلیق بالمحال سے متعلق ملاحظہ کیجئے: البحرالرائق میں مذکور ہے:

وخرج ما كان مستحيلاً كقوله: إن دخل الجمل في سم الخياط فأنت طالق فلا يقع أصلاً لأن غرضه منه تحقيق النفي حيث علقه بأمر محال وهذا يرجع إلى قولهما. (البحرالرائق: ۴/۲، باب التعليق، ط: كوئٹه). (وكذا في الفتاوى الهندية: ۱/۴۲۱).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

زید نے ایسی شرط پر طلاق کو معلق کیا ہے جس کا پورا کرنا ممکن نہیں، لہٰذا یہ تعلیق ہی صحیح نہیں، پس اس صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، نکاح بدستور قائم ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۳/۴۱، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

طلاق جاری کردوں گا کہنے سے طلاق کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی سے فون پر میسیج میں کہا: ہمارے نکاح کے گواہوں کے سامنے طلاق جاری کردوں گا، کسی کا نام نہیں لیا، پھر اس نے بتایا کہ یہ اس وجہ سے کہا تا کہ بیوی ڈر جائے، کیا اس لفظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: شوہر کے الفاظ ''طلاق جاری کردوں گا''، مستقبل کے لیے ہیں، لہٰذا فی الحال کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، صیغہ استقبال سے طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

قالت لزوجها من باتو نمی باشم فقال الزوج : مباش، فقالت: طلاق بدست تو است مرا طلاق کن ، فقال الزوج: طلاق می کنم، طلاق می کنم وکرر ثلاثاً طلقت ثلاثاً بخلاف قوله: کنم، لأنه استقبال فلم یکن تحقیقاً بالتشکیک ، فی المحیط: لوقال بالعربیة : أطلق ، لایکون طلاقاً إلا إذا غلب استعماله للحال فیکون طلاقاً . (الفتاوی الهندیة: ۱/۳۸۴).

تنقیح الفتاوی الحامدیه میں مذکور ہے:

صیغة المضارع لا یقع بها الطلاق إلا إذا غلب فی الحال کما صرح به الکمال بن الهمام . (۱/۳۸،ط:دارالاشاعة العربیة). مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۴/۴۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

نابالغہ مطلقہ لڑکیوں کی عدت کی مدت:

سوال: قرآنِ کریم میں یہ بات مذکور ہے کہ جن مطلقہ لڑکیوں کو حیض نہیں آتا ان کی عدت تین ماہ ہے (واللاتی لم یحضن)، بعض روشن خیال علماء کہتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ سے مراد وہ لڑکیاں ہیں جو بالغہ، منکوحہ ہوں اور ان کو حیض نہیں آتا پھر طلاق ہوجائے تو تین ماہ عدت ہے، نابالغہ مطلقہ مراد نہیں ہے، اب آپ مفسرین اور محدثین کے علوم کی روشنی میں یہ بات واضح کردیں کہ یہ آیت نابالغہ غیر حائضہ اور بالغہ غیر حائضہ دونوں کو شامل ہے، ان روشن خیالوں کا مقصد نابالغہ کے نکاح کے تصور کو ختم کرنا ہے۔ بینوا بالبرہان توجروا عندالرحمٰن۔

الجواب: احادیث اور مفسرین کے اقوال کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ مذکورہ آیتِ کریمہ سے مراد نابالغہ غیر حائضہ، اور بالغہ غیر حائضہ لڑکیاں ہیں۔ احادیث ملاحظہ کیجیے:

قال فی الدر المنثور فی التفسیر الماثور: أخرج عبد الرزاق، وابن المنذر من طریق الثوري عن إسماعیل قال: لما نزلت هذه الآیة ﴿والمطلقات یتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء﴾، [البقرة:۲۲۸]، سألوا النبي صلی الله علیه وسلم فقالوا: یارسول الله ! أرأیت التي لم تحض والتي قد یئست من المحیض فاختلفوا فیهما فأنزل الله ﴿إن ارتبتم﴾ یعنی إن شککتم ﴿فعدتهن ثلاثة أشهر واللائی لم یحضن ، وأولات الأحمال أجلهن أن یضعن

حملهن ﴾.

وأخرج عبد بن حميد عن قتادة ﴿ واللاتى يئسن من المحيض من نسائكم إن ارتبتم فعدتهن ثلاثة أشهر﴾ قال: هن اللا تى قعدن عن المحيض ﴿ واللاتى لم يحضن﴾ فهن الأبكار الجوارى اللا تى لم يبلغن المحيض . (الدرالمنثور:۲۰۲/۸،دارالفكر،بيروت).

مستدرکِ حاکم میں ہے:

عن أبي بن كعب قال: لما نزلت الآية التي في سورة البقرة في عدد من عدد النساء ، قالوا: قد بقي عدد من النساء لم يذكرن الصغار والكبار، ولا من انقطعت عنهن الحيض، وذوات الأحمال فأنزل اللّٰه عزوجل الآية التي في سورة النساء ﴿واللائى يئسن من المحيض من نسائكم إن ارتبتم فعدتهن ثلاثة أشهر واللائى لم يحضن وأولات الأحمال أجلهن أن يضعن حملهن ﴾، [الطلاق:۴]، صحيح الإسناد ولم يخرجاه . (المستدرك :۲/ ۳۸۲۱/۵۳۴).

قرآنِ کریم کی آیتِ کریمہ میں نابالغہ لڑکیاں بھی شامل ہیں۔مفسرین کے اقوال ملاحظہ کیجیے:

قال فى تفسير الطبرى: إن تأويل الآية : واللا ئى يئسن من المحيض من نسائكم إن ارتبتم بالحكم فيهن ...واللا ئى لم يحضن، ويقول: وكذلك عدد اللا ئى لم يحضن من الجواري لصغر إذا طلقهن أزواجهن بعد الدخول . وبنحو الذي قلنا في ذلك قال أهل التأويل. ذكر من قال ذلك :

حدثنا محمد قال: ثنا أسباط، عن السدي (الكبير، وهو صدوق حسن الحديث، إمام فى التفسير، قاله الشيخ بشار عواد في تحرير تقريب التهذيب: ۱۳٦/۱، وأطال الكلام عليه فليراجع ثمة . وبعضهم يضعفونه) في قوله: ﴿ واللائى يئسن من المحيض من نسائكم ﴾ يقول: التي قد ارتفع حيضها، فعدتها ثلاثة أشهر، ﴿واللائي لم يحضن﴾، قال: الجواري لصغرهن إذا طلقهن أزواجهن بعد الدخول .

حدثنا بشر، قال: يزيد، قال: ثنا سعيد ، عن قتادة ، قوله ﴿واللائی يئسن ﴾...وهن اللواتي قعدن من المحيض فلا يحضن ، واللائی لم يحضن ، هن الأبكار اللا تی لم يحضن ، فعدتهن ثلاثة أشهر.

حدثت عن الحسين، قال: سمعت أبامعاذ يقول: ثنا عبيد ، قال: سمعت الضحاک يقول في قوله:﴿واللا ئی يئسن من المحيض﴾، قال: القواعد من النساء ،﴿ واللا ئی لم يحضن﴾: لم يبلغن المحيض، وقد مسسن ، عدتهن ثلاثة أشهر. (جامع البيان في تأويل القرآن، ص ۴۵۲، ط: الرسالة).

قال فی البحر المحيط: واللا ئي لم يحضن، يشمل من لم يحض لصغر، ومن لايكون لها حيض البتة ، وهو موجود فی النساء . (البحرالمحيط: ۲۸۰/۸،ط:لبنان).

وفي روح المعاني: والمراد باللا ئی لم يحضن الصغار اللا ئی لم يبلغن سن الحيض . واستظهر أبوحيان شموله من لم يحض لصغر ومن لا يكون لهن حيض البتة . (روح المعانی : ۱۳۷/۲۸،ط:مكتبة التراث العربی).

وفي تفسير آيات الأحكام: واللا ئی لم يحضن، أی واللا ئی لم يحضن كذلک، أی عدتهن ثلاثة أشهر، يريد أن المعتدة التي لم يسبق لها حيض تعتد بثلاثة أشهر، سواء أ كان عدم حيضها لصغر، أم لعلة ، أم لمنعه بدواء . (تفسيرآيات الاحكام ،ص۷۸۲،المكتبة العصرية).

وقال في ظلال القرآن: واللا ئی يئسن من المحيض...واللا ئی لم يحضن...يشمل اللواتي انقطع حيضهن، واللا تی لم يحضن بعدُ لصغر أو لعلة . (ظلال القرآن:۲۳۹/۷).

علمائے کرام کے نزدیک نابالغہ کا نکاح جائز اور درست ہے۔ملاحظہ ہوامام بخاریؒ نے باب قائم فرمایا ہے:

باب إنكاح الرجل ولده الصغار، لقول اللّٰه تعالیٰ:﴿واللائی لم يحضن﴾ فجعل عدتها ثلاثة أشهر قبل البلوغ، حدثنا محمد بن يوسف حدثنا سفيان عن هشام عن أبيه عن عائشةؓ أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم تزوجها وهي بنت ست سنين وأدخلت عليه وهي بنت

تسع و مکثت عندها تسعاً . (صحیح البخاری ، رقم: ۵۱۳۳).

قال الإمام أبوبكر الجصاص : وفي هذه الآية دلالة أيضاً على أن للأب تزويج ابنته الصغيرة من حيث دلت على جواز تزويج سائر الأولياء إذ كان هو أقرب الأولياء ولا نعلم في جواز ذلک خلافاً بين السلف والخلف من فقهاء الأمصار إلا شيئاً ، رواه بشر بن الوليد عن ابن شبرمة أن تزويج الآباء على الصغار لا يجوز وهو مذهب الأصم ويدل على بطلان هذا المذهب سوى ما ذكرنا من دلالة هذه الآية قوله تعالیٰ: واللائی يئسن من المحيض من نسائكم إن ارتبتم فعدتهن ثلاثة أشهر واللائی لم يحضن فحكم بصحة طلاق الصغيرة التي لم تحض والطلاق لايقع إلا في نكاح صحيح فتضمنت الآية جواز تزويج الصغيرة ويدل عليه أن النبي صلى الله عليه وسلم تزوج عائشة رضي الله تعالیٰ عنها وهي بنت ست سنين زوجها إياه أبوبكر الصديق رضي الله تعالیٰ عنه. (أحكام القرآن: ۲/۳۴۶، بيروت).

(وكذا فی احكام القرآن للمفتی محمد شفيع العثمانی : ۵/۷۷،ادارة القرآن). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

طلاق دینے کا شرعی اختیار مرد کو استعمال کرنے کی حدود:

سوال: ایک آدمی ازدواجی زندگی سے تنگ آچکا ہے، جاننا چاہتا ہے کہ کس مرحلہ میں پہنچ کر طلاق کا اختیار استعمال کرنا چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں رشتۂ نکاح اور ازدواجی زندگی کا بندھن وقتی نہیں ہے بلکہ موت حیات کا بندھن ہے، مرتے دم تک رشتہ کو نبھانا اور باقی رکھنا مطلوب ہے کیونکہ یہ رشتہ چین، سکون اور عفت و پاکدامنی کی زندگی گزارنے کا ایک مستحکم وسیلہ اور ذریعہ ہے، نیز ناخوشگواریوں اور میاں بیوی کی نااتفاقیوں کا ابتدائی حل طلاق نہیں ہے بلکہ اصلاحِ حال کا آخری مرحلہ طلاق ہے۔

چنانچہ خاندان کے بڑے حضرات جو عقل دانش رکھتے ہوں ان کو حکم بنا کر اصلاح کی کوشش کی جائے اور مختلف تدابیر استعمال کی جائے تاہم اگر کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہو اور عدمِ موافقت کے ساتھ دونوں کا ساتھ رہنا

ایک مصیبت اور عذاب بن جائے تو آخری تدبیر طلاق کا اختیار استعمال کر کے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ملاحظہ ہو علامہ آلوسی بغدادیؒ فرماتے ہیں:

أن الأصل في الطلاق هو الحظر لما فيه من قطع النكاح الذي تعلقت به المصالح الدينية والدنيوية والإباحة للحاجة إلى الخلاص . (روح المعاني: ۱۳۶/۲، القاهرة).

وفي تفسير آيات الأحكام: إن مرتبة الطلاق بعيدة عن مرتبة النكاح ، إذ أن النكاح تترتب عليه منافع كثيرة ، ويثمر ثمرات طيبة ، فأما الطلاق فإنه يحل العقدة ، ويفصم العروة ، ويبطل ما بين الزوجين وأقاربهما من روابط وصلات، ولهذا قال بعض الفقهاء : إن الآية ترشد إلى أن الأصل في الطلاق الحظر، وإنه لا يباح إلا إذا فسدت الزوجية، ولم تفلح وسائل الإصلاح بين الزوجين. (تفسير آيات الأحكام للشيخ محمد علی، ص۳، ط: المكتبة العصرية).

قال في البحر الرائق: وأما سببه فالحاجة إلى الخلاص عند تباين الأخلاق وعروض البغضاء الموجبة عدم إقامة حدود الله تعالىٰ وشرعه رحمة منه سبحانه ، وأما صفته فهو أبغض المباحات إلى الله تعالىٰ ، وفي المعراج : إيقاع الطلاق مباح وإن كان مبغضاً في الأصل عند عامة العلماء . (البحر الرائق: ۲۳۶/۳، کوئٹه). (وكذا في احياء علوم الدين :۳۳۶/۲)۔

معارف القرآن میں مذکور ہے:

اسلامی تعلیمات کا اصل رخ یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ اور معاہدہ عمر بھر کے لیے ہو، اس کے توڑنے اور ختم کرنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے، کیونکہ اس معاملہ کے انقطاع کا اثر صرف فریقین پر نہیں پڑتا نسل واولاد کی تباہی وبربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں میں فساد تک کی نوبت پہونچتی ہے، اور پورا معاشرہ بری طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، اسی لئے جو اسباب اور وجوہ اس معاملہ کے توڑنے کا سبب بن سکتے ہیں قرآن وسنت کی تعلیمات نے ان تمام اسباب کو راہ سے ہٹانے کا پورا انتظام کیا ہے، زوجین کے ہر معاملے اور ہر حال کے لیے جو ہدایتیں قرآن وسنت میں مذکور ہیں ان سب کا حاصل یہی ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتا چلا جائے، ٹوٹنے نہ پائے، ناموافقت کی صورت میں اول افہام تفہیم کی پھر زجر وتنبیہ کی ہدایتیں دی گئیں، اور اگر بات بڑھ

جائے اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان ہی کے چند افراد کو حکم اور ثالث بنا کر معاملہ طے کرنے کی تعلیم دی۔۔۔

لیکن بعض اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ اصلاحِ حال کی تمام کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں، اور تعلق نکاح کے مطلوبہ ثمرات حاصل ہونے کے بجائے طرفین کا آپس میں مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے، ایسی حالت میں اس ازدواجی تعلق کا ختم کردینا ہی طرفین کے لیے راحت اور سلامتی کی راہ ہوجاتی ہے،

اس لیے شریعتِ اسلام نے بعض دوسرے مذاہب کی طرح یہ بھی نہیں کیا کہ رشتۂ ازدواج ہر حال میں ناقابل فسخ ہی رہے، بلکہ طلاق اور فسخ نکاح کا قانون بنایا، طلاق کا اختیار تو صرف مرد کو دیا، جس میں عادۃً فکر وتدبر اور تحمل کا مادہ عورت سے زائد ہوتا ہے، عورت کے ہاتھ میں یہ اختیار نہیں دیا، تاکہ وقتی تاثرات سے مغلوب ہوجانا جو عورت میں بہ نسبت مرد کے زیادہ ہے وہ طلاق کا سبب نہ بن جائے۔

لیکن عورت کو بھی بالکل اس حق سے محروم نہ رکھا کہ وہ شوہر کے ظلم وستم سہنے ہی پر مجبور ہوجائے، اس کو یہ حق دیا کہ حاکمِ شرعی کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کرکے اور شکایات کا ثبوت دے کر نکاح فسخ کراسکے یا طلاق حاصل کرسکے، پھر مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار تو دیدیا مگر اول تو یہ کہہ دیا کہ اس اختیار کا استعمال کرنا اللہ کے نزدیک بہت مبغوض ومکروہ ہے، صرف مجبوری کی حالت میں اجازت ہے، حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

عن ابن عمر رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أبغض الحلال إلى الله الطلاق . (رواه أبوداود ، وابن ماجه ، وصححه الحاكم ، ورجح أبوحاتم إرساله). یعنی حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض اور مکروہ اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ دوسری پابندی یہ لگائی کہ حالتِ غیظ وغضب میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کریں۔ (معارف القرآن، جلدِ اول، ص ۵۵۶)۔

مزید ملاحظہ ہو: (قاموس الفقہ: ۴/ ۳۳۶، وآپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/ ۴۳۲)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

اگلی طلاق بھول کر دو طلاقیں دینے پر تین طلاق کا حکم:

سوال: اگر کسی مسلمان کو سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے کوئی چیز یاد نہیں رہتی، جب وضو کرتا ہے تو سر کا مسح وغیرہ بھی بھول جاتا ہے دوبارہ کرنا پڑتا ہے، نیز گھر پر نماز پڑھے تو رکعات کی تعداد بھی بھول جاتا ہے، کچھ یاد نہیں

رہتا، ایسے شخص نے زمانہ ماضی میں اپنی بیوی کو ایک طلاق دی تھی، اور بھول گیا تھا، ابھی اس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں، اگلی بالکل یاد نہیں تھی، وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ اسے پہلی طلاق یاد نہیں تھی، آپ مجھے بتائیے کہ اب اس کا نکاح ختم ہو چکا یعنی تین ہو گئیں یا رجوع کا حق باقی ہے؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شخص مذکور کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہو گئیں؛ اب شرعی حلالہ کے بغیر نکاح کرنا درست نہیں ہے، اور اگلی طلاق بھولنا کوئی شرعی عذر نہیں ہے جب اس کو یقینی طور پر یاد ہے کہ پہلے ایک دے چکا تھا تو اب وہ بھی شمار ہوگی، اور دونئی کے ساتھ ملکر تین مغلظہ ہو چکی۔ ملاحظہ ہو فتح القدیر میں مذکور ہے:

قال في فتح القدير: ولزم طلاق الناسي، وتقدم في كتاب الطلاق فيه زيادة أحكام فارجع إليه. (فتح القدير: ۹۸/۶، دارالفكر).

وقال في بدائع الصنائع: وكذا صحة الزوج ليس بشرط وكذا إسلامه فيقع طلاق المريض والكافر لأن المرض والكفر لا ينافيان أهلية الطلاق. (بدائع الصنائع: ۱۰۰/۳، سعيد).

وقال فى الموسوعة الفقهية: الحنفية أوقعوا طلاق الناسي والخاطئ والذاهل وكذلك يمينه. (الموسوعة: ۲۸۶/۳۵، و النتف فى الفتاوى، ص۳۴۸، ط: بيروت).

وفى الأشباه والنظائر: والناسي والعامد فى اليمين سواء، وكذا فى الطلاق لو قال: زوجتي طالق ناسياً أن له زوجة. (الاشباه والنظائر: ۳۰۲/۱، دارالكتب العلمية بيروت).

وفى الأحوال الشخصية: وقد قال علماء الحنفية: إن طلاق الغافل والساهي يقع إذا استوفى كل واحد من هؤلاء الشروط الثلاثة التي قدمنا بيانها، بأن يكون زوجاً بالغاً عاقلاً، لأن السفه والهزل والخطأ والغفلة لا تنقض الأهلية. (الأحوال الشخصية للشيخ محمد محى الدين عبد الحميد، ص ۲۶۴، ط المكتبة العلمية بيروت).

خلاصہ یہ ہے کہ تین طلاقیں واقع ہو چکیں اب شرعی حلالہ کے بغیر دونوں کا آپس میں نکاح جائز نہیں ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

تحریری طلاق پردستخط کرنے سے وقوعِ طلاق کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ماضی بعید میں بے دینی کی وجہ سے کومیونٹی آف پروپٹی میں نکاح کیا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے جس کا انتقال ہوجائے زندہ کواس کی جائیداد کا نصف ملے گا، یہ قانون اسلامی شریعت کے خلاف ہے اب اس کوختم کرنا چاہتا ہے لیکن وکیل نے مشورہ دیا کہ طلاق دینی ہوگی تو کیا یہ شخص وکیل کے طلاق نامہ پر دستخط کردے گا تو طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: شریعتِ مطہرہ میں جس طرح صریح الفاظ کے ساتھ زبانی کہہ دینے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے اسی طرح لکھی ہوئی تحریری طلاق پر دستخط کردینے سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، وجہ یہ ہے کہ صریح الفاظ کسی نیت کے محتاج نہیں بلانیت وارادہ کے طلاق واقع ہوجاتی ہے اگرچہ کسی مصلحت کی وجہ سے ایسا کیا ہو۔

البتہ طلاق کے عدمِ وقوع کی ایک صورت فقہائے کرام نے یہ بیان کی ہے کہ طلاق کے بعد متصلاً ان شاء اللہ کہہ دے یا تحریری طلاق پر دستخط کے ساتھ ان شاء اللہ لکھدے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔اس طرح قانونی طلاق سے چھٹکارا بھی مل جائے گا اور شرعی طور پر زوجین کے نکاح پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔

دلائل حسبِ ترتیب ذیل ملاحظہ ہوفرمائیں:

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ثلاث جدهن جد وهزلهن جد : النكاح ، والطلاق ، والرجعة . رواه الأربعة إلا النسائي وصححه الحاكم ، وقال الترمذي: حسن غريب، والعمل على هذا عند أهل العلم من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وغيرهم . (سنن الترمذي،رقم: ۱۱۸۴).

وفي رد المحتار: صريحه ما لم يستعمل إلا فيه أى غالباً كما يفيد كلام البحر وعرفه فى التحرير بما يثبت حكمه بلانية ، وأراد بما اللفظ أومايقوم مقامه من الكتابة المستبينة او الإشارة المفهومة ...لأن ركن الطلاق اللفظ أو ما يقوم مقامه مماذكر...قوله ولو بالفارسية فما لايستعمل فيها إلا فى الطلاق فهو صريح يقع بلا نية . (فتاوى الشامي: ۲۴۷/۳،سعيد).

عیون المسائل میں ہے:

ولو كتب إليها: أما بعد: فأنت طالق ثلاثاً إن شاء الله ، فإن كان موصولاً في الكتاب لاتطلق، وإن كتب الطلاق ثم مد مدة، ثم كتب إن شاء الله ، يقع الطلاق. (عيون المسائل، ص ٢٠).

و في المحيط البرهاني: فإن كان كتب إن شاء الله موصولاً بكتابته أما بعد: فأنت طالق، لاتطلق، وإن فتر فترة بعد ما كتب أنت طالق ثم كتب إن شاء الله تطلق، لأن الكتاب من الغائب بمنزلة التلفظ من الحاضر . (المحيط البرهاني:٣/ ٤٢٩،الفصل السادس في ايقاع الطلاق).

امام ابو یوسفؒ کتاب الآثار میں فرماتے ہیں: قال: ثنا يوسف عن أبيه عن أبي حنيفةؒ عن حمادؒ ، عن إبراهيم، أنه قال: إذا قال الرجل لامرأته: أنت طالق إن شاء الله فليس بشيء ولا يقع الطلاق. (كتاب الآثار، ص ١٣٨ ، رقم: ٢١٨).

قال في لسان الحكام: كتب الطلاق واستثنى بلسانه أو طلق بلسانه واستثنى بالكتابة يصح . (لسان الحكام ، ص ٣٢٨، ط: القاهرة).

قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ فرماتے ہیں: طلاقِ صریح کا حکم یہ ہے کہ نیت کے بغیر بھی اس سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ (مجموعہ قوانین اسلامی، ص ۱۳۸)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: تحریری طلاق کی چند صورتیں ہیں (۱) مستبینہ مرسومہ: اگر باضابطہ طلاق نامہ یا مکتوب عنوان اور مخاطب کے ساتھ لکھا گیا ہو تو اسے کتابتِ مستبینہ مرسومہ کہتے ہیں، یہ تلفظ کے قائم مقام ہے، اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ (مجموعہ قوانین اسلامی، دفعہ ۳/۴، ص ۱۲۹)۔

خلاصہ یہ ہے کہ طلاق نامہ پر دستخط کے ساتھ ان شاء اللہ کہہ دے اور لکھ بھی دے تو اس کی وجہ سے قانونی نکاح ختم ہو جائے گا لیکن شرعی نکاح پر طلاق نامہ کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ واللہ ﷻ اعلم۔

’’رات ۹ بجے صلح نہ ہوئی تو تیسری طلاق‘‘ کہنے سے طلاق واقع ہونے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے پہلے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دی ہیں، اب بیوی سے کہا کہ اگر آج رات ۹ بجے

ہماری صلح نہیں ہوئی تو میں تیسری طلاق جاری کررہا ہوں، اب اگر صلح نہیں ہوئی تو تیسری طلاق پڑے گی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر رات ۹ بجے صلح نہیں ہوئی تو تیسری طلاق واقع ہوجائے گی، اور عورت مغلظہ ہوجائے گی پھر بغیر شرعی حلالہ کے اس کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

الطلاق المعلق بالشرط فإنه ليس بطلاق للحال ولأنه إعدام ويصير طلاقاً عند وجود الشرط . (۳/۱۹۳، ط: امدادیہ). (وكذا في فتاوى الشامي: ۳/۳۴۱، سعيد، والفقه الحنفي في ثوبه الجديد: ۲/۱۸۳، دارالقلم).

صیغہ حال سے طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۴/۴۵، ط: ممبئی)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

تم کو سٹرونگ طلاق دیتا ہوں کے الفاظ سے طلاق کا حکم:

سوال: میاں، بیوی کے درمیان جھگڑا ہوا، جھگڑے میں بات بڑھ گئی اور شوہر نے بیوی سے کہا میں تم کو سٹرونگ طلاق دیتا ہوں، جس کے معنی ہے سخت طلاق، اِن الفاظ سے کونسی طلاق پڑ گئی؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر شوہر کی نیت ایک طلاق کی ہو تو ایک طلاق بائن واقع ہوئی اور اگر تین کی نیت ہو تو تین ہوجائیں گی، اور اگر کوئی نیت مستحضر نہ ہو تو ایک طلاقِ بائن ہوگی۔

قال في الهداية : وإذا وصف الطلاق بضرب من الزيادة أو الشدة كان بائناً مثل أن يقول: أنت طالق بائن أو البتة . ولو قال لها: أنت طالق أشد الطلاق أو كألف أو ملء البيت فهي واحدة بائنة إلا أن ينوي ثلاثاً أما الأول فلأنه وصفه بالشدة وهو البائن لأنه لا يحتمل الانتقاض والارتفاض . ولو قال: أنت طالق تطليقة شديدة أو عريضة أو طويلة فهي واحدة بائنة . (الهداية : ۲/۳۶۹، ط: شركت علمية).

وللاستزادة انظر: (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۲۷۶، سعيد، وبدائع الصنائع: ۳/۱۱۰، سعيد، والجوهرة النيرة، ص۱۰۵، وآپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/۴۵۳)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

’’میں تجھ کو اپنی زندگی میں نہیں چاہتا‘‘ کے الفاظ سے طلاق کا حکم:

سوال: عبد اللہ نے اپنی بیوی کو یہ الفاظ لکھ دیے: ’’میں عبد اللہ، ناظمہ کو اپنی زندگی میں نہیں چاہتا‘‘ اب کیا حکم ہے طلاق پڑ جائے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مذکورہ الفاظ طلاق پر دلالت نہیں کرتے، اور نہ ہی طلاق کا احتمال رکھتے ہیں لہٰذا اِس جملہ سے نیت کے باوجود طلاق واقع نہیں ہوگی۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

إذا قال: لا حاجة لي فيک أولا أريدک أولا أحبک أولا أشتهيک أولا رغبة لي فيک فإنه لا يقع وإن نوى في قول أبي حنيفةؒ . (البحر الرائق: ۳/۳۰۳، کوئٹہ).

وقال في المبسوط للإمام السرخسيؒ: نقول: قوله : لا حاجة لي فيک بمنزلة قوله لا أشتهيک ولا أريدک ولا أهواک ولا أحبک ، وليس في شيء من هذه الألفاظ ما يدل على الطلاق، والنية متى تجردت عن لفظ يدل عليه كان باطلاً . (المبسوط للإمام السرخسيؒ: ۳۰/۲۹۵، دار الفكر). (وكذا في الفتاوى الهندية: ۱/۳۷۵، وفتاویٰ حقانیہ: ۴/۴۸۰). **واللہ ﷻ اعلم۔**

’’بھاڑ میں چلی جا‘‘ کہنے سے طلاق کا حکم:

سوال: آج سے دو سال پہلے میری بیگم سے فون پر بات ہوئی تھی، اور بحث کے دوران میں نے غصہ میں اسے کہا: بھاڑ میں چلی جا، لیکن میں نے طلاق نہیں دی، اور نہ طلاق دینے کی کوئی نیت تھی، میری بیوی کہتی ہے کہ میں نے اسے طلاق دی، اور پاکستان میں کسی دار الافتاء سے میری طرف سے جھوٹا الزام لگا کر فتویٰ لیا، کیا طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر شوہر کا مذکورہ بالا بیان سچائی اور حقیقت پر مبنی ہے تو اس کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ ’’بھاڑ میں چلی جا‘‘ یہ الفاظ کنایات میں سے ہیں، اور کنایاتِ طلاق میں بغیر نیت کے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ بیوی کے کہنے سے اور طلاق کا فتویٰ لینے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

قال في البدائع: ولأن المرأة في باب الطلاق تدعى وقوع الطلاق لأنها تدعى وجود شرط الوقوع، والزوج ينكر الوقوع لإنكاره شرط الوقوع فكان القول قول المنكر، والله الموفق. (بدائع الصنائع: ۳/۱۵۰، سعید).

وفى الاختيار لتعليل المختار: وإذا اختلفا في وجود الشرط فالقول للزوج، لأنه منكر ومتمسك بالأصل وهو العدم، والبينة للمرأة لأنها مدعية مثبتة. (الاختيار لتعليل المختار: ۳/۱۵۶، ط: دارالكتب العلمية بيروت).

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولو قال لها: اذهبي أى طريق شئت، لا يقع بدون النية وإن كان في حال مذاكرة الطلاق، وفي مجموع النوازل: لوقال لها: اذهبي إلى جهنم ونوى الطلاق يقع، كذا في الخلاصة. (الفتاوى الهندية: ۱/۳۷۶، باب الكنايات).

وفى الدر المختار: فالكنايات لا تطلق بها قضاء إلا بنية أو دلالة الحال وهي مذاكرة الطلاق أو الغضب. وفى الشامي: قوله: قضاء، قيد به لأنه لايقع ديانة بدون النية ولو وجدت دلالة الحال فوقوعه بواحدة من النية أو دلالة الحال إنما هو في القضاء فقط. (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۲۹۶، سعید). واللہ ﷻ اعلم۔

طلاق کے مطالبہ پر I divorce you لکھنے سے طلاق کا حکم:

سوال: بیوی نے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا، شوہر نے بیوی کے اِس مطالبہ کرنے پر تحریری میسیج (message) بھیجا I divorce you کیا اِس تحریری میسیج سے طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: اپنی رضامندی سے تحریری طلاق خود لکھنے یا دوسرے سے لکھوانے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، اگر چہ زبان سے کچھ نہ کہا ہو؛ اس لیے کہ وقوعِ طلاق کے لیے تکلم شرط نہیں ہے، لہٰذا بصورتِ مسئولہ مذکورہ میسیج سے ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگئی۔ دلائل ملاحظہ ہو:

بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع میں ہے:

وكذا التكلم بالطلاق ليس بشرط فيقع الطلاق بالكتابة المستبينة وبالإشارة المفهومة من الأخرس؛ لأن الكتابة المستبينة تقوم مقام اللفظ والإشارة المفهومة تقوم مقام اللفظ . (بدائع الصنائع:۳/۱۰۰).

درر الحكام شرح مجلة الأحكام میں ہے:

الكتاب كالخطاب... والحاصل أن كل كتاب يحرر على الوجه المتعارف من الناس حجة على كاتبه كالنطق باللسان . (درر الحكام شرح مجلة الأحكام:المادة ۶۹: ۱/۶۲).

درمختار مع ردالمحتار میں ہے:

كتب الطلاق وإن مستبيناً على نحو لوح وقع إن نوى، وقيل مطلقاً، ولو على نحو الماء فلا مطلقاً، ولوكتب على وجه الرسالة والخطاب،كأن يكتب يا فلانة: إذا أتاك كتابي هذا فأنت طالق طلقت بوصول الكتاب جوهرة، وفي الشامية: (قوله كتب الطلاق الخ) قال في الهندية: الكتابة على نوعين: مرسومة وغير مرسومة ، ونعني بالمرسومة أن يكون مصدراً ومعنوناً مثل ما يكتب إلى الغائب، وغير المرسومة أن لا يكون مصدراً معنوناً، وهو على وجهين: مستبينة وغير مستبينة ، فالمستبينة ما يكتب على الصحيفة والحائط والأرض على وجه يمكن فهمه وقراءته، وغير المستبينة ما يكتب على الهواء والماء وشيء لايمكنه فهمه وقراءته، ففي غير المستبينة لا يقع الطلاق وإن نوى، وإن كانت مستبينة لكنها غير مرسومة إن نوى الطلاق وإلا لا، وإن كانت مرسومة يقع الطلاق نوى أو لم ينو ثم المرسومة لا تخلو إما أن أرسل الطلاق بأن كتب: أما بعد فأنت طالق، فكما كتب هذا يقع الطلاق وتلزمها العدة من وقت الكتابة ، وإن علق طلاقها بمجيء الكتاب بأن كتب: إذا جاءك كتابي فأنت طالق فجاءها الكتاب فقرأته أو لم تقرأ يقع الطلاق كذا في الخلاصة، (الدر المختار مع رد المحتار:۳/۲۴۶)

باب الصريح (صريحه ما لم يستعمل إلا فيه) ولو بالفارسية، وفي الشامية، (قوله ولو بالفارسية) فما لا يستعمل فيها إلا في الطلاق فهو صريح يقع بلا نية، وما استعمل فيها استعمال الطلاق وغيره فحكمه حكم كنايات العربية في جميع الأحكام بحر. (۲۴۷/۳)

جدید فقہی مسائل میں ہے:

غیر عربی لفظوں سے نکاح وطلاق: شریعت کا اصول یہ ہے کہ جو امور ذکر سے متعلق ہیں ان میں الفاظ ومعانی دونوں ہی مقصود ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید، نماز وغیرہ جس میں تلاوت قرآن اور بعض اذکار واجب ہیں۔ اگر ان میں اس کی بجائے اس کا ترجمہ پڑھ دیا جائے تو صحیح تر قول کے مطابق درست نہ ہوگا۔ لیکن عام گفتگو اور معاملات میں عربی کے الفاظ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے جیسے خریدنا، بیچنا، ہبہ کرنا وغیرہ۔

نکاح وطلاق بھی ان ہی معاملات میں ہے۔ وہ تمام الفاظ جن سے کسی بھی زبان میں نکاح وطلاق کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ نکاح ہو جانے اور طلاق واقع ہونے کے لیے کافی ہوں گے۔ طلاق کے لیے کسی دوسری زبان کا ایسا لفظ استعمال کیا جائے جو خاص اسی مفہوم کو ادا کرتا ہو اور اس کو بولنے کے بعد کسی اور طرف ذہن جاتا ہی نہ ہو تو اس سے طلاق رجعی واقع ہوگی یعنی اس طلاق کے بعد بیوی کو لوٹا لینے کا حق باقی رہے گا۔ (جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۸۹)۔ و(فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۴/ ۱۷۴)۔

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

تحریری طلاق: تحریری طلاق کی چند صورتیں ہیں: کتابت مستبینہ: یعنی کسی کاغذ، دیوار وغیرہ پر ایسی تحریر جو واضح ہو اور باقی رہنے والی ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) مستبینہ مرسومہ (۲) مستبینہ غیر مرسومہ

اگر باضابطہ نامہ یا مکتوب عنوان اور مخاطب کے ساتھ لکھا گیا ہو تو اسے کتابت مستبینہ مرسومہ کہتے ہیں، اور اگر یوں ہی کسی کاغذ کے ٹکڑے یا دیوار پر بیوی کی طرف اضافت کے بغیر صرف یہ لکھے کہ طلاق ہے یا طلاق دی، اور یہ تحریر بیوی کو نہ بھیجے تو کتابت مستبینہ غیر مرسومہ ہے۔

کتابت مستبینہ مرسومہ تلفظ کے قائم مقام ہے، اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ کتابت مستبینہ غیر مرسومہ سے طلاق ایسی صورت میں واقع ہوگی جب کہ شوہر کہے کہ میری نیت بیوی کو طلاق دینے کی تھی۔

کتابت غیر مستبینہ: جوتحریر ظاہر نہ ہواور پڑھنے میں نہ آئے، جیسے پانی اور ہوا پر لکھنا، اس سے کسی حال میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔ (مجموعہ قوانین اسلامی، ص:۱۲۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دودھ نہ پینے کی قسم میں مخلوط دودھ پینے سے طلاق کا حکم:

سوال: ایک شخص نے قسم کھائی کہ ''اگر میں دودھ پیوں تو میری بیوی کو طلاق'' پھر دودھ میں پانی ملا کر پیئے اور یہ معلوم نہیں کہ پانی زیادہ ہے یا دودھ، تو کیا وہ شخص حانث ہوگا یا نہیں؟ اور اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ محض شک کی وجہ سے وہ شخص حانث نہیں ہوگا اور اس کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وإن وقع الشک فيه ولا يدری ذلک فالقياس أن لا يحنث لأنه وقع الشک في حکم الحنث فلا يثبت مع الشک وفی الاستحسان يحنث لأنه عند احتمال الوجود والعدم علی السواء فالقول بالوجود أولی احتياطاً لما فيه من براء ة الذمة بيقين وهذا يستقيم فی اليمين باللّٰه تعالیٰ لأن الکفارة حق اللّٰه تعالیٰ فيحتاط في إيجابها فأما فی اليمين بالطلاق والعتاق فلا يستقيم لأن ذلک حق العبد وحقوق العباد لايجري فيها الاحتياط للتعارض فيعمل فيها بالقياس . (بدائع الصنائع: ۶۲/۳، سعید).

(وکذا فی البحرالرائق: ۳۵۷/۴، دارالمعرفة، والفتاوی الهندية: ۹۱/۲، والمبسوط للإمام السرخسي: ۱۸۳/۸، ط: ادارة القرآن کراچی).

بدائع کی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ شک واقع ہو تو حقوق اللہ میں احتیاط پر عمل کرتے ہوئے حانث ہونے کا حکم لگایا جائیگا اور کفارہ واجب ہوگا، لیکن حقوق العباد میں قیاس پر عمل کرتے ہوئے حانث نہیں ہوگا اور طلاق حقوق العباد سے متعلق ہے لہٰذا طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ حقوق اللہ میں اصل ذمہ کا مشغول ہونا ہے تو فراغتِ ذمہ یقینی طور پر مطلوب ہے اور حقوق العباد میں اصل ذمہ کا فارغ ہونا ہے تو وجوب ولزوم کے لیے مضبوط دلیل

چاہیے جس میں شک نہ ہو۔ جیسا کہ علامہ سرخسیؒ نے اپنے اصول میں بیان کیا ہے:

الأصل: أن الاحتياط في حقوق اللّٰه تعالىٰ جائز وفي حقوق العباد لا يجوز. (أصول السرخسي، ص۱۵، میرمحمد کتب خانه). واللہ ﷻ اعلم۔

زوجین میں حرمتِ مصاہرت ثابت ہونے پر بچوں کے نسب کا حکم:

سوال: کیا زوجین کے درمیان حرمتِ مصاہرت ثابت ہونے کے بعد اگر بچہ پیدا ہوا (یعنی ہمبستری کی وجہ سے) تو وہ ثابت النسب ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ بچہ ثابت النسب ہوگا، کیونکہ فقہاء کے اختلاف کی وجہ سے یہ ہمبستری زنا کے حکم میں نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وبحرمة المصاهرة لا يرتفع النكاح حتى لا يحل لها التزوج بآخر إلا بعد المتاركة وانقضاء العدة والوطء بها لا يكون زنا. وفى الشامية: قوله: والوطء بها، أى الوطء الكائن في هذه الحرمة قبل التفريق والمتاركة لا يكون زنا، قال فى الحاوي: والوطء فيها لا يكون زنا لأنه مختلف فيه وعليه مهر المثل بوطئها بعد الحرمة ولا حد عليه ويثبت النسب.
(الدرالمختار مع ردالمحتار: ۳/۳۷، سعید).

قال فى البحرالرائق: فإذا ثبت حرمة المصاهرة بين الزوجين ثم حدث بينهما ولد ثم مات الأب اختلفوا في ميراث هذا الولد منه للاختلاف في هذه الحرمة فلم يكن كولد الزنا كما لو جاء ت بولد بعد النكاح المعلق طلاقها الثلاث به فإن النسب فيه ثابت للاختلاف.
(البحرالرائق: ۴/۱۱۹، کوئٹه). واللہ ﷻ اعلم۔

مرتد ہوجانے کی دھمکی سے اکراہ کا حکم:

سوال: اگر کسی نومسلم عورت نے اپنے شوہر سے یوں جبر کیا کہ اگر تم مجھے تین طلاق نہیں دیتے تو میں

دوبارہ عیسائی اور مرتد ہو جاؤں گی تو کیا یہ اکراہ میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر اکراہ ہو تو ملجی ہے یا غیر ملجی ؟

الجواب: بظاہر عورت کا یہ کہنا کہ تم تین طلاق نہیں دو گے تو میں مرتد بن جاؤں گی، یہ اکراہ میں شامل نہیں ہے، اکراہ کی دو قسمیں ہیں: ا کراہ ملجی ؛ جان لینے یا عضو تلف کرنے کی دھمکی دی جائے۔۲: اکراہ غیر ملجی : قید کرنے کی دھمکی دی جائے، لیکن عورت کی یہ بات اکراہ میں داخل نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو خزانۃ الفقہ میں مرقوم ہے:

إذا أكره رجلاً بقتل أو تلف عضو من أعضاء ه أو بأمر يخاف منه تلف نفسه أو ذهاب عضو من أعضاء ه أن يطلق امرته... (خزانة الفقه ،ص ۳۳۳،۳۳۴).

شرح منظومة ابن وهبان میں ہے:

إن الإكراه يحصل بالضرب أو بالحبس أو بالقيد قال: وأعلم أن أصحابنا أجمعوا على أن الإكراه بوعيد تلف النفس أو عضو من الأعضاء إكراه معتبر شرعاً ، سواء حصل على فعل أو قول، وإن حصل الإكراه بالحبس والتقييد، فإن كان على فعل فليس بمعتبر شرعاً ويجعل كأن المكرَه فعل ذلك بغير إكراه . (شرح منظومة ابن وهبان : ۲/۸۷).

وللمزيد راجع: (الدرالمختار:۶/۱۲۹،سعيد،والفتاوى الهندية:۳۵/۲). **واللہ ﷻ اعلم۔**

شہوت سے انکار کرنے پر حرمتِ مصاہرت کا حکم:

سوال: حرمتِ مصاہرت میں اگر کوئی شخص شہوت کا انکار کردے تو حرمتِ مصاہرت ثابت ہوگی یا نہیں؟ عام طور پر فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایسی جگہ بوسہ دیا یا چھویا جو بطورِ شہوت ہی چھویا جاتا ہے تو انکار کے باوجود حرمت ثابت ہوگی، بعض حضرات نے یہ بیان کیا کہ اگر شہوت کا انکار کردے تو حرمت ثابت نہ ہوگی؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر شہوت سے انکار کردے تو حرمتِ مصاہرت ثابت نہ ہوگی۔ ملاحظہ ہو محیط برہانی میں مرقوم ہے:

ومن المشايخ من فصل في التقبيل بينهما إذا كان على الفم وبينما إذا كان على

الجبهة والرأس فقال: إن كانت القبلة على الفم يفتى بالحرمة ولا يصدق إن كان بغير شهوة و إذا كان على الرأس أوعلى الذقن أوعلى الخد لا يفتى بالحرمة ، إلا إذا ثبت أنه فعل بشهوة،ويصدق إن لم يكن بشهوة وهكذا ذكرفي مجموع النوازل.(المحيط البرهاني:۳/ ۱۸۵)،

فتاوى الشامی میں مذکور ہے:

قوله كمس، أى بشهوة كما فى المنح ويفيده قوله بما يوجب حرمة المصاهرة قال فى البحر: ودخل الوطء والتقبيل بشهوة على أى موضع كان فما أو خداً أو ذقناً أو جبهة أو رأساً والمس بلا حائل أو بحائل يجد الحرارة معه بشهوة والنظر إلى داخل الفرج بشهوة بأن كانت متكئة وخرج ما إذا كانت هذه الأفعال غير شهوة أو نظر إلى داخل الفرج بشهوة (فتاوى الشامی: ۳/ ۳۹ ۹،سعيد).

وفيه أيضاً: قوله للشفقة ، أفاد أن التقبيل لايحرم إلا إذا كان عن شهوة وينبغى تقييده بأن لا يكون على الفم لأنه على الفم يوجب حرمة المصاهرة مطلقاً تأمل . (فتاوى الشامی:۳/ ۶۸ ۳،سعيد).

وفيه أيضاً: ومثله فى العناية لكن في فصل المحرمات من فتح القدير: إذا أقر بالتقبيل و أنكر الشهوة اختلف فيه قيل: لا يصدق ولا يقبل إلا أن يظهر خلافه وقيل: يقبل، وقيل: بالتفصيل بين كونه على الرأس والجبهة فيصدق أو على الفم فلا والأرجح هذا . (فتاوى الشامی: ۶/ ۳۸۰،سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

طلاقِ ثلاثہ کے بعد بچے ثابت النسب نہیں:

سوال: ایک شخص نے بیوی کو تین طلاقیں دیں، پھر غفلت کیوجہ سے جماع کرتا رہا اور بچے بھی ہوئے تو اب بچے ثابت النسب ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر اس کو حرام جانتے ہوئے جماع کرتا رہا تو یہ زنا کے حکم میں ہے اور بچے

ثابت النسب نہیں ہوں گے۔

۲۔اگراس نے اپنے گمان میں حلال جان کر جماع کیا تھا تو یہ شبہہ فی الفعل ہوااوراس صورت میں بھی نسب ثابت نہ ہوگا۔

۳۔اگراس شخص نے کسی مفتی سے فتویٰ پوچھ کراس پرعمل کیا تو یہ مقبول شبہہ ہے اور بچے ثابت النسب ہیں۔ملاحظہ ہوالدرالمختار میں ہے:

وإذا وطئت المعتدة بشبهة ، قوله بشبهة...ومفاده أنه لو وطئها بعد الثلاث فى العدة بلا نكاح عالماً بحرمتها لا تجب عدة أخرى لأنه زنا. (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۵۱۸/۳،سعید). (وكذا فى :۵۲۳/۳،سعید).

تبيين الحقائق میں مذکور ہے:

ولشبهة الفعل إن ظن حله كمعتدة الثلاث...أى يسقط الحد لأجل الشبهة فى الفعل إن ظن أن وطئها حلال له ويسمى هذا النوع من الشبهة شبهة الفعل...والنسب يثبت فى الأولى فقط، أى يثبت النسب إن ادعاه فى الشبهة الأولى وهى شبهة فى المحل ولا يثبت فى النوع الثانى وهو الشبهة فى الفعل . (تبيين الحقائق: ۱۷۷/۳،ط:امداديه).

قال في فتح القدير: ونص فى التبيين أن المبتوتة بالثلاث إذا وطئها الزوج بشبهة كانت شبهة الفعل وفيها لا يثبت النسب وإن ادعاه نص عليه في كتاب الحدود . (فتح القدير: ۳۵۲/۴، دارالفكر).

آپ کے مسائل اوران کاحل میں مذکور ہے:

تین طلاق کے بعداگرتعلقات قائم رکھےتواس دوران پیداہونے والی اولاد کی کیاحیثیت ہوگی؟

... جواولاداس عرصے میں پیداہوئی اس کانسب صحیح نہیں،اس کی حیثیت ناجائزاولاد کی سی ہے،ان کوچاہیے کہ فوراً علیحدگی اختیارکرلیں اوراللہ تعالیٰ سےاپنے گناہ کی معافی مانگیں۔(آپ کے مسائل اوران کاحل:۴۷۶/۶)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

عورت کے نشہ کی حالت میں ہونے سے طلاق کا حکم:

سوال: ایک عورت ہمیشہ نشہ کی حالت میں رہتی ہے، شوہر نے تنگ آکر تین طلاقیں دیدیں، اس وقت بھی عورت نشہ کی حالت میں تھی، اس نے گالی دے کر شوہر سے کہا: یہاں سے چلے جاؤ، اب شوہر معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کیا اس حالت میں طلاق ہوئی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب شرعی حلالہ کے بغیر اس عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں، شرعی حلالہ یہ ہے کہ یہ عورت عدت کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے پھر وہ طلاق دیدے یا اس کا انتقال ہوجائے تو عدت گزارنے کے بعد زوجِ اول کے ساتھ نکاح کرسکتی ہے۔

ملاحظہ ہو طلاق واقع ہونے کے لیے بیوی کا سامنے ہونا بھی ضروری نہیں؛ فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں ہے:

سوال: ایک شخص نے اپنی زوجہ کو اس کی عدمِ موجودگی میں طلاق دیدی تو طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب: اس صورت میں اس کی زوجہ پر طلاق واقع ہوگئی، کیونکہ طلاق دینے کے وقت عورت کا سامنے ہونا اور پاس ہونا ضروری نہیں ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۴۲/۹، مدلل ومکمل، دار الاشاعت)۔

دوسری جگہ مذکور ہے: وقوعِ طلاق کے لیے زوجہ کا موجود ہونا شرط نہیں ہے۔ (۸۰/۹)۔

اور ایک جگہ مرقوم ہے: خطاب ہونا اور روبرو ہونا زوجہ کا شرط نہیں، اگر زوجہ غائب ہو اور اس کو خطاب نہ کیا جاوے اور غائبانہ طلاق دی جاوے تب بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ (۸۵/۹)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

طلاق واقع ہونے کے لیے عورت کا سامنے ہونا یا طلاق کے الفاظ سننا یا عورت کا نام لے کر طلاق دینا شرط نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۵۰۳/۴، ط: دیوبند)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دار القضاء یا جمعیت العلماء کو طلاق کا اختیار دینے کا حکم:

سوال: جماعتِ مسلمین یعنی دار القضاء کو شوہر تفویض (تملیک) طلاق بایں الفاظ کرے کہ اگر میں

وقتِ مقررہ پر بلا کسی معتبر وجہ اور اطلاع کے دار القضاء حاضر نہ ہوسکوں تو دار القضاء کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ جب بھی چاہے میری بیوی پر ایک طلاق بائن واقع کرے؟ کیا اس طرح تفویض کر لینے سے اس کی غیر حاضری کی صورت میں دار القضاء کو طلاق کا اختیار رہوگا یا نہیں؟ کیا اس شخص کو اپنے اس قول سے رجوع کرنے کا اختیار رہوگا یا نہیں؟ برائے مہربانی مفصل مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر شوہر نے جماعتِ مسلمین یا دار القضاء کو یہ اختیار دیا اور ان کے اگریمنٹ پر دستخط کر دئے کہ اگر وہ بلا کسی معتبر وجہ کے مجلس قضاء میں حاضری نہ دے تو دار القضاء کو اس کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع کرنے کا اختیار رہوگا، تو یہ صورت شرعاً تفویض کہلائیگی اور دار القضاء کو طلاق دینے کا اختیار حاصل ہوگا، پھر شوہر اپنے قول سے رجوع نہیں کرسکتا، یہ ہمیشہ کے لیے ہوگا نیز اس کو موقت بھی کیا جاسکتا ہے، مثلاً ۲۵ سال کے لیے، وغیرہ۔

لیکن اس تفویض نامہ اور اگریمنٹ پر دستخط کرنے کی وجہ سے شوہر کا طلاق دینے کا حق ختم نہیں ہوگا، اگر شوہر خود طلاق دیدے تب بھی نافذ ہوجائے گی۔ ملاحظہ ہو قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ فرماتے ہیں:

۱۔ مرد اپنا اختیار بیوی کو دیدے کہ وہ اس کی طرف سے اپنے اوپر طلاق واقع کرلے یا کسی اور شخص کو اس بات کا اختیار دیا کہ اگر وہ چاہے تو اس کی بیوی کو طلاق دیدے، تو یہ تفویض ہے۔ اور اگر کسی دوسرے عاقل بالغ کو طلاق دینے کا حکم دے اور اس کے اختیار پر نہ چھوڑے، تو یہ توکیل ہے۔

۲۔ تفویض تملیک ہے اور توکیل تملیک نہیں ہے، اسی وجہ سے تفویض طلاق میں رجوع صحیح نہیں اور توکیل طلاق میں رجوع صحیح ہے، نیز مالک اپنی مشیت پر عمل کرتا ہے جب کہ وکیل کا مشیت اور رائے سے تعلق نہیں، اس سے فقط فعل مطلوب ہے۔

۳۔ تفویض مجلس تک محدود ہے، ہاں اگر الفاظ میں تعمیم ہو تو پھر اپنے عموم پر رکھا جائے گا، مثلاً: یہ کہا کہ جب چاہو وغیرہ، برخلاف توکیل کے کہ وہ مجلس تک محدود نہیں ہے۔ (مجموعہ قوانین اسلامی: از ۱۵۰ تا ۱۵۴)۔

قال في الدر المختار: **لا تطلق بعده أي المجلس إلا إذا زاد على قوله طلقي نفسک، وأخواته متى شئت أو متى ما شئت أو إذا شئت أو إذا ما شئت، فلا يتقيد بالمجلس ولم**

يصح رجوعه . وفي الشامية: قوله فلا يتقيد بالمجلس، أما في متى ومتى ما فلأ نهما لعموم الأوقات فكأنه قال: في أى وقت شئت فلا يقتصر على المجلس . (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/۳۱۷، سعيد).

بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

أما بيان صفته فهو أنه لازم من جانب الزوج حتى لا يملك الرجوع عنه ولا نهى المرأة عما فعل إليها و لا فسخ ذلک لأنه ملكها الطلاق و من ملک غيره شيئاً فقد زالت ولايته من الملک فلا يملک إبطاله بالرجوع والنهى والفسخ...وإن كان مؤقتاً بوقت وعلمت في شيء من الوقت صار الأمر بيدها ، فأما إذا علمت بعد مضى الوقت كله لا يصير الأمر بيدها بهذا التفويض أبداً لأن ذلک علم لا ينفع لأن التفويض المؤقت بوقت ينتهي عند انتهاء الوقت . (بدائع الصنائع :۳/۱۱۳،سعيد).

وفيه أيضاً: فإن وقته بوقت خاص بأن قال: أمرک بيدک يوماً أو شهراً أو سنة أوقال: اليوم أو الشهر أو السنة أو قال: هذا اليوم أو هذا الشهر أو هذه السنة لا يتقيد بالمجلس ولها الأمر فى الوقت كله تختار نفسها فيما شاء ت منه . (۳/۱۱۵،سعيد).

وفيه أيضاً: وأجمعوا على أن قوله لأجنبي طلق امرأتي توكيل ولا يتقيد بالمجلس وهو فصل التوكيل فإن قيده بالمشيئة بأن قال له: طلق امرأتي إن شئت فهذا تمليک عند أصحابنا الثلاثة ...(بدائع الصنائع:۳/۱۲۲،سعيد).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

تفویض طلاق کے بعد شوہر اس سے رجوع نہیں کرسکتا ہے۔ اگر شوہر نے تفویض متعین مدت تک کے لیے کی ہے اور وہ مدت گزر گئی اور بیوی نے اس مدت کے اندر طلاق واقع نہیں کی تو تفویض ختم ہوگئی۔ تفویض یا توکیل کی وجہ سے خود شوہر کا حق طلاق ختم نہیں ہوتا۔ (مجموعہ قوانین اسلامی، ص۱۵۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

وعدۂ طلاق کو معلق کرنے سے طلاق کا حکم:

سوال: ایک عورت نے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کیا، شوہر نے کہا تو میرے ساتھ صحبت پر تیار ہوگی تو میں طلاق دوں گا، بیوی نے شرط پوری کردی، لیکن بعد میں دونوں میں صلح ہوگئی، تو کیا شرط پوری کرنے پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شرط پوری کرنے پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، کیونکہ شوہر نے طلاق دینے کا وعدہ کیا تھا، اور وعدۂ طلاق کو معلق کرنے کے بعد شرط پوری ہونے پر طلاق واقع نہیں ہوتی، شوہر کے الفاظ طلاق دوں گا یہ مستقبل کے الفاظ ہیں اِن الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

صيغة المضارع لا يقع بها الطلاق إلا إذا غلب في الحال كما صرح به الكمال ابن الهمام . (تنقيح الفتاوى الحامدية: ۱/۳۸).

وفي الفتاوى الهندية: بخلاف قوله: كنم ، لأنه استقبال فلم يكن تحقيقاً بالتشكيك في المحيط لو قال بالعربية : أطلق لا يكون طلاقاً إلا إذا غلب استعماله للحال فيكون طلاقاً
(الفتاوى الهندية: ۱/۳۸۴).

وفي المحيط: بخلاف قوله: كنم ، لأنه تمحض للاستقبال وهو وعد، وبالعربية قوله: أطلق، لا يكون طلاقاً في أنه دائر بين الحال والاستقبال فلم يكن تحقيقاً مع الشك .
(المحيط البرهاني: ۴/۴۳، الفصل السابع والعشرون في المتفرقات ، ط: رشيديه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

عیسائی عورت کے طلاقِ ثلاثہ کے بعد مسلمان ہونے سے سقوطِ حلالہ کا حکم:

سوال: ایک مسلمان شخص نے عیسائی عورت کے ساتھ نکاح کیا تھا، پھر دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا اور شوہر نے عیسائی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، اس کے بعد وہ عورت مسلمان ہوگئی، اب اگر یہ عورت سابق شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو حلالہ ضروری ہوگا یا اس کے بغیر نکاح درست ہے؟

الجواب: اسلام لانے اور مذہب بدلنے کی وجہ سے حلالہ کا حکم ساقط نہیں ہوتا، اور حلالہ کے بغیر سابق شوہر سے نکاح جائز نہیں ہوجاتا۔لہٰذا بصورتِ مسئولہ عیسائی عورت کے لیے سابق شوہر سے نکاح کے لیے شرعی حلالہ ضروری ہے، اس کے بغیر نکاح جائز نہیں۔ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے:

وإذا كانت النصرانية تحت مسلم طلّقها ثلاثاً فتزوجت نصرانياً ودخل بها حلت للمسلم الذي طلقها ثلاثاً. (الفتاوى الهندية: ۱/۴۷۳).

تبدیل مذہب سے حکمِ حلالہ ساقط نہیں ہوتا۔ملاحظہ ہو الدرالمختار میں ہے:

ولا ينكح مطلقة من نكاح صحيح نافذ بها أى بالثلاث لو حرة...حتى يطأها غيره ... أو حرة بعد ثلاث وردة و سبي نظيره من فرق بينهما بظهار أو لعان ثم ارتدت و سبيت ثم ملكها لم تحل له أبداً. وفي رد المحتار: قوله لم تحل له أبداً. أي ما لم يكفر في الظهار ويكذب نفسه أو تصدقه في اللعان، فوجه الشبه بين المسألتين أن الردة واللحاق والسبي لم تبطل حكم الظهار واللعان كما لم تبطل حكم الطلاق. (فتاوى الشامي : ۳/۴۱۲،سعيد).

تبيين الحقائق میں علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں:

كانت تحته حرة فطلقها ثلاثاً ثم ارتدت ولحقت بدارالحرب ثم استرقها لم تحل له حتى تتزوج بزوج آخر و يدخل بها لما تلونا نظيره: إذا ظاهر من امرأته أو لاعنها وفرق بينهما ثم ارتدت والعياذ بالله ولحقت بدارالحرب ثم استرقت وملكها الزوج الأول لم تحل له أبداً. (تبيين الحقائق: ۲/۲۵۹،ط:امداديه).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے:

اس حرکت (ارتداد) سے بھی حلالہ ساقط نہیں ہوگا۔(فتاویٰ محمودیہ:۱۳/۵۰۲، جامعہ فاروقیہ)۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے: مرتد ہوجانے سے طلاقِ ثلاثہ مغلظہ کا اثر باطل نہیں ہوتا ہے۔(فتاویٰ رحیمیہ: ۴/۴۶۴،ط:دیوبند)۔واللہ ﷻ اعلم۔

تحریمِ حلال کی قسم کھانے سے بیوی کے حرام ہونے کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے یوں قسم کھائی کہ اگر آئندہ میں جوا خانہ گیا تو مجھ پر حلال شئ حرام ہے۔ چونکہ پرانی عادت تھی اس لیے کچھ دنوں کے بعد وہاں گیا، اب اس کی قسم کا کیا حکم ہے؟ اس کی بیوی حرام ہوئی یا نہیں؟ جبکہ اس نے بیوی کی طلاق کی کوئی نیت نہیں کی تھی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ وہ حانث ہوگیا، اور کفارہ واجب ہوا، لیکن بیوی پر طلاق کے بارے میں متقدمین فرماتے ہیں: بلانیت طلاق واقع نہیں ہوگی، اور متاخرین فقہاء کے نزدیک عرف کی وجہ سے ایک طلاقِ بائن واقع ہوگی، البتہ بعض فقہاء مثلاً: علامہ شامیؒ اور علامہ ابن نجیم مصریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہمارے عرف میں یہ الفاظ طلاق کے لیے مستعمل نہیں اس لیے نیت کا اعتبار ہوگا اور بلانیت طلاق واقع نہ ہوگی۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله كل حل، قال في الهداية: ولو قال: كل حل على حرام، فهو على الطعام والشراب إلا أن ينوي غير ذلك...وهذا كله جواب ظاهر الرواية ومشايخنا قالوا: يقع به الطلاق من غير نية لغلبة الاستعمال وعليه الفتوى، قلت: ومقتضى قوله فإنه يستعمل فيما يتناول عادة أن العرف كان أولاً في استعماله في الطعام والشراب ثم تغير ذلك إلى عرف آخر وغلب استعماله في الطلاق...والفتوى على قول المتأخرين بانصرافه إلى الطلاق البائن عاماً أو خاصاً...وتوقف البزدوي في مبسوطه في كون عرف الناس إرادة الطلاق به فالاحتياط أن لا يخالف المتقدمين. (فتاوى الشامي: ۳/۷۳۲، مطلب كل حل عليه حرام، سعيد).

قال في المبسوط: ولو قال: كل حل على حرام، يسأل عن نيته فإذا نوى يميناً فهو يمين ولا تدخل امرأته فيه إلا أن ينويها فإذا لم ينو حمل ذلك على الطعام والشراب خاصة.
(المبسوط للامام السرخسيؒ: ۶/۱۲۸، ط: دار الفكر).

وفي خلاصة الفتاوى: ولو قال: كل حلال على حرام...فقال في الفتاوى الصغرى:

لابـد من النية قال في المحيط فإن نوى اليمين أو لم ينو شيئاً كان يميناً وينصرف إلى الطعام والشـراب ولا تدخل فيه امرأته إلا بالنية استحساناً هكذا قال محمدؒ، وعند مشايخ بلخؒ أنه تدخل امرأته بغير نية . (خلاصة الفتاوىٰ: ۹۵/۲، ط:رشيدية).

(وكذا في البحر الرائق: ۳۱۸/۴، ط:دارالمعرفة، والجوهرة النيرة : ۲۹۴/۲، ط:مكتبة امدادية).

فتاویٰ فریدیہ میں مذکور ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنے افسر کو تحریر کردیا کہ میں فلاں تاریخ کو گھر آؤں گا اگر نہ آؤں تو مجھ پر حلال دنیا حرام ہے اس تحریر پر تحریر کنندہ اور دو گواہوں کے دستخط ہیں لیکن مقررہ تاریخ تک شخص مذکور گھر نہیں گیا بلکہ اس وقت تک نہیں گیا، کیا مذکورہ شخص پر بیوی مطلقہ ہوگی؟ حالانکہ اس شخص کا لکھتے وقت یہ وہم گمان بھی نہ تھا کہ ’’حلالِ دنیا حرام ہے‘‘ سے بھی طلاق واقع ہوتی ہے اب اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: چونکہ ایمان (قسم) کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اور ہمارے دیار کے عرف میں یہ لفظ جماع کے متعلق معروف نہیں ہے اور یہ حالف بھی جماع کے متعلق خالی الذہن تھا، لہٰذا اس حالف پر بیوی مطلقہ نہیں ہوئی ہے، نہ قضاءً اور نہ دیانۃً، والتفصیل فی کتاب ایمان ردالمحتار: ۸۹/۳۔ (فتاویٰ فریدیہ: ۴۹۷/۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

شوہر کی اطاعت سے متعلق ایک حدیث کی تحقیق:

سوال: شوہر کی اطاعت سے متعلق ایک حدیث سننے میں آئی ہے؛ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص سفر پر گیا اور بیوی کو بتلا گیا کہ گھر سے باہر نہ جائے اور اس کے والد نچلے منزلہ میں رہتے تھے، وہ بیمار ہوگئے، عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ معلوم کرنے کے لیے کسی کو بھیجا کہ عیادت کے لیے جاسکتی ہے، جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شوہر کی اطاعت کرو، پھر والد کا انتقال ہوگیا تو دوبارہ مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا والد کا چہرہ دیکھنے جاسکتی ہے، حضور نے جواب میں فرمایا: شوہر کی اطاعت کرو، پھر حضور نے اس عورت کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے شوہر کی اطاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تیرے والد کی مغفرت فرمادی۔ کیا یہ قصہ کسی

حدیث میں ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہے تو اس کا درجہ کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مذکورہ بالا قصہ حدیث کی چند کتابوں میں موجود ہے لیکن اس کے تمام طرق ضعیف ہیں، جبکہ قرآن اوراحادیثِ صحیحہ کثیرہ میں یہ بات موجود ہے کہ بوقتِ ضرورت والدین کی خدمت، عیادت ضروری ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا: **وبالوالدين إحسانا،** پھر **لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق** یعنی خالق کو ناراض کرکے کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے، چنانچہ اللہ اوراس کے رسول کا حکم عدولی کرکے شوہر کوراضی کرنا سمجھ میں نہیں آتا، لہٰذا اس ضعیف حدیث کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں۔

حدیث کی تحقیق درجِ ذیل ملاحظہ کیجئے:

۱۔ أخرج الإمام الطبراني فى الأوسط(۷/۳۳۲،رقم ۷۶۴۸)**قال وبه حدثنا زافرعن ثابت البناني عن أنس بن مالک ﷺ عن النبي صلى الله عليه وسلم أن رجلاً خرج وأمر امرأته أن لاتخرج من بيتها وكان أبوها في أسفل الدار وكانت في أعلاها فمرض أبوها فأرسلت إلى النبي صلى الله عليه وسلم فذكرت له ذلک فقال: أطيعي زوجک، فمات أبوها فأرسلت إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: أطيعي زوجک فأرسل إليها النبي صلى الله عليه وسلم أن الله غفر لأبيها بطاعتها لزوجها.**

إسناده ضعيف جداً؛ في إسناده : ۱) محمد بن موسى أبوعبد الله الاصطخرى ؛ قال الهيثمي لا أعرفه. وقال الحافظ : شيخ مجهول. قال ابن النجار: مجهول. وضعفه الدارقطني . راجع: (إرشاد القاصى والدانى إلى تراجم شيوخ الطبرانى: ۱/۶۲۱،ولسان الميزان: ۷/۵۴۱،ط: دارالبشائر،والفرائدعلى مجموع الزوائد،ص ۲۴۹،ط:الدوحة،قطر).

۲) عصمة بن المتوكل ؛ قال الهيثمي: ضعيف. قال عقيلي: قليل الضبط للحديث ، يهم وهماً . قال الإمام أحمد: لا أعرفه. راجع : (مجمع الزوائد: ۴/۳۱۳/۷۶۶۲،ط: القاهرة، وميزان الاعتدال :۳/۶۸،ط:لبنان،ولسان الميزان:۵/۴۳۹،دارالبشائر).

۳) زافر بن سليمان:ضعيف يعتبر به؛ راجع: (تحريرالتقريب: ۱/۴۰۹،وميزان الاعتدال:۲/۲۵۳).

۲۔ أخرج يحيى بن عبد الحميد عن يوسف بن عطية (متروك) عن ثابت عن أنس بن مالك نحوه . (مسند عبدبن حميد ۱۳۶۹/۱۶/۲) ، قال الشيخ مصطفى العدوى في تعليقاته على المنتخب من مسند عبد بن حميد: ضعيف جداً ، في إسناده: يوسف بن عطية وهو متروك . (المنتخب ،ص ۴۰۴، رقم: ۱۳۶۹).

ـ يوسف بن عطية: قال الذهبي: مجمع على ضعفه. وقال النسائي: متروك . وقال الفلاس: ما علمته كان يكذب، لكنه يهم . وقال البخارى: منكر الحديث. وقال أبوزرعة، وأبوحاتم والدارقطني: ضعيف الحديث. وقال أبوبشر الدولابي: متروك الحديث. (ميزان الاعتدال: ۴۶۸/۴،ط:لبنان، وتهذيب الكمال: ۴۴۶/۳۲،ط: موسسة الرسالة).

خلاصہ یہ ہے کہ نصوصِ کثیرہ معتبرہ جن میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید آئی ہے ان کے مقابلہ میں اس ضعیف اور کمزور حدیث میں مذکورہ قصہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مرتدہ کی عدت میں طلاقِ ثلاثہ کا حکم:

سوال: اگر کوئی عورت مرتد ہوجائے اور نکاح فسخ ہوجائے تو عدت واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اگر شوہر نے دورانِ عدت تین طلاق دیدی تو عورت مغلظہ ہوجائیگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صورتِ مسئولہ میں عورت پر عدت لازم ہے اور عدت ختم ہونے سے پہلے تین طلاق دیدی تو نافذ ہوجائے گی اور عورت مغلظہ ہوجائے گی، لیکن اگر عدت ختم ہونے کے بعد تین طلاق دی تو نافذ نہیں ہوگی کیونکہ عورت اجنبیہ کی طرح بن گئی۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

وأفاد وجوب العدة سواء ارتد أو ارتدت بالحيض أو بالأشهر لو صغيرة أو آيسة أو بوضع الحمل كما فى البحر. (فتاوى الشامى :۱۹۴/۳ ،سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۲۹۵/۴، ط: ممبئی)۔

وقوعِ طلاق سے متعلق علامہ شامیؒ نے محقق ابن ہمامؒ سے نقل فرمایا ہے کہ طلاق واقع ہوجائے گی۔

قال فی الفتح ویقع طلاق زوج المرتدة علیها ما دامت فی العدة لأن الحرمة بالردة غیر متأبد فإنها ترتفع بالإسلام فیقع طلاقه علیها فی العدة مستتبعاً فائدته من حرمتها علیه بعد الثلاث حرمة مغیاة بوطء زوج آخر . (فتاوی الشامی: ۱۹۳/۳، سعید). (وکذا فی فتح القدیر: ۴۲۰/۳، دار الفکر، وحاشیة تبیین الحقائق: ۱۷۴/۲، ط: امدایه).

فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں مرقوم ہے:

اگر بصورتِ ترکِ اسلام اس کی منکوحہ اس پر حرام ہے اور نکاح اس کا فسخ ہوتو ایسی عورت کے لیے عدت شرعی ہے؟ الجواب: عدت واجب ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲۱۴/۱۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

''میری طرف سے تم فری ہو'' کہنے سے طلاق کا حکم:

سوال: ایک شخص کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوا اور غصہ کی حالت میں اس نے اپنی بیوی سے یہ الفاظ کہے: ''میری طرف سے تم فری ہو جہاں پے جانا چاہتی ہو جاؤ'' لیکن اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تین مرتبہ کہا یا ایک مرتبہ کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟ ہوئی تو کتنی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شوہر کے یہ الفاظ کہ میری طرف سے تم فری (Free) ہو جہاں جانا چاہتی ہو جاؤ، طلاق کے بارے میں صریح نہیں، لہٰذا اگر شوہر نے طلاق کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہیں تو ایک طلاقِ بائن واقع ہوگئی اور اگر بلا نیت کہے تھے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

الکنایات لا یقع بها الطلاق إلا بالنیة أو بدلالة الحال، لأنها غیر موضوعة للطلاق بل تحتمله وغیره فلا بد من التعیین أو دلالته ، وهي علی ضربین...وبقیة الکنایات إذا نوی بها الطلاق کانت واحدة بائنة و إن نوی ثلاثاً کانت بثلاث...إلا أن یکون في حال مذاکرة الطلاق فیقع بها الطلاق فی القضاء ولایقع فیما بینه وبین اللّٰه تعالیٰ إلا أن ینویه. (الهدایة: ۳۷۴/۲، باب ایقاع الطلاق ، سعید).

(وکذا فی الدر المختار مع رد المحتار: ۲۹۶/۳، سعید، والفتاوی الهندیة: ۳۷۶/۱).

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مذکور ہے:

آزاد کرنے کا لفظ کہنا صریح طلاق نہیں ہے کنایہ ہے، اگر نیت شوہر کی اس لفظ سے طلاق کی ہے اور حال یہ ہے کہ شوہر بالغ ہے تو اس لفظ سے ایک طلاقِ بائنہ اس کی زوجہ پر واقع ہوگئی۔ (فتاویٰ دارالعلوم: ۹/ ۲۶۸)۔

دوسری جگہ مذکور ہے: جہاں جی چاہے چلی جا، کنایاتِ طلاق سے ہیں، ان میں اگر شوہر کی نیت طلاق کی ہو تو طلاقِ بائنہ واقع ہوتی ہے ورنہ نہیں، پس شوہر سے دریافت کیا جاوے کہ اس نے کس نیت سے یہ الفاظ کہے ہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۹/ ۲۵۹، دارالاشاعت)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ محمودیہ: ۱۲/ ۵۰۰، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

میں شادی شدہ نہیں ہوں، کہنے سے طلاق واقع ہونے کا حکم:

سوال: ایک شادی شدہ مرد ایک عورت کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا اس درمیان اس عورت نے پوچھا آپ شادی شدہ ہیں، اس نے کہا: میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ کیا اِن الفاظ سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ شوہر کے الفاظ: ''میں شادی شدہ نہیں ہوں'' سے طلاق واقع نہیں ہوئی، لیکن ایسے مشتبہ الفاظ استعمال کرنے سے بچنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو المحیط البرہانی میں مذکور ہے:

وذكر الناطفي في طلاق الهداية : إذا قال: مالي امرأة ونوى الطلاق لا يكون طلاقاً عند أبي حنيفةؒ . (المحيط البرهاني: ۳/ ۲۳۶).

وفى الفتاوى الهندية : ولو قال: ما لى امرأة لا يقع وإن نوى وكذا لو قال: علي حجة إن كانت لي امرأة وهذا بالإجماع ذكره الإمام السرخسيؒ في نسخته والشيخ الإمام نجم الدين في شرح الشافي كذا فى الخلاصة . (الفتاوى الهندية: ۱/ ۳۷۵).

وفى التاتارخانية : قال لم يكن بيننا نكاح ، أوقال: لم أتزوجک ، ونوى الطلاق لايقع الطلاق بالإجماع . (الفتاوى التاتارخانية: ۴/ ۴۶۷، مكتبة زكريا).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے: سوال: زید منکوح تھا مگر دوسری جگہ اس نے چند معتبر آدمیوں کے سامنے قسم

کھا کر یہ کہہ دیا کہ میرا نکاح کسی سے نہیں ہوا، اور وہ اپنی بیوی کو اپنے یہاں بلاتا بھی نہیں، نہ اس سے کسی قسم کے تعلقات رکھتا ہے آیا ایسی صورت میں اس کی بیوی مطلقہ ہو چکی یا نہیں؟

جواب: محض اتنا کہنے سے طلاق نہیں ہوئی۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۲/۵۶۱، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کل نسوة علیه حرام ، کہنے سے طلاق کا حکم:

سوال: ایک نوجوان جو غیر شادی شدہ ہے اس نے یہ جملہ کہا : **کل نسوة علی حرام** ، ہر عورت میرے اوپر حرام ہے، کیا محض نکاح کرتے ہی اس کی بیوی مطلقہ ہو جائے گی یا نہیں؟ نیز اس کے لیے نکاح کرنے کا کیا حکم ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مذہبِ احناف میں تحریمِ حلال یمین اور قسم ہوتی ہے لہٰذا جب بھی یہ جوان نکاح کرے گا تو کفارۂ یمین واجب ہوگا، ہاں اگر اس جملہ سے تعلیق طلاق کی نیت کی ہے تو پھر جب نکاح کرے گا تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جائے گی، لیکن اگر کوئی نیت نہیں کی یا محض خبر دینا مقصود تھا تو کلام لغو ہو جائے گا۔

فتاویٰ تاتارخانیہ میں امام قاضی خان اور شیخ الاسلام سے اسی طرح کا فتویٰ نقل کیا گیا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

إذا قال: حلال اللّٰه علی حرام ، أو قال: حلال خدائے بر من حرام إن فعلت کذا… إلی قوله: فهذا کله طلاق بائن، وفی الحجة: لایقع إلا بالنیة ، فبعد ذلک ینظر إن کانت له امرأة وقت الحلف طلقت واحدة بائنة … وإن لم تکن له امرأة وقت الحلف کان یمیناً لأنه تعذر صرفه إلی المرأة فیجعل یمیناً ، لأن تحریم الحلال یمین حتی أن من قال لغیره : حرامست با تو سخن کفتن کان یمیناً حتی لو کلمه تلزمه الکفارة ، فکذا هنا یکون یمیناً فتلزمه الکفارة إذا حنث ، وبه کان یفتی الإمام القاضی الأوزجندی…إلی أن قال: ثم علی قول من یقول بأنه یکون یمیناً إذا لم تکن له امرأة وقت هذه المقالة وإذا عنی التعلیق وقت الیمین فتزوج امرأة تطلق و یصیر تقدیر کلامه : إن تزوجت فهی طالق إن فعلت کذا … هکذا فتوی شمس الإسلام . (الفتاوی التاتارخانیة:۳/۳۰۹).

قال في الهداية : ومن حرم على نفسه شيئاً مما يملكه لم يصر محرماً وعليه إن استباحه كفارة يمين ... و لنا أن اللفظ ينبئ عن إثبات الحرمة و قد أمكن إعماله بثبوت الحرمة لغيره بإثبات موجب اليمين فيصار إليه ثم إذا فعل مما حرمه قليلاً أو كثيراً حنث ووجبت الكفارة وهو المعنى من الاستباحة المذكورة لأن التحريم إذا ثبت تناول كل جزء منه . (الهداية : ۳۲۰/۲). وللمزيد راجع : (فتاوی الشامي: ۷۲۹/۳،سعيد).

ہاں اگر خبر دینا مقصود تھا یا کوئی نیت نہیں کی تھی تو کلام لغو ہو جائے گا۔ملاحظہ ہو علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں: وإن أراد الإخبار أو لم يرد شيئاً لا تجب الكفارة لأنه أمكن تصحيحه إخباراً والمنقول فيه خلاف بين أبي يوسفؒ وأبي حنيفةؒ عند أحدهما يحنث مطلقاً وعند الآخر لا يحنث من غير نظر إلى نية . (فتح القدير: ۸۸/۵،دار الفكر).

وفي فتاوى الشامي : وفي الفتح: وإن أراد الإخبار أو لم يرد شيئاً لا تجب الكفارة لأنه أمكن تصحيحه إخباراً . (فتاوی الشامي:۷۲۹/۳، سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

اپنی مرضی سے صحبت کروں تو تو میری ماں کی طرح حرام ہے، کہنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنی بیوی سے یہ الفاظ کہے: اگر میں اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ صحبت کرنے کے لیے آؤں تو تو میری ماں کی طرح حرام ہے، اگر تو اپنی مرضی سے آئے تو کوئی بات نہیں ہے، اِن الفاظ سے ظہار ہوا یا طلاق؟ اگر طلاق ہوئی تو کب اور کونسی؟ مفصل ومدلل بیان کریں۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ شوہر کے مذکورہ بالا الفاظ ''تو میری ماں کی طرح حرام ہے'' ظہار، طلاق اور ایلاء تینوں کا احتمال رکھتے ہیں، لیکن جب طلاق کی نیت نہ ہو تو حرفِ تشبیہ کی وجہ سے ظہار پر محمول کریں گے، چنانچہ جب شخص مذکور اپنی مرضی سے صحبت کرنے آئیگا تو ظہار ثابت ہو جائے گا، اور اس کا حکم یہ ہے کہ غلام آزاد کرے، اگر دستیاب نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے، اور اگر روزوں پر قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلائے۔ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مذکور ہے:

ولو قال أنت على حرام ،كأمي حمل على نيته ،لأنه إذا ذكر مع التشبيه التحريم لم يحتمل معنى الكرامة فتعين التحريم ، وهو يحتمل تحريم الظهار ويحتمل تحريم الطلاق والإيلاء فيرجع إلى نيته فإن لم تكن له نية يكون ظهاراً ، لأن حرف التشبيه يختص بالظهار فمطلق التحريم يحمل عليه . (بدائع الصنائع: ۱۹۲/۸ ،سعيد).

قال في المحيط البرهاني: ولوقال لها:أنت علي حرام كأمي، فإن نوى الطلاق كان طلاقاً ، وإن نوى الظهار أونوى التحريم لا غير أو لم تكن نية فهو ظهار، لأن معنى البر انتفى بقرائن التحريم بحرف التشبيه ، فبقي احتمال الظهار والطلاق، فأى ذلک ينوى صحت نيته، وعند عدم النية يحمل على الظهار؛لأنه أدنى . (المحيط البرهاني:۲۷/۴،داراحياء التراث العربى). **وينظرللمزيد:** (العناية رح الهداية:۲۵۳/۴،دارالفكر، وتبيين الحقائق:۵/۳،ط:القاهرة).

مجموعہ قوانین اسلامی میں ہے:

ظہار سے طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، البتہ جب تک کفارہ ظہار نہ ادا کیا جائے بیوی سے صحبت اور بوس کنار حرام ہے۔ کفارۂ ظہار دو ماہ مسلسل روزے رکھنا ہے اس طور پر کہ ان میں رمضان کے روزے اور وہ پانچ دن شامل نہ ہوں جن میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر کفارہ کے روزوں کے درمیان رمضان مبارک شروع ہوجائے یا دس ذی الحجہ کی تاریخ آ گئی تو از سر نو دو ماہ کے روزے رکھنے پڑیں گے، اور جو شخص روزے پر قادر نہ ہو اس کے لیے کفارہ ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت متوسط درجہ کا پیٹ بھر کر کھانا کھلانا یا ساٹھ مسکینوں میں سے ہر ایک کو نصف صاع گیہوں یا اس کی قیمت دینا ہے۔ (مجموعہ قوانین اسلامی، ص ۱۶۳)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاوی الشامی:۴۷۳/۳،سعید، وتحفۃ الفقہاء:۲۱۴/۲، دار الکتب العلمیۃ، کتاب المسائل:۳۳۲/۵)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

باب......﴿۹﴾

وقف سے متعلق متفرق مسائل:

چندہ میں مدد کرنے والے کو چندہ کی رقم سے انعام دینے کا حکم:

سوال: مدرسہ میں چندہ وغیرہ میں مدد کرنے والے شخص کو مدرسہ کی مد سے ہدیہ دینا کیسا ہے؟ یعنی کسی گاؤں میں چندہ کے لیے جائے اور وہاں کوئی پہچان والا شخص مدرسہ کے سفیر کو ساتھ لے کر چندہ کرادے تو چندہ میں سے اس کو کچھ ہدیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ تا کہ آئندہ کے لیے ترغیب ہو اور چندہ میں مدد مل جائے۔

الجواب: مدرسہ کی رقم اپنی ذاتی ملک نہیں، ہدیہ اور تحفہ اپنی ذاتی ملکیت سے دیا جاتا ہے، ہاں جو حضرات مدرسہ کے معاون ہیں اور چندہ کے حصول میں مدد کرتے ہیں تو ان کو بطورِ ہدیہ کچھ دینے کی گنجائش ہے۔

قال فی الشامية : والحاصل أن الوجه يقتضی أن ما كان قريباً من العمارة يلحق بها فی التقديم علی بقية المستحقين...فيقدم أولاً العمارة الضرورية ثم الأهم فالأهم من المصالح والشعائر بقدر ما يقوم به الحال فإن فضل شيء يعطی لبقية المستحقين إذ لا شک أن مراد الواقف انتظام حال مسجده أومدرسته لا مجرد انتفاع أهل الوقف...إنما هو فيما إذا لم يكن الوقف معيناً علی جماعة معلومين كالمسجد والمدرسة إما لو كان معيناً كالدار الموقوفة علی الذرية أو الفقراء فإنه بعد العمارة يصرف الريع إلی ما عينه الواقف بلا تقديم لأحد علی أحد ، فاغتنم هذا التحرير. (فتاوی الشامی: ۳۶۸/۴،سعید).

وقال أيضا: لكن أفتی فی الخيرية : بأنه إذا كان في ريع الوقف عوائد قديمة معهودة يتناولها الناظر بسعيه له طلبها لقول الأشباه عن إجارات الظهيرية والمعروف عرفاً

كالمشروط شرطاً فهو صريح في استحقاقه ما جرت به العادة . (فتاوى الشامي: ۴/ ۴۵۰، سعيد).

ملاحظہ ہو فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

اگر چندہ دہندگان نے مصرف کی تعیین کردی ہے تو اسی مصرف پر چندہ صرف کیا جائے گا، اس کے خلاف نہ کیا جائے اگر مصرف کی تعیین نہیں کی، بلکہ مہتمم کو مصالح مدرسہ میں صرف کرنے کا کلی اختیار دیدیا ہے تو پھر ہر مصلحت میں صرف کرنا درست ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۵/ ۴۶۶، جامعہ فاروقیہ)۔

امداد الفتاویٰ میں مذکور ہے: سوال کا ماحصل یہ ہے کہ ایک تختہ پر مدرسہ کا نام لکھ معلق کیا ہے، بعض کی رائے یہ ہے اس کا خرچہ مدرسہ کے مال سے نہیں دینا چاہیے، کیونکہ یہ کام مدرسہ کا نہیں ہے؟

فقہاء نے ایک قاعدہ لکھا ہے کہ مسجد کا نقش ونگار مالِ وقف سے جائز نہیں لیکن استحکام جائز ہے پس اسی نظیر پر صورتِ مسئولہ کا حکم یہ ہے کہ اگر اس تختہ کی تعلیق سے مدرسہ کو کوئی بین نفع ہو تو مالِ مدرسہ کا لگانا اس میں جائز ہے اور اگر کوئی معتد بہ مصلحت نہیں ہے محض احتمال ہی کا درجہ ہے تو اپنے پاس سے اس کے دام دینا چاہیے۔ (امداد الفتاویٰ: ۲/ ۵۹۴، ط: کراچی)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۱۵۲، مکتبہ احسان دیوبند، وفتاویٰ قاسمیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کتب خانہ کی کتابیں مطالعہ کے لیے گھر لے جانے کا حکم:

سوال: ایک کتب خانہ ہے جس میں لوگ مطالعہ کے لیے آتے ہیں، بعض لوگ مطالعہ کے لیے کتابیں گھر پر لے جانا چاہتے ہیں، تو کیا شرعاً کتب خانہ کی کتابیں مطالعہ کے لیے گھر پر لے جانے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ واقفین کی شرائط کا لحاظ رکھا جائے گا، اگر واقفین نے کتابوں کے باہر لے جانے کی اجازت نہیں دی تو متولی اور نگران اجازت نہیں دے گا اور اگر واقفین نے اجازت دی ہے تو متولی اور نگران کی اجازت سے گھر پر لے جانا جائز ہوگا، ہاں مطالعہ کے بعد واپسی ضروری ہوگی، نیز اگر کوئی تعدی ہوئی تو لے جانے والے ضامن ہوں گے۔ ملاحظہ ہو علامہ علاء الدین حصکفیؒ درمختار میں فرماتے ہیں:

قولهم شرط الواقف كنص الشارع أى فى المفهوم والدلالة ووجوب العمل به ...

وفي رد المحتار: قوله ففي جواز النقل تردد ، الذی تحصل من كلامه أنه إذا وقف كتباً وعين موضعها فإن وقفها على أهل ذلك الموضع لم يجز نقلها منه لا لهم ولا لغيرهم وظاهره أنه لايحل لغيرهم الانتفاع بها وأن وقفها على طلبة العلم فلكل طالب الانتفاع بها في محلها وأما نقلها منه ففيه تردد ناشئ مما قدمه عن الخلاصة من حكاية القولين من أنه لو وقف المصحف على المسجد أی بلا تعينن أهله قيل يقرأ فيه أی يختص بأهله المترددين إليه وقيل لايختص به أی فيجوز نقله إلى غيره وقد علمت تقوية القول الأول بما مر عن القنية وبقى ما لو عمم الواقف بأن وقفه على طلبة العلم لكنه شرط أن لايخرج من المسجد أو المدرسة كما هو العادة وقدمنا عند قوله: ولا يرهن عن الأشباه أنه لو شرط أن لايخرج إلا برهن لايبعد وجوب اتباع شرطه وحمل الرهن على المعنى اللغوی تبعاً لما قاله السبكی ويؤيده ما قدمناه قبيل قوله والملك يزول عن الفتح من قوله إن شرائط الواقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله أن يجعل ماله حيث شاء ما لم يكن معصية وله أن يختص صنفاً من الفقراء...إن قولهم شرط الواقف كنص الشارع أی فی المفهوم والدلالة ووجوب العمل به ، قلت لكن لايخفى أن هذا إذا علم أن الواقف نفسه شرط ذلك حقيقة أما مجرد كتابة ذلك على ظهر الكتب كما هو العادة فلا يثبت به الشرط وقد أخبرنی بعض قوام مدرسة إن واقفها كتب ذلك ليجعل حيلة لمنع إعارة من يخشى منه الضياع ، والله سبحانه أعلم . (فتاوی الشامی: ۳۶۶/۴،سعيد).

امداد الاحکام میں مذکور ہے:

الجواب: اس کتب خانہ سے مدرسین وطلبہ کو اسی شہر میں جس میں یہ کتب خانہ ہے کتب مستعار دینا جائز ہے اور شہر سے باہر بھیجنا جائز نہیں اور جو کتابیں خراب و بوسیدہ واپس آئیں یا ضائع ہو جائیں ان کے متعلق اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مستعیر نے قصداً کتاب کو خراب کیا یا حفاظت نہیں کی تو اس کا ضمان مستعیر پر ہے اور اگر اس نے قصداً ایسا نہیں کیا بلکہ بدون اس کے فعل کے اتفاقاً ایسا ہو گیا تو مستعیر پر ضمان نہیں۔ قال في الدر: وبه عرف حكم نقل كتب الأوقاف من محلها للانتفاع لها والفقهاء بذلك مبتلون فإن وقفها على

مستحقي وقفه لم يجز نقلها وإن على طلبة العلم وجعل مقرها في خزانته التي في مكان كذا ففي جواز النقل تردد، نهر. (الدرالمختار: ۳۶۶/۴،سعيد).

قلت: والنقل منه في هذه البلدة ليس من النقل عرفاً فإن أهل المدارس يعيرون الكتب لطلبة العلم وسكونتهم فى البلدة فى أمكنة شتى ولا ينكره الواقفون ولا أحد من العلماء وأيضاً لايحصل الانتفاع بدونه فإن اجتماعهم فى المكتبة بأسرهم متعذر والنقل عن البلدة لايخلو عن خطرالضياع عادة فيمتنع إلا أن يكون الناقل من مدرس هذه المدرسة أو متولي المكتبة وهو على عزم الرجوع إلى هذة البلدة ففيه مندرجة فى الجملة . والله أعلم. (امدادالاحکام:۱۰۳/۳،کراچی)۔

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

دوسرے مدرسے میں پڑھنے والا قابل اطمینان ہوکہ کتابیں واپس کردے گا تو اس کو استفادہ کے لیے دینا بھی درست ہے۔(فتاویٰ محمودیہ:۴۷۵/۱۵،جامعہ فاروقیہ)۔واللہ ﷻ اعلم۔

کتب خانہ کے قدیم نسخے فروخت کر کے ضروری کتابیں خریدنے کا حکم:

سوال: ایک مدرسہ کے کتب خانہ میں درسی اور غیر درسی کتابوں کے متعدد نسخے موجود ہیں، جن کی مدرسہ کو نہ فی الحال ضرورت ہے اور نہ آئندہ ضرورت کا امکان ہے، تو کیا ایسے قدیم نسخے فروخت کر کے ان کے عوض دیگر ضروری کتب کا خریدنا جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مدرسہ کے عمومی کتب خانہ میں آمدہ کتب تین قسم کی ہوتی ہیں:۱۔مدرسہ کی خریدی ہوئی کتب جو وقف نہ ہوں۔۲۔مدرسہ کی خریدی ہوئی کتب جو وقف کردی گئی ہوں۔۳۔باہر سے آمدہ کتب جو عام طور پر وقف ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اگر مدرسہ کو ان کتب کی فی الحال یا آئندہ ضرورت نہیں ہے تو ان کو مناسب قیمت میں فروخت کر کے ان کے عوض ضروری کتابیں خریدنا جائز اور درست ہے۔

قال في قانون العدل والإنصاف: إنما يجوز بيع الوقف بثمنه ما يكون وقفاً بدلاً عنه إذا شرط الواقف استبداله...أو سوغت الضرورة والمصلحة للقاضى بيعه والاستبدال به .

(قانون العدل والانصاف،ص ۴۲،مؤسسة الريان).

وفيـه أيضـاً : النقود المتحصلة من بيع الوقف الجائز بيعه حكماً للاستبدال به تكون وقفـاً بمنزلة العين الأصلية فلا يملكها الواقف ولا تصرف على المستحقين بل يشترى بها بدل . (قانون العدل والانصاف،ص ۱۰۳).

البحر الرائق میں مذکور ہے:

والـحـاصل أن الموقوف عليه السكنى إذا امتنع من العمارة ولم يوجد مستاجر باعها القاضي واشترى بثمنها ما يكون وقفاً . (البحر الرائق: ۲۱۹/۵،کوئٹه).

وقـال الـعـلامة الشـامـي في حـاشية البـحـر الرائق: وقد روى عن محمدؒ إذا ضعفت الأرض الـمـوقـوفة عـن الاستبـدال والـقيـم يـجـد بثـمنها أخرى أكثر ريعاً كان له أن يبيعها ويشتري بثمنها ما هو أكثر ريعاً . (منحة الخالق :۲۱۹/۵،کوئٹه).

وفـي البـحـر أيـضـاً: فعلى هذا يباع النقض في موضعين عند تعذر عوده وعند خوف هـلاكه والمراد ما انهدم من الوقف فلو انهدم الوقف كله ، فقد سئل عنه قارئ الهداية بقوله سئل عن وقف تهدم ولم يكن له شيء يعمر منه ولا أمكن إجارته ولا تعميره هل تباع أنقاضه مـن حـجـر وطـوب وخشـب؟ أجاب إن كان الأمر كذلک صح بيعه بأمر الحاكم ويشترى بثمنه وقف مكانه . (البحر الرائق:۲۲۰/۵،کوئٹه).

جدید فقہی مباحث میں مرقوم ہے:

شمس الائمہ سرخسیؒ نے جواز کا فتویٰ دیا ہے نیز بعضوں نے مثلاً امام ظہیرالدینؒ نے جواز کا فتویٰ دیکر رجوع فرمالیا ہے،مشائخ میں سے بعض لوگ جواز کا فتویٰ اس وقت دیتے ہیں جب کہ شئ موقوفہ سے انتفاع بالکل ختم ہوجائے ،بعض کے نزدیک منفعت من کل الوجوہ معطل ہوجائے یا منفعت کم ہوجائے ،بہر دونوع استبدال جائز ہے،حضرت امام محمدؒ سے روایات دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ منفعت کی کمی کی صورت میں متولی کو اس بیع کا اختیار ہے،لیکن بتامہا تعطل کی صورت میں قاضی کو اختیار ہے،صاحبِ قنیہ نے بھی جواز ہی کا فتویٰ دیا ہے ۔۔۔بہر کیف صورتِ مسئولہ میں ازدیادِ منفعت کی خاطر اوقاف کو فروخت کیا جاسکتا ہے،جیسا کہ ائمہ کی عبارات

مؤید ہیں۔(جدید فقہی مباحث:۱۲/ ۳۰۵، ط: ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ)۔

مساجد و مدارس کی شخصی ملکیت سے متعلق تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۴/ ۶۶۰، ط: زمزم)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

غیر مسلم کے وقف کرنے اور مسجد میں تعاون کرنے کا حکم:

سوال: کیا غیر مسلم کا وقف صحیح ہے یا نہیں؟ اگر کوئی غیر مسلم مسجد میں مالی تعاون کرنا چاہے تو قبول کرسکتے ہیں یا نہیں؟ کیا کسی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم کا تعاون قبول کیا تھا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ غیر مسلم کا وقف صحیح ہے جبکہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں اس کو کارِ خیر اور ثواب سمجھتے ہو، نیز غیر مسلم کے وقف میں کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، اِسی طرح مسجد میں تعاون قبول کرنا بھی درست ہے جبکہ آئندہ چل کر مسجد پر کسی قسم کے تسلط یا فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، قربت اور طاعت سمجھ کر تعاون کررہا ہو۔

ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

إن شرط الوقف أن يكون قربة عندنا وعندهم ...(فتاوى الشامي: ۴/ ۳۴۱،سعيد).

الإسعاف في حكم الأوقاف میں علامہ طرابلسیؒ فرماتے ہیں:

الأصل في هذا الباب أن ما كان وقفه أوالوقف عليه قربة عندنا وعندهم يصح وقفه والوقف عليه وما كان قربة عندنا فقط أوعندهم فقط لايصح وقفه ولا الوقف عليه . (اسلام کا نظامِ اوقاف، ص۲۰۳)۔

اسلام کا نظامِ اوقاف میں مرقوم ہے:

غیر مسلم بیت المقدس کی تعمیر یا اسکی ضروریات پوری کرنے کے لیے وقف کریں تو یہ وقف درست ہوگا، کیونکہ بیت المقدس کی تعمیر اور اس کی ضروریات پر خرچ کرنا مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے نزدیک باعثِ قربت ہے، یہی حکم فقراء، مساکین، یتامی، مسافر خانوں وغیرہ کا ہوگا۔ (اسلام کا نظامِ اوقاف، ص۲۰۳)۔

احکام الاوقاف میں مذکور ہے:

قلت: فإن قال: (أهل الذمة) تكون غلة هذا الوقف في ثمن الزيت والإسراج في بيت المقدس، قال: هذا جائزمن قبل أن أهل الذمة يتقربون بذلك وهوعندالمسلمين قربة

أيضاً ، قلت: فإن قال في كتاب صدقته يشترى بما يستغل من هذه الصدقة بعد النفقة عليها عبيد فيعتقون عني في كل سنة أو قال في بعض ذلک؟ قال: هذا كله جائز. (احکام الاوقاف ، ص ۲۹۰).

وقال في الشامية: بخلاف الوقف على حج وعمرة فإنه قربة عندنا فقط . (ردالمحتار: ۴/ ۳۴۱،سعید).

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کامختلف دینی امور میں غیرمسلم کا تعاون قبول فرمانایااس کی اجازت دینامختلف احادیث سے ثابت ہے، چنانچہ بیت اللہ شریف اور مسجدِحرام پرقریش کاخرچ کرنااورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کااس کو برقرار رکھنامسلم شریف کی روایت میں ہے: عن عائشة قالت: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الجدر امن البيت هو قال؛ نعم، فلم لم يدخلوه فى البيت قال: إن قومک قصرت بهم النفقة قلت فما شأن بابه مرتفعاً قال؛ فعل ذلک قومک ليدخلوا من شاؤوا ويمنعوا من شاؤوا، ولولا أن قومک حديث عهدهم فى الجاهلية فأخاف أن تنكر قلوبهم لنظرت أن أدخل الجدر فى البيت وأن ألزق بابه بالأرض . (رواه مسلم ،رقم : ۱۳۳۳ ،باب جدرالكعبة وبابها).

امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں باب قائم فرمایاہے: باب قبول الهدية من المشركين ، وقال أبوهريرة رضی اللہ عنہ عن النبي صلى الله عليه وسلم هاجر إبراهيم عليه السلام بسارة فدخل قرية فيها ملک أو جبار فقال: أعطوها آجر وأهديت للنبي صلى الله عليه وسلم شاة فيها سم ، وقال أبوحميد : أهدى ملک أيلة للنبي صلى الله عليه وسلم بغلة وكساه برداً وكتب له ببحرهم. حدثنا عبد الله بن محمد حدثنا يونس بن محمد حدثنا شيبان عن قتادة حدثنا أنس رضی اللہ عنہ قال: أهدى للنبي صلى الله عليه وسلم جبة سندس وكان ينهى عن الحرير فعجب الناس منها فقال: والذى نفس محمد بيده لمناديل سعد بن معاذ فى الجنة أحسن من هذا. وقال سعيد عن قتادة عن أنس رضی اللہ عنہ إن أكيدر دومة أهدى إلى النبي صلى الله عليه وسلم . (صحيح البخارى : ۱/ ۳۵۶).

مسلم شریف میں روایت مذکور ہے:

عن ابن شهاب قال: أخبرني عروة بن الزبير أن حكيم بن حزام أخبره أنه قال لرسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: أى رسول الله صلى الله عليه وسلم أرأيت أموراً كنت أتحنث بها فى الجاهلية من صدقة أوعتاقة أوصلة رحم أفيها أجر فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أسلمت على ما أسلفت من خير. (التحنث :التعبد).(صحيح مسلم ،رقم ۱۲۳ ،باب بيان حكم عمل الكافر إذا أسلم بعده). واللہ ﷻ اعلم۔

اپنی ملک سے علیحدہ کیے بغیر فقط زبانی وقف کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے اپنی زمین کا مخصوص حصہ مسجد ومدرسہ بنانے کے لیے وقف کیا، یہ وقف زبانی ہے، کوئی تحریر نہیں ہے، اس پر تعمیر نہیں کرائی۔ کیا یہ وقف صحیح ہوا یا نہیں؟ کیا مسجد ومدرسہ کی زمین الگ کیے بغیر وقف مکمل ہوا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ زبانی وقف صحیح ہے، وقف کے صحیح ہونے لیے تحریر ضروری نہیں ہے، ہاں مسجد کا وقف اس وقت صحیح ہوگا جب الگ کردے اور جب الگ نہیں کیا تو مسجد کا وقف صحیح نہیں ہوا، البتہ مدرسہ کا وقف صحیح ہوگیا۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

وإذا بنى مسجداً لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن للناس بالصلاة فيه فإذا صلى فيه واحد زال عند أبي حنيفةؒ عن ملكه...وقال أبويوسفؒ: يزول ملكه بقوله: جعلت مسجداً لأن التسليم عنده ليس بشرط لأنه إسقاط لملك العبد فيصير خالصاً للّٰه تعالىٰ بسقوط حق العبد وصار كالإعتاق. (الهداية: ۱۹/۳ ،المكتبة الاسلامية).

مسجد اور قبرستان کے علاوہ میں بالاتفاق زبانی وقف صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مرقوم ہے:

والحاصل أن وقف المشاع مسجداً أو مقبرة غير جائز مطلقاً وفي غيرهما إن كان مما لايحتمل القسمة جاز اتفاقاً، والخلاف فيما يحتملها ومن أخذ بقول محمد فى القبض وهم مشائخ بخارى أخذ بقوله في وقف المشاع وصرح فى الخلاصة من الإجارة والوقف بأن الفتوى على قول محمدؒ في وقف المشاع وكذا فى البزازية والولوالجية وشرح المجمع لابن الملك وفى التجنيس وبقوله يفتى، وتبعه فى غاية البيان. (البحرالرائق:

۵/۲۱۳، کوئٹہ).

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مسجد میں بھی زبانی وقف صحیح ہے، اور اکثر مشائخ نے امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ثم إن أبايوسفؒ يقول: يصير وقفاً بمجرد القول لأنه بمنزلة الإعتاق عنده وعليه الفتوىٰ . (فتاوى الشامي: ۴/۳۳۸، سعيد). (وكذا في الجوهرة: ۳/۲۹۱، ط: موقع الاسلام).

وقال في البحر الرائق: وفي شرح المجمع: أكثر فقهاء الأمصار أخذوا بقول أبي يوسف في خروجه بمجرد اللفظ وهم مشايخ بلخ أخذ بقوله في هذه ومن أخذ بقول محمد والفتوى عليه، وفي فتح القدير: وقول أبي يوسفؒ أوجه عند المحققين وفي المنية الفتوى على قول أبي يوسفؒ وهذا قول مشايخ بلخ...وفي المبسوط: كان القاضي أبوعاصم يقول قول أبي يوسفؒ من حيث المعنى أقوى...فالحاصل أن الترجيح قد اختلف والأخذ بقول أبي يوسفؒ أحوط وأسهل ولذا قال في المحيط ومشايخنا أخذوا بقول أبي يوسفؒ ترغيباً للناس في الوقف . (البحر الرائق: ۵/۲۱۲، دار المعرفة).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

وقف صحیح ہونے کے لیے رجسٹری ہونا شرط نہیں؛ زبانی وقف بھی درست اور کافی ہے اور ایسی صورت میں نماز اس مسجد میں درست ہے اور جمعہ بھی درست ہے بشرطیکہ شرائطِ جمعہ اس آبادی میں موجود ہوں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۴/۲۶۸، جامعہ فاروقیہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسجد بنا کر وقف کر دے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک زبانی وقف صحیح ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

باب......﴿۱۰﴾

تجارت سے متعلق متفرق مسائل کا بیان

نشہ آور پاؤڈر (Beer powder) کی تجارت کا حکم:

سوال: ایک قسم کا پاؤڈر ملتا ہے جس کو بیئر پاؤڈر (Beer powder) کہا جاتا ہے، اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو پانی میں ڈال کر چوبیس گھنٹے رکھا جاتا ہے، پھر وہ پاؤڈر نشہ آور شراب میں تبدیل ہو جاتا ہے، کیا اس کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ چونکہ اِس پاؤڈر کا غالب استعمال شراب میں ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی تجارت سے بالکل بچنا چاہیے، ہاں اشربہ اربعہ محرمہ (انگور کی کچی شراب، انگور کی پختہ شراب، کھجور کی شراب اور زبیب کی شراب) کی تجارت حرام ہے باقی منشیات کی تجارت حرام نہیں بلکہ مکروہِ تحریمی اور ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں مرقوم ہے:

قال فی الدرالمختار: وصح بيع غير الخمر ومفاده صحة بيع الحشيشة والأفيون. قوله وصح بيع غير الخمر أى عنده خلافاً لهما فى البيع والضمان لكن الفتوى على قوله فى البيع وعلى قولهما فى الضمان إن قصد المتلف الحسبة وذلك يعرف بالقرائن وإلا فعلى قوله كما فى التتارخانية وغيرها، ثم إن البيع وإن صح لكنه يكره كما فى الغاية. (فتاوى الشامى: ۶/۴۵۴، سعيد).

وفيه أيضاً: وجاز بيع عصير...ممن يعلم أنه يتخذه خمراً لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغيره وقيل: يكره لإعانته على المعصية. (فتاوى الشامى: ۶/۳۹۱، سعيد).

(وكذافي البحر الرائق: ۸/ ۲۳۰،دار المعرفة ،و تبيين الحقائق: ۶/ ۲۸،ط:امدايه).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں مذکور ہے:

بیع کے بارے میں یہ اصول ہے کہ جس شئ کا کوئی جائز استعمال ہو اس کی بیع جائز ہے چاہے وہ چیز عام طور سے ناجائز کام میں استعمال ہوتی ہو، یعنی اب یہ مشتری کا کام ہے کہ اس کو جائز مقصد کے لیے استعمال کرے (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۴/ ۱۷)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے: گانجہ، بھنگ، افیون کی تجارت مکروہِ تحریمی ہے، لیکن اگر کسی نے کرلیا تو صحیح ہو جائے گی۔ (فتاویٰ محمودیہ:۱۶/ ۱۲۱، جامعہ فاروقیہ)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

جواخانہ (casino) میں حساب کتاب کی ملازمت کرنے کا حکم:

سوال: میں ایک حساب داں (Accountant) ہوں، مختلف کمپنیاں مجھے اجرت پر بلاتی ہے، اس وقت مجھے ایک جوا کی کمپنی نے حساب کتاب کے لیے بلایا ہے، کیا میں ان کے لیے حساب کتاب کی ملازمت کرسکتا ہوں؟ کیا میرے لیے یہ تنخواہ جائز ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے جوا، قمار کو حرام قرار دیا ہے، لہٰذا اس کا حساب کتاب کرنا اس میں تعاون کرنا ہے اور معصیت میں تعاون ناجائز ہے، بنابریں ایسی ملازمت سے اجتناب کرنا چاہیے اور اس کی تنخواہ لینا بھی ناجائز اور گناہ ہے۔ ملاحظہ ہو قرآنِ کریم میں ہے: ﴿و لا تعاونوا بالإثم والعدوان﴾ [المائدة: ۲]۔

نیز حدیث شریف میں سودی حساب کتاب رکھنے والے کو سود کے گناہ میں شریک کیا گیا ہے اسی طرح جوا کا حساب کتاب رکھنے والا بھی جوا کے گناہ میں شریک ہوگا۔ ملاحظہ ہو مسلم شریف میں ہے:

عن جابر رضي الله عنه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء. (رواه مسلم ، رقم: ۱۵۹۸ ،باب لعن آكل الربا وموكله).

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، حساب کتاب رکھنے والے اور ان کے گواہوں پر لعنت فرمائی، اور فرمایا کہ سود کے وبال میں یہ سب برابر کے شریک ہیں۔

علامہ عبدالرؤوف المناویؒ نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا ہے:

استحقاق الثلاثة اللعن من حيث أن كلا منهم راض به ومعين عليه . (التيسير بشرح الجامع الصغير: ۲/ ۱۵۷، ط: الرياض).

امام نوویؒ فرماتے ہیں باطل کی اعانت گناہ اور ناجائز ہے: **قال: هذا تصريح بتحريم كتابة المبايعة بين المترابيين والشهادة عليهما وفيه تحريم الإعانة على الباطل والله أعلم.** (شرح صحيح مسلم: ۱۱/ ۲۶، ط: بيروت).

کفایت المفتی میں مذکور ہے: جواب: ہاں! یہ حدیث صحیح ہے اور اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ سود لینے والا، دینے والا، گواہ اور کاتب سب گناہ میں شریک ہیں۔ (کفایت المفتی: ۱۱/ ۲۰۸، جامعہ فاروقیہ)۔

قاموس الفقہ میں مذکور ہے:

جس طرح خودکسی ناجائز اور خلافِ شرع کام کرنا درست نہیں اسی طرح ایسے کاموں میں ملازمت اور تعاون بھی درست نہیں... اس لیے بینک، انشورنس، شراب خانوں، قحبہ خانوں کی ایسی ملازمت جائز نہیں ہوگی جس میں آدمی سود، قمار، شراب یا قحبہ کے کاروبار کا ذریعہ بنے، اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے، سود کا حساب و کتاب لکھے، ہاں چپراسی وغیرہ کی ملازمت کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کا براہِ راست اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ (قاموس الفقہ: ۱/ ۵۰۰)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

کونسائمنٹ سیل (consignment sale) کا حکم:

سوال: ایک تجارت کونسائمنٹ سیل کی بنیاد پر چلتی ہے، اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ عام بیع کے ساتھ کمپنی چند خریدار کو یہ اختیار دیتی ہے کہ جو سامان خریدنے کے بعد نہ بیچ سکے تو وہ مال کمپنی کو دوبارہ واپس کرسکتے ہیں، یہ کمپنی کے لیے مال کا واپس کرنا اقالہ کے ماتحت شمار ہوتا ہے، کیا شریعت میں اس قسم کی بیع کی گنجائش ہوسکتی ہے؟ یا یہ بیع وشرط میں داخل ہوکر ناجائز ہوگی؟ آج کل دنیا میں اکثر بڑی کمپنیاں اس میں مبتلا ہیں، اور اس کی وجہ سے خریدار زیادہ مائل ہوتے ہیں، بہت سارے مسلمان تجار نے بھی یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اِس معاملہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بیع میں واپسی کی شرط نہ لگائے بلکہ عقدِ بیع کے بعد وعدہ کرلے اور کاغذات میں بھی درج کردیا جائے، تو اس قسم کا معاملہ صحیح اور درست ہوگا، اور یہ شرط وعدہ کے درجہ میں ہوگی۔

اس کی نظیر بیع بالوفا ہے اس میں اقالہ یقینی ہے اور بہت سارے علماء نے اس بیع کے جواز کا فتویٰ دیا ہے جس کی تفصیل فتاویٰ دارالعلوم زکریا (جلد ۵)، میں دیکھی جاسکتی ہے، اس کی روشنی میں اوپر والی صورت بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی جبکہ اس میں اقالہ کا احتمال ہے یقینی نہیں ہے۔

بیع بالوفاء کے بارے میں شرح النقایہ میں لکھا ہے، ملاحظہ ہو:

وإن ذكر البيع من شرط ثم ذكر الشرط على وجه الميعاد جاز البيع و يلزمه الوفاء بالميعاد لأن المواعيد قد تكون لازمة ، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: العدة دين فيجعل هذا الميعاد لازماً لحاجة الناس إليه . (شرح النقاية :۲۵۳/۳،ط:بيروت).

وقال في تبيين الحقائق: وإن ذكر البيع من غير شرط ثم ذكرا الشرط على الوجه المعتاد جاز البيع و يلزمه الوفاء بالميعاد لأن المواعيد قد تكون لازمة قال عليه الصلاة والسلام : العدة دين . فيجعل هذا الميعاد لازماً لحاجة الناس إليه. وقال جلال الدين في حواشي الهداية : صورته أن يقول البائع للمشتري بعت منك هذا العين بألف على أني لو دفعت إليك ثمنك تدفع العين إلى ثم قال: ويسمى هذا بيع الوفاء . (تبيين الحقائق: ۱۸۴/۵،ط:امداديه). (وكذا في فتاوى قاضيخان: ۱۶۵/۲، ومجمع الضمانات: ۱/۵۳۰، وفتح القدير: ۴۴۵/۶، ط: دار الفكر، والعناية شرح الهداية بهامش فتح القدير: ۴۴۴/۶).

امدادالاحکام میں مذکور ہے:

اور بیع بالوفا کی ایک صورت یہ ہے کہ ایجاب وقبول بیع وشراء کا ہو اور ایجاب وقبول میں کوئی شرط واپسی وغیرہ کی نہ ہو بلکہ بعد ایجاب وقبول کے شرط ردو غیرہ کی کی جاوے، یہ بالاتفاق جائز ہے لخلو العقد عن الشرط اور جب زبانی ایجاب وقبول میں متصلاً شرط نہ ہوتو بیعنامہ میں متصلاً شرط لکھنے سے حرمت نہ آئے گی، **لأن الأصل في العقود القول والكتابة وثيقة ، والله تعالىٰ أعلم۔** (امدادالاحکام:۳/۴۳۵،کراچی)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

چونکہ بیع بالشرط کے ناجائز ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے چنانچہ امام شافعیؒ کے نزدیک بعض صورتوں میں بیع بالشرط جائز ہے اور ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ بیع بالشرط جائز ہے اس لیے فقہاء

متاخرین نے ضرورت کی وجہ سے بیع بالوفا کو جائز کردیا ہے۔(امدادالاحکام:۴۲۹/۳، کراچی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کلیرنگ ایجنٹ(clearing agent) کا حکم:

سوال: کیا کلیرنگ ایجنٹ کا کام کرنا جائز ہے اوراس پر ملنے والی رقم کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ کلیرنگ ایجنٹ کا مطلب یہ ہے ملک میں درآمدات کی کاغذاتی کاروائی وغیرہ کرنا، نیز اگر یہ ایجنٹ بندرگاہ کے منتظمین کو کم رقم ادا کرتا ہے اور وہ امپوٹر وایکسپوٹر سے زیادہ وصول کرتا ہے مثلاً :۱۰۰۰ محکمہ کو دیے اور ۱۵۰۰ وصول کیے تو یہ اضافی رقم اپنے لیے رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگراس محکمہ اورادارہ نے کلیرنگ ایجنٹ کی تنخواہ مقرر کی ہے اوراس ادارہ و کمپنی کی جانب سے امپوٹر وایکسپوٹر کی فیس بھی مقرر ہے تو پھر ایجنٹ زیادہ وصول نہیں کرسکتا، ہاں اگر محکمہ کی طرف سے کہا گیا ہو کہ ایک متعین رقم مثلاً :۱۰۰۰ رینڈ ہمیں دو اور امپوٹر سے تم زیادہ وصول کرسکتے ہو تو اضافی رقم اپنے لیے رکھنے کی اجازت ہوگی۔ ملاحظہ ہو علامہ سرخسیؒ مبسوط میں لکھتے ہیں:

ومقصوده آخر الحديث" ومن استاجر أجيراً فليعلمه أجره " وهذا دليل جواز الإجارة استئجار الحر للعمل ووجوب إعلام الأجر وأنه لايجب تسليم الأجر بنفس العقد، لأنه أمر بالإعلام ولو كان التسليم يجب بنفس العقد لكان الأولى أن يقول فليؤته أجره وفي قوله صلى الله عليه وسلم:" أعطوا الأجير أجره قبل أن يجف عرقه " دليل على ذلك أيضاً فإنه أمر بالمسارعة إلى أداء الأجرة وجعل أول أوقات المسارعة ما بعد الفراغ من العمل قبل جفوف العرق فدل أن أول وقت الوجوب هذا. (المبسوط :۷۶/۱۵، دارالفکر).

فتاوى الشامى میں منقول ہے: **مطلب في أجرة الدلال : تتمة : قال فى التتارخانية : وفى الدلال والسمسار، يجب أجر المثل، وما تواضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا فذاك حرام عليهم، وفى الحاوى: سئل محمد بن مسلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجوا أنه لابأس به وإن كان فى الأصل فاسداً لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز، فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام وعنه قال: رأيت ابن شجاع يقاطع نساجاً ينسج له ثياباً في كل سنة .** (فتاوى الشامى: ۶۳/۶، سعيد). واللہ ﷻ اعلم۔

کمپنی سے ممبر شپ کارڈ لیکر پوئنٹ حاصل کرنے کا حکم:

سوال: آج کل کمپنیاں بطورِ ممبر شپ مشتری کے نام سے ایک کارڈ جاری کرتی ہیں، جس کی وجہ سے مشتری کو سامان کی خریداری میں خصوصی مراعات ملتی ہیں، اور خریداری پر پوئنٹ بھی ملتے ہیں پھر سال کے آخر میں پوئنٹ کے ذریعہ انعام ملتا ہے یا خصوصی مراعات ملتی ہیں، لیکن اس کو حاصل کرنے کے لیے سال بھر میں چند مرتبہ اس کمپنی سے سودا خریدنا ضروری ہوتا ہے تو کیا ایسا کارڈ حاصل کر کے مراعات لینا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ کمپنیوں سے کارڈ حاصل کر کے اس پر مشروط پوئنٹ یا مخصوص مراعات حاصل کرنا جائز اور درست ہے، فقہ کی اصطلاح میں اِس کو تبرعِ مشروط کہتے ہیں۔

چند دلائل درجِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:　　مسلم شریف میں ہے:

عن أنس ﷺ أن جاراً لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فارسیاً کان طیب المرق فصنع لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم جاء یدعوہ ، فقال: وھذہ لعائشۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھا فقال: لا، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لا، فعاد یدعوہ ، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم :وھذہ ، قال: لا ، قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : لا، ثم عاد یدعوہ، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: وھذہ ، قال: نعم فی الثالثۃ ، فقاما یتدافعان حتی أتیا منزلہ.

(رواہ مسلم :۲/۱۷۶).

حدیثِ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ: ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ طعام پیش کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بھی شرط لگائی اس نے انکار کر دیا پھر تیسری مرتبہ میں اجازت دیدی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہمراہ تشریف لے گئے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اونٹ کا پالان خریدا اور عازب ﷺ سے درخواست کی کہ اپنے بیٹے براء ﷺ سے کہدے کہ یہ پالان میرے ساتھ لے چلے، عازب ﷺ نے کہا نہیں مگر اس شرط پر کہ آپ ہجرت کا واقعہ سنا دیں، حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے ہجرت کا واقعہ سنایا اور حضرت براء ﷺ پالان لے گئے۔ ملاحظہ ہو بخاری شریف میں ہے:

عن البراء ﷺ قال: اشتری أبوبکر ﷺ من عازب ﷺ رحلاً بثلاثۃ عشر درھماً، فقال

أبو بکر ﷺ: لعازب ﷺ مر البراء فليحمل إلي رحلي، فقال عازب : لا ، حتى تحدثنا كيف صنعت أنت ورسول الله صلى الله عليه وسلم حين خرجتما من مكة والمشركون يطلبونكم ، قال: ارتحلنا...الخ. (رواه البخاري ١/ ٥١٥،في مناقب المهاجرين).

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تبرعِ مشروط جائز ہے اور تبرعِ مشروط: احسان میں شرط لگانے یا کسی معاملہ میں اپنے فائدہ کی شرط لگانے کو کہتے ہیں۔

مزید ملاحظہ ہو ملاحظہ ہو: (امداد الاحکام: ۳/ ۳۸۶، و ۴۰۶، وفتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۵۵۴، ۵۵۹). **واللہ ﷻ اعلم۔**

واللہ ﷻ اعلم۔

(Transit insurance) ٹرانزٹ انشورنس کا حکم:

سوال: کیا ٹرانزٹ انشورنس جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً: جنوبی افریقہ سے بوٹسوانا تک، کیونکہ گزشتہ مہینہ ایک دوست کی گاڑی لوٹ لی گئی تھی، جس میں تقریباً دو لاکھ رینڈ کا تجارتی سامان تھا، اب اس کو ڈر ہے کہ مستقبل میں بھی ایسا ہوسکتا ہے تو کیا اس کے لیے انشورنس کرانا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: ہر وہ انشورنس جس میں جمع شدہ رقم کے عوض میں زیادہ رقم ملتی ہو ناجائز ہے، ہاں اگر جمع شدہ رقم کے عوض میں علاج کی خدمت ملتی ہو یا کار وغیرہ کی مرمت ملتی ہو تو اس کی گنجائش نکل سکتی ہے، بظاہر صورتِ مسئولہ میں سامانِ تجارت ضائع ہونے کے وقت رقم ملتی ہے اور زیادہ ملتی ہے، بنا بریں ایسا معاملہ ناجائز ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ فی زماننا انشورنس دراصل سود و قمار کا مجموعہ ہے، یہ دونوں بنگاہِ شریعت ناجائز ہیں۔

مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں:

بیمہ کمپنیوں سے دوکانوں کارخانوں، عمروں کا بینہ کرانا ناجائز ہے کیونکہ بیمہ ربا اور قمار پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ دونوں ناجائز ہیں۔ (کفایت المفتی: ۸/ ۸۳، دار الاشاعت)۔

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

جان و مال کا انشورنس اصل میں جائز نہیں، کیونکہ اگر پالیسی مکمل کی تو پالیسی لینے والا جتنی رقم ادا کرتا ہے، کمپنی اس سے زیادہ رقم واپس کرتی ہے اور یہ سود ہے اور اگر پالیسی مکمل ہونے سے پہلے حادثہ پیش آ گیا تو رقم پوری مل جاتی ہے حالانکہ اس نے چند قسطیں ہی جمع کی ہیں، گویا پالیسی لینے والے کو اپنی پالیسی کا انجام معلوم نہیں،

کسی کو دو تین قسطوں کی ادائیگی پر پوری رقم مل جائے گی، اور کسی کو تمام ادا کرنی ہوگی، ظاہر ہے کہ یہ صورت قمار میں داخل ہے، پس انشورنس سود اور قمار سے مرکب صورت ہے، اور شریعت میں ان دونوں کی ممانعت ہے اس لیے اصلاً یہ صورت جائز نہیں ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۳۵۸)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۴۶۔۴۵۲، ط: زمزم پبلشرز)۔

البتہ بعض مرتبہ ٹرانزٹ انشورنس لازمی ہوتا ہے اس کے بغیر داخلہ کی اجازت نہیں دیتے تو اس کی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۴۳، ط: زمزم پبلشرز)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کفالت نامہ (Letter of Guarantee) پر اجرت لینے کا حکم:

سوال: زید جاپان میں ایک کمپنی کا مالک ہے، اس نے عمر کے ساتھ جو فی الحال پاکستان میں ہے یہ معاہدہ کیا کہ زید عمر کو گارنٹی لیٹر دیگا جو جاپان کے ویزا کے لیے ضروری ہے، اور عمر اس کے بدلہ میں جاپان آ کر زید کے ساتھ اس کی کمپنی میں کام کرے گا اور ۳۰ فیصد نفع زید کو دے گا، اور اگر زید کے ساتھ کام نہ کرنا چاہے تو سات لاکھ روپے دے گا، اب کیا زید کا یہ معاہدہ بنگاہِ شریعت درست ہے یا نہیں؟ اور کیا عمر کے اس کے ساتھ کام نہ کرنے کی صورت میں سات لاکھ زید کو دینے لازم ہوں گے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: کفالہ بالنفس اور کفالہ بالمال عقدِ تبرع ہے اس پر اجرت لینا صحیح نہیں، کفالہ بالنفس میں مکفول بہ کو عدالت لانا ہوتا ہے اور کفالہ بالمال مکفول عنہ کی طرف سے دین کی ادائیگی ہوتی ہے۔ چنانچہ صورتِ مسئولہ میں زید جاپانی سفارت خانہ کو ضمانت دے رہا ہے کہ میں عمر کے لیے درجِ ذیل اشیاء کی ضمانت لیتا ہوں:

۱۔ جاپان میں رہائش کا خرچہ　۲۔ واپسی کے سفر کا خرچہ　۳۔ اور جاپانی حکومت کے تمام قوانین کی پابندی۔ یہ کفالتِ محضہ ہے اس کا عوض لینا جائز نہیں اس لیے گارنٹی لیٹر دینے پر معاوضہ لینا جائز نہیں۔

ملاحظہ ہو فتح القدیر میں مرقوم ہے:

والكفالة عقد تبرع كالنذر لا يقصد به سوى ثواب الله أو رفع الضيق عن الحبيب فلا يبالي بما التزم في ذلك ويدل على ذلك إقدامه بلا تعيينه للمقدار حين قال ما كان عليه فعلي، فكان مبناها التوسع فتحملت فيها الجهالة. (فتح القدير: ۷/ ۱۸۱، دار الفكر).

مزید ملاحظہ ہو: (بدائع الصنائع: ۶/ ۵، سعید، والاختیار لتعلیل المختار: ۲/ ۱۷۹، دار الكتب العلمية، بيروت،

وفقهي مقالات: ۱/ ۳۰۱، وفتاوى الشبكة الاسلامية: ۷۰۳۴۲، وقرارات مجمع الفقه الإسلامي، ص ۲۰).

لیکن آج کل کی کفالت میں بہت ساری ذمہ داریاں اور کاغذی کاروائیاں شامل ہوتی ہیں جیسے صورتِ مسئولہ میں: جاپان میں رہائش، واپسی کے تمام قوانین کی پابندی، وغیرہ، اس لیے بعض علماء کے نزدیک اس پر مناسب اجرت لے سکتے ہیں، جیسے مرضعہ بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری لیتی ہے اور اس پر اجرت لیتی ہے یا کوئی کمپنی کار کی مرمت کی ذمہ داری لیتی ہے اور اس پر اجرت لیتی ہے یا جیسے عقدِ موالات میں مولیٰ اسفل مولیٰ اعلیٰ سے کہتا ہے کہ تم میرے مرنے کے بعد میرے وارث ہوں گے اور میری جنایت کے ذمہ دار ہوگے تو مولیٰ اعلیٰ ذمہ داری کی وجہ سے وراثت کا مستحق ہوتا ہے، اِن بعض علماء کے نزدیک مناسب اور معروف اجرت لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، یہ صرف کفالت نہیں بلکہ اس میں عمل بھی ہے۔

جواز والوں کے دلائل ملاحظہ کیجیے: (۱) کتبِ فقہ سے مرضعہ کی اجرت کا جواز:

قال في الدرالمختار: والظئر، المرضعة بأجر معين لتعامل الناس بخلاف بقية الحيوانات لعدم التعارف، وكذا بطعامها وكسوتها ولها الوسط وهذا عند الإمام لجريان العادة بالتوسعة على الظئر شفقة على الولد. و في رد المحتار: قوله لتعامل الناس علة للجواز وهذا استحسان لأنها ترد على استهلاك العين و هو اللبن...ووجهه أن العادة لما جرت بالتوسعة على الظئر شفقة على الولد لم تكن الجهالة مفضية إلى النزاع والجهالة ليست بمانعة لذاتها بل لكونها مفضية إلى النزاع. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۶/ ۵۳، سعید).

۲۔عقدِ موالات کے بارے میں علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

مولى الموالاة أي القابل موالاة الميت حين قال له: أنت مولاي ترثني إذا مت وتعقل عني إذا جنيت ولم يكن من العرب ولا في معاتيقهم ولا له وارث نسبي ولا عقل عنه بيت المال أو مولى موالاة آخر فيرثه القابل بلا عكس إلا إن شرط ذلک من الجانبين وتحققت الشرائط فيهما وله أن يرجع ما لم يعقل عنه مولاه وهذا مذهب عمر وعلي وكثيرين.

(فتاوى الشامي: ۶/ ۷۶۴، سعيد).

بعض علماء نے مجبوری کے وقت جائز قرار دیا ہے، جیسے شافعیہ میں سے ڈاکٹر وہبہ زحیلیؒ فرماتے ہیں:

لكن إن شرط الكفيل تقديم مقابل أو أجر على كفالته ، وتعذر على المكفول عنه تحقيق مصلحته من طريق المحسنين المتبرعين ، جاز دفع الأجر للضرورة أو الحاجة العامة ، لما يترتب على عدم الدفع من تعطيل المصالح كالسفر للخارج للدراسة أو للارتزاق أو لتاجيل الجندية ونحوها ، وأساس القول بالجواز فيه : إن الفقهاء أجازوا دفع الأجر للحاجة لأداء القربات والطاعة من تعليم قرآن وممارسة الشعائر الدينية ، كما أنهم أجازوا دفع شيء من المال على سبيل الرشوة للوصل إلى الحق أو دفع الظلم ، أو الدفع لعدو لدرء خطره وضرره عن البلاد ، والمكفول عنه يحقق بالكفالة منفعة له تتعين الكفالة المأجورة سبيلاً إليها ، لكن يجب عدم الاستغلال أو المغالاة في اشتراط المقابل، مراعاة لأصل مشروعية الكفالة وهو التبرع ،كما يمكن اعتبار الأجر لمكاتب الكفالات مقابل الأتعاب في إنجاز معاملة الكفالة . (الفقه الإسلامى وأدلته :۵/ ۱۶۱ ،دمشق).

جدید فقہی مسائل میں مرقوم ہے:

البتہ اگر کوئی شخص کسی چیز کے لینے پر مجبور ہو تو اس قاعدہ کے تحت کہ مجبوریاں ناجائز چیزوں کی گنجائش پیدا کر دیتی ہیں (الضرورات تبيح المحظورات) وہ اجرت ادا کرسکتا ہے۔ (جدید فقہی مسائل:۴/ ۲۶۹)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ہوٹلوں میں ایک متعین رقم دیکر کھانا کھانے کا حکم:

سوال: آج کل ہوٹلوں میں اور ریسٹورنٹ میں بیوفے (Buffet) لگائے جاتے ہیں، اس کی صورت یہ ہے کہ لوگ آتے ہیں اور ایک متعین رقم ادا کرتے ہیں، اور پیش کیے ہوئے مختلف کھانوں میں سے جتنا کھانا ہو کھاتے ہیں، کوئی مقدار متعین نہیں ہوتی، کیا یہ جائز ہے؟ جب کہ مبیع مجہول ہے، معلوم نہیں کون کتنا کھائے گا، بعض کم کھاتے ہیں اور بعض زیادہ؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسا معاملہ جائز اور درست ہے، کیونکہ مبیع کی جہالت جھگڑا پیدا کرنے والی نہیں ہے، نیز لوگوں کا آپس میں تعامل ہے اس وجہ سے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو تکملہ فتح الملہم میں ہے:

قال العبد الضعيف عفا اللّٰه عنه : ويخرج على هذا كثير من المسائل في عصرنا، فقد جرت العادة في بعض الفنادق الكبيرة أنهم يضعون أنواعاً من الأطعمة فى قدور كبيرة ، و يخيرون المشترى في أكل ما شاء بقدر ما شاء ، ويأخذون ثمناً واحداً معيناً من كل أحد، فالقياس أن لا يجوز البيع لجهالة الأطعمة المبيعة وقدرها، ولكنه يجوز لأن الجهالة يسيرة غير مفضية إلى النزاع ، وقد جرى بها العرف والتعامل . (تكملة فتح الملهم : ۱/۳۲۰،باب بطلان بيع الحصاة والبيع الذى فيه غرر).

فیض الباری میں علامہ انورشاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

قلت: إن الناس يعاملون في أشياء تكون جائزة فيها بينهم على طريق المروءة والإغماض، فإذا رفعت إلى القضاء يحكم عليها بعدم الجواز وذلک لأن العقود على نحوين: نحو: يكون معصية في نفسه وذا لا يجوز مطلقاً ونحو: لا يكون معصية وإنما يحكم عليه بعدم الجواز لإفضائه إلى المنازعة فإذا لم تقع فيه منازعة جاز. (فيض البارى : ۲۸۹/۳).

جمهرة القواعدالفقهيه میں مذکور ہے:

الجهالة ليست بمانعة لذاتها بل لكونها مفضية إلى النزاع وهذا أصل مهم ينبغي التعويل عليه فى الأحكام فإن به حل كثير من المشكلات وليعلم أن أحكام المعاملات الشرعية مبنية على أصلين عادلين :

الأول: منع كل ما فيه ظلم وأكل أموال الناس بالباطل .

الثاني: منع ما يؤدي إلى الاختلاف والنزاع بسبب الجهالة فإذا انتفى ما يؤدي إلى الظلم والنزاع بسبب الجهالة ، صح التعامل ، والعرف أصل عظيم يرجع إليه في ذلک بعد الشرع . (جمهرة القواعدالفقهية فى المعاملات المالية : ۱/۳۱۹).

حضرت مفتی ولی حسنؒ فرماتے ہیں: قاعدۂ کلیہ یہ ہے کہ جو جہالت نزاع کا سبب ہو وہ منع ہے اور جو جہالت نزاع کا سبب نہیں بنتی وہ منع نہیں ہے۔ (درس الہدایہ،الجزء الثالث،ص۲۹)۔

شافعیہ کے نزدیک بھی جہالتِ یسیرہ یا غررِ یسیر مفسدِ عقد نہیں ہے اور اس قسم کا معاملہ صحیح اور درست ہے۔
ملاحظہ ہو شرح المہذب میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

الأصل أن بيع الغرر باطل لهذا الحديث والمراد ما كان فيه غرر ظاهر يمكن الاحتراز عنه فأما ما تدعو إليه الحاجة ولايمكن الاحتراز عنه كأساس الدار وشراء الحامل مع احتمال أن الحمل واحد أو أكثر وذكر أو أنثى وكامل الأعضاء أو ناقصها...فهذا يصح بيعه بالإجماع، ونقل العلماء الإجماع أيضاً في أشياء غررها حقير، منها أن الأمة أجمعت على صحة بيع الجبة المحشوة وإن لم يرحشوها ولو باع حشوها منفرداً لم يصح .

وأجمعوا على جواز إجارة الدار وغيرها شهراً مع أنه قد يكون ثلاثين يوماً وقد يكون تسعة وعشرين ...

قال العلماء : مدار البطلان بسبب الغرر والصحة مع وجوده على ما ذكرناه وهو أنه إذا دعت الحاجة إلى ارتكاب الغرر ولا يمكن الاحتراز عنه إلا بمشقة أوكان الغرر حقيراً جاز البيع وإلا فلا . (شرح المهذب : ۹/ ۲۵۸،دارالفکر). (وکذا فی شرح صحیح مسلم للامام النووی : ۲/ ۲،ط:قدیمی). **واللہ ﷻ اعلم۔**

باپ بیٹوں کی مشترکہ تجارت میں نفع کا حکم:

سوال: لوگوں میں مشہور ہے کہ اگر بھائی بہن والد کے ساتھ رہتے ہیں، اور ایک بھائی ان میں سے کسی فیکٹری میں بہت اہم ملازمت کرتا ہے، پھر علیحدگی کی نوبت آجائے تو اس ملازم بھائی کے پورے مال اور دوسری خریدی ہوئی اشیاء میں دوسرے بھائی بہن بھی شریک ہیں، کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ یا ملازم بھائی اپنے مال کا مالک ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ باپ بیٹے ساتھ رہتے ہیں اور ایک بیٹا ملازمت میں خوب کماتا ہے تو یہ کمائی اس کی اپنی ہے اس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہے کیونکہ وہ خود ملازمت کرتا ہے نہ کہ دوسرے بھائی بہن۔
قرآن، حدیث اور کتبِ فقہ میں بہت سارے ایسے دلائل موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اجرت اجیر اور ملازم کا خاص حصہ ہے دوسرا کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو قرآنِ کریم میں ہے:

فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن. [الطلاق : ٦]، معلوم ہوا کہ اجرت اجیر کی ملکیت ہے۔
حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”**أعطوا الأجير أجره قبل أن يجف عرقه**“.
(رواه ابن ماجه ،رقم: ۲۴۴۳).
اس سے معلوم ہوا کہ اجیر ہی مستحق اجرت ہے نہ کہ اس کے گھر والے۔
دوسری حدیث میں ہے: **عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال الله عزوجل: ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة رجل أعطى بي ثم غدر و رجل باع حراً فأكل ثمنه و رجل استاجر أجيراً فاستوفى منه ولم يعط أجره .** (رواه البخاري ،رقم: ۲۲۲۷). اس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ اجیر جو مستحق اجر ہے اس کو اس کی اجرت نہ دینا اللہ تعالیٰ سے خصومت ولڑائی کے مترادف ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے: **ثم الأجرة تستحق بإحدى معان ثلاثة إما بشرط التعجيل أو بالتعجيل أو باستيفاء المعقود عليه فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة فإنه يملكها .** (الفتاوى الهندية: ۴/۴۱۳).
بدائع الصنائع میں بشرط التعجیل کے تحت مذکور ہے: **لأنهما لما شرطا تعجيل البدل لزم اعتبار شرطهما لقوله عليه الصلاة والسلام: المسلمون عند شروطهم وملك الآجر البدل حتى تجوز له هبته والتصدق به والإبراء عنه .** (بدائع الصنائع : ۴/۲۰۳،سعيد).

ایک اشکال اور اس کا جواب:

یہاں پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ: **أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما مال فالكسب كله للأب ، إذا كان الابن في عيال الأب لكونه معيناً له ألا ترى أنه لو غرس شجرة تكون للأب وكذا الحكم في الزوجين إذا لم يكن لهما شيء ثم اجتمع بسعيهما أموال كثيرة فهي للزوج وتكون المرأة معينة له إلا إذا كان لها كسب على حدة فهو لها كذا في القنية .** (الفتاوى الهندية: ۲/۳۲۹).
ان عبارات سے بعض حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب باپ بیٹا ساتھ کام کرتے ہیں تو سب کچھ

باپ کا ہے۔اس کا کیا جواب ہے؟

جواب: اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ کام یادکان یا فیکٹری باپ کی ہواور بیٹا بطورِتابع اور معاون ان کے ساتھ کام کرتا ہو یا بیوی شوہر کی دکان میں بطورِمعاون کام کرتی ہوتو سب کچھ باپ اورشوہر کا ہے لیکن اگر بیٹے کا اپنا کام یاملازمت ہےاوراس کام میں وہ مستقل ہےتو وہ سب کچھ بیٹے کا ہےاس لیے فقہی عبارت میں: ''**إذا كان الابن في عيال الأب لكونه معيناً**''کے الفاظ آئے ہیں۔

ہاں ایک صورت اور سمجھ لیں کہ باپ بیٹے سب الگ الگ کام کرتے ہیں اورسب اپنی کمائی یااس کا کچھ حصہ باپ کے حوالے کرتے ہیں یاسب بھائی کام کرتے ہیں اوراپنی کمائی یااس کا کچھ حصہ گھر پرخرچہ کے لیے مشترکہ رکھتے ہیں تو وہ کمائی پہلی صورت میں باپ کی ہےاوردوسری صورت میں بھائیوں کی مشترکہ ہے۔

قال في تنقيح الفتاوى الحامدية : إخوة خمسة سعيهم وكسبهم واحد وعائلتهم واحدة حصلوا بسعيهم وكسبهم أموالاً فهل تكون الأموال المذكورة مشتركة بينهم أخماساً ؟ الجواب: ما حصله : الإخوة الخمسة بسعيهم وكسبهم يكون بينهم أخماساً . (تنقيح الفتاوى الحامدية: ۱۲۳/۲).

وقال في رد المحتار: وفى الخانية : زوج بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا فى المتاع فهو للأب . (فتاوى الشامي: ۳۲۵/۴، سعيد).

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں بیٹا اپنی کمائی کا مالک اورخودمختار ہے، ہاں جتنی مقدار باپ کے حوالے کردےاوردیدے وہ والد کی ہوگی۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

میڈیا کی ایڈوٹائزنگ کرنے کا حکم:

سوال: کیا میڈیا (ریڈیواورٹی وی) کے مراکز کے لیےاڈوٹائزنگ ایجنٹ بننا جائز ہے یانہیں؟اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ اشتہارات کے ذریعہ گاہک لانے پر۲۰فیصد فائدہ ہوگا ،یہ بات بھی یادرہے کہ تمام کمپنیاں شریعت کےمطابق حلال کاروبارکرتی ہیں،کیاایسےایجنٹ کی آمدنی حلال ہوگی یانہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ کمپنی کی مصنوعات کی تشہیراوراس کےاشتہارات جوشریعت کے دائرہ میں رہ کرہوں جائز ہیں یعنی اشتہارات میں جاندار کی تصویریا موسیقی یالہوولعب وغیرہ شامل نہ ہوتوایسی ایجنسی کی

اجازت ہے اور اس کی آمدنی بھی حلال ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

قال في البزازية : إجارة السمسار والمنادى والحمامى والصكاک وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة و يطيب الأجر الماخوذ لو قدر أجر المثل . (فتاوى الشامي: ۶/۴۷، سعيد).

وفيه أيضاً: تتمة : قال في التاتارخانية : وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما تواضعوا عليه إن في كل عشرة دنانير كذا فذاک حرام عليهم ، وفي الحاوى : سئل محمد بن مسلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجوا أنه لا بأس به وإن كان في الأصل فاسداً لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام . (فتاوى الشامي : ۶/۶۳، سعيد).

قاموس الفقہ میں مرقوم ہے:

آج کل مختلف تجارتوں میں کمیشن کا طریقہ مروج ہوگیا ہے، یعنی کمپنی اپنا مال فروخت کرنے والوں کو بجائے تنخواہ متعین کرنے کے فیصد متعین کر دیتی ہے، مثلاً: جتنی فروخت ہوگی اس کا دس فیصد اسے بہ طورِ اجرت دیا جائے گا... بہت سے دینی اور عصری اداروں میں جو لوگوں کے تعاون پر چلا کرتے ہیں، اب یہ طریقہ مروج ہوتا جارہا ہے کہ اُنھیں متعینہ تنخواہ دینے کے بجائے کچھ فیصد اجرت دے دی جائے، اس میں مدرسہ والے اپنے لیے یہ عافیت سمجھتے ہیں کہ اگر تنخواہ مقرر کی جائے تو ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ محنت میں کمی کرے... احناف میں مشائخ بلخ نے عرف کی رعایت کرتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے۔ (قاموس الفقہ :۱/۴۹۹)۔

دوسری جگہ مذکور ہے: جس طرح خود کسی ناجائز اور خلافِ شرع کام کرنا درست نہیں اسی طرح ایسے کاموں میں ملازمت اور تعاون بھی درست نہیں... اس لیے بینک، انشورنس، شراب خانوں، قحبہ خانوں کی ایسی ملازمت جائز نہیں ہوگی جس میں آدمی سود، قمار، شراب یا قحبہ کے کاروبار کا ذریعہ بنے، اس کی طرف لوگوں کو دعوت دے، سود کے حساب و کتاب لکھے، ہاں چپراسی وغیرہ کی ملازمت کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کا براہِ راست اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔ (قاموس الفقہ :۱/۵۰۰)۔

اسلامی فقہ میں ہے:

جن چیزوں سے کسی جرم یا گناہ کی ترغیب ہوتی ہوان کا بیچنا اور خریدنا سب حرام ہے، مثلاً کسی سامان سے یا سامان پر بنی ہوئی تصویر سے یا اشتہار سے، زنا کی، سود لینے کی، شراب پینے کی، چوری یا ڈاکے یا کسی اور جرم کی ترغیب ہوتی ہو، ان کی خرید وفروخت اور اشاعت دونوں حرام ہے، سینما کا موجودہ کاروبار، غیر تمدنی فلم سازی، عریاں تصویریں، فحش گانے اور فحش ناولیں یہ سب حرام ہیں۔ (اسلامی فقہ:۲/۳۸۰)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مسلمان خاتون کا پولیس محکمہ میں ملازمت کرنے کا حکم:

سوال: ایک مسلمان عورت فرانس میں رہتی ہے، وہ یہ پوچھنا چاہتی ہے کہ پولیس محکمہ میں ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ یعنی عورت کے لیے پولیس بننا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا بالبرہان توجروا عند الرحمٰن۔

الجواب: مسلمان عورت کے لیے پولیس کی ملازمت درجِ ذیل خرابیوں کی وجہ سے ناجائز ہے؛

۱۔ بلا حجاب لوگوں کے سامنے آنا۔

۲۔ غیر مردوں کے ساتھ خلط واختلاط کا پایا جانا۔

۳۔ اس تعلیم کا مردوں سے حاصل کرنا، کیونکہ یہ مردوں ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

۴۔ غیر محرموں کے سامنے اپنی زیب وزینت کا اظہار کرنا۔

۵۔ پولیس کا ایسا تنگ اور چست لباس پہننا جو عورت کے پوشیدہ اعضاء کی بناوٹ کو ظاہر کرتا ہے، اس میں مردوں کے ساتھ تشبہ ہے جو ممنوع ہے۔

۶۔ اس ملازمت میں مردوں کے ساتھ خلوت پائی جاتی ہے جو حرام ہے۔

۷۔ دین کے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی یا دشواری کا واقع ہونا۔

۸۔ گھریلو ذمہ داریاں انجام دینے میں دشواری اور کوتاہی کا واقع ہونا، خصوصاً رات کی ملازمت میں۔

۹۔ پولیس کی ملازمت میں عورت کے لیے خطرات زیادہ ہیں۔

۱۰۔ پولیس کی ملازمت میں جس رعب ودبدبہ اور بوقتِ ضرورت سختی کی ضرورت ہے، فطری طور پر یہ چیزیں عورتوں میں نہیں ہیں۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے: **عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الإيمان بضع وسبعون شعبة...الحياء شعبة من الإيمان** . (صحيح مسلم : ۱/۴۷، باب عدد شعب الايمان).

قال الشيخ الملا على القاري في المرقاة: والمراد به الحياء الإيماني وهو خلق يمنع الشخص من الفعل القبيح بسبب الإيمان كالحياء عن كشف العورة والجماع بين الناس .
(مرقاة المفاتيح: ۱/ ۷۰، كتاب الايمان).

بخاری شریف میں روایت ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المتشبهين من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال . (صحيح البخاری ،رقم: ۵۸۸۵).

فتاویٰ رحیمیہ میں مذکور ہے:

عورت کمپنی میں ملازمت کرے گی تو کئی ممنوعات کا ارتکاب ہوگا، بے پردگی ہوگی ، نامحرم مردوں کے ساتھ اختلاط اور بعض موقعوں پرخلوت اور تنہائی کا موقعہ بھی آسکتا ہے،ان کے ساتھ بے تکلفانہ بات چیت اور نامحرم مردوں کے ساتھ آمدورفت ہوگی وغیرہ وغیرہ،اس لیے شرعاً ایسی ملازمت کی اجازت نہیں ہوسکتی ۔(فتاویٰ رحیمیہ:۵/ ۴۵۸)۔

آپ کے مسائل اوران کا حل میں ہے:

جواب: اللہ تعالیٰ نے مرداورعورت کا دائرۂ کار الگ الگ بنایا ہے،عورت کے کام کا میدان اس کا گھر ہے اور مرد کا میدانِ عمل گھر سے باہر ہے، جو کام مرد کرسکتا ہے،عورت نہیں کرسکتی اور جوعورت کرسکتی ہے مرد نہیں کرسکتا،دونوں کو اپنے اپنے دائرے میں رہ کر کام کرنا چاہیے، جولوگ مرد کا بوجھ عورت کے نحیف کندھوں پر ڈالتے ہیں وہ عورت پرظلم کرتے ہیں۔(آپ کے مسائل اوران کا حل:۸/ ۵۵)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

(Extended Warranty) اضافہ شدہ ضمانت کا حکم:

سوال: آج کل بازار میں ایسا معاملہ ہوتا ہے کہ مثلاً کوئی چیز خریدی تو ایک سال تک مفت میں ٹھیک کرنے کی شرط ہوتی ہے، پھر کمپنی یا دکاندار یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے مزید اتنی رقم دی تو اس کی گارنٹی دو سال کر دی جائے گی،تو کیا ایسا معاملہ درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ صحیح اور درست ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ مشتری مزید رقم ادا کرتا ہے اور بائع اس کے عوض مبیع ٹھیک کرنے کی گارنٹی دیتا ہے تو یہ عقدِ اجارہ کا معاملہ ہے کہ بائع رقم کے عوض خراب

ہونے پر ٹھیک کرنے کے عمل کی ذمہ داری لیتا ہے۔ ملاحظہ ہو مفتی تقی صاحب لکھتے ہیں:

هناك التزام آخر رائج في السوق اليوم باسم "الضمان الممدد" وهو أن يمدد البائع مدة تصليح الجهاز من قبله فوق المدة المشروطة في العقد لقاء عوض ما لي زائد، فمثلاً: لو كانت المدة المشروطة في العقد لتصليح الجهاز من قبل البائع سنة، فإن البائع يقول: ادفع لي كذا، فأمدد المدة إلى سنة أخرى، فهذا ليس مما نحن فيه الآن من مسألة البيع بالشرط، وإنما هو عقد مستقل من عقود الصيانة. وموضعه الإجارة. (فقه البيوع: ۱/۵۰۱).

فقہاء نے لکھا ہے کہ عمل کی ذمہ داری اٹھانے پر بھی اجرت واجب ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وإن أطلق له العمل فله أن يستاجر من يعمله لأن المستحق عمل في ذمته ويمكن إيفاء بنفسه أو بالاستعانة بغيره بمنزلة إيفاء الدين. (الهداية: ۳/۲۹۷).

وفي ردالمحتار: لأن المعقود عليه في حقه هو العمل أو أثره. (رد المحتار: ۶/۶۴، سعيد).

وفي تقريرات الرافعي: قوله أو أثره أي وأثره إذا لم يشترط أن يعمل بنفسه. (تقريرات الرافعي: ۶/۲۶۸، سعيد).

وفي فتاوى الشامي: قوله وإن لم يعمل أي إذا تمكن من العمل. (فتاوى الشامي: ۶/۶۹، سعيد).

وفي الهندية: وأما شرائط الصحة... ومنها أن يكون المعقود عليه وهو المنفعة معلوماً علماً يمنع المنازعة فإن كان مجهولاً جهالة مفضية إلى المنازعة يمنع صحة العقد وإلا، فلا... ومنها بيان المدة. (الفتاوى الهندية: ۴/۴۱۱).

خلاصہ یہ ہے کہ یہ بیع بالشرط کے تحت داخل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستقل عقدِ اجارہ کا معاملہ ہے جو جائز ہے ہاں پہلی مرتبہ کی مفت سروس کی گارنٹی بیع بالشرط میں داخل ہے، لیکن متعارف ہونے کی وجہ سے وہ بھی جائز ہے، اس کی تفصیل فتاویٰ دار العلوم زکریا (۵/۵۵) میں ملاحظہ کیجئے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ہوائی جہاز میں سامان گم ہونے پر زیادہ رقم ملنے پر رقم کی زیادتی کا حکم:

سوال: امارات سے ایک شخص کا بیگ گم ہوگیا، دوسرے شخص کے اس بیگ میں دو کرتے تھے پھر جب قیمت واپس کی گئی تو اس شخص کو چار کرتوں کی قیمت دی گئی تو اب چار کرتوں کی قیمت استعمال کرنا درست ہے یا

نہیں؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ امارات اجیرِ مشترک کے حکم میں ہے کیونکہ اجرت پر آدمی اور سامان کو ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچاتی ہے، اور فقہ کے قاعدے سے اجیرِ مشترک کے پاس بلاکوتاہی سامان ضائع ہوجائے تو تاوان نہیں آتا، ہاں کوتاہی اور غفلت کی وجہ سے ضائع ہونے پر تاوان آتا ہے پھر اگر بیگ کے مالک نے فہرست میں انہیں اشیاء کا ذکر کیا تھا جو ضائع اور گم ہوئی تھیں اور امارات کمپنی نے اس کو زائد رقم ادا کی تو اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز اور درست ہے، لیکن اگر بیگ والے نے زیادہ چیزیں لکھی، مثلاً دو کرتوں کی جگہ چار کرتے لکھے، تو زائد قیمت لینا جائز نہیں، اس کو صدقہ کر دینا چاہیے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے:

وحكم الأجير المشترك أن ما هلك في يده من غير صنعه فلا ضمان عليه في قول أبي حنيفةؒ وهو قول زفر والحسن وإنه قياس سواء هلك بأمر يمكن التحرز عنه كالسرقة والغصب أو بأمر لا يمكن التحرز عنه كالحرق الغالب والغارة الغالبة والمكابرة وقال أبويوسف ومحمد إن هلك بأمر يمكن التحرز عنه فهو ضامن وإن هلك بأمر لا يمكن التحرز عنه فلا ضمان كذا في المحيط ، وبعضهم أفتوا بالصلح عملاً بالقولين...وبقولهما يفتى اليوم لتغير أحوال الناس وبه يحصل صيانة أموالهم كذا في التبيين . (الفتاوى الهندية: ۵۰۰/۴).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے: اگر دھوبی کی بے پرواہی سے کپڑا گم ہوگیا تو اس کا ضمان لینا درست ہے لیکن اگر دھوبی بے اختیار تھا اور یک دم پانی زیادہ آگیا اور کوشش کے باوجود حفاظت نہ کرسکا تو اس پر ضمان نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۳۶۴/۱۲، ط: محمودیہ)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سیڈیوں کے حقوق الطبع محفوظ کرنے کا حکم:

سوال: کیا سیڈیوں کے حقوق الطبع محفوظ کرنے سے محفوظ ہوجائیں گے یا نہیں؟ نیز اگر کمپنی والوں کی طرف سے اس کے نقل کرنے کی اجازت نہ ہو تو اسے اپنے استعمال یا بیچنے کے لیے نقل کرنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب: حق ایجاد ایسا حق ہے جس کو شریعت نے تسلیم کیا ہے، کہ جس شخص نے کوئی چیز ایجاد کی تو اس کو محفوظ کرنے اور بیچنے یا اس پر منافع لینے کا وہ حقدار ہے، اگر ہر کس و ناکس کو اس کے نقل کرنے، بیچنے اور منافع

لینے کی اجازت دی جائے تو محنت ومشقت اُٹھانے والا اپنی محنت کے پھل سے محروم ہوجائے گا، ہاں کوئی شخص اپنے استعمال کے لیے نقل کرنا چاہے تو اس کی گنجائش ہے، جبکہ بیچنے اور منافع حاصل کرنے کا ارادہ نہ ہو۔

حدیث شریف میں ہے: **" من سبق إلى ما لم يسبقه إليه مسلم فهوله "**. (رواه البيهقى فى سننه الكبرى: ۱۴۲/۶، كتاب احياء الموات، وابوداود: ۴۳۷/۲، باب فى اقطاع الارضين).

شارحِ بخاری ابن بطال قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ جن حقوق میں عام لوگ برابر ہیں اگر کوئی ان میں سبقت کرلے تو سبقت کرنے والا زیادہ حقدار ہوگا۔ **من سبق إلى المواضع عند العالم أو المسجد أو غيره مما حقوق الناس فيه متساوية أنه أحق به** . (شرح صحيح البخارى: ۷۶/۲).

نیز شرحِ مجلّہ میں حقوقِ مجردہ کا عوض لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو شرحِ مجلّہ میں مرقوم ہے:

قال: وعلى ما ذكره من جواز الاعتياض عن الحقوق المجردة بمال، ينبغي أن يجوز الاعتياض عن حق التعلي، وعن حق الشرب، وعن حق المسبل بمال، لأن هذه الحقوق لم تثبت لأصحابها لأجل دفع الضرر عنهم، بل تثبت لهم ابتداء بحق شرعي...الخ. (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسى: ۱۲۱/۲).

نیز حقِ طباعت وحقِ تصنیف کو محفوظ کرکے اس کا معاوضہ لینے کو درجِ ذیل کتبِ فتاویٰ میں جائز قرار دیا ہے:

(نظام الفتاویٰ: ۳۱۴/۲، وفتاویٰ رحیمیہ: ۲۴۲/۳، وفتاویٰ حقانیہ: ۱۱۱/۶، وفقہی مقالات: ۲۲۳/۱، وجدید فقہی مسائل: ۱۷۸/۱، و اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵۸/۳)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: (فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۳۱۵/۵، زمزم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

۵۰ ہزار سے زائد پر فروخت کرو تو زائد آپ کے لیے ہے، اِس شرط کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دوسرے سے یہ کہا کہ اگر تم ۵۰ ہزار سے زائد پر میری کار فروخت کرو تو زائد جتنے ہوں وہ سب آپ کے ہیں یا یہ کہا کہ زائد میرے اور آپ کے درمیان آدھے آدھے ہیں۔ کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر زائد پر کار بیچی تو زائد رقم لے سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: یہ کپڑا اتنے میں بیچ دو، جو بھی اس سے زیادہ ہو وہ آپ کے ہیں، نیز محمد بن سیرینؒ سے منقول ہے آپ نے کہا: اس کو بیچ دو جو

بھی نفع ہو وہ آپ کا ہے یا میرے اور آپ کے درمیان ہوگا، تو اِن آثار کی روشنی میں صورتِ مسئولہ میں مذکورہ معاملہ بعض علماء کے ہاں جائز اور درست ہوگا۔ ملاحظہ امام بخاریؒ صحیح بخاری میں فرماتے ہیں:

باب أجر السمسرة، ولم يرابن سيرين وعطاء وإبراهيم والحسن بأجرالسمسار بأساً وقال ابن عباس رضي الله عنه : لا بأس أن يقول: بع هذا الثوب فما زاد على كذا وكذا فهو لک ، وقال ابن سيرين: إذا قال: بعه بكذا فما كان من ربح فهو لک أو بيني وبينک فلا بأس به وقال النبي صلى الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم . (صحيح البخاري : ۱/۳۰۳).

لیکن شراحِ بخاری نے اس معاملہ کو مذہبِ احناف میں مکروہ قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

وأما قول ابن عباس رضي الله عنه وابن سيرين فأكثر العلماء لا يجيزون هذا البيع وممن كرهه الثوري والكوفيون وقال الشافعي ومالک: لا يجوز فإن با ع فله أجر مثله وأجازه أحمد وإسحاق وقالا: هو من باب القراض وقد لا يربح المقارض . (عمدة القارى : ۸/۶۲۴، ط:ملتان).

شیخ ابوالحسن ابن بطال قرطبیؒ فرماتے ہیں:

وأما قول ابن عباس رضي الله عنه: بع هذا الثوب فما زاد على كذا فهو لک ، وقول ابن سيرين: بعه بكذا فما كان من الربح فهو لک ، أو بيني وبينک ، فإن أكثر العلماء لايجيزون هذا البيع، وممن كرهه النخعيؒ والحسنؒ والثوريؒ والكوفيون ، وقال مالکؒ والشافعيؒ: لا يجوز، فإن با ع فله أجر مثله . (شرح صحيح البخاری : ۶/۴۰۲، الرياض).

علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اجرت کی جہالت کی وجہ سے یہ اجارہ فاسد ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

وهذه الإجارة فاسدة عندنا لجهالة الأجرة فيستحق أجرة المثل . (فيض البارى : ۳/۴۱۵).

مفتی تقی عثمانی صاحب نے اس معاملہ کو ناجائز کہہ کر جواز کی صورت تحریر فرمائی ہے:

حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ یہ صورت جائز نہیں، ہوسکتا ہے یہ کہا جائے کہ بھائی! یہ چیز سو روپے میں بیچ دو، تمہاری اجرت دس روپے ہے، لیکن اگر سو روپے میں زیادہ میں بیچ دیا تو جتنا زیادہ ہوگا وہ بھی تمہارا ہوگا، یعنی اجرت مقرر کرلی کہ یہ اس کو ملے گی لیکن اگر ایک سو سے زیادہ میں فروخت کیا تو وہ بھی اس کا ہوگا، تو ہمت افزائی کے طور پر زیادہ حصہ بھی مقرر کردیا جائے اور اس کو خاص مقدار ثمن پر معلق کردیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ

نہیں۔(انعام الباری:۶/۴۶۴)۔

لیکن شیخ وہبہ زحیلی شافعیؒ نے الفقہ الاسلامی وادلتہ میں احناف کی طرف اس معاملہ کی صحت کی نسبت فرمائی ہے۔عبارت ملاحظہ ہو: **ويجوز عند الحنفية أن يشترط لأحد المتعاقدين دراهم عديدة إن زاد الربح على مقدار كذا من الدراهم، فذلك شرط صحيح لا يؤثر في صحة المضاربة لأنه لا يؤدي إلى جهالة الربح** . (الفقه الإسلامي وأدلته:۴/۸۴۹، بحواله الشركات للأستاذ الخفيف، ۷۱)، چنانچہ ہمارے عرف میں بھی یہ رائج ہے کہ جب گاڑی والا کسی تاجر کو گاڑی بیچنے کے لیے دیتا ہے تو گاڑی کی مارکیٹ ویلیو سے تین چار ہزار کم میں دیتا ہے،مثلاً ایک گاڑی کی مارکیٹ ویلیو ۶۰ ہزار ہے تو مالک تاجر سے کہے گا کہ ۵۵ ہزار مجھے چاہیے باقی آپ رکھ لینا،اب تاجر اس کو ۵۷ یا ۶۰ میں فروخت کرنے کی پوری کوشش کرے گا اور کم از کم ۵ ،۷ ہزار سے کم نفع پر تیار نہ ہوگا۔گویا تاجر کو یہ بات معلوم ہے کہ اس گاڑی پر میرا کتنا نفع ہے پھر سوچ کر ہی گاڑی قبول کرے گا،لہٰذا اس معاملہ میں نہ جہالت ہے اور نہ فساد کی کوئی اور وجہ ہے، یہ معاملہ کار ڈیلروں کے درمیان معروف ومشہور ہے۔اور فقہاء کے یہاں ایک قاعدہ مشہور ہے:

المعروف بين التجار كالمشروط بينهم، قال الشيخ أحمد زرقا: هذه خاصة في عرف التجار فإذا وقع التعارف والاستعمال بينهم على شيء غير متصادم للنص يتبع وينصرف إليه عند الإطلاق ولا تسمع دعوى إرادة خلافه كما لو باع التاجر شيئاً وقد جرى العرف على أن يكون بعض معلوم القدر من الثمن حالاً ، أو على أن دفع كل الثمن يكون منجماً على نجوم معلومة يكون ذلك العرف مرعياً بمنزلة الشرط الصحيح . (شرح القواعد ص ۲۳۹، ط: دارالقلم، دمشق). واللہ ﷻ اعلم۔

زمین کے کرایہ میں بطورِ قرض معتد بہ رقم کی شرط لگانے کا حکم:

سوال: ایک علاقہ میں یہ عرف ہے کہ لوگ کاشتکار کو زمین اجارہ پر دیتے ہیں لیکن ساتھ میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ کاشتکار کو بطورِ قرض ۵ لاکھ مثال کے طور پر مالک کو دینے ہوں گے، پھر جب زمین کی مدتِ اجارہ ختم ہوجاتی ہے تو یہ رقم واپس کردی جاتی ہے،کیا ایسا معاملہ شریعت کی نگاہ میں جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ شرط بظاہر مقتضی عقد کے خلاف ہے اور معروف ومشہور بھی نہیں ہے، پھر

اس کے ذریعہ سے سود کا دروازہ کھلتا ہے، لہٰذا ایسی شرط سے اجتناب کرنا چاہیے، ہاں اگر بطورِ ڈپازٹ کچھ رقم جمع کرالی جائے تاکہ زمین یا مکان کو اگر کوئی نقصان پہنچے تو اس کی تلافی کی جاسکے تو یہ درست ہے۔

نیز اجارہ میں اس قرض مشروط نے زمین کے مالک کو فائدہ پہونچایا، جو کہ جائز نہیں، کیونکہ ۵ لاکھ کی ویلیو واپسی کے وقت ۲ لاکھ کے برابر بھی نہ ہوگی، اور بیع اور اجارہ میں ایسی شرط لگانا صحیح نہیں۔

شرح العنایہ علی الہدایہ میں مرقوم ہے:

وفيما إذا لم يكن متعارفاً وفيه منفعة لأحد المتعاقدين كبيع عبد بشرط استخدام البائع مدة يكون العقد فاسداً لوجهين لأن فيه زيادة عارية عن العوض ، لأنهما لما قصدا المقابلة بين المبيع والثمن خلا الشرط عن العوض وهوالربا، لايقال: لا تطلق الزيادة إلا على المجانس للمزيد عليه والمشروط منفعة فكيف يكون ربا لانه مال جاز أخذ العوض عليه ولم يعوض عنه بشيء فكان ربا، ولأنه يقع بسببه المنازعة في مقصوده فيعرى العقد عن مقصوده من قطع النزاع . (شرح العناية على الهداية بهامش فتح القدير : ۶/۴۴۲،دار الفكر).

تکملہ فتح الملہم میں مذکور ہے:

وقدكثرت في عهدنا أنواع الشروط فى البيوع والإجارات وغيرها، فكل ما جرى به التعامل كان جائزاً ، مثل ما تعورف فى العالم كله أن مشترى الثلاجات ، والدافئات والماكينات الأخرى يشترط على البائع القيام بتصليحها كلما عرضها فساد في حدود مدة معلومة ،كالسنة أو السنتين مثلاً ، فإن هذا الشرط جائز لشيوع التعامل بها . (تكملة فتح الملهم : ۱/۶۳۵).

مزید ملاحظہ ہو: (الكفاية على الهداية : ۶/۷۷،مكتبه رشيديه،والمبسوط للإمام السرخسي: ۱۳/۱۴، وشرح المجلة للاتاسي: ۲/۵۹،والمدخل الفقهي العام : ۲/،وفتاویٰ دار العلوم زكريا: ۵/۵۸). **واللہ ﷻ اعلم۔**

الکحول (Alcohol) مخلوط پرفیوم کی تجارت کا حکم:

سوال: پرفیوم جس میں الکحول ہوتا ہے کیا بدن یا کپڑے پر لگانا جائز ہوگا یا نہیں؟ نیز اس کی تجارت کا کیا حکم ہے؟ اگر کسی شخص نے کپڑے یا بدن پر لگا کر نماز پڑھی تو نماز ہوگئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: جوالکحول اشربعہ اربعہ محرمہ: انگور کی کچی شراب، انگور کی پختہ شراب، کھجور کی شراب اور زبیب کی شراب سے بنے ہو وہ بالاتفاق حرام اور ناجائز ہیں، اوران کی تجارت بھی جائز نہیں، لیکن ان چار کے علاوہ دیگراشیاء سے بنے ہوں؛ مثلاً جو، آلو، شہد، مکئی، چاول وغیرہ جیسا کہ فی زمانناعام اور شائع ہے تو اس کی نجاست وحرمت میں فقہاء کا اختلاف ہے؛ امام محمدؒ کے نزدیک قلیل بھی ناپاک ہے البتہ شیخینؒ کے نزدیک قلیل مقدار ناپاک نہیں اور ایسے پرفیوم کی تجارت بھی جائز ہے۔ ملاحظہ ہو الجامع الصغیر میں مذکور ہے:

وقال في الجامع الصغير: وما سوى ذلک من الأشربة فلا بأس به، قالوا: هذا الجواب على هذا العموم والبيان لا يوجد في غيره وهو نص على أن ما يتخذ من الحنطة والشعير والعسل والذرة حلال عند أبي حنيفةؒ ولا يحد شاربه عنده وإن أسكر منه ...عن محمدؒ أنه حرام...وكان أبويوسفؒ يقول:...ثم رجع إلى قول أبي حنيفةؒ، وقوله الأول مثل قول محمدؒ، و نبيذ العسل والتين ونبيذ الحنطة والذرة والشعير حلال وإن لم يطبخ، وهذا عند أبي حنيفةؒ وأبي يوسفؒ إذا كان من غير لهو وطرب. (الهداية: ۴/۴۹۶، كتاب الاشربة).

مفتی مصر علامہ محمد بن بخیت مطیعی مصری کے فتاویٰ میں مرقوم ہے:

وما كان مستحضراً من الثمار والحبوب والأخشاب فهو طاهر، وهذا الصنف هو الرائج والغالب استعماله في المتجر على ما بلغنا ممن بحثوا عنه...أما السبيرتو المأخوذ من الأشياء الطاهرة كالحبوب والاخشاب، فالأدوية والروائح العطرية المخلوطة به طاهرة وأما السبيرتو المستخرج من الأشياء المتخمرة، وهي الخمور فإن تلاشى فيها أو تحول من طبعه، فالظاهر أنه لا بأس به. (الفتاویٰ للامام محمد بن بخيت المطيعي مفتي الديار المصرية، ص ۱۹).

تكمله فتح الملهم میں ہے:

وإنما نبهت على هذا لأن "الكحول" المسكرة (Alcohols) اليوم صارت تستعمل في معظم الأدوية، ولأغراض كيمياوية أخرى، ولا تستغني عنها كثير من الصناعات الحديثة، وقد عمت بها البلوى، واشتدت إليها الحاجة، والحكم فيها على قول أبي حنيفةؒ سهل، لأنها إن لم تكن مصنوعة من النيء من ماء العنب، فلا يحرم بيعها عنده،

والذي ظهر لي أن معظم هذه الكحول لا تصنع من العنب ، بل تصنع من غيرها ...

فالحاصل أن هذه الكحول، لو لم تكن مصنوعة من العنب والتمر، فبيعها للأغراض الكيمياوية جائز باتفاق بين أبي حنيفةؒ وصاحبيه ، وإن كانت مصنوعة من التمر أو من المطبوخ من عصير العنب ، فكذلك عند أبي حنيفةؒ ، خلافاً لصاحبيه ، ولو كانت مصنوعة من العنب النيء فبيعها حرام عندهم جميعاً ، والظاهر أن معظم الكحول لا تصنع من عنب ، ولا تمر، فينبغي أن يجوز بيعها لأغراض مشروعة في قول علماء الحنفية جميعاً . (تكملة فتح الملهم : ١/ ٥٥١،ط:مكتبة دار العلوم كراتشي).

منتخبات نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

ابتدائی دور میں الکحل جو ہر شراب یا ردی شراب (شراب کی تلچھٹ) ہوتا تھا اس لیے فقہاء نے اس کو شراب کا حکم دیا تھا اور اس کو ناپاک وحرام قرار دیا تھا اور اس کا استعمال اور دوا میں استعمال بھی ناجائز قرار دیا تھا، مگر اب الکحل سائنٹیفک طریقے سے بننے لگی ہے، کہ وہ شراب نہیں رہتی بلکہ سرکہ (خل) کے حکم میں ہوجاتی ہے اس لیے جب تک دلائل شرعیہ سے یہ یقین نہ ہوجائے کہ الکحل وہی شراب کا جو ہر یا تلچھٹ ہے اس وقت تک اس کے ناپاک وحرام ہونے کا اور اس کے دوا وغیرہ میں استعمال کی ممانعت یا عدمِ جواز کا حکم نہیں دے سکتے ،اور نہ استعمال کے بعد یا جسم پر لگنے کے بعد تطہیر کا حکم دینا ضروری کہہ سکتے ہیں البتہ تقویٰ الگ بات ہوگی اور تقاضائے احتیاط کہا جائے گا نہ کہ فتویٰ۔ (منتخبات نظام الفتاویٰ، جلدِ اول، ص۳۹۶، ط: اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا)۔

امداد الفتاویٰ میں ہے: اسپرٹ اگر عنب و زبیب و رطب و تمر سے حاصل نہ کی ہو تو اس میں گنجائش ہے للاختلاف، ورنہ گنجائش نہیں للاتفاق۔ (امداد الفتاویٰ: ۱/ ۱۳۷)۔

کتاب الفتاویٰ میں مذکور ہے: جس سینٹ میں الکحل ہو اس سلسلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر انگور اور کھجور سے الکحل حاصل کیا گیا ہو، تو وہ شراب کے حکم میں ہونے کی وجہ سے ناپاک ہے، اس کا لگانا جائز نہیں، اور اگر لگا لیا اور الکحل لگا ہوا حصہ ہتھیلی کی گہرائی کی مقدار یا اس سے زیادہ ہو، تو اس کے ساتھ نماز کی ادائیگی درست نہیں، اگر ان دونوں کے علاوہ کسی اور شئ سے الکحل حاصل کیا گیا ہے، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ ناپاک نہیں اور اس کا استعمال درست ہے۔ (کتاب الفتاویٰ: ۶/ ۸۱)۔

مزید ملاحظہ ہو: (احسن الفتاویٰ:۲/ ۹۵، وفقہی مقالات:۱/ ۲۵۸، وفتاویٰ حقانیہ:۳/ ۲۰۸، وانعام الباری:۶/ ۲۱۲)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کرکٹ میں کامیابی پر کمپنی کی طرف سے انعام حاصل کرنے کا حکم:

سوال: بعض مسلمان کرکٹ کھیلتے ہیں، اس کی وجہ سے انہیں ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، پھر جب دوسرے ممالک کے ساتھ میچ میں کامیاب ہوتے ہیں تو انہیں بعض کمپنیاں انعام دیتی ہیں تو کیا اس انعام کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ عموماً کمپنیاں سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب: غیر مسلم کمپنیاں جو سود وغیرہ میں ملوث ہوتی ہیں، ان کی طرف سے مسلمان کریکیٹر کو انعام ملے تو اس کا لینا اور استعمال کرنا درست ہے، کیونکہ غیر مسلم سود وغیرہ مال کے مالک بن جاتے ہیں، نیز یہ انعام کمپنی یعنی ثالث کی طرف سے ہے اس وجہ سے وہ قمار سے بھی نکل جائے گا اور اس کا لینا جائز اور درست ہوگا۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

ولأبي حنيفةؒ أن أهل الذمة لا يلتزمون أحكامنا فى الديانات وفيما يعتقدون خلافه فى المعاملات ...الخ . (الهداية: ۲/ ۳۳۸).

وفيه أيضاً : وإذا باع المسلم خمراً وأخذ ثمنها ، وعليه دين ، فإنه يكره لصاحب الدين أن يأخذه ، وإن كان البائع نصرانياً فلا بأس به . (الهداية : ۴/ ۴۷۰).

علامہ سرخسیؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

...وأما الخمر والخنزير فقد قيل: الحرمة بخطاب خاص في حق المسلمين وهو قوله تعالىٰ: ﴿ يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر﴾ [المائدة:۹۰] إلى قوله تعالىٰ: ﴿ فهل أنتم منتهون ﴾ [المائدة: ۹۱]، وقيل: ليس من ضرورة الحرمة سقوط المالية والتقوم فالمال قد يكون حراماً وقد يكون حلالاً وإنما تنبنى المالية على التمول وهم يتمولون ذلک .

(المبسوط : ۵/ ۳۹، ادارة القرآن).

منتخباتِ نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار اور سودی لین دین بھی کرتے ہیں، بہت سی بیع باطل وفاسد بھی کرتے

ہیں، شراب بھی بناتے اور بیچتے ہیں، اوراس کی قیمت لیتے ہیں، خنزیر بھی بیچ کراس کی قیمت لیتے ہیں، پھر مسلمانوں کو یہ پیسے مزدوری میں انعام وغیرہ میں دیتے ہیں، اوران سب پیسوں کا حرام ہونا معلوم ہونے کے باوجوداس پیسوں کا لینا اس وقت تک شرعاً جائز وغیر مکروہ شمار ہوتا ہے جب تک کہ یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ چیز جس کو فروخت کرر ہا ہے یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈالکر لایا ہے یا جو قیمت دے رہا ہے یہ بعینہٖ وہی روپیہ ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈالکر مثلاً لایا ہے، (یعنی بعینہٖ چوری، ڈاکہ وغیرہ کا ہوتو جائز نہیں) غرض ان سب کا لے لینا اور استعمال کر لینا سب درست رہتا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکم جواز کیوں ہے تو اس کی وجوہ متعدد ہیں، متعدد شرعی ضوابط اس کی بنیاد ہیں، مثلاً: (الف) تبدیل ملک سے حکماً تبدیل عین ہوجاتا ہے یا (ب) خلط واستہلاک کا ضابطہ جو مسلّم ہے... جس محکمہ کے اصحابِ حل وعقد خالص غیر مسلم ہوں یا مشترک ہوتے ہوں، اقتدارِ اعلیٰ غیر مسلم کے ہاتھ میں ہواور وہ اپنے طور پر سودی کاروبار کر کے نفع حاصل کر کے، کوئی رقم حاصل کر لے، اور بطورِ تبرع کسی مسلمان ملازم کو دیں تو اس کا لینا جائز رہے گا، اور بمد انعام داخل ہوکر طیب وحلال شمار ہوگا۔

(منتخبات نظام الفتاویٰ، ص ۴۶۸، ط: اصلاحی کتب خانہ)۔ مزید ملاحظہ ہو: (امدادالاحکام: ۴۹۰/۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایک کمپنی کے چند شرائط کے ساتھ شرکت کا حکم:

سوال: ایک کمپنی کے کچھ شرائط ہیں؛ ا۔ سرمایہ داروں کے ساتھ نفع نقصان میں شریک ہوگی ۲۔ اخراجات منہا کیے بغیر نفع کی تقسیم ہوگی ۳۔ اگر کوئی کمپنی سے علیحدہ ہونا چاہے تو یوم الشرا کے اعتبار سے قیمت ادا کی جائے گی بازاری قیمت کا اعتبار نہ ہوگا۔ تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ مذکورہ شرائط کے ساتھ اس کمپنی میں شرکت جائز ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مال دونوں کی طرف سے ہے اور عمل کمپنی کے ذمہ ہے، تو یہ عقد اصلاً مضاربت ہے لیکن تبعاً مشارکت ہے، اور عقدِ مضاربت میں مضارب پر تاوان کی شرط فاسد ہے، البتہ مضاربت فاسد نہ ہوگی ہاں شرط خود باطل ہوجائے گی۔ لیکن اگر حکومت یا بینک کے قوانین کے اعتبار سے لعینہٖ اس شرط کا لکھنا ضروری نہ ہوتو اس طرح لکھا جائے کہ رب المال اور کمپنی دونوں اپنے اپنے حصہ کے نقصان کے ذمہ دار ہوں گے، اور اگر لکھنا ضروری ہوتو یوں لکھا جائے کہ مضاربت میں رب المال کے مال اور مضارب کی محنت کا نقصان ہوتا ہے، اور نقصان کی صورت میں اگر رب المال نے کمپنی کے خلاف مقدمہ دائر کردیا تو کمپنی

(مضارب) وعدہ کرتی ہے کہ تبرعاً نقصان کی تلافی کرے گی اگر چہ شرعاً ضروری نہیں ہے۔
مضارب رب المال کے ساتھ اپنا مال ملا کر شریک ہوسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

الأصل أن ما يفعله المضارب ثلاثة أنواع: نوع يملكه بمطلق المضاربة وهو ما يكون من باب المضاربة وتوابعها ومن جملته التوكيل بالبيع والشراء للحاجة ...ونوع يملكه بمطلق العقد ويملكه إذا قيل: اعمل برأيك وهو ما يتحمل أن يلحق به فيلحق به عند وجود الدلالة وذلك مثل دفع المال مضاربة أو شركة إلى غيره وخلط مال المضاربة بماله أو بمال غيره . (الفتاوى الهندية: ۴/ ۲۹۱، باب فيما يملك المضارب من التصرفات).

درمختار میں مرقوم ہے:

ولا يملك المضاربة والشركة والخلط بمال نفسه إلا بإذن. وفي رد المحتار: والخلط بمال نفسه أي أو غيره كما في البحر إلا أن تكون معاملة التجار في تلك البلاد أن المضاربين يخلطون، ولا ينهونهم فإن غلب التعارف بينهم في مثله وجب أن لا يضمن كما في التاتارخانية . (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۵/ ۶۴۹، كتاب المضاربة، سعيد).

شرکت ومضاربت عصر حاضر میں مذکور ہے:

عموماً مضارب اپنے پاس سے پیسے نہیں لگاتا، بلکہ رب المال سے سرمایہ لے کر کاروبار کرتا ہے، لیکن اگر مضارب بھی اپنا کچھ سرمایہ اسی کاروبار میں لگانا چاہے تو اس معاملے میں مضاربت کے ساتھ شرکت بھی جمع ہوجائے گی... یہ صورت بھی شرعی اعتبار سے جائز ہے، اور اس صورت میں مضارب کے لیے جائز ہے کہ وہ نفع میں دوحیثیتوں سے شریک ہو، ایک شریک کی حیثیت سے، کیونکہ اس نے اپنا سرمایہ بھی لگایا ہے، اور ایک مضارب کی حیثیت سے، کیونکہ وہ اپنے رب المال کے روپے سے کاروبار میں محنت کررہا ہے، ان دونوں حیثیتوں کے لحاظ سے ایسے مضارب کے لیے منافع کا الگ الگ فی صد حصہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔ (شرکت ومضاربت عصر حاضر میں، ص ۲۴۲)۔

مضارب یعنی کمپنی پر نقصان برداشت کرنے کی شرط کا حکم:

جتنے فیصد کسی کی سرمایہ کاری ہے اتنا ہی فیصد وہ نقصان میں حصہ دار ہے، یہ اصول شریعت کی طرف سے

مقرر ہے، لہٰذا تمام شرکاء مل کر بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، خلاصہ یہ ہے کہ شرکت کے کاروبار میں نقصان ہر شریک کے مال کے تناسب سے ہوگا، اوراس قاعدہ کی بنیاد حضرت علیؓ کا اثر ہے، جس میں انہوں نے فرمایا:

والوضيعة على المال والربح على ما اصطلحوا عليه . (مصنف عبدالرزاق :۸/۲۴۸/۱۵۰۸۷).

علامہ ابوبکر کاسانیؒ بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں:

والـوضيـعة على قدر المالين متساوياً ومتفاضلاً ، لأن الوضيعة اسم لجزء هالك من المال، فيتقدر بقدر المال . (بدائع الصنائع: ۶/۶۲، سعید). (ملخص از شرکت ومضاربت عصر حاضر میں، ص۲۱۶)۔

شرط (۲) کمپنی اخراجات منہا کیے بغیر منافع تقسیم کرے گی، یہ شرط باطل ہے صحیح نہیں ہے کیونکہ کمپنی مضارب ہے اور مضارب پر تمام اخراجات کا بوجھ ڈالنا صحیح نہیں ہے، دراصل اخراجات منافع سے منہا کیے جائیں گے اور اگر منافع نہ ہوں تو راس المال سے منہا کیے جائیں گے۔ ہاں اگر قانونی مجبوری ہو تو اس طرح لکھا جائے کہ کمپنی اگرچہ شرعاً تمام اخراجات کو برداشت کرنے کی ذمہ دار نہیں ہے لیکن یہ وعدہ کرتی ہے کہ تبرعاً بطورِ احسان برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ ملاحظہ ہو مبسوط میں علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

قـال: إن جـاء أحـدهـمـا بـألف درهـم والآخـر بـألـفـي درهم فاشتركا على أن الربح والـوضيعة نصفان فهذه شركة فاسدة ، ومراده أن شرط الوضيعة نصفين فاسد لأن الوضيعة هـلاک جـزء مـن الـمـال فكأن صاحب الألفين شرط ضمان شيء مما يهلک من ماله على صاحبه وشرط الضمان على الألفين فاسد ولكن لا يبطل بهذا أصل العقد لأن جواز الشركة بـاعتبـار الـوكـالة والـوكالة لا تبطل بالشروط الفاسدة وإنما تفسد الشروط وتبقى الوكالة فكذا هذا فإن عملا على هذا فوضعا فالوضيعة على قدر رؤوس أموالهما لأن الشرط بخلافه كـان بـاطلاً وإن ربـحـا فـالـربـح عـلى ما اشترطا لأن العقد كان صحيحاً واستحقاق الربح بالشرط . (المبسوط للامام السرخسیؒ: ۱۱/۲۸۸، ط:بیروت).

بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

لـو شرط عليه أن الوضيعة على وعليک فهذه مضاربة والربح بينهما والوضيعة على رب الـمال لأن شرط الوضيعة على المضارب شرط فاسد فيبطل الشرط وتبقى المضاربة .

(بدائع الصنائع: ۶/۸۰،سعید). مزید ملاحظہ ہو: (الهداية: ۳/۲۶۴،والفتاوى الهندية: ۴/۲۸۸،وفتاویٰ حقانيه: ۶/۳۵۰، وكفايت المفتى: ۸/۱۱۶).

شرط (۳) مضاربت کے اختتام پر یوم الشراء کی قیمت لگانے کا حکم:

اگر مضاربت ختم کرنا چاہیں اور کمپنی کا رب المال کو اس کا نقد دینا ضروری ہو تو عام طور پر بازاری قیمت لگائی جاتی ہے، لیکن اگر کمپنی یہ شرط لگادے کہ یوم الشراء کی قیمت لگائی جائے گی تو پھر بطورِ صلح اس کو منظور کرلیں یعنی تخارج اور صلح کی شکل میں اپنے حق سے کچھ نزول کرتے ہوئے رضامندی ظاہر کی جائے۔

یوم الشراء کی قیمت لگانے سے متعلق علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

ثم اعلم أن الشريكين إذا اشتريا بالمال متاعاً ثم أرادا القسمة فإنه يقوم ذلك يوم اشترياه ويكون الربح بينهما على قدره ولو اشتركا في العروض على أن لكل واحد حصة ماله فاشتريا بها متاعاً ثم باعاه بألف درهم فإنهما يقتسمان الدراهم على قيمة العروض يوم اشترياه كذا في الينابيع . (البحر الرائق: ۵/۱۸۶،ط: کوئٹہ).

(وكذافي فتاوى الشامي: ۴/۳۳۱، سعيد، والمحيط البرهاني: ۶/۴۰۶، والفتاوى الهندية: ۲/۳۲۱).

صلح کے بارے میں ملاحظہ کیجیے: **قال في البحر الرائق: ولو أخرجت الورثة أحدهم عن عرض أو عقار بمال أو عن ذهب بفضة أو على العكس صح قل أو كثر حملاً على المبادلة لا إبراء .**

(البحر الرائق: ۷/۲۶۰،ط: کوئٹہ).

اللباب في شرح الكتاب میں مذکور ہے:

وإذا كان السلم بين شريكين فصالح أحدهما من نصيبه على دفع من رأس المال فإن أجازه الآخر جاز اتفاقاً . (اللباب في شرح الكتاب: ۱/۲۱۸).(وكذا في النتف في الفتاوى،ص۳۰۸، وتحفة الفقهاء: ۳/۲۵۰). مزید ملاحظہ ہو: (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/۳۸و۴۶)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

سودی قرض کے عوض فوائد حاصل کرنے کا حکم:

سوال: اگر ایک کمپنی اپنے ملازمین کو کہے کہ فلاں کمپنی کو قرض دو اس کے بدلے ہم آپ کو ایسے منافع

دیں گے جو آپ کے ساتھ خاص ہوں گے، کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوں گے، کیا ایسا معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مذکورہ بالا معاملہ کا ماحصل یہ ہے کہ سودی قرض پر راضی کر کے اس پر کچھ منافع دینا ہے، جو کہ سودی معاملہ پر ایک قسم کا تعاون ہے، اور شریعتِ مطہرہ میں سودی قرض بھی جائز نہیں اور سودی قرض کی وکالت بھی جائز نہیں، بنابریں سودی قرض پر منافع حاصل کرنے سے بچنا ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث میں ہے:

عن جابر رضي الله عنه قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: وهم سواء. (رواه مسلم، رقم: ۱۵۹۸).

قال الإمام النووي رحمه الله: وفيه: تحريم إعانة على الباطل، والله أعلم. (شرح صحيح مسلم: ۲٦/۱۱).

وقال الملا على القاري: قال الخطابي: سوى رسول الله صلى الله عليه وسلم بين آكل الربا وموكله إذ كل لا يتوصل إلى أكله إلا بمعاونته ومشاركته إياه فهما شريكان فى الإثم كما كانا شريكان فى الفعل. (المرقاة: ۲۹۴/۹).

درمختار میں مرقوم ہے:

أمر المسلم ببيع خمر أو خنزير أو شرائهما، أى وكل أى وكل المسلم ذمياً أو أمر المحرم غيره أى غير المحرم ببيع صيده، يعنى صح عند الإمام مع أشد كراهة كما صح ما مر، لأن العاقد ينصرف بأهليته وانتقال الملك إلى الآمر حكمي وقالا: لا يصح، وهو الظهر، شرنبلالية عن البرهان. وفى الشامية: قوله وهو الأظهر، لعل وجهه ما قاله فى الفتح من أن حكم هذه الوكالة فى البيع أن لا ينتفع بالثمن وفى الشراء أن يسيب الخنزير ويخلل الخمر أو يريقها فبقي تصرفاً بلا فائدة فلا يشرع مع كونه مكروهاً تحريماً فأى فائدة فى الصحة. (الدر المختار مع رد المحتار: ۸۳/۵، سعيد).

وفي فتح القدير: أن الموكل لا يملك بنفسه فلا يملك تولية غيره فيه. (فتح

القدیر: ۶/ ۴۳۹، دار الفکر).

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ فرماتے ہیں معصیت میں تعاون فساد فی الارض کی طرح ہے؛

قال : الإعانة فی المعصية و ترويجها وتقريب الناس إليها معصية وفساد فی الأرض .
(حجة الله البالغة: ۲/ ۱۹۲).

مزید ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی: ۱۱/ ۱۹۷، جامعہ فاروقیہ، وفتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۳۴۹، جامعہ فاروقیہ)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

عیسائیوں کو گرجا بنانے کے لیے مکان کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: کیا مسلمان شخص اپنا مکان عیسائیوں کو گرجا بنانے کے لیے کرایہ پر دے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کسی نے دیدیا تو کرایہ لینا اور استعمال کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: باطل اور منسوخ مذہب کی ترویج واشاعت کا سبب بننا اور اس کی مدد کرنا جائز نہیں ہے بنابریں صاحبینؒ کے قول کے مطابق یہ اجارہ ناجائز ہے اور اگر کسی نے غلطی سے یا نادانستہ طور پر دیدیا ہو تو اس کا کرایہ مکروہ اور واجب التصدق ہوگا۔ ملاحظہ ہو فتح القدیر میں مذکور ہے:

فأما إذا استاجرها فی الابتداء ليتخذها بيعة أو كنيسة لا يجوز على قول أبي يوسفؒ ومحمدؒ في هذه المسألة لكون مختار نفسه قولهما . (تكملة فتح القدير: ۱۰/ ۶۰، دار الفكر).

القول الراجح میں منقول ہے:

القول الراجح هو قول الصاحبين لأن قولهما منصوص عليه وقولهما مبنى على الاحتياط... قال فخر الإسلام : قول أبي حنيفة قياس وقولهما استحسان ، وهكذا فی رد المحتار عن الزيلعی . (القول الراجح: ۲/ ۳۰۶).

جواہر الفقہ میں مرقوم ہے:

ثم السبب إن لم يكن محركاً وداعياً ، بل موصولاً محضاً ، وهو مع ذلک سبب قريب بحيث لا يحتاج في إقامة المعصية به إلى إحداث صنعة من الفاعل كبيع السلاح من أهل الفتنة...وإجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر أو يتخذها كنيسة أو بيت نار وأمثالها، فكله مكروه تحريماً بشرط أن يعلم به البائع والآجر من دون تصريح به باللسان ، فإنه إن لم يعلم

كان معذوراً وإن علم وصرح كان داخلاً في الإعانة المحرمة . (جواہر الفقہ:۲/۴۵۳، طبع قدیم)۔

کتاب الفتاویٰ میں مذکور ہے:

اسلام کی بنیادی تعلیم خدا کی وحدت ہے، اس کی نگاہ میں سب سے زیادہ خلافِ واقعہ بات یہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کوشریک ٹھہرایا جائے... (ہندوؤں کے) تمام تہوار کسی نہ کسی مشرکانہ فکر پرمبنی ہیں... اللہ تعالیٰ نے ہمیں گناہ پر تعاون سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے فقہاء نے گانے بجانے کے اجارہ کو نادرست قرار دیا ہے۔ کوئی مسلمان شراب کے لیے اپنا گھر کرایہ پر دے، یا اپنی سواری شراب کی بار برداری کے لیے دے تو امام ابوحنیفہؒ کے دونوں لائق تلامذہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اسی اصول کی بنا پر اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ (کتاب الفتاویٰ: ۵/۴۰۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

گوسٹ رائٹنگ (Ghost Writing) کا پیشہ اختیار کرنے کا حکم:

سوال: کیا گوسٹ رائٹنگ کا پیشہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز گوسٹ رائٹنگ سے کمایا ہوا مال حلال ہوگا یا نہیں؟ گوسٹ رائٹنگ کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی کاریگری اور ہنرمندی اور تجربہ کاری سے کہانیاں وغیرہ کی کتابیں لکھتا ہے، پھر معاہدہ کے تحت کوئی اور کمپنی اپنے نام سے شائع کرتی ہے اور اس کتاب نویس کو اس کی اجرت ادا کر دیتی ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصل مؤلف کو اس کی شہرت نہ ملے۔

الجواب: یہاں دو مسئلے علیحدہ ہیں: ۱۔ ایسی کہانیاں یا کتابیں لکھنا جن میں محاسن اخلاق اور سبق آموز واقعات اور معاشرے کی اصلاح کے تعلق سے مضامین شامل ہو جائز اور درست ہے۔ ہاں مخربِ اخلاق، فحش اور گندے مضامین اور عریانیت کو پھیلانے والی باتیں ہوں تو اس کا لکھنا اور شائع کرنا جائز نہیں ہے۔

۲۔ تنخواہ اور اجرت لینے سے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ جن مضامین کا لکھنا درست ہے ان کی اجرت بھی جائز ہے اور جن مضامین کا لکھنا جائز نہیں ہے ان کی اجرت بھی ناجائز ہے۔ خلاصہ یہ ہوگا کہ گوسٹ رائٹنگ کا حکم اور اس کی اجرت کا حکم مضامین کے اوپر مرتب ہوگا، یعنی اگر مضامین درست ہوں تو جواز کا حکم ہوگا ورنہ عدم جواز کا حکم لاگو ہوگا۔ لیکن اگر ایسے مضامین ہیں جن کا دینی یا دنیوی کوئی فائدہ نہیں تو یہ لایعنی میں داخل ہوگا اور اس سے بچنا بہتر ہوگا۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن علي بن حسين قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إن من حسن إسلام

المرء تركه ما لايعنيه . (سنن الترمذی،رقم: ۲۳۱۸).

أخرج أبويعلى في مسنده : عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه ، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: حدثوا عني ولا حرج حدثوا عني ولا تكذبوا علي ومن كذب على متعمداً فقد تبوأ مقعده من النار وحدثوا عن بني إسرائيل ولا حرج . (مسند ابی یعلی ،رقم: ۱۲۰۹).

وفي تعليقاته لحسين سليم أسد: إسناده صحيح .

قال في الدر المختار: وحديث حدثوا عن بني إسرائيل يفيد حل سماع الأعاجيب والغرائب من كل ما لا يتيقن كذبه بقصد الفرجة لا الحجة بل و ما يتيقن كذبه لكن بقصد ضرب الأمثال والمواعظ وتعليم نحو الشجاعة على ألسنة آدميين أو حيوانات ذكره ابن حجر. وفي الشامية : وفي لفظ لأحمد بن منيع عن جابر رضي الله عنه: حدثوا عن بني إسرائيل فإنه كان فيهم أعاجيب...فرق عليه الصلاة والسلام بين الحديث عنه والحديث عنهم. قوله بقصد الفرجة لا الحجة ، الفرجة مثلثة التفصي عن الهَمّ، قوله : لكن بقصد ضرب الأمثال ، وذلك مقامات الحريري فإن الظاهر أن الحكايات التي فيها عن الحارث بن همام والسروجي لا أصل لها وإنما أتى بها على هذا السياق العجيب لما لا يخفى على من يطالعها وهل يدخل في ذلك مثل قصة عنترة والملك الظاهر وغيرهما . (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/۴۰۵، سعيد).

معارف القرآن میں مذکور ہے:

اس زمانہ میں بیشتر نوجوان فحش ناول یا جرائم پیشہ لوگوں کے حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار دیکھنے کے عادی ہیں، یہ سب چیزیں اسی قسم لہو حرام میں داخل ہیں، اسی طرح گمراہ اہل باطل کے خیالات کا مطالعہ بھی عوام کے لیے گمراہی کا سبب ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، راسخ العلم علماء ان کے جوابات کے لیے دیکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔(معارف القرآن:۷/۲۳)۔

حلال وحرام میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب لکھتے ہیں:

اگر یہ مفروضہ کہانیاں عبرت آموز اور نصیحت خیز ہوں، صالح مقصد کی حامل ہوں اور تعمیری ہوں تو نہ

صرف جائز بلکہ بہترین ہیں، لیکن اگر ان کا مقصد سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنا اور اخلاقی انارکی پیدا کرنا ہو تو ظاہر ہے کہ سخت گناہ اور ناجائز ہیں۔ (حلال وحرام،ص۲۳۴)۔

ناجائز فعل کی اجرت بھی ناجائز ہے؛ چنانچہ فحش ناول قصہ کہانی کی کتاب اجرت پر دینا اور اجرت لینا جائز نہیں۔ ملاحظہ ہو: جدید معاملات کے شرعی احکا میں مرقوم ہے:

بعض لوگ دکان میں مختلف قسم کے فحش ناول قصہ کہانی کی کتابیں رکھتے ہیں ان کو کرایہ پر دیکر آمدنی حاصل کرتے ہیں، اولاً تو فحش تصاویر والے لیٹریچر اسی طرح ناول، جرائم پیشہ لوگوں کے حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار وغیرہ اسی طرح اہل باطل کے خیالات کا مطالعہ کرنا بھی عوام کے لیے گمراہی کا سبب ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اس کے لیے کتب فراہم کرنا یہ ناجائز کام میں تعاون ہونے کی وجہ سے گناہ کا کام ہے۔(۱/۲۲۹)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

معقود علیہ عین معصیت ہو جیسے ناچ، گانا بجانا، زنا، چوری، جعل سازی، چغل خوری، تعزیہ بنانا، بت سازی، تصویر سازی، شراب کشی، شرک وکفر اور حرام کاموں کی ترویج اور بدعات وفسق وفجور، یہ اجارہ بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے۔ ان گناہ کے کاموں کی انجام دہی سے جو اجرت یا نفع حاصل ہوا وہ ملک خبیث ہے ... بلانیت ثواب صدقہ کر دینا واجب ہے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام، جلداول،ص۲۰۴، وص۱۱۰)۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مرقوم ہے:　حرام کام کی اجرت بھی حرام ہے۔(۶/۴۰)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کمپنی کے ملازمین کی غفلت کی وجہ سے ان پر تاوان ڈالنے کا حکم:

سوال: ایک کمپنی ہے جو پردے اور اس سے متعلق سامان تیار کرتی ہے، اس کمپنی کے ملازمین یہ اشیاء تیار کرتے ہیں، بہت سی مرتبہ ملازمین غفلت اور کوتاہی برتتے ہیں جس کی وجہ سے سامان صحیح تیار نہیں ہوتا اور خریدار کی طرف سے شکایتیں موصول ہوتی ہیں، کمپنی نے کئی مرتبہ ملازمین کو متنبہ کیا لیکن اپنی غفلت سے باز نہیں آتے، اب کمپنی ملازمین پر جرمانہ عائد کرنا چاہتی ہے، تو کیا شرعاً اس کی اجازت ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ کمپنی کے ملازمین اجیر خاص کے حکم میں ہیں اور اجیر خاص کا حکم یہ ہے کہ اگر کوئی چیز بلا تعدی ضائع ہو جائے تو تاوان واجب نہیں ہوگا، البتہ خود ہلاک کردے، اور ان کی طرف سے تعدی پائی جائے تو تاوان واجب ہوگا، چنانچہ کمپنی کے مینیجر کے بار بار بتانے کے باوجود ملازمین غفلت سے باز نہیں

آتے لہٰذان پرتاوان اور جرمانہ لگانا صحیح اور درست ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

قوله ولا يضمن ما هلك في يده ، أى بغير صنعه بالإجماع وقوله أو بعمله أى المأذون فيه فإن أمره بعمل فيعمل غيره ضمن ما تولد منه . (فتاوى الشامي: ٦/ ٧٠، سعيد).

قال في النتف في الفتاوى: فأما الأجير الخاص فهو الذي يعمل لك وحدك دون غيرك ويقال له أجير الوحد وهو لا يضمن ما يهلك على يديه إلا في ثلاثة أوجه : إذا خالف أو تعدى أو تعمد . (النتف في الفتاوى: ٢/ ٥٦١، ط: لبنان).

قال في مجمع الضمانات: ولا ضمان على الأجير الخاص ولا فيما تلف من عمله اتفاقاً إذا لم يتعمد الفساد ذكره في الإصلاح نقلاً عن الخانية قال في الفصولين نقلاً عن التجريد الأجير الخاص: لايضمن إلا بالتعدى . (مجمع الضمانات: ١/ ١٠٣).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں مرقوم ہے:

اجیر خاص کے ہاتھ سے کوئی چیز بغیر تعدی کے ضائع ہو جائے تو اس پر تاوان لازم نہ ہوگا اور اگر خود تلف کردے تو ضمان لازم ہوگا۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام، جلد اول، ص ۱۹۸)۔

مزید ملاحظہ ہو: (شرح مجلّہ: ۲/ ۷۱۸، وعالمگیری: ۴/ ۵۰۰، ومحیط برہانی: ۱۲/ ۳۱، وفتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۶۳۲)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بینک کا وکالت پر اجرت لینے کا حکم:

سوال: اگر مشتری بینک کو گاڑی خریدنے کے لیے وکیل بالشراء بنادے اور دس ہزار بینک کے لیے وکالت کی اجرت متعین کردے تو کیا بینک کے لیے یہ اجرت جائز ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: وکیل کا اجرت کے ساتھ کام کرنا جائز اور درست ہے جبکہ وہ وکیل اجرت لینے میں معروف و مشہور ہو یا پہلے سے بتلا دیا جائے اور اجرت بھی متعین کردی جائے، تاکہ بعد میں نزاع واقع نہ ہو، چنانچہ بینک کا دس ہزار لیکر اپنے موکل کے لیے گاڑی خریدنا جائز اور درست ہے۔ ملاحظہ ہو فتح القدیر میں مرقوم ہے:

والصواب أن مراد صاحب العناية هو أنه قد يكون في نفس الوكالة التعاوض كما إذا أخذ الوكيل الأجرة لإقامة الوكالة فإنه غير ممنوع شرعاً ، إذ الوكالة عقد جائز لا يجب

علی الوکیل إقامتها فیجوز أخذ الأجرة فیها . (فتح القدیر: ۳/۸، دارالفکر، و فتاوی الشامی: ۷/۲۶۹).

اسلامی فقہ میں ہے: بااجرت وکیل میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اجرت لے کر یا کمیشن پر کوئی کام کرتے ہیں، کسی حکومت کے تمام ملازمین اس کے وکیل ہوتے ہیں، اس لیے ان کو اپنی حکومت کی مرضی کے مطابق کام کرنا چاہیے، آپ اپنے ذاتی ملازم سے کوئی کام کرائیں تو یہ آپ کا وکیل سمجھا جائے گا، اسی طرح اگر آپ کمیشن ایجنٹ مقرر کریں تو یہ آپ کا وکیل سمجھا جائیگا، یعنی اس کو آپ کی ہدایت کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ (اسلامی فقہ: ۲/۲۴۷)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۵/۲۰۷ و ۱۷۷ ط: زمزم، وجدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۲۲۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اقالہ کی فیس (کینسلیشن فیس) لینے کا حکم:

سوال: اقالہ میں کچھ فیس لگانا جائز ہے یا نہیں؟ اس فیس کو عرفِ عام میں کینسلیشن کہتے ہیں، نیز اگر بائع نے قبضہ بھی نہ دیا ہو تو فرق ہوگا یا نہیں؟ مثلاً ایک شخص نے کوئی چیز خریدی اور بطورِ ڈپازٹ ۲۰۰ ریند ادا کیے، بعد میں آکر کہتا ہے کہ کینسل کرو مجھے نہیں لینا ہے، تو کیا اس صورت میں ڈپازٹ کی رقم میں سے کچھ کاٹ سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بیع مطلق ایجاب وقبول ہونے کے بعد مکمل ہو کر لازم ہو جاتی ہے پھر کسی کو اختیار نہیں رہتا، ہاں اگر مشتری اقالہ کرنا چاہے تو بائع کی رضامندی سے درست ہے، لیکن بائع کا اس پر کوئی فیس وصول کرنا یا ثمن میں سے کچھ رقم رکھ لینا درست نہیں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعانہ ضبط کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

حدثنا عبد اللّٰه بن مسلمة قال: قرأت علی مالک بن أنس ﷺ أنه بلغه عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده أنه قال: نهی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، عن بیع العربان، قال مالک: وذلک فیما نری واللّٰه أعلم، أن یشتری الرجل العبد أو یتکاری الدابة ثم یقول: أعطیک دیناراً علی أني إن ترکت السلعة أو الکراء فما أعطیتک لک . (سنن ابی داود، رقم: ۳۵۰۴).

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ فرماتے ہیں:

قال: ونهی عن بیع العربان أن یقدم المشتری إلی البائع شيء من الثمن، فإن اشتری

حسب من الثمن، وإلا فهو له مجاناً ، وفيه معنى الميسر . (حجة الله البالغة : ۱۹۱/۲،البیوع المنهي عنها ، ط: قديمی).

بدایۃ المجتہد میں مرقوم ہے:

جمهور علماء الأمصار على أن بيع العربان غيرجائز...وإنما صار الجمهور إلى منعه لأنه من باب الغرر والمخاطرة وأكل المال بغير عوض . (بداية المجتهد:۱۶۲/۲).

اقالہ ثمن اول پر ہوتا ہے اور کمی بیشی کی شرط باطل ہے۔ملاحظہ ہو ہدایہ میں مذکور ہے:

الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الأول، لقوله عليه الصلاة والسلام: من أقال نادماً بيعته أقال الله عثرته يوم القيامة ، ولأن العقد حقهما فيملكان رفعه دفعاً لحاجتهما ، فإن شرطا أكثر منه أو أقل فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الأول . (الهداية:۱۰۲/۳،ط:بشری).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

حیوانات کے سری پائے میں بیع سلم کا حکم:

سوال: ایک آدمی کو پائے کھانے کا بہت شوق ہے وہ قصائی سے کہنا چاہتا ہے کہ ہر اتوار کو مجھے گائے کے پائے ۴۰۰ رینڈ میں چاہیے، کیا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہو تو بیع کی کونسی قسم میں داخل ہوگا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ وقت، قیمت اور مبیع متعین ہونے کی وجہ سے جائز اور درست ہے اس میں نزاع کی کوئی شکل نہیں، لہٰذا یہ بیع سلم میں داخل ہو کر جائز ہوگا۔ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن ابن عباس رضي الله عنه قال: قدم النبي صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يسلفون بالتمر السنتين والثلاث فقال: من أسلف في شيء ففي كيل معلوم ووزن معلوم إلى أجل معلوم .

(صحيح البخاری،رقم: ۲۲۴۰،باب السلم فی وزن معلوم).

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اصلاً سری پائے اور گوشت میں بیع سلم جائز نہیں ہے، لیکن صاحبِ ہدایہؒ نے فرمایا کہ اگر اس کی پوری کیفیت بتلا دی جائے تو جائز ہے نیز صاحبینؒ کے نزدیک جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے: **ولا في أطرافه كالرؤوس والأكارع، للتفاوت فيها ، إذ هو عددي لا مقدر لها ، قال ولا في الجلود عدداً ، ولا في الحطب حزماً ، ولا في الرطبة جرزاً ، للتفاوت**

إلا إذا عرف ذلک بأن يبين له طول ما يشد به الحذمة أنه شبر أو ذراع ، فحينئذٍ يجوز إذا كان على وجه لا يتفاوت . (الهداية:۳/۱۳۷).

شرح نقایہ میں مرقوم ہے:

ولا يصح السلم في اللحم عند أبي حنيفةؒ ويصح عندهما وبه يفتى . (شرح النقاية :۳/۲۷۸).

البحرالرائق میں مذکور ہے: وقالا: يجوز إذا بين جنسه ونوعه وسنه وموضعه وصفته وقدره كشاة خصي ثني سمين من الجنب أو الفخذ مائة رطل، لأنه موزون مضبوط الوصف ... و في الحقائق والعيون الفتوى على قولهما . (البحرالرائق:۶/۱۷۲،دارالكتاب الاسلامی).

(وكذافي الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: ۴/۲۸۹،وفتاویٰ دارالعلوم زكريا:۵/۲۷۷).

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا معاملہ بیع سلم کے تحت داخل ہوکر جائز ہوگا اور اگر کسی کو بیع سلم تسلیم نہ ہو تو پھر یہ وعدہ ہوجائے گا اور جب پائے لینے کا وقت آئیگا اس وقت بیع ہوجائے گی۔ واللہ ﷻ اعلم۔

کرسمس کے موقع پر دکان سجانے کا حکم:

سوال: کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ کرسمس کے موقع پر اپنی دکان میں کرسمس ٹری (درخت) لگا کر بناؤ سنگار کرے؟ اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کی دکان پر ملازمت کرتا ہو اور اسے کہا جائے کہ تم بناؤ سنگار کرو تو کیا حکم ہے؟ نیز گھروں میں کرسمس بناؤ سنگار کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: کسی مسلمان شخص کا کرسمس کے دنوں میں اپنی دکان یا مکان میں کرسمس بناؤ سنگار جس میں ذی روح کی تصاویر ہوں اور مسیحی دین کی تعظیم ہو بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ ہاں زیب وزینت اور آرائش کا سامان بحیثیتِ سامان فروخت کرنے کی اجازت ہے جبکہ اس میں ذی روح کی تصویر نہ ہو۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الصورة في البيت ، ونهى عن أن يصنع ذلک حديث جابر رضی اللہ عنہ حديث حسن. (سنن الترمذي: ۱/۳۰۵،باب ماجاء في الصورة).

مشکوٰۃ شریف میں روایت مذکور ہے:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تشبه بقوم فهو منهم .

(مشكاة المصابيح ،ص ۳۷۵).

قال العلامة الملا على القاري في مرقاة المفاتيح : أى من شبه نفسه بالكفار مثلاً فى اللباس وغيره أو بالفساق أو الفجار أو بأهل التصوف والصلحاء الأبرار، فهو منهم : أى فى الإثم والخير . (مرقاة المفاتيح : ۸/۲۵۵).

قال في فيض القدير : من تشبه بقوم ، أى تزيا في ظاهره بزيهم وفي تعرفه بفعلهم وفي تخلقه بخلقهم وسار بسيرتهم وهديهم في ملبسهم وبعض أفعالهم أى وكان التشبه بحق قد طابق فيه الظاهر والباطن، فهو منهم...لو خص أهل الفسوق والمجوس بلباس منع لبسه لغيرهم فقد يظن به من لا يعرفه أنه منهم فيظن ظن السوء فيأثم الظان والمظنون فيه بسبب العون عليه وقال بعضهم: قد يقع التشبه في أمور قلبية من الاعتقادات وإرادات وأمور خارجية من أقوال وأفعال قد تكون عبادات وقد تكون عادات في نحو طعام ولباس ومسكن ونكاح واجتماع وافتراق وسفر وإقامة وركوب وغيرها...وقد يحمل منهم فى القدر المشترك الذي شابههم فيه فإن كان كفراً أو معصية أو شعاراً لها كان حكمه كذلك .

(فيض القدير : ۶/۱۰۴).

مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر میں مذکور ہے:

و يكفر بخروجه إلى نيروز المجوس والموافقة معهم فيما يفعلونه في ذلك اليوم وبشراءه يوم نيروز شيئاً لم يكن يشتريه قبل ذلك تعظيماً للنيروز لا للأكل والشرب وبإهدائه ذلك اليوم للمشركين . (مجمع الانهر :۴/۴۹۴).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

کفار ومشرکین کے مذہبی میلے جن میں شعائر شرک وکفر کا اظہار اور اصنام واوثان کی پرستش اور تعظیم ہوتی ہے ایسے میلوں میں بغرضِ تفریح وسیر وتماشابینت قیام واتحاد شریک ہونا اور رونق بڑھانا یا ایسے امور کے لیے جو شعائر کفر میں داخل ہیں چندہ دینا یا معاونت کرنا حرام ہے۔(کفایت المفتی:۱۳/۱۶۴، جامعہ فاروقیہ)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۸/۲۲۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

کلب کارڈ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا حکم:

سوال: کیا کلب کارڈ حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ کلب کارڈ بھی پوئنٹ کارڈ کی طرح ہوتا ہے جو ایک خاص دکان کلکس سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس دکان سے خریداری پر پوئنٹ ملتے ہیں، برائے مہربانی حکم شرعی سے مطلع فرما کر اجر عظیم کے مستحق ہوں؟

الجواب: کلب کارڈ حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اُٹھانا جائز اور درست ہے، اور یہ تبرعِ مشروط کے حکم میں ہے، یعنی دکان دار نے ہدیہ میں خریداری کی شرط لگائی اور یہ جائز ہے جبکہ سامان عام قیمت میں فروخت ہوتا ہو اور ہدیہ کی وجہ سے زیادہ قیمت نہ لی جاتی ہو۔ تبرعِ مشروط کے چند دلائل ماقبل میں مذکور ہوئے۔ کچھ مزید ملاحظہ ہو: امداد الاحکام میں ہے:

پس ارشاد ہوا کہ معاہدہ مذکور کے خریدار کو سال بھر برابر چالو مارکو مال خریدتے رہنے کی حالت میں دو تین روپیہ سیکڑہ مثلاً سال کے تمام پر رعایت دی جائے اور دورانِ سال دوسری جگہ ایک مرتبہ بھی خریدنے میں بالکل کچھ نہ دیا جائے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ معاہدہ جائز ہے کیونکہ خریدار کو سال تمام پر کمیشن پر سیکڑہ پر دیا جاتا ہے وہ بائع کی طرف سے تبرع ہے خریدار کا حق لازم نہیں، اور تبرع کو کسی شرط سے مشروط کرنا جائز ہے۔ (امداد الاحکام: ۳/۶۰۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

روڈ فنڈ کی رقم زیادتی کے ساتھ حاصل کرنے کا حکم:

سوال: سڑک پر ایکسیڈنٹ ہونے کے بعد حکومت کی جانب سے روڈ فنڈ ملتا ہے، اور یہ ہائی کورٹ کی جانب سے رقم ادا کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور ساتھ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر وقت پر ادا نہ کیا گیا تو رقم پر مزید ڈھائی فیصد سود لگا کر ادا کیا جائیگا، اب سوال یہ ہے کہ کورٹ کے حکم کے بعد روڈ ایکسیڈنٹ فنڈ والے چھ ماہ کے بعد رقم ادا کرتے ہیں اس لیے اس پر سود بھی ادا کرتے ہیں تو کیا مزید رقم کا لینا جائز ہوگا یا نہیں؟

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ جب اس رقم پر زکوٰۃ ادا کریں گے تو کونسی تاریخ کا اعتبار ہوگا جس تاریخ کو کورٹ نے فیصلہ کیا، یا جس دن پیسے ملیں گے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: روڈ ایکسیڈنٹ فنڈ کی جانب سے جو رقم ملتی ہے، کورٹ کے فیصلہ کے بعد وہ استحقاق کے

زمرے میں آتی ہے اس پر ملکیت نہیں آتی ،لہٰذا جواضافی رقم سود کے نام سے دی جائے وہ ابتدائی تبرع ہے،سود نہیں،اگر چہ حکومت اس کوسود سے موسوم کرے،اس کا لینا جائز اور درست ہے۔

۲۔رقم موصول ہونے کے بعد سال کی گنتی شروع ہوگی،روڈا یکسیڈنٹ فنڈ کی مثال پراویڈنٹ فنڈ ہے کہ علماء نے اس کو دین ضعیف میں شمار کیا ہے یعنی اس پر قبضہ کرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کی جائے اس سے پہلے نہیں۔

سود اس کو کہتے ہیں کہ مالی معاوضہ میں بلاعوض زیادتی مشروط ہو۔ملاحظہ ہوفقہاءسود کی تعریف یوں لکھتے ہیں:

قال في الهداية: الربا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين فى المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه . (الهداية : ۷۸/۳).

العنایہ شرح الہدایہ میں ہے:

الربا فى اللغة هو الزيادة... وفى الاصطلاح هو الفضل الخالي عن العوض المشروط فى البيع . (العناية :۷/۳). (وكذا فى الدرالمختار: ۱۶۸/۵،سعيد).

معجم لغة الفقهاء میں مذکور ہے:

الربا كل زيادة مشروطة فى العقد خالية عن عوض مشروع . (معجم لغة الفقهاء ،ص ۲۱۸). (وكذا فى التعريفات الفقهية،ص ۱۰۲).

منتخباتِ نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

شرعاًربا کے معنی میں جتنی عبارتیں فقہاء نے نقل فرمائی ہے ان سب حاصل یہ ہے کہ اموالِ ربویہ میں عقدِ معاوضہ کا معاملہ ہواوراسی عقد میں کسی جانب کوزیادتی بلاعوض ہو(یعنی) جس میں نفع عقدِ معاملہ میں مشروط ہو۔ (منتخباتِ نظام الفتاویٰ:۱/۱۹۵)۔

خلاصہ یہ ہے سود اس کو کہتے ہیں کہ عقدِ معاوضہ میں زیادتی بلاعوض مشروط ہوجبکہ ہمارے مسئلہ میں ایسا نہیں،یہ ابتدائی تبرع ہے،اس کا لینا جائز اور درست ہے۔اور یہ پراویڈنٹ فنڈ کی طرح ہے جب وصول ہوجائے اس کے بعد زکوٰۃ ادا کی جائے گی اس سے پہلے نہیں،علماء نے اس کو دین ضعیف میں شمار کیا ہے۔

دینِ ضعیف کا حکم ملاحظہ ہو:

قال في فتح القدير: فنقول: قسم أبوحنيفةؒ الدين إلى ثلاثة أقسام: قوى وهو بدل

القرض ومال التجارة ، ومتوسط: وهوبدل ماليس للتجارة كثمن ثياب البذلة وعبد الخدمة ودارالسكنى، وضعيف: وهو بدل ما ليس بمال كالمهر والوصية وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدية وبدل الكتابة والسعاية...وفى الضعيف لا تجب مالم يقبض نصاباً ويحول الحول بعد القبض عليه . (فتح القدير: ۲/۱٦۷،ط: دارالفكر).

کفایت المفتی میں مرقوم ہے:

پراویڈنٹ فنڈ پر جو رقم محکمہ کی طرف سے دی جاتی ہے اور اسی طرح دونوں رقموں کے مجموعے پر جو رقم سود کے نام سے بڑھائی جاتی ہے یہ سب رقم جائز ہے، یہ شرعاً سود نہیں ہے اگر چہ محکمہ اس کو سود کے نام سے موسوم کرتا ہے اوران تمام رقوم کی زکوٰۃ ادا کرنے کا یہ حکم ہے کہ وصولی رقم کے ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے وصول ہونے سے پہلے ادائیگی لازم نہیں۔ (کفایت المفتی:۸/ ۹۷،دارالاشاعت)۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مذکور ہے:

ملازمان کی تنخواہ میں سے کچھ روپیہ وضع ہوتا ہے اور پھر اس میں کچھ رقم ملا کر بوقتِ ختمِ ملازمت ملازموں کو ملتا ہے وہ ایک انعام سرکاری سمجھا جاتا ہے اس پر زکوٰۃ گزشتہ برسوں کی واجب نہیں ہوتی ، آئندہ کو بعد میں وصول کے جب سال بھر نصاب پر گزر جاوے گا اس وقت دینا لازم ہوگا۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند:٦/۳۳۱،ط:مدلل ومکمل)،

مزید تفصیل کے لیے فتاویٰ دارالعلوم زکریا کی تیسری جلد ص۱۵۱، پراویڈنٹ کے تحت ملاحظہ فرمالیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بلا بیانِ نفع مطلق شرکت کا حکم:

سوال: زید ایک چھوٹی سی دکان چلاتا تھا، خالد ایک بڑی کمپنی کا مینیجر تھا، اس نے زید کے ساتھ شرکت کا ارادہ کیا زید نے کہا ٹھیک ہے، پھر کئی مہینوں کے بعد بڑی دکان کرایہ پر ملی تو زید نے خالد کو اطلاع دی، خالد نے کمپنی سے اپنی معرفت بہت رعایتی قیمت پر اُدھار مال دلوانا شروع کیا، زید محنت کرتا تھا اور خالد مال فراہم کرتا تھا، یہاں تک کہ خوب ترقی کی، زید خالد سے ماہانہ تنخواہ حاصل کرتا تھا، اور دکان کے پیسے مال میں خالد کو ادا کر دیتا تھا، خالد کی شرکت کی وجہ سے زید کو دو فائدے ہوئے :۱۔ مال بہت ہی رعایتی قیمت میں ملا،۲۔ اُدھار ملا اور پیسے دینے میں کوئی جلدی نہیں تھی ، اطمینان سے دینا ہوتا تھا۔ اب دریافت طلب دو باتیں ہیں:۱۔ کیا زید کا خالد سے

ماہانہ تنخواہ لینا درست ہے یا نہیں؟ ۲۔ زید کی محنت سے دکان نے ترقی کرلی کیا خالد بھی اس دکان میں شریک ہوگا یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنے فیصد جبکہ نفع کی تقسیم کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ زید اور خالد کے درمیان شرکت کا معاملہ صحیح اور درست ہے، ہر ایک کو آدھا آدھا منافع ملے گا، اور زمانہ حال کے فقہاء کے نزدیک شریک اجیر اور ملازم بن سکتا ہے، اس لیے زید کا تنخواہ لینا بھی صحیح ہے، بظاہر اس قسم کی شرکت میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

ملاحظہ ہو اس قسم کے معاملہ کے بارے میں فقیہ النفس امام قاضی خانؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

رجل اشترى عبداً وقبضه فطلب رجل آخر منه الشركة فيه فاشركه كان العبد بينهما نصفين. (فتاوى قاضيخان بهامش الفتاوى الهندية: ۳/۷۱۶).

عالمگیری میں بھی اس طرح کے معاملہ میں نصف نصف کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

ولو أقر فلان شريكي فيما في هذا الحانوت فإن جميع ما في الحانوت يصير مشتركاً بينهما. (الفتاوى الهندية: ۴/۲۲۰) کسی شخص نے یہ اقرار کیا کہ فلاں آدمی میرا شریکِ تجارت ہے تو جو کچھ اس دکان میں ہے اس دکان کا تمام مال دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگا۔

دوسری جگہ مذکور ہے: **قال: أنت شريكي في التجارات فما في أيديهما من متاع التجارات بينهما وكذلك الدراهم والدنانير.** (الفتاوى الهندية: ۴/۲۲۰) ایک شخص نے دوسرے سے یہ کہا کہ آپ میری تمام تجارتوں میں شریک ہیں تو جو کچھ ان دونوں کے پاس اموالِ تجارت ہیں وہ ان کے درمیان نصف نصف ہوگا، اسی طرح دراہم ودنانیر کا حکم ہوگا یعنی لفظِ شرکت کی وجہ سے نقد بھی دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگا۔

فتح القدیر میں محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ مطلق شرکت دونوں کے درمیان برابری چاہتی ہے یعنی آدھا آدھا منافع ملے گا۔ عبارت ملاحظہ ہو:

ولو اشترى رجل عبداً وقبضه فطلب إليه آخر أن يشركه فيه فأشركه فيه فله نصف بمثل نصف الثمن الذي اشتراه به وهذا بناء على أن مقتضى الشركة يقتضي التسوية. (فتح القدير: ۶/۱۶۶، ط: دار الفكر). (وكذا في الفتاوى الهندية: ۲/۳۰۴).

بخاری شریف کی ایک روایت سے بھی استیناس حاصل کیا جاسکتا ہے کہ مطلق شرکت برابری کی متقاضی ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ ہو: **عن زهرة بن معبد عن جده عبد الله بن هشام وكان قد أدرك النبي صلى الله عليه وسلم وذهبت به أمه زينب بنت حميد إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت : يا رسول الله ! بايعه...وعن زهرة بن معبد أنه كان يخرج به جده عبد الله بن هشام إلى السوق فيشترى الطعام فيلقاه ابن عمر رضی اللہ عنہ وابن الزبير رضی اللہ عنہ فيقولان له أشركنا فإن النبي صلى الله عليه وسلم قد دعا لک بالبركة فيشركهم ...الخ .**

قال أبو عبد الله : إذا قال الرجل للرجل أشركني فإذا سكت فيكون شريكه بالنصف.

(صحیح البخاری ،رقم: ۲۴۳۶،باب الشركة في الطعام).

حدیثِ بالا سے استدلال کرتے ہوئے امام بخاریؒ نے فرمایا کہ مطلق شرکت ،شرکت بالنصف پر محمول ہوگی ،علامہ عینیؒ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ شریک کی خاموشی رضامندی پر دلالت کرتی ہے۔

ملاحظہ ہو عمدۃ القاری میں ہے: **لأن سكوته يدل على الرضا.** (عمدة القاری : ۹ / ۲۹۱، ط: دار الحديث ،ملتان).

خلاصہ یہ ہے کہ جب زید نے خالد کو اپنی دکان میں شریک کرلیا تو یہ شرکت بالنصف ہوگئی ،اس طور پر کہ زید دکان میں تجارت کرتا ہے اور خالد اپنی وجاہت اور معرفت سے سامان فراہم کرتا ہے، جیسے فقہاء نے تحریر فرمایا ہے کہ زید کسی صاحبِ ہنر کو بٹھادے اور زید اپنی وجاہت اور پہچان کی وجہ سے کام قبول کرے اور نفع میں دونوں شریک ہوں تو یہ شرکت صحیح ہے اور یہ شرکۃ الوجوہ کی طرح ہے، صاحب ہدایہؒ نے اس کو شرکۃ الوجوہ فرمایا ہے۔

ہدایہ کی عبارت ملاحظہ کیجئے: **لأن هذه شركة الوجوه في الحقيقة ، فهذا لوجاهته يقبل، وهذا لحذاقته يعمل فينتظم بذلک المصلحة فلا تضره الجهالة فيما يحصل .** (الهداية: ۳/۱۷، ۳، مسائل منثورة من كتاب الاجارات ،ط:شركة علمية).

تکملہ فتح القدیر میں مرقوم ہے:

لأن هذا شركة التقبل في العمل بأبدانها سواء، فيصير رأس مال أحدهما التقبل ، ورأس مال الآخر العمل . (تكملة فتح القدير : ۸/۸۹،ط: دار الفكر).

صاحبِ عنایہ علامہ اکمل الدین بابرتیؒ فرماتے ہیں:

لأن شركة التقبل أن يكون ضمان العمل عليهما وأحدهما يتولى القبول من الناس والآخر يتولى العمل لحذاقته وهو متعارف فوجب القول بجوازها للتعامل بها قال صلى الله عليه وسلم: ماراه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن. (العناية بهامش فتح القدير: ۹/۱۵۰، دارالفكر). واللہ ﷻ اعلم۔

شریک کا اجیر اور ملازم بن کر تنخواہ لینے کا حکم:

زمانہ حال کے بعض علماء کے نزدیک شرکت کے معاملہ میں شریک اجیر بن سکتا ہے، اس اعتبار سے زید کا اجرت لینا درست ہے۔ ملاحظہ ہو احسن الفتاویٰ میں مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ رقمطراز ہیں:

کتبِ فقہی کی عبارات نقل کرنے کے بعد بطورِ خلاصہ چند امور پر نشاندہی فرمائی ہے:

۱۔ شریک کو اجیر رکھنے کا عدم جواز کسی نص شرعی سے ثابت نہیں۔

۲۔ حضرت امام رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس کے بارے میں کوئی روایت نہیں۔

۳۔ امام محمدؒ کا قول ہے مگر آپ سے اس کی کوئی علت منقول نہیں۔

۴۔ بعض مشائخؒ نے جو علل بیان فرمائی ہیں وہ دوسرے مشائخؒ کی نظر میں مخدوش ہیں۔

۵۔ علامہ سعدیؒ نے اس کو اجارۃ المشاع کی طرح قرار دیا ہے۔

۶۔ اجارۃ المشاع باجماع الائمۃ الاربعہ جائز ہے۔ البتہ امام محمدؒ کے نزدیک غیر شریک کے لیے ناجائز ہے۔

۷۔ ائمہ ثلاثہ اجارۃ المشاع کی طرح شریک کو اجیر رکھنے کے جواز پر متفق ہیں۔

۸۔ قفیز طحان کی حرمت نص شرعی سے ثابت ہونے کے باوجود بعض فقہاء نے بوجہ تعامل اس کے جواز کا قول فرمایا ہے مگر دوسرے فقہاء نے اسے اس لیے قبول نہیں فرمایا کہ یہ تعامل ان کے بلاد سے خاص ہے اور تعامل خاص سے ترکِ نص شرعی جائز نہیں۔

۹۔ ترکِ نص شرعی کے لیے تعامل عام شرط ہے مگر ترکِ نص مذہب کے لیے تعامل خاص بھی کافی ہے۔

۱۰۔ مذہبِ حنفی ہونے کی حیثیت سے اقوالِ صاحبینؒ سے تعامل پر مبنی احکام مقدم ہیں۔

۱۱۔نص مذہب کوتو تعامل خاص سے بھی ترک کر دیا جاتا ہے اور کمپنی کے شرکاء کو اجیر رکھنے کا تو تعامل عام ہے، لہٰذا بطریق اولیٰ نص مذہب متروک ہوگی، بالخصوص جبکہ یہ نص امام بھی نہیں بلکہ قولِ محمدؒ ہے جس سے تعامل مقدم ہے۔علاوہ ازیں مضاربت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مضارب عمل مشترک سے نفع حاصل کرتا ہے۔

(احسن الفتاویٰ: ۷/ ۳۲۸)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بچہ نے ایک ہفتہ دودھ نہیں پیا تو اس ہفتہ کی اجرت لینے کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے اپنے بچہ کو دودھ پلانے کے لیے ۴ ہزار رینڈ تنخواہ پر ایک عورت کو مقرر کیا، ایک ہفتہ بچہ بیمار رہا اس کی وجہ سے بچے نے دودھ نہیں پیا، تو کیا عورت اس ہفتہ کی تنخواہ کی مستحق ہوگی یا نہیں؟ جبکہ عورت پورے مہینہ کی تنخواہ طلب کر رہی ہے، کیونکہ وہ تو تیار تھی، بچہ نہیں پی سکتا تھا، اور بچے کا والد تین ہفتے کی اجرت دینا چاہتا ہے، اب کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مرضعہ دودھ پلانے والی اجیر خاص کے حکم میں ہے، اور اجیر خاص کی طرف سے کوئی تعدی اور قصور نہ ہو تو وہ اجرت کا مستحق ہے، چنانچہ عورت کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں تھی لہٰذا پورے مہینہ کی اجرت واجب ہے ایک ہفتہ کی تنخواہ وضع کرنا درست نہیں۔ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مرقوم ہے:

والخاص يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل كمن استوجر شهراً للخدمة أو لرعي الغنم يعني الأجير الخاص يستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة عمل أو لم يعمل . (البحر الرائق: ۳۳/۸، دار المعرفة). (وكذا في الدر المختار: ۶۹/۶، سعيد).

مزید ملاحظہ ہو: (امداد الفتاویٰ: ۳/ ۳۶۲، وفتاویٰ قاسمیہ: ۲۱/ ۵۴۴)۔واللہ ﷻ اعلم۔

آن لائن ڈراپ شاپنگ تجارت کا حکم:

سوال: ڈراپ شاپنگ کا طریقہ کار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ویب سائٹ کے ذریعہ کمپنی کے مال کی تشہیر کرتا ہے، گاہک قیمت ادا کرتے ہیں تو یہ شخص قیمت اور مشتری کی فرمائش کمپنی کو بھیج دیتا ہے، کمپنی مشتری کی مطلوبہ چیز اس کے گھر پہنچا دیتی ہے اور اس گاہک لانے والے شخص کو اس کا کمیشن بھی ادا کر دیتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کمیشن لینا جائز ہے؟ نیز کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مطلوبہ چیز کمپنی میں موجود نہیں ہوتی اور مناسب وقت

میں فراہم کرنا بھی مشکل ہوتا ہے تو کیا اس کو ایک کوپن دینا جائز ہوگا یا اس کی قیمت واپس کرنا ضروری ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ شخص جو کمپنی اور مشتری کے درمیان واسطہ ہے، یہ ایجنٹ اور دلال کے حکم میں ہے اور دلال کا اجرت یا کمیشن لینا جائز اور درست ہے، لیکن اگر وہ مطلوبہ چیز کمپنی کے پاس نہیں ملی تو یہ بیع معدوم ہوئی جو کہ باطل ہے، لہٰذا مشتری کو قیمت واپس کرنا ضروری ہے، ہاں اگر مشتری کوپن لینے پر راضی ہو تو پھر کوپن دینا بھی صحیح ہے۔ ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وأما الذي يرجع إلى المعقود عليه فأنواع منها: أن يكون موجوداً فلا ينعقد بيع المعدوم، وماله خطر العدم. (بدائع الصنائع: ۱۳۸/۵، سعید).

مجلة الاحكام العدليه میں مرقوم ہے:

المادة: بيع المعدوم باطل فيبطل بيع ثمرة لم تبرز أصلاً. (مجلة الأحكام ص ۴۲).

دلالی کی اجرت جائز اور درست ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا: جلد،۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زمین خریدنے کے بعد پتا چلا کہ قابل تعمیر نہیں تو واپس کرنے کا حکم:

سوال: ۱۔ ایک شخص نے تعمیر کی غرض سے ایک زمین خریدی بعد میں پتا چلا کہ حکومت کی طرف سے اس پر تعمیر کی اجازت نہیں، کیونکہ زمین کی خرابی کی وجہ سے تعمیر ممکن نہیں، کیا اس کو واپس کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ ۲۔ اس زمین میں کچھ اخراجات بھی کیے ہیں وہ واپس لینا درست ہے یا نہیں؟ ۳۔ نیز زمین کی سیکیورٹی اسٹیٹ میں ماہانہ پیسے بھرنے ہوتے ہیں، اب زمین کے بیکار ہونے کی وجہ سے کیا اب بھی ادا کرنا لازم ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ زمین کا ایک اہم مقصد تعمیر ہے جب حکومت کی جانب سے ممانعت ہے اور مشتری کو پہلے سے اس کا علم بھی نہیں تھا تو یہ عیب میں داخل ہے۔ لہٰذا مشتری بائع کو زمین واپس کرکے اپنے پیسے وصول کرسکتا ہے۔

۲۔ خیارِ عیب میں واپسی پر فقط ثمن واپس لینے کی اجازت ہے واپسی کا خرچہ وغیرہ خود مشتری کے ذمہ ہے ہاں اگر بائع نے عمداً عیب پوشیدہ رکھ کر مشتری کو دھوکا دیا ہے تو مدیون متمرد پر قیاس کرتے ہوئے مشتری سے اخراجات وصول کرسکتا ہے۔

۳۔ جب زمین بیکار تھی اور تعمیر وغیرہ کسی کام میں استعمال نہیں ہوسکتی تھی تو اس کی سیکیورٹی ادا کرنا بھی شرعاً

لازم نہیں ہے۔ نمبرا کے دلائل ملاحظہ کیجئے: فتح القدیر میں مذکور ہے:

والعيب: ما تخلو عنه أصل الفطرة السليمة مما يعد به ناقصاً ، قوله وإذا اطلع المشترى على عيب فى المبيع ، ولم يكن شرط البراء ة من كل عيب ، فهو بالخيار، إن شاء أخذ ، ذلک المبيع بجميع الثمن ، وإن شاء رده ، هذا إذا لم يتمكن من إزالته بلا مشقة .

(فتح القدير: ۳۵۵/۶، ط: دارالفكر).

فتاویٰ شامی منقول ہے:

لا بد فى العيب أن لا يتمكن من إزالته بلا مشقة...وأن يكون عند البائع ولم يعلم به المشترى، ولم يكن البائع شرط البراء ة منه خاصاً أو عاماً ولم يزل قبل الفسخ ...الخ.

(فتاوى الشامى: ۵/۵،سعيد).

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے:

عیب پر مطلع ہونے کے بعد مشتری کو اختیار ہے چاہے تو کل ثمن کے بدلے اس کو رکھے اور چاہے تو واپس کردے۔ (احسن الفتاویٰ: ۴۹۳/۶)۔

۲۔مبیع واپس کرنے کے اخراجات مشتری کے ذمہ ہیں۔ ملاحظہ ہو (فتاویٰ دارالعلوم زکریا،۲۴۲/۵،ط: دیوبند)۔

۳۔متمرد مدیون سے مقدمہ کے اخراجات وصول کرنا درست ہے۔

عزیز الفتاویٰ میں ہے:

جس صورت میں کہ مدیون متمرد ہے اور باوجود استطاعت دین کے ادا کرنے میں تساہل وانکار کرتا ہے اور دائن بہ مجبوری نالش کر کے قرض وصول کرتا ہے تو اس حالت میں مدیون سے خرچہ عدالت لینا درست ہے کہ سبب اس خرچہ کا مدیون ہوا ہے۔ (عزیز الفتاویٰ: ۶۲۵/۱،ط: دارالاشاعت)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۱۷۱/۵،ط: زمزم،کراچی)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اقالہ میں ثمن اول سے زیادہ رقم ادا کرنے کا حکم:

سوال: زید نے عمر سے وکیل کی معرفت ۴۰ لاکھ میں زمین خریدی، اور پانچ لاکھ روپے ادا کردیے، جب وکیل عمر کے پاس باقی رقم ادا کرنے کے لیے گیا تو عمر نے زمین بیچنے سے انکار کردیا، اور زید کی رضامندی

کے لیے پانچ لاکھ کے ساتھ مزید ایک لاکھ واپس کرنے کو کہا، کیا مزید رقم زید کے لیے لینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز زید نے وکیل کو بطورِ اجرت دس ہزار روپے ادا کیے تھے، کیا یہ دس ہزار عمر سے لے سکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ایجاب وقبول مکمل ہونے کے بعد بیع لازم ہوجاتی ہے، پھر دونوں کی رضامندی کے بغیر بیع ختم کرنے کا یعنی کسی ایک کو اقالہ کرنے کا اختیار نہیں، چنانچہ صورتِ مسؤلہ میں بائع یعنی عمر نے مشتری یعنی زید کی رضامندی کے بغیر اقالہ کیا جو صحیح نہیں ہوا۔ بلکہ بائع پر لازم ہے کہ بیع مکمل ہونے بعد ثمن ادا کرنے پر مبیع مشتری کے وکیل کو سپرد کردے۔

پھر اگر دونوں کی رضامندی سے اقالہ کرلیا جائے تب بھی ثمن اول سے زیادہ لینا درست نہیں۔ ہاں اگر زید اقالہ نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ زمین عمر کو پانچ لاکھ سے زیادہ پر بیع جدید کے ساتھ فروخت کردے اور جو زیادہ رقم ملے گی اسی سے وکیل اجرت بھی ادا کردے۔

بیع مطلق ایجاب وقبول سے لازم ہوجاتی ہے، ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما إلا من عيب أو عدم رؤية . (الهداية:۳/۳۳، ط:بشرى، ومختصر القدورى، ۷۸).

اقالہ کے لیے فریقین کی رضامندی شرط ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ عالمگیری میں مرقوم ہے:

وشرط صحة الإقالة رضاء المتقائلين . (الفتاوى الهندية:۳/۱۵۷).

قال في شرح المجلة : للعاقدين أن يتقايلا البيع برضاهما بعد انعقاد فالرضاء شرط فى الإقالة كما في سائر العقود وهي لا تصح إلا من العاقدين أو ورثتهما. (شرح المجلة لسليم رستم باز : ۱/۹۲). (وكذا فى الدر المختار: ۵/۱۲۱، سعيد).

اقالہ ثمن اول پر ہوتا ہے، ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

الإقالة جائزة فى البيع بثمل الأول، لقول عليه الصلاة والسلام: من أقال نادماً بيعته أقال الله عثرته يوم القيامة ، ولأن العقد حقهما فيملكانه رفعه دفعاً لحاجتهما ، فإن شرطا أكثر منه أو أقل فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الأول . (الهداية :۳/۱۰۲، ط:بشرى).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں مذکور ہے:

اقالہ کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جو عقد ہوا ہے اس کو ختم کر دیا جائے، مال بائع کو واپس کر دیا جائے اور قیمت مشتری کو واپس دی جائے، اس کی بعض دفعہ سخت ضرورت پڑتی ہے...ان حالات میں اگر طرفین پہلا سودا ختم کرنے پر رضامند ہو جائیں تو شرعاً جائز ہے اس سودا کو ختم کر دیا جائے، البتہ قیمت میں کمی زیادتی جائز نہیں بلکہ جتنی قیمت ادا کی گئی تھی وہی پوری واپس کی جائے گی۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۴۶)۔

جائیداد کی بیع قبل القبض درست ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

ویجوز بیع العقار قبل القبض عند أبي حنیفۃ وأبي یوسف، وقال محمد: لا یجوز، رجوعاً إلی إطلاق الحدیث واعتباراً بالمنقول وصار کالاجارۃ، ولھما أن رکن البیع صدر من أھلہ في محلہ، ولا غرر فیہ؛ لأن الھلاک فی العقار نادر، بخلاف المنقول، والغرر المنھی عنہ غرر انفساخ العقد، والحدیث معلول بہ عملاً بدلائل الجواز والإجارۃ. (الھدایۃ ۱۱۱/۳، ط: بشری).

قال فی الھندیۃ: بیع العقار قبل القبض جائز عندھما وعلیہ الفتویٰ کذا فی المضمرات. (الفتاوی الھندیۃ: ۱۰۹/۳). واللہ ﷻ اعلم۔

میعاد ختم ہونے (Expire) پر مال واپس کر کے کمپنی سے پیسے وصول کرنے کا حکم:

سوال: ایک آدمی کی مشروبات کی دکان ہے کمپنی سے مشروب خرید کر بیچتا ہے، جب کمپنی میں نئے مشروبات آتے ہیں تو کمپنی دو ہزار بوتلیں دکاندار کو دیتی ہے، ایک ہزار قیمتاً اور ایک ہزار مفت میں، پھر میعاد ختم (Expire) ہونے پر کمپنی مشروبات واپس لیتی ہے اور قیمت واپس کر دیتی ہے، حال ہی میں کمپنی نے اس کو دو ہزار بوتلیں دی ایک ہزار قیمتاً اور ایک ہزار مفت میں، پھر دکاندار نے میعاد ختم (Expire) ہونے کی وجہ سے ۱۵ سو واپس کر دی، اور کمپنی نے ۱۵ سو کی قیمت واپس کی تو پانچ سو جو مفت میں تھیں ان کی قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ کمپنی کا ایک ہزار مشروبات مفت میں دینا ابتدائی تبرع وہدیہ شمار ہوگا، اور مالک نے قبضہ بھی کر لیا ہے لہٰذا یہ دکاندار کے ہو گئے، میعاد ختم (Expire) ہونے پر دکاندار نے ۱۵ سو واپس کیے تو ایک ہزار میں اقالہ ہوا جو ثمن اول پر ہے لہٰذا صحیح اور درست ہے، باقی پانچ سو کی قیمت کمپنی نے ادا کی یہ بھی

ہدیہ اور تبرع کے قبیل سے ہے، کیونکہ بظاہر کمپنی کو پہلے سے معلوم تھا کہ ایک ہزار مفت میں دی تھی پھر بھی اس کی قیمت ادا کی، لہٰذا یہ تبرع اور ہدیہ ہے اور اس ہدیہ کا وصول کرنا بھی جائز اور درست ہے۔ البتہ اگر کمپنی کو معلوم نہ ہو تو دھوکے سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ بتلا دینا چاہیے۔ ملاحظہ ہو مسلم شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم قال: من حمل السلاح علينا فليس منا ومن غشنا فليس منا. (رواه مسلم، رقم: ۱۰۱).

اللباب فی شرح الکتاب میں مذکور ہے:

الهبة لغة: التبرع والتفضل بما ينفع الموهوب مطلقاً، وشرعاً تمليک عين بلا عوض. (اللباب فی شرح الکتاب: ۱/ ۲۱۹).

فتح القدير میں ہے: **الهبة في الشريعة فهي تمليک المال بلا عوض.** (فتح القدير: ۹/ ۴۵۷).

کمپنی کا اپنے خریدار کو مشروط ہدیہ کرنا تبرعِ مشروط کے قبیل سے ہے اور یہ جائز ہے۔ اس کے دلائل ما قبل میں مذکور ہو چکے ہیں وہاں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ اور ایک ہزار بوتلوں میں اقالہ ہے اور اقالہ فریقین کی رضا مندی سے ثمن اول پر درست ہے۔ ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

الإقالة جائزة فی البيع بشمل الأول، لقول عليه الصلاة والسلام: من أقال نادماً بيعته أقال اللّٰه عثرته يوم القيامة، ولأن العقد حقهما فيملكانه رفعه دفعاً لحاجتهما، فإن شرطا أكثر منه أو أقل فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الأول. (الهداية: ۳/ ۱۰۲، ط: بشرى).

فتاویٰ عالمگیری میں مرقوم ہے: **وشرط صحة الإقالة رضاء المتقائلين.** (الفتاوى الهندية: ۳/ ۱۵۷).

قال في شرح المجلة: للعاقدين أن يتقايلا البيع برضاهما بعد انعقاد فالرضاء شرط في الإقالة كما في سائر العقود وهي لا تصح إلا من العاقدين أو ورثتهما. (شرح المجلة لسليم رستم باز: ۱/ ۹۲). وكذافی الدر المختار: ۵/ ۱۲۱، سعيد). **واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

مسابقہ میں شرکت اور حرام کاروباری کمپنی کی طرف سے انعام حاصل کرنے کا حکم:

سوال: کیا درجِ ذیل شرائط کے ساتھ مسلمان گھوڑ دوڑ میں حصہ لے سکتے ہیں؟

۱۔اپنا ذاتی گھوڑا خریدنا ہے۔
۲۔(NHA) یعنی گھوڑ دوڑ کی آتھورٹی میں جا کر گھوڑا رجسٹر کرنا ہے۔
۳۔گھوڑے کو مشق کرانے کے لیے ایک مشاق رکھنا ہے۔
۴۔مشاق گھوڑے کو مسابقہ کے لیے منتخب کریگا کہ کس درجہ کی دوڑ میں جاسکتا ہے، پھر داخلہ فیس ۹۰ رینڈ سے ۴۰ ہزار رینڈ تک ہوتی ہے۔
۵۔اگر گھوڑا ایک سے پانچ نمبر میں کامیاب ہوتا ہے تو انعام دیا جاتا ہے، یہ انعام کبھی بطورِ جوا مقرر ہوتا ہے اور کبھی کسی ثالث کمپنی کی طرف سے ہوتا ہے۔اب دریافت طلب امر حسبِ ذیل ہیں:

کیا بلاشرط لگائے فقط داخلہ فیس ادا کر کے گھوڑ دوڑ میں شرکت کی اجازت ہے یا نہیں؟ اگر کوئی مسلمان شرکت کر کے کامیاب ہو تو کمپنی سے انعام حاصل کرنا درست ہے یا نہیں جبکہ آج کل اکثر غیر مسلم کمپنیاں حرام کاروبار میں ملوث ہیں۔بینوا بالبرہان تو جروا عند الرحمٰن۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ گھوڑ دوڑ میں داخلہ فیس دیکر حصہ لینا اور کامیاب ہونے پر ثالث کمپنی کی طرف سے انعام حاصل کرنا جائز ہے، کیونکہ داخلہ فیس کے بدلہ میں ان کی تیار کردہ جگہ میں گھوڑا دوڑانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے، نیز اس کے عوض مقابلہ دیکھنے اور وہاں بیٹھنے وغیرہ کی سہولیات بھی مل جاتی ہیں، لہٰذا جو انعام ملے گا وہ داخلہ فیس کے عوض نہیں سمجھا جائے گا، پھر یہ انعام مقابلہ کرنے والوں کی طرف سے نہیں دیا جاتا بلکہ ثالث کی طرف سے ہے جس نے مسابقہ میں حصہ نہیں لیا، ہاں اگر مسابقہ کرنے والوں نے آپس میں شرط لگائی ہو تو یہ انعام جوا میں داخل ہو کر ناجائز ہوگا۔

غیر مسلم کمپنیوں کی طرف سے انعام حاصل کرنا جائز ہے، وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم سودی لین دین کر کے، بیع باطل وفاسد وغیرہ یا شراب، خنزیر بیچ کر جو بھی مال حاصل کرتے ہیں وہ ان کی ملک میں داخل ہو جاتا ہے، اور مسلمان ان سے بطورِ ہدیہ وہ مال قبول کر سکتے ہیں، ہاں اگر چوری، غصب اور ڈاکہ زانی وغیرہ سے حاصل کریں تو اس کا لینا جائز نہیں اور کمپنیاں ایسا نہیں کرتیں۔

البتہ اگر یہ انعام مسلمان کی طرف سے دیا جائے اور اس کا اکثر وبیشتر کاروبار حرام ہو تو ان سے وہ مال انعام میں لینا جائز نہیں، اگر انعام حاصل کیا تو اگر مالک معلوم ہو تو مالک کو لوٹانا ضروری ہے ورنہ بلا نیتِ ثواب

صدقہ کردیا جائے۔اوراگر مسلم کمپنی کا اکثر وبیشتر کاروبار حلال ہوتو پھر لینا اور استعمال کرنا جائز ہے۔

دلائل اور حوالہ جات ترتیب وار درج ذیل ملاحظہ فرمائیں:

قال في البحر الرائق: والمسابقة بالفرس والإبل والأرجل والرمي جائزة ، لقوله: لا سبق إلا في خف أو نعل أو حافر وأذن رسول الله صلى الله عليه وسلم لسلمة بن الأكوع أن يسابق رجلاً كان لا يسابق أبداً فسبقه سلمة بن الأكوع وقال الزهري: كانت المسابقة بين أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بالخيل والركاب والأرجل ولأن الغزاة يحتاجون إلى رياضة خيلهم وأنفسهم ، وحرم شرط الجعل من الجانبين لا من أحد الجانبين ...

ولو قال واحد من الناس لجماعة من الفرسان أو للاثنين فمن سبق فله كذا من مال نفسه أو قال للرماة من أصحاب الهدف فله كذا جاز لأنه من باب التنفيل فإذا كان للتنفيل من بيت المال كالسلب ونحوه يجوز فما ظنك بخالص ماله . (تكملة البحر الرائق: ۸/۵۵۵، مسائل شتى، ط: دار المعرفة).

وقال في البدائع : وكذلك ما يفعله السلاطين وهو أن يقول السلطان لرجلين من سبق منكما فله كذا فهو جائز لما بينا أن ذلك من باب التحريض على استعداد أسباب الجهاد خصوصاً من السلطان فكانت ملحقة بأسباب الجهاد . (بدائع الصنائع: ۶/۲۰۶، سعيد).

(وكذا في فتاوى الشامي: ۶/۴۰۳، سعيد، والفتاوى الهندية : ۶/۴۴۵، وتبيين الحقائق: ۶/۲۲۷، ط: امداديه، ملتان).

کفار سے مالِ حرام ہدیہ وانعام میں قبول کرنا جائز اور درست ہے۔ملاحظہ ہو ہدایہ میں ہے:

وإذا باع المسلم خمراً وأخذ ثمنها ، وعليه دين ، فإنه يكره لصاحب الدين أن يأخذه وإن كان البائع نصرانياً فلا بأس به . (الهداية : ۴/۴۷۰).

علامہ سرخسیؒ مبسوط میں فرماتے ہیں:

...وأما الخمر والخنزير فقد قيل: الحرمة بخطاب خاص في حق المسلمين وهو

قوله تعالیٰ: ﴿ يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر ﴾ [المائدة: ۹۰] إلى قوله تعالیٰ: ﴿ فهل أنتم منتهون ﴾ [المائدة: ۹۱]، وقيل: ليس من ضرورة الحرمة سقوط المالية والتقوم فالمال قد يكون حراماً وقد يكون حلالاً وإنما تنبني المالية على التمول وهم يتمولون ذلک.

(المبسوط: ۳۹/۵، ادارة القرآن).

منتخباتِ نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار اور سودی لین دین بھی کرتے ہیں، بہت سی بیع باطل وفاسد بھی کرتے ہیں، شراب بھی بناتے اور بیچتے ہیں، اور اس کی قیمت لیتے ہیں، خنزیر بھی بیچ کر اس کی قیمت لیتے ہیں، پھر مسلمانوں کو یہ پیسے مزدوری میں انعام وغیرہ میں دیتے ہیں، اور ان سب پیسوں کا حرام ہونا معلوم ہونے کے باوجود اس پیسوں کا لینا اس وقت تک شرعاً جائز وغیر مکروہ شمار ہوتا ہے جب تک کہ یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ چیز جس کو فروخت کر رہا ہے یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈالکر لایا ہے یا جو قیمت دے رہا ہے یہ بعینہٖ وہی روپیہ ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈالکر مثلاً لایا ہے، (یعنی بعینہٖ چوری، ڈاکہ وغیرہ کا ہو تو جائز نہیں) غرض ان سب کا لے لینا اور استعمال کر لینا سب درست رہتا ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکمِ جواز کیوں ہے تو اس کی وجوہ متعدد ہیں، متعدد شرعی ضوابط اس کی بنیاد ہیں، مثلاً: (الف) تبدیل ملک سے حکماً تبدیل عین ہو جاتا ہے یا (ب) خلط واستہلاک کا ضابطہ جو مسلَّم ہے... جس محکمہ کے اصحابِ حل وعقد خالص غیر مسلم ہوں یا مشترک ہوتے ہوں، اقتدارِ اعلیٰ غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو اور وہ اپنے طور پر سودی کاروبار کر کے نفع حاصل کر کے، کوئی رقم حاصل کر لے، اور بطورِ تبرع کسی مسلمان ملازم کو دیں تو اس کا لینا جائز رہے گا، اور بمد انعام داخل ہو کر طیب وحلال شمار ہوگا۔

(منتخباتِ نظام الفتاویٰ، ص۴۶۸، ط: اصلاحی کتب خانہ)۔ مزید ملاحظہ ہو: (امداد الاحکام: ۴۹۰/۴)۔

مسلمان سے حرام اور سودی مال کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

لو رأى المكاس مثلاً يأخذ من أحد شيئاً من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذ من ذلک الآخر آخر فهو حرام. (فتاوى الشامي: ۹۸/۵، مطلب الحرمة تتعدد، سعيد).

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبيل الكسب الخبيث

التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه. (فتاوی الشامی: ۶/ ۳۸۵، کتاب الکراهیة، فصل فی البیع، سعید).

عالمگیری میں ہے:

ولا یجوز قبول هدیة أمراء الجور لأن الغالب في مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أکثر ماله حلال بأن کان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به لأن أموال الناس لاتخلو عن قلیل حرام فالمعتبر الغالب، وکذا أکل طعامهم کذا فی الاختیار شرح المختار. (الفتاوی الهندیة: ۵/ ۳۴۲).

ہاں اگر یقینی طور پر معلوم نہیں کہ یہ مالِ حرام ہے یا مخلوط ہے اور غالب حلال کمائی کا ہے تو پھر ہدیہ قبول کرنے کی گنجائش ہوگی۔ حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی ؒ فقہی عبارات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ جس شخص کی آمدنی حلال اور حرام سے مخلوط ہو اس میں غالب کا اعتبار ہے، غالب حلال ہے تو اس کا ہدیہ وضیافت قبول کرنا جائز ہے لیکن اگر خاص ہدیہ یا طعام کی بابت یقیناً معلوم ہوجائے کہ اس میں کچھ حرام ملا ہوا ہے تو اس کا قبول کرنا حرام ہے اور کھانا بھی حرام مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خلط واستہلاک ہے اس لیے ان کے قول پر گنجائش ہے جیسا کہ بعض روایات سے ظاہر ہوگا اور اگر غالب آمدنی حرام ہے تو ہدیہ وضیافت قبول کرنا حرام ہے ہاں اگر اس طعام وہدیہ کی بابت اطلاع کردے کہ یہ حلال ہے تو جائز ہے۔ (امدادالاحکام: ۴/ ۳۹۹)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (شامی: ۵/ ۹۸، وامدادالاحکام: ۴/ ۳۹۷۔ ۴۰۰۔ وفتاوی عثمانی: ۳/ ۳۹۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بلا رأس المال قرض پر مضاربت منعقد کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دوسرے کو اپنا وکیل بنا کر کہا کہ میرے لیے دس لاکھ رینڈ کا سونا ادھار خرید و، پھر اس کو آگے بیچ دو، نفع ہمارے درمیان آدھا آدھا ہوگا، تو کیا یہ معاملہ صحیح ہوگا؟ اور اگر کوئی نقصان ہوا، مثلاً: سونے کی قیمت کم ہوگئی تو موکل نے اپنے ذمہ تلافی لے لی، کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسے معاملہ کو شریعت میں مضاربت کہتے ہیں، موکل رب المال ہے اور وکیل مضارب ہے، اور نفع دونوں کے درمیان آدھا آدھا ہے، اور مضاربت میں ضروری ہے کہ رب المال مضارب کو راس المال سپرد کردے، ادھار پر معاملہ صحیح نہیں۔

پھر اگر سرمایہ میں کوئی نقصان ہو جائے تو مضارب اس کا ذمہ دار نہیں بلکہ اگر نفع ہو تو نفع سے منہا کیا جائے گا اور اگر نفع نہ ہو تو رب المال ذمہ ہوگا۔

لیکن چونکہ معاملہ مذکورہ میں راس المال سپرد نہیں کیا گیا اس لیے یہ معاملہ صحیح نہیں ہوا۔ رب المال کو چاہیے کہ سرمایہ مضارب کے حوالہ کردے اور مضارب اس پر قبضہ کرلے تا کہ یہ معاملہ ٹھیک ہو جائے۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں مذکور ہے:

المضاربة مشتقة من الضرب في الأرض سمي بها لأن المضارب يستحق الربح بسعيه وعمله ، وهي مشروطة للحاجة إليها فإن الناس بين غني بالمال غبي عن التصرف فيه وبين مهتد في التصرف صفر اليد عنه فمست الحاجة إلى شرع هذا النوع من التصرف لينتظم مصلحة الغبي والذكي والفقير والغني وبعث النبي صلى الله وسلم والناس يباشرونه فقررهم عليه وتعاملت به الصحابة ثم المدفوع إلى المضارب أمانة في يده لأنه قبضه بأمر مالكه ...

المضاربة عقد على الشركة بمال من أحد الجانبين ومراده الشركة في الربح وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر ولا مضاربة بدونها، ألا ترى أن الربح لو شرط كله لرب المال كان بضاعة ولو شرط جميعه للمضارب كان قرضاً . (الهداية : ۲۵۷/۳).

بدائع الصنائع میں مضاربت کی شرائط کے تحت مرقوم ہے:

ومنها أن يكون معلوماً فإن كان مجهولاً لا تصح المضاربة ؛ لأن جهالة رأس المال تؤدى إلى جهالة الربح ، وكون الربح معلوماً شرط صحة المضاربة .

ومنها أن يكون رأس المال عيناً لا دينا ، فإن كان ديناً فالمضاربة فاسدة . (بدائع الصنائع : ۸۲/۶،سعید). (وكذا في الفتاوى الهندية: ۲۸۵/۴،وتبيين الحقائق : ۵۶/۵،امداديه ،ملتان).

ہدایہ میں ہے: **وما هلك من مال المضاربة فهو من الربح دون رأس المال لأن الربح تابع وصرف الهلاك إلى ما هو التبع أولى كما يصرف الهلاك إلى العفو في الزكاة فإن زاد**

الهالک علی الربح فلا ضمان علی المضارب ، لأنه أمین. (الهداية: ۲۶۶/۳).

(وکذا فی الدرالمختارمع ردالمحتار: ۶۵۶/۵ ،سعید،فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۵۵۶/۵). **واللہ ﷻ اعلم۔**

بیع فاسد ہونے پر نفع واجب التصدق ہونے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی سے قرض لے کر تجارت شروع کی، اس تجارت سے ایک لاکھ رینڈ فائدہ ہوا اب قرض واپس کر کے اس نے فائدہ کی رقم سے نئی تجارت شروع کی، بعد میں اسے معلوم ہوا کہ پہلی تجارت فاسد تھی، بیع قبل القبض اور اسی طرح دیگر وجوہات کی بنیاد پر، اب کیا حکم ہے؟ کونسا منافع واجب التصدق ہے؟ پہلی تجارت سے حاصل کیا ہوا یا دونوں ملا کر، اگر دونوں ملا کر صدقہ کرتا ہے تو اس کے پاس کھانے، پینے کے لیے کچھ نہیں بچتا ہے، کیونکہ ذریعہ آمدنی فقط یہی ہے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ پہلی تجارت بیع قبل القبض اور دیگر مفسدِ عقد چیزوں کی وجہ سے فاسد ہوگئی تھی، لہٰذا اس کے منافع ایک لاکھ رینڈ واجب التصدق ہے، اور نئی تجارت میں مفسدِ عقد چیزیں شامل نہیں تھیں بنابریں دوسری تجارت کے منافع واجب التصدق نہیں ہیں، اس کے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ عالمگیری میں مرقوم ہے:

ولو اشتری جارية شراء فاسداً وقبضها وباعها وربح فيها تصدق بالربح ولو اشتری بثمنها شيئاً آخر فربح فيه طاب الربح كذا فی السراج الوهاج . (الفتاوی الهندية:۱۴۹/۳).

وقال فی الهداية: ومن اشتری جارية بيعاً فاسداً وتقابضا فباعها وربح فيها تصدق بالربح ويطيب للبائع ما ربح فی الثمن، والفرق أن الجارية مما يتعين فيتعلق العقد بها فيتمكن الخبث فی الربح ، والدراهم والدنانير لايتعينان علی العقود فلم يتعلق العقد الثاني بعينها فلم يتمكن الخبث فلا يجب التصدق ، وهذا فی الخبث الذی سببه فساد الملک .

(الهداية : ۶۶/۳).

اہم فقہی فیصلے میں مذکور ہے:

اصولی طور پر قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے، تاہم اگر قبضہ سے پہلے بیع کر دی جائے تو یہ بیع فاسد ہوگی نہ کہ باطل اور قبضہ کے بعد مفید ملک ہوگی۔ (اہم فقہی فیصلے:۱۰۰)۔

مزید ملاحظہ ہو: (ہدایہ: ۳/۶۲، وفتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۵/۱۶۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

گاڑیوں کی کمپنی کے ساتھ عقدِ مضاربت کا حکم:

سوال: موریشس میں ایک کمپنی قائم کی گئی ہے؛ لوگ پیسے دیتے ہیں اور کمپنی بطورِ وکالت گاڑیوں کی تجارت کرتی ہے، پیسے دینے کے بعد کم از کم چھ ماہ رکھنا ضروری ہے اس سے پہلے موکل نہیں لے سکتا ہے، چھ ماہ کے بعد نفع نقصان کا حساب کتاب ہوتا ہے، کمپنی کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ راس المال پر سالانہ چھ فیصد نفع کمائے، پھر چھ ماہ بعد اگر چھ فیصد سے کم نفع حاصل ہوا تو راس المال مع منافع موکل کو دیدیا جاتا ہے اور اگر چھ فیصد پر زیادہ ہوگا تو وکیل کا ہوگا، نقصان کی صورت میں راس المال کے تناسب سے کمی ہوگی، بہر صورت وکیل کمپنی چلانے کی فیس وصول کرتا ہے۔ کیا یہ معامل شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایک طرف سے عمل ہے اور دوسری طرف سے مال ہے لہٰذا یہ عقدِ مضاربت ہے وکیل مضارب ہے اور موکل رب المال ہے اور مضابت میں مضارب کا منافع کے فیصد کے ساتھ اجرت لینا جائز اور درست ہے، زمانہ حال کے مفتی حضرات کے نزدیک شریک اجیر بن سکتا ہے۔

البتہ نفع کی تقسیم کا جو طریقہ ہے وہ بظاہر صحیح نہیں، اس کو اس طرح صحیح کرلیا جائے کہ جو بھی کمپنی کو نفع ہوگا وہ فیصد کے اعتبار سے تقسیم کیا جائے گا، اور اس کے لیے فیصد مقرر کرلیے جائیں، اور خدانخواستہ اگر نقصان ہو جائے تو رب المال اس کے ذمہ دار ہوں گے، کمپنی (مضارب) اس کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

نیز عقدِ مضاربت کو موقت بھی کر سکتے ہیں کہ چھ ماہ سے قبل کوئی بھی پیسے واپس نہیں لے سکتا اور چھ ماہ بعد واپس کیے جائیں گے لیکن پہلے سے معاہدہ کر کے اس پر دستخط کروا لیے جائیں۔

ملاحظہ ہو در مختار میں مرقوم ہے:

المضاربة ... وشرعاً عقد شركة في الربح بمال من جانب رب المال وعمل من جانب المضارب. وفي رد المحتار: قوله وشرعاً عقد شركة، قال في النهاية: ومن يحذو حذوه أنها دفع المال إلى غيره ليتصرف فيه ويكون الربح بينهما على ما شرطا. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۵/۶۴۵، سعید).

وفيه أيضاً: وشرطها:...وكون الربح بينهما شائعاً فلو عين قدراً فسدت، وكون

نصيب كل منهما معلوماً عند العقد . (الدر المختار: ۵/ ۶۴۸، سعید).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں مذکور ہے:

اگر عقدِ مضاربہ میں داخل ہوتے وقت ہی فریقین اس بات پر متفق ہوجاتے ہیں کہ کوئی فریق بھی ایک معینہ مدت کے اندر چند مخصوص حالات کے علاوہ مضاربہ کو ختم نہیں کرے گا تو یہ بات بظاہر شریعت کے کسی اصول کے خلاف معلوم نہیں ہوتی، بالخصوص اس حدیث کی روشنی میں؛ جس میں یہ آیا ہے کہ:

المسلمون على شروطهم إلا شرطاً أحل حراماً أو حرم حلالاً . (رواه الترمذی، رقم: ۱۳۵۲، وقال: هذا حديث حسن صحيح). (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/ ۴۷، ط: ادارۂ اسلامیات).

شریک اجیر بن سکتا ہے اور اس کے لیے منافع کے فیصد کے علاوہ ماہانہ تنخواہ مقرر کی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ ہو: (احسن الفتاویٰ: ۷/ ۳۲۸، سعید)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

بینک سے سودی قرض لیکر گاہک کو خریداری پر رعایت دینے کا حکم:

سوال: بعض تجار گاہکوں کو خریدنے پر آمادہ کرنے کے لیے ان کو بینک کے ذریعہ خریدنے کی پیشکش کرتے ہیں تاکہ تین قسطوں میں ثمن کی ادائیگی کی رعایت مل جائے، اس کی صورت یہ ہے کہ بینک مشتری کی طرف سے بائع کو یکمشت فوری طور پر قیمت ادا کردیتا ہے اور مشتری بینک کو تین قسطوں میں وہی قیمت ادا کرتا ہے پھر بینک بائع سے مبیع کی قیمت کے تناسب سے کچھ فیصد سود وصول کرتا ہے۔

اب اس کی درج ذیل چند صورتیں ہیں:

۱۔ مسلمان گاہک کے لیے مسلمان تاجر کی دکان سے خریدنا۔

۲۔ مسلمان گاہک کے لیے غیر مسلم کی دکان سے خریدنا۔

۳۔ کسی محتاج اور متوسط درجہ والے کے لیے حاجت کی بنا پر ایسا معاملہ کرنا۔

۴۔ مسلمان تاجر کے لیے ایسی پیشکش کرنا، اگر نہیں کی تو بہت ممکن ہے کہ گاہک خریداری کے لیے دوسری دکان پر چلا جائے۔

۵۔ کیا یہ زائد فیصد سود کو سروس چارج میں شمار کیا جاسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مذکورہ بالا معاملہ سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

۱۔ مسلمان گاہک کا مسلمان دکاندار کے ساتھ ایسا سودی معاملہ کرنا ناجائز ہے۔

۲۔ کفار نے اسلامی احکام کا التزام نہیں کیا ہے اس وجہ سے کافر تاجر کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا جائز ہے، تاہم اجتناب اولیٰ ہے۔ ہاں کفار سے سود حاصل کرنا جائز نہیں۔

۳۔ جب تک کوئی سخت ضرورت یا مجبوری کی شکل نہ ہو وہاں تک سودی لین دین میں ملوث ہونا جائز نہیں۔ کیونکہ نفس حاجت کی بناپر حرام معاملہ حلال نہیں بن جاتا۔

۴۔ مسلمان تاجر کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے جائز ذرائع اختیار کرے اور ناجائز اسباب سے پرہیز کرے، اور گاہک کو سودی معاملہ کی پیشکش کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

۵۔ بینک کے سود کو سروس چارج کہنا مشکل ہے، کیونکہ قیمت کے تناسب سے لی جانے والی رقم سود ہی کہلائے گی۔ دلائل حسبِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

قال في الدر المختار: وفي الخلاصة: القرض بالشرط حرام...وفي الأشباه: كل قرض جر نفعاً حرام، وفي رد المحتار: قوله كل قرض جر نفعاً حرام، أي إذا كان مشروطاً كما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة. (الدر المختار مع ردالمحتار: ۱۶۶/۵، سعید).

العنایہ شرح الہدایہ میں ہے:

الربا في اللغة هو الزيادة... وفي الاصطلاح هو الفضل الخالي عن العوض المشروط في البيع. (العناية: ۷/۳). (وكذا في الدر المختار: ۱۶۸/۵، سعيد).

معجم لغة الفقهاء میں مذکور ہے:

الربا كل زيادة مشروطة في العقد خالية عن عوض مشروع. (معجم لغة الفقهاء، ص ۲۱۸). (وكذا في التعريفات الفقهية، ص ۱۰۲).

منتخباتِ نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

شرعاً ربا کے معنی میں جتنی عبارتیں فقہاء نے نقل فرمائی ہے ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اموالِ ربویہ میں عقدِ معاوضہ کا معاملہ ہو اور اسی عقد میں کسی جانب کو زیادتی بلاعوض ہو (یعنی) جس میں نفع عقدِ معاملہ میں مشروط ہو۔ (منتخباتِ نظام الفتاویٰ: ۱/۱۹۵)۔

کفار کے آپس کے معاملات کے متعلق فساد کا حکم نہیں لگایا جائیگا۔ ملاحظہ ہو امداد الاحکام میں ہے:

امام اعظمؒ کے نزدیک اہل ذمہ کے بھی معاملات خلافِ شرع پر حکم فساد نہ لگایا جائے گا، بشرطیکہ وہ معاملات خود ان کے دین کے موافق ہوں کیونکہ اہل ذمہ نے معاملات میں احکامِ اسلام کا التزام اپنے معتقدات کے خلاف میں نہیں کیا... لہٰذا ایسے معاملات جب وہ اپنے مذہب کے موافق کریں گے تو ان کو صحیح مانا جائے گا اور حکمِ فساد نہ دیا جائے گا... جواب کا حاصل یہ ہے کہ کفار مخاطب بالفروع فی العقوبات والمعاملات اگرچہ ہیں لیکن حکم بالحرمۃ والفساد کے لیے خطابِ عام کافی نہیں بلکہ التزام بھی شرط ہے۔ (امداد الاحکام: ۴/۳۹۰)۔

منتخباتِ نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

غیر مسلم آپس میں سودی کاروبار اور سودی لین دین بھی کرتے ہیں، بہت سی بیع باطل و فاسد بھی کرتے ہیں، شراب بھی بناتے اور بیچتے ہیں، اور اس کی قیمت لیتے ہیں، خنزیر بھی بیچ کر اس کی قیمت لیتے ہیں، پھر مسلمانوں کو یہ پیسے مزدوری میں انعام وغیرہ میں دیتے ہیں، اور ان سب پیسوں کا حرام ہونا معلوم ہونے کے باوجود اس پیسوں کا لینا اس وقت تک شرعاً جائز وغیر مکروہ شمار ہوتا ہے جب تک کہ یہ یقین نہیں ہوتا کہ یہ چیز جس کو فروخت کر رہا ہے یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈالکر لایا ہے یا جو قیمت دے رہا ہے یہ بعینہٖ وہی روپیہ ہے جس کو چرا کر یا ڈاکہ ڈالکر مثلاً لایا ہے، (یعنی بعینہٖ چوری، ڈاکہ وغیرہ کا ہو تو جائز نہیں) غرض ان سب کا لے لینا اور استعمال کر لینا سب درست رہتا ہے۔ (منتخباتِ نظام الفتاویٰ، ص ۴۶۸، ط: اصلاحی کتب خانہ)۔

ہاں اگر اس پورے معاہدہ پر گاہک کو بھی دستخط کرنے پڑتے ہو تو پھر اس قسم کے سودی معاملہ پر دستخط کر کے رعایت لینا جائز نہیں ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

قرض وصول کر کے ادا کرنے کی ذمہ داری پر اجرت لینے کا حکم:

سوال: بینک اور زید کے درمیان عقد ہوا اس میں ربا اور بغیر ربا دونوں کا امکان ہے پھر ایک کمپنی (servicing company) نے ذمہ داری لی کہ وہ زید سے رقم وصول کر کے بینک کو دیگی اور اس کے عوض بینک اس کمپنی کو کچھ متعین رقم یا فیصد دیگا کیا ایسا معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ہر قسم کے سودی لین دین سے بچنا ضروری ہے چاہے سود یقینی ہو یا امکان کے درجہ میں ہو، ہاں کمپنی کا بینک سے اپنے عمل کی اجرت حاصل کرنا جائز اور درست ہے کیونکہ زید سے رقم وصول

کر کے بینک کو دینے کی ذمہ داری لی ہے جو کہ ایک جائز اور درست عمل ہے اس کی اجرت بھی جائز ہے۔ پھر اجرت میں متعین رقم بھی لی جاسکتی ہے اور فیصد کے اعتبار سے بھی دونوں طرح جائز ہے۔

ملاحظہ ہو صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

وإن أطلق له العمل فله أن يستاجر من يعمله لأن المستحق عمل في ذمته ويمكن إيفاؤه بنفسه أو بالاستعانة بغيره بمنزلة إيفاء الدين . (الهداية :۳/۲۹۷).

وفي اللباب: وإن أطلق له العمل فله أن يستأجر من يعمله لأن المستحق عمل في ذمته ، ويمكن إيفاؤه بنفسه وبالاستعانة بغيره ، بمنزلة إيفاء الدين ، والعادة جارية أن الصناع يعملون بأنفسهم وبأجرائهم . (اللباب في شرح الكتاب: ۱/۱۸۴).

وفي رد المحتار: أن المشترک له أن يتقبل العمل من أشخاص، لأن المعقود عليه ، في حقه هو العمل أو أثره . وفي التحرير المختار للرافعي: قوله هو العمل أو أثره ، أي العمل إذا شرط عليه أن يعمل بنفسه وأثره إذا لم يشترط أن يعمل بنفسه . (ردالمحتار: ۶/۶۴، سعيد، والتحرير المختار: ۶/۲۶۸، سعيد). وكذا في تبيين الحقائق: ۵/۱۳۴).

وفي فتاوى الشامي: تتمة : قال في التاتارخانية : وفي الدلال والسمسار يجب أجر المثل وما توا ضعوا عليه أن في كل عشرة دنانير كذا فذلک حرام عليهم ، وفي الحاوي: سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار فقال: أرجو أنه لا بأس به وإن كان في الأصل فاسداً لكثرة التعامل وكثير من هذا غير جائز فجوزه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام .

(فتاوى الشامي : ۶/۶۳، سعيد).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں مرقوم ہے:

ایک شخص کا دوسرے پر قرض ہے اور قرض کی دستاویز بھی موجود ہے اور گواہ بھی موجود ہیں لیکن وہ مقروض قرض ادا نہیں کرتا اب یہ شخص کسی با اعتماد شخص سے کہتا ہے کہ میرا قرض فلان سے وصول کر کے دو میں اس قرض کا تہائی تمہیں دوں گا تو شرعاً یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟

حضرت تھانویؒ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: یہ شخص اجیر خاص ہے لہٰذا تنخواہ معین

ہونی چاہیے خواہ ماہانہ خواہ یک مشت کہ کامیابی حاصل ہونے کے بعد تم کو اتنا فیصد دیں گے۔ (جلد اول، ص ۲۵۲)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فلمی ایکٹرز کی ملازمت کرنے کا حکم:

سوال: کیا فلمی ایکٹرز کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سے جو کمائی حاصل ہوتی ہے وہ حلال ہے یا حرام؟ بینوا توجروا۔

الجواب: فلموں میں کام کرنا متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے، اس کا دیکھنا، اس میں ملازمت کرنا اور اس کی تجارت کرنا سخت گناہ اور حرام ہے، فلم میں پائے جانے والے چند منکرات اور کبیرہ گناہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ بے حیائی اور عریانیت کے مناظر، ۲۔ غیر اخلاقی مکالمات، بلکہ مخربِ اخلاق کردار کے مناظر، ۳۔ غیر محرم کے ساتھ فحش کردار کے مناظر، ۴۔ موسیقی کے ساتھ گانے۔ عشق ومعاشقہ کے ناجائز اسباب اور خواہشات اُبھارنے والے مناظر، چوری، ڈاکہ زنی اور جرائم پیشہ لوگوں کے کردار کے مناظر، وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان میں سے ایک بھی موجود ہو تو اس قسم کی ملازمت کی حرمت اور اس کے عدمِ جواز کے لیے کافی ہے، چہ جائیکہ یہ سب کا مجموعہ ہے۔

قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿ومن الناس من يشترى لهو الحديث ليضل عن سبيل اللّٰه﴾ [لقمان:٦]،

قال العلامة الآلوسي في روح المعاني: و لهو الحديث على ماروى عن الحسن رحمه الله: كل ما شغلك عن عبادة اللّٰه تعالیٰ وذكره من السمر و الأضاحيك و الخرافات و الغناء و نحوها . (روح المعاني: ٦٧/٢١).

قال الملا على القارى فى المرقاة: وقال النووى فى الروضة : غناء الإنسان بمجرد صوته مكروه وسماعه مكروه وإن كان سماعه من الأجنبية كان أشد كراهة والغناء بآلات مطربة هو من شعار شاربى الخمر كالعود والطنبور والصنج والمعازف وسائر الأوتار حرام وكذا سماعه حرام . (مرقاة المفاتيح: ١٣٢/٩).

قال فى تكملة البحر الرائق: ودلت المسألة على أن الملاهى كلها حرام حتى التغنى بضرب القصب قال عليه الصلاة والسلام ليكونن من أمتي أقوام يستحلون الحر الحرير والخمر والمعازف ، أخرجه البخاري، وفى لفظ آخر: ليشربن أناس من أمتى الخمر

يسمونها بغير اسمها يعزف على رؤوسهم بالمعازف والمغنيات يخسف الله بهم الأرض ويجعل منهم القردة والخنازير واختلفوا في التغني المجرد قال بعضهم: إنه حرام مطلقاً والاستماع إليه معصية لإطلاق الحديث وهو اختيار شيخ الإسلام . (تكملة البحر الرائق: ۲۱۴/۸، دار المعرفة، بيروت).

للمزيد من البحث راجع : (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۳۴۸/۶،سعيد،والهداية : ۸۰/۴، ط: المكتبة الاسلامية، وتبيين الحقائق: ۱۳/۶ ،ط:امداديه ، ملتان،وفتح القدير).

کتاب الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

فلموں میں اداکاری سخت گناہ ہے... جو عند اللہ سخت پکڑ کا باعث ہے اور یہ صرف بے شرمی نہیں بلکہ بے شرمی کی ندائے عام ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ انسان کی جو نیکی دوسروں پر اثر انداز ہو تو اس کا دائرۂ اثر جتنا وسیع ہو انسان اسی قدر اجر کا مستحق ہے اور اسی طرح اگر کوئی شخص برائی کا داعی ہو تو اس کی اس قبیح دعوت کا اثر جتنا وسیع ہوگا وہ اسی نسبت سے گناہ گار بھی ہوگا۔ (کتاب الفتاویٰ: ۳۱۸/۱)۔

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

ناچ گانا شرعاً ناجائز ہے، اس کا دیکھنا اور سننا بھی ناجائز ہے اگرچہ وہ فلم ہی کے ذریعہ ہو... فلم تو خود مستقل لغو تماشا ہے اس میں اور لوگوں کو ملایا جائے تو مجموعہ لغویات ہوگا۔ (۵۱۱/۱۹، جامعہ فاروقیہ)۔

مزید دیکھیں: (کتاب الفتاویٰ: ۲۰۱/۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مالِ عاریت پر تعدی کی وجہ سے تاوان کا حکم:

سوال: ایک شخص نے کسی کو ایک ہفتہ کے لیے کتاب عاریت پر دی، اس نے ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی کتاب واپس نہیں کی، دسویں دن کتاب چوری ہوگئی تو مستعیر پر تاوان لازم ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر مستعیر نے بلا کسی سبب کے ایک ہفتہ میں کتاب واپس نہیں کی، پھر چوری ہوگئی تو اس پر تاوان لازم ہوگا۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

وإذا قيدها بوقت فهي مطلقة إلا في حق الوقت حتى لو لم يردها بعد مضي الوقت مع الإمكان ضمن إذا هلكت سواء استعملها بعد الوقت أو لا . (البحر الرائق: ۲۸۲/۷،ماجديه).

قال في الدرالمختار: وإن أطلق المعير أو المؤجر الانتفاع في الوقت والنوع انتفع ماشاء أي وقت شاء لما مر ، وإن قيده بوقت أو نوع أو بهما ضمن بالخلاف إلى شر فقط لا إلى مثل أو خير . (الدرالمختار: ۵/۶۸۰،سعید).

قال في الفتاوى الهندية: وإن قيدها بوقت ومضى الوقت ولم يردها ضمن . (الفتاوى الهندية: ۴/۳۷۱، وكذا في تكملة ردالمحتار: ۸/۴۱۸،سعيد).

باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ میں مذکور ہے:

فارسی عبارت کا ترجمہ: مگر اس صورت میں اگر وہ تین دن مقررہ وقت کے لیے عاریت تھی مگر بغیر کسی خاص وجہ کہ اس کے واپس کرنے میں دیر کی، تو اس غفلت کی وجہ سے ضمان واجب ہوجائیگا، اگر دیر کرنا بغیر ضرورت کے اور فضول تھا اور اگر بھیج دینے کا پکا ارادہ تھا اور سامان بغیر دیر کیے ضائع ہوگیا تو اس میں تاوان نہیں ہے۔(باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ،ص ۳۲۵،مفتی الٰہی بخش اکیڈمی)۔واللہ ﷻ اعلم۔

اقالہ میں مبیع کے نقصان کا تاوان لینے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دوسرے سے گاڑی خریدی، ۴۵ دن برابر استعمال کی، اس عرصہ میں اس نے گاڑی کو خراب کیا مثلاً ویل خراب ہوئے اور ایک طرف کا دروازہ خراب ہوا، پھر کہتا ہے کہ مجھے نہیں چاہیے، بائع نے غصہ میں آ کر واپس لے لی، اب کیا بائع ۴۵ دن کا کرایہ اور ویل اور دروازے کی قیمت طلب کرسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مشتری نے جب گاڑی خریدی، اور اس کو چلایا گھمایا پھرایا تو اب اس کو واپس نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن اب مشتری نے واپس کی اور بائع نے لے لی اگر چہ غصہ میں لی، تو اقالہ منعقد ہوگیا، اور اقالہ کے لیے ثمن اول کا ذکر ضروری نہیں ہے، نیز جب بائع نے اقالہ کرلیا تو اب ویل اور دروازے کی قیمت لینے کا حق نہیں، کیونکہ چلاتے وقت مشتری گاڑی کا مالک تھا، اور اس نے اپنی ملک میں تصرف کیا تھا، اسی طرح ۴۵ دن کے کرایہ کے مطالبہ بھی حق نہیں ہے۔

ہاں مشتری اگر قیمت میں سے کچھ رقم بطورِ تبرع بائع کے پاس چھوڑ دے تو درست ہے، لیکن اگر نہ چھوڑے تو بائع کو آخرت میں بے حساب ثواب ملے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ اقالہ سے انکار کا حق حاصل

ہونے کے باوجود واپس لینا ثواب کا کام ہے، مزید براں اس کو کار استعمال کرنے کا ثواب بھی ملے گا۔

اقالہ خود ایک ثواب کا کام ہے۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں فضیلت وارد ہوئی ہے:

عن أبي هريرة رضى الله تعالىٰ عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أقال نادماً بيعته أقال الله عثرته يوم القيمة ، قال الشيخ شعيب الأرنوؤط: إسناده صحيح على شرط مسلم . (صحيح ابن حبان : ١١/٤٠٤/٥٠٢٩، ط:مؤسسة الرسالة).

درمختار میں مرقوم ہے:

وتصح أيضاً...بالتعاطى ولو من أحد الجانبين كالبيع وهو الصحيح بزازية ، قوله هو الصحيح ،بزازية: عبارتها قبض الطعام المشترى وسلم بعض الثمن ثم قال بعد أيام أن الثمن غال فرد البائع بعض الثمن المقبوض، فمن قال: البيع ينعقد بالتعاطى من أحد الجانبين جعله إقالة وهو الصحيح . (الدرالمختار مع ردالمحتار : ٥/١٢٠،سعيد).

شرح المجلہ میں مرقوم ہے: **واستفيد من قوله الإقالة كالبيع ، أن القبول فيها كما يكون بالقول يكون بالفعل الدال على القبول كالبيع ، فلو أوجب أحد المتقابلين وصدر من الآخر فعل يدل على القبول تمت الإقالة...الإقالة بالتعاطى القائم مقام الإيجاب والقبول صحيحة .**

(شرح المجلة ٢/٧٨، وكذا فى الفتاوى الهندية:٣/١٥٧).

اقالہ میں ثمن اول کا ذکر نہ کیا ہو پھر بھی ثمن اول پر اقالہ صحیح ہو جائیگا۔ ملاحظہ ہو درمختار میں ہے:

وتصح بمثل الثمن الأول وبالسكوت عنه، المراد أن الواجب هو الثمن الأول سواء سماه أولا . (فتاوى الشامى : ٥/١٢٥،سعيد).

قال في شرح المجلة: وقوله وينفسخ البيع ، أى يجب رد مثل الثمن الأول حالاً سواء تقايلا على مثل الثمن الأول أوسكتا عن بيانه وقت الإقالة . (شرح المجلة : ٢/٧٧).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وکیل بالشراء کا کم قیمت میں خرید کر زیادہ کی رسید بنوانے کا حکم:

سوال: میں ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں، کمپنی مجھے فون خریدنے کے لیے بھیجتی ہے، دکاندار پہچان کی

بناپر مجھے کم قیمت میں دیتا ہے، اور رسید عام قیمت پر بناتا ہے مثلاً: ۲۵۰ میں خریدے اور رسید ۲۶۰ کی بنوائے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے اور جو زائد رقم ہے وہ میں اپنے لیے رکھ سکتا ہوں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ وکیل بالشراء کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ۲۵۰ میں خریدے اور رسید ۲۶۰ کی بنوا کر ۱۰ رینڈ جیب میں رکھدے، بلکہ جتنی قیمت میں خریدے اس کے مطابق رسید بنائے، ہاں یہ بات درست ہے کہ ۲۵۰ میں خریدے اور ۲۵۰ کی رسید بنائے، پھر بعد میں تعلقات کی وجہ سے بطورِ انعام وکیل کو کچھ دیدے تو کوئی حرج نہیں اور کمپنی کو بھی شاید اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ سنن ابی داود میں روایت ہے:

عن عروة يعني ابن الجعد البارقي قال: أعطاه النبي صلى اللّٰه عليه و سلم ديناراً يشترى به أضحية أو شاة فاشترى شاتين فباع أحداهما بدينار فأتاه بشاة و دينار فدعا له بالبركة في بيعه فكان لو اشترى تراباً لربح فيه . (سنن ابی داود: ۲۵۶/۳).

قال في الدرالمختار: و لو وهبه كل الثمن رجع بكله ولو بعضه رجع الباقي لأنه حط وفي الشامي: قوله كل الثمن، أي جملة واحدة قال في البحر: ولو وهبه خمس مائة ثم الخمسمائة الباقية لم يرجع الوكيل إلا بالأخرى لأن الأولى حط والثانية هبة. (الدرالمختارمع رد المحتار: ۵/۵۱۶، سعيد).

قال في الفتاوى الولوالجية: رجل أمر رجلاً يشترى له جارية بألف درهم فاشتراه ثم أن البائع وهب للوكيل ألفاً فللوكيل أن يرجع على البائع بألف، لأنه لا يمكن أن يجعل هذا حطاً عن الثمن، لأنه يفسد العقد فجعل هبة فيرجع، بخلاف ما إذا وهب خمسمائة حيث ليس أن يرجع على الآمر، لأنه أمكن أن يجعل هذا حطاً عن الثمن، فصار كأنه اشترى بخمسمائة، ولو وهب البائع منه الخمسمائة أولاً ثم وهب منه الخمسمائة الباقية يرجع عليه بالخمسمائة الباقية دون الأولى، لأنه لا يمكن أن يجعل الخمسمائة الباقية حطاً .

(الفتاوى الولوالجية: ۳۵۳/۴). (وكذا في البحرالرائق: ۱۵۵/۷).

وفي المبسوط للإمام السرخسيؒ: قال: و لو وكل وكيلاً بأن يؤدى عنه ودفع إليه المال فأدى نصفه وحط الطالب نصفه فهذا الحط عن الأصيل وليس للوكيل منه شيء، لأن

الحط إسقاط والإسقاط إنما يكون عمن عليه المال . (المبسوط : ۱۹/ ۱۵۱).

وللمزيد من البحث راجع : (بدائع الصنائع : ۶/ ۳۱، سعيد، والفقه الحنفی وأدلته : ۲/ ۱۳۰).

واللہ ﷻ اعلم۔

فیس کے تناسب سے ملازم کی اجرت متعین کرنے کا حکم:

سوال: ایک مدرسہ والوں نے ایک معلّمہ کو پڑھانے کے لیے رکھا اور تنخواہ یہ طے کی گئی کہ جو بھی ماہانہ فیس وصول ہوگی اس کا بیس فیصد تنخواہ میں دیا جائیگا، مثلاً اگر مجموعی فیس ۱۰۰۰۰ وصول ہوئی تو ۲۰۰۰ رینڈ اس ماہ کی تنخواہ ہوگی۔ کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ بینوا بالبرہان توجروا عندالرحمٰن۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ تنخواہ دینے کا یہ طریقہ لوگوں میں معروف ومشہور نہیں ہے، اوراس میں جھگڑے کا اندیشہ ہے اوراگر جھگڑا نہ ہو تو بھی ناراضگی یقینی ہے، پھر معلّمہ دل سے کام نہیں کرے گی، لہٰذا اربابِ مدرسہ کو چاہیے کہ معلّمہ کی تنخواہ فیصد سے نہیں بلکہ ماہانہ رقم متعین کردے تاکہ اطمینانِ قلبی سے کام کریں، اور ماہانہ متعین رقم دینا لوگوں میں معروف ومشہور ہے، اوراس میں نزاع سے بھی امن رہے گا۔

ملاحظہ ہو الاختیار لتعلیل المختار میں ہے: **ولا بـد مـن كـون المنافع و الأجرة معلومة ، وما صلح ثمناً صلح أجرة .** (الاختيار : ، كتاب الاجارة).

البحر الرائق میں مرقوم ہے:

و شـرطهـا أن تـكـون الأجـرة والمنفعة معلومين لأن جهالتهما تفضي إلى المنازعة .

(البحر الرائق: ۷/ ۲۹۷، دارالمعرفة). (وكذا في الدرالمختار : ۶/ ۵، سعيد).

وفـي الشامي: قوله كون الأجرة والمنفعة معلومين، أما الأول فكقوله بكذا دراهم أو دنـانيـر وينصرف إلى غالب نقد البلد فلو الغلبة مختلفة فسدت الإجارة ما لم يبين نقداً منها فلو كانت كيلياً أو وزنياً أوعددياً متقارباً فالشرط بيان القدر والصفة . (فتاوى الشامي: ۶/ ۵).

شرح القواعد الفقهيه میں مرقوم ہے:

إذا تـعـارف الـنـاس واعتـادوا التـعـامـل عليه بدون اشتراط صريح فهو مرعى ويعتبر بـمـنـزلة الاشتـراط الـصـريح فكما لا تسمع الدعوى بخلاف ما شرط صريحاً مما تعورف

لاتسمع الدعوی بخلاف ما تعورف واعتید العمل به بدون شرط ولذا قالوا : لو ادعی نازل الخان وداخل الحمام وساکن المعد للاستغلال الغصب ولم یکن معروفاً به لم یصدق فی ذلک ویلزمه الأجر . (شرح القواعد الفقهية ، ص ۱۳۴ ،ط:دارالقلم). واللہ ﷻ اعلم۔

تقسیمِ نفع کی چند صورتوں کے ساتھ مضاربت کا حکم:

سوال: عقدِ مضاربت میں تقسیمِ نفع کو درجِ ذیل چند صورتوں کے ساتھ مشروط کردے تو کیا شریعت کی رو سے ایسا معاملہ جائز ہوگا یا نہیں؟

۱۔ نفع ہمارے درمیان اخماساً ہوگا چار خمس آپ کے اور ایک خمس میرا، نیز کل نفع اگر ۱۰،۰۰۰ روپیہ سے تجاوز کرجائے تو میں صرف ایک ہزار لوں گا باقی آپ کا ہوگا۔ نوٹ: دس ہزار میں سے ایک ہزار ایک خمس سے بھی کم ہے لیکن رضامندی سے یہ شرط طے ہوجائے تو کیا درست ہے یا نہیں؟

۲۔ نفع ہمارے درمیان اخماساً تقسیم ہوگا، چار خمس آپ کے اور ایک خمس میرا، اگر میرا نفع ایک ہزار سے متجاوز ہو تو زائد آپ کو ہبہ کردوں گا۔

۳۔ دوسری صورت کی طرح ہے لیکن ہبہ کی جگہ یہ کہا کہ اگر میرا نفع ایک ہزار سے زائد ہو تو مزید رقم آپ کو دینے کی ضمانت دیتا ہوں۔ بینوا توجروا۔

الجواب: عقدِ مضاربت میں نفع کی تقسیم کا اصول یہ ہے کہ نفع فیصد کے اعتبار سے تقسیم کیا جائیگا، کسی کے لیے متعین رقم نہیں طے کی جائے گی، وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر متعین رقم سے زائد نفع نہ ہو تو دوسرا محروم ہوگا، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں چونکہ نفع فیصد کے اعتبار سے مقرر کیا گیا ہے لہٰذا مذکورہ معاملہ جائز اور درست ہوگا۔ ملاحظہ ہو شرحِ مجلّہ میں مرقوم ہے:

و تعیین حصة العاقدین من الربح...یتضمن اشتراط ثلاثة أمور: الأول: أن یکون نصیب کل منهما من الربح معلوماً حتی لو کان مجهولاً بأن شرط للمضارب جزء أو شیئاً أو ردد بین النصف والثلث مثلاً تکون فاسدة لأن الربح هو المعقود علیه وجهالته توجب فساد العقد .

الثانی: أن یکون جزءاً شائعاً قل أو کثر کالنصف أو الثلث لأن الشرکة فی الربح

إنـمـا تتحق به حتى لو شرطا لأحدهما مائة من الربح مثلاً أو مائة مع الثلث أو الثلث إلا مائة والباقى للآخر لم تجز المضاربة لأنه يؤدى إلى قطع الشركة فى الربح لجواز أن لا يربح إلا ذلک القدر ، زيلعى ، وحاشيته للشلبى .

الثـالـث: أن يـكـون المشروط للمضارب مشروطاً من الربح حتى لو شرطا شيئاً من رأس الـمال أو منه ومن الربح فسدت المضاربة كما فى الهندية عن المحيط . (شرح المجلة لمحمد خالد الاتاسی: ۳۳۳/۴).

وقـال فـى الـمبسـوط للإمام السرخسي: وكذلک والباقى لرب المال فهوجائز لأن الـمشـروط لـلمضارب جزء شائع معلوم وهذا الشرط لا يؤدى إلى قطع الشركة بينهما فى الـربـح مع حصوله فما من شيء يحصل من الربح قل أوكثر إلا وله عشر...ولو قال على أن مـا رزق اللّٰه تعالىٰ في ذلک من شيء فللمضارب من ذلک مائة درهم فهذه مضاربة فاسدة لأن هـذا الشـرط يـوجب قطع الشركة بينهما فى الربح مع حصوله فربما لا يربح إلا مقدار المئة . (المبسوط للامام السرخسی: ۲۸۸/۲۲).

قـال الـقـدورى فـى كتـابـه: كـل شرط يوجب جهالة الربح أوقطع الشركة فى الربح يـوجـب فسـاد المضاربة وما لايوجب شيئاً من ذلک لا يوجب فسادها نحو أن يشترطا أن تكون الوضيعة عليهما كذا فى الذخيرة . (الفتاوى الهندية: ۲۸۸/۴).

الفقه الاسلامی میں مذکور ہے:

ويـجـوز عـند الحنفية أن يشترطا لأحد العاقدين دراهم معدودة معلومة إن زاد الربح عـلـى مـقدار كذا من الدراهم فذلک شرط صحيح لا يؤثر فى صحة المضاربة لأنه لايؤدى إلى جهالة الربح . (الفقه الاسلامی وادلته: ۸۴۹/۴).

وقـال الإستـاذ على الخفيف فى"الشركات" ويجب فيها أن يكون نصيب كل منهما فـى الـربـح حـصة شـائـعة مـنه حتى يتحقق الاشتراک فى الربح فتفسد المضاربة إذا جعل لأحـدهـمـا مبـلـغ مـعين من النقود على أى وضع إلا إذا شرط في ذلک أن يكون فى الربح

زيادة عليه مشتركة كأن يجعل لأحدهما ١٠٠ جنية في السنة إذا وصل الربح ألف جنية، وما بقي فهو بينهما مناصفة أو مثالثة أو نحو ذلک إذ مع هذا الشرط يتحقق الاشتراک في الربح . (الشركات). واللہ ﷻ اعلم۔

برنی کھجور کو عجوہ کے عوض کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص برنی کھجوروں کے دو کیلو دیکر عجوہ کھجور ایک کیلو لے لے تو ایسا معاملہ جائز ہوگا یا نہیں؟ یعنی یہ معاملہ جیدها وردیها سواء کے تحت آئیگا یا دونوں الگ نوع شمار ہوں گی؟ چونکہ دونوں کی قیمتوں میں بہت فرق ہے؟ بینوا بالدلیل تو جروا بالا جرالجزیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایک کیلو عجوہ کے عوض دو کیلو برنی لینا جائز نہیں ہے، یہ عین ربا ہے کیونکہ دونوں کھجور ہیں اور اموالِ ربویہ میں جید اور ردی کا حکم یکساں ہے۔ ہاں یہ بات جائز ہے کہ ایک کیلو عجوہ کو ثمن کے بدلہ فروخت کردے اور اسی ثمن کے عوض دو کیلو برنی لے لے تو معاملہ علیحدہ ہونے کی وجہ سے جائز ہوگا۔

ملاحظہ ہو بخاری شریف میں مذکور ہے:

عن مالک بن أوس سمع عمر رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: البر بالبر ربا إلا هاء وهاء والشعير بالشعير ربا إلا هاء وهاء والتمر بالتمر ربا إلا هاء وهاء . (صحيح البخاري: ١/٢٩٠).

وفيه أيضاً : عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استعمل رجلاً على خيبر فجاء ه بتمر جنيب فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم أكل تمر خيبر هكذا قال: لا والله يا رسول الله إنا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين والصاعين بالثلاثة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيباً . (صحيح البخاري : ١/٢٩٣).

الفتاوی الہندیہ میں مرقوم ہے:

فإذا باع المكيل كالبر والشعير والتمر والملح أو الموزون كالذهب والفضة وما باع بالأواقي بجنسه مثلاً بمثل صح وإن تفاضل أحدهما لا يصح وجيده ورديئه سواء حتى

لایصح بیع الجید بالردی مما فیه الربا إلا مثلاً بمثل . (الفتاوی الهندیة: ۱۱۷/۳).

بدائع الصنائع میں مذکور ہے:

الحنطة کلها اختلاف أنواعها وأوصافها وبلدانها جنس واحد...وکذلک التمر ... فلا یجوز بیع کل مکیل من ذلک بجنسه متفاضلاً فی الکیل وإن تساویا فی النوع والصفة بلا خلاف وإما متساویاً فی الکیل متفاضلاً فی النوع والصفة فنقول لاخلاف في أنه یجوز بیع الحنطة بالحنطة السقیة بالسقیة والنحسیة بالنحسیة وأحدهما بالأخری والجیدة بالجیدة والردیئة بالردیئة وأحدهما بالأخری ... (بدائع الصنائع: ۱۸۷/۵، سعید).

وفی التبیین : ولأن تفاوت الوصف لا یعد تفاوتاً عادة ولو اعتبر لانسد باب البیاعات. (تبیین الحقائق: ۸۹/۴، ط: امدادیه). **واللہ ﷻ اعلم۔**

مسلمان کے لیے سودی اکاؤنٹ رکھنے اور سودی رقم ٹیکس میں ادا کرنے کا حکم:

سوال: کیا سودی رقم ٹیکس میں ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو سودی رقم کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ کیا کسی مسلمان کے لیے سودی اکاؤنٹ رکھنا جائز ہے، جس میں سود حاصل ہوتا ہو اس نیت سے کہ سودی رقم سے ٹیکس ادا کروں گا؟ بینوا بالدلیل تو جروا بالاجر الجزیل۔

الجواب: ا۔بصورتِ مسئولہ اگر منصفانہ ٹیکس ہے یعنی جس کا فائدہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیں پہنچتا ہے، ایسے ٹیکس میں کسی قسم کی سودی رقم ادا کرنا جائز نہیں چاہے وہ سود پرائیویٹ بینک کا ہو یا سرکاری بینک کا۔ ہاں وہ ٹیکس جو سرکار کی طرف سے ظلماً عائد کیا جاتا ہے، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ تو اس کا حکم یہ ہے کہ مرکزی اور سرکاری بینک کا سود اس میں ادا کرنے کی گنجائش ہے کیونکہ یہ مالِ حرام مالک کو واپس کرنے کے مترادف ہے اگر چہ بعض محتاط علماء نے لکھا ہے کہ سودی رقم سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا مناسب نہیں، لہٰذا ٹیکس میں دینا بھی خلافِ احتیاط ہے اگر چہ حدِ جواز میں داخل ہے، البتہ پرائیویٹ بینک کا سود حکومتی ٹیکس میں ادا کرنا جائز اور درست نہیں۔ اور ہمارے ملک جنوبی افریقہ میں عام طور پر پرائیویٹ بینک ہوتے ہیں لہٰذا ایسے سود کا ٹیکس میں ادا کرنا جائز نہیں۔

۲۔اگر کسی کے پاس سودی رقم ہو تو وہ بعینہٖ مالک کو واپس کر دی جائے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو بلا نیتِ

ثواب فقراء پر صدقہ کردی جائے۔

۳۔حفاظت کی غرض سے بینک میں پیسہ جمع رکھنا جائز ہے ہاں سودی اکاؤنٹ کے علاوہ دیگرا کاؤنٹ میں رکھنا چاہیے،لیکن اگر کسی نے غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں رکھا ہے تو توبہ استغفار کے ساتھ سود بلانیت ثواب فقراء پر تقسیم کردے اور آئندہ کسی مسلمان کے لیے سودی معاملہ میں ملوث ہونا جائز نہیں۔نیز اس نیت سے سودی اکاؤنٹ کھولنا کہ سود کی رقم سے ٹیکس ادا کروں گا جائز نہیں۔

ترتیب وار دلائل ملاحظہ فرمائیں: فتاوی الشامی میں مذکور ہے:

۱۔ إذا آجر المغصوب فالأجر له ، فإن تلف المغصوب من هذا العمل أو تلف لا منه وضمنه الغاصب له الاستعانة بالأجر في أداء الضمان وتصدق بالباقي . (فتاوى الشامی : ۱۸۹/۶ ،سعید).

قال في الهداية: فلو هلك العبد في يد الغاصب حتى ضمنه له أن يستعين بالغلة في أداء الضمان، لأن الخبث لأجل المالك ، ولهذا لو أدى إليه يباح له التناول فيزول الخبث بالأداء إليه ، بخلاف ما إذا باعه فهلك في يد المشترى ثم استحق وغرمه ليس له أن يستعين بالغلة في أداء الثمن إليه ؛ لأن الخبث ما كان لحق المشترى إلا إذا كان لا يجد غيره ؛ لأنه محتاج إليه ، وله أن يصرفه إلى حاجة نفسه ، فلو أصاب مالا تصدق بمثله إن كان غنياً وقت الاستعمال، وإن كان فقيراً فلا شيء عليه لما ذكرنا . (الهداية : ۳۷۵/۳).

(وكذا في تبيين الحقائق : ۲۲۵/۵ ،امداديه).

وفي الفتاوى السراجية : إذا آجر المغصوب يستعين بأجره في ضمان القيمة و يتصدق بالفضل لأنه كسب خبيث . (فتاوى سراجية،ص ۳۵۸).

فتاویٰ محمودیہ میں مرقوم ہے: سرکاری بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم غیرواجبی ٹیکس میں سرکا ہی کو دیدیجائے یا پھر محتاج غرباءکودیدے ثواب کی نیت نہ کرے۔(فتاویٰ محمودیہ:۳۴۷/۲۴)۔

منتخب نظام الفتاویٰ میں مذکور ہے: اسٹیٹ بینک یا مرکزی حکومت کے اور جتنے بینک ہیں ان سے سود کی جو رقم ملے،اس کو اگر مرکزی حکومت ہی کے کسی غیر شرعی ٹیکس میں دیدے تو ذمہ بری ہوجائیگا جیسے انکم ٹیکس وغیرہ۔

(منتخب نظام الفتاویٰ:۱/۱۹۶)۔

۲۔ مالِ حرام مالک کو واپس کیا جائے اور اگر مالک نہ ملے تو اس کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے۔

قال في رد المحتار: لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئاً وهو أولى بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (فتاوى الشامي: ۶/۳۸۵، سعيد). وكذافي البحرالرائق: ۸/۲۰۱، كوئٹه).

۳۔ فتاویٰ رحیمیہ میں مرقوم ہے: بینک میں حفاظت یا قانونی دشواریوں کی وجہ سے رقم رکھی جاسکتی ہے، سود حاصل کرنے کی نیت سے رقم رکھنا درست نہیں، اگرچہ یہ نیت ہو کہ سود کی رقم محتاجوں کو دے دی جائے گی۔ (فتاویٰ رحیمیہ:۹/۲۷۰)۔

منتخب نظام الفتاویٰ میں مذکور ہے: پہلی بات تو یہ ہے حفاظت کی غرض سے یا کسی مجبوری کی وجہ سے اگر بینک میں روپیہ جمع کرنا پڑے تو ایسے شعبہ یا کھاتہ میں جمع کرنے کی کوشش کرے جس میں سود کا حساب ہی نہ لگایا جاتا ہو۔ (منتخب نظام الفتاویٰ:۱/۱۹۰)۔

آج کل ایسے بلاسودی کھاتے دستیاب ہیں لہٰذا انہیں کو استعمال کرنا چاہیے اور سودی کھاتہ میں رقم جمع نہیں کروانی چاہیے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

دائن کے لاپتا ہونے پر قرض کی رقم کا حکم:

سوال: ایک شخص نے دوسرے سے قرض لیا، بڑی رقم تھی، اب واپس کرنا چاہتا ہے لیکن دائن کا کچھ پتا نہیں ہے اور کسی بھی طریقے سے رابطہ ممکن نہیں ہے تو اب اس رقم کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ کیا کسی خیر کے ادارے میں دینا درست ہے یا نہیں؟ کہاں تک انتظار کرنا چاہیے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ دائن کی تلاش وجستجو کرنے کے بعد بھی جب کوئی سراغ نہ ملے تو اس کے شرعی ورثاء کو دیدی جائے، لیکن بسیار انتظار کے بعد ورثاء کا بھی کچھ پتا نہ چلے تو کسی معتمد خیر کے ادارے میں دی جاسکتی ہے، ہاں غرباء، فقراء پر تقسیم کردی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، لیکن یہ بات یاد رہے کہ اگر دائن آ گیا اور صدقہ منظور کرلیا تو فبہا ورنہ پوری رقم اس کو واپس کرنی ہوگی اور مدیون کو صدقہ کا ثواب مل جائیگا۔

ملاحظہ ہو در مختار میں مذکور ہے:

عليه ديون ومظالم جهل أربابها وأيس من عليه ذلك ، من معرفتهم فعليه التصدق بقدرها من ماله...هذا مذهب أصحابنا. وفي رد المحتار: قوله جهل أربابها ، يشمل ورثتهم فلو علمهم لزمه الدفع إليهم لأن الدين صار حقهم... وإن لم يجد المديون ولا وارثه صاحب الدين ولا وارثه فتصدق أو وارثه عن صاحب الدين برى في الآخرة . قوله كمن في يده عروض لايعلم مستحقيها ، يشمل ما إذا كانت لقطة علم حكمها ، وإن كانت غيرها فالظاهر وجوب التصدق بأعيانها أيضاً، قوله سقط عنه المطالبة ، كأنه والله تعالىٰ أعلم لأنه بمنزلة المال الضائع والفقراء مصرفه عند جهل أربابه ، وبالتوبة يسقط أثم الإقدام على الظلم . (فتاوى الشامي: ۴/۲۸۳،سعيد). وكذا في مجمع الانهر في شرح ملتقى الابحر: ۲/ ۵۳۱، ط: بيروت).

فتاویٰ دینیہ میں مرقوم ہے:

جن لوگوں کا قرض باقی ہے ان لوگوں کا انتقال ہو چکا ہے تو ان کے ورثاء کو ڈھونڈ کر اور تحقیق کر کے یہ رقم ان تک پہنچانا ضروری ہے، اس لیے کہ اس رقم پر اب ان کا حق ہے، تلاش بسیار کے بعد بھی اگر ان کے ورثا کا علم نہ ہو تو وہ رقم مرحوم کی طرف سے مسجد میں یا غربا میں صدقہ کر دیا تو یہ کافی ہو جائیگا، البتہ اس کے بعد اگر ورثاء کا علم ہو تو دوبارہ ورثاء کو ادا کرنا ضروری ہوگا۔ (فتاویٰ دینیہ: ۴/۴۹۲، مکتبہ راندیر)۔

اشرف الاحکام میں مرقوم ہے؛ لقطہ کا حکم یہ ہے کہ جب مالک کا پتا چلنا متعذر ہو تو کسی کارِ خیر میں دیدیا جائے چنانچہ میں مدرسہ میں دیدیتا ہوں۔ (اشرف الاحکام، ص ۱۹۷، بحوالہ حسن العزیز: ۳/۶)۔

مزید ملاحظہ ہو: (احسن الفتاویٰ: ۶/ ۳۹۰، وفتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۲۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

زیورات میں بیع سلم کا حکم:

سوال: کیا سونے چاندی کے زیورات میں بیع سلم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ سونے چاندی کے زیورات میں بیع سلم جائز اور درست ہے، اس طور پر کہ فی الحال راس المال یعنی رقم ادا کر دی جائے اور مدتِ مقررہ پر زیورات لا کر دیے جائیں، اس میں بیع سلم کی شرائط

پائی جاتی ہیں اور چونکہ راس المال ثمنِ عرفی ہے ثمنِ خلقی نہیں ہے لہٰذا ایک جانب قبضہ کافی ہے، بعد میں زیورات کی ادائیگی سے بیع پر کوئی فرق مرتب نہ ہوگا۔ ملاحظہ ہوالمحیط البرہانی میں مذکور ہے:

للسلم شرائط كثيرة : أحدها : بيان جنس المسلم فيه كقولنا تمرزلاً . والثاني: بيان نوعه كقولنا فارسي أو ما أشبهه ، والثالث: بيان صفته كقولنا جيد أو رديء . والرابع : بيان قدره في المكيلات بالكيل والموزونات بالوزن والمعدودات بالعدد لأن بدون بيان هذه الأشياء يقع بينهما منازعة من التسليم والتسلم ...

الشرط الخامس: أن يكون المسلم فيه مؤجلاً بأجل معلوم حتى إن سلم الحال لايجوز وهذا مذهبنا ...والشرط السادس : أن يكون المسلم فيه موجوداً من وقت العقد إلى وقت محل الأجل حتى أن السلم في المنقطع لا يجوز وهذا مذهبنا...الشرط السابع : أن يكون المسلم فيه يتعين بالتعيين ...الشرط الثامن : أن يكون المسلم فيه من الأجناس الأربعة من المكيلات والموزونات والعدديات المتقاربة والذرعيات...الشرط التاسع مكان الإيفاء إذا كان المسلم فيه شيئاً له حمل ومؤنة كالحنطة وغيرذلك ...الشرط العاشر : قبض رأس المال في المجلس ...الخ. (المحيط البرهاني : ۱۶۵.۱۵۷/۷،الفصل الثاني والعشرون في السلم).

بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وأما الذي يرجع إلى البدلين جميعاً فهو أن لايجمعهما أحد وصفي علة ربا الفضل و ذلک إما الكيل وإما الوزن وإما الجنس لأن أحد وصفي علة ربا الفضل هو علة ربا النساء فاذا اجتمع أحد هذين الوصفين في البدلين يتحقق ربا النساء والعقد الذي فيه ربا فاسد .

(بدائع الصنائع: ۲۱۴/۵،سعيد).

فتاوی شامی میں بیع سلم کی تعریف یوں کی ہے: **بيع آجل وهو المسلم فيه بعاجل وهو رأس المال ... والأصل أخذ آجل بعاجل .** (فتاوى الشامي: ۲۰۹/۵،سعيد).

خلاصہ یہ ہے کہ زیورات کی بیع سلم کے بارے میں کوئی عدمِ جواز کی وجہ معلوم نہیں ہوتی لہٰذا جائز ہوگی ،

اور چونکہ راس المال ثمن عرفی ہے ثمن خلقی نہیں ہے اس وجہ سے ربا کا تحقق نہ ہوگا ہاں مجلس میں راس المال پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔نظام الفتاویٰ میں ہے:

نوٹ (کاغذی نوٹ) نہ کیلی ہے اور نہ وزنی، بلکہ عددی ہے۔(نظام الفتاویٰ:۱/۲۹۹)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (جدید فقہی مباحث:۴/۶۰۰)۔

جدید معاملات کے شرعی احکام میں مرقوم ہے:

سونا یا چاندی اس طرح ادھار پر فروخت کرنا کہ مثلاً: سونے کے زیورات خرید لیے اور رقم کچھ ابھی دے دی اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ کاغذی نوٹ کے ذریعہ سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے اس لیے ادھار خرید وفروخت جائز ہے، شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے تا کہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے...

وفي الهندية: قال: وروى الحسن عن أبي حنيفةؒ إذا اشترى فلوساً بدراهم وليس عند هذا فلوس ولا عند الآخر دراهم ثم أن أحدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منها حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط. (الفتاوى الهندية: ۳/۲۲۴، الفصل الثالث في بيع الفلوس)،

(جدید معاملات کے شرعی احکام: جلد اول، ص ۱۲۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میدان میں کھیلنے کے لیے فیس ادا کرنے اور اس پر انعام حاصل کرنے کا حکم:

سوال: ایک علاقہ میں ۳۲ جماعتیں کھیلنے والی ہیں، اس کھیل کی ایک انتظامی کمیٹی ہے، کھیل کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ ہر جماعت ۵۰۰ رینڈ بطورِ فیس ادا کرے گی اس کے بدلہ میدان میں کھیلنے کا حق حاصل ہوگا، تو کل ۱۶۰۰۰ ہزار رینڈ جمع ہوں گے، پھر جو جماعت کامیاب ہوگی اسے ۲۵۰۰ ہزار بطورِ انعام دیے جائیں گے اور نمبر ۲ پر آنے والی جماعت کو ۱۵۰۰ بطورِ انعام حاصل ہوں گے، باقی ۱۲۰۰۰ میدان کی فیس اور دیگر اخراجات میں استعمال کیے جائیں گے اور کچھ حصہ انتظامی کمیٹی کو ملے گا۔ کیا شرعاً یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ یہ معاملہ جائز اور درست ہے کیونکہ جو پیسے بطورِ فیس ادا کیے اس کے عوض میدان میں کھیلنے کا حق مل گیا اور دوسری سہولیات مل گئیں، پھر کامیاب ہونے والی جماعت کو کمیٹی اپنی طرف سے انعام دے تو یہ درست ہے کیونکہ پیسوں میں کسی کا حق نہیں لہٰذا یہ ابتدائی تبرع ہے۔

نیز اس کی مثال وہ صورت بھی ہے کہ سب لوگ تبرعاً کھانا لاکر جمع کر کے ساتھ کھالیں جس میں کوئی زیادہ کھاتا ہے کوئی کم کھاتا ہے جبکہ کسی کو کھانے کی رغبت ہی نہیں ہوتی تو درست ہے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أبي موسى قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: إن الأشعريين إذا أرملوا فى الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد ثم اقتسموه بينهم في إناء واحد بالسوية فهم مني وأنا منهم . (صحيح البخاري رقم: ۲۴۸۶).

قال الشيخ ابن بطال البكري: وإنما يأكل كل واحد على قدر نهمته ، وقد يأكل الرجل أكثر من غيره ، وهذه القسمة موضوعة بالمعروف ، وعلى طريقة بين الآكلين . (شرح صحيح البخاري :۷/۷).

قال فى الهندية : المسافرون إذا خلطوا أزوادهم أو أخرج كل واحد منهم درهماً على عدد الرفقة واشتروا به طعاماً وأكلوا فإنه يجوز وإن تفاوتوا فى الأكل كذا فى الوجيز للكردري ، والله أعلم . (الفتاوى الهندية: ۳۴۲/۵). **واللہ ﷻ اعلم۔**

غیر مسلم کے لیے سیاحت کی جگہ کھانا فراہم کرنے کا حکم:

سوال: ایک آدمی حلال کھانے کی تجارت کرتا ہے، ایک تفریحی سیاحت گاہ ہے جس کے ماتحت ایک رقص گاہ چلتی ہے، مسلمان اور غیر مسلم سب اس تفریحی جگہ پر سیر وسیاحت کے لیے جاتے ہیں، کیا ایسی جگہ کھانا فراہم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ عام سیاحت کرنے والے چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنا اور ان کو کھانا فروخت کرنا جائز اور درست ہے اور اس کی آمدنی بھی حلال وطیب ہے، ہاں خصوصی طور پر جو لوگ رقص گاہ میں ہوں یا دیگر فواحش کے اڈے میں ہوں وہاں جا کر کھانا پہنچانا گناہ اور معصیت پر تعاون ہے جو ناجائز ہے، اس سے فوری اجتناب کرنا چاہیے۔

ملاحظہ ہو جواہر الفقہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

ثم السبب إن لم يكن محركاً وداعياً ، بل موصولاً محضاً ، وهو مع ذلک سبب

قريب بحيث لا يحتاج في إقامة المعصية به إلى إحداث صنعة من الفاعل كبيع السلاح من أهل الفتنة...وإجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر أو يتخذها كنيسة أو بيت نار وأمثالها، فكله مكروه تحريماً بشرط أن يعلم به البائع والآجر من دون تصريح به باللسان ، فإنه إن لم يعلم كان معذوراً وإن علم وصرح كان داخلاً فى الإعانة المحرمة . (جواہر الفقہ:۲/۴۵۳،طبع قدیم)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

سرکاری ٹیکس آفس میں ملازمت کرنے کا حکم:

سوال: میں ایک حکومت کے ٹیکس آفس میں کام کرتا ہوں ، میرا کام ٹیکس انسپیکٹر (Tax inspector) کا ہے لوگوں کے اکاؤنٹ (Account) دیکھ کر جنہوں نے اب تک ٹیکس ادا نہیں کیا ان کا پیچھا کرنا ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا میرے لیے ایسی ملازمت جائز ہے جبکہ میں حکومت کے ظالمانہ ٹیکس بھی وصول کرتا ہوں، اور کیا میرے لیے تنخواہ لینا حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ حکومت کا تمام ٹیکس ظالمانہ نہیں ہوتا بلکہ حکومت چلانے اور عوام کے مفاد کے لیے ٹیکس لینا کبھی ناگزیر ہوتا ہے، ہاں بعض ٹیکس ظلماً بھی لیے جاتے ہیں، لیکن جب غیر مسلم حکومت لوگوں کے اموال پر قبضہ کرلے تو حکومت ان اموال کی مالک بن جاتی ہے، اس کو فقہ کی اصطلاح میں استیلاء کہتے ہیں، چنانچہ حکومت کے ٹیکس آفس میں ملازمت کرنا اور لوگوں سے ٹیکس وصول کرنا اور اس پر تنخواہ لینا جائز اور درست ہے۔ کیونکہ آپ حکومت کی جانب سے وکیل بالاجرت ہیں اور وکالت کی اجرت جائز اور درست ہے۔

دلائل ملاحظہ ہو: علامہ سرخسیؒ فرماتے ہیں:

فأما في زماننا إنما يوجد أكثر النوائب بطريق الظلم ومن تمكن من دفع الظلم عن نفسه فذلک خير له . (المبسوط للامام السرخسيؒ:۱۰/۳۵،دارالفكر،بيروت).

حکومت کا استیلاء سببِ ملک ہے، جب حکومت نے بطورِ ٹیکس کچھ رقم پر قبضہ کرلیا تو اب حکومت اس رقم کی مالک بن گئی۔ ملاحظہ ہو تبیین الحقائق میں ہے:

قوله فى المتن وإن غلبوا على أموالنا وأحرزوها بدارهم ملكوها ، وبه قال مالکؒ وأحمدؒ إلا أن عند مالکؒ يملكونها بمجرد الاستيلاء بدون الإحراز . (تبيين الحقائق: ۳/۲۶۰، القاهرة).

فتح القدیر میں مرقوم ہے: **قوله وإذا غلب الترک علی الروم أی کفار الترک علی کفار الروم فسبوهم وأخذوا أموالهم ملکوها ، لأن الاستیلاء قد تحقق علی مال مباح ... قوله تعالیٰ ﴿للفقراء المهاجرين﴾ [الحشر:۸] سماهم فقراء ، والفقير من لا يملک شيئاً ، فدل علی أن الکفار ملکوا أموالهم التي خلفوا وهاجروا عنها .** (فتح القدیر: ۳/۶، ط: دارالفکر).

(وکذا فی فتاوی الشامی : ۴/۱۶۰ ،سعید).

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ مسلمان کے کافر سے میراث حاصل کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

يجوز للمسلم أن يرث من الکافر بسبب استيلاء الحکومة الکافرة علی مال الکافر أولاً ثم دفعها إلی المسلم بقانونها و استيلاء الکافر سبب للملک عندنا، والله أعلم ، أو يقال: استولی المسلم علی مال الکافرة بقوة سلطان أهل الحرب وصار تملکاً له بالاستيلاء ودليل التملک بقوة سلطان أهل الحرب ما ذکر في شرح السير . (امدادالاحکام:۴/۶۲۸)۔

وفی الفتاوی الهندية : الباب الخامس في استيلاء الکفار: إذا غلب کفار الترک علی کفار الروم فسبوهم وأخذوا أموالهم ملکوها فإن غلبنا علی الترک حل لنا ما نجده مما أخذوه...الخ. (الفتاوی الهندية : ۲/۲۲۴) . (وکذا فی الدرالمختار : ۴/۱۶۰ ،سعید،والبحرالرائق : ۵/۱۰۲ ، دارالمعرفة ،وتبيين الحقائق :۳/۲۶۰ ،وفتح القدير: ۶/۳).

قاموس الفقہ میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب لکھتے ہیں:

استلاء کے معنی غالب آجانے کے ہیں، فقہ کی اصطلاح میں دارالحرب کے کافروں کے مسلمانوں یا کسی دوسری مملکت کے کافروں ہی پر غالب آجانے کو کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اہل کفر اگر کسی کے مال پر غلبہ حاصل کرلیں تو وہی اس کے مالک قرار پاتے ہیں، اس طرح اگر غیر مسلموں کی ایک مملکت کسی دوسری مملکت کے مال پر غاصبانہ قبضہ کرلے تو وہ اس کی مالک ہوجائے گی اور مسلمانوں کے لیے ان سے ایسی اشیاء کا خریدنا درست ہوگا، اور خریدنے کے بعد وہ اس کے جائز مالک قرار پائیں گے۔ (قاموس الفقہ :۲/۱۳۱،۱۳۲)۔

اشرف الاحکام جو امداد الفتاویٰ کا تتمہ ہے اس میں مرقوم ہے:

فرمایا: استیلاء کافر موجبِ ملک ہے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک۔ بحوالہ ادب الاعلام، ص:۲۲۰۔ (اشرف

الاحکام،ص۲۳۸، میراث کے احکام، ط: ادارہ اسلامیات، لاہور)۔(وکذا فی کتاب النوازل:۳۷۲/۱۲)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بیع کی قانونی کاروائی مکمل ہونے تک بائع کا مشتری سے کرایہ وصول کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے مکان خریدا، بائع کے کہنے پر مشتری نے پوری قیمت وکیل کے اکاؤنٹ میں منتقل کردی، وکیل نے مشتری سے کہا کہ آپ مکان میں رہ سکتے ہیں لیکن جب تک قانونی کاروائی مکمل نہ ہوجائے وہاں تک آپ کو مکان کا کرایہ ادا کرنا ہوگا۔ کیا یہ کرایہ لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز وکیل نے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ آپ کی رقم بینک میں رکھدی جائے گی اور جو سود حاصل ہوگا اسی سے کرایہ ادا کردیا جائیگا، کیا یہ صورت جائز ہے؟ بینوا بالدلیل تو جروا بالا جرالجزیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ جب عقد مکمل ہوگیا اور مشتری نے قیمت ادا کردی تو مشتری مکان کا مالک بن گیا اس کے بعد مشتری سے کرایہ لینا جائز نہیں ہے، شریعت میں بیع کی تکمیل کا مدار قانونی دستاویزات پر نہیں ہے، اس کے بغیر ایجاب وقبول پر بیع مکمل ہوجاتی ہے، اور بائع کے وکیل کا رقم کو سودی کھاتہ میں رکھ کر سود حاصل کرنا جائز نہیں، اگر بینک میں سود کا چھوڑنا مناسب نہ ہو تو بائع یا اس کا وکیل سود کی رقم بلانیتِ ثواب فقراء پر تقسیم کردے۔ لیکن مشتری کے منع کرنے کے باوجود اگر وکیل اپنے طور پر سود وصول کر کے کرایہ لیتا ہے تو وکیل خود اس کا ذمہ دار ہے۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

قال في الهداية : وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما إلا من عيب أو عدم رؤية . (الهداية : ۲۰/۳).

مجمع الانہر میں مرقوم ہے:

وإذا وجد الإيجاب والقبول من المتعاقدين لزم البيع وفيه إشارة إلى أن البيع يتم بهما ولا يحتاج إلى القبض ولا إلى إجازة البائع بعدهما وهو الصحيح بلا خيار مجلس إلا من عيب أو عدم رؤية . (مجمع الانهر:۱۱/۳، دارالكتب العلمية، بيروت).

وقال في الشامية : لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة ولا يأخذون منه شيئاً وهو أولىٰ بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بهالأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه. (فتاوى الشامي: ۳۸۵/۶).

نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

اصل ضابطہ یہ ہے کہ جو بھی حرام مال ہو اس کے بارے میں اصل حکم یہی ہے کہ جس کا مال ہے اس کی ملک میں کسی تدبیر سے لوٹا دینا، اور جب اصل مالک کی ملک میں نہ پہنچا سکے تو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطورِ صدقہ کسی مستحق صدقہ کو دے کر جلد از جلد اپنی ملک سے خارج کردے اور خود کسی کام میں استعمال نہ کرے اور نہ اس کو صدقہ میں دینے کے بعد ثواب کی نیت کرے۔(نظام الفتاویٰ:۱/۱۸۵)۔واللہ ﷻ اعلم۔

حرام گوشت فروخت کرنے والے کو دکان کرایہ پر دینے کا حکم:

سوال: ایک شخص نے ایک پراپرٹی خریدی، اس میں ایک دکان بھی شامل ہے اور کرایہ دار ایک حرام گوشت فروخت کرنے والا قصائی ہے، کرایہ کا معاہدہ تھوڑی مدت میں ختم ہونے والا ہے، کیا ایسے قصائی کو دکان کرایہ پر دینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ نیز پہلے سے کرایہ کا معاہدہ چلا آرہا تھا تو اب اس سے کرایہ وصول کرکے استعمال کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر کرایہ دار مسلمان ہے تو مسلمان کو حرام گوشت بیچنے کے لیے دکان کرایہ پر دینا مکروہِ تحریمی ہے اور کرایہ کی رقم واجب التصدق ہے، اور اگر کرایہ دار غیر مسلم ہے تو مکروہِ تنزیہی ہے، بچنا اولیٰ ہے، اور امام صاحبؒ کے قول کے مطابق آمدنی حرام نہیں ہوگی۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق میں ہے:

و إجارة بيت ليتخذ بيت نار أو بيعة أو كنيسة أو يباع فيه خمر بالسواد ، يعني جاز إجارة البيت لكافر ليتخذ معبداً أو بيت نار للمجوس أو يباع فيه خمر في السواد وهذا قول الإمام وقالا: يكره كل ذلك لقوله تعالىٰ : ﴿وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ . (البحر الرائق: ۸/۲۳۰).(وكذا في تبيين الحقائق: ۶/۲۹،امداديه،ملتان).

جواہر الفقہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

ثم السبب إن لم يكن محركاً وداعياً ، بل موصولاً محضاً ، وهو مع ذلك سبب قريب بحيث لا يحتاج في إقامة المعصية به إلى إحداث صنعة من الفاعل كبيع السلاح من أهل الفتنة...وإجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر أو يتخذها كنيسة أو بيت نار وأمثالها، فكله مكروه تحريماً بشرط أن يعلم به البائع والآجر من دون تصريح به باللسان ، فإنه إن لم يعلم

كان معذوراً وإن علم وصرح كان داخلاً في الإعانة المحرمة .(جواہر الفقہ :۲/۴۵۳،طبع قدیم)۔

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے:

بندہ کے خیال میں اجارہ من الکافر اور اجارہ من المسلم میں فرق ہے، عباراتِ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کافر سے متعلق ہیں اور اس میں درایۃً وروایۃً کراہت تنزیہیہ کو ترجیح معلوم ہوتی ہے اور اجارہ من المسلم میں کراہتِ تحریمیہ راجح معلوم ہوتی ہے۔(احسن الفتاویٰ:۶/۴۵۶)۔ مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا:۵/۶۲۶)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

اپنی حیاتی میں بیوی کو مکان ہبہ کرنے کی ایک صورت:

سوال: ا۔ایک آدمی اپنی زندگی میں اپنا مکان اپنی بیوی کو ہبہ کرنا چاہتا ہے لیکن اس میں منقولی اشیاء و سامان موجود ہیں، ان کو ہبہ سے مستثنیٰ کرنا چاہتا ہے تو شریعت میں اس کی کیا صورت ہوگی؟ ۲۔اور اگر قابل تقسیم زمین میں سے ہبہ کرنا چاہتا ہے اور تقسیم نہیں کرنا چاہتا ہے تو اس کی کیا صورت ہوگی؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ ہبہ کے تام ہونے کی آسان صورت یہ ہے کہ شوہر بیوی کو مکان معمولی قیمت میں بیچ دے اور سامان کا استثناء کردے، پھر وہ قیمت معاف کردے، اس طرح مکان بیوی کا ہوجائے گا اور سامان شوہر ہی کا رہے گا۔

۲۔اس کی آسان صورت بھی یہی ہے کہ آدھی زمین موہوب لہ کے ہاتھ معمولی قیمت میں فروخت کردے پھر قیمت معاف کردے۔نیز آئندہ انکار کے سدِ باب کے لیے مکان یا زمین موہوب لہ کے نام پر کرا دینا بہتر ہے۔

دوسری صورت ودیعت کی ہے، کہ سامان بیوی کو بطورِ ودیعت دیکر تخلیہ کردے، پھر مکان ہبہ کردے اور بیوی کو قبضہ دیدے تو ہبہ تام ہوجائیگا۔ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں مذکور ہے:

ولو وهب داراً فيها متاع الواهب وسلم الدار إليه أو سلمها مع المتاع لم تصح والحيلة فيه أن يودع المتاع أولاً عند الموهوب له ويخلي بينه وبينه ثم يسلم الدار إليه فتصح الهبة فيها . (الفتاوى الهندية: ۴/۳۸۰).

(وكذافي فتاوى الشامي: ۸/۴۳۹،سعيد، وفتاویٰ دارالعلوم زکریا:۵/۶۰۱)۔**واللہ ﷻ اعلم۔**

مدرس کا درس کے علاوہ خارجی اوقات میں اپنے طلبہ کو اجرت پر ٹیوشن دینے کا حکم:

سوال: ایک اسلامی اسکول کے اساتذہ خارجی اوقات میں اپنے طلبہ کو اجرت لیکر ٹیوشن دیتے ہیں، انتظامیہ کو اس پر اشکال ہے اور بعض ممبران یہ قانون بنانا چاہتے ہیں کہ اگر اپنے طلبہ کو ٹیوشن دے تو اجرت نہیں لے سکتے، اب سوال یہ ہے کہ کیا کسی ادارے میں تعلیم دینا اور پھر اپنی کلاس کے بعض طلبہ کو خارج اوقات میں اجرت لیکر پرائیویٹ ٹیوشن دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایسا قانون بنانا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر اساتذہ پرائیویٹ ٹیوشن کی وجہ سے مدرسہ کے اوقات میں بچوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تو یہ اپنے منصب میں خیانت ہے اور تخونوا أماناتكم [الأنفال:۲۷] میں شامل ہوگا، اور اگر اساتذہ اوقاتِ درس میں پوری توجہ اور امانت داری سے پڑھاتے ہوں لیکن بعض طلبہ مزید نمبرات حاصل کرنے کی غرض سے ٹیوشن لیتے ہوں تو اس کی گنجائش ہے، اور یہ قانون بنانا کہ اوقاتِ درس کے علاوہ نہیں پڑھا سکتے، صحیح نہیں، الا یہ کہ خارج میں پڑھانے کی وجہ سے مدرس اوقاتِ درس میں تقصیر کرتا ہو یا اتنا تھک جاتا ہو کہ تعلیم دینا اس کے لیے مشکل ہو۔

کیونکہ اساتذہ اجیر خاص کے حکم میں ہیں اور اجیر خاص اپنے استراحت کے اوقات میں دیگر غیر ضروری مصروفیات میں تھک کر اپنے فرائض منصبی میں کوتاہی کرے تو یہ خیانت میں شامل ہوگا۔ شرعاً اس کی اجازت نہیں۔ ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں مرقوم ہے:

لو استأجر أستاذ لتعليم علم أو صنعة وسميت الأجرة فإن ذكرت انعقدت الإجارة صحيحة على المدة حتى أن الأستاذ يستحق الأجرة بكونه حاضراً و مهيئاً للتعليم تعلم التلميذ أو لم يتعلم ... لأنه لما انعقدت الإجارة صحيحة بتعيين الأجر والمدة استحق الأستاذ الأجرة لمجرد تسليمه نفسه للتعليم ... لكونه أجيراً خاصاً ... أن الأجير الخاص يستحق الأجرة إذا كان في مدة الإجارة حاضراً للعمل و لا يشترط عمله بالفعل. (شرح المجلة لسليم رستم باز: ۱/۳۰۵، المادة:۵۶۸).

قال في الدرالمختار: والثاني وهو الأجير الخاص ويسمى أجير وحد وهو من يعمل لواحد عملاً موقتاً بالتخصيص ويستحق الأجر بتسليم نفسه في المدة وإن لم يعمل كمن

استوجر شهراً للخدمة . (الدرالمختار: ۶/ ۶۹،سعید،وومثله فی الهداية : ۳/ ۳۱۰).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جب مدرس کے لیے اوقات متعین کردیے گئے ہیں تو ان اوقات میں وہ اجیر خاص ہیں، ان اوقات میں اس کو دوسرا کام اجارہ پر کرنا جائز نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ:)۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں مذکور ہے:

آج کل ملک میں جو عام وبا پھیلی ہوئی ہے کہ اکثر اساتذہ اسکول وکالجوں کے ٹیوشن پڑھاتے ہیں گورنمنٹ سے بھی تنخواہ لیتے ہیں اور بچوں سے فیس بھی جن کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں... ٹیوشن لینا جائز ہے مگر تعلیم گاہ میں بچوں پر توجہ نہ کرنا گناہ ہے۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۲۳۵)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

گیس سلنڈر میں مارکیٹ پالیسی کے تحت کم گیس بھرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص ایک ایل پی (LP) گیس انڈسٹری میں کام کرتا ہے، اُس کا کام گیس بھرنا ہوتا ہے، عام طور پر خالی سلنڈر ۱۱ کیلو کے ہوتے ہیں اور ۹ کیلو گیس بھری جاتی ہے لیکن مارکیٹ پالیسی کے تحت پورا، ۹ کیلو نہیں بلکہ ۱۰۰ سے ۵۰۰ گرام کم رکھا جاتا ہے، اور ہم اس کے پابند ہوتے ہیں، اگرچہ پورے ۹ کیلو بھرنا بھی کوئی مشکل نہیں ہے، اور دوسری طرف ناپ تول میں کمی کرنے والے کے بارے میں قرآنِ مجید میں وعید آئی ہے، اب کیا میرے لیے ایسی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ عام لوگ جانتے ہیں کہ کچھ کم گیس بھری جاتی ہے اور یہ کمپنی کی طرف سے ہے تو جائز ہے لیکن اگر مشتری کے ساتھ دھوکا بازی سے کام لیا جاتا ہو تو پھر نا جائز ہے۔

حدیث شریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکا دینے سے منع فرمایا: ملاحظہ ہو ترمذی شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مرعلى صبرة من طعام ، فأدخل يده فيها ، فنالت أصابعه بللاً ، فقال: يا صاحب الطعام ، ماهذا ؟ قال: أصابته السماء يا رسول الله ! قال: أفلا جعلته فوق الطعام حتى يراه الناس ، ثم قال: من غش فليس منا . (رواه الترمذی : ۱/ ۲۴۵).

قال فی الدرالمختار: لا يحل كتمان العيب في مبيع أو ثمن لأن الغش حرام ، وفی رد

المحتار: قوله لأن الغش حرام، ذكر في البحر أول الباب بعد ذلك عن البزازية عن الفتاوىٰ إذا باع سلعة مبيعة عليه البيان وإن لم يبين قال بعض مشايخنا: يفسق بمجرد هذا لأنه صغيرة، قلت: وفيه نظر، لأن الغش من أكل أموال الناس بالباطل فكيف يكون صغيرة بل الظاهر في تعليل كلام الصدر إن فعل ذلك مرة بلا إعلان لا يصير به مردود الشهادة وإن كان كبيرة. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۵/۴۷، سعید).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

سوال: نائلون میں بیل چنٹ دار ہے وہ ہمیں نو میٹر ملتی ہے اور ہم اس کو کھینچ کر گیارہ میٹر بڑھا دیتے ہیں، اور ہم اس کو ناپ کر فروخت کرتے ہیں اور گاہک کہتا ہے کہ یہ کھینچی ہوئی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ کھینچ کر رکھی ہے، گاہک کی مرضی ہے کہ لے یا نہ لے، اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: جب آپ بتلا دیتے ہیں کہ ہاں یہ کھینچ رکھی ہے، اور دھوکا نہیں دیتے تو خریدار کی مرضی ہے دل چاہے خریدے نہ دل چاہے نہ خریدے، دھوکا دیں تو ناجائز اور گناہ ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۲۴/۲۹۹)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

قرض میں اجل کا بطورِ وعدہ لازم ہونے کا حکم:

سوال: زید کو مقدمہ کے لیے بڑی رقم کی ضرورت پڑی، بکر کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے بکر نے زید کو دو سال کی مدت میں بالاقساط ادائیگی کے وعدہ پر تین لاکھ رینڈ قرض دیا، پھر اچانک تعلقات ختم ہوئے اور بکر نے چھ ماہ میں رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا، زید نے وعدہ یاد دلاتے ہوئے کہا کہ دو سال کی مدت میں ادائیگی مکمل ہو جائے گی، بکر چونکہ عالم ہے اس لیے اس نے کہا قرض میں اجل لازم نہیں ہے اور مجھے مطالبہ کا حق ہے، اب شریعت کا کیا حکم ہے؟

۲۔ زید یہ بھی کہتا ہے کہ میرے پاس فی الحال ادائیگی کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے، آپ پر مہلت لازم ہے۔ شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا مہلت دینا لازم ہوگا یا نہیں؟ بینوا بالدلیل تو جروا بالا جر الجزیل۔

الجواب: مذہبِ احناف کے مطابق قرض میں اجل لازم نہیں، لہٰذا بکر کو مطالبہ کا حق حاصل ہے، البتہ بلاوجہ وعدہ خلافی کرنے کا گناہ ہوگا۔

۲۔ اگر زید کے پاس فی الحال ادائیگی کا کوئی انتظام نہیں، تنگدست ہے تو بکر کے لیے مہلت دینا لازم

ہے۔ملاحظہ ہو ہدایہ میں مذکور ہے:

قال: وكل دين حال إذا أجله صاحبه صار مؤجلاً لما ذكرنا إلا القرض فإن تأجيله لايصح لأنه إعارة و صلة في الابتداء حتى يصح بلفظة الإعارة و لا يملكه من لا يملك التبرع كالوصي والصبي و معاوضة في الانتهاء فعلى اعتبار الابتداء لا يلزم التأجيل فيه .

(الهداية : ۳/ ۶۰).

(و كذا في التبيين : ۴/ ۸۴،ط:امداديه ،وفتاوى الشامي: ۵/ ۱۵۸ ،سعيد،ومجمع الانهر :۳/ ۱۱۷ ، ط: بيروت، والبحر الرائق: ۶/ ۱۳۲ ،ط:دار المعرفة).

بہشتی زیور میں مرقوم ہے:

مسئلہ نمبر ۴: کسی سے کچھ روپیہ یا غلہ اس وعدہ پر قرض لیا کہ ایک مہینہ یا پندرہ دن کے بعد ہم ادا کر دیں گے اوراس نے منظور کرلیا تب بھی یہ مدت کا بیان کرنا لغو بلکہ نا جائز ہے، اگر اس کو (قرض دینے والے کو) اس مدت سے پہلے ضرورت پڑے اور تم سے مانگے یا بے ضرورت ہی مانگے تو تم کو ابھی دینا پڑیگا۔(بہشتی زیور، حصہ ۵/ ۴۰۷)۔

احسن الفتاویٰ میں ہے:

قرض خواہ مدتِ متعینہ سے قبل طلب کرسکتا ہے، البتہ بلاضرورت طلب کرنے کی صورت میں وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔(احسن الفتاویٰ: ۷/ ۱۷۷، ط:سعید)۔

لیکن مولانا خالد سیف اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ قرض میں مدت کا اعتبار ہونا چاہیے۔

ملاحظہ فرمائیں، قاموس الفقہ میں ہے:

قرض کی ادائیگی سے متعلق تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ کب قرض کی ادائیگی واجب ہوگی؟ حنفیہ، شوافع، حنابلہ کے نزدیک قرض میں جو مدت متعین کی جائے قرض دہندہ اس کا پابند نہیں ہے، کیونکہ قرض ایک طرح کا تبرع ہے، اگر مدت کا لزوم ہو جائے تو پھر وہ تبرع باقی نہیں رہے گا، مالکیہ کے نزدیک فریقین اس مدت کے پابند ہوں گے اور قرض دہندہ کو مدت مقررہ سے پہلے قرض کے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا، علامہ ابن قیمؒ کا رجحان اسی طرف ہے...واقعہ یہ ہے کہ مالکیہ کا قول اس مسئلہ میں زیادہ قرین صواب نظر آتا ہے اور قرآن وحدیث میں شرطوں اور وعدوں کی تکمیل کے سلسلہ میں جو ارشادات منقول ہیں ان کا تقاضہ یہی ہے، نیز یہ بات بھی ذہن رہنی چاہیے کہ

جن فقہاء نے قرض میں معینہ مدت کی مہلت کو لازم قرار نہیں دیا ان کے یہاں بھی یہ حکم قضا ہے، دیانۃً ایفائے عہد تمام ہی فقہاء کے نزدیک واجب ہے، علامہ ابن تیمیہؒ کا رجحان بھی اس سلسلہ میں وہی ہے جو مالکیہ کا ہے۔ (قاموس الفقہ: ۴/۴۹۲، بعنوان: قرض کی ادائیگی کب واجب ہوگی، ط: زمزم)۔

عطر ہدایہ میں مرقوم ہے:

قرض میں مدت لازم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حاشیہ میں مرقوم ہے:

چوتھے لزوم بھی ممتنع نہیں ہوسکتا اس لیے کہ نفع مقروض ہے اور امام مالکؒ سے مروی ہے کہ قاضی اگر مدت معین کردے تو لازم ہوجائے گی۔ البتہ قرض مجرد لزوم شرط کو نہیں چاہتا کیونکہ تبرع ہے، مگر وعدہ وغیرہ سے لزوم کا مضائقہ نہیں، پس یہ لزوم بجز دقرض ہونے کے نہیں بلکہ وعدہ سے ہے اور فقہاء نے وعدہ کو بوجہ حاجت لازم مان ہی لیا ہے۔ (حاشیہ عطر ہدایہ، ص۲۹۴، ط: زمزم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

میڈیکل ایڈ کے پریمیم پر زائد ادا کر کے فوائد حاصل کرنے کا حکم:

سوال: ڈسکوری میڈیکل ایڈ (Discovery Medical Aid) کے ساتھ جو حضرات منسلک ہیں ان کو ویٹیلیٹی پروگرام (Programme Vitality) کا اختیار دیا جاتا ہے، ان حضرات کو میڈیکل ایڈ کے پریمیم (premium) سے کچھ زائد پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو مختلف فوائد حاصل ہوتے ہیں: مثلا: ہوائی جہاز کا ٹکٹ، جیم کی ممبر شپ، مخصوص سبزیاں، مخصوص کپڑے، مخصوص گھڑیاں وغیرہ پر رعایت ملتی ہے۔

۲۔ کیا بینک کو سالانہ فیس ادا کر کے لویلٹی فوائد (loyalty benefits) حاصل کرنا جائز ہے؟ مثلاً: اِی باکس (ebucks)، اس میں وہ حضرات جن کے پاس ایف، این، بی (FNB) اکاؤنٹ ہو وہ اپنا کریڈٹ کارڈ بینک کے ساتھ رجسٹر کر کے، سالانہ دوسو رینڈ ادا کر کے مختلف فوائد حاصل کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ دونوں معاملوں کا تعلق تبرعِ مشروط کے ساتھ ہے کہ پہلے میں مختلف فوائد کو پریمیم پر کچھ زیادہ ادا کرنے کے ساتھ مشروط کیا ہے، اور دوسرے میں حصولِ فوائد کو بینک کے ساتھ رجسٹر کر کے سالانہ دوسو رینڈ ادا کرنے کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اور چونکہ اس میں پیسہ کا مقابلہ پیسہ سے نہیں اور نہ ہم جنس

سے ہے، نیز جہالت مفضی الی النزاع بھی نہیں ہے،اس وجہ سے جس کا غیر سودی اکاؤنٹ ہوتو اس کے لیے گنجائش ہے۔ہاں اگر بینک کی آمدنی زیادہ تر حرام اور سودی کاروبار سے ہوتو ایسے فوائد حاصل کرنے سے بچنا چاہیے۔فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے: **فإن كان مجهولاً جهالة مفضية إلى المنازعة يمنع صحة العقد وإلا فلا** . (الفتاوى الهندية: ۴/ ۴۱۱).

فتاویٰ دارالعلوم زکریا میں مذکور ہے:

علاج ومعالجہ کی مد میں کمپنی سے خود رقم وصول نہ کریں بلکہ کمپنی خود اس رقم کے عوض علاج ومعالجہ کی ذمہ داری اُٹھالے اور علاج کرادے تو اس صورت میں جو رقم آپ نے جمع کرائی تھی اس کے عوض میں کمپنی نے آپ کو علاج کی سہولت فراہم کردی،اگر چہ اس صورت میں ثمن کا عوض مجہول ہے مگر چونکہ یہ جہالت مفضی الی النزاع نہیں ہے اور لوگ ایسی جہالت سے معاملے کرتے ہیں اس لیے اس کی گنجائش ہوگی۔(۵/ ۴۳۵)۔

تبرعِ مشروط کے دلائل ماقبل میں کئی مرتبہ گزر چکے ہیں،وہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔واللہ ﷻ اعلم۔

ملازمت میں کوٹ، پتلون پہنالازم ہوتو ایسی ملازمت کاحکم:

سوال: ایک آدمی اسکول میں ٹیچر ہے، پڑھانے کی ملازمت کے لیے اس کو امتحان دینا ہے،لیکن شرط یہ ہے کہ کوٹ پتلون اور ٹائی پہننی ہوگی،جبکہ وہ شخص ہمیشہ کرتہ پہنتا ہے،اب شریعت میں ایسی ملازمت کا کیا حکم ہے؟ بینوابالدلیل توجروابالاجرالجزیل۔

الجواب: تلاش بسیار کے باوجود کوئی مناسب ملازمت نہ ملتی ہو اور ایسی ملازمت کا اختیار کرنا کسی خاص مصلحت کی وجہ سے ضروری ہوتو ایسے لباس میں ملازمت کرنے کی گنجائش ہے،البتہ وضع قطع کو ذرا مختلف بنادے،مثلاً شرٹ اتنا لمبا ہو کہ سرین چھپ جائے اور پتلون نما شلوار ٹخنوں سے اوپر ہو اور ٹائی بالکل نہیں پہننی چاہیے۔

لیکن اگر دوسری جگہ ملازمت دستیاب ہوتو پھر صلحاء اور اہل صلاح وتقویٰ کا لباس مستحب اور سنت سے زیادہ قریب ہے۔ملاحظہ ہو تکملہ فتح الملہم میں ہے:

إن الإسلام دين تشمل أحكامه جميع شعب الحياة ، فإنه لم يدع باب اللباس هملاً ، بل وضع له مبادى وأحكاماً لا يجوز لمسلم أن يخالفها ، وقد يزعم الإنسان المعاصر أن

اللباس والزينة من الأمور العادية البسيطة التى تخضع للتقاليد الرائجة في كل عصر ومصر ولا علاقة لها بأحكام الحلال والحرام ، فإنها ليست من الأمور الجذرية التى تقوم على أساسها الحياة ، ولكن هذا الزعم إنما نشأ من قلة التدبر ...

ولكن الإسلام لا يسلك في شأن من شؤون الحياة إلا طريقاً يتفق مع الفطرة السليمة ، ويتجارب مع مقتضيات الطبيعة وربما أن الإنسان جبل على حب التنوع فى أنواع اللباس والطعام ، فإن الإسلام لم يقصره على نوع دون نوع ، ولم يقرر للإنسان نوعاً خاصاً ، أو هيئة خاصة من اللباس، ولا أسلوباً خاصاً للمعيشة وإنما وضع مجموعة من المبادى والقواعد الأساسية يجب على المسلم أن يتحفظ بها في أمر لباسه ، ثم تركه حراً فى اختيار ما يراه من أنواع الملابس، وليس هناك ما يمنع التطور في أنواع اللباس، ما دام الإنسان يتحفظ بهذه المبادى ، ويفي بشروطها الواجبة .

فمن مقدمة هذه المبادئ (ا) أن اللباس يجب أن يكون ساتراً لعورة الإنسان ... و ستر العورة من أعظم مقاصد اللباس ، وأن اللباس الذي يخل بهذا المقصد يهمل ما خلق اللباس لأجله ، فيحرم على الإنسان استعماله...وكذلك اللباس الرقيق أواللاصق بالجسم الذي يحكي للناظر شكل حصة من الجسم الذي يجب ستره ، فهو في حكم ماسبق في الحرمة و عدم الجواز .

(۲) أن اللباس إنما يقصد به الستر و التجمل ... وأما ما يقصد به الخيلاء والكبر أو الأشر و البطر أو الرياء ، فهو حرام .

(۳) أن اللباس الذي يتشبه به الإنسان بأقوام كفرة ، لا يجوز لبسه لمسلم إذا قصد بذلك التشبه بهم .

(۴) أن لبس الحريرحرام للرجال دون النساء ، وكذلك إسبال الإزار إلى الكعبين لايجوز للرجال و يجوز للنساء .

(۵) الثوب المصبوغ بلون مطرب يحصل به الفخر والمراآة، فنهى رسول الله صلى

الله عليه وسلم عن المعصفر والمزعفر .

... ولا اختلاف بين قوله صلى الله عليه وسلم: إن البذاذة من الإيمان...وبين قوله صلى الله عليه وسلم : إن الله يحب أن يرى أثر نعمته على عبده...لأن هناک شيئين مختلفين في الحقيقة ، قد يشتبهان بادى الرأى ، أحدهما مطلوب والآخر مذموم ، فالمطلوب ترک الشح ، ويختلف باختلاف طبقات الناس، فالذي هو في الملوک شح ربما يكون إسرافاً في حق الفقير، وترک عادات البدو واللاحقين بالبهائم واختيار النظافة ومحاسن العادات ، والمذموم الإمعان في التكلف والمرآة والتفاخر بالثياب ، وكسر قلوب الفقراء ، و نحو ذلک و في ألفاظ الحديث إشارات إلى هذه المعاني كما لا يخفى على المتأمل. (تكملة فتح الملهم: ۸۷/۴. ۸۹).

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

انگریزی بال، ہیٹ، کوٹ پتلون میں سے ہر چیز تشبہ کے لیے کافی ہے مگر تشبہ کا حکم اسی صورت میں ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اسے دیکھ کر اس شبہ میں پڑ جائے کہ یہ شخص اس قوم کا فرد ہے، مثلاً ہیٹ لگانے والے کو کرسٹان سمجھا جائے۔تو جو چیزیں کہ غیر لوگوں میں بھی عام طور پر استعمال ہونے لگی ہوں مثلاً بوٹ، پتلون، کوٹ تو ان میں تشبہ کی جہت کمزور اور خفیف رہ جاتی ہے۔(کفایت المفتی :۱۶۴/۹، دار الاشاعت)۔

کوٹ، پتلون سے متعلق حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

اب اس میں اتنا تشدد نہیں، اتنا ضرور ہے کہ ان اطراف میں یہ صلحاء کا لباس نہیں، اس سے بچنا چاہئے، کراہت کا درجہ ہے۔

تعلیق میں مرقوم ہے:

آج کل پینٹ شرٹ (کوٹ پتلون) اور انگریزی بال کا گرچہ مسلمانوں میں عام رواج ہو گیا ہے، مگر اس کے باوجود اسے انگریزی لباس ہی سمجھا جاتا ہے۔الغرض تشبہ بالکفار نہ بھی ہو تشبہ بالفساق میں تو کوئی شبہ نہیں، لہذا ایسے لباس سے احتراز ضروری ہے۔پتلون کے متعلق یہ تفصیل اس وقت ہے جب اس سے واجب الستر اعضاء کی بناوٹ اور حجم نظر نہ آتا ہو، اگر پتلون اتنی چست اور تنگ ہو کہ اس سے اعضاء کی بناوٹ اور حجم نظر آتا ہو،

جیسا کہ آج کل ایسی پتلون کا کثرت سے رواج ہو گیا ہے، تو اس کو پہننا اور لوگوں کو دکھانا اور دیکھنا سب ناجائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ مع التعلیقات: ۱۹/۲۸۰، جامعہ فاروقیہ)۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

جس علاقہ میں یہ کفار وفساق کا شعار ہو، وہاں اس سے پرہیز کیا جائے اور جہاں شعار نہ ہو، سبھی استعمال کرتے ہوں وہاں کا یہ حکم نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۱۹/۲۸۱، جامعہ فاروقیہ)۔

(مزید ملاحظہ ہو: فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۷/۱۲۰۔۱۲۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مباحات میں عقدِ اجارہ منعقد ہونے کا حکم:

سوال: بعض لوگ مچھلیاں پکڑنے جاتے ہیں اور مدد کی غرض سے کچھ بچوں کو ساتھ لے جاتے ہیں جن کے ذمہ مچھلی کا کانٹا تیار کرنا، چارہ لگانا، دانہ ڈالنا، وغیرہ ہوتا ہے، بعض مرتبہ یہ اجرت پر رکھے ہوئے بچے مستاجر کی اشیاء استعمال کر کے مچھلی پکڑتے ہیں اور مستاجر کو دیتے ہیں، تو ان مچھلیوں کا مالک کون ہوگا مستاجر یا وہ بچے جنہوں نے مچھلیاں پکڑی ہیں؟ کیونکہ مچھلی پکڑنا مباح ہے اور مباحات میں اجارہ جائز نہیں ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر ان بچوں کو بطورِ مزدور رکھا اور ان کے لیے روزانہ یا ماہانہ کے حساب سے تنخواہ مقرر کردی اور ان کے کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ مچھلی پکڑ کر مالک کو دیں گے تو یہ وقت کا اجارہ ہے، لہٰذا مچھلی مستاجر کی ہوگی۔ ملاحظہ ہو شرح مجلّہ میں مرقوم ہے:

يسوغ الاحتطاب من أشجار الجبال المباحة كائناً من كان ويملك الحطب بمجرد الاحتطاب أي بجمعه ، والربط ليس بشرط ، المحتطب يملك الحطب بنفس الاحتطاب ولايحتاج إلى أن يشده ويجمعه حتى يثبت له الملك . (شرح المجلة : ۴/۱۸۸، المادة : ۱۲۵۳).

فقہاء کے یہاں لکڑیاں چننے، مچھلیاں پکڑنے اور پانی بھرنے اور دیگر مباحات میں شرکت صحیح نہیں ہے، لیکن اگر وہ کام ایسا ہو جس میں مہارت ضروری ہو تو یہ شرکتِ صنائع کے قبیل سے ہو کر جائز ہوگی۔

قال في الدرالمختار : فصل في الشركة الفاسدة لا تصح شركة في احتطاب واحتشاش واصطياد واستقاء وسائر مباحات ، كاجتناء ثمار من جبال وطلب معدن من كنز

وطبخ آجر من طين مباح لتضمنها الوكالة والتوكيل في أخذ المباح لا يصح ، وما حصله أحدهما فله وما حصلاه معاً فلهما ، نصفين إن لم يعلم ما لكل، قوله من طين مباح ، فإن كان الطين أوالنورة أوسهلة الزجاج مملوكاً فاشتركا على أن يشتريا ذلک ويطبخاه ويبيعاه جاز وهو كشركة الوجوه . (الدرالمختار: ۳۲۵/۴،سعيد). (وكذا فى الفتاوى الهندية: ۳۳۲/۲).

عطر ہدایہ میں مرقوم ہے: ہر مباح چیز قبضہ سے ملک میں داخل ہوسکتی ہے ۔۔۔لہٰذا جواہر،لکڑی،پھل، پھول، گھاس، پانی، جانور،مچھلیاں، کنکر، پتھر، اور جملہ معدنیات قبضہ کے بعد مملوک ہوجاتی ہے اور کسی کے قبضہ میں آنے سے پہلے ہر شخص کا حق حاصل ہے کہ اس پر قبضہ کرلے۔(عطر ہدایہ ص ۳۱۳)۔

ہاں اگر مستاجر کسی آدمی کو مباح چیزیں جمع کرنے کے لیے اجرت پر رکھے اور وقت کی تعیین کردے تو یہ اجارہ جائز ہے اور لکڑیاں مستاجر کی ہوگی اور اجیر کو اجرت ملے گی۔ملاحظہ ہو شرحِ مجلّہ میں مذکور ہے:

إذا استاجر شخص أجيراً لأجل جمع الأحطاب المتكسرة أو إمساک الصيد فما جمعه من الحطب أو أمسكه من الصيد فهو للمستاجر ، لأن الأجير عامل لمستاجره .

(شرح المجلة : ۱۸۸/۴ ، لمحمد خالد الاتاسى).

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے:

اگر آپ مزدور سے اس طرح معاملہ کریں کہ مثلاً ایک دن میں آٹھ گھنٹے تم سے یہ کام لینا ہے، اور آٹھ گھنٹے کی مزدوری مثلاً چار روپے دوں گا، اور مزدور اس کو منظور کرلے تو شرعاً یہ معاملہ درست ہے، اور وہ لکڑی آپ کی ملک ہوگی۔(فتاویٰ محمودیہ: ۱۱۹/۲۵، جامعہ فاروقیہ)۔

جدید فقہی مسائل میں مرقوم ہے:

اگر ان کو ماہانہ یا سالانہ ملازم رکھے اور اجرت وقت کی ادا کرے چاہے مچھلی ملے یا نہ ملے تو یہ جائز ہے، اجرت حلال ہوگی اور مچھلی جو ملی وہ سب مالک کی ہوگی ، اور اگر وقت مقرر نہ کرے بلکہ مزدوروں کو جال حوالہ کرکے شکار کے لیے بھیجے اور مچھلی کی کچھ مقدار اجرت ٹھہرائے جیسے فی زماننا مروج ہے تو یہ صورت ناجائز ہے، یہ اجارہ باطل ہوگا، مچھلی شکار کرنے والے کی ملک ہوگی، جال والے کو جال کی اجرتِ مثل ملے گی۔ (جدید فقہی مسائل ۲۲۶/۱)۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بلیک فرائیڈے (Black Friday) کے دن تجارت میں حصہ لینے کا حکم:

سوال: میں نے بعض لوگوں سے سنا ہے کہ بلیک فرائیڈے میں مسلمان تجارت میں حصہ نہیں لیتے، میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا مسلمان اِس دن تجارت میں حصہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب: بلیک فرائیڈے امریکہ میں یومِ شکریہ (نومبر کی آخری جمعرات) کے بعد جمعہ کو منایا جاتا ہے جو ایک غیر رسمی نام ہے (یعنی جس کا رسم ورواج یا عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں)، اور یہ دن ۱۹۵۲ء کے بعد سے امریکہ میں کرسمس کی خریداری کے موسم کا آغاز سمجھا جاتا ہے، جبکہ یہ اصطلاح زیادہ پرانی نہیں ہے، اِس دن تجارت کے مراکز میں عام طور پر قیمتوں میں ترخیص اور کمی کی جاتی ہے، اور یہ دن خریداری کا مصروف ترین دن سمجھا جاتا ہے۔ بلیک کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس دن تاجروں کو خوب منافع حاصل ہوتے ہیں، اور تاجروں کی اصطلاح میں بلیک منافع کی علامت ہے اور سرخ نقصان اور خسارے کی نشانی ہے۔ (ملخص از ویکی پیڈیا)۔

مسلمان بلیک (Black) کے لفظ سے یہ نیت کرے کہ چونکہ رات کے اندھیرے سے یہ تجارت شروع ہو جاتی ہے اور لوگوں کو جلدی جانا پڑتا ہے اس لیے اس کا نام بلیک فرائیڈے ہے۔

اِس دن تجارت میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے جائز اور درست ہے اس میں کوئی خرابی نہیں، اور نہ کوئی غلط عقیدہ یا کوئی مذہبی شعار اس سے منسلک ہے۔ اس دن تاجروں کا قیمت میں رعایت دینا بھی درست ہے۔

ملاحظہ ہو صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

ویجوز للمشتری أن یزید للبائع فی الثمن و یجوز للبائع أن یزید للمشتری فی المبیع ویجوز أن یحط عن الثمن . (الهداية : ۵۹/۳).

قال فی العناية : قال ویجوز للمشتری أن یزید البائع فی الثمن، إذا اشتری عیناً بمائة ثم زاد عشرة مثلاً أو باع عیناً بمائة ثم زاد علی المبیع شیئاً أو حط بعض الثمن جاز. (العناية : ۵۱۹/۶).

فتاویٰ شامی میں منقول ہے:

ثم ذکر حط الثمن وهبته وإبراءه ، وحاصل ما ذکره فی البحر عن الذخیرة : أنه لو وهبه بعض الثمن أو أبرأه عنه قبل القبض فهو حط ، وإن حط البعض أو وهبه بعد القبض

صح ، ووجب عليه للمشتري مثل ذلك . (فتاوى الشامي: ۵/۱۵٦،سعيد).

اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے، مذکور ہے:

آج کل عموماً بڑے مارکیٹ میں تجارت کے فروغ وعروج کے لیے ''ڈسکاؤنٹ'' کا طریقہ رائج ہے، مثلاً دکان میں ہر سامان پر کچھ ڈسکاؤنٹ ہوتا ہے، یعنی اگر کسی سامان کی قیمت ایک ہزار ہے، تو اس پر پچیس فیصد ڈسکاؤنٹ، یعنی وہ سامان اب گاہک کو صرف سات سو پچھتر میں دیا جائے گا، خرید وفروخت کی یہ مروجہ صورت شرعاً درست ہے۔ (اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: ۸/ ۲۲۷)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

مدرس کو اجرت کے ساتھ اجر وثواب کی امید رکھنے کا حکم:

سوال: اگر معلم اجرت لیتا ہے اور اوقات کی پابندی کرتا ہے بلکہ زیادہ وقت دیتا ہے اور خوب دل و جان سے محنت سے کام کرتا ہے تو کیا اجرت کے ساتھ اس کو اجر وثواب ملے گا یا نہیں؟ کیا تنخواہ لینا ثواب کے منافی تو نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ متاخرین احناف نے ضرورت کی وجہ سے تدریس پر اجرت اور تنخواہ لینے کو جائز قرار دیا ہے لہٰذا اگر مدرس ضروریاتِ زندگی کے گزر بسر کے لیے تنخواہ لے اور اجر وثواب اور خدمتِ دین کی نیت کرے، اور پوری امانت داری کے ساتھ کام کرے، ایسا نہ ہو کہ جہاں تنخواہ زیادہ ملے وہاں دوڑ کر چلا جائے تو اس میں ثواب کی امید ہے۔ مسلمانوں کے بچوں کو دیندار بنانا اور دین اور شریعت کا علم دینا، حلال وحرام کی تمیز بتانا، یہ دین ہی ہے۔ احادیث سے چند دلائل اور شواہد ملاحظہ فرمائیں:

١۔ إن عائشةؓ قالت: لما استخلف أبوبكر الصديقؓ قال: لقد علم قومي أن حرفتي لم تكن تعجز عن مؤونة أهلي وشغلت بأمر المسلمين فسيأكل آل أبي بكر من هذا المال ويحترف للمسلمين فيه . (رواه البخاري: ۲/۲۹۷).

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے فرمایا کہ میری قوم جانتی ہے کہ میرا پیشہ میرے اہل وعیال کے لیے ناکافی نہ تھا اور اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول ہو گیا ہوں تو آل ابی بکر اس مال سے کھائیں گے اور ابوبکر مسلمانوں کے کام کی نگہبانی کرے گا۔

۲۔مسند احمد میں روایت ہے: **عن عبد اللّٰہ بن زید الأزرق قال: كان عقبة بن عامر الجهني ﷜ يخرج فيرمي كل يوم وكان يستتبعه فكأنه كاد أن يمل فقال: ألا أخبرك بما سمعت من رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم قال: بلى قال: سمعته يقول إن اللّٰه عزوجل يدخل بالسهم الواحد ثلاثة نفر الجنة ؛ صاحبه الذي يحتسب في صنعته الخير والذي يجهز به في سبيل اللّٰه والذي يرمي به في سبيل اللّٰه وقال: ارموا واركبوا وأن ترموا خير من أن تركبوا وقال: كل شيء يلهو به ابن آدم فهو باطل إلا ثلاثاً رمية عن قوسه وتأديبه فرسه وملاعبته أهله فإنهن من الحق .** (مسند احمد ،رقم: ۱۷۳۳۷).

اس روایت سے معلوم ہوا کہ تیر بنانے والا حسن نیت کی وجہ سے جنت کا مستحق ہوگا اگر چہ عموماً تیر بیچنے کے لیے بناتے ہیں۔

۳۔ترمذی شریف میں ہے: **عن أبي سعيد ﷜ عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء ،قال أبوعيسىٰ : هذا حديث حسن .** (رواه الترمذی: ۱/ ۱۳۵).

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جس تاجر کے پیش نظر سچائی ،امانت داری اور مخلوق کی خدمت ہو تو اس کو اجر و ثواب ملتا ہے،تو معلّم جو دین کا علم سکھاتا ہو اور دنیا کو مقصد نہ بناتا ہو تو اس کو بھی ثواب ملتا ہے۔

۴۔مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے: **قال عمر ﷜: إني أنزلت نفسي من مال اللّٰه منزلة مال اليتيم ، إن استغنيت عنه استعففت ، وإن افتقرت أكلت بالمعروف .** (مصنف ابن ابی شیبة : ۱۷/ ۳۲۴).

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: میں اللہ تعالیٰ کے مال پر مثل یتیم کے مال کے نگہبان ہوں جب مجھے ضرورت نہیں ہوتی تو لینے سے بچتا ہوں اور محتاج ہوتا ہوں تو دستور کے موافق لیتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ بہ وقتِ ضرورت وظیفہ لینے سے ثواب میں کمی نہیں آتی۔

۵۔تاریخ بغداد میں ہے: **عن الحسنؒ أن عمر بن الخطاب ﷜ وعثمان بن عفان ﷜ كانا يرزقان المؤذنين والأئمة والمعلمين والقضاة .** (تاریخ بغداد: ۲/ ۱۸۱،ط: دارالکتب العملية).

حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما مؤذن، ائمہ اور معلمین کو تنخواہ دیتے تھے، معلوم ہوا کہ ان کا تنخواہ لینا ثواب کے منافی نہیں تھا۔

۶۔ بخاری شریف میں روایت ہے: **عن أبي موسى ﷺ قال: جاء رجل إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فقال: الرجل يقاتل للمغنم، والرجل يقاتل للذكر، والرجل يقاتل ليرى مكانه فمن في سبيل الله، قال: من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله.** (رواه البخاري: ۴/۲۰).

قال ابن ابی حمزة: ذهب المحققون إلى أنه إذا كان الباعث الأول قصد إعلاء كلمة الله لم يضره ما انضاف إليه، ويدل على أن دخول غير الإعلاء ضمناً لا يقدح فى الإعلاء إذا كان الإعلاء هو الباعث الأصلي ما رواه أبوداود بإسناد حسن عن عبد الله بن حوالة قال: بعثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على أقدامنا لنغنم فرجعنا ولم نغنم شيئاً، فقال: اللّهم لا تكلهم إلي. (فتح الباري: ۶/۲۸).

اس روایت اور اس کی تشریح سے معلوم ہوا کہ جہاد میں اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی نیت ہو تب بھی ثواب ملے گا جبکہ فقط دنیا کمانا مقصودِ اصلی نہ ہو۔

علامہ شامیؒ شفاء العلیل وبل الغلیل میں رقمطراز ہیں:

فإن عمل الآخرة نوعان: الأول: ما يكون قربة مقصودة بالذات كالصلاة والصوم والتلاوة والتسبيح والحج ونحوها فلا يجوز أخذ الأجرة عليه لأنه ما شرع إلا بوصف العبادة والخلوص لله تعالىٰ وإرادة الدنيا به قلب الموضوع والثاني: ما يكون وسيلة وآلة للنوع الأول كالتعليم والإمامة ونحوها ولا خلاف أنه إذا وجد النية فيه لله تعالىٰ يكون قربة يثاب عليها وإلا لا ولكن يبقى كونه وسيلة وآلة. (مجموعة رسائل ابن عابدين: ۱/۱۷۸).

فتاوی الشامی میں مذکور ہے:

أقول: لا يلزم من حل الأجرة المعلل بالضرورة حصول الثواب ولا سيما إذا كان لولا الأجرة لا يؤذن فإنه يكون عمله للدنيا وهو رياء لأنه لم يحتسب عمله لوجه الله تعالىٰ

فهو كمهاجر أم قيس وإذا كان الجاهل المحتسب لا ينال ذلک الأجر فهذا بالأولى كيف وقد ورد في عدة أحاديث التقييد بالمحتسب منها ما رواه الطبراني في الكبير كما في الفتح ثلاثة على كثبان المسک يوم القيمة لا يهولهم الفزع الأكبر ولايفزعون حين يفزع الناس رجل علم القرآن فقام به يطلب وجه الله وما عنده ومملوک لم يمنعه رق الدنيا عن طاعة ربه نعم قد يقال إن كان قصده وجه الله تعالىٰ لكنه بمراعاته للأوقات والاشتغال به يقل اكتسابه عما يكفيه لنفسه وعياله فيأخذ الأجرة لئلا يمنعه الاكتساب عن إقامة هذه الوظيفة الشريفة ولولا ذلک لم يأخذ أجراً فله الثواب المذكور بل يكون جمع بين عبادتين وهما الأذان والسعي على العيال وإنما الأعمال بالنيات . (فتاوى الشامي: ۱/ ۳۹۲، سعيد).

امدادالاحکام میں مذکور ہے:

اگر یہ نیت رہے کہ اگر مجھ کو اس سے زیادہ کہیں روپیہ ملا تو میں اس کو چھوڑ کر اس کو اختیار کرلوں گا تب تو ثواب نہ ملے گا اور اس کو اجرتِ محضہ کہا، یہ نیت رہے کہ زیادہ کے لیے بھی اس کو نہ چھوڑوں گا تو ثواب ضائع نہ ہوگا اور اس کو اجرت نہ کہا جائے گا بلکہ نفقہ حبس وکفایت مثل رزق قاضی کہا جائیگا۔ (امدادالاحکام: ۳/۳۴۰)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

کمپنی کے لیے سوفٹ ویئر اور ویب سائٹ بنانے کا حکم:

سوال: ایک آئی، ٹی، آئی کی کمپنی ہے جو مختلف کمپنیوں کے لیے سوفٹ ویئر اور ویب سائٹ بناتی ہے، ابھی ایک ایسی کمپنی کا آڈر ملا ہے جو ٹی وی بناتی ہے تو کیا اس کمپنی کے لیے ٹی وی والی کمپنی کا سوفٹ ویئر اور ویب سائٹ بنانا جائز ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح بیوٹی پالر، فوٹو شاپ اور نائی کے لیے سوفٹ ویئر اور ویب سائٹ بنانے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: جائز اور حلال کاروبار والی کمپنیوں کا سوفٹ ویئر اور ویب سائٹ بنانا جائز اور درست ہے اور اس کی آمدنی بھی حلال ہے، ہاں جو کمپنیاں حرام کاروبار یا معصیت کے کاموں میں سرگرم ہیں، ان کے ویب سائٹ اور سوفٹ ویئر بنانے سے بچنا چاہیے اس میں گناہ کے کام میں ایک قسم کا تعاون پایا جاتا ہے، تاہم اگر کسی

نے بنایا تو آمدنی حرام نہ ہوگی بلکہ مکروہ ہوگی۔

اسی طرح بیوٹی پالر اور نائی کا غالب کاروبار حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مکروہ ہوگا لیکن بیوٹی پالر میں قباحتیں زیادہ ہیں لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔ نیز فوٹو شاپ میں عام طور پر جاندار کی تصویریں بنا کر ان کو خوبصورت کیا جاتا ہے، ایسے کاروبار والوں کے لیے سوفٹ ویئر بنانا مکروہ ہے، اس سے بھی بچنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو فتاوی شامی میں مذکور ہے:

قوله معزياً للنهر قال فيه من باب البغاة وعلم من هذا أنه لا يكره بيع ما لم تقم المعصية به كبيع الجارية المغنية والكبش النطوح والحمامة الطيارة والعصير والخشب الذى يتخذ منه المعازف، وما فى بيوع الخانية من أنه يكره بيع الأمرد من فاسق يعلم أنه يعصى به مشكل . (فتاوى الشامى : ۶/ ۳۹۱، سعيد).

جواہر الفقہ میں مذکور ہے:

ثم السبب إن لم يكن محركاً وداعياً ، بل موصلاً محضاً ، وهو مع ذلك سبب قريب بحيث لا يحتاج في إقامة المعصية به إلى إحداث صنعة من الفاعل، كبيع السلاح من أهل الفتنة و بيع العصير ممن يتخذه خمراً ...فكله مكروه تحريماً بشرط أن يعلم به البائع والآجر من دون تصريح به باللسان ، فإنه إن لم يعلم كان معذوراً . (جواهر الفقه : ۲/ ۴۵۲).

فتاویٰ محمودیہ کی تعلیق میں لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے بارے میں یقینی پتہ چل جائے کہ وہ اس کو گناہ ہی میں استعمال کرے گا تو ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا مکروہ ہے۔ (تعلیقاتِ فتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۱۲۹، جامعہ فاروقیہ)۔

آپ کے مسائل اور ان کا حل میں ہے:

خواتین کو آرائش اور زیبائش کی تو اجازت ہے، بشرطیکہ حدود کے اندر ہو، لیکن موجودہ دور میں بیوٹی پالرز کا جو پیشہ کیا جاتا ہے، اس میں چند در چند قباحتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے یہ پیشہ حرام ہے اور وہ قباحتیں مختصراً یہ ہیں:

۱۔ بعض جگہ مرد اس کا کام کرتے ہیں اور یہ خالصتاً بے حیائی ہے۔

۲۔ ایسی خواتین بازاروں میں حسن کی نمائش کرتی پھرتی ہیں، یہ بھی بے حیائی ہے۔

۳۔ بیوٹی پالرز سے آنے کے بعد مرد و عورت اور لڑکے اور لڑکی میں امتیاز مشکل ہوتا ہے، حالانکہ مرد کا

عورتوں اور عورت کا مردوں کی مشابہت کرنا موجب لعنت ہے۔ (آپ کے مسائل اوران کا حل: ۸/ ۳۲۵)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۷/۳۷۳)۔

قال في البحر الرائق: وظاهر كلام النووي في شرح مسلم الإجماع على تحريم تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر لأنه متوعد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور في الأحاديث يعني مثل ما في الصحيحين عنه صلى الله عليه وسلم، أشد الناس عذاباً يوم القيمة المصورون يقال لهم أحيوا ما خلقتم. (البحر الرائق: ۲/ ۲۹، دارالكتاب الإسلامي). مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا، جلدِ ہفتم)۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

آن لائن تجارت میں بذریعہ بینک قیمت وصول کرنے میں تاخیر کا حکم:

سوال: ایک آدمی آن لائن جوتوں کی تجارت کرتا ہے اور قیمت بینک کے ذریعہ وصول کی جاتی ہے، مشتری بائع کے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کرتا ہے، پھر اگر بائع فوراً رقم بینک سے نکلوالے تو سروس چارج لگتا ہے لیکن اگر ۲۸ دن کے بعد نکلوائے تو کوئی چارج نہیں تو کیا تاخیر سے نکلوانے کی گنجائش ہے جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ ان پیسوں سے بینک سودی کاروبار چلائے گا۔ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بینک ایک خدمت مہیا کرتا ہے اور اس کے عوض فیس وصول کرتا ہے تو خدمت کے عوض فیس وصول کرنا جائز اور درست ہے، اب بینک نے یہ شرط لگائی کہ اگر آپ ۲۸ دن کے بعد رقم اٹھائیں گے تو فیس معاف ہے، یہ تبرعِ مشروط ہے جو کہ جائز اور درست ہے، اور رہی یہ بات کہ بینک اس درمیان میں سودی کاروبار کریگا تو پہلی بات یہ ہے کہ رقم متعین نہیں ہے دیگر رقوم کے ساتھ مخلوط ہوگئی تو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ آپ ہی کی رقم سے سودی کاروبار کیا، دوسری بات یہ ہے کہ رقم چھوڑنا سببِ بعید ہے اور اصل سودی کاروبار میں بینک مباشر اور داعی ہے لہٰذا آپ کے لیے زیادہ حرج نہیں۔ ملاحظہ ہو جواہر الفقہ میں مرقوم ہے:

ثم السبب إن لم يكن محركاً وداعياً، بل موصلاً محضاً، وهو مع ذلك سبب قريب بحيث لا يحتاج في إقامة المعصية به إلى إحداث صنعة من الفاعل، كبيع السلاح من أهل الفتنة و بيع العصير ممن يتخذه خمراً...فكله مكروه تحريماً بشرط أن يعلم به البائع والآجر من دون تصريح به باللسان، فإنه إن لم يعلم كان معذوراً. (جواهر الفقه: ۲/ ۴۵۲).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۴۲۲/۵)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایمیزون پرائم تجارت کا حکم:

سوال: ایمیزون (Amazon) ایک آن لائن دکان ہے جس میں انٹرنیٹ کے ذریعہ تجارت ہوتی ہے، یہ بڑے مارکیٹ کی طرح ہے اور ہر قسم کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں، اس میں ایک اسکیم ہے کہ اگر گاہک ماہانہ ۹۹ ڈالر ادا کرے گا تو اس کو درج ذیل مراعات اور سہولیات دی جائیں گی:

۱۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی دلیوری فری ہوگی۔

۲۔ بڑی اشیاء کی دیلوری میں کافی رعایت دی جائے گی۔

۳۔ اشیائے خوردنی میں دیلوری بہت مختصر وقت میں ہوگی۔

۴۔ بعض چیزیں انہیں گاہکوں کے لیے مخصوص ہوں گی۔

۵۔ جب کسی چیز پر رعایتی قیمت ہوگی تو یہ گاہک مقدم ہوں گے۔

۶۔ ایمیزون کتب خانہ سے ماہانہ ایک کتاب مفت میں پڑھنے کی اجازت ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کو ایمزون پرائم (Amazon Prime) کہتے ہیں، کیا ایسا معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اِس عقد کا خلاصہ یہ ہے کہ ماہانہ ۹۹ ڈالر کے بدلہ میں مذکورہ بالا مراعات اور سہولیات دی جائیں گی، یعنی مراعات اور سہولیات کے احسان کو ۹۹ ڈالر کے ساتھ مشروط کیا ہے، اس کو تبرعِ مشروط کہتے ہیں، اس کا جواز احادیث، فقہاء کرام اور اکابر کی عبارات میں مصرح ہے۔ بنابریں مذکورہ بالا معاملہ جائز اور درست ہے۔ دلائل کی تفصیل کے لیے فتاویٰ دارالعلوم زکریا، جلدِ پنجم کا مطالعہ مفید ہے۔ واللہ ﷻ اعلم۔

حق شفعہ سے دستبرداری کے عوض مال حاصل کرنے کا حکم:

سوال: زید نے خالد سے زمین خریدی زمین کے پڑوس میں عبداللہ ہے اس نے کہا میں شفعہ کا حقدار ہوں، اگر آپ مجھے دولاکھ روپے دیدیں تو میں شفعہ چھوڑ دوں گا ورنہ شفعہ کا دعویٰ کردوں گا، کیا زید عبداللہ کو ترکِ شفعہ کی وجہ سے دولاکھ دے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہو تو کیا اس کے جواز کی کوئی تدبیر ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ حق شفعہ کے عوض مال حاصل کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا زید کا عبداللہ کو دولاکھ

روپے دینا صحیح نہیں ہے، اگر دیدے تب بھی واجب الرد ہے، اورحق شفعہ بھی باطل ہوجائے گا، ہاں جواز کی یہ تدبیر ہوسکتی ہے کہ شفیع مشتری سے کہدے کہ آپ مجھے مکان مشفوع کا آدھا حصہ یا مخصوص کمرہ یا مخصوص جگہ جس کی قیمت دولاکھ ہے ڈیڑھ لاکھ میں دیدے اور مشتری اس پر راضی ہوجائے اور شفیع شفعہ چھوڑ دے تو اس طرح شفیع کو ۵۰ ہزار کا فائدہ حاصل ہوگا اور شفیع شفعہ کا حق رکھتے ہوئے شفعہ چھوڑ دے گا۔

ملاحظہ ہو ہدایہ میں مرقوم ہے:

وإن صالح من شفعته على عوض بطلت شفعته ورد العوض لأن حق الشفعة ليس بحق متقرر في المحل بل هو مجرد حق التملک فلايصح الاعتياض عنه. (الهداية: ۴/ ۴۰۶، ط: شركة علمية).

وقال في البحر الرائق: وبالصلح عن شفعته على عوض وعليه رده، يعني تبطل الشفعة إذا صالح المشترى الشفيع على عوض وعلى الشفيع رد العوض. (تكملة البحر الرائق: ۱۶۸/۸). (وكذا في الفتاوى الهندية: ۱۸۴/۵).

عنایہ شرح ہدایہ میں لکھا ہے:

إن الصلح إذا كان على بعض الدار صح ولم تبطل الشفعة، لأن ذلک على وجهين: أحدهما أن يصالحه على أخذ نصف الدار بنصف الثمن وفيه الصلح جائز لفقد الإعراض، والثاني أن يصالحه على أخذ بيت بعينه من الدار بحصته من الثمن والصلح فيه لا يجوز لأن حصته مجهولة وله الشفعة لفقد الإعراض. (العناية شرح الهداية: ۴۱۴/۹، ط: دار الفكر). **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

انٹرنیٹ پرخرید وفروخت کے وقت ایجاب وقبول کی صورت:

سوال: ایک آدمی جنوبی افریقہ میں بیٹھا ہے اور چین میں ایک تاجر سے انٹرنیٹ پر ایجاب وقبول کرتا ہے، کیا اس ایجاب وقبول سے بیع منعقد ہوجائے گی یا نہیں؟ بیع کے ایجاب وقبول کے لیے مجلس کا ایک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اور اگر اس طرح نکاح کا معاملہ ہو تو کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ بذریعہ انٹرنیٹ خرید وفروخت بیع بالکتابت کے حکم میں ہوگی، بایں طور کہ جنوبی افریقہ میں انٹرنیٹ پر ایجاب کرتا ہے اور چین میں بیٹھا شخص انٹرنیٹ پر تحریر دیکھ کر قبول کرتا ہے تو جب تحریر

پہنچی اور انٹرنیٹ کھول کر دیکھی اس وقت قبول کرلیا تو بیع منعقد ہوگئی جیسے فقہاء نے لکھا ہے کہ بیع بالکتابت میں تحریر پہنچنے کی مجلس کا اعتبار ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فتاویٰ شامی میں رقمطراز ہیں:

ولا يتوقف شطر العقد فيه أى البيع على قبول غائب فلو قال بعت فلاناً الغائب فبلغه فقبل لم ينعقد اتفاقاً ، إلا إذا كان بكتابة أو رسالة فيعتبر مجلس بلوغها. قال في رد المحتار: قوله إلا إذا كان بكتابة أو رسالة ، صورة الكتابة أن يكتب أما بعد فقد بعت عبدي فلاناً منک بكذا فلما بلغه الكتاب قال في مجلسه ذلک اشتريت تم البيع بينهما ، وصورة الإرسال أن يرسل رسولاً فيقول البائع بعت هذا من فلان الغائب بألف درهم فاذهب يا فلان وقل له فذهب الرسول فأخبره بما قال، فقبل المشترى في مجلسه ذلک...قلت: ويكون بالكتابة من الجانبين فإذا كتب اشتريت عبدک فلاناً بكذا فكتب إليه البائع قد بعت فهذا بيع كما فى التتارخانية .

قوله فيعتبر مجلس بلوغها أى بلوغ الرسالة أو الكتابة قال فى الهداية : والكتابة كالخطاب وكذا الإرسال حتى اعتبر مجلس بلوغ الكتابة وأداء الرسالة ...(فتاوى الشامى : ۵۱۲/۴،سعيد).

نئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے میں مذکور ہے:

انٹرنیٹ پر بھی اگر بیک وقت عاقدین موجود ہوں اور ایجاب کے بعد فوراً دوسرے کی طرف سے قبول ظاہر ہو جائے تو بیع منعقد ہو جائیگی اور ان صورتوں میں عاقدین کو متحد المجلس تصور کیا جائیگا۔

اگر انٹرنیٹ پر ایک شخص نے بیع کی پیشکش کی اور دوسرا شخص اس وقت انٹرنیٹ پر موجود نہیں تھا، بعد کو اس نے اس پیشکش کرنے والے کا پیغام حاصل کیا، یہ صورت تحریر وکتابت کے ذریعہ بیع کی ہوگی، اور جس وقت دوسرا شخص اس پیشکش کو پڑھے اسی وقت اس کی جانب سے قبولیت کا اظہار ضروری ہے۔

لیکن جہاں تک نکاح کی بات ہے تو عقدِ نکاح منعقد ہونے کے لیے ایجاب وقبول کی مجلس کا ایک ہونا ضروری ہے اور انٹرنیٹ پر چونکہ مجلس بدل گئی لہٰذا نکاح منعقد نہیں ہوگا، ہاں صحیح صورت یہ ہے لڑکی انٹرنیٹ پر کسی کو وکیل بنادے پھر وکیل مجلس نکاح میں موکل کی طرف سے ایجاب وقبول کرلے۔

ملاحظہ ہو بدائع الصنائع میں مرقوم ہے:

وأما الذي يرجع إلى مكان العقد فهو اتحاد المجلس إذا كان العاقدان حاضرين وهو أن يكون الإيجاب والقبول في مجلس واحد حتى لو اختلف المجلس لا ينعقد النكاح .

(بدائع الصنائع : ۵/ ۳۲۶،سعید).

(وكذا في الفتاوى الهندية: ۲/ ۲۳۱،وخلاصة الفتاوىٰ : ۲/۵ ۱ ،والبحر الرائق: ۲/ ۳۵۱).

کتاب الفتاویٰ میں مذکور ہے:

نکاح میں ضروری ہے کہ ایجاب وقبول ایک ہی مجلس میں ہو،سوال میں جن صورتوں کا ذکر ہے اس میں ظاہر ہے کہ بات کرنے یا تحریری طور پر اپنی بات کو پیش کرنے والے کی مجلس الگ ہوتی ہے اور مخاطب کی مجلس الگ ،اس لیے ان ذرائع ابلاغ کے ذریعہ نکاح کا ایجاب وقبول درست نہیں ،البتہ کسی شخص کو ایجاب وقبول کا وکیل بنایا جاسکتا ہے اور وہ اپنے موکل کا نکاح کرسکتا ہے۔(کتاب الفتاویٰ:۴/ ۳۰۶)۔واللہ ﷻ اعلم۔

بذریعہ بینک سونے کی تجارت کا حکم:

سوال: ہم بذریعہ بینک سونے کی تجارت کرتے ہیں؛اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب سونے کی قیمت کم ہوتی ہے تو ہم بینک کے واسطہ سے سونا خریدتے ہیں ،اور جب قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو بیچ دیتے ہیں ،لیکن خریدنے کے بعد نہ ہم سونے سے کوئی انتفاع حاصل کرسکتے ہیں اور نہ ہم اس کو بینک سے نکلوا سکتے ہیں ،بس فقط آگے اس کو بیچ سکتے ہیں ،خریدنے کے بعد ہمارے اکاؤنٹ میں فقط اتنا دکھایا جاتا ہے کہ آپ اتنی مقدار سونے کے مالک ہے، باقی ہمارے خیال میں سونا بینک کے پاس بھی نہیں ہوتا، کیا ہمارے لیے ایسا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایسا معاملہ جائز اور درست نہیں ہے ،وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ معاملہ بیع قبل القبض میں شامل ہے جو حدیث شریف سے ممنوع ہے، کیونکہ جب آپ بینک سے سونا خریدتے ہیں تو بینک کے پاس سونا نہیں ہوتا فقط اتنی مقدار کو آپ کے اکاؤنٹ میں ظاہر کیا جاتا ہے پھر آپ اس کو آگے بیچتے ہیں جبکہ حقیقت میں سونا آپ کے اکاؤنٹ میں منتقل نہیں ہوا لہٰذا ایسا عقد جائز نہیں ہے۔ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن حكيم بن حزام ﷛ قال: يا رسول الله يأتيني الرجل فيريد مني البيع ليس عندي

أفأبتاعه له من السوق؟ فقال: لا تبع ما ليس عندك. (سنن ابی داود: والترمذی، رقم: ۱۲۳۲، وابن ماجه، رقم: ۲۱۸۷).

دوسری حدیث شریف میں ہے:

عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، قال: من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یستوفیه. (صحیح مسلم: ۵/۲، باب بطلان بیع المبیع قبل القبض، وصحیح البخاری، رقم: ۲۱۳۶).

قال فی الهدایة: ومن اشتری شیئاً مما ینقل ویحول لم یجز له بیعه حتی یقبضه، لأنه نهی عن بیع مالم یقبض ولأن فیه غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاک. (الهدایة: ۳/۷۴).

جدید فقہی مباحث میں مرقوم ہے:

بیع قبل القبض کی ممانعت متعدد احادیث میں وارد ہوئی ہے، ائمہ مجتہدین نے ان احادیث کو معلول بہ علت قرار دیا ہے، اگر علت پائی جائے گی تو ممانعت کا حکم باقی رہے گا ورنہ نہیں، ائمہ مجتہدین کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل القبض بیع کی ممانعت کی تین علتیں ہیں: ۱۔غرر، ۲۔ربح مالم یضمن، ۳۔احتمال ربا النسیئہ۔ (جدید فقہی مباحث: ۱۵/۱۴۱)۔

(مزید ملاحظہ ہو: اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴/۸۱، وفتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/۱۱۴)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ایزی پیسہ اکاؤنٹ میں پیسے رکھ کر فری منٹ استعمال کرنے کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام، پاکستان میں ایک سم کارڈ کی کمپنی ہے جس میں ایزی اکاؤنٹ کھولنے اور اس میں ۱۰۰۰ روپے سے زیادہ رقم جمع رکھنے پر ماہانہ ۵۰ منٹ فری ملتے ہیں، اس کا کوئی معاوضہ نہیں ہوتا، یعنی ۱۰۰۰ روپے میں سے کوئی ایک پیسہ بھی نہیں کٹتا؟ تو کیا ۵۰ فری منٹ کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا یہ کمپنی کی طرف سے انعام میں شامل ہے یا پھر سود میں داخل ہو کر ناجائز ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ ایزی اکاؤنٹ میں ۱۰۰۰ روپے جمع کرنے کے عوض ۵۰ فری منٹ استعمال کرنے کے لیے دیے جاتے ہیں، تو یہ ’’ کل قرض جر نفعاً فهو ربا ‘‘ کے زمرہ میں شامل ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال ناجائز ہے، ایسا سودی اکاؤنٹ کھولنے سے اجتناب کرنا چاہیے، عام سادہ سم والا اکاؤنٹ استعمال

کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہوفتاویٰ شامی میں مذکور ہے:

قوله :كل قرض جر نفعاً فهو حرام ، أى إذا كان مشروطاً كما علم مما نقله عن البحر وعن الخلاصة وفى الذخيرة و إن لم يكن النفع مشروطاً فى القرض فعلى قول الكرخى لا بأس به . (فتاوى الشامى: ۵/۱۶۶،سعيد).

اعلاء السنن میں مذکور ہے: **باب كل قرض جر نفعاً فهو ربا ، قال ابن أبي موسى: ولو أقرضه قرضاً ثم استعمله عملاً لم يكن ليستعمله مثله قبل القرض كان قرضاً جر منفعة ، ولو استضاف غريمه ، ولم تكن العادة جرت بينهما بذلک حسب له ما أكله ، لما روى ابن ماجه في سننه عن أنس رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا أقرض أحدكم قرضاً ، فأهدى له أوحمله على الدابة ، فلا يركبها ولا يقبله إلا أن يكون جرى بينه وبينه قبل ذلک . قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: إسناده ضعيف، عتبة بن حميد الضبى ضعيف ويحيى بن أبى إسحاق الهنائى، ويقال يزيد بن أبي إسحاق، ويقال :يزيد بن أبى يحيى، مجهول .**

قال: وهذا كله في مدة القرض، فأما بعد الوفاء فهو كالزيادة من غير شروط ، و حكمه أنه إذا أقرضه مطلقاً من غير شرط فقضاه خيراً منه فى القدر أو الصفة أو دونه برضاهما جاز . (اعلاء السنن : ۵۱۳/۱۴،ادارة القرآن).

آپ کے مسائل اوران کاحل میں ہے:

اگر وہ قرض کی وجہ سے کھلاتا ہے تو جائز نہیں اور اگر قرض سے پہلے دونوں جانب سے کھانے اور کھلانے کی عادت تھی تو جائز ہے،اس کے باوجود اگر احتیاط سے کام لیا جائے تو بہتر ہے۔(آپ کے مسائل:۱۹۴/۷)۔

ماہنامہ الفاروق میں دارالافتاء جامعہ فاروقیہ سے اسی قسم کا ایک مسئلہ شائع ہوا ہے،ملاحظہ ہو:

جواب:سم کارڈ پر بنائے گئے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کرنے سے کمپنی کی طرف سے جوفری منٹ ملتے ہیں وہ قرض پر نفع ہے،لہٰذا اس کا استعمال ناجائز اور حرام ہے،البتہ نفس اکاؤنٹ کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(ماہنامہ:الفاروق،جمادی الاولیٰ،۱۴۳۹ھ،ص۳۵)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

مخصوص قسم کی کریم کی تجارت اوراس کے استعمال کرنے کا حکم:

سوال: ایک قسم کی کریم (Minyak Lintah) بازار میں دستیاب ہے اس کے مکونات میں سے: ناریل کا تیل (coconut oil)، کلونجی (black seed)، زنجبیل (ginger)، مار ماہی (eel) اور ایک قسم کا کیڑا (Leech) ہے، اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ مرد اپنے مخصوص عضو پر مالش کرتا ہے جس کی وجہ سے جماع پر قوت حاصل ہوتی ہے۔ کیا اس کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ مذکورہ بالا کریم کے تمام مکونات صحیح اور درست ہیں، فقط ایک چیز کیڑا یہ حشرات الارض میں سے ہے، لیکن چونکہ اس میں دمِ سائل نہیں ہے لہٰذا میتہ یا ناپاک نہیں، پاک ہے، بنابریں خارجی استعمال درست ہے اور اس کی تجارت بھی جائز اور درست ہے، ہاں غیر شادی شدہ نوجوانوں کو بے حیائی اور فحش کاری کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، نیز ایسی جگہوں پر جا کر بھی نہ بیچا جائے جو فحش کاری اور زنا کاری کے اَڈے ہیں۔ ملاحظہ ہو فتاوی شامی میں ہے:

لـم يـذكروا دودة القرمز أما إذا كانت حية فينبغي جريان الخلاف الآتي في دود القز و بـزره وبيـضه وأما إذا كانت ميتة وهو الغالب فإنها على ما بلغنا تخنق فى الكلس أو الخل فـمقتـضـى ما مر بطلان بيعها بالدراهم لأنها ميتة ، وقد ذكر سيدي عبد الغنى النابلسي في رسـالة أن بيـعهـا بـاطـل وأنه لايضمن متلفها لأنها غير مال، قلت: وفيه أنها من أعز الأموال اليـوم ويـصـدق عـليهـا تـعريف المال المتقوم ويحتاج إليها الناس كثيراً فى الصباغ وغيره فيـنبـغي جواز بيعها كبيع السرقين والعذرة المختلطة بالتراب مع أن هذه الدودة إن لم يكن لها نفس سائلة تكون ميتتها طاهرة كالذباب والبعوض وإن لم يجز أكلها ، وسيأتى أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع . (فتاوى الشامى : ۵/ ۵۱ ،سعيد).

فتاوی رحیمیہ میں مذکور ہے: مکھی اور چیونٹی میں دمِ سائل نہیں ہے اس لیے پاک ہے مگر کھانا حلال نہیں، خارجی استعمال ہر طرح درست ہے، داخلی استعمال درست نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۶/ ۲۵)۔

بہشتی زیور میں مذکور ہے:

مسئلہ: دریائی جانور سب پاک ہیں چھوٹے ہوں یا بڑے مذبوح ہوں یا غیر مذبوح، ہاں کھانا کسی کا سوائے مچھلی کے مذہبِ حنفی میں درست نہیں تو خارجی استعمال تمام حیوانات دریائی کا اور ان کے تمام اجزاء کا

درست ہوا۔ (بہشتی زیور، نواں حصہ، ۸۷۷، ط: دارالاشاعت)۔

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۶/۷۷۰)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بٹ کائن (Bitcoin) کرنسی سے خرید وفروخت کرنے کا حکم:

سوال: آج کل مارکیٹ میں ایک کرنسی عروج پر ہے جس کو بٹ کائن کرنسی کہتے ہیں، میں اس کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں، نیز اس سے تجارت کرنے کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بٹ کائن کرنسی کے بارے میں چند معروضات پیش خدمت ہیں:

۱۔ بٹ کائن رقم کی ادائیگی کے لیے ایک ڈیجیٹل کرنسی ہے، یعنی ایک غیر مرئی سکہ ہے۔

۲۔ بٹ کائن انٹرنیٹ پر خرید وفروخت کے لیے نقد رقم کی طرح ہے۔

۳۔ بٹ کائن نیٹ ورک کی ایک خاص بات یہ ہے کہ کوئی ملک یا ادارہ اس کا مالک نہیں اور نہ اس کو کنٹرول کرتا ہے بلکہ استعمال کرنے والے کنٹرول کرتے ہیں، اس لیے اگر وہ ضائع ہوجائے تو کوئی ملک یا کوئی ادارہ اس کا بدل نہیں دے سکتا۔

۴۔ بٹ کائن برقی آلہ میں محفوظ ہوتا ہے، یہ اسی وقت ضائع ہوسکتا ہے جب وہ برقی آلہ خراب ہوجائے اور صحیح ہونے کی کوئی امید نہ ہو یا گم ہوجائے یا کوڈ بھول جائے۔

۵۔ بٹ کائن کرنسی نمبرات کی شکل میں ڈیجیٹل کرنسی کے طور پر وجود میں آئی۔

۶۔ اس کرنسی کی قیمت کا تعین طلب ورسد کی آزادی کے سپرد کیا گیا، جس کی وجہ سے ابتدا میں اس کی قیمت ایک ڈالر سے بہت کم تھی، مگر بعد میں اُتار، چڑھاؤ سے گزرتے ہوئے اب اس کی قیمت پانچ ہزار ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔

۷۔ بعض مغربی ممالک میں ٹیکسوں کی حصولی، نجی حسابات اور اس کرنسی کی نگرانی کے لیے جزوی طور پر تسلیم کیا گیا ہے، جبکہ بعض دیگر ممالک میں اس پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔

۸۔ کسی بھی ملک کی باقاعدہ نگرانی نہ ہونے اور اس کرنسی میں اُتار چڑھاؤ کی وجہ سے بین الاقوامی طور پر اس کرنسی کے تحت طے پانے والے معاملات کرنے والے اداروں کو کئی بار تنبیہ کی جاچکی ہے۔

فقہی نقطہ نظر سے بٹ کائن سے معاملہ کرنے کے جواز وعدمِ جواز کا حکم اور اس کے دلائل:

بٹ کائن کو اگر حکومت تسلیم نہ کرے اور اس پر تعامل نہ ہو تو ثمن نہیں ہے اس سے معاملہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اور اگر حکومت نے تسلیم کر لیا ہو اور اس پر عمل درآمد ہو اور عرف و تعامل پایا جاوے تو بعض مفتی حضرات کے نزدیک ثمن عرفی کی قسم میں داخل ہے اور بعض مفتی حضرات نے عدمِ جواز میں مقالے تحریر فرمائے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک یہ کرنسی ثمن نہیں لہٰذا اس سے معاملہ کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

عرب ممالک میں بہت سے مفتی حضرات نے اس کرنسی سے ہونے والے معاملات کے جواز کا فتویٰ صادر فرمایا ہے جبکہ دیگر بعض نے حکومت کے باقاعدہ تسلیم نہ کرنے تک محتاط رہنے کا فتویٰ دیا ہے۔

ثمن عرفی بننے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے؟ ملاحظہ ہو قاموس الفقہ میں ہے:

ہمارے زمانہ کے لحاظ سے کسی چیز کے ثمن اصطلاحی بننے اور اس کی ثمنیت پر اتفاقِ رائے پیدا ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ عوام میں بطورِ خود اس کا چلن ہو جائے، جیسا کہ قدیم کتبِ فقہ میں مذکور ہے فی زماننا یہ صورت ممکن نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت کسی چیز کو ثمن قرار دیدے اور یوں عوام اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں، یہی شکل اس وقت پوری دنیا میں رائج ہے... فقہاء کی تفصیلات سے واضح ہے کہ ثمنیت کا پیدا ہونا اصل میں عرف و رواج پر مبنی ہے، فلوس نافقہ اور ایسے درہم و دینار جن پر کھوٹ غالب ہو، کے ثمن تسلیم کیے جانے کی وجہ سوائے رواج و تعامل کے اور کیا ہے؟ (قاموس الفقہ: ۳/۵۹)۔

لہٰذا جس ملک میں حکومت نے قانونی طور پر اسے تسلیم کر لیا ہو تو وہاں ثمن اصطلاحی کے حکم میں ہے۔

فقہاء نے مال کی مختلف تعریفیں کی ہیں، درجِ ذیل ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

وقدمنا أول البيوع تعريف المال بما يميل إليه الطبع و يمكن ادخاره لوقت الحاجة، وأنه خرج بالادخار، المنفعة فهي ملك لا مال، لأن الملک ما من شأنه أن يتصرف فيه بوقف الاختصاص كما فى التلويح، فالأولى ما فى الدرر من قوله المال موجود يميل إليه الطبع ... (فتاوى الشامي: ۵/ ۵۱، سعيد).

قال فى البحر الرائق: المال ما يميل إليه الطبع و يمكن ادخاره لوقت الحاجة والمالية إنما ثبت بتمول الناس كافة أو بتقوم البعض والتقوم يثبت بها وبإباحة الانتفاع له شرعاً فما يكون مباح الانتفاع بدون تمول الناس لا يكون ما لا كحبة حنطة وما يكون مالاً

بين الناس ولا يكون مباح الانتفاع لا يكون متقوماً كالخمر وإذا عدم الأمران لم يثبت واحد منهما كالدم . (البحر الرائق: ۵/ ۲۵۶،ط:الماجدية).

وفي منحة الخالق: لأن المال ما يميل إليه الطبع ويدخر لوقت الحاجة أو ما خلق لمصالح الآدمي ويجري فيه الشح والضنة . (منحة الخالق حاشية البحر: ۵/۲۵۷،ط:الماجدية).

وقال في بدائع الصنائع: وأما التبر فهل يصلح رأس مال الشركة ؟ ذكر في كتاب الشركة وجعله كالعروض وفي كتاب الصرف جعله كالأثمان المطلقة ؛ لأنه قال فيه: إذا اشترى به فهلك لاينفسخ العقد ، والأمر فيه موكول إلى تعامل الناس، فإن كانوا يتعاملون به فحكمه حكم الأثمان المطلقة ، فتجوز الشركة بها وإن كانوا لا يتعاملون بها فحكمها حكم العروض، ولا تجوز فيها الشركة . (بدائع الصنائع: ۶/ ۵۹،سعيد).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (شرح المجلۃ لسلیم رستم باز اللبنانی: ۱/ ۶۰۷،دار الکتب العلمیۃ ،ودرر الحکام فی شرح مجلۃ الاحکام لعلی حیدر: ۱/ ۱۰۱،بیروت،وتبیین الحقائق: ۳/ ۳۱۷،ط:امدادیہ،ومجمع الانہر: ۱/ ۲۰۷،داراحیاء التراث العربی)۔

پاکستان کے بعض ادارے؛ ۱۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن اور جامعۃ الرشید نے تعامل اور حکومتی حکم نامہ کے بغیر اس کرنسی کو کاروباری سرمایہ کاری کے طور پر اختیار کرنے کو ناجائز کہا ہے۔

ماہنامہ ’’الصدیق‘‘ میں جواز وعدمِ جواز والوں کے دلائل کے بعد دونوں کے درمیان محاکمہ کیا گیا ہے، اس کے کچھ ملخصات پیش خدمت ہیں: **جواز کے دلائل کا تجزیہ:**

دوسری دلیل کے ضمن میں یہ بات ذکر کی گئی کہ جس بیع میں عدمِ جواز کی وجوہات میں سے کوئی وجہ نہ ہوتو وہ جائز ہے اور اگر عدمِ جواز کی کوئی صورت ہوتو وہ ناجائز ہے جبکہ بٹ کائن اور دوسری ڈیجیٹل کرنسی میں عدمِ جواز کی وجوہات میں سے کوئی وجہ نہیں لہٰذا اس کا کاروبار جائز ہے۔

اس دلیل میں دو باتیں محلِ نظر ہیں: **پہلی بات:** یہ کہ اس میں عدمِ جواز کی وجوہات میں سے کوئی وجہ نہیں یہ بات ہمیں تسلیم نہیں، کیونکہ بیع کے ناجائز ہونے کی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ ہے کہ مال نہ ہو اور بٹ کائن بھی مال نہیں، کیونکہ مال یا تو شئ مرغوب اور قابل ذخیرہ چیز کا نام ہے جب کہ اس میں یہ وصف نہیں پایا جاتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اعیان ومنافع پر مال کا اطلاق ہوتا ہے اور بٹ کائن نہ تو اعیان میں سے ہے اور نہ منافع

میں، لہٰذا یہ مال نہیں ہوا تو جو حکم غیر مال کی خرید وفروخت کا ہوتا ہے وہی اس کا بھی ہوگا۔

اور اگر بعض لوگوں کے ہاں یہ شئ مرغوب اور قابل ذخیرہ ہو، تو بھی جو لوگ اس کو شئ مرغوب اور قابل ذخیرہ نہیں مانتے ان کے نزدیک یہ مال نہیں ہوا اور جس طرح جو چیز بعض کے نزدیک غیر مال ہو اور بعض کے نزدیک مال، جیسے شراب وغیرہ تو اس کی بیع فاسد ہوتی ہے، لہٰذا یہی حکم بٹ کائن کا بھی ہوگا۔

دوسری بات: اس دلیل میں پوری توجہ بٹ کائن کے کاروبار میں شرعی خامی پر مرکوز کی گئی ہے جب کہ ہمارا موضوع اس کی کرنسیت کا ثبوت ہے جب اس کی کرنسیت ثابت ہو جائے، تب ہم اس کے کاروبار کے جواز وعدمِ جواز کے احکام پر بحث کریں گے، یعنی دعویٰ ایک ہے اور دلیل دوسری، دعویٰ ہے بٹ کائن کی کرنسیت وعدمِ کرنسیت اور دلیل ہے کہ بٹ کائن کے کاروبار میں شرعی خامی نہیں۔

عدمِ جواز کے دلائل کا تجزیہ: عدمِ جواز کی پہلی دلیل کا تجزیہ:

اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ ثمنیت کے لیے اصل سونا چاندی ہے یا پھر اس کی رسید اور تیسری صورت میں قابل ضمانت حکومت، اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ثمن شرعی میں تو اصل یہی ہے کہ سونا چاندی یا اس کی رسید ہو اور یا پھر قابل ضمانت حکومت جیسا کہ فلوس وغیرہ، لیکن عرفی ثمن میں اس کے لیے تعامل اور حکومت کی اجازت بھی کافی معلوم ہوتی ہے، اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم بھی بٹ کائن کو ثمن شرعی نہیں کہہ رہے بلکہ ہم اس کو ثمن عرفی کہہ سکتے ہیں۔

جہاں تک یہ بات ہے کہ بٹ کائن اور ڈیجیٹل کرنسی میں سافٹ ویئر کی مضبوطی پر قوت ثمن کا اعتبار ہے یعنی جو سافٹ ویئر قوی ہوتا ہے اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے تو یہی بات عام کاغذی کرنسی میں بھی ہے کہ جس کرنسی کے عوام اور حکومت مضبوط ہو تو ان کی کرنسی بھی مضبوط ہوتی ہے۔

اور یہ بات کہ بٹ کائن وغیرہ ڈیجیٹل کرنسی میں ہیکنگ وغیرہ کا خطرہ ہے، تو یہی خطرہ کاغذی نوٹ کے غصب میں اور اس کی نقلی کاپی تیار کرنے میں بھی ہے، جب وہ جائز ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟

جواز وعدمِ جواز کے مندرجہ بالا دلائل اور ان پر کیے گئے تجزیہ کی روشنی میں چند باتیں معلوم ہوئیں:

پہلی بات: خلاصہ یہ ہے کہ کرنسی کا مدار اس کے ارقام اور نمبرات پر ہوتا ہے اور اس کرنسی پر بھی نمبرات وارقام مرقوم ہے تو یہ کرنسی کے حکم میں ہوگی۔

کرنسی کے ساتھ کمپنیوں کا معاملہ اورعوام کا معاملہ رائج ہوگیا ہے حتی کہ خاص نمبرات کے ساتھ محفوظ کی جاسکتی ہے اورحساب، کتاب ریکارڈ کیا جاسکتا ہے، اور جب حکومت کی سرپرستی ہواورعوام میں مقبولیت ہوتو پھر اب کرنسی ہوجانا ممکن ہے۔

دوسری بات کا خلاصہ: بٹ کائن کا بطورِ ثمن استعمال کرنے میں بظاہر کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا، البتہ سونا چاندی، اس کی رسید یا ضامن حکومتی یا ان کے مسلّم اداروں میں تعامل نہ ہونے کی وجہ سے اسے بطورِ کرنسی استعمال کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ (ملخص از ماہنامہ ''الصدیق''، ص ۱۳۵۔۱۳۷، معہد الصدیق للدراسات الاسلامیۃ کا ترجمان، محرم الحرام تا ربیع الاول ۱۴۳۹ھ، اکتوبر یا دسمبر ۲۰۱۷ء)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

ٹائم شیئرز کی تجارت کا حکم:

سوال: ٹائم شیئرز کا مطلب یہ ہے کہ لوگ تعطیلات گزارنے کے لیے ایک دو ہفتہ کے لیے ہوٹل یا کمرے کرایہ پر لیتے ہیں، تو کیا اس کی تجارت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ یعنی ایک سے خرید کر دوسرے کو بیچنا جبکہ مکمل قبضہ نہیں ہوتا تو کیا نفع پر بیچنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: اگر کوئی شخص ہوٹل کو کرایہ پر لیکر دوسرے کو دینا چاہے تو اس کے قبضہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی طرف سے کسی کو اپنا قائم مقام کردے وہ ہوٹل کی چابیاں لے کر قبضہ کرلے گا اور آنے والوں کو کرایہ پر دیگا۔

نیز اگر کمروں کو نفع کے ساتھ کرایہ پر دینا ہو تو کمروں میں کچھ تصرف کرلے مثلاً ٹیبل کرسیاں لگادیں یا حمام میں صابون وغیرہ رکھدے یا ہوٹل والوں سے ڈالر پر معاملہ کیا جائے اور کرایہ داروں سے رینڈ پر کرلیا جائے تب بھی زائد نفع لینا درست ہوگا۔ ملاحظہ ہو درمختار میں مذکور ہے:

(وله السكنى بنفسه إسكان غيره بإجارة وغيرها) وكذا كل ما لا يختلف بالمستعمل يبطل التقييد لأنه غير مفيد، بخلاف ما يختلف، و لو آجر بأكثر تصدق بالفضل إلا في مسألتين : إذا آجرها بخلاف الجنس أو أصلح فيها شيئاً. وفى الشامية: قوله بخلاف الجنس، أى جنس ما استاجر به وكذا إذا آجر مع ما استاجر شيئاً من ماله يجوز أن تعقد عليه الإجارة فإنه تطيب له الزيادة كما فى الخلاصة، قوله أو أصلح فيها شيئاً، بأن جصصها أو فعل فيها مسناة وكذا كل عمل قائم لأن الزيادة بمقابلة ما زاد من عنده حملاً

لأمره على الصلاح كما في المبسوط. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲۹/۶، باب ما يجوزمن الاجارة).

فتاوی عالمگیری میں ہے:

وإذا استاجر داراً وقبضها ثم آجرها فإنه يجوز إن آجرها بمثل مااستاجرها أو أقل وإن آجرها بأكثر مما استاجرها فهي جائزة أيضاً إلا أنه إن كانت الأجرة الثانية من جنس الأجرة الأولىٰ فإن الزيادة لا تطيب له ويتصدق بها وإن كانت من خلاف جنسها طابت له الزيادة ولو زاد في الدار زيادة كما لو وتد فيها وتداً أوحفر فيها بئراً أو طيناً أو أصلح أبوابها أو شيئاً من حوائطها طابت له الزيادة. (الفتاوى الهندية: ۴۲۵/۴، الباب السابع في اجارة المستاجر).

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

جتنی رقم کسی جگہ بھی کرایہ مکان کی آپ ادا کریں اتنی رقم پر دوسرے کو دے سکتے ہیں، اگر اس سے زیادہ رقم لیں گے تو اس کا صدقہ کر دینا ہوگا۔

دوسری جگہ مرقوم ہے:

اگر اس شخص نے اس جائیداد میں کوئی تصرف نہیں کیا تب تو یہ منافع ناجائز ہے اس کا تصدق واجب ہے اگر اس جائیداد کی کوئی اصلاح کی یا مرمت کی ہے اور پھر دوسرے شخص کو دی ہے تو یہ منافع جائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ: ۶۰۴/۱۶، ۶۰۵ جامعہ فاروقیہ).

جدید معاملات کے شرعی احکام میں ہے:

شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ یہ معاملہ جائز ہے، بشرطیکہ اپنے موجر کے ساتھ نہ ہو اور اجرتِ اولیٰ سے کم پر ہو اور اگر اجرتِ اولیٰ سے زیادہ کے ساتھ ہو تو زائد رقم حلال نہ ہوگی اس کا تصدق واجب ہوگا۔

الا یہ کہ دوسرا عقد پہلے عقد کے خلافِ جنس سے ہو، یا یہ کہ کرایہ دار اس میں کوئی مرمت واصلاح کرے، مثلاً اگر مکان ہو تو اس کی مرمت، رنگ روغن وغیرہ کرے، اگر زمین ہو تو اس کی نالی وغیرہ درست کرے۔ (جدید معاملات کے شرعی احکام: ۲۱۶/۱).

مزید ملاحظہ ہو: (کفایت المفتی: ۳۳۱/۷، کتاب المعاش، دارالاشاعت).

بظاہر اس کا مدار عرف پر ہے پہلے زمانہ میں اس کا عرف نہیں تھا آج کل اس کا عرف ہے لہٰذا بلا شرط زیادہ

لینے کی اجازت ہونی چاہیے۔جیسے اجیر، اجیر الاجیر سے زائد وصول کرسکتا ہے اگر زید عمرو کو ایک کپڑا سینے کے لیے دے ایک درہم کے عوض، اور عمرو بکر کو دو درہم کے عوض دیدے تو یہ صحیح ہے۔اسی طرح اگر رب المال مضارب کو نصف ربح پر دے اور مضارب، مضارب المضارب کو کل نفع کے ثلث پر دیدے تو یہ جائز ہے، مثلاً: مضاربت میں کل نفع چھ لاکھ ہو تو ۳ لاکھ رب المال کے، ۲ لاکھ مضارب المضارب کے اور ا، لاکھ مضارب کے ہوں گے، اسی طرح صورتِ مسئولہ میں موجر مستاجر کو ۷۰ ہزار میں دیدے اور مستاجر آگے ایک لاکھ میں دیدے اور ۳۰ ہزار خود رکھ لے تو یہ جائز ہونا چاہیے، لیکن اُس زمانہ میں اس کا عرف نہیں تھا۔مضاربت کی دلیل ملاحظہ کیجیے:

قال في الهداية: فإذا دفع رب المال مضاربة بالنصف وأذن له بأن يدفعه إلى غيره فدفعه بالثلث وقد تصرف الثاني وربح ، فإن كان رب المال قال له على أن ما رزق الله فهو بيننا نصفان فلرب المال النصف وللمضارب الثاني الثلث وللمضارب الأول السدس لأن الدفع إلى الثاني مضاربة قد صح لوجود الأمر به من جهة المالك ورب المال شرط لنفسه نصف جميع ما رزق الله تعالىٰ فلم يبق للأول إلا النصف فينصرف تصرفه إلى نصيبه وقد جعل من ذلك بقدر ثلث الجميع للثاني فيكون له فلم يبق إلا السدس ويطيب لهما ذلك لأن فعل الثاني واقع للأول كمن استوجر على خياطة ثوب درهم فاستاجر غيره عليه بنصف درهم . (الهداية : ۳/۲٦۴).

نیز درر الحکام میں اس میں زائد پر نہ دینے کی قید نہیں۔عبارت ملاحظہ ہو:

للمستاجر أي جاز له أن يؤجر الأجير من غير موجره ولا يجوز أن يؤجره لمؤجره لأن الإجارة تمليك المنفعة والمستاجر في حق المنفعة قائم مقام المؤجر فيلزم تمليك المالك ويعير و يودع فيما لايختلف الناس في الانتفاع به ، لأنه لما ملك منافعه جاز له أن يملكها لكن لا فيما يختلف الناس في الانتفاع بها وإلا كان متعدياً . (درر الحكام في شرح غرر الاحكام : ۲/ ۲۴۱، مسائل شتى).

عطر ہدایہ میں کرایہ کی چیز کو اجرت پر دینے یا عاریت پر دینے کے بارے میں مطلقاً جواز مرقوم ہے، زائد پر دینے کے لیے کوئی شرط مرقوم نہیں ہے۔ملاحظہ ہو: کرایہ پر لی ہوئی چیز کو آگے کرایہ پر یا عاریت کے طور پر دینا

درجِ ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ پھر چند شرائط مذکور ہیں لیکن زائد دینے کے لیے کوئی شرط مرقوم نہیں ہے۔ (عطر ہدایہ، ص ۲۷۰، ط: زمزم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

اپنے کھاتہ میں دوسرے کی رقم رکھنے کی اجرت لینے کا حکم:

سوال: ایک آدمی نے کسی شخص کو ۱۲لاکھ روپے دیے اور کہا کہ یہ روپے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کردو، اور یہ بھی بتادیا کہ جمع کرنے اور اکاؤنٹ استعمال کرنے کی وجہ سے تم کو ۵۰ ہزار روپے بطورِ اجرت ملیں گے، پھر آہستہ آہستہ اکاؤنٹ سے روپے نکال کر مجھے دیتے جانا، کیا ایسا معاملہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب: بعض ممالک میں عارضی مشکل حالات کی وجہ سے اپنے اکاؤنٹ میں زیادہ روپے نہیں رکھ سکتے ہیں ورنہ ضبط ہوجائیں گے اور شرمندگی الگ ہوگی، اس لیے کسی اور کے اکاؤنٹ میں اپنی رقم رکھوانی ہوگی اور وہ شخص رقم کی حفاظت کے عوض ۵۰ ہزار وصول کریگا پھر آہستہ آہستہ نکال کر اس کے حوالہ کردے گا، یہ اجارہ کی شکل ہے شرعاً اس کی اجازت ہے، پھر یہ بات بھی یاد رہے کہ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرنا اور نکالنا ایک مشکل کام ہے، اس میں کافی محنت کرنی پڑتی ہے، لائن میں کھڑا رہنا ہوگا، چنانچہ عقد کے وقت رقم کی حفاظت، اکاؤنٹ استعمال کرنا اور جمع کرنے نکالنے کی محنت وغیرہ کا بھی تذکرہ کرلیا جائے، ان سب کے عوض ۵۰ ہزار لینا جائز اور درست ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

المودِع إذا شرط الأجرة للمودَع على حفظ الوديعة صح ولزم عليه كذا في جواهر الأخلاطي . (الفتاویٰ الهندية: ۳۴۲/۴).

فقہاء نے اجارہ کی تعریف درجِ ذیل الفاظ میں فرمائی ہے۔ ملاحظہ ہو القدوری میں ہے:

الإجارة عقد على المنافع بعوض و لا يصح حتى تكون المنافع معلومة و الأجرة معلومة ، لأن الجهالة فى المعقود عليه وبدله يفضى إلى المنازعة كجهالة الثمن و المبيع .

(القدوری مع الجوهرة:). (وكذا فى المبسوط للامام السرخسیؒ : ۱۳۵/۱۵ ،ط:بیروت). واللہ ﷻ اعلم۔

ریٹس ٹیکس میں سودی رقم ادا کرنے کا حکم:

سوال: کیا سودی رقم گھر کے ریٹس میں ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟ ریٹس کا مطلب یہ ہے حکومت کی

جانب سے گھر، زمین اور دوسری چیزوں پر بطورِ ٹیکس مقرر کردہ رقم۔

الجواب: سودی رقم کا اصل حکم یہ ہے کہ مالک کو واپس کردی جائے، لیکن اگر مالک کا علم نہ ہو تو فقراء، مساکین پر بلانیتِ ثواب صدقہ کردی جائے، باقی حکومت کے ریٹس ٹیکس میں ادا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ جنوبی افریقہ کے بینک پرائیویٹ ہوتے ہیں حکومتی نہیں ہوتے۔

ملاحظہ ہو معارف السنن میں مالِ خبیث کا حکم اسطرح مذکور ہے:

قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك فسبيله التصدق على الفقراء، قال: ومثله يقول ابن القيم في بدائع الفوائد، قال: والظاهر أن المتصدق بمثله ينبغي أن ينوى به فراغ ذمته ولا يرجو به المثوبة، نعم يرجوها بالعمل بأمر الشارع، وكيف يرجو الثواب بمال حرام ويكفيه أن يخلص منه كفافاً رأساً برأس. (معارف السنن: ۱/۳۵).

نظام الفتاویٰ میں مرقوم ہے:

اصل ضابطہ یہ ہے کہ جو بھی حرام مال ہو اس کے بارے میں اصل حکم یہی ہے کہ جس کا مال ہے اس کی ملک میں کسی تدبیر سے لوٹا دینا (إذا علم المالك بعينه فلا شك فى حرمته ووجوب رده عليه، فتاویٰ شامی، باب البيع الفاسد، سعيد) اور جب اصل مالک کی ملک میں نہ پہنچا سکے تو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بطورِ صدقہ کسی مستحقِ صدقہ کو دے کر جلد از جلد اپنی ملک سے خارج کردے اور خود کسی کام میں استعمال نہ کرے اور نہ اس کو صدقہ میں دینے کے بعد ثواب کی نیت کرے، (وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فأما إذا ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرد إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته فليس له حيلة إلا أن يدفع إلى الفقراء، بذل المجهود: ۱/۳۷) مرکزی حکومت سے ملی ہوئی سود کی رقم انکم ٹیکس سیل ٹیکس میں جب مرکزی حکومت کی ہے دے سکتے ہیں، باقی میونسپل کارپوریشن بورڈ، میونسپلٹی ٹیکس اور اس کے علاوہ دیگر ٹیکسوں میں نہیں دے سکتے ہیں۔ (نظام الفتاویٰ: ۱/۱۸۵)۔

مزید ملاحظہ ہو: (احسن الفتاویٰ: ۷/۲۱، وجدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۱۶۳، وفتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۵/۴۰۲)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

غیر مسلم کمپنی کی تیار کردہ اشیائے خوردنی فروخت کرنے کا حکم:

سوال: جنوبی افریقہ میں نیستافوڈ (NESTA FOODS) نامی ایک کمپنی ہے جو پلونی (POLONY)، ورس (WORS) وغیرہ اشیائے خوردنی بناتی ہے، کمپنی کسی غیر مسلم کی ہے اوراس کے کوئی حلال سرٹیفکیٹ وغیرہ بھی نہیں ہے۔اب سوال یہ ہے کہ ایک آدمی کی دکان دیہات میں ہے جس کی اکثریت غیر مسلم ہے، تو کیا وہاں غیر مسلموں کو ایسی اشیاء فروخت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب: خنزیر کے سوا تمام جانور چاہے ماکول اللحم ہوں یا غیر ماکول اللحم باقاعدہ ذبح کردینے سے ان کا گوشت پاک ہوجاتا ہے، اوراس کی بیع بھی درست ہے اور کمائی حلال ہے۔لیکن اگر یہ اشیاء مردار سے بنائی جاتی ہوتو ان کا بیچنا جائز نہیں ہے۔ملاحظہ ہو علامہ عینیؒ بنایہ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں:

(وكذلک يطهر لحمه) أى لحم ماذكى حتى اذاصلى ومعه من لحم الثعلب المذبوح أونحوه أكثر من قدرالدرهم جازت صلاته (هو الصحيح) أى الحكم بطهارة لحمه هوالصحيح ، واحترز به عما قال فى الأسرار وغيره أنه نجس قلت: قد اختلف أصحابنا في طهارة لحمه و شحمه ، فقال الكرخيؒ: كل حيوان يطهر جلده بالدباغ يطهر بالذكاة فهذا يدل على أنه يطهرشحمه و لحمه وسائر أجزاءه ، و قال بعض مشائخنا : يطهر جلده لاغير منهم نصربن يحيى والفقيه أبوجعفر والأول أقرب إلى الصواب، وقال فى المفيد هو الصحيح ... (البناية فى شرح الهداية: ۱/۳۷۶،ط: متكبه رشيديه كوئٹه).

فتاوی ہندیہ میں ہے:

وفي فتاوىٰ أهل سمرقند: إذا ذبح كلبه وباع لحمه جاز، وكذا إذا ذبح حماراً وباع لحمه وهذا فصل اختلف المشايخ فيه بناء على اختلافهم في طهارة هذا اللحم بعد الذبح واختيار الصدر الشهيد على طهارته...ويجوز بيع لحوم السباع والحمرالمذبوحة فى الرواية الصحيحة، ولايجوز بيع لحوم السباع الميتة كذا في محيط السرخسيؒ. (الفتاوى الهندية:۳/۱۱۵).

فتاوی شامی میں ہے: **قوله والسباع وكذا يجوزبيع لحمها بعدالتذكية لإطعام الكلب أو سنور بخلاف لحم الخنزير لأنه لايجوز إطعامه محيط.** (فتاوى شامى:۵/۲۲۶،سعيد).

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ بہشتی زیور میں فرماتے ہیں:

مردہ ان حیوانات کی بیع درست ہے جو پاک ہیں، جیسے دریائی جانور یا حشرات غیر ذی دم یا ذی دم جانور بعد ذبح، کیونکہ ذبح سے ہر جانور پاک ہوجاتا ہے سوائے سور کے۔ (بہشتی زیور، نواں حصہ، ص۱۰۳).

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

سوائے خنزیر کے تمام وہ جانور جن میں دم سائل ہو خواہ ان کا گوشت کھانا حلال ہو یا حرام باقاعدہ ذبح کرنے سے سب پاک ہوجاتے ہیں، یعنی تمام اجزا ان کے گوشت، چربی، آنتیں، اوجھ، سنگدانہ، پتہ، اعصاب سب طاہر ہوجاتے ہیں، سوائے خون کے یعنی دم مسفوح کے، نتیجہ یہ ہے کہ خارجی استعمال ان کا ہر طرح درست ہوجاتا ہے، جیسے سر پر باندھنا وغیرہ، ہاں کھانا درست نہیں سوائے حلال جانوروں کے۔ (نواں حصہ، ص۱۰۵).

حضرت رحمہ اللہ کی عبارت کا حاصل یہ ہے کہ خنزیر کے سوا تمام جانور ذبح سے پاک ہوجاتے ہیں اور ان کی بیع درست ہے، ہاں سوائے حلال جانوروں کے ان کا کھانا درست نہیں۔

علامہ اکمل الدین بابرتی رحمہ اللہ اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے قولِ مخالف کے جوابات بھی دئے ہیں، تفصیل کے لیے، ملاحظہ فرمائیں:

(شرح العناية على الهداية بهامش فتح القدير مع الفتح: ۱/۹۵۔۹۶، دار الفكر. والبناية في شرح الهداية: ۱/۲۳۳. وفتاویٰ شامی: ۱/۲۰۵، سعيد. ومجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر: ۱/۱۱، تحت الماء المستعمل. وحاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، ص۱۲۹. وخلاصة الفتاویٰ: ۱/۴۳، احكام الدباغة، و الجوهرة النيرة: ۱/۱۷، ملتان. والفتاوى الولوالجية: ۱/۴۶، الفصل الثاني، بيروت. وامداد الفتاح، ص ۱۷۰، بيروت).

یہاں پر مزید ایک بات قابل غور یہ ہے کہ کیا ذبح سے مراد شرعی ذبح ضروری ہے یا مجوسی وغیرہ کا ذبیحہ بھی پاک ہے، نیز غیر شرعی طریقہ پر ذبح کیا گیا اور دم مسفوح مکمل طور پر بہہ گیا تو گوشت پاک ہوا یا نہیں؟

اس مسئلہ میں بھی فقہاء کے دو قول ہیں اور دونوں کی تصحیح کی گئی ہے، چونکہ مسئلہ تجارت سے متعلق ہے اس وجہ سے بیع کی گنجائش ہوگی۔ نیز اس کی نظیر سرطان ہے کہ غیر ماکول ہے اور اس کی بیع جائز ہے۔

ملاحظہ فرمائیں علامہ طحطاوی فرماتے ہیں:

قوله الشرعية، نقل في البحر من كتاب الطهارة عن الدراية والمجتبى والقنية أن ذبح

المجوسی، وتارک التسمية عمداً يوجب الطهارة على الأصح وإن لم يؤكل، وأفاد في التنوير أن اشتراط الذكاة الشرعية هو الأظهر وإن صحح المقابل. (حاشية الطحطاوی على مراقی الفلاح، ص ۱۶۹، کتاب الطهارة، قديمی).

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

وفی القنية : قال الكرابيسی والقاضی عبد الجبار : مجوسي ذبح حماراً قيل لايطهر والصحيح أنه يطهر. (البناية : ۲۳۳/۱).

درمختار میں ہے:

(وهل يشترط كون ذكاته شرعية) بأن تكون من الأهل في المحل بالتسمية (قيل نعم، وقيل لا، والأول أظهر)، لأن ذبح المجوسي وتارك التسمية عمداً كلا ذبح (وإن صحح الثاني) صححه الزاهدي في القنية والمجتبى، وأقره في البحر. وفی رد المحتار : قوله وأقره في البحر، حيث ذكر أنه في المعراج نقل عن المجتبى والقنية تصحيح الثاني، ثم قال: وصاحب القنية هو صاحب المجتبى، وهو الإمام الزاهدی المشهور علمه وفقهه، ويدل على أن هذا هو الأصح أن صاحب النهاية ذكر هذا الشرط أی كون الذكاة شرعية بصيغة قيل معزياً إلى الخانية. (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۲۰۵/۱، سعيد. وكذا في حاشية الطحطاوی على الدرالمختار: ۱۱۳/۱، باب المياه، كوئته).

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۲۳۶/۵) ۔ واللہ ﷻ اعلم ۔

بائنیری آپشنز ٹریڈنگ (binary options trading) کا حکم:

سوال: بائنیر آپشنز ٹریڈنگ (binary options trading) جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بائنیری آپشنز ٹریڈنگ کا طریقہ کار یہ ہے کہ سرمایہ کار اپنی ملکیت کے سرمایہ کے بارے میں ایک ایجنٹ کے ساتھ اندازہ لگاتا ہے کہ یہ اثاثہ جات ایک متعین وقت کے اندر (کبھی ۶۰ سیکنڈ) میں اس کی قیمت بڑھ جائے گی یا کم ہوگی، پھر مدت گزرنے کے بعد دیکھا جائے گا کہ اس کا اندازہ صحیح تھا یا غلط اگر صحیح تھا تو اس کا سرمایہ اضافی رقم کے ساتھ ملے گا، ورنہ سرمایہ بھی کھو دیگا، اور جس کمپنی کے ساتھ اس نے یہ معاملہ کیا وہ کمپنی

اس اثاثہ پر قبضہ کرلے گی، اسی طرح یہ طریقہ نقد میں بھی مروج ہے، بہت سارے ممالک میں اس طرح کا معاملہ ممنوع ہے، اور اس کے متخصصین کے نزدیک ایک نئی قسم کا جوا ہے، نیز بائینیری کا مطلب بھی یہی ہے کہ جیت یا ہار درمیان کا کوئی راستہ نہیں۔

شرعی نقطہ نظر سے اس معاملہ کو اگر دیکھا جائے تو یہ سود وقمار دونوں ہی کا مجموعہ ہے، یعنی انویسٹر کا اندازہ صحیح تو مزید ملے گا اور اگر غلط تو پورا سرمایہ کھودیگا، سود وقمار دونوں نص قطعی سے حرام ہے لہٰذا ایسا معاملہ ناجائز اور حرام ہے، اس سے مکمل اجتناب کرنا لازم اور ضروری ہے۔

مذکورہ معاملہ سے متعلق معلومات درجِ ذیل ویب سائٹ کی مدد سے حاصل کی گئی ہیں:

۱۔ businessinsider.com

۲۔ wikipedia.org

۳۔ techterms.com

دلائل ملاحظہ فرمائیں: **قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿الذین یأکلون الربا لایقومون إلا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس ذلک بأنهم قالوا إنما البیع مثل الربا، وأحل اللّٰہ البیع وحرم الربا...** [البقرة:۲۷۵]،

وقال تعالیٰ: ﴿یا أیھاالذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون﴾ [المائدة:۹۰].

وقال فی الھدایة: الربا ھو الفضل المستحق لأحد المتعاقدین فی المعاوضة الخالي عن عوض شرط فیہ. (الھدایة:۳/۷۸).

قال فی الدرالمختار: وسمی القمار قماراً لأن کل واحد من المقامرین ممن یجوز أن یذھب مالہ إلی صاحبہ، ویجوز أن یستفید مال صاحبہ وھو حرام بالنص، ولا کذلک إذا شرط من جانب واحد لأن الزیادة والنقصان لا تمکن فیھما بل في أحدھما تمکن الزیادة، وفی الآخر الانتقاض فقط فلا تکون مقامرة لأنھا مفاعلة عنہ، زیلعی. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۶/۴۰۳، سعید).

فی التعریفات الفقهية : القمار مصدر قامر هو كل لعب يشترط فيه غالباً أن يأخذ الغالب شيئاً من المغلوب وأصله أن يأخذ الواحد من صاحبه شيئاً فشيئاً في اللعب ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال في الجانبين . (التعريفات الفقهية، ص: ١٧٧).

(وكذا في جواهر الفقه : ٢/٢٢٧، وامداد الفتاوىٰ: ٣/١٦١).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں مرقوم ہے:

غرر کی ایک صورت جس کو فقہاء کرام نے تعلیق التملیک علی الخطر سے تعبیر فرمایا ہے کہ عقود ومعاوضہ میں تملیک کو کسی خطرہ پر معلق کرنا، خطرہ کا معنی ہے کوئی ایسا آنے والا واقعہ جس کے واقع ہونے یا نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو اس واقعہ پر تملیک کو معلق کردینا کہ اگر یہ واقعہ پیش آگیا تو میں نے اپنی فلاں چیز کا تمہیں مالک بنادیا . . . اس کو قمار کہتے ہیں۔

قمار یعنی جوا یا میسر اس میں ایک طرف سے ادائیگی یقینی ہو اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہو، . . . یہ قمار ہے، تعلیق التملیک علی الخطر ہے اور غرر کا ایک شعبہ ہے جو حرام ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴/۶۷)۔

واللہ ﷻ اعلم۔

شراء ما باع باقل مما باع بعد نقد بعض الثمن کا حکم:

(یعنی اپنی فروخت شدہ چیز کو کم قیمت میں خریدنا جب کہ مشتری نے ثمن کا کچھ حصہ ادا کردیا ہو، اس عقد کا حکم):

سوال: اگر کوئی شخص ایک مشین ایک لاکھ میں فروخت کرے اور پچاس ہزار کی رقم قیمت میں وصول کرلے اور پھر وہ مشین ۸۵ ہزار میں خریدلے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ آسان الفاظ میں **شراء ما باع بأقل مما باع بعد أداء بعض الثمن** جائز ہے یا نہیں؟ یہ تو معلوم ہے کہ احناف کے نزدیک قبل نقد الثمن صحیح نہیں۔

الجواب: **شراء ما باع بأقل مما باع بعد أداء بعض الثمن** جائز نہیں، جب تک آخری درہم بھی ادا نہ ہوجائے اس وقت تک وہ قبل نقد الثمن کے حکم میں ہی ہوگا، اور جائز نہ ہوگا، کیونکہ فقہاء نے عدم جواز کی جو علت بیان فرمائی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض ثمن ادا کرنے سے بھی عدمِ جواز کی علت بدستور باقی رہتی ہے۔ ملاحظہ ہو محیط برہانی میں مذکور ہے:

نـو ع آخر في شراء ما با ع بأقل مما با ع ؛ يجب أن يعلم أن شراء ما با ع الرجل بنفسه أو بيـع لـه بـأن بـا ع و كيـلـه بأقل مما با ع ممن با ع أو ممن قام مقام البائع كالوارث قبل نقد الثـمـن لا يجوز إذا كانت السلعة على حالها لم ينتقض بعيب ، وكذلک إن بقي عليه شيء من ثمنه وإن قل . (المحیط البرهانی: ۳۴۳/۷).

قال في مجمع الأنهر:

ولا يـجوز شراء ما با ع البائع أو وكيله من سلعة أو غيرها بأقل مما با ع من الثمن قبل نقد كل الثمن الأول أو بعضه وإن بقي من ثمنه درهم كما فی السراج. (مجمع الانهر: ۲۰/۲).

ہدایہ وغیرہ کتب میں بیان کردہ علت سے بھی پتا چلتا ہے کہ یہ جائز نہیں۔

ولأن الثـمـن لم يدخل في ضمانه فإذا وصل إليه المبيع ووقعت المقاصة بقي له فضل خمس مائة وذلک بلا عوض . (الهداية: ۵۷/۳).

وفی العناية : بقی له فضل خمس مائة بلاعوض وهوربا. (العناية :۲۹/۶).

وقال فی الكفاية:

قوله ولأن الثمن لم يدخل في ضمانه، لأن الثمن قبل القبض لايدخل في ضمان البائع فإذا عاد إليه عين المبيع بالصفة التي خرج عن ملكه وتقابل خمس مائة بخمس مائة قصاصاً يسـلـم لـلبائع خمس مائة مع سلامة الجارية له وهذه الزيادة ربح مالم يضمن لأنها تنشأ من زيادة الثمن الأول على الثمن الثاني، والثمن الأول لم يدخل فی ضمانه وبخلاف ما إذا باعه بالعرض لأن الفضل إنما يظهر عند المجانسة . (الكفاية على الهداية: ۷۱/۶،ط:رشيديه).

وقال في فتح القدير:

ونهـى رسـول الله صلى الله عليه وسلم، عن بيع ربح مالم يضمن، وهذا لأن الثمن لا يـدخل في ضمانه قبل القبض، فإذا عاد إليه الملک الذي زال عنه بعينه وبقي له بعض الثمن فهو ربح حصل لا على ضمانه من جهة من باعه . (فتح القدير:۷۱/۶،ط: رشيديه).

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

سرکاری زمین پرمکان بنا کرفروخت کیالیکن مشتری کے نام زمین نہ ہوئی توثمن واپس لینے کاحکم:

سوال: ایک شخص نے سرکاری زمین پرمکان بنا کرا سے فروخت کردیااورمشتری کویقین دلایا کہ زمین تمہارے نام پرہوجائے گی ،مشتری نے وہ مکان کرایہ پردیااوردوتین سال تک کرایہ وصول کیا،لیکن وہ زمین مشتری کے نام پرنہیں ہوئی کسی اور کے نام پرہوئی اوراس نے کسی کوبیچ دی،اب مشتری ثمن کامطالبہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ نیز جوکرایہ وصول کیااس کامالک کون ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: مشتری اول بائع سے پوراثمن وصول کرنے کاحقدار ہے،نیز یہ ثمن کرایہ کے علاوہ ہوگا کرایہ کامالک بھی مشتری اول ہی ہوگا۔ملاحظہ ہوہدایہ میں مرقوم ہے:

ولو تداولته الأيدى ثم قطع في يد الآخر رجع الباعة بعضهم على بعض عنده كما فى الاستحقاق...قوله فى الكتاب ولم يعلم المشترى يفيد على مذهبهما ؛ لأن العلم بالعيب رضا به، ولا يفيد على قوله فى الصحيح ، لأن العلم بالاستحقاق لا يمنع الرجوع . (الهداية: ۴۸/۳).

وفي شرح المجلة نقلاً عن جامع الفصولين: شراه عالماً بأنه ليس لبائعه ثم استحق ، رجع بثمنه . (شرح المجلة للاتاسى : ۲/۱۶۲۴).

کرایہ کامالک مشتری اول ہی ہوگا۔ملاحظہ ہوتنقیح الفتاوی الحامدیہ میں مرقوم ہے:

سئل : فيما إذا اشترى زيد حصة من طاحونة وكانت في يده مدة ثم استحق عمرو حصة فى المبيع وطلب من المشترى غلة الحصة المستحقة فى المدة المزبورة فهل ليس له ذلک .

الجواب: نعم ؛ قال فى جواهرالفتاوىٰ من باب الخامس من البيوع : اشترى طاحونة وكانت فى يده مدة ثم استحقها مستحق فليس له أن يطالب المشترى بغلة الطاحونة ؛ لأنه ليس من أجزاء المبيع بل من كسبه وفعله .

أقـول: لا يـقـال يـنبـغـي وجـوب الأجـرة عن تلك المدة إذا كانت الطاحونة معدة للاستغلال بناء على ما أفتى به المتاخرون من وجوب أجرة المثل في غصب عقار الوقف أو اليتيم أو المعد للاستغلال ؛ لأنا نقول: قيدوا ذلک فی المعد للاستغلال بما إذا لم يسكنه بتاويل عقد أو ملک كما قدمناه في أوائل الباب الثاني من الوقف وهنا التأويل المذكور موجود ، فتنبه . (العقود الدرية فی تنقيح الفتاوی الحامدية: ۱/ ۹۱، ط:بيروت). واللّٰہ ﷻ اعلم۔

گولف ٹورنمنٹ میں کامیاب ہونے پر انعام حاصل کرنے کا حکم:

سوال: گولف ٹورنمنٹ میں میری پوزیشن آئی اور مجھے انعام ملا، میرا خیال ہے کہ انہوں نے اینٹرنس (داخلہ) فیس سے انعام خریدا تھا، کیا میرے لیے انعام لینا درست ہے یا نہیں؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ عام طور پر داخلہ فیس کے بدلہ میں کچھ کھانے پینے اور کھیلنے کی سہولیات مہیا کی جاتی ہیں، اور انعام ابتدائی تبرع ہوتا ہے، لہٰذا انعام حاصل کرنا جائز اور درست ہوگا۔

دلائل اور حوالہ جات ترتیب وار درجِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

قال فی البحر الرائق: والمسابقة بالفرس والإبل والأرجل والرمي جائزة ، لقوله: لا سبق إلا في خف أو نعل أو حافر وأذن رسول الله صلى الله عليه وسلم لسلمة بن الأكوع أن يسابق رجلاً كان لا يسابق أبداً فسبقه سلمة بن الأكوع وقال الزهري: كانت المسابقة بين أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم بالخيل والركاب والأرجل ولأن الغزاة يحتاجون إلى رياضة خيلهم وأنفسهم ، وحرم شرط الجعل من الجانبين لا من أحد الجانبين ...

ولو قال واحد من الناس لجماعة من الفرسان أو للاثنين فمن سبق فله كذا من مال نفسه أو قال للرماة من أصحاب الهدف فله كذا جاز لأنه من باب التنفيل فإذا كان للتنفيل من بيت المال كالسلب ونحوه يجوز فما ظنک بخالص ماله . (تكملة البحر الرائق: ۸/۵۵۵، مسائل شتى، ط: دار المعرفة).

وقال فی البدائع : وكذلک ما يفعله السلاطين وهو أن يقول السلطان لرجلين من سبق منكما فله كذا فهو جائز لما بينا أن ذلک من باب التحريض على استعداد إسباب

الجهاد خصوصاً من السلطان فكانت ملحقة بأسباب الجهاد . (بدائع الصنائع: ٦/٢٠٦،سعيد).

(وكذا في فتاوى الشامي: ٦/٤٠٣،سعيد،والفتاوى الهندية : ٦/٤٤٥،وتبيين الحقائق: ٦/٢٢٧، ط: امداديه).

امداد الاحکام میں مذکور ہے:

سوال: مدارس میں فیس داخلہ اور فیس ماہواری طلبہ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جائز ہے کیونکہ یہ اجرت نہیں بلکہ چندہ ہے اور چندہ میں شرط جائز ہے کیونکہ اس سے جبر لازم نہیں آتا جس کو شرط منظور نہ ہوگی اس کو عدمِ داخلہ کا اختیار ہوگا۔

ودليله أنه عليه السلام قال لمن أضافه وعائشة رضى الله تعالىٰ عنها، قال : لا، قال: فلا إذن، قال فى الثالثة وعائشة رضى الله تعالىٰ عنها قال: نعم۔(امداد الاحکام:۳/۲۰۶،ط:قدیم).

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کرنا چاہتا تھا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہاں جانے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جانے کی شرط رکھی جس کو تیسری مرتبہ میزبان نے قبول کرلیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لیجانا تبرع تھا جس کو حضرت عائشہؓ کے جانے کے ساتھ مشروط فرمایا۔

(امداد الاحکام حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نگرانی میں تحریر شدہ حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

''ماہنامہ''البلاغ'' جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ میں حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی صاحبؒ کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس میں حضرت نے فرمایا:...حقیقت میں یہ امداد الاحکام حضرت تھانویؒ کے امداد الفتاویٰ کا تتمہ ہے....البلاغ، ص۴۰)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

PIL کمپنی سے منافع حاصل کرنے کا حکم:

سوال: ہماری حکومت نے پرائیویٹ سیکٹر (private sector) کو ایک کمپنی کھولنے کا حکم دیا جس کے ذمہ باہر سے ایندھن درآمد کرنا ہے، چنانچہ اس وقت کی موجودہ ایندھن کمپنیوں (مثلاً: بی پی، اِنجن وغیرہ) نے ایک کمپنی شروع کی جس کا نام پی آئی ایل (PIL) رکھا، ہر ایندھن کمپنی پی آئی ایل (PIL) میں برابر حصہ دار ہے اور ان کے منتخب ممبران پی آئی ایل (PIL) کمپنی کے بارڈ آف دائرکٹر (Board of Directors) پر اپنی کمپنی کی نمائندگی کرتے ہیں، پی آئی ایل کمپنی ایندھن درآمد کر کے ملک کی ایندھن کمپنیوں کو ایندھن بیچ کر نفع

کماتی ہے، چونکہ بہت بڑی رقوم میں پیسوں کی لین دین ہوتی ہے اس لیے پی آئی ایل کمپنی ۴۵ دن کا فکس ڈپازٹ اکاؤنٹ میں پیسہ جمع کر کے اپنے بائع کو پیسہ ادا کرتی ہے نیز اس اکاؤنٹ میں پیسہ رکھ کر پی آئی ایل کمپنی سود بھی حاصل کرتی ہے، چنانچہ پی آئی ایل (PIL) کمپنی کا منافع ۶۰ فیصد سود سے حاصل ہوتا ہے اور ۴۰ فیصد ایندھن فروخت کر کے، نیز جن کمپنیوں کے پی آئی ایل کمپنی میں شیئرز ہیں ان کو بھی منافع دیا جاتا ہے۔ اب اس کے متعلق درج ذیل چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

۱۔ کیا ایندھن کمپنیاں پی آئی ایل کمپنی سے منافع وصول کرسکتی ہیں؟

۲۔ کیا ایندھن کمپنیوں کے لیے یہ بات درست ہے کہ ۴۰ فیصد نفع لے کر ۶۰ فیصد کسی غریب کو بلانیتِ ثواب صدقہ کردے؟

۳۔ ایندھن کمپنیوں کے دائرکٹرز کو کام کرنے کے عوض پی آئی ایل کمپنی سے الاونس (Allowance) ملتا ہے، جبکہ یہ بات معلوم نہیں ہے کہ الاونس کا کتنا حصہ حلال سے ہے اور کتنا حرام سے، کیا دائرکٹرز کے لیے یہ الاونس لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ پی آئی ایل (PIL) کمپنی کی غالب آمدنی یعنی ۶۰ فیصد حرام اور سود سے ہے اور قلیل مقدار یعنی ۴۰ فیصد حلال سے ہے، اور علما نے لکھا ہے کہ جس کمپنی کی غالب کمائی حرام ہو اس سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں الا یہ کہ نفع کی اتنی مقدار یعنی ۶۰ فیصد صدقہ کردی جائے، پھر بھی شیرز ہولڈر کے لیے لازم ہے کہ سالانہ اجلاس میں سود کے خلاف آواز اُٹھائے اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے، نیز پی آئی ایل کمپنی کو پابند کیا جائے کہ سود کے علاوہ کسی اور اکاؤنٹ میں اپنی رقوم جمع کرائے تاکہ سود سے بچیں، اگر غیر سودی اکاؤنٹ میں جمع کراتے ہیں تو تمام منافع حلال ہوں گے۔

۳۔ کسی مسلمان دائرکٹر کے لیے جائز نہیں ہے کہ سودی کمائی سے الاونس حاصل کرے، ہاں اگر معلوم ہوجائے کہ کتنا فیصد سود ہے تو پھر اتنی مقدار صدقہ کردے تو باقی حلال ہوگا، تاہم اس قسم کے معاملہ سے اجتناب اولیٰ ہے، کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ ہر قسم کے سودی معاملہ سے اجتناب کردے۔

ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم، آكل الربا وموكله وكاتبه

وشاهديه وقال: وهم سواء . (صحيح مسلم : ۲/۲۷).

فتاویٰ ہندیہ میں مرقوم ہے:

غلب على ظنه أن أكثر بياعات أهل السوق لا تخلو عن الفساد فإن كان الغالب هو الحرام يتنزه عن شرائه ولكن مع هذا لو اشتراه يطيب له المشترى شراء فاسداً إذا كان عقد المشترى الأخير صحيحاً كذا فى القنية . (الفتاوى الهندية:۳٦۴/۵).

قال الإمام الحموي: ووجهه أن كون الغالب فى السوق الحرام لا يستلزم كون المشتري حراماً ، لجواز كونه من الحلال المغلوب ، والأصل الحل . (غمزعيون البصائر شرح الأشباه والنظائر : ۱/۳۰۹).

مفتی تقی صاحب رقمطراز ہیں: شیئرز کی خرید وفروخت کے لیے چار شرطیں ہیں:

۱۔اصل کاروبار حلال ہو۔

۲۔اگر کمپنی کچھ سودی لین دین کرتی ہوتو کمپنی کی سالانہ میٹنگ میں آواز اُٹھائی جائے۔

۳۔جب منافع تقسیم ہواس وقت کا نفع جتنا حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہواس کوصدقہ کردے۔(فقہی مقالات:۱/۱۵۱)۔

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں مرقوم ہے:

آج جتنی کمپنیاں اس وقت قائم ہیں،ان میں سے اکثر کمپنیاں ایسی ہیں کہ ان کا بنیادی کاروبار تو حرام نہیں ہے،مثلاً: ٹیکسٹائل کمپنیاں ہیں،آٹوموبائل کمپنیاں ہیں،وغیرہ۔لیکن شاید ہی کوئی کمپنی ایسی ہوگی جو کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو،یہ کمپنیاں دوطریقے سے سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں:

پہلاطریقہ یہ ہے کہ یہ کمپنیاں فنڈ بڑھانے کے لیے بینک سے سود پر قرض لیتی ہیں،اوراس قرض سے اپنا کام چلاتی ہیں۔دوسراطریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے پاس جوزائداور فاضل رقم ہوتی ہے،وہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہیں،اوراس پروہ بینک سے سود حاصل کرتی ہیں،وہ سود بھی ان کی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

ایسی کمپنیوں کے بارے میں موجودہ دور کے علماء کرام کی رائیں مختلف ہیں۔علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ کمپنیاں حرام کاموں میں ملوث ہیں،لہٰذا ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کمپنی کے

ساتھ حرام کام میں حصہ دار بنے...

علماء کرام کی دوسری جماعت کا یہ کہنا ہے کہ اگر چہ ان کمپنیوں میں یہ خرابی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے تو پھر دو شرطوں کے ساتھ اس کمپنی کے شیئرز لینے کی گنجائش ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا یہی موقف ہے، اور ان دونوں حضرات کی اتباع میں، میں بھی اسی موقف کو درست سمجھتا ہوں۔ وہ دو شرطیں یہ ہیں:

ا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شیئرز ہولڈر اس کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز ضرور اُٹھائے، اگر چہ اس کی آواز مسترد ہو جائے اور میرے نزدیک آواز اُٹھانے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کی جو سالانہ میٹنگ ہوتی ہے، اس میں یہ آواز اُٹھائے کہ ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے، سودی لین دین پر راضی نہیں ہیں، اس لیے اس کو بند کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہوگی، اور یقیناً اس کی یہ آواز مسترد ہوگی، لیکن جب وہ یہ آواز اُٹھائے تو حضرت تھانویؒ کے قول کے مطابق ایسی صورت میں وہ انسان اپنی ذمہ داری پوری ادا کر دیتا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جب منافع تقسیم ہو، تو وہ شخص انکم اسٹیٹ منٹ کے ذریعہ یہ معلوم کرے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ اس کمپنی کو کل آمدنی کا ۵ فیصد حصہ سودی ڈپازٹ میں رقم رکھوانے سے حاصل ہوا ہے، تو اب وہ شخص اپنے نفع کا پانچ فیصد حصہ صدقہ کر دے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل، جلدِ سوم، ص۲۱-۲۳)۔

امداد الاحکام میں مذکور ہے:

اگر ملازم کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تنخواہ جو مجھے دی گئی ہے یہ بیع فاسد کے ثمن سے دی گئی ہے یا سود کی آمدنی سے، جب تو اس کا لینا درست نہیں، اور اگر سب مخلوط ہوا اور اس کو معلوم نہیں کہ یہ تنخواہ بیع صحیح کی قیمت سے ہے یا فاسد کی تو وہ تنخواہ حلال ہے۔ (امداد الاحکام: ۳/۵۳۳)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دارالعلوم زکریا: ۵/۲۲۴، ط: زمزم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ووڈاکوم کمپنی کی طرف سے شیک اپ (Shake Up) آفر کا حکم:

سوال: ووڈوکوم (Vodacom) کمپنی اپنی ترقی کی غرض سے موسمِ گرما (summer) میں کچھ

خاص آفر (offer) دیتی ہے، جس کا نام شیک اپ (ShakeUp) آفر ہے۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے: اس کے ذریعہ لوگوں کو ۱۰۰۱ ملین تک تحفہ حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس میں حصہ لینے کے تین طریقے ہیں: (۱) اس ایپ (Vodacom App) کو ڈاؤن لوڈ کرنے سے۔ (۲) اس کے واٹس ایپ گروپ میں شامل ہونے سے۔ (۳) ایک پرموشن والے نمبر پر سبسکرائب (subscribe) کرنے سے۔ ان تینوں طریقوں کو اختیار کرنے سے کوئی پیسہ نہیں کٹتا ہے۔ کیا اس میں شامل ہونا جائز ہے؟ بینوا بالدلیل تو جروا بالاجر الجزیل۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ مذکورہ آفر میں شامل ہونا جائز اور درست ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، یہ ایک طرفہ چیز ہے نہ اس میں قمار کا پہلو ہے اور نہ سود کا شائبہ ہے۔ ہاں اگر اس آفر کو حاصل کرنے کے لئے پیسہ لگانا پڑے اور اس کے بدلہ میں تحفہ کے ملنے یا نہ ملنے کا دارومدار ہو تو ایک طرف سے تو پیسے یقینی ہوئے اور دوسری جانب سے بدلہ مشکوک ہے، تو پھر یہ صورت قمار اور سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔

دلائل ملاحظہ ہو: **قال الله تعالىٰ: ﴿يا أيها الذين آمنوا إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلكم تفلحون﴾** [المائدة: ۹۰].

تفسير السمرقندی: وقال عطاء ومجاهد: الميسر القمار كله، حتى لعب الصبيان بالجوز والكعاب. (تفسير السمرقندی: ۱/۲۰۳).

وفی الدر المختار: حل الجعل من جانب واحد... وفی الشامية: جواز الجعل فيما ذكر استحسان. (الدرالمختار مع رد المحتار: ۶/۴۰۲).

وسمي القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرام بالنص. (۶/۴۰۳).

وفی الفتاوی الهندية: وحرم شرط الجعل من الجانبين لا من أحد الجانبين... وإذا شرط من جانب واحد بأن يقول: إن سبقتني فلك علي كذا وإن سبقتك فلا شيء لي عليك جاز استحسانا. (الفتاوی الهندية: ۶/۴۴۵).

فتاویٰ عثمانی میں ہے: اگر بچوں سے انعام یا قرعہ اندازی میں شرکت کے لیے کوئی فیس وصول نہیں کی گئی تو یہ قمار نہیں ہے، اور قرعہ اندازی تقسیم انعامات کے لیے جائز ہے۔ (فتاویٰ عثمانی: ۳/۲۴۳)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

سینما میں ملازمت کرنے اور تنخواہ لینے کا حکم:

سوال: کیا سینما میں ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یعنی سینما شروع ہونے سے پہلے اسکرین ٹھیک کرنا یا اسپیکر وغیرہ سیٹ کرنا اور اندر کے دیگر کاموں میں معاونت کرنا وغیرہ۔ کیا ایسی ملازمت جائز ہوگی؟ اور اس پر ملنے والی تنخواہ حلال ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: صاحبینؒ کے نزدیک ہر ایسی ملازمت جس میں معصیت اور گناہ کے کاموں پر تعاون ملتا ہو جائز اور درست نہیں ہے، بنابریں اس قسم کی ملازمت سے اجتناب لازم اور ضروری ہے اور تنخواہ بھی مکروہ ہوگی۔ ملاحظہ ہو قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالعُدْوَانِ﴾ لہٰذا ایسی ملازمتوں سے بچنا چاہئے اور کوئی ایسا آمدنی کا ذریعہ اختیار کیا جائے جس میں کسی قسم کی حرمت یا کراہت کا شائبہ نہ ہو۔

درمختار میں ہے: **(و) جاز تعمير كنيسة وحمل خمر ذمي بنفسه و دابته بأجر. لا عصرها لقيام المعصية بعينه... وقالا: لا ينبغي ذلک؛ لأنه إعانة على المعصية، وبه قالت الثلاثة. زيلعي . وفي حاشية ابن عابدين: قوله وجاز تعمير كنيسة) قال فى الخانية: ولو آجر نفسه ليعمل فى الكنيسة ويعمرها لا بأس به؛ لأنه لا معصية فى عين العمل. قوله (وحمل خمر لذمي) قال الزيلعي: وهذا عنده، وقالا: هو مكروه... وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية، ولا سبب لها وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار.** (الدر المختار وحاشية ابن عابدين: ۶/ ۳۹۱).

حاشیۃ الطحطاوی میں ہے:

قوله: (وجاز تعمير كنيسة) أى بالترميم لا بالإعادة بعد الهدم، وظاهره جوازه وأنهم لو استأمروا الإمام أمهم وأنه يجوز للمسلم أن يؤجر نفسه لذلک. (حاشية الطحطاوى على الدر المختار: ۴/ ۱۹۶).

البحر الرائق میں ہے: **وعلى هذا الخلاف إذا آجر دابة ليحمل عليها الخمر أو نفسه ليرعى له الخنازير فإنه لطيب له الأجرة عنده، وعندهما يكره. وفى التتارخانية: ولو أجر**

المسلم نفسه لذمي ليعمل في الكنيسة فلا بأس. (البحر الرائق:۷/۱/۲۴۱، بيروت).

محیط برہانی میں ہے: **ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيس ويعمرها فلا بأس به؛ إذا ليس في نفس العمل معصية.** (المحيط البرهاني: ۵/۳۶۲).

فتاوی عالمگیریہ میں ہے: **ولو استأجر الذمي مسلماً ليبني له بيعة أو كنيسة جاز ويطيب له الأجر.** (الفتاوى الهندية: ۴/۴۵۰)،

(وكذا في فتاوى قاضي خان على هامش الهندية: ۲/۳۲۴، والفتاوى البزازية على هامش الهندية: ۵/۱۲۵، وجواهر الفقه: ۲/۴۵۳، مسئلة الإعانة على الحرام. وإمداد الفتاوى: ۴/۳۲۲).

فتاوی دارالعلوم زکریا میں ہے: فقہائے احناف کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے، حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ اس میں تعاون علی المعصیۃ پایا جاتا ہے؛ اس لیے ایسی مزدوری سے بچنا چاہئے، جب کہ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے کام میں کوئی معصیت نہیں؛ لہذا جائز ہے۔ تاہم نہ کرنے میں احتیاط کا پہلو ہے، ہاں اگر کسی نے ایسی مزدوری قبول کر لی تو اجرت ناجائز اور حرام نہیں ہوگی۔ (زکریا: ۵/۶۲۶، ۶۳۸)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

معاوضہ دیکر ترجمہ کرانے پر ترجمہ کے حقوق کا حکم:

سوال: زید نے عمرو سے کہا کہ آپ ہمارے لیے چند کتابوں کا ترجمہ کریں، اس کے عوض آپ کو ہم رقم ادا کریں گے، یعنی ترجمہ کرنے کی اجرت دیں گے۔ عمرو تیار ہو گیا اور اجرت پر ترجمہ کیا اور زید نے اس کا معاوضہ ادا کر دیا۔ اب زید نے مطالبہ کیا کہ تمام ترجموں کی کاپیاں ہمیں دیدیں اور اس کی فائلیں اپنے کمپیوٹر سے ختم کردیں۔ لیکن عمرو کہتا ہے کہ میں ایسا نہیں کرسکتا؛ اس لیے کہ قرآن حدیث کے ترجموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا زید کا مطالبہ صحیح ہے اور عمرو انکار کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا بالدلیل۔

الجواب: جب عمرو نے اپنا کام ختم کرلیا اور پیسے بھی وصول کر لیے تو اجارہ ختم ہو گیا۔ اب وہ ترجمہ جو عمرو نے کیا وہ زید کا حق بن گیا، اور حقوق مال کی طرح ہیں۔ لہذا عمرو کے لیے اس کاپی کو رکھنا اور اس سے استفادہ کرنا، نیز اس کو آگے بیچنا یہ سب جائز نہیں ہوگا؛ اس میں زید کا نقصان ہے۔ اور زید کا یہ شرط لگانا اور یہ مطالبہ کرنا کہ وہ فائلیں ختم کرلیں، صحیح اور درست ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ فرماتے ہیں کہ مال ہونے کے لیے تین بنیادی عناصر ہیں:

(۱)اول یہ کہ وہ شرعاً مباح ہو۔ (۲)دوسرا یہ کہ وہ شئ قابل انتفاع ہو۔ (۳) تیسرا عنصر یہ ہے کہ عرف میں جس شئ کی خرید وفروخت مروج ہوجائے، وہ مال ہے۔اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فقہ کے چاروں دبستان اس پر متفق ہیں۔(جدید فقہی مسائل:۱۷۱/۴)۔

مولانا عمر عابدین قاسمی لکھتے ہیں:

پس اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ: (۱) جمہور کے نزدیک مال کے علاوہ منافع اور حقوق کی بھی خرید و فروخت ہوسکتی ہے۔ (۲)اگر بیع کے لیے مال ہونا ہی ضروری ہوتو فقہاء کی عبارتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مال میں حقوق ومنافع بھی شامل ہیں، یہ نہ صرف ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے، بلکہ حنفیہ کے یہاں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔ (۳) کسی شئ کے مال ہونے کے لیے عرف ورواج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔(۴) قابل ادخار ہونے کی کوئی ایک ہی صورت متعین نہیں، کسی چیز کا قانونی طور پر محفوظ ہوجانا بھی قابل ادخار ہونے کے لیے کافی ہے۔(حقوق اوران کی خرید وفروخت:ص ۱۴۱)۔

فتاویٰ دارالعلوم زکریا میں ہے:

سوال: حق تصنیف پر معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟۔۔۔ ناشر یا مطبع کسی موضوع پر کام کا پروجکٹ تیار کرے اوراس کے لیے اسکالرز کی خدمات حاصل کرے، نیز ان کا کوئی معاوضہ طے کردیا جائے، جواس تصنیف وتالیف، ترتیب وتحقیق یا کسی علمی کام کے بدلے دیا جائے، یہ طریقہ زیادہ تر بین الاقوامی شہرت یافتہ مطابع اور ناشرین کے درمیان مروج ہے۔

الجواب: حق تصنیف پر معاوضہ لینا جائز ہے۔سوال میں ذکرکردہ صورتوں میں سے پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں ہے،اس کا حکم وہی ہے جو امامت اور درس وتدریس کے معاوضہ کا ہے۔نیز تصنیف ناشر یا مطبع کی ملکیت ہوگی؛ کیونکہ اس نے اس عمل کی اجرت ادا کی۔(فتاوی دارالعلوم زکریا:۳۲۲/۵)۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

لمبی مدت ملازمت کرنے پر قانونی بونس لینے کا حکم:

سوال: ایک آدمی کسی کمپنی میں تقریباً ۳۵ سال سے کام کرتا تھا اب وہ اس کمپنی سے کام چھوڑنا چاہتا ہے اور حکومت کا قانون یہ ہے کہ پرانا ملازم کام چھوڑنا چاہے تو اس کو کچھ بونس دینا ضروری ہے اگر نہ دے تو وہ

بذریعہ کورٹ مقدمہ چلا کر وصول کرسکتا ہے، اب یہ شخص پوچھنا چاہتا ہے کہ کیا شرعی اعتبار سے یہ بونس ملازم کا حق ہے یا نہیں؟ یعنی کوئی مسلمان مالک کہے کہ میں نہیں دینا چاہتا تو اس کو کورٹ میں جانا چاہئے یا نہیں؟

الجواب: جب حکومت کی طرف سے بونس کا دینا حکومت کا قانون ہے اور اس کو جانبین نے قبول بھی کیا ہے تو بونس ملازم کا حق بنتا ہے اور اپنے حق کو وصول کرنے کے لئے کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہو تو شرعاً اس کی بھی اجازت ہے۔ بخاری شریف میں ہے:

حدثنا أبو نعيم حدثنا سفيان عن هشام عن عروة عن عائشة رضي الله عنها قالت هند أم معاوية لرسول الله صلى الله عليه وسلم إنّ أبا سفيان رجل شحيح فهل على جناح أن آخذ من ماله سراً قال خذي أنت وبنوک مايكفيک بالمعروف. (صحیح البخاری، رقم ۲۲۱۱)۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ انسان کو اپنا حق وصول کرنے کے لئے اگر قاضی یا بادشاہ کے پاس فریاد لے کر جانا پڑے تو اس کی بھی اجازت ہے، حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا اپنا حق وصول کرنے کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم امیر المؤمنین تھے، آپ نے ان کا مقدمہ سن کر فرمایا ''**خذى مايكفيک وولدک بالمعروف**''.

شرحِ بخاری لابن بطال میں ہے:

إن هنداً قالت: يارسول الله، إن أباسفيان رجل شحيح وليس يعطيني ما يكفيني وولدي إلا ما أخذت منه وهو يعلم فقال: (خذي مايكفيک وولدک بالمعروف) في هذا الحديث من الفقه: أنه يجوز للإنسان أن يأخذ من مال من منعه من حقه أو ظلمه بقدر ماله عنده ولا إثم عليه في ذلک لأنّ النبي صلى الله عليه وسلم أجاز لهند ما أخذت من مال زوجها بالمعروف وأصل هذا الحديث فى التنزيل في قوله تعالى: (وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به) [النحل] . (شرح صحیح البخاری: ۷/۵۴۲، مکتبۃ الرشد، ریاض)۔

سنن ابن ماجہ میں ہے:

حدثنا العباس بن الوليد الدمشقي حدثنا وهب بن سعيد بن عطية السلمى حدثنا عبد الرحمن بن يزيد بن أسلم عن أبيه عن عبد الله بن عمر قال: قال رسول الله صلى الله

عليه وسلم أعطوا الأجير أجره قبل أن يجفّ عرقه. (سنن ابن ماجه، رقم ۲۴۳۴)۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ثم الأجرة تستحق بأحد معان ثلاثة بشرط التعجيل أو بإستيفاء المعقود عليه فإذا وجد أحد هذه الأشياء الثلاثة فإنه يملكها كذا في شرح الطحاوي. (الفتاوى الهندية: ۴/۴۱۳)۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے:

اور نفقہ بقدر حالہا یعنی بین بین شوہر کے ذمہ لازم ہے اس کو وہ بذریعہ عدالت بھی لے سکتی ہے اور عورت کی طرف سے یہ چارہ جوئی کہ یا شوہر نان ونفقہ ادا کرے ورنہ طلاق دیدے موافق حکم شریعت ہے اس میں اس پر کچھ گناہ نہیں۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کبیر ج۹ص ۲۷۶ دارالاشاعت)۔

کتاب النوازل میں ہے: اگر کوئی ہمارا نقصان کرے تو بدلہ لینا کیسا ہے؟

جواب: نقصان کی شکل میں بذات خود بدلہ لینے کی بجائے قانونی طور پر بذریعہ عدالت بدلہ لینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ **قال الله تعالى: فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم** (البقرة: ۱۹۴) **وقال سبحانه تعالى: ولا تلقو بأيديكم إلى التهلكة وأحسنوا إن الله يحب المحسنين.** (البقرة: ۱۹۵)۔ (کتاب النوازل ج۱۷ص ۵۰۷، ط: المرکز العلمی مرادآباد)۔ **واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔**

جائیداد نام پر کرانے کی فیس سودی رقم سے ادا کرنے کا حکم:

سوال: جب کوئی شخص جائیداد خریدتا ہے تو جائیداد کو اپنے نام کرانے کی فیس ''ساؤتھ افریقن ریوینیو سروس'' کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ کیا جائیداد منتقل کرنے کی فیس سودی رقم سے ادا کی جاسکتی ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: سودی رقم کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ اصل مالک کو واپس کی جائے جب مالک معلوم ہو اور اگر مالک کا علم نہ ہو اور پتا لگانا بھی دشوار یا ناممکن ہو تو اس کی طرف سے فقراء ومساکین پر صدقہ کردی جائے، چنانچہ صورتِ مسئولہ میں درجِ ذیل دو وجوہات کی بنا پر سودی رقم فیس میں ادا کرنا جائز نہیں:

(۱) عام طور پر جنوبی افریقہ کے بینک حکومتی اور سرکاری نہیں ہیں، بلکہ پرائیویٹ اور خانگی ہوتے ہیں، تو ایک بینک سے رقم لے کر دوسرے بینک میں نہیں دے سکتے۔ (۲) سودی رقم سے کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اور صورتِ مسئولہ میں جائیداد نام پر کرانے کا فائدہ حاصل ہورہا ہے، لہٰذا یہ ناجائز ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

إذا علم المالک بعینه فلا شک في حرمته ووجود رده علیه. (باب البیع الفاسد: سعید).

معارف السنن میں ہے:

قال شیخنا: ویستفاد من کتب فقهائنا کالهدایة وغیرها أن من ملک بملک خبیث ولم یمکنه الرد إلی المالک فسبیله التصدق علی الفقراء. قال: ومثله یقول ابن القیم في "بدائع الفوائد"... قال: والظاهر أن المتصدق بمثله ینبغي أن ینوي به فراغ ذمته، ولا یرجو به المثوبة . (معارف السنن: ۱/۳۴، ۳۵، سعید).

بذل المجہود میں ہے:

وأما إذا کان عند رجل مال خبیث، فأما إذا ملکه بعقد فاسد أو حصل له بغیر عقد ولا یمکنه أن یرد إلی مالکه ویرید أن یدفع مظلمته فلیس له حیلة إلا أن یدفع إلی الفقراء. (بذل المجهود: ۱/۳۷).

مزید ملاحظہ فرمائیں: (نظام الفتاوی: ۱/ ۱۸۵، وکتاب الفتاوی: ۵/ ۳۱۸، ۳۱۹، وجدید معاملات کے شرعی احکام: ۱/۱۶۳، وجدید فقہی مسائل: ۱/۲۵۲، وفتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۱۰، وفتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/۴۱۲)۔ **واللہ ﷻ اعلم۔**

باپ کے انتقال کے بعد بچوں کے مال میں تصرف کا حکم:

سوال: ایک آدمی کا انتقال ہوگیا، اور ان کے نابالغ بچے ہیں۔ ان بچوں کی ماں ہے اور چچا وغیرہ بھی موجود ہیں، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ اب ان بچوں کی پرورش اور ولایت وغیرہ کا حق کس کو حاصل ہوگا؟

الجواب: بصورتِ مسئولہ نابالغ بچوں کی پرورش دیکھ بھال وغیرہ کا حق ماں کو حاصل ہے۔ اصل قاعدہ یہ ہے کہ صغیر کے مال میں تجارت اور تصرفات کا حق صرف ولی کو حاصل ہے اور مال میں تصرف کا ولی صرف باپ ہے پھر اس کا وصی، پھر دادا، پھر اس کا وصی پھر قاضی ہے۔

فی زماننا چونکہ قاضی وغیرہ کا نظام نہیں ہے اور اصل ولایت کی علت وفورِ شفقت ہے اور ماں میں یہ بدرجہ اتم موجود ہے لہٰذا ماں زیادہ حقدار ہوگی، ہاں اگر ماں معذرت کردے یا حفاظت کا صحیح انتظام نہ کرسکے تو پھر چچا کو حق دیا جاسکتا ہے تاکہ بچوں کے اموال کو ضائع ہونے سے بچاتے ہوئے احتیاط کے ساتھ بچوں کی ضروریات پر خرچ

کریں۔ ملاحظہ فرمائیں درمختار مع ردالمحتار میں مرقوم ہے:

(الوالي في النكاح) لا المال(العصبة بنفسه) وفي الشامي:(قوله لا المال) فإنه الولي فيه الأب ووصيه والجد ووصيه والقاضي ونائبه فقط. (فتاوى الشامي:۳/۷۶،ط:سعيد).

وفيه أيضاً: أن الولاية في المال الصغير لأبيه، ثم لوصي الأب، ثم للجد، ثم لوصيه، ثم للقاضي ...الخ. (الدر المختار: ۶/۱۷۷،ط:سعيد).

وقال في شرح بلوغ المرام: في شرح هذه الجملة " نعم ولك أجر"...: وأن الولي في المال هو الأب فقط وعلى هذا فلو مات رجل عن أطفال صغار ولهم أم وخلف مالاً فمن يتولى ما لهم ؟ المشهور من المذهب أن الولاية هنا للحاكم يذهب إلى القاضي، وكل من ترى، والقول الثاني يقول: الولاية هنا للأم ؛ لأنَّ لدى الأم من الشفقة مثل ما لدى الأب أو أكثر...الخ. (شرح بلوغ المرام:۳/۳۳۴،ط:المكتبة الإسلامية للنشر والتوزيع).

وفي تبيين الحقائق: وقوله في غير الأب والجد يتناول الأم والقاضي حتى إذا زوجهما القاضي والأم يثبت لهما الخيار؛لأن ولاية الإلزام تبنى على الرأي الكامل والشفقة الوافرة، والموجود في كل واحد منهما أحد هما، و عن أبي حنيفة أنه لا يثبت لهما الخيا ر؛ لأن ولاية القاضي تامة؛لأنها تعم المال والنفس، وشفقة الأم فوق شفقة الأب فكانا كالأب.
(تبيين الحقائق: ۲/۱۲۳،المطبعة الكبرى الأميرية).

وفي الفتاوى البزازية: أحق الناس بالولد حال قيام النكاح وبعد الفرقة الأم فإن ماتت أو تزوجت بأجنبي..الخ. (الفتاوى البزازية: ۲/۳۲). واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

امارات لوٹو (Emirates lotto) سے انعام حاصل کرنے کا حکم:

سوال: کیا امارات لوٹو (Emirates lotto) میں حصہ لینا اور اس سے انعام حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امارات لوٹو کا طریقہ کار یہ ہے کہ امارات والے کچھ مخصوص کارڈ بنا کر ۳۵ درہم میں فروخت کرتے ہیں، جو خریدتا ہے وہ لوٹو میں حصہ دار بن سکتا ہے، پھر ۴۹ نمبرات میں سے ۶ نمبر متعین کرنے ہوں گے، پھر ۴۹ گینڈ جس پر ۴۹ نمبرات مرقوم ہوتے ہیں لوٹو مشین (Lotto machine) میں گھماتے ہیں اور چھ نمبر نکالتے ہیں

پس جس کے نمبر چھ کے بالکل موافق ہوگئے، اس کو بڑا انعام (jackpot) ملتا ہے، اگر کسی کے پانچ نمبر موافق ہوئے تو وہ دوسرے نمبر کا انعام حاصل کرتا ہے، اگر ۴ نمبر موافق ہوئے تو تین سو درہم ملتے ہیں، اور اگر تین موافق ہوئے تو اگلے کھیل میں مفت داخلہ ملتا ہے، کارڈ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ملک بھر کی ۱۹۰۰۰ جگہوں سے کہیں سے بھی خرید سکتے ہیں، اور کارڈ کے خریدنے پر لوٹو میں حصہ دار بن سکتا ہے ورنہ نہیں؟ اب شرعی نقطہ نظر سے اس لوٹو کا کیا حکم ہوگا؟ برائے مہربانی مطلع فرما کر اجرِ عظیم کے مستحق ہو۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ کارڈ بنا کر فروخت کرنا لاٹری کو عروج دینے کی وجہ سے ہے، تاکہ انعام کی لالچ میں زیادہ سے زیادہ لوگ شرکت کریں، پھر کارڈ خریدنے والا بھی انعام کی غرض سے کارڈ خریدتا ہے، اور ایک جانب تو رقم کی ادائیگی یقینی ہوئی اور دوسری جانب مشکوک ہے، اس کو بنگاہِ شریعت قمار کہا جاتا ہے، جو کہ نص قطعی سے حرام اور ناجائز ہے، لہٰذا اس سے بالکل اجتناب کرنا لازم اور ضروری ہے۔

ملاحظہ ہو قرآنِ کریم میں ہے:

قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان فاجتنبوه، لعلكم تفلحون﴾ [المائدة: ۹۰]،

قال في تفسير السعدى: وأما الميسر فهو كل المغالبات التي يكون فيها عوض من الطرفين. (ص ۹۸، ط: الرسالة).

وأخرج الإمام أحمد في مسنده عن عبد اللّٰه بن عمرو ﷺ، قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إن اللّٰه حرم على أمتي الخمر والميسر. (مسند أحمد، رقم: ۶۵۴۷).

قال في قواعد الفقه: القمار: مصدر قامر، هو كل لعب يشترط فيه غالباً أن يأخذ الغالب شيئاً من المغلوب وأصله أن يأخذ الواحد من صاحبه شيئاً فشيئاً فى اللعب ثم عرفوه بأنه تعليق الملك على الخطر والمال فى الجانبين. (قواعد الفقه، ص ۴۳۴).

وقال في تبيين الحقائق: وسمى القمار قماراً لأن كل واحد من المقامرين ممن يجوز أن يذهب ماله إلى صاحبه، ويجوز أن يستفيد مال صاحبه فيجوز الازدياد والانتقاص فى كل واحد منهما فصار قماراً. (تبيين الحقائق: ۶/۲۲۷، امداديه).

مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں:

غرر کی ایک صورت جس کو فقہاء کرام نے تعلیق الملک علی الخطر ، سے تعبیر فرمایا ہے کہ عقود معاوضہ میں تملیک کو کسی خطرہ پر معلق کرنا۔۔۔اسی کا ایک شعبہ قمار ہے، قمار یعنی جوا یا میسر اس میں ایک طرف سے تو ادائیگی یقینی ہو اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہو۔۔۔تو جتنی بھی لاٹریاں ہمارے زمانے میں مشہور ہیں۔۔۔یہ قمار ہے، تعلیق الملک علی الخطر ، ہے اور غرر کا ایک شعبہ ہے جو حرام ہے۔(اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴/۷۶، ادارۂ اسلامیات)۔ مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا، جلدِ پنجم)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

آئی ڈی کارڈ استعمال کرنے کی اجرت لینے کا حکم:

سوال: کیا دوسرے کے آئی ڈی کارڈ پر اپنے لیے گاڑیاں منگا کر اس کو آئی کارڈ کی اجرت دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز لینے والے کے لیے اس اجرت کا لینا حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب: عام طور پر ایسے معاملہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ا۔کسی کے شناختی کارڈ کو اپنا شناختی کارڈ بتا کر کوئی چیز حاصل کرنا، یہ صورت ناجائز ہے، اس میں دھوکا دہی ہے۔

۲۔ خریدار شناختی کارڈ کے مالک کو وکیل بالشراء بنادے کہ آپ میرے لیے گاڑی خرید لے میں آپ کو اتنی رقم ادا کردوں گا، تو یہ صورت جائز ہے، اور وکیل بالشراء کا اجرت مقرر کر کے لینا جائز اور درست ہے۔

اسلام میں دھوکا دہی ممنوع اور ناجائز ہے۔ ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مر على صبرة طعام فأدخل يده فيها فنالت أصابعه بللاً ، فقال: ما هذا يا صاحب الطعام ، قال: أصابته السماء يارسول الله ! قال: أفلا جعلته فوق الطعام كي يراه الناس، من غش فليس مني. (رواه مسلم، رقم: ۱۰۲).

دستور العلماء میں مذکور ہے:

الوكالة...وفى الشرع تفويض التصرف في أمر شرعي إلى غيره أى إقامة الغير مقام نفسه فى التصرف ممن يملك التصرف ، والوكيل: هو الذي فوض إليه التصرف بإقامة المفوض أى الموكل إياه مقام نفسه فى التصرفات . (دستور العلماء: ۳/۳۲۱).

وفى التعريفات الفقهية : والوكالة ، وهي شرعاً تفويض أحد أمره لآخر وإقامته مقامه

ویقال لذلک الشخص موکل ولمن أقامه وکیل والأمر موکل به . (التعریفات الفقهیة، ص ۵۴۶).

اسلامی فقہ میں مذکور ہے:

وکالت دوقسم کی ہوتی ہے، ایک خاص ایک عام، خاص کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کسی سے کہا کہ آپ اتنے روپے میں میرے لیے موٹر خرید دیجئے ۔۔۔ پھران دونوں کی دوقسمیں ہیں، ایک بااجرت دوسرے بے اجرت دونوں کے احکام یکساں ہیں۔ (اسلامی فقہ: ۲/۶۴)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

پراپرٹی میں شراب کی دکان کے کرایہ کاحکم:

سوال: ایک شخص نے ایک پراپرٹی خریدی جس میں پہلے سے شراب کی دکان تھی، اب جب تک عقدِ اجارہ ختم نہیں ہوتا وہاں تک شراب بیچنے والے کو نکال نہیں سکتے، ہاں عقدِ اجارہ ختم ہونے کے بعد وہ نکل جائے گا، کیا اس دوران اس دکان کا کرایہ وصول کرنا اور استعمال کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ بینوا تو جروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر شراب فروخت کرنے والا مسلمان ہے تو کرایہ مکروہِ تحریمی اور واجب التصدق ہوگا، اور اگر غیر مسلم ہو تو مکروہِ تنزیہی ہوگا، استعمال کرنا مرخص ہے، البتہ تصدق افضل اور بہتر ہے۔

ملاحظہ ہو البحر الرائق میں مرقوم ہے:

وإجارة بیت لیتخذ بیت نار أو بیعة أو کنیسة أو یباع فیه خمر بالسواد ، یعنی جاز إجارة البیت لکافر لیتخذ معبداً أو بیت نار للمجوس أو یباع فیه خمر فی السواد وهذا قول الإمام ، وقالا: یکره کل ذلک لقوله تعالیٰ: وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان . (تکملة البحر: ۸/۲۳۰).

احسن الفتاویٰ میں مذکور ہے:

بندہ کے خیال میں اجارہ من الکافر اور اجارہ من المسلم میں فرق ہے، عباراتِ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کافر سے متعلق ہیں اور اس میں درایۃً وروایۃً کراہتِ تنزیہیہ کو ترجیح معلوم ہوتی ہے اور اجارہ من المسلم میں کراہتِ تحریمیہ راجح معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم۔ (احسن الفتاویٰ: ۶/۴۵۶)۔ واللہ ﷻ اعلم۔

ایمیزون ای بائی ویپ سائٹ پر تجارت کرنے کا حکم:

سوال: آج کل انٹرنیٹ پر تجارت کی ایک خاص ویپ سائٹ ہے جس کو ایمیزون ای بائی ویب سائٹ کہتے ہیں، طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مشتری اس ویب سائٹ سے سامان خریدتا ہے، اور تیسرے آدمی کو بیچتا ہے، جبکہ سامان اس ویب سائٹ والوں کے پاس بھی نہیں ہوتا، آڈر ملنے کے بعد تیار کیا جاتا ہے، یعنی ایسا سامان جو قبضہ اور ملک میں نہیں، کیا ایسی تجارت جائز ہوگی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اس ویب سائٹ سے درجِ ذیل دو وجوہات کی بنا پر تجارت جائز نہیں ہے:

۱۔مبیع کے معدوم ہونے کی وجہ سے، کیونکہ بہت سی مرتبہ آڈر ملنے بعد مبیع تیار کی جاتی ہے۔

۲۔بیع قبل القبض ہونے کی وجہ سے یعنی کسی چیز کو اپنے قبضہ میں آنے سے پہلے فروخت کرنا۔

ہاں اگر بائع مشتری کے ساتھ بیع سلم کا معاملہ کرے اور شرائطِ سلم موجود ہوں تو بیع صحیح ہوگی، پھر مشتری اول مشتری ثانی کے ساتھ وعدہ کرے تو یہ معاملہ صحیح ہوگا۔

مذکورہ بالا معاملہ کی صحت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بائع اول بھی مشتری اول کے ساتھ وعدہ کرے، اور سامان تیار ہوجائے پھر بیع کرے تو یہ معاملہ صحیح ہوجائیگا۔ ملاحظہ ہو مسلم شریف کی روایت میں ہے:

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ، قال: كنا في زمان رسول الله صلى الله عليه وسلم نبتاع الطعام، فيبعث علينا من يأمرنا بانتقاله من المكان الذي ابتعناه فيه، إلى مكان سواه، قبل أن نبيعه.

(رواه مسلم: ۵/۲،باب بطلان البيع قبل القبض).

بیع معدوم کے متعلق علامہ ابوبکر کاسانی بدائع الصنائع میں فرماتے ہیں:

وأما الذي يرجع إلى المعقود عليه فأنواع؛ منها: أن يكون موجوداً فلا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كبيع نتاج النتاج بأن قال: بعت ولد ولد هذه الناقة وكذا بيع الحمل لأنه إن باع الولد فهو بيع المعدوم وإن باع الحمل فله خطر المعدوم وكذا بيع اللبن فى الضرع لأنه له خطر لاحتمال انتفاخ الضرع. (بدائع الصنائع: ۱۳۸/۵،سعيد).

(وكذا فى ردالمحتار: ۵۰۵/۴، سعيد).

فقہی مقالات میں مرقوم ہے:

شرعی احکام کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ جس چیز کو فروخت کر رہے ہیں وہ وجود میں آ چکی ہو، اور وہ چیز آپ کی ملکیت میں ہو، اور آپ کے قبضہ میں بھی ہو، البتہ چاہے اس پر حقیقی قبضہ ہو یا حکمی وعرفی قبضہ ہو۔ (فقہی مقالات:۳/۷٦)۔

بیع قبل القبض کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں: حدیث شریف میں ہے:

عن عبد اللّٰہ بن دینار قال: سمعت ابن عمرؓ یقول: قال النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم: من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یقبضه . (رواه البخاری، رقم: ۲۱۳۳).

وعن ابن عباسؓ: أن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یستوفیه، قال ابن عباسؓ: وأحسب کل شيء مثله .

(رواه الترمذی، رقم: ۱۲۹۱، باب ماجاء فی کراهیة بیع الطعام حتی یستوفیه).

محقق ابن ہمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

خص الطعام بالنهي في حدیث رواه مالک...قلنا: قد رواه ابن عباسؓ أیضاً قال: وأحسب کل شيء مثل الطعام أخرجه عنه ائمة الکتب الستة وعضد قوله ماروی أبوداود عن ابن إسحاق إلی ابن عمرؓ قال: ابتعت زیتاً فی السوق، فلما استوجبته لقیني رجل فأعطاني فیه ربحاً حسناً فأردت أن أضرب علی یده فأخذ رجل من خلفي بذراعی فالتفت فإذا زید بن ثابت ؓ فقال: لا تبعه حیث ابتعه حتی یحوزها التجار إلی رحالهم ورواه ابن حبان في صحیحه والحاکم فی المستدرک وصححه وقال فی التنقیح سنده جید وقال ابن إسحاق صرح فیه بالتحدیث وأخرج النسائی أیضاً فی سننه الکبری عن یعلیٰ بن حکیم عن یوسف بن ماهک عن عبد اللّٰہ بن عصمة عن حکیم بن حزام قال: قلت: یارسول اللّٰہ إني رجل ابتاع هذه البیوع وأبیعها فیما یحل لي منها وما یحرم، قال: لاتبیعن شیئاً حتی تقبضه ورواه أحمد في مسنده وابن حبان وقال هذا الحدیث مشهور...فالحق أن الحدیث حجة ... ثم علل الحدیث لأن فیه غرر انفساخ العقد الأول علی اعتبار هلاک المبیع قبل القبض فتبین حینئذٍ أنه باع ملک الغیر بغیر إذنه وذلک مفسد للعقد وفی الصحاح أنه صلی اللّٰہ

عليه وسلم نهى عن بيع الغرر والغرر ما طوى عنك علمه ... (فتح القدير: ٦/ ١١٥، دارالفكر).

تکملہ فتح الملہم میں ہے:

إن العلة في النهي عن بيع المبيع قبل القبض هي أنه يستلزم ربح ما لم يضمن وإنما يضمن الإنسان ما يخاف فيه الهلاك وأما العقار فلا يخشى فيه ذلك إلا نادراً حتى لو كان العقار على شط البحر كان المبيع علواً لايجوز بيعه قبل القبض .(تكملة فتح الملهم : ١/ ٣٥٣).

مزید ملاحظہ ہو: (نئے مسائل اور علمائے ہند کے فیصلے، ص ۱۰۶، واحسن الفتاویٰ: ۶/ ۵۲۵)۔

شرائطِ سلم کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (الہدایۃ: ۳/ ۹۵)۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

قرض خواہ کا مدیون کو نفع پر قرض دینے کا حکم:

سوال: بعض ممالک مثلاً: جاپان، ڈینمارک وغیرہ کے بینکوں میں ایک طریقہ چلا تھا، اس کا خلاصہ اور ماحصل یہ ہے کہ جب عام بینکوں کی رقوم مرکزی بینک میں زیادہ جمع ہوجاتی ہیں تو مرکزی بینک کو اس کا کچھ فیصد مثلاً: 0.1% ادا کرنا ہوتا ہے، مثلاً: ۱۰ ملین پر ۱۰ ہزار اور یہ زیادہ رقم ہے، لہٰذا بینک والے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ قرض لینے پر ترغیب دیتے ہیں اور واپسی میں کم ادا کرنا ہوتا ہے، مثلاً: ایک ہزار قرض لیا ہو تو ۹۹۰ ادا کرنے ہیں ۱۰ رینڈ بینک معاف کردیتا ہے۔ کیا یہ طریقہ جائز ہے اور قرض لینے پر کوئی گناہ تو نہیں ہوگا؟ بینوا توجروا۔

الجواب: پہلے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ سودی قرض بنگاہِ شریعت حرام اور ناجائز ہے، اور سودی قرض کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ قرض دے کر اس پر مدیون سے مزید وصول کرے، یعنی مال کی مشروط زیادتی جو کسی چیز کا عوض نہ ہو، لیکن صورتِ مسئولہ میں قرض خواہ مدیون کے قرض میں سے کچھ حصہ معاف کر رہا ہے یہ احسان ہے یعنی جو بھی بینک سے قرض لیگا اس کے قرض سے کچھ فیصد معاف کردیا جائے گا، یہ تبرع، احسان اور صلح کے قبیل سے ہے اور یہ جائز ہے۔ ملاحظہ فرمائیں؛ فتاویٰ شامی میں ہے:

لأن الصلح عن بعض الدين أخذ لبعض حقه وإبراء عن الباقي . (الدرالمختار مع رد المحتار: ٥/ ٣٢٠، سعيد).

وفي تبيين الحقائق: باب الصلح في الدين ؛ قال: الصلح عما استحق بعقد المداينة أخذ لبعض حقه وإسقاط للباقي لا معاوضة ، هكذا ذكر في نسخ هذا المختصر بقوله عما

استحق، وهذا سهو، لأنه إذا صالح عن الدين لا يكون جميع صورة استيفاء لبعض حقه وإسقاطاً للباقي، وإنما يكون كذلک إن لو وقع الصلح عن الدين على بعض الدين ألا ترى أنه لو وقع عن الدين بجنس آخر يحمل على المعاوضة والصواب أن يقال الصلح على ما استحق بعقد المداينة ، الخ، فإنه يكون أصلاً جيداً لا يرد عليه نقض وهكذا ذكر القدوری، وكل في مختصر القدوری بقوله شيء وقع عليه الصلح وهو مستحق بعقد المداينة لم يحمل على المعاوضة ، وإنما يحمل على أنه استوفى بعض حقه وأسقط باقيه وذكر بعضهم أن الإحسان متى وجد من أحد الجانبين يكون تبرعاً . (تبيين الحقائق، مع حاشية الشلبی : ۴۱/۵، الكبرى الاميرية).

ہاں اگر معاملہ برعکس ہے یعنی قرض خواہ نے قرض پر نفع اپنے لیے مشروط کیا ہے تو یہ ربا ہے۔اور ” كل قرض جر نفعاً فهو ربا “ کے تحت داخل ہو کر حرام ہوگا۔ملاحظہ ہو علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

قوله كل قرض جر نفعاً حرام ، أى إذا كان مشروطاً كما علم مما نقله عن البحر، وعن الخلاصة وفی الذخيرة وإن لم يكن النفع مشروطاً فی القرض فعلى قول الكرخی لا بأس به . (الدرالمختارمع ردالمحتار: ۱۶۶/۵،سعيد).

لیکن بلا وجہ قرض لینے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ قرض کوئی اچھی چیز نہیں ہے،اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض کے بارے سے پناہ مانگی ہے۔ملاحظہ ہو حدیث شریف میں ہے:

عن عروة بن الزبير ، أن عائشة زوج النبی صلى الله عليه وسلم أخبرته ، أن النبی صلى الله عليه وسلم كان يدعو فی الصلاة : اللّٰهم إني أعوذ بک من عذاب القبر ، وأعوذ بک من فتنة المسيح الدجال وأعوذ بک من فتنة المحيا والممات ، اللّٰهم إني أعوذ بک من المأثم والمغرم ، قالت: فقال له قائل:ما أكثر ما تستعيذ من المغرم يا رسول اللّٰه ، فقال: إن الرجل إذا غرم حدث فكذب ووعد فأخلف . (رواه مسلم ،رقم: ۵۸۹).

وفي سنن الترمذی: عن أبي هريرةؓ عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال: نفس المؤمن معلقة بدينه حتى يقضى عنه ، هذا حديث حسن وهو أصح من الأول . (رواه

الترمذی، رقم: ۱۰۷۹). واللہ ﷻ اعلم۔

سیٹلمنٹ ڈسکاؤنٹ کا حکم:

سوال: کیا سیٹلمنٹ ڈسکاؤنٹ (settlement discount) جائز ہے یا نہیں؟ یعنی بائع مشتری سے یہ کہے کہ اگر آپ ۳۰ دن کے اندر پیسے ادا کردیں گے تو میں آپ کو ۲ فیصد رعایت دوں گا، اور اگر ۳۰ دن کے بعد ادا کیا تو پوری رقم ادا کرنی ہوگی۔ بینوا توجروا۔

الجواب: بصورتِ مسئولہ اگر ابتدا میں ایسی شرط لگائی تو یہ معاملہ جائز نہیں ہوگا، ہاں بغیر شرط کے صلح کرلے تو اس کی گنجائش ہے، کہ دائن نے کم کرکے مدیون پر احسان کیا اور مدیون نے جلدی ادا کرکے دائن پر احسان کیا، اسی طرح ابتداءً عقد میں شرط نہ لگائے بلکہ وعدہ کرلے تو بھی گنجائش ہے۔

ملاحظہ ہو فتاویٰ شامی میں ہے:

وذكر في شرح الكافي للاسبيجابي جواز هذا الصلح مطلقاً على قياس قول أبي يوسف رحمه الله لأنه إحسان من المديون في القضاء بالتعجيل وإحسان من صاحب الدين في الاقتضاء بحط بعض حقه وحسن هذا إذا لم يكن مشروطاً في الآخر، وأما إذا شرط أحدهما في مقابلة الآخر فدخل في الصلح معاوضة فاسدة فيكون فاسداً، وهكذا في غاية البيان. (ردالمحتار: ۲۵۳/۲، سعید).

قال في العناية: ومن له على آخر ألف درهم، ومن له ألف درهم حالة فقال: أد إلي غداً منها خمسمائة على ذلك بريء من الفضل ففعل فهو بريء. (العناية: ۴۳۳/۶).

وفي أحكام القرآن للجصاص:

ومن أجاز من السلف إذا قال: عجل لي واضع عنك فجائز أن يكون أجازوه إذا لم يجعله شرطاً فيه وذلك بأن يضع عنه بغير شرط ويعجل الآخر الباقي بغير شرط. (احکام القرآن: ۴۶۷/۱).

بدایۃ المجتہد میں ابن رشد قرطبی مالکیؒ فرماتے ہیں:

أما ضع وتعجل: فأجازه ابن عباس رضي الله عنه من الصحابة وزفر من فقهاء الأمصار، ومنعه

جماعة منهم ابن عمر رضي الله عنه من الصحابة ، ومالک وأبو حنيفةؒ ، والثوری ، وجماعة من فقهاء الأمصار، واختلف قول الشافعي في ذلک ، فأجاز مالک ، وجمهور من ينكر: ضع وتعجل أن يتعجل الرجل فی دينه المؤجل عرضاً يأخذه ، وإن كانت قيمته أقل من دينه ، وعمدة من لم يجز ضع وتعجل. أنه شبيه بالزيادة مع النظرة المجتمع على تحريمها ووجه شبهه بها أنه جعل للزمان مقداراً من الثمن بدلاً منه فی الموضعين جميعاً وذلک أنه هنالک لما زاد له فی الزمان زاد له عرضه ثمناً وهنا لماحط عنه الزمان حط عنه فی مقابلته ثمناً وعمدة من أجاز ما روی عن ابن عباس رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم لما أمر بإخراج بنی النضير جاءه ناس منهم فقالوا يانبی الله إنک أمرت بإخراجنا ولنا على الناس ديون لم تحل، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ضعوا وتعجلوا . فسبب الخلاف معارضة قياس الشبه لهذا الحديث . (بداية المجتهد : ۲/ ۱۴۴،ط:مصر).

اسلام اور جدید معاشی مسائل میں مرقوم ہے:

دین مؤجل اگر جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑ نا اس وقت جائز ہے جب یہ چھوڑ نا تعجیل کے لیے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کر دے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو، تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل:۳/ ۱۱۷)۔

ربا اور اس عقد میں چند اعتبار سے فرق ہے:

۱۔ ربا میں مدیون پر ظلم ہے اور ضع وتعجّل میں مدیون پر احسان ہے۔

۲۔ عقدِ ربا زیادتِ دین کا ذریعہ ہے اور ضع وتعجّل میں دین کا اسقاط ہے، یعنی ایک لاکھ کچھ مدت کے بعد دو لاکھ بن جائے گا اور ضع وتعجّل میں ایک لاکھ پچاس ہزار بن گیا۔

۳۔ ربا میں مدیون پر مزید بوجھ ڈالنا ہے اور ضع وتعجّل میں بوجھ ہلکا کرنا ہے۔

۴۔ عقدِ کتابت میں احناف اور حنابلہ کے ہاں ضع وتعجّل جائز ہے جبکہ وہ بھی دین ہے۔

ہاں اگر عقد میں مشروط ہو تو اصلاً یہ معاملہ جائز نہیں ہے۔

قال فی الدرالمختار: ولا يصح الصلح عن دراهم على دنانير مؤجلة أو عن ألف

مؤجل على نصفه حالاً لأنه اعتياض عن الأجل وهو حرام . (الدرالمختار: ۵/ ۲۴۰،سعيد).

وقال فى الهداية: ولو كانت له ألف مؤجلة فصالحه على خمسمائة حالة لم يجز ، لأن المعجل خير من المؤجل وهو غير مستحق بالعقد فيكون بإزاء ما حطه عنه، ذلك اعتياض عن الأجل و هو حرام. (الهداية : ۳/ ۲۵۱). (وكذفى الجوهرة النيرة:۳/ ۲۴۶،موقع الاسلام ، و دررالحكام شرح مجلة الاحكام: ۴/ ۴۴، ومجمع الانهر فى شرح ملتقى الابحر: ۳/ ۴۳۴،ط:بيروت).

مزید ملاحظہ ہو: (فتاویٰ دار العلوم زکریا:۵/ ۵۱۶)۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

بحمد اللہ تمّ

مصادر ومراجع

فتاوی دارالعلوم زکریا جلدِ نہم (۹)

القرآن الکریم تنزیل من رب العلمین

الف

إمداد الفتاح شرح نور الإیضاح للفقیه حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی ،۱۰۶۹ھ بیروت
آپ کے مسائل اوران کاحل مولانامحمد یوسف لدھیانویؒ شہادت ۱۴۲۱ھ مکتبہ لدھیانوی
الأبواب والتراجم حضرت شیخ مولانامحمد زکریاؒ ایچ ایم سعید کمپنی
الاختیار لتعلیل المختار للفقیه عبد الله بن محمود الموصلی دارالکتب العلمیة بیروت
الاستذکار للشیخ ابی عمر یوسف بن عبدالله بن محمد بن عبد البر النمری القرطبی
اسنی المطالب فی شرح روض الطالب لشیخ الاسلام ابی یحیی زکریا الانصاری دارالکتب العلمیة بیروت
آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام حضرت مفتی محمد شفیعؒ کراچی
إعانة الطالبین للشیخ ابی بکر عثمان بن محمد التوفیقیة
احسن الفتاویٰ حضرت مولانامفتی رشید احمدؒ ایچ ایم سعید کمپنی
احکام القرآن للشیخ ابی بکر محمد بن عبد الله ابن العربی دار الفکر
اوجز المسالک شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا المهاجر المدنیؒ مکتبه امدادیه ملتان
امدادالفتاویٰ حکیم الامت مولانااشرف علی تھانوی مکتبہ دارالعلوم کراچی
الاذکار للامام ابی زکریا محی الدین بن شرف النووی و ۶۳۱ت ۶۷۶، دار الکتب العربیه بیروت
احیاء علوم الدین للامام ابی حامد محمد بن محمد الغزالی ت ۵۰۵ھ ، دار الفکر
امدادالاحکام حضرت مولاناظفراحمد عثمانی ومفتی عبدالکریم گمتھلویؒ مکتبہ دارالعلوم کراچی
اسلامی فقہ مولانامجیب اللہ ندوی لاہور
آثار السنن للعلامة محمد علی النیموی ت ۱۳۲۲ صدیقیه کتب خانه
اعلاء السنن للشیخ ظفر احمد العثمانی التهانویؒ ادارة القرآن کراچی
الأشباه و النظائر للامام زین الدین بن ابراهیم ابن نجیم الحنفی ت ۹۷۰ ادارة القرآن کراچی

امداد المفتین　حضرت مفتی محمد شفیع ۱۳۱۴ھ-۱۳۹۶ھ　دارالاشاعت
انجاح الحاجة حاشية ابن ماجه　للشيخ عبد الغنى المجددى الدهلوى ۱۲۹۵، قديمى كتب خانه
ارشاد السارى الى مناسک الملا على القارى　للشيخ حسين بن محمد المكى الحنفى　بيروت
احکام القرآن　حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ
اہم فقہی فیصلے　حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ　ادارۃ القرآن
ایضاح المسائل　مفتی شبیر مرادآبادی صاحب
ایضاح النوادر　مفتی شبیر مرادآبادی صاحب
احكام القرآن　للامام ابى بكر الجصاص الرازى　سهيل
احكام القرآن　حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ　ادارة القرآن
الاوسط　للشيخ ابى بكر محمد بن ابراهيم بن المنذر النيسابورى
اقتضاء الصراط المستقيم　للعلامة احمد بن عبد الحليم ابن تيميةؒ　مكتبة الرشد الرياض
الاكمال　للامام الحافظ ابن ماكولا　دار الكتاب الاسلامى
اخبارمكة　للشيخ ابى عبد الله محمد بن اسحاق المكى الفاكهى
احکام اسلام عقل کی نظر میں　حکیم الامت حضرت تھانویؒ
الاحوال الشخصية　للشيخ محمد قدرى باشا
الاستيعاب فى معرفة الاصحاب　للشيخ ابى عمر يوسف بن عبدالله بن محمد بن عبد البر النمرى القرطبى
الاموال　للشيخ القاسم بن سلام الهروى
الامالى الشجرية　للشيخ يحيى بن حسين الشجرى　موقع الوراق
اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے　مفتی جعفر ملی　اکل کوا مہاراشٹر
اصول البزدوى (كنز الوصول الى معرفة الاصول) للامام على بن محمد البزدوى الحنفى　كراتشى
اتحاف المهرة بالفوائد المبتكرة　للشيخ الحافظ ابن حجر العسقلانى　مجمع الملک فهد مدينة منورة
الآثار　للامام ابويوسف
الآثار　للامام محمد
اصول السرخسى　للامام ابى بكر محمد بن احمد بن ابى سهل السرخسى م ۴۹۰ھ، قديمى كتب خانه
الانتفاع بالأعيان المحرمة　للشيخ محمد عبد الرزاق ابى زيد　دارالنفائس اردن
اشرف الاحکام تتمہ امداد الاحکام　حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ　ادارۂ اسلامیات لاہور

احکام القنطرة فی احکام البسملة للعلامة عبدالحي اللكنوى ادارة القرآن كراتشى
انوارالمحمود علی سنن ابی داود لشیخ الهند محمود الحسن الديوبندى ، جمعه والفه العلامة الشيخ محمد صديق النجيب آبادى ادارة القرآن
اشرف الهداية حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھوی مکتبہ دارالاشاعت
احسن الکلام حضرت مولانا سرفراز صفدرخان صاحب مکتبہ صفدریہ
ارشاد السارى شرح صحيح البخارى للعلامة القسطلانى مصر
انوارالباری مجموعہ افادات علامہ محمد انورشاہ کشمیری ودیگر اکابر محدثین ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ
ارشاد السالک الی اشرف المسالک فی فقه الامام مالک للشيخ شهاب الدين المالكى الشركة الافريقية
الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف للشيخ علاء الدين ابى الحسن المرداوى الدمشقى الحنبلى
الاصابة فى تمييز الصحابة للشيخ الحافظ ابن حجر العسقلانى دارالكتب العلمية بيروت
اسلام اورجدید معاشی مسائل حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
الاستخفاف بشعائر الله للشيخ عبدالكريم هجيع
اعلام الموقعين للعلامة ابن القيم الجوزية دار ابن الجوزى
الادب المفرد للامام محمد بن اسماعيل البخارى
اغلاط العوام للعلامة اشرف على التهانوى زمزم
احكام الاحكام للشيخ ابن دقيق العيد
اکابر دیوبند حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ادارۃ المعارف کراچی
اسلام کا نظامِ اوقاف، تاریخ، اہمیت اوراحکام، ازمولانا ڈاکٹر خلیل احمد اعظمی ادارۂ اسلامیات، لاہور
اقامة الحجة على ان الاكثار فى التعبد ليس ببدعة للعلامة عبد الحي اللكنوى
الاقتصاد فى الاعتقاد للامام الغزالى
اكمال المعلم بفوائد مسلم للعلامة القاضى عياض اليحصبى دار الوفاء مصر
انعام البارى للشيخ المفتى محمد تقى العثمانى مكتبة الحراء كراتشى
امهات المؤمنين فى مدرسة النبوة للشيخ مصطفى طحان
ارشاد القاصى والدانى الى تراجم شيوخ الطبرانى
الاتقان فى علوم القرآن للامام السيوطى الهيئة المصرية
الامالى المطلقة للشيخ الحافظ ابن حجر العسقلانى المكتب الاسلامى

الاحوال الشخصية للشيخ محمد محي الدين عبدالحميد المكتبة العلمية بيروت
الأغصان الندية شرح الخلاصة البهية بترتيب احداث السيرة النبوية للشيخ ابى اسماء محمد بن طه دارابن حزم
الاساس فى السنة وفقهها للشيخ سعيد حوى دارالسلام

باء

البناية شرح الهداية　للعلامة بدرالدين العينیؒ　مكتبه رشيديه كوئٹه
بذل المجهود　للمحدث خليل احمد السهارنفوریؒ ت١٣٤٦　ندوة العلماء لكهنؤ
البداية و النهاية　للحافظ اسماعيل ابن كثير القرشي الدمشقیؒ ت٧٧٤　دار المعرفة
بہشتی زیور　حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی　دارالاشاعت
بہشتی گوہراصلی　حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی　دارالاشاعت
بداية المجتهد　للامام ابى الوليد محمد بن احمد القرطبى　دار نشر الكتب
البجيرمى على الخطيب للشيخ سليمان بن محمد　التوفيقية
البحر الرائق　للشيخ زين الدين ابن نجيم مصرى　المكتبة الماجدية
بلوغ المرام　للحافظ ابن حجر العسقلانیؒ　جمعية احياء التراث الاسلامى
بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع للامام علاء الدين أبى بكر بن مسعود الكاسانى ت٥٨٧　سعيد كمپنى
بوادرالنوادر　حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ　ادارہ اسلامیات
البدرالمنير فى تخريج الاحاديث والآثار الواقعة فى الشرح الكبير　للشيخ سراج الدين ابن الملقن　الرياض
بحوث فى قضايا فقهية معاصرة للشيخ المفتى محمد تقى العثمانى دارالعلوم كراتشى
باقیات فتاویٰ رشیدیہ　جمع وترتیب مولانا نورالحسن کاندھلوی　حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی
البيان فى مذهب الامام الشافعیؒ للشيخ ابى الحسن يحيى بن ابى الخير اليمنى الشافعى دار المنهاج جده
بيان الوهم والايهام فى كتاب الاحكام للشيخ ابن قطان الفاسى
البحرالمحيط للشيخ ابى حيان الاندلسى دارالفكر
بارہ مہینوں کے فضائل　مفتی عبدالکریم صاحب　اسلامیات لاہور
البلاغ (ماہنامہ دارالعلوم کراچی)

تاء

تهذيب التهذيب للحافظ ابى الفضل احمد بن على بن حجر العسقلانیؒ ت٨٥٢　دار الكتب العلمية بيروت

تحفة الأحوذی للشیخ محمد بن عبد الرحمن المبارکفوریؒ و۱۲۸۳ ت۱۳۵۳ دار الفکر
التاج والإکلیل لمختصر الخلیل للشیخ محمد بن یوسف العبدری دارالفکر
تعلیق الألبانی علی الترمذی و ابی داؤد وابن ماجه و صحیح ابن خزیمه لمحمد ناصر الدین المکتب الاسلامی
التعلیق الممجد للعلامه عبد الحی اللکنوی بتحقیق الدکتور تقی الدین ندوی دمشق
تهذیب الکمال للحافظ جمال الدین ابی الحجاج یوسف المزّی و۶۵۴ ت۷۴۲ مؤسسة الرسالة
تاریخ بغداد للحافظ ابی بکر أحمد بن علی الخطیب البغدادی و۳۹۳ت۴۶۳ الکتب العلمية
تقریب التهذیب للحافظ احمد بن علی بن حجر العسقلانی و۷۷۳ت۸۵۲ دار نشر الکتب الاسلامية
التذکرة فی احوال الموتی وامور الاخرة للامام محمد بن احمد الانصاری القرطبی دار الریان للتراث
تحریر تقریب التهذیب للدکتور بشار عواد معروف والشیخ شعیب الرنؤوط موسسة الرسالة بیروت
تنویر الابصار للعلامه شمس الدین محمد بن عبد اللہ التمرتاشیؒ ۹۳۹ت۱۰۰۴ سعید کمپنی
التفسیر المظهری قاضی محمد ثناءاللہ پانی پتیؒ ت۱۲۲۵ بلوچستان بک ڈپو
التمهید للشیخ ابی عمر یوسف بن عبد الله بن عبد البر النمری و۳۶۸ت۴۶۳ مکتبة المؤید
تفسیر عثمانی شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مدینہ منورہ
الترغیب و الترهیب للحافظ ذکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی المنذری م۶۵۶ھ دار احیاء التراث
تفسیر ابن أبی حاتم للامام الحافظ عبدالرحمن ابن أبی حاتم الرازی المکتبة العصرية
تکملة فتح الملهم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مکتبة دار العلوم کراچی
التعلیقات علی نصب الرایة للشیخ محمد عوامة المکتبة المکية
التعلیقات علی ابن ماجه للدکتور بشار عواد معروف دار الجیل بیروت
تنقیح الفتاوی الحامدية للسید العلامة محمد امین ابن عابدین الشامی دار الاشاعة العربية
تالیفاتِ رشیدیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ م۱۳۲۳ھ ادارہ اسلامیات لاہور
تبیین الحقائق للعلامة فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی مکتبه امدادیه ملتان
تذکرة الرشید حضرت مولانا محمد عاشق الٰہیؒ مکتبہ عاشقیہ
التعلیقات علی مشکاة المصابیح للشیخ ناصرالدین ألالبانی المکتبة الاسلامی
التعلیقات علی تهذیب الکمال للدکتور بشار عواد معروف مؤسسة الرسالة
التعلیقات علی المصنف لابن ابی شیبة للشیخ محمد عوامه حفظه اللہ و رعاه المجلس العلمی
التحریر المختار للعلامة عبدالقادر الفاروقی الرافعی ایچ ایم سعید کمپنی

تفسیر ابن کثیر للحافظ اسماعیل ابن کثیر القرشی الدمشقی ت۷۷۴ دارالسلام
التحریر فی اصول الفقه مع التقریر و التحریر للعلامة الشیخ ابن همام مع الحلبی دار الکتب العلمیة بیروت
تاریخ مدینة دمشق للشیخ ابی القاسم ابن هبة الله الشافعی دارالفکر
تحفة الفقهاء للفقیه علاء الدین السمرقندی دارالکتب العلمیة
التعلیقات علی کتاب الحجة حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب دارالمعارف النعمانیہ
التعلیقات علی المستدرک للشیخ صالح اللحام
التعلیقات علی شعب الایمان للشیخ مختار احمد
تاریخ مکة المکرمة للامام ابی الولید محمد الأزرقی الریاض
التعلیقات علی سنن الترمذی للدکتور بشار عواد
التعلیقات علی مسند الامام احمد للشیخ شعیب الارنؤوط القاهرة
تنزیه الشریعة المرفوعة للحافظ ابی الحسن علی بن محمد بن عراق الکنانی دارالکتب العلمیة
التعلیقات علی سنن ابن ماجه للشیخ محمد فؤاد عبد الباقی
التلخیص الحبیر للحافظ ابن حجر العسقلانی
تلخیص المستدرک للامام شمس الدین الذهبی
التعلیقات علی سنن الترمذی للشیخ محمد شاکر
التعلیقات علی سنن الترمذی للشیخ مصطفیٰ حسین الذهبی
التعلیقات علی سنن الترمذی للشیخ محمود محمد محمود حسن
تحفة الأشراف بمعرفة الاطراف للامام جمال الدین یوسف بن عبد الرحمن المزی المکتب الاسلامی
تسکین الصدور حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ مکتبہ صفدریہ
التفسیر الوسیط للشیخ محمد بن سید الطنطاوی
تبصیر المنتبه بتحریر المشتبه للعلامة ابن حجر العسقلانی
توضیح المشتبه فی ضبط اسماء الرواة و انسابهم و القابهم و کناهم للشیخ ابن ناصر الدین الدمشقی
تفسیر المنار للشیخ محمد رشید علی رضا
التصحیح والترجیح للشیخ قاسم بن قطلوبغا بیروت
التعلیقات علی شرح تحفة الملوک للشیخ سائد بکداش دارالبشائر الاسلامیة
تحفة الملوک للفقیه محمد بن ابی بکر عبد القادر الرازی دار البشائر الاسلامیة

تحفة الالمعی حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری
التیسیر بشرح الجامع الصغیر للشیخ عبد الرؤف المناوی الریاض
تیسیر اصول الفقه للشیخ محمد انور البدخشانی بیت العلم
تعلیقات امداد الفتاویٰ مفتی شبیر احمد قاسمی زکریا بک ڈپو دیوبند
تفسیر النیسابوری (غرائب القرآن) للشیخ الحسن بن محمد بن الحسین النیسابوری
التعلیقات علی موارد الظمان الی زوائد ابن حبان
التعلیقات علی سنن ابی داود للشیخ شعیب الارنووط
التجنیس والمزید للامام ابی الحسن علی بن ابی بکر المرغینانی
التنبیه فی الفقه الشافعی للشیخ ابی اسحاق الشیرازی
تفسیر السمرقندی (بحر العلوم) للامام الفقیه ابی اللیث نصر بن محمد السمرقندی دار الکتب العلمیة
تحفة القاری شرح صحیح البخاری حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری مکتبۂ حجاز دیوبند
تحذیر الانام عن تغییر رسم الخط من المصحف الامام للشیخ المفتی محمد شفیع العثمانی دارالعلوم کراتشی
تحفة التحصیل فی ذکر رواة المراسیل للحافظ احمد بن عبد الرحیم ابی زرعة العراقی مکتبة الرشد الریاض
تخریج الدلالات السمعیة علی ماکان فی عهد رسول الله للشیخ ابی الحسن الخزاعی
تذکرة الموضوعات للشیخ محمد بن طاهر المقدسی
التراتیب الاداریة للشیخ عبد الحي الکتانی
تنویر الحلک فی بطلان دعوی اثبات الصوم بالحساب والفلک للشیخ سلیم علوان
التعلیقات علی مراسیل ابی داود للشیخ شعیب الارنؤوط
تهذیب الآثار للامام الطبری القاهرة
تاریخ المدینة للشیخ ابی زید النمیری البصری
تفسیر السراج المنیر للامام شمس الدین محمد بن احمد الشربینی دار الکتب العلمیة بیروت
تفسیر ابی السعود (ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم)للشیخ ابی السعود محمد العمادی بیروت
تفسیر الطبری (جامع البیان فی تاویل القرآن) للامام ابی جعفر محمد بن جریر الطبری مؤسسة الرسالة
تاریخ الاسلام للامام شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذهبی دارالکتاب العربی
التجرید الرکنی فی الفروع للامام رکن الدین ابی الفضل الکرمانی جامعة ام القری
تاج العروس من جواهر القاموس للشیخ محمد بن محمد بن عبد الرزاق الزبیدی دارالهدایة

تکملة الاکمال للشیخ ابی بکر محمد بن عبد الغنی البغدادی
تتمة اضواء البیان للشیخ عطیة محمد سالم
تبلیغی واصلاحی مضامین حضرت مولانا عاشق الٰہی بلندشہری
تفسیر العز بن عبد السلام للامام عز الدین بن عبد السلام السلمی الدمشقی الشافعی دار ابن حزم بیروت
التوضیح شرح مشکاة المصابیح للشیخ ظهیر الدین محمود بن عبد الصمد الفاروقی
تدریب الراوی للامام جلال الدین السیوطی
تاریخ الطبری(تاریخ الامم والملوک) للامام ابی جعفر محمد بن جریر الطبری دار الکتب العلمیة بیروت
تفسیرعزیزی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدیمی کتب خانہ
تفسیرحقانی علامہ عبدالحق حقانی دہلوی میرمحمد کتب خانہ
تاریخ الخمیس فی احوال انفس نفیس للامام الشیخ حسین بن محمد بن الحسن الدیاربکری بیروت
تفسیر جواہرالقرآن افادات حضرت مولانا حسین علی، جمع کردہ مولانا غلام اللہ خان، کتب خانہ رشیدیہ راولپنڈی
تفسیر آیات الاحکام للشیخ محمد علی الصابونی المکتبة العصریة
التعلیقات علی المنتخب من مسند عبد بن حمید للشیخ مصطفی العدوی
التعریفات الفقهیة للمفتی السید محمد عمیم الاحسان المجددی البرکتی دارالکتب العلمیة بیروت
تعلیقاتِ فتاوی محمودیہ زیرسرپرستی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ جامعہ فاروقیہ
تعلیم الاسلام حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مکتبۃ البشریٰ
التعریف باوهام من قسم السنن الی صحیح وضعیف دار البحوث دبئی

ثاء

الثقات للامام محمد بن حبان بن احمد ابوحاتم التمیمی البستی دارالفکر
الثقات للشیخ قاسم بن قطلوبغا

جیم

جواہرالفقہ حضرت مفتی محمد شفیعؒ مکتبہ دارالعلوم کراچی
الجامع الصغیر للامام جلال الدین بن أبی بکر السیوطی ت ۹۱۱ دار الکتب العلمیة بیروت
الجوهر النقی علی هامش السنن الکبری لعلاء الدین بن علی بن عثمان ابن الترکمانی ت۷۴۵ دار المعرفة
جامع الأحادیث للامام جلال الدین عبد الرحمن السیوطی ت ۹۱۱، دار الفکر

الجوهرة النيرة　للامام أبی بکر بن علی بن محمد الحدادی ت ۸۰۰　مکتبة امدادية
جدید فقہی مسائل　مولانا خالد سیف اللہ رحمانی　کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
جدید فقہی مباحث　حضرت قاضی مجاھد الاسلام قاسمیؒ
جواہر الفتاویٰ　حضرت مفتی عبدالسلام صاحب چاٹگامی
جلالین　علامہ جلال الدین محلی وعلامہ جلال الدین سیوطی
الجزء اللطيف فی الاستدلال بالحديث الضعيف　افادات حضرت مفتی رضاء الحق صاحب　زمزم پبلشرز
الجامع لاحکام القرآن　للشیخ ابی عبد الله محمد بن احمد الانصاری الخزرجی القرطبی　دارعالم الکتب
جامع المسانيد و السنن　للامام الحافظ عمادالدين ابن کثير الدمشقی الشافعی　دارلفکر
جامع الرموز　للفقيه شمس الدين محمد الخراسانی القهستانی　المطبعة الکريمة
جامع احکام الصغار علی هامش الفصولين　للعلامه الاستروشنی　اسلامی کتب خانه
الجامع الصغير　للامام محمد بن الحسن الشيبانیؒ　عالم الکتب
جامع الفتاویٰ　للشيخ المفتی مصلح الدين　الطاف
جدید فقہی تحقیقات　مرتبہ　حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب　اسلامک فقہ اکیڈمی　وکتب خانہ نعیمیہ
جامع الاحاديث　للامام جلال الدين السيوطی
الجواهر البهية علی شرح العقائد النسفية　للشيخ　شمس الدين الافغانی　الجامعه الحسينية رانديرسورت
جواهر الفتاویٰ　للعلامة رکن الدين محمد بن عبد الرشيد الکرمانی
جلسات رمضانية　للشيخ العثيمين
الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع　للخطيب البغدادی　موقع جامع الحديث
جواهر العقود ومعين القضاة والموقعين والشهود　للشيخ شمس الدين الاسيوطی　موقع يعسوب
جامع البيان فی تاويل القرآن　للشيخ ابی جعفر محمد بن جرير الطبری الآملی　الرسالة
جمهرة القواعد الفقهية　فی المعاملات المالية
جامع الآثار فی السير ومولد المختار　للشيخ ابن ناصر الدين الدمشقی　دارالفلاح
جدید معاملات کے شرعی احکام　مفتی احسان اللہ شائق

حاء

حاشية مؤطا امام مالک　لمولانا اشفاق الرحمن الکاندلوی　آرام باغ کراچی

حاشية الدسوقی للشیخ شمس الدین محمد عرفه الدسوقی دار الفکر
حاشية تبيين الحقائق للشيخ احمد الشبلی امدادیه ملتان
حواشی الشيروانی للشيخ شهاب الدين احمد بن حجر الهيتمی دار الفكر
حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح للعلامه السيد أحمد الطحطاوی میر محمد کتب خانه کراچی
الحاوی للفتاوی للامام جلال الدين السيوطی ت ۹۱۱، فاروقی کتب خانه
حاشية الجمل للشيخ سليمان الجمل دار الفكر
حاشية لامع الدراری حضرت شیخ محمد زکریاؒ سعید کمپنی
حاشية الشرنبلالی علی درر الحكام للعلامه حسن بن عمار الشرنبلالی استنبول
حاشية فيض الباری حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی
حاشية الهداية للشيخ إلٰهداد الجونفوری شركة علمية
حاشية الترغيب و الترهيب للشيخ مصطفى محمد عماره داراحیاء التراث العربی بیروت لبنان
حاشية صحيح البخاری للشيخ المحدث احمد علی السهارنفوری
حاشية سنن ابن ماجه للشيخ محمد بن عبد الهادی السندی
حاشیہ کتاب الفسخ والتفریق حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ
حلال وحرام حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
الحاوی الكبير للعلامة ابی الحسن الماوردی
حاشية الطحطاوی علی الدر المختار للعلامة السيد أحمد الطحطاوی مكتبة العربية كوئٹه
حجة الله البالغة للمحدث الكبير الشاه ولی الله قديمی کتب خانه
حاشية بذل المجهود للشيخ تقی الدين الندوی دارالبشائر الاسلامية
حاشية فتاویٰ دارالعلوم ديوبند للمفتی ظفير الدين دارالاشاعت
حلبة المجلی وبغية المهتدی فی شرح منية المصلی للفقيه ابن امير الحاج الحلبی دارالكتب العلمية بيروت
حاشية مشكاة المصابيح للشيخ السيد شريف
حاشية سنن ابن ماجه للشيخ عبد الغنی المجددی قديمی کتب خانه
حلية طالب العلم للشيخ ابی زيد بكر بن عبد الله دار العاصمة للنشر والتوزيع الرياض
الحبائک فی اخبار الملائک للعلامة جلال الدين السيوطی
حاشية التجنيس والمزيد للشيخ الدكتور محمد امين ادارة القرآن والعلوم الاسلامية كراتشی

حاشية البنانی علی هامش شرح الزرقانی
حسن البیان فی لیلة النصف من شعبان للشیخ عبدالله بن محمد الصدیق الغماری عالم الکتب
حاشیہ عطر ہدایہ للشیخ محمد غانم عبدالحق

خاء

خیر الفتاوی مولانا خیر محمد جالندھری ودیگر مفتیانِ خیر المدارس شرکت پرنٹنگ لاہور
خلاصة الفتاوی للشیخ طاهربن عبد الرشید البخاری مکتبه رشیدیه کوئٹه
خیر الخبر فی أذان سید البشر للعلامة عبد الحي اللکنوی ادارة القرآن
خزانة الأکمل فی الفروع للشیخ یوسف بن علی بن محمد الجرجانی الحنفی
الخلاصة الفقهية علی مذهب السادة المالكية للشیخ محمد العربی القروی دارالکتب العلمية
خطباتِ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
خزانة الفقه للامام الفقیه ابی اللیث نصر بن محمد السمرقندی
الخلاصة البهية فی ترتیب احداث السیرة النبوية للشیخ وحید بن عبد السلام بالی دارالفوائد

دال

الدر المنثور للامام عبد الرحمن جلال الدین السیوطیؒ و ۸۴۹ت ۹۱۱ دار الفکر
الدر المختار للعلامة علاء الدین محمد بن علی حصکفیؒ و ۱۰۲۵ ت ۱۰۸۸ ایچ ایم سعید کمپنی
دین کی باتیں (خلاصہ بہشتی زیور) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
دلائل النبوة للامام البیهقی دار الکتب العلمية
دلیل الفالحین فی شرح ریاض الصالحین للشیخ ابن علان محمد علی بن محمد الصدیقی
الدر المنضود علی سنن ابی داود حضرت مولانا محمد عاقل صاحب مکتبہ خلیلیہ
درر الحکام فی شرح غرر الاحکام للعلامة محمد بن فرامرز المعروف بملا خسرو معارف نظارت جلیلة
الدر المنتقی فی شرح الملتقی للفقیه علاء الدین محمد الحصکفی
الدعوات الکبیر للامام ابی بکر البیهقی
الدعاء المسنون حضرت مولانا مفتی محمد ارشاد صاحب القاسمی دارالعلوم زکریا
عدة الصابرین وذخرة الشاکرین للعلامة محمد بن ابی بکر بن ایوب بن القیم الحنبلی الجوزية بیروت
الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج للامام جلال الدین السیوطی

درر الحكام شرح مجلة الاحكام للشيخ على حيدر دارالكتب العلمية بيروت
درس الهداية للشيخ المفتى ولى حسن التونكى
دستور العلماء للقاضى عبد رب النبى بن عبد رب الرسول الاحمد نكرى دارالكتب العلمية بيروت

ذال

ذکراجتماعی وجہری شریعت کے آئینہ میں افادات حضرت مفتی رضاءالحق صاحب زمزم

راء

روح المعانى للعلامة شهاب الدين السيد محمود الآلوسى البغدادیؒ ت١٢٧ التراث القاهرة
رد المحتار المعروف بفتاوى الشامى لخاتمة المحققين محمد امين ابن عابدين ت١٢٥٢ ايچ ايم سعيد كمپنى
روضة الطالبين للإمام النووى المكتب الإسلامى
رسائل ابن عابدين للعلامة الشامیؒ سهيل اكيڈمى
رؤیتِ ہلال حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ دارالمعارف کراچی
الرواة الثقاة المتكلم فيهم بمالايوجب ردهم للإمام شمس الدين أبى عبد الله الذهبى دار البشائر الإسلامية
ردع الاخوان عن محدثات جمعة آخر رمضان للعلامة عبد الحي اللكنوى ادارة القرآن
رسائل السقاف للشيخ حسن بن على السقاف دار الرازى
رمز الحقائق للعلامة بدر الدين العينى
روح البيان للشيخ اسمعيل الحقى دار احياء التراث العربى
الروض الانف فى شرح السيرة النبوية للامام المحدث عبد الرحمن السهيلى مكتبة ابن تيمية
روزے کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا مفتی انعام الحق صاحب قاسمی بیت العمار کراچی
الرحيق المختوم للشيخ صفى الرحمن المباركفورى دار القلم
رحمة للعٰلمين للشيخ محمد سليمان المنصورفورى دارالسلام

زاء

زاد المعاد فى هدى خير العباد للحافظ شمس الدين أبى عبد الله الزرعى و ١٩٦ ت ١٥٧ مؤسسه الرسالة
زبدة المناسک مع عمدة المناسک فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مکتبہ اشرفیہ
زبدة الفتاویٰ حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب مکتبہ نجاح

زوال السنۃ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

زوجات النبی صلی اللہ علیہ وسلم للشیخ سعید ایوب بیروت ، لبنان

سین

سلسلة الاحاديث الضعيفة للشيخ محمد ناصر الدين الالبانیؒ المكتب الاسلامی

سلسلة الأحاديث الصحيحة للشيخ محمد ناصر الدين الألبانی مكتبة المعارف الرياض

السنن الكبری للنسائی للامام أحمد بن شعيب النسائی

سير اعلام النبلاء للحافظ شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبی و۷۴۸۱ت۱۳۷۴ مؤسسة الرسالة

السنن الصغری للامام البيهقی

سنن سعيد بن منصور للامام سعيد بن منصور الخراسانی ت۲۲۷ الدار السلفية الهند

السنن الكبری للحافظ ابی بكر احمد بن الحسين بن علی البيهقی دار المعرفة

السعاية للعلامة عبد الحي اللكنوی سہیل اکیڈمی

سبل الهدی و الرشاد فی سيرة خير العباد للشيخ محمد بن يوسف الشامی

السيرة الحلبية للشيخ علی بن برهان الدين الحلبی دارالمعرفة

سنن ابی داود للامام ابی داود سليمان بن الاشعث السجستانی فيصل ، وبيروت

سنن الترمذی للامام ابی عيسیٰ محمد بن عيسی الترمذی السلمی فيصل ، بيروت

سنن ابن ماجه للامام ابی عبدالله محمد بن يزيد القزوينی قديمی

سنن الدارقطنی للامام ابی الحسن علی بن عمر الدارقطنی البغدادی دارالمعرفة

سنن الدارمی للامام عبد الله بن عبد الرحمن الدارمی دارالكتاب العربی

سنن النسائی المجتبی للامام ابی عبد الرحمن احمد بن شعيب النسائی حلب

سراج القاری محاضرات الشيخ محمد زكريا الكاندلوی جمعها مولانا عبد الرحيم معهد الرشيد الاسلامی

السراجی فی الميراث للشيخ سراج الدين بشری

السنن والمبتدعات للشيخ محمد بن احمد عبد السلام خضر الشقيری دار الفكر

سلسلة القصص للشيخ محمد بن صالح

السيرة النبوية للامام عبد الملک بن هشام الحميری المعافری دار الجيل

السفر الطويل الی تحقيق يوم ولادة الرسول صلی الله عليه وسلم للشيخ محمد الامين سليم

سیرۃ المصطفی حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ مکتبہ مدنیہ

شین

شرح النقاية (فتح باب العناية) للشيخ الملا على بن محمد سلطان القارى الحنفى ت ۱۰۱۴ سعيد كمپنى

شرح الطيبى للامام شرف الدين حسين بن محمد بن عبد الله الطيبى ت ۷۴۳ ادارة القرآن

شرح المجلة للامام محمد خالد الاتالسى رشيديه

شرح الوقايه للفقيه عبيد الله بن مسعود بن تاج الشريعة مطبع مجيدى

شرح عقود رسم المفتى لفقيه العصر ابن عابدين المعروف بالشامى مكتبه اسعدى ومكتبه بشرىٰ

شعب الايمان للامام ابى بكر احمد بن الحسين البيهقى و ۳۸۴ت ۴۵۸ الدار السلفية الهند

شرح معانى الآثار للامام ابى جعفر احمد بن محمد بن سلمة بن سلامة الطحاویؒ ايچ ايم سعيد كمپنى

شر ح صحيح مسلم للامام ابى زكريا يحيى بن شرف الدين النووى و ۶۳۱ت ۶۷۲ دار احياء التراث

شفاء السقام فى زيارة خير الانام للشيخ تقى الدين السبكى

الشرح الكبير للشيخ ابن قدامه المقدسى بيروت

شرح الصدور للحافظ جلال الدين السيوطى ت ۹۱۱، دار المؤيد الرياض

شرح الزرقانى للعلامة محمد بن عبد الباقى الزرقانى المالكیؒ دار احياء التراث بيروت

شرح مختصر الخليل للشيخ محمد عليش دار الفكر

شرح الهداية للشيخ سعدى چلپى

الشرح الكبير على هامش الدسوقى للامام ابى البركات سيد احمد الدردير المالكى

شرح النقاية للشيخ الياس زاده سعيد

شرح العناية للعلامه اكمل الدين البابرتى دارالفكر

شرح المهذب للامام النووى دار الفكر

شب براءت کی حقیقت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب میمن اسلامک پبلشرز

شرح القواعد الفقهية للشيخ احمد بن الشيخ محمد الزرقا دار القلم دمشق

شرح منظومة ابن وهبان للشيخ ابن الشحنة الحلبى الوقف المدنى ديوبند

شرح تحفة الملوك للشيخ محمد بن عبد اللطيف بن ملك دارالبشائر الاسلامية

شرح سنن ابى داود للعلامة بدر الدين العينى مكتبة الرشد الرياض

شرح مختصر الطحاوی للفقیه قاسم بن قطلوبغا الحنفی دار البشائر الاسلامیة
شرح بلوغ المرام للشیخ عطیة محمد سالم موقع الشبکة الاسلامیة
شرح سنن ابی داود للشیخ عبد المحسن
شرح اللباب للشیخ الملا علی القاری بیروت
شفاء العلیل ترجمة القول الجمیل للشاه ولی الله الدهلوی رحمانیه
شرح مختصر البعلی لکتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول
شرح الاربعین النوویة للامام ابن دقیق العید
شرح زاد المستقنع للشیخ الشنقیطی
شرح الصاوی علی جوهرة التوحید للشیخ احمد بن محمد المالکی
شرح العقائد النسفیة للعلامة سعد الدین التفتازانی
شرح العقیدة الطحاویة للشیخ عبد الغنی المیدانی الحنفی
شرح الصغیر علی اقرب المسالک للشیخ الدردیر المالکی
شعبان وشبِ براءت کے فضائل واحکام مولانا رضوان راولپنڈی ادارۂ غفران
شبِ براءت مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی
شعبان المعظم للحافظ تنویر احمد الشریقی مکتبه رشیدیه
شرح میارة الفاسی للشیخ ابی عبد الله المالکی دار الکتب العلمیة
شرکت ومضاربت عصر حاضر میں مولانا محمد عمران اشرف عثمانی ادارۃ المعارف کراچی
الشرکات للاستاذ علی الخفیف
شرح المجلة للشیخ سلیم رستم باز اللبنانی
شفاء العلیل وبل الغلیل فی حکم الوصیة بالختمات والتهلیل للعلامة ابن عابدین الشامی
الشامل فی فقه الخطیب والخطبة للشیخ سعود بن ابراهیم الشریم

صاد

صحیح البخاری للامام الهمام امیر المؤمنین فی الحدیث محمد بن اسماعیل بن ابراهیم البخاری
صحیح مسلم للامام مسلم بن الحجاج القشیری
صحیح و ضعیف سنن الترمذی للشیخ محمد ناصر الدین الألبانی

صحیح ابن حبان للحافظ محمد بن حبان بن احمد ابی حاتم التمیمی موسسة الرسالة بیروت
صحیح ابن خزیمه للحافظ محمد بن اسحاق بن خزیمة النیشابوری المکتب الاسلامی
الصحاح فی اللغة للامام ابی نصر اسماعیل بن حماد الجوهری الفارابی
صفوة المسائل فی التوحید والفقه والفضائل للشیخ محمد نصر الدین محمد عویضة
صفة الصفوة للامام ابی الفرج عبد الرحمن ابن الجوزی دار المعرفة بیروت
الصدیق (ماهنامه) معهد الصدیق للدراسات الاسلامیة

ضاد

الضعفاء للامام البخاری

طاء

الطبقات الکبری للحافظ محمد ابن سعد دار صادر بیروت

عین

العرف الشذی علیٰ هامش سنن الترمذی للعلامه المحدث الکبیر انور شاه الکشمیری فیصل دیوبند دهلی
عمدة الرعایة علی شرح الوقایة للعلامة عبد الحی اللکنوی المجیدی کانفوری
عصر حاضر کے فقہی مسائل مولانا بدر الحسن القاسمی حیدرآباد
عارضة الأحوذی للإمام ابن العربی المالکی دار الکتاب العربی
عمل الیوم و اللیلة للامام أبی عبد الله أحمد بن شعیب النسائی ت۳۰۳ دار الفکر
عمدۃ الفقہ حضرت مولانا زوار حسین صاحب مجددیہ
عمل الیوم و اللیلة للامام أبی بکر أحمد بن محمدبن اسحاق ابن السنی دائرة المعارف العثمانیة
عون المعبود للشیخ محمد شمس الحق العظیم آبادی دار الکتب العلمیة
العنایة شرح هدایة للعلامة أکمل الدّین محمد بن محمود البابرتیؒ ت ۷۸۶
عمدة القاری فی شرح البخاری للعلامة بدر الدین محمد محمود بن احمد العینیؒ دار الحدیث ملتان
عزیز الفتاویٰ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب
علل الحدیث للشیخ ابی محمد عبد الرحمن ابن ابی حاتم الرازی
العبر فی خبر من غبر للعلام شمس الدین الذهبی

العلل المتناهية للشيخ عبد الرحمن بن على بن الجوزى دارالكتب العلمية بيروت
عطر ہدایہ ''حلال وحرام کے احکام'' بحرالعلوم حضرت مولانا فتح محمد صاحب لکھنوی زمزم پبلشرز
علمی مکاتیب　مولانا مرغوب احمد لاجپوری
علم تشریح الابدان پروفیسر ڈاکٹر نجیب الحق صاحب
عين الهداية حضرت مولانا سید امیر علی صاحب　مکتبہ رحمانیہ
العقود الدرية فى ذكر بعض مناقب شيخ الاسلام ابن تيمية للامام ابن عبد الهادى
عيون المسائل فى فروع الحنفية للفقيه ابى الليث نصر بن محمد السمرقندى
علمی واصطلاحی ارشادات مع مختصر سوانح شیخ محمد یونس صاحب　مولانا زید ندوی مظاہری
عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل اوران کا حل مرتب حضرت مولانا موسیٰ صاحب کرماڈی لندن الطاف اینڈ سنز

غين

غمز عيون البصائر　للشيخ احمد بن محمد الحموى　　ادارة القرآن
غنية المتملى فى شرح منية المصلى　　للشيخ ابراهيم الحلبى ت ٩٥٦ سهيل اكيڈيمى لاهور
غنية الناسک فى بقية المناسک العلامه المحقق محمد حسن الشاه　　ادارة القرآن كراچى
غريب الحديث للامام عبد الله بن مسلم بن قتيبة الدينورى بغداد
غريب الحديث للامام ابى عبيد القاسم بن سلام الهروى دار الكتاب العربى بيروت
غاية البيان و نادرة الاقران شرح الهداية للعلامة قوام الدين امير كاتب الاتقانى (مخطوطة) مكتبة شيخ الاسلام فيض اللّٰه آفندى استنبول
الغاية فى شرح الهداية للعلامة ابى العباس السروجى مخطوطة الجامعه الاسلامية ، المدينة المنورة

فاء

فتاویٰ حقانیہ مفتیانِ کرام دارالعلوم حقانیہ　　دارالعلوم حقانیہ
فتاویٰ مفتی محمود　　مولانا مفتی محمود صاحب ملتان　　لاہور
فتح البارى شرح صحيح البخارى　　للحافظ ابن رجب الحنبلى　　دار ابن جوزى
فتاوى واحدى　　للعلامة عبد الواحد السيوستانى السندى کوئٹه ،پاکستان
الفتاوى السراجية　للامام ابى محمد سراج الدين على بن عثمان زمزم پبلشرز
فتاویٰ خلیلیہ　　حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ

فتاویٰ عثمانی مفتی تقی عثمانی صاحب کراچی
فتاویٰ محمودیہ مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کتب خانہ مظہری کراچی
فتح الباری فی شرح البخاری للحافظ ابن حجر العسقلانیؒ و۷۷۳ت ۸۵۲، دار نشر الکتب الاسلامیة
فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (کبیر) حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کتب خانہ امدادیہ دیوبند
فتح الملهم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مکتبه دار العلوم کراچی
فیض القدیر للحافظ محمد عبد الرؤف المناویؒ دار الفکر
الفتاوی الهندیة للشیخ نظام الدین وجماعة من علماء الهند الاعلام بلوچستان بک ڈپو
فتاویٰ رحیمیہ مفتی سید عبد الرحیم لاجپوریؒ مکتبہ رحیمیہ مکتبۃ الاحسان دیوبند
فتح القدیر للامام کمال الدین محمد بن عبد الواحد ابن همام السیواسی ت ۶۸۱ دار الفکر
فیض الباری حضرت مولانا انور شاہ کشمیری م۱۳۵۲ھ مطبعه حجازی القاهرة
فتاویٰ رشیدیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ م۱۳۲۳ھ مکتبۃ رحمانیہ لاہور
فتح باب العناية للشیخ العلامة علی بن سلطان محمد القاری
فتاوی قاضی خان للامام فخر الدین حسن بن منصور اوزجندی الفرغانی ت۵۹۲ بلوچستان بک ڈپو
الفقه الاسلامی و أدلته للدکتور وهبة الزحیلی دار الفکر
فتاویٰ دارالعلوم دیوبند حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ دارالاشاعت
الفتاوی التاتارخانیة للامام عالم بن علاء الانصاری الاندربنی الدهلوی ت۷۸۶ ادارةالقرآن
فتاوی اللکنوی(نفع المفتی والسائل) للعلامة عبد الحی اللکنوی و۱۲۶۴ ت۱۳۰۴ دار ابن حزم کراچی
الفتاوی البزازیة لحافظ الدین محمد بن محمد بن شهاب البزاز الکردی ۸۲۷ بوچستان بک ڈپو
الفقه علی المذاهب الأربعة للشیخ عبد الرحمن الجزائری دار الفکر
فتاویٰ فریدیہ حضرت مفتی فرید صاحب اکوڑہ خٹک
الفردوس بمأثور الخطاب للحافظ ابی شجاع الدیلمی دار الکتب العلمیة
الفتاوی الولوالجیة للفقیه ظهیر الدین عبد الرشید بن ابی حنیفة الولوالجی دار الکتب العلمیة
الفقه الحنفی و ادلته للشیخ اسعد محمد سعید الصاغرجی دار الکلم الطیب دمشق
فتح الوهاب للشیخ زکریا بن محمد بن احمد الانصاری دارالکتب العلمیة بیروت
الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید للشیخ عبد الحمید محمود طهماز دار القلم دمشق
فتح المعین للامام ابی السعود السید محمد المصری الحنفی

فضائل اعمال شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ
فتاویٰ دارالعلوم زکریا افادات حضرت مفتی رضاء الحق صاحب زمزم پبلشرز
فتاوی علماء البلد الحرام مرتب خالد بن عبدالرحمن الجريسى
فتح المغيث للعلامة شمس الدين السخاوى
فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء جمع وترتيب الشيخ احمد الدويش
فتاوى الأزهر فتاوى اعلام المفتين لدار الافتاء المصرية
فتاویٰ بینات ترتیب وتخریج مجلس دعوت وتحقیق اسلامی مکتبہ بینات کراچی
فتاوى نور على الدرب للشيخ عبد العزيز بن عبد الله بن باز
فقہی مقالات مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
الفتاوى المهمة للشيخ عبد الله بن عبد العزيز بن باز
فقه العبادات للشيخ السيد سابق
فتاوى فقهية معاصرة عبد الملک بن عبدالرحمن السعدى دارالنور
فتاویٰ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرتب مفتی سلمان منصور پوری مکتبہ دینیہ دیوبند
فتاویٰ قاسمیہ مفتی شبیر احمد قاسمی شاہی مرادآباد
فتاویٰ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی ادارۃ المعارف کراچی
الفتاوى الفقهية الكبرى للحافظ ابن حجر الهيتمى المكى دارالفكر
الفروع لابن مفلح الحنبلى مؤسسة الرسالة
فتاویٰ دینیہ حضرت مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی جامعہ حسینیہ راندیر سورت گجرات
فتح العزيز بشرح الوجيز للامام عبدالكريم بن محمد الرافعي القزوينى
الفتوحات الربانية على الاذكار النووية للشيخ محمد بن على بن محمد بن علان المكى الشافعى
فقه المعاملات دارالاشاعت کراچی
الفقه الميسر للشيخ شفيق الرحمن الندوى لكهنؤ
فتح الرحمن فى بيان هجر القرآن دار ابن خزيمه
فتاوى الاسلام سوال وجواب
فيض المولى الكريم للشيخ ابراهيم بن عبد الرحمن القاهرى
فقه العبادات على مذهب الامام مالک

فتاوی الشیخ الرملی

الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة للامام محمد بن علی بن محمد الشوکانی المکتب الاسلامی

فضائل لیلة النصف من شعبان للشیخ المحدث عبد الحفیظ المکی مکتبة الحرمین

الفوائد العلیة علی الاحکام الشرعیة فی الاحوال الشخصیة علی مذهب ابی حنیفة النعمان

فتاوی دار الافتاء المصریة وزارة الاوقاف المصریة

فی ظلال القرآن للشیخ سید قطب

الفرائد علی مجموع الزوائد الدوحة قطر

فتاوی الشبکة الاسلامیة باشراف عبد الله الفقیه

فقه البیوع للشیخ المفتی محمد تقی العثمانی

الفتاوی للشیخ محمد بن بخیت المطیعی المصری الحنفی

الفاروق (ماهنامه) جامعه فاروقیه کراچی

قاف

القاموس الوحید للشیخ وحید الزمان الکیرانوی حسینیه دیوبند

قواعد الفقه لمولانا عمیم الاحسان دار الکتاب دیوبند

قرة العین للشیخ عبد اللّٰه بن محمد الغماری بیروت

القول الراجح (ترجیح الراجح بالروایة فی مسائل الهدایة) إفادات المفتی غلام قادر النعمانی

قفو الاثر فی صفو علوم الاثر للامام رضی الدین ابن الحنبلی الحلبی الحنفی مکتب المطبوعات الاسلامیة بحلب

قوت المغتذی علی سنن الترمذی للامام جلال الدین السیوطی

القواعد الکبری للشیخ عزالدین بن عبد السلام سلطان العلماء

قنیة المنیة للفقیه نجم الدین مختار بن محمود الزاهدی

قرارات مجمع الفقه الاسلامی

قانون العدل والانصاف للشیخ محمد قدری باشا مؤسسة الریان، المکتبة المکیة

کاف

کتاب الدعاء للامام أبی القاسم سلیمان بن أحمد الطبرانی و۲۶۰ت۳۶۰ دار الکتب العلمیة بیروت

کفایت المفتی مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ دہلویؒ دارالاشاعت کراچی

كشف الخفاء للشيخ اسماعيل بن محمد العجلونی ت۱۱۶۲ دار احياء التراث بيروت
كتاب الروح للحافظ شمس الدين ابی عبد الله ابن قيم الجوزيه دار الفكر
كشاف القناع عن متن الاقناع للشيخ منصور بن يونس بن ادريس البهوتی دار الفكر
كتاب الام للإمام ابی عبد الله محمد بن ادريس الشافعی دار الفكر بيروت
كتاب الخراج للإمام ابی يوسف ادارة القرآن
كتاب الفتاوی لمولانا خالد سيف الله الرحمانی زمزم
كنز الدقائق للامام ابی البركات النسفی امدادية ملتان
كتاب الحجة علی اهل المدينة للامام محمد بن الحسن الشيبانی
الكامل فی ضعفاء الرجال للشيخ عبد الله بن عدی الجرجانی دارالفكر
كتاب الآثار للامام ابی يوسفؒ
كتاب الزهد للشيخ عبد الله بن المبارك بن واضح المروزی دار الكتب العلمية بيروت
الكشاف للشيخ ابی القاسم محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی بيروت
كتاب المسائل مفتی سلمان منصور پوری کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
كتاب النوازل مفتی سلمان منصور پوری مرکز علمی
كشف الاسرار للامام عبد العزيز علاء الدين البخاری دارالكتب العلمية بيروت
الكفاية علی الهداية علی هامش فتح القدير للامام جلال الدين الخوارزمی مكتبه رشيديه كوئٹه
كتاب المراسيل للامام ابی داود السجستانی
الكوكب الدری علی سنن الترمذی للشيخ العلامة رشيد احمد الجنجوهی
كتاب الزهد للامام احمد بن حنبل
كتاب الآداب للشيخ فؤاد بن عبد العزيز دار القاسم
كشف المشكل من حديث الصحيحين للعلامة ابن الجوزی الرياض
كتاب الفروع للامام شمس الدين ابی عبد الله محمد بن مفلح المقدسی دار الكتاب العربی
كتاب الاموال للشيخ ابن زنجويه
كشف الظنون للشيخ حاجی خليفة
الكشف والبيان (تفسير الثعلبی) للامام ابی اسحاق احمد بن محمد الثعلبی النيسابوری بيروت لبنان
الكفاية فی علم الرواية للامام ابی بكر الخطيب البغدادی المكتبة العلمية المدينة المنورة

الکافی فی فقه الامام المبجل احمد بن حنبل للامام ابی محمد عبد الله بن قدامة المقدسی
الکامل فی التاریخ للشیخ ابی الحسن علی بن ابی الکرم محمد بن محمد الشیبانی دارالکتب العلمیة

لام

لسان العرب للامام محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری م ۷۱۱ هـ مکتبة دار الباز مکة المکرمة
لامع الدراری حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایچ ایم سعید کمپنی
لسان المیزان للحافظ ابی الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی ت ۸۵۲، اداره تالیفات اشرفیه ملتان
اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة واالإفتاء للشیخ احمد بن عبد الرزاق الدّویش ریاض
لباب المناسک للامام السندیؒ بیروت
اللباب فی شرح الکتاب للفقیه عبد الغنی الدمشقی المیدانی دارالکتاب العربی
اللباب فی علوم الکتاب للشیخ ابی حفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی دارالکتب العلمیة بیروت
لسان الحکام فی معرفة الاحکام للشیخ ابراهیم بن ابی الیمن الحنفی ابن الشحنة دارالفکر
لآلی البحار فی تخریج مصادر ابن عابدین فی حاشیته رد المحتار
اللباب فی الجمع بین السنة والکتاب للامام ابی محمد علی بن زکریا المنبجی دار القلم
لباب الفتاویٰ حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بھڈکودروی جامعہ علوم القرآن جمبوسر
لغات الحدیث حضرت مولانا وحید الزمان کیرانوی مکتبہ میر محمد کتب خانہ
اللباب فی فقه الشافعی للامام ابی الحسن احمد بن محمد الضبی السعودیة
لطائف المعارف للحافظ ابن رجب الحنبلی
اللؤلؤ المکنون فی سیرة النبی المأمون للشیخ موسی بن راشد العازمی المکتبة العامریة کویت

میم

مشکاة المصابیح للامام ابی عبد الله محمد بن عبد الله الخطیب الطبریزیؒ قدیمی کتب خانه کراچی
المرقاة شرح مشکاة للشیخ الملا علی القاریؒ مکته امدادیه ملتان
مختصر القدوری للامام ابی الحسن احمد بن محمد البغدادی سعید
المحیط البرهانی للامام محمود صدر الشریعة ابن مازة البخاری الریاض
منحة الخالق حاشیة البحر الرائق للعلامة ابن عابدین الشامی کوئٹه
ماہنامہ ندائے شاہی جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

منظومة ابن وهبان للشيخ عبدالوهاب بن احمد بن وهبان الدمشقى الوقف المدنى ديوبند
منتخب نظام الفتاوی حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمی اصلاحی کتب خانہ دیوبند
مغنى المحتاج للامام محمد بن محمد الخطيب الشربينى التوفيقية
معرفة السنن والآثار للإمام البيهقى جامع الحديث
مطالب اولى النهى فى شرح غاية المنتهى للشيخ مصطفى السيوطى الرحيبانى المكتب الاسلامى
مظاہر حق جدید نواب قطب الدین خان دہلوی دارالاشاعت
المستدرک للحافظ ابى عبد الله محمد بن عبد الله ت۴۰۵ دار الباز للنشر والتوزيع۔ مكة المكرمة
مجمع الزوائد للحافظ نور الدين على بن أبى بكر الهيثمیؒ ت۸۰۷ دار الفكر
مسند الامام احمد بن حنبل للاما م احمد بن حنبل الشيبانیؒ و۱۶۴ ت ۲۴۱، دار الفكر
معارف القرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ت۱۳۹۶ ادارة المعارف کراچی
مصنف ابن ابى شيبة للحافظ ابى بكر عبد الله بن محمد بن أبى شيبة العبسى ت۲۳۵ ادارة القرآن کراچی
المجموع شرح المهذب للامام ابى زكريا يحى بن شرف الدين النووى و ۶۳۱ ت۶۷۲ دار الفكر
ميزان الاعتدال للحافظ محمد بن أحمد بن عثمان الذهبى ت۷۴۸ دار الفكر العربى
المعجم الكبير للحافظ ابى القاسم سليمان بن احمد الطبرانى و ۲۶۰ ت۳۶۰ مكتبه ابن تيميه
مصباح اللغات للعلامة ابى الفضل عبد الحفيظ البلياوى قديمى كتب خانه کراچی
مختصر المعانى للعلامة سعد الدين التفتازانى سعيد کمپنیؒ
مجموعة الفتاویٰ مولانا عبدالحی لکھنوی میر محمد کتب خانہ
المحلیٰ للامام ابى محمد على بن احمد سعيد بن حزم الاندلسى دار الباز مكة المكرمه
مسند ابوعوانه للامام ابى عوانه يعقوب بن اسحاق الاسفرائنى دار المعرفة
مقالات الامام الكوثرى للشيخ محمد زاهد الكوثرى ت ۱۳۷۱ دار شمسى كراتشى
المغنى عن حمل الأسفار علىٰ هامش احياء العلوم للعلامه زين الدين أبى الفضل العراقى ت۸۰۶ دار الفكر
المقاصد الحسنة للعلامة شمس الدين محمد بن عبد الرحمن السخاوى دار الكتب العلمية
مسند أبى داؤد الطيالسى للامام أبى داود سليمان بن داود الفارسى الطيالسى ت۲۰۴ دار المعرفة
المعجم الأوسط للامام أبى القاسم سليمان بن احمد الطبرانى ت۳۶۰ مكتبة المعارف
مسند أبى يعلى للشيخ الاسلام أبى يعلى أحمد بن على الموصلى و ۲۱۰ ت۳۰۷ مؤسسة علوم القرآن
من فضائل سورة الاخلاص وما لقارئها للحافظ الحسن بن محمد الخلال و ۳۵۲ ت ۴۳۹مكتبة لينه القاهرة

المعجم الصغير للامام ابی القاسم سليمان بن أحمد الطبرانی و ۲۶۰ ت ۳۶۰ المكتب الاسلامی
المبسوط للعلامة شمس الائمة ابی بكر محمد احمد السرخسی دار المعرفة بيروت
مصنف عبد الرزاق للحافظ أبی بكرعبد الرزاق بن الهمام الصنعانی و ۱۲۶ ت ۲۱۱ ادارة القرآن كراچ
المؤطا للامام مالک بن انس ؒ
مراقی الفلاح للشيخ حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی ت ۱۰۶۹ مصطفی البانی الحلبی
المغنی (فی فقه الحنبلی) للامام عبد الله بن احمد بن قدامة المقدسی الحنبلی دار الكتب العلمية
معارف السنن للعلامه محمد يوسف البنوری ؒ
مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر للشيخ عبد الله بن شيخ محمد داماد افندی دار إحياء التراث
مسند الحميدی للحافظ ابی بكر عبد الله بن الزبير الحميدی سملک ڈابھیل الهند
مالابدمنہ قاضی ثناءاللہ پانی پتی ؒ
ماہنامہ ''الحق'' جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
ماہنامہ الفاروق زیر سرپرستی مولانا سلیم اللہ خان صاحب کراچی
ماہنامہ ''البینات'' ۱۳۸۷ھ ازحضرت مولانا محمد یوسف بنوری
ماہنامہ دارالعلوم دیوبند
منهاج السنن حضرت مفتی فرید صاحب
المختار للفقيه عبدالله بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی
المبسوط (فی فقه الشافعی) للشيخ احمد جنک حيدر آباد
المقالات الفقهية حضرت مفتی رفیع عثمانی صاحب مكتبه دار العلوم كراچی
مجلة المجمع الفقهی الاسلامی رابطة العالم الاسلامی مكة المكرمة
مجله المآثر بیادگار محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی
معلم الفقہ ترجمہ مجموعۃ الفتاوی جناب مولوی برکت اللہ صاحب لکھنوی آرام باغ کراچی
معلم الحجاج حضرت مولانا مفتی سعید احمد مفتی مظاہر العلوم سہارنپور مع حاشیہ ازحضرت مولانا قاری شیر محمد سندھی صاحب ادارة القرآن
المعجم الوسيط ابراهيم مصطفی / احمد الزيات / حامد عبد القادر /محمد النجار
معجم البلدان للامام ياقوت بن عبدالله الحموی دارالفكر
مسند الامام الشافعی للامام محمد بن ادريس ابی عبدالله الشافعی دار الكتب العلمية
الموضوعات للعلامه ابن الجوزی

میزان الاعتدال للحافظ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذھبی
معرفة الصحابة للحافظ ابی نعیم الاصبھانی دار الکتب العلمیة
مسند عبد بن حمید للحافظ عبد بن حمید بن نصر الکسی القاھرة
مجموعہ قوانین اسلامی قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ
المفھم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم للامام القرطبی بیروت
المنتظم للعلامه ابن الجوزی
معجم ابن عساکر للحافظ ابی القاسم علی بن الحسن بن ھبة الله الشافعی
مختصر تاریخ دمشق للحافظ ابن منظور موقع الوراق
مسائل فقھیة معاصرة للشیخ عبد الملک بن عبد الرحمن السعدی دارالنور
المواھب اللدنیة بالمنح المحمدیة للعلامة احمد بن محمد القسطلا نی المکتب الاسلامی
مجموعة الفتاوی للشیخ تقی الدین ابی العباس احمد بن عبدالحلیم بن تیمیة الحرانی
معارف القرآن حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی
المجروحین من المحدثین والضعفاء والمتروکین للامام محمد بن حبان ابی حاتم البستی
موسوعة الافلاک والاوقات للشیخ ابی ایمن خلیل احمد عبد اللطیف الکیرنوی بیروت لبنان
الموسوعة الفقھیة الکویتیة لجنة من العلماء الکبار الکویت
محقق ومدلل جدید مسائل جمع وترتیب حضرت مولانا مفتی جعفر صاحب ملی رحمانی اکل کوا
مواھب الجلیل للشیخ ابی عبدالله محمد بن محمد بن عبد الرحمن المغربی دار الکتب العلمیة بیروت
ملتقی الابحر للعلامة الفقیه ابراھیم بن محمد بن ابراھیم الحلبی دارالبیروتی
مجلة المجمع الفقی الاسلامی
مجموعة الفتاوی بھامش خلاصة الفتاوی للعلامة عبد الحي اللکنوی مکتبة رشیدیه کوئٹه
المنتقی شرح الموطا للامام الباجی الاندلسی دار الکتاب العربی
منھج الامام احمد فی اعلال الاحادیث
موسوعة اقوال الامام احمد فی الجرح والتعدیل
مسند علی بن جعد للامام ابی الحسن علی بن الجعد
المبسوط للامام محمد بن الحسن الشیبانی ادارة القرآن
مختصر اختلاف العلماء للامام الطحاوی

مجمع بحار الانوار للشيخ العلامة محمد طاهر الصديقى الفتنى مكتبة دار الايمان
مختصر قيام الليل للشيخ محمد بن نصر المروزى
مسند الشاميين للامام الطبرانى الرسالة
المدخل الى السنن الكبرى للامام البيهقى
مجموعة رسائل اللكنوى للعلامة عبد الحي اللكنوى ادارة القرآن
مقدمة ابن الصلاح للشيخ ابى عمرو عثمان بن عبد الرحمن الشهرزورى مكتبة الفارابى
موضوعات الصغانى للامام الرضى الصاغانى موقع الوراق
المدخل للامام ابن الحاج العبدرى المالكى دار الفكر
المجموع المغيث فى غريبى القرآن والحديث
المستخرج لابى عوانة
مشكل الحديث لابن الفورک
مطالع الانوار على صحاح الآثار للشيخ ابن قرقول ابراهيم بن يوسف
مطالب اولى النهى للشيخ مصطفى السيوطى الحنبلى دمشق
مكمل تاريخ دارالعلوم ديوبند سیدمحبوب رضوی میرمحمد کتب خانہ
مدارج السالكين للعلامة ابن القيم الجوزية
مجموع فتاوى ومقالات للشيخ ابن باز
مجموع فتاوى ورسائل للشيخ ابن عثيمين
ملفوظات حكيم الامت
المنجد دار الاشاعت كراچى
المفهم لما اشكل من تلخيص كتاب مسلم للامام ابى العباس احمد بن عمر بن ابراهيم القرطبى دمشق
مختارات النوازل للامام ابى الحسن على بن ابى بكر المرغينانى
المصفى شرح المؤطا للشاه ولى الله الدهلوى
مفطرات صوم اور عصر حاضر کے بعض مسائل مسیح العلوم بینگلور
المسائل المهمة فيما ابتلت به العامة اكل كوا
مفطرات الصيام المعاصرة للدكتور احمد بن محمد خليل
المستوعب للعلامة ابى الفرج عبد الرحمن ابن الجوزى

المدخل الی مذهب الامام احمد بن حنبل لليخ ابن بدران الحنبلی دارالکتب العلمية بيروت
ما ثبت بالسنة للشيخ عبد الحق الدهلوی
مساوی الاخلاق للشيخ محمد بن جعفر الخرائطی السامری
المختصر الكبير فی سيرة الرسول للشيخ عز الدين بن جماعة الكتانی
مجمع الضمانات فی مذهب الامام الاعظم ابی حنيفة النعمان للعلامة ابی محمد بن غانم بن محمد البغدادی
المدخل الفقهی العام للشيخ مصطفی زرقا
معجم لغة الفقهاء للشيخ محمد رواس قلعه جی والشيخ حامد صادق قنيبی ادارة القرآن والعلوم الاسلامية
مکتوباتِ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی
المحيط الرضوی للعلامة رضی الدين السرخسی
مرويات غزوة بنی المصطلق وهی غزوة المريسيع للشيخ ابراهيم بن ابراهيم قريبی المدينة المنورة

نون

نصب الرايه للمحدث جمال الدين ابی محمد عبد الله بن يوسف الزيلعی الحنفی المكتبه المكية
نيل الاوطار للشيخ محمد بن علی بن محمد الشوكانیؒ ادارة القرآن كراچی
نهاية المحتاج الی شرح المنهاج للشيخ شمس الدين محمد بن أبی العباس دار الفكر
نور الايضاح للعلامه حسن بن علی الشرنبلالی مجيديه
نظام الفتاوی حضرت مفتی نظام الدین اعظمی
النهر الفائق للشيخ سراج الدين عمر بن ابراهيم ابن نجيم المصری قديمی
نخب الافكار للعلامه بدر الدين العينی الوقف المدنی
نئے مسائل اور علماء ہند کے فیصلے قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ
نتائج الافكار للشيخ شمس الدين قاضی زاده آفندی دار الفكر
نور الانوار للعلامة احمد بن ابی سعيد الملا جيون الاميتی
نجم الفتاویٰ مفتی نجم الحسن امروہی
النهاية فی غريب الحديث للشيخ ابی السعادات المبارک بن محمد الجزری المكتبة العلمية بيروت
النشر فی القراءات العشر للشيخ شمس الدين ابی الخير ابن الجزری بيروت
النكت والعيون (تفسير الماوردی) للامام ابی الحسن علی بن محمد الماوردی البصری دار الكتب العلمية

النتف فی الفتاوی لشیخ الاسلام علی السغدی دارالکتب العلمیة بیروت

واو

الوافی بالوفیات لصلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی دار احیاء التراث بیروت
وفیات الاعیان و ابناء ابناء الزمان للشیخ ابی العباس شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان
وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی للعلامة علی بن عبد الله بن احمد السمهودی دارالکتب العلمیة بیروت

هاء

الهدایة للامام ابی الحسن علی بن ابی بکر المرغینانیؒ و ۱۱۵ت ۵۹۳ مکتبة شرکة علمیة
الهدیة العلائیة للشیخ علاء الدین بن محمد امین ابن عابدین الشامی
هدایة المحتار فی درایة الآثار لمولانا محمد هدایة الله القاسمی دیوبند

یاء

الیواقیت الغالیة فی تحقیق الأحادیث العالیة للشیخ محمد یونس السهارنفوری

انگریزی مراجع حسبِ ذیل ہیں:

www.vekywellhealthline.com

www.healthline.com

mydr.com

en.wikipedia.org

businessinsider.com

تمت بحمد الله